
علمی ادبی و دینی
ماہنامہ
مقام اشاعت

دنیائے خضاب میں ہولناک زلزلہ

"اکسیر حنا" رجسٹرڈ بال سیاہ کریم

سفید بالوں کو سیاہ کرنے میں یدِطولیٰ رکھتی ہے موجودہ زمانہ میں ہزارہا اقسام کے ولایتی و دیسی خضاب اور کالے تیل تیار ہو چکے ہیں جو کہ رنگ برنگی ہونیکی وجہ سے بہت ہی ضرر رساں ثابت ہوئے ہیں بعض حضرات جو اِن نام نہاد خضابوں اور کالے تیلوں سے متنفر ہو چکے ہیں وسمہ او مہندی استعمال کرتے ہیں وہ بھی گھنٹوں بھر کی انتظاری سے اکتا گئے ہیں پبلک کی ان تکلیفات کو مدِنظر رکھتے ہوئے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد ہم نے ایک نایاب بال سیاہ کریم تیار کرلی ہے۔ یہ کریم سفید بالوں کو چند منٹوں کے اندر اندر شب دیجور کی مانند سیاہ کر دیتی ہے۔ اِس کا نام "اکسیر حنا" رجسٹرڈ ہے یہ اپنے نام اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک بےنظیر چیز ہے یہ نہایت ہی آرام دہ اور قابلِ اعتبار ہے۔ یہ اکسیر، مہندی اور دیگر یونانی ادویات سے مرکب سے کشید کر کے تیار کی گئی ہے اور اسے طبِ جدید کے زریں اصولوں سے بنایا گیا ہے۔ جلد پر دھبہ نہیں ڈالتی۔ نزلہ اور زکام کی شکایت مطلقاً نہیں ہونے دیتی بالوں کو ہمیشہ کیلئے سیاہ، جلد کو نرم، خشکی کو دور کرنے کے علاوہ گرتے بالوں کو بچاتی ہے۔ اس کی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ کو تازگی اور دل کو فرحت پہنچتی ہے۔ زیادہ تعریف کرنا فضول ہے اگر تحریر کے مطابق سفید بالوں کو سیاہ نہ کرے تو قیمت بلاعذر واپس آزمایش شرط ہے۔ قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ۔ نمونہ مفت پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا

مفت نمونہ طلب کرنے والے حضرات کے لئے ۸ آنے کے ٹکٹ ڈاک ارسال کرنے لازمی ہیں۔ ان کے بغیر تعمیل ارشاد نہ ہوگی۔ ایجنٹوں کی ہر شہر میں ضرورت ہے۔ شرائط ایجنسی کیلئے خط و کتابت کریں اپنا پتہ نہایت خوشخط اردو یا انگریزی میں تحریر کریں ۔ (اِس اشتہار کا مضمون رجسٹری شدہ ہے)۔

المشتہر

مینجر نشاط ٹریڈنگ کمپنی رجسٹرڈ لاہور

منظور کردہ صاحب بہادر ڈائرکٹر تعلیم پنجاب لاہور چٹھی نمبر ۲۳۲۹ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۳۶ء

منظور کردہ محکمہ تعلیم حیدرآباد دکن ۲۲۰ بابت سنہ ۱۳۴۴ف مثل نمبر ۱۳ (۱۳۴۴ف)

مکتبۂ اُردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ لاہور

ادبِ لطیف

فروری ۱۹۳۸ء

ادارۂ تحریر

چودھری برکت علی بی۔ اے

میرزا ادیب بی۔ اے

مقامِ اشاعت

مکتبۂ اُردو لاہور

سالانہ چندہ مع ضخیم سالنامہ و افسانہ نمبر سے علاوہ محصول ڈاک

چندہ ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

مندرجات

جلد ۶ | بابت ماہ فروری ۱۹۳۸ء | نمبر ۶

(چودھری برکت علی بی اے پرنٹر پبلشر نے دی رائج ... پریس ... سے چھپوا کر ادب لطیف لوئر مال روڈ لاہور سے شائع کیا)

ادارہ

نذرِ اوّلین

گذشتہ اعلانات میں واضح کیا گیا تھا کہ مکتبہ اردو کی تین تازہ مطبوعات "کمپنی کی حکومت ہندوستان میں"، "آہنگ رزم" اور "پاند کا گناہ" جملہ ظاہری محاسن سے آراستہ ہو کر مارکیٹ میں نکل چکی ہیں۔ "کمپنی کی حکومت" اس دورِ پر آشوب کی ولخراش و درد انگیز داستان ہے جب مہذب اقوام یورپ اپنے آہنیں پنجوں سے ہندوستان کے سینے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی کوشش میں مصروف تھیں جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب آٹھ سو سال کی لمعہ افشانیوں کے بعد غروب ہو رہا تھا اور جب فرنگی تدبر کے مکارانہ حملے ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بالکل تباہ کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس وقت کیسے کیسے مظالم بیکس ہندوستانیوں پر کئے گئے ہوں گے کس کس چال سے ہندوستانیوں کے ذہن و دل کو مسموم کرنے کی کوشش کی گئی ہو گی اور کس کس انداز سے ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں ہی کا خون چوسنے پر آمادہ کیا گیا ہو گا۔ فرنگی تاجر صرف تاجرانہ مقاصد لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے مگر اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ صرف فرنگیانہ چال ہے تاجرانہ مقاصد کے پردے میں ہندوستان کو ذہنی و اقتصادی لحاظ سے غلام بنانے کے ارادے مضطرب ہیں۔ کمپنی کی حکومت میں ان تمام واقعات کو نقد و نظر کی روشنی میں لایا گیا ہے۔ جس کے زیر اثر تاجروں کی جماعت ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر سکی۔ پھر ہر ایک گورنر کے ذہن و دل کے گہرے ترین گوشوں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ ہمارے طلبا کو جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں وہ ان حقائق سے وہی ہوتی ہیں مگر یہ جنس تو حقیقت سے یکسر محروم ہوتا ہے۔ ضرورت تھی کہ کمپنی کی ہندوستان میں حکومت کے اصلی واقعات کے خد و خال واضح کئے جاتے اور اسی مقصد کے ماتحت یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ جناب باری صاحب کے پر جوش انداز بیان کے باوجود قدم قدم پر تحقیقات دیانتداری کا ثبوت دیتا ہے۔ امید ہے ملک اس کتاب کی کما حقہ قدر کریگا۔ دوسری کتاب "آہنگ رزم" ہے۔ اردو زبان رزمیہ نظموں سے بہت حد تک محروم ہے حالانکہ شاعری کی اس اہم صنف سے ترقی یافتہ زبانیں مالا مال ہیں۔ آہنگ رزم اردو میں جنگی ترانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو لفردانہ دلنشاہی قوم کی عظمت کو نمایاں کرتے ہیں جو قوم شجاعت و بہادری سے محروم ہو جاتی ہے زمانہ کی یورشیں اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتی ہیں۔ لیکن کتاب میں اردو کے ممتاز شاعر جناب آرزو اکبر آبادی نے سپاہیانہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر پر جوش ہیجان انگیز نظمیں کہی ہیں۔ ہر ایک ہندوستانی کو آہنگ رزم کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ تیسری کتاب "چاند کا گناہ" ہے اس میں دنیا کے مقتدر و کامل الفن افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کو نہایت دلآویز پیرائے میں منتقل کیا گیا ہے۔ راجہ مہدی علی خاں کو خاص تحت جو امتیاز حاصل ہے اور یہ افسانے آپکی اس صلاحیت پر شاہد ہیں۔

افسانہ نمبر۔ ادب لطیف کا افسانہ نمبر مقررہ وقت پر شائع ہو گا۔ اس نمبر کو شاندار سے شاندار بنانے کے لئے ابھی سے کارکنان رسالہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے سالنامے میں طویل افسانہ "پریم کا جادو" مترجمہ جناب سراج الدین احمد صاحب نظامی بے حد مقبول ہو چکا ہے۔ افسانہ نمبر میں اسی قسم کا ایک افسانہ شائع ہو رہا ہے جس کا عنوان "پریم کا سپنا" ہے۔ جو پریم کے جادو سے بدرجہا دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ صحرا نورد کا چھٹا خط بھی شائع ہو گا۔

ادب لطیف کا ایک اور خاص نمبر۔ کارکنان ادب لطیف نے ارادہ کیا ہے کہ دو خاص نمبروں کے علاوہ ہر سال ایک اور خاص نمبر بھی شائع ہونا چاہئے اور یہ خاص نمبر۔۔ ہر لحاظ سے خاص نمبر ہونا چاہئے یعنی اس میں جتنے مضامین شائع ہوں وہ ایک ہی موضوع کو لئے ہوئے ہوں امسال یہ خاص نمبر۔۔۔ اشتراکیت نمبر ہو گا اشتراکیت نمبر میں ہندوستان کے نامور ادیب خیال مراد آبادی کا ایک طویل مگر نہایت دلآویز اور مفید مقالہ درج ہو گا۔ اس مقالے میں اشتراکیت کے تمام پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ خیال کیجئے موضوع کتنا اہم ہے۔ اور پھر اس کا بھی اندازہ لگائیے کہ مضمون نگار کی شخصیت بھی دنیائے ادب میں کتنی بلند ہے۔ اس کے بعد جو خاص نمبر ہو گا اس میں میرزا ادیب کا مکمل ڈراما درج ہو گا +

جناب اثر چکوالی بی۔اے

قطعات

حال و قال

فسونِ عقل سے بیزار ہوں میں
شرابِ عشق میں سرشار ہوں میں
خودی کی ترجماں ہر سانس میری!
اثرؔ اک بندۂ خوددار ہوں میں

وسعتِ دل

مرا دل، مالکِ ہر دو جہاں ہے
زمیں کیا، اسکے اندر آسماں ہے
نہ پوچھو اس کی لامحدود وسعت
مثالِ نورِ یزداں بیکراں ہے

محبت

محبت ہے امینِ قلبِ انساں
محبت زندگی کا مدعا ہے
محبت میں ہی پنہاں قومیت کا
حقیقت میں اثرؔ رازِ بقا ہے

زندہ دلی

جہاد و جہد ہے میرا خزینہ
سکوں پرور نہیں میرا سفینہ
ڈرا سکتے نہیں مجھ کو حوادث
عمل کے نور سے روشن ہے سینہ

جناب عبدالغنی بی اے

نپولین اعظم اور صنفِ نازک[۱]

بعض مورخین نپولین کی بڑی مکروہ تصویر کھینچتے ہیں بالخصوص اُس کی پرائیویٹ زندگی کو ہر قسم کی نجاستوں سے آلودہ دکھاتے ہیں۔ ادب لطیف کے اس شیوع میں حقائق و واقعات کی بنا پر میں اُس پر عائد کردہ الزامات کی حقیقت عالم آشکارا کرنا چاہتا ہوں۔

نپولین پانچ سال کی عمر میں ایک ابتدائی سکول میں داخل ہوا اور اول اول چھ سال کی عمر میں ایک ہم مکتب لڑکی گیا کومینیٹا سے محبت کرنے لگا۔ اُس کی پُرجوش طبیعت اس لڑکی کی محبت میں سراپا محو ہو گئی۔ اور اُس نے اپنی محبوبہ کے دل میں بھی اتنا ہی پُرجوش ولولہ پیدا کر دیا۔ وہ اُس سے گفتگو کرنے کو دُنیا بھر کی نعمتوں سے اعلےٰ ترسمجھتا لیکن اُس وقت کی محبت خواہ کتنی ہی ولولہ انگیز کیوں نہ ہو، فرشتوں کی معصوم محبت ہے۔ اس کے بعد جن دنوں وہ بریَن سکول متاقع فرانس میں تعلیم پاتا تھا۔ سکول میں ایک ڈرامہ دکھایا گیا۔ سکول کے ایک قلی کی عورت دیکھنے گئی اور نپولین نے اُسے اس لئے وہاں سے بھگا دیا۔ کہ ایک عورت نوجوانوں میں کیوں بیٹھے۔ پیرس سکول کے زمانہ تعلیم میں ایک اور بڑا نتیجہ خیز واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک بار اپنے ہم جماعتوں کے ہمراہ کسی خوشی کی تقریب پر مارسیلز گیا۔ وہاں تمام لڑکے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ رقص و سرود سے لذت اندوز ہونے لگے مگر وہ علیحدہ رہا۔ کسی نے طعنہ دیا کہ تمہارے دل میں جنس لطیف کا احترام موجود نہیں وہ بولا "آدمی کی تعمیر کھیل کود اور رقص و سرود سے نہیں ہوتی"۔ یہ واقعہ جہاں یہ ظاہر کرتا ہے کہ نپولین بچپن ہی سے پاکیزہ اخلاق رکھتا تھا۔ وہاں اس حقیقت کا بھی انکشاف کرتا ہے کہ نپولین کے مقاصد اوائل عمر ہی سے بڑے دقیع اور رفیع تھے۔

بچپن ہی سے اس بلند فطرتی کا اظہار بڑا تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہمیں حیران نہ ہونا چاہئے۔ یہ اُس بے نظیر تربیت کا نتیجہ تھا جو نپولین کی ماں نے قیافہ شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے کی تھی۔ اُس نے نپولین کے اخلاق کو ایک پاکیزہ سانچے میں ڈھالا۔ مذہب اور پاکدامنی کی اہمیت اُس کے دل و دماغ سے تسلیم کرائی اور اسکے دماغ کو اعلےٰ خیالات کی پرورش گاہ بنایا۔ نپولین ماں کی اس تربیت کا مداح تھا۔ اور اس حقیقت کا بار بار ببانگ دہل اعلان کیا کرتا تھا۔ کہ وہ خود اور اس کے بھائی بہن اپنی اُس جسمانی، اخلاقی اور دماغی تربیت کیلئے اپنی والدہ کے ممنونِ احسان ہیں جس نے انہیں عظمت و جلال کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ اسی فقیدالنظیر

۱؎ میں نے اس مضمون میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے۔

تاریخ نپولین مصنفہ اسٹ۔ تاریخ نپولین مصنفہ گیرو۔ نپولین اعظم کے ... خطوط نپولین اعظم کے ...

تربیت کا نتیجہ تھا۔ کہ پاکدامنی اور نیکی نپولین کے لئے فطری رجحانات بن چکے تھے۔ اور وہ تعلیمِ نسواں کو قوم کی اصلاح و تربیت کے لئے اشد ضروری سمجھتا تھا۔

جب نپولین تعلیم ختم کر چکا۔ تو اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر اُسے لفٹیننٹ کے ممتاز عہدہ پر تعینات کیا گیا۔ اُس کی عمر اُس وقت پورے سولہ سال تھی عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ جب ولولے اور امنگیں طبیعت میں ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ فضائیں مسرت و مستی سے معمور دکھائی دیتی ہیں۔ اقصائے عالم کا ذرہ ذرہ مخمخانہ بدوش نظر آتا ہے۔ ہر فردِ بشر حسین و جمیل صورتوں پر متاعِ دل و ایماں قربان کر دینا چاہتا ہے! اور آرزوئیں طوفان بنکر صبر و سکوں کو پرِ کاہ کی طرح اڑائے پھرتی ہیں۔ مگر اس زمانہ میں بھی نپولین نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ اور اگرچہ حالات بھی جوشِ شباب کی تسکین کا سامان پیدا کر سکتے تھے۔ مگر اُس نے اپنی آرزوؤں کو متلاطم نہ ہونے دیا۔

اسی زمانہ میں وہ ایک دفعہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ بدامنی مٹانے کے لئے آکسون گیا۔ وہاں افسروں کے قیام کا انتظام ایک حجام کے ہاں ہوا۔ حجام کی بیوی عشوہ فروش تھی فوج کے تمام افسر اسکے نازبردار تھے۔ اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ اُس کے ساتھ الفت و محبت کی ملکش گفتگو میں گزارتے۔ مگر تنہا نپولین ان بیہودگیوں کی محفل سے دور رہتا۔ اور اپنا فارغ وقت مطالعہ اور غور و فکر میں صرف کرتا۔ حجام کی بیوی نے جب دیکھا کہ اسکے تیرِ نگاہ نپولین کے دل میں پیوست نہیں ہوتے۔ اور وہ زیادہ بے اعتنائی برت رہا ہے۔ تو وہ بڑی ناراض رہنے لگی۔ چند سال بعد جب نپولین اٹلی کا سپہ سالار تھا۔ وہ آکسون سے گزرا۔ اور اس نے اُس عورت سے پوچھا۔ کیا تمہیں ایک افسر بوناپارٹ نامی یاد ہے۔ جو کسی وقت تمہارے ہاں رہا کرتا تھا"؟

"ہاں۔ مگر وہ ایک بڑا ناپسندیدہ مہمان تھا"

نپولین نے کہا: "افسوس نیک عورت اگر میں اپنے ایام اس طرح گزارتا جس طرح تمہاری خواہش تھی۔ تو مجھے آج اٹلی کی افواج کی سالاری نصیب نہ ہوتی"۔

انہی ایام میں فرانس میں انقلاب کی عالم سوز آگ بھڑک اٹھی۔ انقلابیوں نے شاہانِ فرانس کی استبدادیت کے تار و پود کو نذرِ آتش کر ڈالا۔ شاہی خاندان کے متعدد افراد تہِ تیغ کر دیئے گئے۔ مذہب کے نام پر لوگوں کو زمانہ ماسبق میں بڑی جانگداز ایذائیں پہنچائی جا چکی تھیں۔ اس لئے مذہب کو خیرباد کہہ دیا گیا۔ لوگ خدا کی ہستی کے منکر بن گئے اور ہر قسم کی مذہبی اور اخلاقی بندشوں کو کھلم کھلا توڑ ڈالا۔ بالخصوص پیرس ان تمام بداعتدالیوں اور بدعنوانیوں کا مرکز بن گیا۔ ان طوفانی حالات نے نپولین کو فرانس کے سیاسی افق پر نمودار کیا۔ اُس نے اپنے فطری جوہر کا عظیم الشان مظاہرہ کیا۔ کفر و الحاد اور بدلگامی کا یہ محشر خیز ماحول اُس پر کچھ بھی اثر نہ کر سکا۔ اور وہ ان آلودگیوں سے اس طرح پاک صاف نکل آیا جس طرح چاند سیاہ بادلوں میں سے زیادہ منور بن کر نکلتا ہے۔

انقلاب کے ان خونیں ایام میں ایک دن وہ گاڑی پر سے اتر رہا تھا۔ ایک عورت پریشان حال اپنے ہاتھ میں مردہ بچے کو اٹھائے ہوئے آئی۔ اور نپولین کو یوں کہنے لگی "اگر مجھے مدد نہیں مل سکتی تو میں اپنے باقی پانچ یتیم بچوں کو لیکر ڈوب مروں گی"۔ نپولین اس دردناک منظر کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ جھٹ

سے آگاہ ہونے کے لئے سوالات کرتا رہا۔ اور جب اُسے اُس عورت کی مصیبت کا پوری طرح علم ہو گیا۔ اُس نے تمام کنبہ کے احتیاج کا معقول انتظام کر دیا۔ انقلاب کے دنوں میں اُس نے اسی طرح تنگدستوں اور مفلوک الحالوں کی مدد کی۔ بالخصوص یتیموں اور بیواؤں سے بڑی ہمدردی کا اظہار کرتا تھا۔ اور ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ میں ایک عورت کے آنسوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک اور واقعہ اس حقیقت پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ شہنشاہ بننے پر بعض وجوہات کی بنا پر وہ جرمنی پر حملہ آور ہوا۔ ایک گورنر شہزادے نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور اطاعت گزار بن گیا لیکن اس شہزادے نے اطاعت کے بعد جاسوسی کا کام شروع کر دیا۔ اور شاہِ جرمنی کو تمام حالات سے مطلع کرنے لگا۔ اس کا ایک اسی قسم کا خط پکڑا گیا۔ اب اُسکا فوجی قوانین کے مطابق گولی سے اڑایا جانا یقینی تھا۔ اس کی بیوی آہ و زاری کرتی ہوئی نپولین کے قدموں پر آ گری اُس کی آہ و پکار اس قدر درد آمیز تھی۔ کہ نپولین کا دل موم ہو گیا۔ اُس نے وہ خط دردمند خاتون کو دکھایا اور کہا: "مادام کیا یہ تمہارے خاوند کا خط نہیں ہے؟" عورت کا جواب "ہاں" تھا۔ نپولین کہنے لگا: "اب یہ خط تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اسے آگ میں ڈال دو۔ اور پھر تمہارے خاوند کے خلاف کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔" عورت ششش و پنج میں تھی۔ نپولین نے خود اُسی وقت وہ خط سپردِ آتش کر ڈالا اور کہا: "تمہارا خاوند محفوظ ہے۔ اب کوئی ایسا ثبوت نہیں جو اُس کو ملزم ٹھہرائے" نپولین کی نگاہوں میں صنفِ نازک کے احساسات کا کس قدر احترام تھا!

اسی انقلاب کے دنوں میں حکومت کی طرف سے نپولین کو حکم ہوا۔ کہ وہ بغاوت کے مزید امکانات کم کرنے کے لئے اہلِ پیرس سے ہتھیار چھین لے۔ بیوہارنیس نامی ایک معزز شخص کی تلوار نپولین کے قبضہ میں آئی وہ شخص چند دن پہلے اس ہولناک انقلاب کا شکار ہو چکا تھا۔ اُس کا یتیم بیٹا تلوار واپس لینے کے لئے نپولین کے پاس گیا۔ لڑکا بڑا ذہین اور خوبصورت تھا۔ اُس نے جذبات سے مملو سادگی کے ساتھ تلوار کا مطالبہ کیا۔ نپولین کے دل پر اس معصوم التجا نے بڑا اثر کیا اور تلوار واپس کر دی۔ تلوار کی واپسی پر امتنان و تشکر کی کیفیت اور فرطِ خوشی کو لڑکے نے اپنے چہرے پر اس دانشمندی سے ظاہر کیا کہ نپولین کی توجہ فی الفور اُس عورت کی طرف منعطف ہو گئی جس کی تربیت نے اس بچے کو ایسی شاندار سیرت کا مالک بنایا تھا۔ دوسرے دن صبح اُس لڑکے کی ماں جوزافائن سیاہ ماتمی لباس پہنے نپولین کی اس نوازش کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آئی۔ اُس کی ترنم ریز آواز وفورِ جذبات کے باعث مرتعش تھی۔ جوزافائن نے ایسی شفقتِ مادری، علے انداز بیان اور وقار آمیز سنجیدگی کا اظہار کیا کہ نپولین اس کا دلدادہ ہو گیا۔ اور بہت جلد اُس سے ملاقات کرنے کے لئے گیا۔ یہ تعلقات گہرے ہوتے ہوتے ایک پُر جوش اور ولولہ انگیز محبت کی شکل اختیار کر گئے۔

اس محبت میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ نپولین کے لئے عورت کی صرف بلند سیرت ہی جاذبِ نظر تھی۔ جوزافائین پاکیزگی اخلاق مجلسی خوبیوں، حُسنِ ذاتی، اور خاندانی وجاہت کی بنا پر سوسائٹی میں ممتاز تھی۔ اُس کے انہی اوصاف نے نپولین کے دل کو بھی مسحور کر لیا۔ اور بہت جلد ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے وقت نپولین کی عمر چھبیس سال تھی اور جوزافائن کی اٹھائیس سال۔

اس امر کے متعلق مورخین ایک عجیب واقعہ نقل کرتے ہیں
یک دفعہ ایک آدمی نے نپولین کو سلیمانؑ سے تشبیہہ دی تو دوسرے آدمی نے کہا: "واہ تم اسے سلیمان سے زیادہ کس طرح کہہ سکتے ہو۔ وہ یہودی بادشاہ تو سات سو بیویاں رکھتا تھا۔ اور تین سو کنیزیں۔ مگر نپولین تو ایک ہی بیوی پر مطمئن ہے۔ اور وہ بھی بیوہ اور اس سے عمر میں بڑی ہے۔"

جنگ نپولین کو اپنی محبوب بیوی سے عرصہ دراز کے لئے جدا کر دیتے تھے۔ جدائی کے یہ دن اس کے لئے بڑے جانگداز ہوتے تھے۔ اور وہ تسکینِ دل کی خاطر جوزافائن کا ایک مرمریں مجسمہ اپنی قمیص کے اندر لٹکائے رکھتا تھا۔ اور جب بیتاب ہو جاتا تو جنگ کی عدیم الفرصتی کے باوجود اس ہنگامہ خیز ساعت میں قلم اور کاغذ لیکر ایسے رومان انگیز محبت نامے لکھتا جو دلوں کو وقفِ اضطراب کر دیتے ہیں اور جنہیں ادیب اگر دیکھ پائیں تو آنکھوں پر رکھ لیں۔ خاص باد پا قاصد مقرر تھے۔ جو یہ محبت نامے پہنچا کر تدبر بجو بہ کیا کرتے تھے۔ نپولین نے ایک موقع پر جوزافائن کے متعلق کہا: "وہ واقعی انتہائی پیاری عورت تھی۔۔۔۔ مہذب، پُرخلوص، اور خوبصورت۔ وہ سنگار کی دیوی تھی۔ تمام فیشنوں کی ابتدا اُسی سے ہوئی۔ اس کے لئے ہر لباس موزوں تھا۔ وہ بڑی مہربان اور کریم النفس تھی۔ وہ فرانس کی بہترین اور انتہائی باوقار عورت تھی۔" ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نپولین اپنی بیوی کے حسنِ ظاہری اور کمالِ باطنی کا کتنا والہانہ طور پر شیدا تھا۔ کیا یہ ہماری ازدواجی زندگی کے لیے سبق آموز نہیں؟

عفت اور عصمت اُن دنوں تقریباً نامعلوم صفات تھیں بڑی بڑی ذی شان عورتیں اپنے حسن وجمال کی آرائش کرکے مردوں کے دلوں کو موہنے کے درپے رہتی تھیں۔ معززنا اور متمول لوگ انکی نوازشہائے بیجا کے خاص مورد ہوا کرتے تھے۔ نپولین کو بھی بہت سی عورتوں نے اپنی پیچدار سیاہ زلفوں کا صید اپنے عنابی لبوں کا مفتون اور اپنی نرگسیں آنکھوں کا شیدائی بنانے کیلئے انتہائی کوشش کی۔ ایک خاتون مادام سٹیل اس معاملہ میں ممتاز ہے۔ یہ عورت جہاں حد درجہ کی حسین اور با اثر تھی۔ وہاں بڑی ذہین اور سازشیں کرنے میں یکتائے روزگار بھی تھی۔ نپولین کو اس بنا پر اس کی طرف توجہ کرنے کی ترغیب دی گئی۔ کہ وہ ایک خطرناک دشمن ہے اور مفید اتحادی بن سکتی ہے۔ مگر نپولین اپنے اصولوں کو دنیاوی اغراض کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا تھا۔ سٹیل ہر کوشش میں ناکام رہی اور برابر مخالفت کرتی رہی۔ ایک بار بھری مجلس میں اُس نے اپنی تمام ساحرانہ قوتوں کو مجتمع کرکے نپولین سے استفسار کیا: "تمہارے خیال میں دنیا کی سب سے بڑی عورت کونسی ہے؟" "وہ مادام جس نے سب سے زیادہ بچے جنے ہوں"۔ مسولینی کے پیشرو نپولین کا مضحکہ انگیز جواب تھا۔ ایک دفعہ ایک عورت نے نپولین کو جوزافائن کی حد سے زیادہ محبت کا طعنہ جوزافائن کی موجودگی میں دیا۔ نپولین نے برافروختہ ہوکر کہا: "مجھے محبت کی بجائے کسی اور معاملہ پر غور کرنا ہے۔ میں نے اپنے لئے راہِ عمل تجویز کر لی ہے۔ اور دنیا کی لطیف ترین آنکھیں مجھے اس سے بال بھر منحرف نہیں کر سکتیں۔" ایک دفعہ ایک اور معزز عورت نپولین کو دلدادہ و شیدا بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تو اس نے کہا: "ایک عورت کو وفادار بیوی اور نیک ماں بننا چاہیئے۔"

فرانس کے انقلابِ عظیم کے دوران میں نپولین سیاسی افق پر نمودار ہوا تھا۔ اس کے انجام پر وہ سیاسی دنیا میں نصف النہار

پر آفتاب بن کر چمکا۔ اُس کے سامنے یورپ بھر کے تمام بادشاہ اور سیاستدان ماند پڑ گئے اور بزدلانہ مکروہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ نپولین پر ایسے ایسے حیا سوز الزامات لگائے گئے کہ کوئی شریف آدمی انہیں سننا تک گوارا نہیں کر سکتا۔ ایک دفعہ جزیرہ سینٹ ہلینا پر نپولین ایک اسی قسم کی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا تو اس نے کہا میں اکثر عورتوں کے نام بھی نہیں جانتا۔ یہ تمام احمقانہ باتیں ہیں۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ میرے پاس اس قسم کی بدکاریوں کے لئے کوئی وقت نہ تھا:

اس ناپاک پراپیگنڈے نے حیران کُن اثر کیا۔ کوتاہ اندیش لوگوں کا ان تمام باتوں پر ایمان ہو گیا۔ با ایں ہمہ جو کوئی نپولین کے صحیح حالات سے باخبر ہو جاتا یا اُسے ایک بار بھی دیکھ پاتا۔ تو وہ اِن تمام اعتقادات کو سر کی ایک جنبش سے دور کر دیتا۔ اور پھر نپولین کے اوصافِ حمیدہ کا معترف بن جاتا۔ مسز ایبل ایک انگریز خاتون رقمطراز ہے:۔ نپولین کے متعلق میرے اولیں خیالات یہ تھے۔ وہ ایک عظیم الجثہ کریہہ المنظر دیو ہے۔ جس کی پیشانی کے عین درمیان ... ایک سُرخ شعلہ آفریں آنکھ ہے۔ جس کے لمبے لمبے دانت منہ سے باہر نکلے ہوتے ہیں۔ اور اُن سے وہ چھوٹی چھوٹی شرارتی لڑکیوں کو چیر ڈالتا ہے۔ جوان ہونے پر اگرچہ میرے خیالات میں بچپن کی سادگی نہ تھی لیکن نپولین سے خوف ذرا بھر کم نہ ہوا تھا۔ میرے دماغ میں اُس کے نام کے ساتھ تمام شرمناک اور دہشت انگیز باتیں موجود تھیں۔ میرا زبردست اعتقاد تھا کہ وہ آدم کا بدترین بیٹا ہے۔ ان خیالات کے لحاظ سے میں یکہ و تنہا نہ تھی۔ مجھ سے زیادہ عمر والے اور زیادہ دانا آدمی اِس معاملہ میں میرے برابر کے شریک تھے میں کہہ سکتی ہوں۔ کہ انگریز قوم کی اکثریت یہی خیال رکھتی تھی:" یہاں تک کہ مسز موصوفہ نے اُن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو انتہا پسندوں کے شر انگیز پراپیگنڈے سے پیدا ہوئے تھے آگے چل کر وہ کہتی ہیں:۔ سینٹ ہلینا میں نپولین کو دیکھ کر میرے ان خیالات میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی۔ گھوڑے کی سواری نپولین کے قد کی کمی کو پورا کر دیتی تھی اور وہ انتہائی باوقار شخص معلوم ہوتا تھا۔ . . . ایک دفعہ جب اُس نے گفتگو شروع کی تو اس کی مسحور کُن مسکراہٹ اور اس کے کرمفرمارویہ نے میرے دماغ میں اُس خوف کا شائبہ تک بھی نہ رہنے دیا جس کے ساتھ میں اُسے پہلے دیکھا کرتی تھی۔ اُس کا رویہ اس قدر تصنع سے پاک مشفقانہ اور محبت آمیز تھا کہ میں چند دنوں ہی میں اُس سے بے تکلف ہو گئی۔"

مخالفین کے اخبارات جوزافائن کے دامن کو بھی ہر قسم کے گناہوں سے آلودہ دکھاتے تھے۔ اس کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں یہ بصیرت افروز سطور پائی جاتی ہیں:۔ ایک وقت تھا کہ نپولین کو بدنام کرنے والی ہر تہمت یا شرمناک کہانی انگلستان میں بہت جلد تسلیم کر لی جاتی تھی۔ واقعی کہانی جس قدر حیا سوز ہوتی تھی۔ اس کے تسلیم کئے جانے کا اتنا ہی زیادہ یقین ہوتا تھا۔ قومی تعصب کی خوش عقیدگی کو معمولی ناممکنات ناگوار نہیں گزرتی تھیں مثال کے طور پر یہ عام مشہور تھا اور دنیا بھر میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ کہ ملکہ جوزافائن ایک شرمناک بلکہ اس بھی بدتر سیرت رکھتی تھی۔ لیکن عام اعتقاد بالکل کسی ثبوت پر مبنی نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ وہ شخص جو بدکاری کو اس قدر حقارت سے دیکھتا تھا۔ اور جس نے بعد میں اپنی ملازمت سے تمام قابل اعتراض سیرت اور شہرت والی عورتوں کو برطرف کر دیا۔ اُس عورت سے شادی کرتا جو مشکوک اخلاق رکھتی تھی۔"

معاندین نے اس بے بنیاد خبر کی بھی تشہیر کی کہ نپولین کی جوزفائن سے والہانہ اُلفت اس کی اگلے خاوند سے بیٹی کی وجہ سے تھی لیکن بوریَن نامی نپولین کا ایک زبردست دشمن اس خبر کے متعلق اپنی تاریخ نپولین میں رقمطراز ہے۔ "یہ تہمت اُن تہمتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جو کینہ پرور طبیعت اُن بلند مرتبہ ہستیوں پر لگاکر خوش ہوتی ہے جو دنیا میں نامور ہو چکی ہوں۔ ایک غیر متعصب مورّخ کو نپولین پر یہ الزام عاید نہ کرنا چاہئے۔ اُس کے اصول انتہائی مستحکم تھے۔ اس قسم کا خیال بھی کبھی اس کے دل سے نہ گزرا تھا۔ اور نہ ہی یہ تہمتیں اُس کے اخلاق اور اُس کی طبیعت سے مطابقت رکھتی تھیں :

شہنشاہ بننے پر نپولین نے کہا " لاریب ایک بادشاہ کا بدترین عیب اُس کے اخلاق کا گھناؤناپن ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح بدعات کو ایک فیشن کی حیثیت سے اپنی رعایا میں رواج دیتا ہے۔ اور رعایا بادشاہ کو خوش رکھنے کے لئے اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ یہ بدترین رواج ہر قسم کی گناہ کی گرفت کو مضبوط کرتا ہے۔ ہر قسم کی پاکیزگی کے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔ اور ایک وبا کی طرح تمام سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ قصہ کوتاہ یہ قومی تباہی ہے " یہ الفاظ کس بلاغت سے واضح کر رہے ہیں۔ کہ نپولین کے اخلاق فرشتوں کی پاکدامنی کے آئینہ دار تھے۔

شاہانِ سابقہ سے مطلب برآری کے لئے امرا اور ارکین دربار حسن کی بے پناہ طاقت کو استعمال میں لاتے تھے۔ اپنی زہرہ جبیں اور پری تمثال بہو بیٹیوں کو اپنے مفاد کی نمائندگی کے لئے بادشاہوں کے حضور میں بھیجا کرتے تھے۔ نپولین کے عہد میں بھی اس ضمیر فروشی اور عصیاں کاری کو جاری رکھنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اُس نے بڑی مستعدی اور مستقل مزاجی سے اسے بند کیا۔ ایکدفعہ ایک درباری نے اپنی بہو کو نپولین کے دربار میں پیش کرنیکی کوشش کی وہ مہ لقا مسحور کن سادگی کے ساتھ اپنی نگاہِ غلط انداز نپولین کے چہرہ پر ڈالا کرتی تھی۔ بظاہر عصب چھپا کر آہیں بھرتی تھی . . . . اور اس کی شرم آلود نگاہیں دعوت نظارہ دیتی تھیں۔ اس سازش میں بہت سے لوگ شریک تھے۔ نپولین کچھ عرصہ تو خاموش رہا لیکن آخر تنگ آکر اُس نے مذکورہ بالا درباری کو ایک سال کے لئے معطل کر دیا۔ اُس کی بیوی کو چھ سال کے لئے دربار میں آنے کی ممانعت کر دی۔ اور اُس کے بیٹے اور بہو کو ایک سال کے لئے جرمنی بھیجدیا۔

ہم نے نپولین کی زندگی کے ہر مرحلہ کو بنظرِ غائر دیکھا ہے۔ اور معلوم کیا ہے کہ اُس کے اصُول بہترین اصول تھے۔ اور اُسکے اخلاق پاکیزہ ترین اخلاق تھے لیکن پھر بھی تنگ نظر لوگ اُسکے مفروضہ اخلاقی عیوب ونقائص کی نشر و اشاعت دنیا میں کر رہے ہیں میں سمجھ نہیں سکتا کہ جس کے اثر سے فوجی سپاہیوں جیسے اجڈ اور بداخلاق لوگ اعلےٰ اخلاق کے مالک بن گئے وہ خود کس طرح پست فطرت کی طرف مائل ہو سکتا تھا۔ بقول بعض انگریز مورّخ بھی لکھ گئے ہیں کہ نپولین اپنی سلطنت کی بقا کے لئے کبھی بھی کوئی ایسا فعل نہ کرتا تھا جس سے رائے عامہ پر بُرا اثر پڑے۔ میں نے تو مشتے نمونہ از خروارے کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایک دو دو واقعات پر اکتفا کیا ہے۔ ویسے اگر اس قسم کے ان تمام واقعات کو لکھا جائے جو اس بلند مشرب انسان کو پیش آئے تو ایک خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

وہ چاہتا تھا کہ اپنی قوم کو ترقی کے ملاءِ اعلےٰ پر پہنچا دے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ عمر بھر ذاتی ترقی کے لئے کوشاں رہا۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم پُر زور الفاظ میں کہیں گے۔ کہ اُس کی ذاتی ترقی میں قومی ترقی کا راز پنہاں تھا۔ طبقۂ نسواں کو تہذیب آشنا کرنے کے لئے اُس نے جو تجاویز اختیار کیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اُس کی والدہ کی تربیت نے اُس کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا اسی لئے وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ فرانس کو احیاے قومی کیلئے بہترین ماؤں سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اُسکی بیوی کے قابلِ تقلید رویہ نے اس پر روز روشن کی طرح واضح کر دیا تھا۔ کہ طبقۂ نسواں کا مہذب عنصر سوسائٹی پر از حد شرافت نواز اثر پیدا کیا۔ کرتا ہے۔ اُس کی غیر معمولی وسعتِ معلومات نے اس کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا تھا کہ عورتوں کی مناسب تعلیم و تربیت ہی قومی بہبودی کی ذمہ وار ہے اور بنی نوع انسان کو ترقی کے منتہائے کمال تک پہنچا سکتی ہے۔ اُسے علم تھا کہ صنفِ لطیف کے پہلو میں ایک زبردست حساس دل ہے۔ اور جہاں غلط تعلیم اس اثر پذیر دل میں تباہ کن جذبات پیدا کر سکتی ہے وہاں صحیح تعلیم اس دل کو حقیقت آشنا بنا کر عورتوں کو زیادہ دلکش اور قومی و ملی لحاظ سے زیادہ مفید بنا سکتی ہے۔ چنانچہ بر سرِ اقتدار ہونے پر اُس نے تعلیم نسواں کیلئے جا بجا سکول کھولے اور نہایت مناسب نصابِ تعلیم منتخب کیا۔

جناب انور بی۔ اے

سمندر کی بیتاب موجوں سے

اس محیطِ بیکراں، اس تند رو سیلاب میں
ایک لمحے کا سکوں بھی ہے تمہیں ناساز گار
بے خطر وحشی چٹانوں سے وغا کرتی ہوئی
اف یہ ساحل کی خموشی یہ روپہلی چاندنی
چاندنی کا روح پرور رقص فرشِ آب پر
یہ مناظر گدگداتے ہیں رگِ جذبات کو
لیکن ان کی دلربائی کا نہیں تم پر اثر
اُٹھتی ہے یہ آرزو میرے دلِ بیتاب سے
میں تمہاری گود سے لپٹا ہوا بہتا چلوں

آہ تم آٹھوں پہر رہتی ہو پیچ و تاب میں!
رقصِ پیہم ہے تمہاری زندگانی کا شباب!
حادثاتِ زندگی کا سامنا کرتی ہوئی!
یہ پہاڑوں کی اداسی، یہ فضا کی دلکشی!
روشنی کے کپکپاتے دائرے گرداب پر
خوابِ غفلت سے جگا دیتے ہیں محسوسات کو
تم ہو اور اک جاوداں، لا انتہا ذوقِ سفر
کاش مل جاؤں تمہارے تند رو سیلاب سے
حادثاتِ راہ کی دشواریاں سہتا چلوں

لطف پا جاؤں کشاکش ہائے بے انجام کا
بھول جاؤں ماجرا بے مہریٔ ایام کا

جناب اختر اورینوی۔ ایم۔ اے

عرض

قسم ہے جادو نگاہوں کی مجھے تو نغمہ نواز کر دے
نظر ملا کے دل و جگر کو تو میرے یکسر گداز کر دے

ہے دردِ محزوں میں پھانس سی اور گرہ سی قلبِ فگار میں ہے
خموشیوں کو تبسمِ دلکشا سے آہنگِ ساز کر دے

تو بنکے موجِ شرابِ رنگیں، تمام عالم کو مست کر دے!
گرا کے اپنے قدم پہ مجھ کو تو لغزشوں کو نماز کر دے

جنونِ ارماں کا پاس کر کے اُلٹ دے رُخ سے نقاب اپنا
بصد ادائے عطا و بخشش تو اپنی آغوش باز کر دے

جو اپنی محبوبیت میں گم ہو وہ جانے کیا لذتِ تمنا
اے محوِ ناز و ادا کبھی تو خودی کو وقفِ نیاز کر دے

بڑھا دے شوقِ فزونئ ہمت جھلک ہی دکھلا کے دے تو
رگوں میں میرے جنون بھر کے تو سجدوں کو گل طراز کر دے

میری تو بنیا بیاں مسلّم، مگر یہ دل سے نظر کی سازش
تو اپنی کافر نگاہ سے کہہ کہیں نہ افشائے راز کر دے

ہے چشمِ دزدیدہ کا، مری نگاہِ بےباک آرزو ہے
دل و جگر کے تو پوچھ زخموں کو اور دامن دراز کر دے

یہ چشمِ بے گانہ وار و خود بیں ہے بے نیازی کا جام اختر
تو اپنے اندازِ بے خودی کو غریقِ مستئ ناز کر دے

جناب نذیر میرزا برلاس بی۔ اے (آنرز)

ایک ایکٹ کا ڈراما

بچپن

افراد تمثیل

دادا
ناجو معصوم بچہ
ننھا بوڑھا
اس کے تین دوست

سبزۂ دمیدہ
لالۂ خودرو
اشجار
خرگوش
غروب آفتاب کی پریاں

منظر پہلا:۔ وادی کے اِس پار۔ منظر دوسرا۔ وادی کے اُس پار۔ منظر تیسرا پھر وادی کے اس پار

پہلا منظر

وادی کے اِس پار ——— وقت دوپہر

(پہاڑی کی چوٹی پر اک صاف ستھرا جھونپڑا۔ وادی کا منظر دور تک نظر آرہا ہے۔ جھونپڑے سے ذرا ہٹ کر نیچے کو پیچ در پیچ راستہ گیا ہے جھونپڑا پیڑوں میں گھرا ہے۔

احاطہ میں پیڑوں کے سائے تلے ایک بوڑھا چارپائی پر سو رہا ہے۔ چارپائی کی اس طرف ایک ننھا بچہ نظریں آسمان پر جمائے پشت کے بل گھاس پر لیٹا ہے۔ اردگرد کھلونے بکھرے پڑے ہیں۔ ان کا خرگوش۔ گیند۔ کاٹھ کا گھوڑا وغیرہ اُس پار راستہ پھر سبز سبز جھاڑیوں سے گزرتا اوپر کو جاتا ہے)

ناجو۔ (چونک کر) [illegible]

دادا۔ (آنکھیں بند کئے) کیا ہوا ناجو!

ناجو۔ ہمیں ایک بات بتایئے؟

دادا۔ اب اور کیا یاد آیا؟

ناجو۔ میں دیر سے سامنے کی سفید سفید بدلی کو دیکھ رہا ہوں۔ بڑی دیر سے۔ ایک۔ دو تین گھنٹے گذر گئے۔

دادا۔ (پیار سے) جھوٹا کہیں کا۔ تم تو ابھی ابھی آکے یہاں لیٹے۔ یہی پانچ منٹ ہوئے ہونگے۔

ناجو۔ (سنی ان سنی کر کے) یہ بدلی پہلے پہلے ابا جان کے چہرے کی طرح تھی۔ اب ہمارے پڑوسی کا کتا بن گئی ہے۔ دادا جان! آخر اس کی شکلیں کون بدلے جا رہا ہے؟

[illegible]

ناجو۔ ہوا! ہوا بدلی کی شکل کیونکر بدل سکتی ہے؟

دادا۔ ہوا ہی تو اسے لئے لئے پھرتی ہے۔

ناجو۔ وہ کیوں؟ (دادا کروٹ بدلتا ہے) دادا میاں! دادا میاں!!

(دادا غصہ میں پھر کروٹ بدلکر سیدھا ہو جاتا ہے) ہمیں ایک بات بتا دیجئے! کل جب اس چٹھی رساں نے آپکو نیلا سا خط تو دیا آپ کے آنسو پھوٹ آئے اور رخساروں پر بہ نکلے۔ آپنے ہمیں نہ پوچھا۔ دادا جان! آپ رونے میں کچھ بڑے بڑے نظر آرہے تھے۔ کیوں؟ دادا میاں! ابا جان آخر گھر کیوں نہیں لوٹتے؟

دادا۔ ناجو!

ناجو۔ جی دادا جان۔

دادا۔ میاں آؤ (بچہ اٹھکر قریب آتا ہے) اور قریب آؤ... ذرا اور... بیٹا۔ میں بوڑھا ہوں۔ اب میری آنکھیں صاف نہیں دیکھ سکتیں۔ بس۔ میاں کھڑے ہو جاؤ۔ (بچے کے ننھے ننھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے) ناجو! تم مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھو۔ ایک نہ ایک دن خود بخود یہ تمہاری سمجھ میں آجائیں گی۔ اب نہیں۔

ناجو۔ اچھا بڑے میاں یونہی سہی لیکن جب ہم بڑے ہو جائیں گے تو آپکو بتانا ہوگا۔ بتایئے گا نا؟

دادا۔ (فرط محبت سے بچے کے ہاتھ دباتا ہے) بیٹا ناجو! جوان ہونے تک سب باتیں تمہاری سمجھ میں آجائیں گی لیکن میری آواز تمہارے کانوں تک نہ پہنچے گی۔ ہر کسی کو ایسی باتیں خود سمجھنی چاہئیں بیٹا! اچھا بھاگ جاؤ۔ وہیں جاکر کھیلو لیکن اب اور کچھ...

ناجو (واپس جاکر اون کے کھلونے سے کھیلنے لگتا ہے اور پھر اچانک) دادا جان! (خاموشی) دادا جان!

دادا۔ ہاں۔

ناجو۔ ایک بات اور بتا دیجئے... صرف ایک بات۔ اچھے دادا میاں!

دادا۔ اچھا کہو۔

ناجو۔ (غور سے وادی کے اس پار دیکھتے ہوئے لیٹے لیٹے دادا کی طرف کھسکتا ہے) دادا جان! کبھی آپ نے اس ننھے بوڑھے کو دیکھا جو وادی کے اس پار رہتا ہے۔ ان گھنے پیڑوں کے سائے میں... آپ جب اس طرف دیکھتے ہیں وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ میں اُسے ہر روز دیکھتا ہوں۔

دادا۔ ناجو! تمہارے اتنے سے سر میں کتنے خیال سما رہے ہیں ذرا چپ ہو جاؤ۔ مجھے سونے دو (کروٹ بدلتا ہے) اور ہاں دیکھو ناجو۔ تم کو وادی کے اس پار نہیں جانا۔

ناجو۔ (اون کا کھلونا ہاتھ میں لئے کھیل رہا ہے۔ اور خود سے باتیں کر رہا ہے)

بہت اچھا لیکن جب ابا گھر آئیں گے ہم اُن کے ساتھ ضرور وہاں جائیں گے۔ کل آپا ہم سے کہہ رہی تھی۔ ابا جان بڑے بڑے لوگوں کو تیغ کے گھاٹ اتارنے گئے ہیں۔ ہماری کتاب میں اس طرح کی بہت سی تصویریں ہیں۔ سچ کہوں تو وہ جھوٹ بک رہی تھی۔ ابا کبھی کسی کو دکھ نہ دیں گے ہم جب کبھی اُنکے ساتھ سیر کو گئے انہوں نے راستے میں پڑے پیارے پرندوں کو اٹھا لیا چشمہ پر لے گئے۔ پانی پلایا۔ پر دھلائے

اور وہ سنبھلتے ہی پھر سے اڑ گئے۔ جب ہم گھر کو لوٹے درختوں کی شاخوں پہ بیٹھے بیٹھے انہی پرندوں نے ہمیں گیت سنائے
(لیٹے لیٹے گیت گنگناتا ہے)

ابا گھر کو آئیں گے! اور ہم وادی کو جائیں گے
خوشی سے ناچیں گا ئینگے
چڑیاں منگل گائیں گی ہم کو گیت سنائیں گی

(وقفہ)۔

یہ وادی یہ جنگل سارے یہ نظارے پیارے پیارے
یہ میرے ہیں سب میرے ہیں

(بچہ بڑی محویت سے گیت گائے جا رہا ہے۔ وادی کے اس پار درختوں کے جھنڈ میں سے ایک ٹیلے پہ ننھا بوڑھا کھڑا نظر آتا ہے۔ ناجو کھلونا ہاتھوں میں لئے گائے جاتا ہے۔ اچانک اس کی نگاہ وادی کے اس پار جاتی ہے۔ بوڑھا نظر آتا ہے۔ کھلونا اس کے ہاتھوں سے گر جاتا ہے وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا ہے۔ **وقفہ**۔ بوڑھا نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ بچہ بے تحاشا دادا کی طرف دوڑتا ہے) دادا جان!

(دادا نیند سے چونک پڑتا ہے) ننھا بوڑھا۔ ننھا بوڑھا۔ (وادی کی طرف دوڑتا ہے) دیکھئے۔ دیکھئے۔ وہ کھڑا ہے صاف دکھائی دے رہا ہے۔ دیکھئے تو وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا ہے۔

دادا۔ (آنکھیں ملتے ہوئے) ناجو!... نا— جو!! یہاں آؤ (بچہ پلٹ آتا ہے) ناجو، تم کو وادی کے اس پار نہیں جانا۔ سایہ میں بیٹھ کر کھلونوں سے کھیلو اور ہمیں نیند میں بے آرام نہ کرو۔

(دادا کروٹ بدل کر خراٹے لینے لگتا ہے۔ بچہ کھسکتے کھسکتے وادی کی طرف جاتا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے کہتا جاتا ہے "ابھی آیا"۔ کچھ سوچ کر واپس آتا ہے اور سب سے بڑا اون کا کھلونا ساتھی کے طور ساتھ لیتا ہے اور نیچے اترنے راستہ پر ہولیتا ہے)

ناجو۔ ننھے بڑے میاں! ننھے بڑے میاں۔ میں آرہا ہوں۔
(وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں نظر نہیں آتا۔ اور ذرا دیر بعد اس پار کے راستہ پر اوپر چڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ اور پھر اچانک ......)

دوسرا منظر

وادی کے اس پار

(پیڑوں کے سائے تلے ایک چبوترے پر ننھا بوڑھا کہنی ٹیکے پاؤں پسارے لیٹا ہے۔ اس کے تینوں دوست آس پاس بیٹھے ہیں)

ننھا بوڑھا۔ یوں سمجھ رہا ہوں گویا آپ سے ملے صدیاں گزر گئیں کہئے آپ لوگ خیریت سے تو ہیں؟

پہلا دوست۔ شکریہ!

ننھا بوڑھا۔ میں آپ دوستوں کا بہت شکرگذار ہوں جو آپ میرے بلانے پہ تشریف لے آئے۔ سنئے میں نے آپکو کیوں تکلیف دی۔ چند روز ہوئے میں ایک شام چہل قدمی کو نکلا اور خود کو غروب آفتاب کا ایک حصہ سمجھ لیا۔ نسیم کی طرح دنیا میں ادھر ادھر گھوما۔ اس وقت ہر ایک دن بھر کی محنت کے بعد گھر کو لوٹتا ہے۔ بچے کھیل کود سے تھک کر ماؤں کی گود بسانے گھر آتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے تاریک سایوں کی آڑ لئے کوئی چھوٹا جھونکا آ کہیں سے ملا جاتا ہے۔ مجھے ہمیشہ

یہی وقت پسند رہا ہے لیکن اس شام جہاں کہیں گیا غم و آلام کو دیکھا میں خوفناک طوفان کی طرح گھر لوٹا۔ وہ وقت گیا یہ آیا مگر چین نہیں پایا۔ ممکن ہے یہ صرف وہم ہو اور یہی معلوم کرنے کے لئے آپ دوستوں کو تکلیف دی۔ فرمایئے کیا خیال ہے؟

پہلا دوست۔ کل کی بات ہے میں دنیا کے تماشا کو گھر سے نکلا۔ میں ان گھروندوں کی طرح بن گیا جن میں انسان بستے ہیں۔ آتشدانوں میں شعلے بنا۔ لپکا۔ اچھلا کو دا اور دیواروں پہ بڑے بڑے لرزتے ہوئے سائے بنائے۔ . . . بوڑھے آدمی چپکے چپکے ان سایوں پہ جھکے میں دبے پاؤں زینے پر چڑھ کر سونے کے کمروں میں سفید سفید چادریں بنا۔ میری سفیدی کو جوان جوان لڑکیوں نے حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ان کے ہونٹ لرزے کئی نام سننے میں آئے اور وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی مجھ سے لپٹ کر سو گئیں۔

دوسرا دوست۔ اور میں صحراؤں میں سنہری ریت ہو کر پھیل گیا۔ ایک ایک ذرّہ نظر میں آسمان پر گاڑے ستارہ رہا تھا۔ میں انسانوں اور حیوانوں کے قدموں تلے روندا گیا اور ان کا سُرخ خون میرے ذرہ ذرہ ذروں میں جذب ہو کر رہ گیا۔

تیسرا دوست۔ اور میں اک بحرِ ناپیدا کنار بنا۔ سر اٹھاتی موجیں بلند بلند سرکش چٹانوں سے ٹکرائیں۔ ہزار ہا قطرے ایک سنسناہٹ کے ساتھ فوارے کی طرح بلند ہوئے۔ میرے منہ سے جھاگ نکلی اور میں ہر طرف یوں دوڑتا پھرا جیسے لوا زنجیر توڑ کر بھاگ نکلتا ہے آخر تھک کر آدھی دنیا کا احاطہ کر کے لیٹ رہا سو [illegible]

سلوٹوں کو چوما۔ ہواؤں نے مجھ پہ ننھے پنکھا ور کئے۔ بڑے آہنی جہاز میری نیلگوں سطح پہ چلے جن میں سفر کرنے والے میرا الامحدود حسن سراہنے کو آنکھیں نہیں رکھتے تھے۔ بس آوارگی کے دوران میں مجھے علم تھا کہ میری تاریک گہرائیوں میں کتنی بربادیاں آرام سے رہی ہیں۔

ننھا بوڑھا۔ خوب! خوب! (وقفہ) تو گویا میں دنیا سے بہت پہلے کا جی رہا ہوں اور میں نے آج تک غم و آلام کے بادل اس طرح چھائے ہوئے نہ دیکھے اور نہ خود کو یوں بے بس پایا!

(دور سے ننھے ناجو کے گیت کی آواز آتی ہے۔ سب سنتے ہیں۔ ننھا بوڑھا کھڑا ہو جاتا ہے) ایک بات سوجھی — ایک بات — ٹھہریئے دکھائے پڑا آتا ہے۔ ناجو کے گانے کی آواز آ رہی ہے)

ناجو۔ دادا جان! دادا جان۔ وہ دیکھئے ننھا بوڑھا۔

(بوڑھا وہاں سے پرے ہٹ جاتا ہے۔ ناجو تیزی سے پہنچا ہے۔ ننھا بوڑھا اشاروں سے بلا رہا ہے)

ناجو۔ دادا جان! وہ دیکھئے۔ مجھے تو صاف دکھائی دے رہا ہے دیکھئے مجھے بلا رہا ہے۔

دادا۔ (وہیں سے لیٹے لیٹے) ناجو — ناجو۔ میاں آؤ (ناجو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے) ناجو! تم کو اس پار نہیں جانا۔ اپنے کھلونوں سے کھیلو۔ مجھے بے آرام نہ کرو۔ (ناجو کچھ دیر بعد اس پار جاتا دکھائی دیتا ہے۔ اون کا کھلونا بغل میں دابے ہے)

ناجو۔ ننھے بوڑھے میاں! میں یہ آ رہا ہوں (وہ بوڑھے کے پاس پہنچ کر دم لیتا ہے) [illegible]

ننھا بوڑھا۔ مزاج کیسے ہیں ناجو! اچھے تو ہو نا!

ناجو۔ (آگے بڑھتے ہوئے) اور آپکے مزاج کیسے ہیں بڑے میاں! یہ تو بتلایئے آپ نے یہ کیسے جانا ہے کہ میں ناجو ہوں۔

ننھا بوڑھا۔ یہ تو میں مدتوں سے جانتا ہوں۔ اُس وقت سے جب تم پیدا ہوئے۔ میں ہفتہ میں دو تین بار ہر رات کو سونے سے پہلے تمہیں خدا حافظ کہنے چلا آتا ہوں۔

ناجو۔ لیکن میں نے تو رات کے وقت آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔

ننھا بوڑھا۔ دیکھا تو شاید ہو مگر پہچانا نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ میں ٹمٹماتے چراغ کی لرزتی شعاعوں میں چھپ چھپا کر تمہارے سرہانے پہنچتا۔ تکیہ پر ہاتھ رکھتا اور تمہارے بالوں سے کھیلا کرتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ ادھر تمہارے دادا نے بتی مدہم کی ادھر میں چھلانگ لگا کر کرسی پر آیا اور وہاں سے اچھل کر چھت سے لٹک گیا اور تمہاری آنکھوں میں نیند کو آتے دیکھا۔ یوں آنکھیں پھاڑے پھاڑے کیا دیکھ رہے ہو کیا میرے کہے کا یقین نہیں؟

ناجو۔ اچھا! آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ دادا جان کب چراغ جلاتے بجھاتے ہیں لیکن اگر آپ یوں چھت سے لٹک لئے ہوتے تو میں نے ضرور دیکھ لیا ہوتا۔

ننھا بوڑھا۔ یہ بتاؤ کیا اب تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ (ناجو غور سے تکتا ہے) نظر تم نہ سمجھ گئے ہو میں اس پرانے گوشت جسم میں بالکل اسی طرح رہتا ہوں جیسے تمہارے دادا سامنے کے جھونپڑے میں ۔۔۔۔ یہ جسم پرانا سہی مگر مجھے بھلا لگتا ہے۔

ناجو۔ میں آپ کی پہیلی نہیں سمجھا ۔۔۔

ننھا بوڑھا۔ یہ ایسی پیچیدہ تو نہیں۔ تم کو چندے میرے ہاں رہنا ہے جب دادا کے پاس واپس جاؤ گے تو سب سمجھ جاؤ گے۔ ذرا ٹھہرنا۔ (پلٹ کر تینوں دوستوں سے) مجھے نئی نئی باتیں سوجھ رہی ہیں (پہلے دوست سے) خود سبزۂ رُوئیدہ کو آواز دینا۔ کہنا ایک بچہ اسکے سپرد کرنا ہے (پہلا دوست جاتا ہے) اور تم خود رو پھول اور خرگوش کو بلا لاؤ۔ ان سے بھی یہی کہیو (دوسرا دوست جاتا ہے) اور تم غروبِ آفتاب کی پریاں ساتھ لیتے آؤ۔ (تیسرا دوست جاتا ہے)

ناجو۔ بڑے میاں! اگر ہمیں سبق لینا ہے تو ہم نہیں لیں گے۔ ہماری آپا کہا کرتی ہے کہ ہم بڑے کند ذہن ہیں۔

ننھا بوڑھا۔ ذرا سنو تو (ناجو یوں چوکنا ہو جاتا ہے گویا جماعت میں ہے) کبھی سمندر کے کنارے گئے ہو؟

ناجو۔ جی ہاں۔

ننھا بوڑھا۔ کبھی دیکھا جب پانی اتر جاتا ہے تو چھوٹے چھوٹے گڑھے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ ساحل پر چٹانوں میں ۔۔۔

ناجو۔ جی ہاں۔

ننھا بوڑھا۔ ان گڑھوں میں بھی وہی پانی ہوتا ہے جو ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں۔ میری تمہاری زندگی بھی اسی طرح ہے جس طرح ہر کہیں ٹھاٹھیں مارتی زندگی۔ وہ ننھے گڑھے پھر اک دن سمندر میں مل جاتے ہیں۔ یہی ہمارا حال ہے۔

ناجو۔ بڑا مشکل سبق ہے یاد نہ ہو سکے گا۔

(لڑکی سبز لباس پہنے سامنے آتی ہے)

ننھا بوڑھا۔ آیئے آیئے میرے بچپن کے ساتھی ہیں آیئے ۔۔۔ ننھے کو سنبھالئے۔ آپکا تعارف کرا دوں۔ سبزۂ رُوئیدہ

۔ ۔ ۔ ۔ یہ ناجو صاحب ہیں۔

ناجو۔ (نہایت نرمی سے۔ ہاتھ ملانے کو قدم بڑھاتے ہوئے) مزاج اچھے ہیں آپ کے؟

سبزۂ کار روئیدگی۔ (تمکنت سے) خوب! خوب! آپ ہیں ناجو صاحب۔ ننھے تم کو بڑا اچھا وقت گزارنا ہے۔ تم بے اختیار دھرتی ماتا کی چھاتی سے لپٹ جاؤ گے۔ تم سورج کی شعاؤں اوس کے قطروں۔ ہوا کے جھونکوں۔ مینہ کی بوندوں اور رات کی تاریکیوں سے کھیلا کرو گے۔ درختوں کی جڑوں سے لپٹو گے۔ گھونسلوں کی تلاش لو گے۔ ننھے ننھے پرندوں کی گول گول آنکھیں تمہیں حیرت اور خوف سے دیکھیں گی۔ تم کہسار کی ندی سے رفتار کا انداز چرا لو گے۔ تم اچھلتی کودتی، ناچتی زندگی پر مرٹو گے۔ کیوں میرے ننھے! (ایک نازک اندام خوبصورت ہستی آتی ہے) لیلو! خودرو پھول آ گئے۔ میرے لاجوردی لبادے کا اک مجسم نغمہ ۔ ۔ ۔

لالۂ خودرو۔ (ناجو کا ہاتھ اپنے نازک ہاتھوں میں لیتے ہوئے) تمہاری روح میری روح میں جذب ہو جائے گی۔ میں تمہیں ان کھیتوں۔ میدانوں۔ جنگلوں میں بکھیر دونگا۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مسرت کیا ہوتی ہے۔ وہ مسرت جو دنیا کو حسین بنانے کی سعی سے حاصل ہو (روحِ اشجار آتی ہے)

روحِ اشجار۔ ننھے میں اشجار کی روح ہوں۔ آؤ میرے ساتھ آؤ تمہیں تن کر کھڑا ہونا سکھا دوں۔ تمہارے قد و قامت میں حسن ہوگا اور لطافت۔ تم غرور سے آسمان کو دیکھا کرو گے اس نیلی چھت کی صنعت پر تمہیں حیرت ہوگی۔ زمین کی لمبی لمبی مضبوط انگلیاں تمہارے پاؤں کو تھامے رہیں گی تم اپنے بازو کھول دو گے۔ تمہاری خمیدہ انگلیاں آپ سے آپ سیدھی ہو جائیں گی۔ ہوا کے جھونکے تم سے آنکھ مچولی کھیلیں گے۔ اور روپہلے بادل آ آ کر تمہیں چوم لیں گے تمہیں محسوس ہوگا کہ زندگی تم میں حرکت کر رہی ہے۔ اور شاخوں کی اوٹ میں سے ننھے ننھے پرندوں کی طرح طرح کی بولیاں سنائی دیں گی ـــــ اور ـــــ

(اچھلتی کودتی ایک گول مول شے بڑھتی آتی ہے)

ننھا بوڑھا۔ یہ آیا تمہارا پرانا دوست میاں خرگوش۔

خرگوش۔ (اچھل اچھل کر) ننھے تم جلد ہم میں سے ایک ہو جاؤ گے کبھی اتنی آزاد۔ اتنی معصوم چیز دیکھی تم نے؟ (ایک دو قلابازی لگا کر ناجو کے قدموں میں آ جاتا ہے) تمہیں خوشیاں دیجائیں گی آنکھ کی۔ ناک کی۔ کان کی اور پھر ان کے چھوٹے چھوٹے تالاب ـــــ ہلکی ہلکی چاندنی ـــــ بھیگی بھیگی راتیں ـــــ پچھلی رات کی نرم رو ہوائیں۔ آہاہا۔ ایسی زندگی ایک ابدی راحت ہے! میرے ننھے!

ناجو۔ لیکن ہمارے پڑوسی کا وہ بڑا سا کتا کہاں ہوگا؟

خرگوش۔ تم بڑے شریر ہو ننھے! وہ بوڑھا کھوسٹ کتا۔ ہم اس سے نہیں ڈرتے۔ ہم چھپائیں مائیں ہونا جانتے ہیں یہ گھنی گھنی جھاڑیاں ہماری سہیلیاں ہیں۔ وقت پڑے یہ ہمیں اپنے دامن میں چھپا لیتی ہیں۔ کتا ہمیں کیا پکڑیگا اور عقاب ۔ ۔ ۔ آہاہا۔

ناجو۔ نا بابا۔ ہم باز آئے خرگوش بننے سے۔ ہر کوئی ہمیں کھانے دوڑے گا۔ کہیں جان ہی سے نہ جائیں۔

ننھا بوڑھا۔ ڈر کس کا ہے تمہیں ہم یہ نہ بتائیں گے کہ جان سے

جاناکیا ہوتا ہے۔

ناجو۔ بڑے میاں! ہمیں ایک بات بتاؤ۔ دادا جان تو ٹال دیتے ہیں۔ یہ سب خرگوش مرنے کے بعد کہاں جاتے ہیں۔

ننھا بوڑھا۔ وہاں جہاں کوئی انہیں ستا نہیں سکتا (یوں آواز سنائی دیتی ہے گویا بہت سے ہم عمر بچے کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں) لو وہ آگئیں۔ اب ہم کوچ کر دینگے۔

ناجو۔ کون آگئیں اور کہاں کوچ ہوگا؟

ننھا بوڑھا۔ غروب آفتاب کی پریاں! اور کون... کوچ! تمہیں پَر لگ جائیں گے۔ اُڑ کے آسمان کی رنگینیوں میں پہنچ جاؤ گے اور وہاں سے سورج کے اس پار اترنے کا منظر دیکھو گے اور پھر یہ پریاں! ادھر اُدھر تمہیں لئے لئے پھریں گی ننھے سے انسان زادے عظیم الشان زندگی کی ننھی ننھی خوشیوں سے تمہیں واقف کرنا چاہتا ہوں۔ تم کو جاننا ہے کہ ننھی کلی سے لیکر بڑے بڑے درخت تک سب حسن ہے۔ میں تمہاری واپسی کا انتظار کرونگا۔

(غروب آفتاب کی پریاں ناجو کو گھیر لیتی ہیں۔ وہ ننھی ننھی چڑیاں ہیں۔ ہر ایک کا لباس الگ الگ رنگ کا ہے۔ سب رنگ مل کر غروب آفتاب کا سماں باندھ دیتے ہیں۔ ایک جو ذرا بڑی ہے گویا ہوتی ہے)

ایک پری۔ میں ہر طرف دوڑتی پھروں گی۔ ہر طرف۔ آخر بدلیوں میں چھپ جاؤں گی۔ ہوا کو حکم دوں گی کہ بدلی میں میرا بچھونا تیار کرے۔ میں اس میں آرام لوں گی جہاں سے لیٹے لیٹے دن ڈھلنے کا نظارہ دیکھوں گی۔

ہم سب ملکر سورج کو گھیر لیں گی جب وہ شفق کا لباس اتار کر شب خوابی کے کپڑے پہنے گا۔ بن کے اس پار ایک دریا بہہ رہا ہے میں اس کے شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھونگی اس میں غوطہ لگاؤں گی... اور... اور..

ننھا بوڑھا۔ اُڑو۔ ننھی پریو! اُڑے جاؤ سبھی۔

سب پریاں ملکر۔ یہ اڑیں۔ یہ اڑیں۔

(چھ اڑتی ہیں کئی رنگ متحرک نظر آتے ہیں اور آخر مغرب کی جانب آسمان پہ چھا جاتے ہیں)

ننھا بوڑھا۔ باقیوں سے) یوں! یوں جی کھول کر کھیلو۔

(سب اچھلتی کودتی آسمان کی ہر طرف چھا جاتی ہیں ننھی پریو! بدلیاں تمہاری منتظر ہیں (سب نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں) کل شام کی طرح تمہیں سب کے آخر ہوئیں بکھیرنے کو کھڑی ہیں۔ بڑھو۔ بڑھو۔ اور دنیا پہ چھا جاؤ۔

(اب ننھا بوڑھا اور ناجو تنہا رہ جاتے ہیں)

ننھا بوڑھا۔ اور اب ناجو؟

(ناجو پھوٹ پھوٹ کے رو دیتا ہے)

ناجو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤنگا۔ مجھے ڈر آ رہا ہے۔ تم عجیب عجیب باتیں کرتے ہو میں کچھ نہیں بننا چاہتا۔ میں ناجو ہی اچھا ہوں۔

ننھا بوڑھا۔ ناجو بیٹا ڈر گئے۔ تم تو بڑے دلیر ننھے تھے۔

ناجو۔ میں دلیر ولیر نہیں۔ میں صرف ناجو ہوں۔

ننھا بوڑھا۔ دم بھر کے لئے آنکھیں بند کرو۔ (ناجو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لیتا ہے۔ ننھا بوڑھا پلٹتا ہے تو اک حسین چھوکری بن جاتا ہے)

چھوکری۔ ادھر دیکھو۔ ناجو۔

ناجو۔ (تعجب) وہ ننھا بوڑھا کیا ہوا؟

چھوکری۔ وہ تمہیں بھیرت سے چھوکرتے گئے تو آؤ ناجو! اس پار چلیں
(اور تم تو جانتے ہی ہو) آؤ میرے ساتھ آؤ۔

ناجو۔ (رک رک کر) چلو۔۔۔

(وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے ہنستے کھیلتے اس پار جاتے ہیں)

تیسرا منظر

پھر وادی کے اس پار

(دادا ابھی تک خراٹے لے رہے ہیں۔ ناجو دور سے پکارتا ہے)

ناجو۔ دادا میاں! او دادا میاں!!۔۔ دادا!!! (دوڑ کر قریب آتا ہے اور شانہ جھنجوڑتا ہے) اٹھیے، جاگئے۔ آپ تو سوئے ہی جا رہے ہیں ابھی تک۔

دادا۔ کیا ہوا، کیا ہوا ناجو (آنکھیں ملتے ہوئے) ابھی تو آنکھ لگی ہے، پل بھر ہوا ہوگا، تم بڑے شریر ہو، نہ خود سوؤ نہ ہمیں سونے دو۔ ابھی تو جانے کا وقت بھی نہیں ہوا۔

ناجو۔ دادا میاں! اتنا نہ سوئیے، بیمار ہو جائیے گا۔ بھلا آپ بتائیے ہم کہاں کہاں پھرے۔ کیا کیا دیکھا۔ بتائیے، بتائیے نا۔

دادا۔ کیا ہو گیا تمہیں ناجو!

ناجو۔ میں وادی کے اس پار گیا تھا۔

دادا۔ (غصے سے) ناجو!

ناجو۔ ہاں ہاں۔ اللہ قسم اس پار گیا۔ کبھی شکلیں بدلیں، اڑ گیا، آسمان پر گیا۔ بڑا درخت بنا، اس کی ننھی ننھی شاخیں بالکل ناگن سی۔۔۔ کھیت بنا، کھیت ہی کھیت۔۔۔ اس میں گھاس ہو کر اگا۔۔۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ ننھی چھوکری میری عمر کی ساتھ ساتھ رہی۔ میٹھی میٹھی باتیں کر کر رہیں۔۔۔ اللہ قسم مجھ سے ۔۔۔

دادا۔ (جی ہی جی میں ڈرتے ہوئے) ناجو! تم سو گئے تھے، کیا خواب دیکھا۔

ناجو۔ (وادی کو رخ کرتے ہوئے۔ گویا کچھ سنا ہی نہیں) وہ کھیت (اشارے سے) ان کا سبزہ۔۔ وہ جنگل، سفید سفید ندیاں۔۔۔ نیلی نیلی پہاڑیاں۔۔۔ سب میری ہیں۔

دادا۔ (حیرت سے) ناجو۔

ناجو۔ ہاں۔ ہاں سب میری ہیں کیونکہ میں انہیں چاہتا ہوں۔ ان سے محبت کرتا ہوں۔ اور ننھی چھوکری بھی تو یہی کہہ رہی تھی۔ کسی کو اپنا کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ الفت کیے جاؤ، محبت کیے جاؤ اور میں محبت کرتا ہوں ہر شے سے محبت کرتا ہوں۔ بہت بہت دادا جان۔ کبھی کسی چیز کو آپ نے اتنا چاہا کہ وہی ہو گئے۔ ابا۔۔ امی۔۔۔ اوہو! یاد آیا ننھا بوڑھا میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس نے یہی کہا تھا۔

(وہ دوڑ کر کنارے پر جاتا ہے اور غور سے اس پار نظر دوڑاتا ہے۔ وہاں تو کوئی نہیں۔ لیکن ننھے بوڑھے کی آواز سنائی دیتی ہے)

ننھا بوڑھا۔ دوستو! **تینوں دوست۔** فرمائیے!

ننھا بوڑھا۔ خوب سوچیے۔ اس سرزمین میں جائیے۔ جہاں انسان بستے ہیں۔ ہر ملک، ہر قوم اور ہر گھر میں جائیے اور ننھے ننھے معصوم بچوں کو یہی سبق دیجیے جو ابھی ابھی اس ننھے کو دیے گئے ہیں۔ صرف ننھوں کو۔۔ بڑوں کو نہیں وہ اسے حماقت خیال کریں گے۔ جائیے۔ خدا حافظ۔

تینوں دوست۔ اچھا۔ خدا حافظ۔

(ان کی آوازیں مدھم ہوتے ہوتے سنائی نہیں دیتیں۔ معلوم ہوتا ہے صرف ہوا سرگوشیاں کر رہی تھی)

ناجو۔ (اپنے بازو پھیلا دیتا ہے) یہ سب۔۔ یہ سب میرے ہیں سب دنیا ۔۔۔ [illegible]

جناب اختر انصاری

غزل

عشق کرتے تھے گلعذاروں سے — دشمنی ہوگئی بہاروں سے
کھیلتا ہوں ہواؤں سے دن بھر — باتیں کرتا ہوں شب کو تاروں سے
عیش و عشرت کے تذکرے نہ کرو — نامرادوں سے غم کے ماروں سے
ہاں کہو جا کے داستانِ الم — خوش نصیبوں سے کامگاروں سے
سن لو جا کے شکستِ دل کا حال — سازِ مطرب کے ٹوٹے تاروں سے
اب کے فصلِ بہار کیسی رہی — پوچھئے پیرہن کے تاروں سے

کہدو اختر جو دل پہ گزری ہے
کیوں چھپاتے ہو بات یاروں سے

غزل

دل لگانا بہت بُرا ہے، مگر — کیسے بدلوں میں اپنی فطرت کو
غم سے نالاں ہوں عیش سے بیزار — ہائے کیا ہوگیا طبیعت کو
جس میں دھڑکا لگا رہے غم کا — کیا کروں لے کے ایسی راحت کو
چاندنی رات میں قرار کہاں — چوٹ کھاتی ہوئی طبیعت کو

شب کو روتا ہوں بے سبب اختر
آگ لگ جائے ایسی عادت کو

سید احسن مولائی بی۔اے (علیگ)

عہدِ وسطیٰ کا ایک ماہرِ معاشیات حکمراں[1]

الکاتت[2] خاں کی سلطان علاؤالدین خلجی کو قتل کرنے کی سعی ناشکور اس کے بھانجوں عمر خاں[3] اور منگو خاں کی تخت پر ناجائز تصرف کرنے کی ناکام کوشش اور حاجی مولا کی جو کہ فخرالدین کوتوال کا غلام تھا ہولناک بغاوت[4] ان تمام چیزوں نے علاؤالدین کے طمانیتِ قلب میں بڑی حد تک ایک ہلچل ڈال دی تھی۔ اور اس کو مجبوراً یہ خیال تبدیل کرنا پڑا تھا کہ اس کی سلطنت میں ہر طرح کا امن و سکون ہے۔ اسی امن و سکون کی غلط فہمی کے زیر اثر وہ کلیتہً دیگر فتوحاتِ ملکی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا لیکن یہ حالت دیکھ کر اس نے ترقی سلطنت کے دوش بدوش اندرونی امن کی طرف بھی توجہ کو مبذول کرنا شروع کر دیا جس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ امراء و عمائدین کی بڑھتی ہوئی دولت و طاقت کو جو انہوں نے ابتدائے عہدِ خلجی میں حاصل کر لی تھی۔ صرف روکا ہی نہ جائے بلکہ اس کا قلع قمع بھی کر دیا جائے۔ لیکن عمائدین و امرا کی قوت کو ختم کر دینا یا ان کی دولت کو سلب کر لینا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اس کے لئے تکمیل کانٹے سے درست ایک لشکرِ جرار کی ضرورت تھی جو ان طاقتوں کو پامال کرنے ہی کے کام نہ آئے، بلکہ جس کا بذاتہٖ رعب و داب اس قدر اثر انگیز ہو کہ کسی امیر کو سر اٹھانے کی ہمت ہی نہ ہو سکے۔

سلطان علاؤالدین کے عہد سے قبل اور اب اس کے عہد میں بھی مغل حملوں نے ساری شمالی ہند کی حکومتوں میں تشویش کی لہر دوڑا دی

---

[1] اس مضمون میں حسب ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔
(۱) ڈاکٹر ایشوری پرشاد آف الہ آباد History of Mediaeval India
(۲) ٹامس Chronicles of the Pathan Kings of Delhi
(۳) تاریخ ہند حصہ سوم۔ مطبوعہ کیمبرج پریس (۴) تاریخ ہند۔ مصنفہ اسمتھ۔ (۵) تاریخ ہند۔ مصنفہ ٹاڈ
(۶) شعبہ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی The Journal of Indian History Vol
(۷) ڈاکٹر اسپیز آف علیگڑھ Arabic Literature of India
(۸) ہندوستان میں مسلمانوں کا دستور رہی۔ مصنفہ مورلینڈ (اس کتاب کا راقم الحروف نے ترجمہ بھی کیا ہے) (۹) آئین اکبری
(۱۰) تاریخ علائی مصنفہ حضرت امیر خسروؒ (۱۱) تاریخ فرشتہ (۱۲) تاریخ فیروز شاہی مصنفہ برنی (۱۳) طبقات اکبری مصنفہ نظام الدین
(۱۴) وصاف (۱۵) مسالک الابصار۔

[2] سلطان کا بھتیجا تھا۔ جس نے پانی پت کے میدان میں جبکہ علاؤالدین تھنبور کی طرف جا رہا تھا۔ شکار کھیلتے وقت سلطان کو زخمی کر دیا۔ سلطان نے برافروختہ ہو کر گردن زدنی کا حکم دیدیا۔

[3] ہمشیر زادے تھے۔ ان کو بدایوں اور اودھ کی جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں نے سلطان کے خلاف بغاوت کر کے تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر گرفتار ہوئے اور سلطان کے حکم سے دونوں کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔

تھی۔ یہ لوگ جس وقت چاہتے آتے اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک یا ایک سمت سے دوسری سمت تک تاخت و تاراج کرتے، لوگوں کو لوٹتے، اور ان کے مکانوں کو تباہ کرتے چلے جاتے اس سے رعایا ہی کی حالت ابتر نہیں ہوتی تھی، بلکہ خود راعی کو بھی ایک قسم کا دھچکا لگتا تھا۔ طرغی مغل کا دہلی کا ناگہانی حملہ اور مسلسل محاصرہ اسقدر ہیبت انگیز ثابت ہوا تھا کہ اس کے دور کرنے میں کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہو سکی تھی۔ لیکن علاؤالدین کی خوش بختی سمجھئے یا کچھ اور کہ جلد ہی یہ بلا ہندوستان چھوڑ کر اپنے وطن کو مراجعت کر گئی۔ مورخین میں آج تک یہ مسئلہ وجہ النزاع ہے کہ محاصرہ کیوں اٹھا لیا گیا۔ جبکہ بقول برنی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ کہ اگر مغل سردار صرف ایک ماہ محاصرہ جاری رکھتا تو دہلی کو اس سے محفوظ رکھنا قطعاً ناممکن تھا[1]

[1] طرغی کے دہلی کا محاصرہ اٹھا لینے اور واپس چلے جانے پر طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں کی گئی ہیں۔ برنی نے اسکی وجہ محصورین کی دعائیں اور انکے آنسو بتلایا ہے۔ فرشتہ اور نظام الدین احمد نے اسے حضرت نظام الدین اولیاء کی کرامات کا ایک کرشمہ بتایا ہے۔ امیر خسرو کا یہ قول ہے کہ طرغی نے ایک ہیبت ناک خواب دیکھا تھا جسکی رو سے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ تاریخ کی روشنی میں ان وجوہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ صحیح بات اصل میں یہ تھی کہ طرغی دہلی پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ دارالسلطنت کو جلد ہی اپنے قبضے میں کر لے۔ اسوقت علاؤالدین رنتھمبور کے محاصرے میں مصروف تھا۔ اس اطلاع کے پہنچتے ہی وہ فوراً مع اپنے لشکر کے دارالسلطنت کو لوٹ پڑا۔ اور قبل اسکے کہ طرغی اپنے کسی ارادے کی تکمیل کرے پایۂ تخت میں پہنچ گیا۔ طرغی نے متواتر کئی حملے کئے۔ لیکن ہر مرتبہ اسکی فوج کو ہٹنا پڑا۔ شاہی لشکر پر قابو پا لینا آسان نہ تھا مجبور ہو کر اس نے دہلی کا محاصرہ شروع کر دیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد طرغی کو اتفاقیہ یہ خیال پیدا ہوا کہ مبادا سلطان کی فوجیں ملتان سمانہ اور دیپالپور کی سمت سے اسکی راہ فرار مسدود کر دیں اور اسکی پشت پر حملہ کر دیں پھر تو اسکو کہیں بھاگنے کا بھی راستہ نہ ملیگا۔ چنانچہ اس خیال کے آتے ہی وہ فوراً محاصرہ اٹھا کر وطن کو واپس چلا گیا۔ کچھ مورخین یہ کہتے ہیں کہ طرغی سامان رسد کم ہو جانے کی وجہ سے چلا گیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ برنی طرغی کے حملہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔ "سواد شہر تا چبوترہ سبحانی و موری و ہوبی و بر سر حوض سلطان می رسیدند و جامہا و غلہ کو در فرود می آمدند و شراب ہا می خوردند و غلہ و عہاب از انبار ہائے سلطانی بنرخ ارزاں می فروختند"۔ اس عبارت کی نقل کرنے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اسکو غلہ اور سامان رسد کی کسی وقت بھی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ انکا ان چیزوں کی افراط ہوتی تھی کہ وہ کبھی بیچنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتے

حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی عسکری طرز حکومت کے لئے ایک باقاعدہ عظیم الشان لشکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ حکومت کا اثر قائم رکھا جا سکے بغاوتوں اور سازشوں کو دبایا جا سکے فتنہ و فساد کے بیخ و بن کو اکھاڑا جا سکے۔ اور فتوحات ملکی میں اس سے مدد لی جا سکے۔ تمام گذشتہ حکومتیں عسکریت ہی کی بنیادوں پر قائم رہی ہیں ورنہ آئے دن ان کے شیرازے بکھرتے رہا کرتے۔

ان حالات میں علاؤالدین نے ایک زبردست فوج ترتیب دینے کا عزم بالجزم کر لیا۔ ایسی فوج رکھنے کے لئے لامحالہ کثیر روپیہ کی ضرورت تھی۔ یا اگر روپیہ بہم نہ پہنچ سکے تو کوئی ایسی تدبیر ضروری تھی جس سے ایک طرف تو روپیہ کی وقت بے وقت کی ضرورتوں کے لئے بچت ہوتی اور دوسری طرف اخراجات پورے ہوتے رہتے۔ چنانچہ ان دونوں چیزوں کا تناسب قائم رکھنے کے لئے یہ کیا گیا کہ فوجی ملازمین کی تنخواہوں اور اخراجات کو ایک مقررہ حدود کے اندر لایا گیا۔ ایک سپاہی کی تنخواہ[1] ۲۳۴ تنکہ مقرر ہوئی لیکن اگر وہ دو گھوڑے رکھتا تھا۔ تو اس کو ۷۸ تنکہ مزید ملتے تھے[2] لیکن یہ تنخواہ سپاہیانہ زندگی کے اخراجات کی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور نہ ہی اس میں سپاہی کے گھوڑے کا پورے سال تک خرچ چل سکتا تھا۔

ان خارجی اسباب کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ دیکھیں گے

[1] فرشتہ کا خیال ہے کہ فوجی ملازمین کی قلیل تنخواہوں کا تخیل علاؤالدین نے عہد چنگیزی سے لیا تھا جو تھوڑے روپیہ میں بڑی فوج رکھ سکتا تھا۔ ورنہ چنگیز خاں کے ساتھ جتنی فوج تھی اگر اس کی بڑی بڑی تنخواہیں ہوتیں تو اسکے لئے فوج رکھنا ناممکن ہو جاتا۔

[2] برنی کے الفاظ یہ ہیں۔ جو واضح نہیں مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ "دو صد و سی و چہار تنکہ مرتب دہم و ہشتاد و ہفت تنکہ بدو اسپہ دہم" لیکن اسکا مطلب یہی ہے کہ اصل تنخواہ یعنی ۲۳۴ تنکہ کے علاوہ دو گھوڑے رکھنے والے کو ۷۸ تنکہ مزید دیا جاتا تھا جو تنخواہ کے علاوہ ہوتا تھا۔

کہ ایک اور چیز بھی سرگرم عمل تھی جس وقت علاؤ الدین خلجی سریر آرائے سلطنت ہوا اس نے کسی حکمت عملی کی خاطر یا اپنی مخیر طبیعت سے مجبور ہو کر شاہی خزانہ کو ہر کہ و مہ کے لئے عام کر دیا تھا۔ لوگوں پر انعام واکرام کی اس قدر بارشیں ہوئی تھیں۔ کہ سلطنت بھر میں سونے چاندی کا ایک سیلاب سا نظر آتا تھا۔ غریب سے غریب انسان کے دل میں روپیہ کی ذرا بھی وقعت نہیں رہی تھی۔ سونا جیسی چیز ایک بے حقیقت شئے گردانی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ کی افراط نے اشیا میں تفریط پیدا کر دی۔ اور معمولی سے معمولی چیزیں زیادہ سے زیادہ داموں پر فروخت ہونے لگیں میرے خیال میں روپیہ کو اس قدر ارزاں کر دینا علاؤ الدین کی زبردست معاشیاتی غلطی تھی۔ اور اگر وہ اس غلطی کو کبھی محسوس کرتا تو شاید اس کو حکومت کا قائم رکھنا بھی مشکل ہو جاتا۔ حالانکہ انعام اکرام دشمنوں کا منہ بند کرنے ہی کے لئے دیئے گئے تھے۔

فوجی ملازمین کی ناکافی تنخواہوں اور گرانیٔ اشیا نے علاؤ الدین کو ایک زبردست ماہر معاشیات ثابت کیا ہے۔ وہ بہر حال فوج رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اس وجہ سے مجبور ہو کر وہ طریقۂ عمل اختیار کیا جس کی آج دنیا مداح ہے لیکن نہیں۔ وہ معاشیات اور اصولِ معاشیات کو سمجھتا تھا۔ وہ ان کی نزاکت اور انکے استعمال کو بھی جانتا تھا۔ وہ اس سے بھی واقف تھا کہ اس کی معمولی سی لغزش معاشرت کا سارا شیرازہ بکھیر دے گی۔ ورنہ اس کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ اور زیادہ انعام واکرام کے دروازے کھول دیتا۔ اور بات بات پر روپیہ لٹایا کرتا جبکہ بقول مورخین اس نے جہاں حملہ کیا وہاں لوٹ کی اور کروڑوں روپیہ اور منوں سونا چاندی حاصل کیا لیکن وہ سمجھتا تھا۔ کہ صرف روپیہ پر حکومت کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ روپیہ قائم چیز نہیں اور جب تک اس کو قیام نہیں سماج کا وجود بھی ہے۔ جس روز یہ قائم ہو گیا ایک طرف امیر و غریب، ضرورتمند غیر ضرورتمند کا فرق مشکل ہو جائیگا اور دوسری طرف احساسِ ذمہ داری کا فقدان بھی۔ اس لئے اسکی نظریں کسی مستقل، کسی اعلےٰ اور مستحکم انتظام کی متلاشی تھیں۔ اس کے سامنے ۳ صورتیں تھیں اور ان میں سے بہر کیف وہ کسی ایک پر عزم و استقلال سے عمل کر سکتا تھا۔ وہ صورتیں یہ تھیں۔

(۱) فوجی ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ

(۲) تنخواہوں کے صلے میں جاگیروں کے عطیے

(۳) نرخوں کی کمی اور انکا ایسی جگہ استقلال کہ ایک معمولی سا سپاہی بھی اپنی قلیل تنخواہ میں آرام سے زندگی بسر کر سکے۔

صورتِ اول سے یہ مراد تھی کہ وہ جلد ہی شاہی خزانہ کو خالی کر دے اور چند سال بعد وہ اس لشکر ہی کو خیرباد کہدے جس پر اپنی سلطنت کی بنیادیں رکھ رہا تھا۔ یا اس کو کسی وقت وہاں پہنچا دے۔ جہاں پہنچکر وہ اس پر ہاتھ صاف کرنے میں ذرا نہ چوکے۔ دوسری صورت کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوتا کہ ایک مجموعی حکومت کے حصے بخرے کر کے ایسے لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں جنکے اعتماد و وفا کا کبھی کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکا۔ اور خود ہی حکومت کو اس طرح کمزور کر کے تخت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ چنانچہ اسے مجبوراً تیسری شکل اختیار کرنی پڑی یعنی بازار کے نرخوں کی دیکھ بھال اور انکا انضباط اور یہی شکل ایسی تھی جو اس کی دور اندیشی کے علاوہ اس چیز پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

اگرچہ یہ چیز بہت سی طباع اور بالخصوص نوجوان اور جوشیلی طبائع کے خلاف ہوگی۔ مگر بزرگوں کا ہر قول کسی نہ کسی مخصوص تجربہ کا نتیجہ ہوتا تھا جس کی صداقت تجربے کے بعد ہی کھل سکتی ہے۔ پہلے نہیں۔

اس شکل پر بھی عملدرآمد کے لئے علاؤالدین نے جو طریقے اختیار کئے مورخین ان پر بھی نکتہ چینی سے باز نہیں رہتے۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ آپ شاید ہی کسی زبان میں کوئی ایسی تاریخ پائیں جس میں نہایت ایمانداری اور وسیع النظری سے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہو یا کسی حکمران کا طرز حکومت بیان کیا گیا ہو۔ ہندوستان ہی کے لئے یہ کچھ مخصوص نہیں بلکہ انگلستان۔ فرانس۔ اطالیہ۔ المانیہ کسی بھی بزعم خود مہذب ملک کا تاریخی ادب دیکھ لیجئے۔ اور آپکو صداقت بیانی کے سلسلے میں ہر جگہ صد درجہ مایوسی ہوگی۔ بڑے بڑے انگریز مورخ جنکے تبحر علمی اور علم تاریخ دانی کا دنیا لوہا مانتی ہے' علاؤالدین خلجی کی ان تدابیر کو' جو اس نے شرح و نرخ کے انضباط و انعقاد کے لئے اختیار کیں' نہایت تنگدلی اور تعصب کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے کہ ہندوستان کے ایک دقیانوسی خیال کے حکمران کو معاشیات کا ماہر کہا جائے یا یہ خیال کیا جائے کہ اسکے اندر معاشیات کی ضرورت و اہمیت سمجھنے کے جراثیم بھی تھے۔ اللہ ری تنگ نظری' اور ہیں یہ منصف مورخ رہنے والے مہذب ملک یعنی انگلستان کے جہاں کذب بیانی افترا پردازی اور واقعات کی روپوشی عین تہذیب ہے' بلکہ یہ چیزیں جہاں کی تہذیب کا جزو لاینفک ہیں۔

جہاں دیگر مورخین نے ان اصلاحات کو خیالی قرار دیا ہے وہاں مورلینڈ اپنی تصنیف "ہندوستان میں مسلمانوں کا دستور دیہی" (صفحہ ۳۰) میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ ان اصلاحات میں پانچ اصول برسر کار نظر آتے ہیں

(۱) بازار پر تصرف

(۲) رسل کا ضبط

(۳) صرف پر قابو۔

(۴) بہترین محکمہ اطلاع رسانی۔

(۵) سدول حکمی کی عبرت آموز سزائیں۔

اور یہی اصول تھے جن پر ایک عظیم جنگ کے وقت انگلستان میں عمل کیا گیا اور جن کی بدولت انگلستان کی آخر وقت تک ساکھ قائم رہی اور کسی ملک کو کسی وقت اس کے اعتماد پر شبہ نہ ہوا۔ جبکہ بڑی بڑی سلطنتیں متزلزل ہو گئیں اور ننگی نظر آنے لگی تھیں۔

علاؤالدین نے سب سے پہلے غلہ کی طرف توجہ کو مبذول کیا۔ ایک فہرست نرخ تیار کی گئی جسمیں ضروریات زندگی کی تمام اشیاء کی شرح مقرر کی گئی۔ کوئی چیز ان مقررشدہ قیمتوں سے زیادہ یا کم قیمت پر فروخت نہیں کی جا سکتی تھی۔ من وزن کے لئے اور جیتل[1] سکہ کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ ایک من تقریباً ۱۴½ سیر موجودہ (۰۰ مثقال) اور ایک جیتل ایک پیسہ موجودہ ٹنکہ کا ۱/۶۴ واں حصہ[2] کی برابر ہوتا تھا۔ ذیل کی فہرست سے اس وقت کے کچھ نرخوں اور غلہ کی ارزانی کا اندازہ ہو سکے گا۔

گیہوں	فی من	۷½ جیتل
جو	" "	۴
سٹھی (ساٹھی)	" "	۵ "
ماش	" "	۵ "
نخود	" "	۵ "
موٹھ	" "	۳ "

[1] مسالک الابصار۔ (تعرفی ادب ہندوستان) ڈاکٹر اسپینر مصنف مسالک الابصار کا خیال ہے کہ دہلی کا من ۰۰ مثقال کی برابر ہوتا تھا۔ [2] ای ٹامس نے اپنی تصنیف Chronicles of the Pathan Kings of Delhi میں اسپر خاصی بحث کی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق جیتل ٹنکہ کا ۱/۶۴ واں حصہ ہے۔ اس وقت کا ٹنکہ موجودہ روپیہ کے برابر ہوتا تھا۔ اس لئے جیتل کو موجودہ پیسہ سمجھئے۔

بہت سی اصلاحات مزید عمل میں لائی گئیں۔ سب سے پہلے غلہ کی بہم رسانی پر خاص توجہ اور گہری نگاہ رکھی گئی۔ کیونکہ غلہ کی صحیح اور باضابطہ بہم رسانی کے بغیر بازار پر کسی طرح پوری پوری دھاک نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

خالصہ[1] کی آراضیات کا تمام لگان اور اس کل مالگذاری جنس میں وصول کی جاتی تھی۔ دوآبہ کا تمام غلہ دہلی بھیجا جاتا تھا جہاں اس کو شاہی کھیتوں میں بھر کر رکھتے تھے۔ علاوہ اس کے نئے شہر[2] کی تمام پیداوار کا نصف تو سرکاری مال خانے میں جمع ہوتا تھا۔ اور باقیماندہ نصف اس سے متعلقہ مواضعات میں رکھا جاتا تھا۔ اس طرح دہلی و نواح دہلی و سلطنت کے بہت سے دیگر حصص میں غلہ کی اتنی افراط ہو گئی کہ قحط سالی کے وقت بھی غلہ کی کمی کو محسوس نہیں کیا جاتا تھا جب کبھی قحط سالی کا ظہور ہوتا یا غلہ فروش غلہ لانے میں کوتاہی برتتے یا خرید کر فروخت کرنے میں ناکام رہتے تو سرکاری کھیتوں سے غلہ بازاروں میں بھیجا جاتا اور فہرست نرخ کے مطابق فروخت کیا جاتا۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر سوداگر کسی وقت بادشاہ کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی کریں اور اس کی نافذ کردہ اصلاحات پر عمل نہ کریں تو بادشاہ کو غلہ حاصل کرنے اور شاہی مال سے اناج کی منڈیاں بھر دینے میں ذرا دقت پیش نہ آئے سوداگروں کی کوئی دھمکی بھی بادشاہ کو کسی وقت خوفزدہ نہ کر سکتی اور ذہنیت ہی کسی پریشانی میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ اس طرح علاؤالدین کو اناج کی منڈیوں پر پورا پورا تصرف حاصل ہو گیا۔

افسرانِ مال کو سخت تاکید تھی کہ وہ کاشتکاروں سے حکومت کا حصہ جو پیداوار کے تناسب کے مطابق ہو قبل اس کے کہ وہ اپنے گھروں یا اپنی کھتیوں میں رکھنے کے لئے لیجائیں وصول کیا جائے۔ اور اس وصولیابی میں سختی کی جائے تاکہ حکومت کسی وقت کاشتکار کی فریب ہی کا شکار نہ ہو کیونکہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر کاشتکار کو موقعہ ملا تو وہ ساری پیداوار اٹھا کر لیجائے گا۔ اور جب پیداوار لیگیا تو اس سے پھر سرکاری حصہ نکال لینا آتنا آسان نہ رہے گا جتنا کہ اس وقت جب کہ اس کا سارا غلہ کھیت ہی میں پڑا ہے تعجب ہے اس زمانہ کے چند گمراہ رہنما کاشتکار کی ذہنیت کے اس پہلو پر ذرا توجہ نہیں دیتے۔ حالانکہ برسہا برس پہلے علاؤالدین اس کو خوب سمجھتا تھا۔ اس وصولیابی اور اس کے انتظام کے علاوہ یہ افسرانِ مال غلہ فروشوں کی بھی امداد کرتے تھے۔ اور کاشتکاروں سے علاوہ سرکاری حصہ اور ان کی سال بھر کی ضروریات کی کفالت کے بقدر باقی ماندہ غلہ ان سوداگروں کو خرید کروا دیتے تھے اس سے غلہ فروشوں کو غلہ خریدنے اور بازار میں پہنچانے میں تکلیف و پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا۔

ملک قبول افغانی جو کہ الغ خاں کے مصاحبین میں سے تھا اور جس کے متعلق برنی کے یہ الفاظ ہیں کہ "ملک قبول الافغانی کہ ملک دانا و کارداں و مقرب بود" "شحنۂ منڈی"[3] مقرر کیا گیا۔ اس کو جاگیر

---

[1] دہلی اور وہ قطعات اراضی جو دریائے (؟) سیراب ہوتے تھے مع کچھ حصص شمالی ہندوستان کے خالصہ کہلاتے تھے۔ ان علاقوں کا انتظام وزارتِ مال کے ذریعہ انجام پاتا جس کا بلاواسطہ کاشتکاروں سے تعلق ہوتا تھا۔

[2] نئے شہر کے متعلق تمام تواریخ خاموش ہیں برنی نے ضرور اتنا لکھا ہے "قربان شد تا در شہر نو ولایت شہر نو نصف حصہ سلطان عین غلہ ستانند" عبارت واضح نہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شہر نو ولایت شہر نو سے مورخ مذکور کونسی جگہ بیان کرتا ہے محققین کی توجہ شاید کبھی اس عقدہ کے کشود کا سبب بن سکے۔

[3] ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور بہت سے دیگر مورخین نے "شحنۂ منڈی" یعقوب کو لکھا ہے میرے نزدیک یہ صحیح نہیں یعقوب دراصل مہتمم بازار تھا۔ شحنۂ منڈی مہتمم بازار کے سپرد بازاروں کا عام انتظام تھا۔ اس کا سوداگروں یا تاجروں سے کوئی خاص تعلق نہ ہوتا تھا۔ اس کا فرض صرف یہ تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ بازاروں کا کام ٹھیک ہو رہا ہے۔ بادشاہ کے احکام کی پابندی ہو رہی ہے؟ مگر شحنۂ منڈی کو تاجروں سے تعلق رکھنا پڑتا تھا

سوار اور پیدل عطا کئے گئے۔ تاکہ وہ بازار اور شہر والوں پر اپنے رعب و داب اور طاقت و قوت کو قائم کرے اور قائم رکھے جس سے اہالیان و تاجران و دکانداران سب خوفزدہ ہیں۔ اس کے اختیارات یہاں تک وسیع تھے کہ وہ غلہ فروشوں کے بنیوں اور سرپنچوں تک کو پابہ زنجیر کر سکتا تھا۔ احکام شاہی پر اتنے سخت عملدرآمد اور ان کی تنفیذ کا [illegible] نے دہلی میں غلہ کی بھرمار کر دی اور خود بازاروں میں اتنا غلہ رہنے لگا کہ تمام رعایا کی ضروریات کا وہ کفیل ہو جاتا اور شاہی کھیتیاں بدستور بند رہتیں اور ان کو کھولنے کی کبھی نوبت ہی نہ آتی۔

ایک حکم شاہی سے ایک مرتبہ خرید کئے ہوئے اجناس کو دوبارہ فروخت کرنے کی سخت ممانعت کی گئی۔ صوبہ داران اور افسران کا یہ فرض قرار دیا گیا کہ وہ یہ دیکھیں کہ کہیں اس طرح کی خرید و فروخت تو نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص صرف ایک ہی من غلہ خرید کر اس طرح بیچتے پایا جاتا تو یہی نہیں کہ اسی شخص کو غلے سے محروم کر دیا جائے یا اس پر کچھ جرمانہ ہو۔ بلکہ افسران بالادست بھی مجرم سمجھے اور قرار دیئے جاتے تھے کسی شخص کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنی ضرورت کے علاوہ تھوڑا سا بھی اناج بچائے اور پھر بازار کے نرخ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرے۔ تمام قافلے مہتمم بازار کی ماتحتی میں اپنے فرائض کی تکمیل کرتے اور اس امر کا اقرار کرتے تھے کہ وہ ریاست کے ہر حکم کی پابندی کریں گے اگر کبھی کسی ایسے قافلہ میں جو علاوہ غلہ کے کسی اور تجارت میں مصروف ہو بغیر اجازت ضرورت کے علاوہ کچھ اناج پکڑا جاتا تو قافلے والوں کو سخت سزائیں دی جاتیں۔ سرقافلہ اپنے کاروبار سے متعلق ہی سامان رکھ سکتا تھا۔

دوآبہ اور سو کوس کے اردگرد کی اراضیات کی مالگذاری کچھ اس طرح قائم کی گئی تھی۔ کہ کسان اپنے لئے اپنی ضرورت سے ۱۰۔ ۵ من زیادہ غلہ بھی بچا کر نہیں رکھ سکتا تھا اور یہ کہ تمام من [illegible] دیتا کھیت ہی پر سوداگروں کے ہاتھ فروخت کرنا پڑتی تھی۔ وہ قسط ان جن کی تقرری دو آبہ میں ہوتی تھی۔ اس امر کی ضمانت دیتے تھے کہ وہ کسی کاشتکار کو ایک دانہ اناج کا بھی بچا کے جمع کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

اس بہم رسانی کے ساتھ ساتھ تقسیم کی ممانعت بھی ضروری تھی تمام غلہ فروشوں کو سخت ہدایت کی گئی تھی کہ وہ تمام غلہ صرف ایک بازار میں لا کر جمع کریں [illegible] جو فروخت [illegible] اپنی روزانہ [illegible] غلہ خرید سکتے تھے [illegible] لوگ باہمی جس کا کہیں [illegible] کیا جاتا تھا [illegible] تھی۔ اور یہ لوگ یہاں شحنہ منڈی کو دینا [illegible] ہوتے تھے

بہم رسانی او تقسیم کے پہلو بہ پہلو صرف [illegible] کسی شخص کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنی روزانہ کی ضروریات سے زیادہ غلہ خرید سکے۔ مقدار غلہ فی کس مقرر کر دی گئی تھی۔ اس مقدار سے زیادہ کوئی نہیں خرید سکتا تھا۔ قحط سالی کے دوران میں عام طور پر خریدار کو اصل نرخ سے آدھا من زیادہ دیا جاتا تھا۔ ان احکام و اصلاحات شاہی کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں تاکہ ایک طرف جرم کرنے والے تائب ہوں اور دوسری طرف جرم کرنے والے خوفزدہ رہیں اور کسی حد ول [illegible] کی ہمت نہ کر سکیں۔

بازار کے انتظام میں دخل اندازی کا مطلب سخت سزا ہوتی تھی۔ کوئی شخص اس میں دخل دینا تو درکنار چوں بھی نہیں کر سکتا تھا شحنہ منڈی کو ہر طرح کے اختیارات حاصل تھے۔ اس کی زیر نگرانی اس کے ماتحت کام کرتے تھے۔ تاکہ معمولی سے معمولی بات بھی شحنہ منڈی کی توجہ سے نہ بچ سکے۔ شحنہ منڈی کی نگرانی کے لئے دیوان ریاست ہوتا تھا۔ [illegible] علاوہ شحنہ منڈی [illegible] رکھتا [illegible] ہوتا تھا۔

کہ وہ سوداگروں کے درج شدہ ناموں کی تصحیح کرے۔ اپنے ماتحت رئیسِ پروانہ کی سفارش (اس کا ذکر آگے آئیگا) قیمتی اشیا خریدنے والے امرا وروٗسا کو اجازت نامے دے۔ اجازت ناموں کا یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ تاجر بازاروں سے اشیاء کم داموں پر خرید کر شہر میں زیادہ قیمت پر فروخت نہ کر سکیں۔ دیوانِ ریاست بادشاہ سے ان ملتانی تاجروں کی سفارش بھی کرتا تھا۔ جن کو خزانہ عامرہ سے مالی امداد ملتی تھی۔ تاکہ وہ لوگ مال زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر اپنے پاس رکھیں۔ اور بازار میں کسی وقت کسی چیز کا توڑا نہ ہونے دیں۔ دیوانِ ریاست سلطنت کے چار وزراء میں سے ایک ہوتا تھا۔ ان افسران پہ فرداً فرداً بادشاہ بذاتِ خود نگاہِ غور رکھتا تھا۔ تمام بازاروں میں اس کے جاسوس اور اطلاع دہندہ پھیلے پڑے تھے جو روزانہ کی خبریں اس تک پہنچاتے تھے شحنہ منڈی کے لئے بھی یہ حکم تھا کہ وہ روزانہ بازار کی اطلاعات شاہی حضور میں پہنچاتا رہے۔ اگر کبھی جاسوسوں کے بیان اور شحنہ منڈی کی اطلاعات میں اختلاف ہوتا تھا۔ تو بعد تحقیق جھوٹی اطلاع دینے والے کو عبرت آموز سزائیں دی جاتی تھیں۔

وزن اور پیمانوں کا معیار بھی مقرر کیا گیا۔ اگر کوئی غلہ فروش مقررہ وزن سے کچھ بھی کم تول کر دیتا تھا۔ تو اس کے جسم سے اتنا ہی گوشت کٹوا دیا جاتا تھا۔ جتنا وزن کم ہوتا تھا۔ بادشاہ کے خفیہ ملازمین اس کے حکم سے بازار جاتے اور وہاں سے مختلف اشیاء مثلاً گوشت روٹی حلوہ وغیرہ خرید کر لاتے۔ ان اشیاء کو بادشاہ کے حضور میں وزن کیا جاتا۔ وزن کم ہوتے پر فوراً وہ سوداگر طلب کیا جاتا اور جتنا وزن کم ہوتا اتنا اس کے جسم سے گوشت علیحدہ کروا دیا جاتا۔ اس کے علاوہ اکثر سوداگر کے ناک اور کان تک کٹوا دیئے جاتے۔ تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں ان سزاؤں نے سوداگروں اور دوکانداروں کے دلوں سے بے ایمانی کی ریا ہی کو بالکل محو کر دیا۔ کون بیوقوف ہوگا جو ذرا سی بے ایمانی کی خاطر اپنا گوشت کٹوانے کا سودا کرے؟

ان اصلاحات اور ان کی سخت پابندی نے بازار کو ایک مستقل حالت پر قائم کر دیا۔ نرخوں میں کسی قسم کا تغیر قطعاً ناممکن ہو گیا۔ حتٰے کہ برسات اور قحط سالی ہر موسم اور ہر وقت جب تک علاؤالدین برسرِ حکومت رہا بازار کے نرخوں میں ایک چھدام کی بھی کمی بیشی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہی معاشرت کی حالت میں کوئی ابتری نمودار ہوئی۔ میرے خیال میں تو علاؤالدین کا یہی وہ زبردست کارنامہ ہے جس کی مثال موجودہ زمانے کی مختلف الطرز حکومتوں میں سے کوئی بھی پیش نہیں کر سکتی۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ ان اصلاحات کے نفاذ اور اسکے دائرۂ عمل کو اچھی طرح دھیان میں رکھنا چاہئے بقول مورلینڈ قیمتوں میں یہ کمی اور یہ استقلال صرف دہلی ہی میں ہوئے تھے۔ اور سلطنت کے دیگر حصص میں اس انتظام کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ چونکہ تمام فوج دہلی میں رہتی تھی۔ اس لئے دہلی ہی کے بازاروں کو خاص اہمیت دی گئی۔ غلہ کی بہم رسانی غلہ کو بچا کر رکھنے اور زیادہ قیمت پر نہ بیچنے کے احکام صرف خالصہ ہی تک محدود تھے۔ اور یہ بھی اس لئے کہ صرف اسی حصہ سے بادشاہ کو ضرورت سے زیادہ اور اس کی سکیم کو کامیاب بنانے کے لئے کافی غلہ مل جاتا تھا۔ سرکاری مالگذاری کے مطابق خالصہ کی اراضیات اندرونی حدودِ سلطنت میں شامل تھیں۔ وسطی حدود میں جہاں صوبہ داران کا کاشتکاران سے بلاواسطہ تعلق رہتا تھا اور وہی لوگ کاشتکاران سے مالگذاری کا روپیہ (نقد) وصول کرتے تھے۔ بازاروں سے متعلق کسی قسم کی اصلاحات جاری نہیں ہوئی تھیں۔ تیسری حدود میں جو کہ بیرونی کہلاتی تھیں اور جن میں سلطنت کی سرحد کے صوبے مثلاً ملتان وغیرہ شامل تھے صوبہ داران

کا کاشتکاران سے بلاواسطہ تعلق نہیں تھا۔ بلکہ وہ سرداروں کے ذریعہ سے مالگذاری سرکار وصول کرتے تھے۔ ان میں نہ تو بازار ہی کی اصلاحات جاری ہوئی تھیں اور نہ ہی پیداوار اور غلہ کی بہم رسانی کے متعلق احکام نافذ ہوتے تھے۔

غلہ کے بعد قابل غور اشیاء کپڑا اور دیگر ضروریات کی چیزیں تھیں۔ ان پر بھی بادشاہ نے توجہ دی۔ ایک عظیم الشان عمارت تیار کی گئی جسکا نام سرائے عدل رکھا گیا اور حکم ہوا کہ کپڑے، شکر، مکھن، پھل اور دوسری اسی قسم کی تمام چیزیں اسی جگہ فروخت ہوا کریں گی۔ اگر کوئی شخص یہ اشیاء کسی مکان پر یا کسی اور بازار میں لیجاتے ہوئے پکڑا جاتا تو اسکا تمام سامان ضبط کر لیا جاتا اور اس کو سزا دی جاتی اور جرمانہ بھی کیا جاتا۔ ان تمام اشیاء کے بھی نرخ مقرر کئے گئے جس سے زیادہ یا کم پر کسی کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی اصل نرخ سے کم یا زیادہ پر فروخت کرتا ہوا پایا جاتا تو سزا کا مستوجب ہوتا۔ ذیل میں ان اشیاء کے کچھ نرخ دیئے جاتے ہیں:-

مصری	فی سیر	۲½ جیتل
شکر	"	⅓ "
شکر خام	۳ سیر	½ "
مکھن	½ سیر	۱ "
روغن سیاہ	۳ سیر	۱ "
نمک	۲½ من	۵ "
عمدہ کپڑا	فی ٹنکہ	۲۰ گز
معمولی کپڑا	"	۴۰ "
چادر	۱۰ جیتل	فی عدد

ان اشیاء کی فروخت کے اوقات بھی مقرر کئے گئے تھے طلوع آفتاب سے زوال آفتاب (دوپہر) تک یہ چیزیں بکتی تھیں۔ اس کے بعد نہیں۔ اس بازار کے منتظم کو رئیس پروانہ کہتے تھے۔ یہ فہرست ہندو مسلمان شہری دیہاتی، ملکی غیر ملکی، تمام تاجروں کے نام اپنے دفتر میں درج رجسٹر کرتا تھا۔ ان تاجروں کے لئے یہ شاہی حکم تھا کہ وہ تمام اشیاء سرائے عدل میں لائیں۔ اور حسب نقشہ جو نرخ ہو فروخت کریں۔ ایک جگہ ہونے سے ہر قسم کی اشیاء کافی افراط سے معلوم ہوتی تھیں۔ انکا خریدنا کچھ مشکل کام نہ تھا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ رعایا تاجروں کے آپس کے مقابلہ و تبادلہ سے محفوظ تھی۔ اور ہر چیز مناسب داموں پر مل جاتی تھی۔ تاجر مال جلد یا دیر میں نکلنے کے لئے بہ نسبت کسی اور چیز کے اپنی تقدیر یا اپنے مال کی خوبیوں پر شاکر رہتا تھا۔ اور خریدنے والا اپنی پسند کے موافق چیز خریدتا تھا۔ کیونکہ اس کو خریدتے وقت کبھی یہ خیال کرنا نہیں پڑتا تھا کہ اس چیز کی قیمت فلاں جگہ کم ہے وہاں سے لی جائے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر تاجر بہتر سے بہتر مال لانے کی کوشش کرتا ہوگا۔

بادشاہ کی طرف سے اس کا بھی کافی انتظام تھا کہ اگر کسی وقت سوداگر اشیائے ضرورت بازار میں کسی وجہ سے نہ لاسکیں تو رعایا کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ چنانچہ ملتانی تاجروں کو ۲۰ لاکھ ٹنکہ بیعانہ کی رقم کیلو پر دیا جاتا تھا تاکہ وہ باہر سے مال لاکر اس کا کافی سٹاک اپنے پاس رکھیں اور ضرورت کے وقت بازاروں میں مہیا کریں۔ ملتانی تاجروں پر یہ رعایت اس وقت کی جاتی تھی جب تاجر مال بہم پہنچانے سے معذور ہوتے تھے۔ ان تاجروں کے ساتھ دیگر مخصوص مراعات بھی برتی جاتی تھیں۔ علاوہ خطیر رقوں کے اکثر ان لوگوں کو بازار کا افسر مقرر کیا گیا۔

ان اشیاء کے استعمال پر بھی نظر رکھی گئی۔ اگر کوئی ریشمی یا عمدہ کپڑا خریدنا چاہتا تھا تو پہلے رئیس پروانہ سے اجازت لینی پڑتی تھی۔

رقمیں پروانہ صرف ان امراء و کمانڈرین کے نام دیوان ریاست سے جاری کرتا جن کے متعلق اسکو یقین ہوتا کہ وہ تاجر نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ خطرہ تھا کہ اگر تاجروں کو عمدہ قسم کا کپڑا وغیرہ ان بازاروں سے خرید نے کی اجازت دی گئی تو ممکن ہے کہ یہ لوگ یہاں سے خرید کر مضافات اور سلطنت کے دیگر حصص میں زیادہ نرخ پر فروخت کر کے خوب فائدہ اٹھائیں یا دوسرے الفاظ میں رعایا کو تکلیف پہنچائیں اور شاہی کرم سے محروم رکھیں۔

ان اشیاء کے بعد سلطان کی توجہ کا مرکز گھوڑے، مویشی اور غلام تھے۔ بقول برنی ... کی تعداد میں گرفتار ہوتے اور بازاروں میں مویشیوں کے پہلو بہ پہلو فروخت کئے جاتے۔ معمولی عورتیں ۵ سے ۱۲ تنکہ تک۔ داشتائیں ۲۰ سے ۴۰ تنکہ تک، جوان لڑکے ۲۰ سے ۳۰ تنکہ تک اور پختہ عمر کے غلام ۱۰۰ سے ۲۰۰ تنکہ تک کی قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔

گھوڑے، مویشی اور غلاموں کی بہم رسانی پر خاص نظر رکھی جاتی تھی۔ تاجروں کو یہ شاہی حکم تھا کہ جب وہ فروخت کے لئے نئے گھوڑے لائیں تو پہلے ان کو لیکر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوں۔ ان گھوڑوں کو بنظر خود دیکھنے کے علاوہ بادشاہ پہلے خود ان میں سے اپنے لئے گھوڑے پسند کرتا تھا۔ اور اسکے بعد ان کو بازار لیجانے کی اجازت تھی۔ ان گھوڑوں کی فروخت و تقسیم کا بھی نہایت سخت انتظام تھا۔ علاوہ سپاہی کے کوئی اور شخص گھوڑا نہیں خرید سکتا تھا۔ تجار اور رؤسا اس عنایت سے محروم تھے۔ وہ یہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کسی سپاہی کے ذریعہ سے ہی اپنے لئے کوئی گھوڑا خرید لیں۔ گھوڑوں کے درجہ مقرر کئے گئے تھے اور ان درجوں کے مطابق ان کی قیمتیں مقرر کی گئی تھیں۔ ذیل میں انکی تفصیل دی جاتی ہے:۔

درجہ اول	۱۰۰	سے	۱۲۰ تنکہ تک
درجہ دوم	۸۰	سے	۹۰ تنکہ تک
درجہ سوم	۶۵	سے	۷۰ " "
درجہ چہارم	۱۰	سے	۲۵ " "

اول تینوں درجے فوج میں استعمال کئے جاتے تھے۔ چوتھا درجہ بیکار سمجھا جاتا تھا۔ یہ چوتھے درجہ کے گھوڑے ٹٹو کہلاتے تھے ان ہی کو فرشتہ "یابو" کہتا ہے۔ ان ٹٹوؤں کے استعمال کے لئے کسی شخص کو ممانعت نہیں تھی۔ گائے بیل اور بکری کی قیمت خاص طور پر کم تھی کیونکہ یہ جانور عام طبقہ کے لئے ضروری اور موزوں تھے۔ چنانچہ ان کی قیمتیں عام لوگوں کے ذرائع و تعداد آمدنی کو مدنظر رکھکر قائم کی گئیں۔ تاکہ ہر شخص ان سے متمتع ہو سکے اور گائے بیل یا بکری آسانی سے خرید سکے۔

گائے	۳	سے	۴ تنکہ تک
بیل	۲	سے	۳ " "
بکری	۱۰	سے	۱۴ جیتل تک

جو قواعد گھوڑوں کے لئے وضع کئے گئے تھے وہ ہی مویشیوں اور غلاموں پر بھی عائد ہوتے تھے۔ ہر دو ماہ کے بعد (نظام الدین نے اپنی تاریخ طبقاتِ اکبری میں یہ وقت ایک ماہ لکھا ہے لیکن زیادہ قرین قیاس ۲ ماہ ہی معلوم ہوتا ہے) ایک تحقیقاتی مجلس بیٹھتی تھی۔ جو علاوہ گھوڑوں کے درجہ قائم کرنے کے یہ بھی دیکھتی تھی کہ اس دوران میں دلالوں نے لین دین کیسا کرایا۔ کاروبار کو کتنا بڑھایا۔ وغیرہ۔ ان دلالوں کی کوئی خاص ہمت افزائی نہیں کی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ شاہی برتاؤ بڑا سخت رہتا تھا۔ اور اکثر ان کو شہر بدر کر دیا جاتا تھا تاجر اور خریدار کے مابین معاملات طے کرتے وقت یہ لوگ یہ کرتے کہ دونوں فریقین سے رقمیں سیدھی کر لیتے (جیسا کہ آجکل کے دلال کرتے ہیں)

اور گھوڑے کی قیمت اصل قیمت سے بہت زیادہ بڑھا دیتے۔ اسلئے یہ حکم جاری کیا گیا کہ اگر ایک شخص بھی ایسا کرتا ہوا پایا جائے گا تو تمام دلالوں کو اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس حکم سے یہ لوگ اس قدر سہم گئے کہ رشوت ستانی بالکل نابود ہو گئی۔

اشیار کی اس سلیقگی و ضابطگی کے بعد بازاروں کے عام انتظام و تربیت کے لئے ایک افسر رکھا گیا جس کو مہتمم بازار کہا جاتا تھا۔ اسکے لئے غصہ ناک سخت دل تند خو ترش مزاج اور ساتھ ہی معتمد ہونا ضروری تھا۔ ایسا شخص تاجروں کا مدِ مقابل ثابت ہو سکتا تھا۔ بڑے غور و خوض کے بعد قرعۂ فال یعقوب کے نام پڑا اور ان فرائض کی ذمہ داری اور اس جگہ کا اعتماد اس کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کی کارکردگی اور خوش انتظامی سے کہنا پڑتا ہے کہ شاید علاؤالدین اس سے بہتر اور کوئی انتخاب اس جگہ کے لئے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ترش مزاج بھی تھا اور تند خو بھی۔ سخت دل بھی تھا اور مکار اور چالباز بھی۔ وہ برے سے برا برتاؤ کرنے اور بری سے بری گالی دینے میں ذرا نہ چوکتا تھا۔ اور ان سب سے بڑھکر یہ کہ وہ انتہائی ایماندار اور قابلِ اعتماد شخص تھا۔ ہر بازار میں اسکا ایک آدمی رہتا جس کے پاس بادشاہ کا مرتب کردہ نقشۂ نرخ ہوتا۔ ان آدمیوں کا کام یہ تھا کہ وہ خریداروں سے ملتے اور ان سے دریافت کرتے رہیں کہ انہوں نے جو اشیار خریدی ہیں وہ ان ہی داموں پر خریدی ہیں جو نقشے میں درج ہیں۔ اس طرح اس امر کا صحیح پتہ چل جاتا تھا کہ آیا تاجران و سوداگران اور دوکاندار ان ہی نرخوں پر مال فروخت کرتے ہیں جو بادشاہ نے مقرر کر دیئے ہیں یا ان سے کم زیادہ پر جو لوگ ان احکام کی تعمیل میں کوتاہی کرتے یا بے ایمانی کرتے پکڑے جاتے ان کو یعقوب نظیر کی خدمت میں حاضر کیا جاتا۔ اگر معاملہ معمولی ہوتا تو خود سزا دیکر ان کو چھوڑ

دیت۔ ورنہ پھر ملک قبول کے سامنے پیش کر دیتا جو سزا کے طور پر ان کے جسم سے گوشت یا ان کے ناک کان کٹوا دیتا۔

ان اصلاحات اور اس دارو گیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاجر اور دوکاندار لوگ بھیگی بلیاں بن گئے۔ وہ اب تک اپنے آپ کو ہر تجارت اور ہر کاروبار کا مالکِ مطلق سمجھتے تھے۔ مگر اب رعایا کا خادم سمجھنے لگے۔ بے ایمانی اور دھوکہ دہی کا جو مرض عام ہو گیا تھا مفقود ہو گیا۔ ان کو اپنے فرائض کا خود احساس ہونے لگا۔ آپس میں کسی قسم کا مقابلہ نہیں رہا۔ خوف کے مارے اصل مقدار سے کہیں زیادہ فروخت کرنے لگے۔ ہر قسم کی رشوت کے بازار سرد ہو گئے۔ برنی نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ اس نے بادشاہ کی اس اسکیم کے کامیاب ہونے کی وجوہات کی بھی توضیح و تشریح کی ہے۔ اس کا خیال بالکل صحیح ہے (میں اس کی عبارت طوالت کی وجہ سے نظر انداز کرتا ہوں) در اصل یہ سلطان کی ذاتی دلچسپی ہر معاملہ کی گرفت اور انتہائی سخت مزاجی ہی تھی جس نے ایک طرف رعایا کو چین کی نیند سلایا دوسری طرف افسروں کی بے راہ رویوں کی نگہداشت کی ہر طرف امن و امان اور آسودگی کی حکومت نظر آنے لگی اور تمام سلطنت میں خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔

سلطان کو اپنی اس سکیم پر عمل ہوتے دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اور وہ اس کی ہر تفصیل میں بڑی گہری دلچسپی لیتا۔ اس نے تمام اشیار کا نرخ مقرر کرنے کی پُر اذیت ڈیوٹی اپنے سر لے لی تھی۔ اور نہایت احتیاط ہوشیاری اور خردہ گیری سے اپنے اس فرض کی تکمیل کرتا تھا نظام الدین کہتا ہے کہ سوئیاں کنگھیاں جوتے کھلونے اور ظروف گلی تک جیسی حقیر چیزیں اس کی توجہ سے نہ بچ سکیں۔ اور اس نے ان کی بھی قیمتیں مقرر کیں۔ یہ کام وہ جس محنت سے بھی کرتا ہوگا اور اس کے لئے اس کو جو تفصیل [illegible]

اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ کہ اس کو کام کا صرف شوق ہی نہیں تھا۔ وہ اسمیں صرف لطف ہی حاصل نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی گتھیوں کو بھی سلجھانا اور اپنی عسکری رعایا کو ہر طرح کا آرام پہنچانا چاہتا تھا اس وقت بادشاہ کے پاس اس قدر جرار اور عظیم الشان لشکر تھا کہ مغلوں کی زبردست سے زبردست یلغار، راجاؤں کی بڑی سے بڑی بغاوت اور رعایا کے تیز سے تیز فتنہ کو وہ چشم زدن میں نیست و نابود کر سکتا تھا۔ وہ مطلق العنان حکمران تھا اور صحیح معنوں میں مطلق العنان، اس کی قوت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ہی عہد میں مغلوں نے ہندوستان کی طرف رُخ کرنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس کی زبردست فوج نے مغلوں کو اس قدر پسپا کیا اور اتنے مغل موت کے گھاٹ اتارے کہ پھر ہندوستان کے ہرے بھرے کھیتوں اور اس کی لاتعداد دولت کے سہانے خواب ان کے لئے موت کی حقیقتیں بن گئے۔ اور اس طرح اس مصیبت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

ملکی راجاؤں اور امیروں میں اب مشکل ہی سے یہ جُرأت پیدا ہو سکتی تھی کہ وہ علاؤ الدین کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کا جھوٹے سے بھی کبھی دل میں تصور کریں۔ وہ اس کی بے پناہ طاقت سے لرزہ براندام تھے اور اس کے آگے سربسجود۔ اور اس سب سے بڑھکر بنی نوعِ انسان کو جو آرام و سکون اور آسودگی نصیب ہوئی اس سے بڑے بڑے بادشاہوں کی تاریخ کے اوراق خالی ہیں۔ زندگی کی ضروریات کی ارزانی نے معمولی سے معمولی آدمی کو بھی خوش، اور مطمئن کر دیا تھا۔ قحط سالیوں کا جو ہزاروں لاکھوں مخلوقِ خدا کی موت کا پیغام ہوتیں اب قحط تھا، لوگ میٹھی نیند سوتے اور خوشی کی جاگ جاگتے۔ ان کے لئے دن عید اور رات شب برات تھی۔ ذرا اور گہری نظر ڈالئے تو آپکو فلسفۂ تاریخ کے نازک ترین مسائل بھی روشن نظر آنے لگیں گے۔ علل و معلول کی کڑیاں بھی ملی جلی معلوم ہوں گی۔ اور آخر میں یہ کہنا پڑے گا کہ اندرونی آرام و آسودگی اور بیرونی خطروں سے بے پروائی و بے خوفی نے لوگوں کی معاشرتی تمدن کو بہت ارفع کر دیا۔ انکے تخیل بلند فضاؤں میں پرواز کرنے لگے۔ ان کی کوششیں عمدہ ثمر کی تلاش میں مصروف نظر آنے لگیں انکا تصورِ حیات بلند ہونے لگا، اور فنونِ لطیفہ اور ادب نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی۔ ایک طرف حضرت امیر خسرو[1] رحمۃ اللہ علیہ نے پریم اور موسیقی کے گیت گائے دوسری سمت حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ نے حقانیت و حقایق کی بنسریاں بجائیں۔ ہر طرف سے "لبیک" کے نعرے بلند ہوئے اور لوگ ...... تمام لوگ مست و متوالے نظر آنے لگے۔ اے کاش !! ہم کبھی اپنی آنکھوں سے وہ دورِ رحمت دیکھیں۔ فقط۔

---

[1] حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ہی اس کے عہدِ حکومت کی وہ لاثانی برکت تھی جس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ آپکا وجود علاؤ الدین کی انتہائی خوش قسمتی تھی۔ آپ باکمال انسان تھے۔ جس کے سامنے کوئی فن غیر مکمل نہ رہ سکا تھا۔

جناب رام جوایا خنداں

"شاعر" اور "ابرِ بہار"

"شاعر"

یاد ہے اُس شب کا نظارہ تجھے ابرِ بہار! — دیکھ کر کالی گھٹا ہونا کسی کا بے قرار
مجھ کو جانا تھا تماشائے لقا کے واسطے — تجھ سے کہتا تھا "ذرا تھم جا خدا کے واسطے"
تو گرجتا، گھومتا، اور برق چمکاتا ہوا — سر چڑھا آتا تھا میرے تیر برساتا ہوا
تو نے میرے راستے میں ایک جل تھل کر دیا — تشنۂ دیدار امیدوں پہ پانی پھر گیا
آج تو نے اپنی صورت پھر دکھائی ہے مجھے — آج پھر اُس واقعے کی یاد آئی ہے مجھے
آہ تو یہ چاہتا ہے میں تری منت کروں — تیرے قدموں پہ نچھاور جذبۂ غیرت کروں
اب کہاں وہ، اب نہیں مجھ کو کسی کا انتظار — اب نہ جانا ہے کہیں مجھ کو نہ میں ہوں بے قرار

سرخوش و سرمست از کہسار ہا برخیز و بار
فرصتے دارم بخلوت تند بار و تیز بار

"ابرِ بہار"

ان دنوں اک کیفِ مستی میں میں بھی چور تھا — اپنی ہستی پر مجھے تھا ناز میں مغرور تھا
ہوش میں آنے نہ دیتی تھی مری مستی مجھے — اِک جہانِ خواب تھا یہ عالمِ ہستی مجھے
مجھ کو طوفاں خیزیوں کی قوتوں پر ناز تھا — دشت کو دریا بنا دینا مرا اعجاز تھا
تیرتا تھا میں فضاؤں میں ہیولے کی طرح — دشت میں چکر لگاتا تھا بگولے کی طرح
اب کہاں کیف و غرورِ مستی و جوشِ شباب — اب تو فرطِ شرم سے ہے میرا پیکر آب آب
تھا اُس دن تو تجھے دانستہ تڑپاتا تھا میں — تجھ پر اپنی قوتوں کے تیر برساتا تھا میں
آج تیری بیکسی کو دیکھ کر روتا ہوں میں — آنسوؤں سے اپنے تیرا داغ دھوتا ہوں میں

نوشتہ چیخوف　　　　مترجمہ علی احمد صاحب

گمنام خط

"میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ . . . تم میری زندگی ہو میری خوشی . . . میرا سب کچھ۔ اپنی صاف بیانی کی معافی چاہتی ہوں۔ . . . لیکن میں خاموش بھی نہیں رہ سکتی۔ صبر آخر کب تک؟ میرا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی میری محبت کا جواب محبت ہی سے دو۔ کچھ نہیں تھوڑی سی ہمدردی ہی سہی۔ آج شام پارک کے مغربی گوشے کی طرف ضرور آئیے گا میں منتظر رہوں گی۔ دیکھئے بھول نہ جائیے گا . . . . شاید میرا نام اس موقع پر غیر ضروری ہی ہو . . . اس لئے کہ آپ اس نام کو پہچان بھی نہ سکیں گے . . . لیکن حیران نہ ہوجیے . . . میں جوان ہوں۔ خوبصورت ہوں . . . اس سے زیادہ اور آپ کیا چاہتے ہیں؟

راقمہ . . . .

جب پاول اوانچ نے اس خط کو پڑھا تو اپنے شانے سکوڑ لئے اور پریشانی سے پیشانی پر بل ڈال لئے۔ "آخر اس کا کیا مطلب ہے" اس نے سوچا "میں ایک شادی شدہ شخص ہوں۔ مجھے اس قسم کا محبت آمیز خط کس نے لکھا ہے؟"

پاول نے خط کو بار بار الٹا پلٹا . . . کئی بار شروع سے آخر تک پڑھا لیکن کچھ سمجھ نہ سکا۔ "میں تم سے محبت کرتی ہوں" اس نے طعن آمیز لہجہ میں دہرایا "خوب۔ تو کیا مجھے اس سے ملنے کے لئے جانا ہوگا مگر ایسے عشقیہ قصے میں نے بہت سنے ہیں . . . ضرور کسی بدچلن [illegible]

کو۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں چیستان سے کم نہیں خدا ہی رحم کرے!"

شادی کے بعد کی ۸ سالہ زندگی میں پاول اوانچ اپنے جذبات پر قابو پا چکا تھا کسی عورت سے رسم و راہ نہ تھی اور نہ ہی خط و کتابت یہی وجہ تھی کہ گمنام خط نے اس کے جذبات کو بری طرح ٹھیس لگائی۔

خط پہنچنے کے ایک گھنٹہ بعد وہ صوفے پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا "بہرحال میں کوئی بیوقوف تو نہیں ہوں کہ ان فضولیات میں اپنا وقت ضائع کروں اور وہاں جاؤں۔ تاہم یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خط کس نے لکھا ہے . . . (خط کو غور سے دیکھتے ہوئے) تحریر تو عورت ہی کے ہاتھ کی ہے اور خط بڑی کاوش اور جذبات کے زیر اثر لکھا گیا ہے اس لئے یہ مذاق تو نہیں معلوم ہوتا۔ میرے خیال میں کوئی الہڑ دوشیزہ ہے یا . . کوئی رنگین مزاج بیوہ . . . . صنف نازک کے اس ناکارہ طبقہ کو سوا بیہودگیوں کے اور کوئی کام نہیں رہتا . . . . کچھ عقل میں بات نہیں آتی۔ آخر یہ ہے کون۔ اس آخری سوال کا جواب پاول کے لئے بہت مشکل تھا اس لئے کہ اس مقام پر سوائے اپنی بیوی کے اور کسی عورت سے شناسائی [illegible]

"عجیب معاملہ [illegible] میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن [illegible] لڑکی۔

معصوم لڑکی ہوگی۔ فتنۂ شباب سے چور بدست۔ الہڑ۔۔ نادان کیا دو تین مرتبہ ہی مجھے دیکھ کر اپنا دل کھو بیٹھی۔ لیکن ۔۔۔ یہ ہوگی کون ؟"

اسے دفعتاً ایک خیال آیا۔ گذشتہ ایام میں جب وہ پارک میں تفریح کو جایا کرتا تھا کئی مرتبہ اسے ایک حسین لڑکی سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا جس کی آواز میں سحر تھا اور جس کی ہر ادا میں قیامت انگڑائیاں لیتی معلوم ہوتی تھی۔

"کیا یہ وہی عورت ہے" اوانچ بڑبڑایا "یہ ہو نہیں سکتا۔ کیا ایک نوخیز دوشیزہ اس شخص پر عاشق ہو سکتی ہے جس کی عمر اس کی عمر سے کافی زیادہ ہے۔ اور جس کی شادی کو ہوتے آٹھ سال کا طویل عرصہ گذر گیا ہے۔ نہیں یہ ناممکن ہے۔"

دوپہر کے کھانے پر پاول اوانچ کچھ پریشان اور متفکر دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس وقت بھی تصورات کی حسین دنیا میں کھویا ہوا تھا۔

"وہ لکھتی ہے کہ وہ نوجوان ہے۔ اور خوبصورت بھی ہے۔۔۔۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ بوڑھی نہیں ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں اتنا معمر بھی نہیں ہوں کہ کوئی عورت مجھ پر عاشق نہ ہو سکے۔۔۔ میری بیوی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ علاوہ اس کے محبت تو اندھی ہوتی ہے۔۔۔۔ یہ بھی جانتے ہیں"

"تم کیا سوچ رہے ہو" اس کی بیوی نے اسے خیالات میں محو دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ سر میں خفیف سا درد ہو گیا ہے۔" پاول نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ ایک گمنام خط کے متعلق اس قدر پریشان ہونا سراسر بیوقوفی ہے۔ دیر تک خط کے مضمون اور اس کے [illegible]

غالب ہے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔

"لیکن وہاں تو میرا انتظار کرے گی۔ مجھے نہ پا سکی تو مایوس ہوگی کسی کا دل توڑنا نہیں اچھا۔ وہ کیا خیال کرے گی۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔"

جذبات کی طاقت اس کے خیالات کی طاقت پر غالب آ گئی۔

"میں ضرور جاؤں گا۔ اور دیکھوں گا کہ آخر وہ کون ہے کیسی ہے۔ اسمیں حرج کیا ہے۔ کچھ دلچسپی ہو جائے گی۔ تھوڑا سا مذاق ہی سہی ۔۔۔۔ ایسے دلچسپ موقع بار بار کہاں آتے ہیں" شام ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ پاول اوانچ بستر سے اٹھا اور منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کرنے لگا۔ "آج کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے" اس کی بیوی نے دریافت کیا جب اس نے دیکھا کہ نفیس قمیض پر ایک فیشن ایبل ٹائی لگائی جا رہی ہے۔۔۔

"کچھ نہیں ۔۔ ذرا تفریح کرنے جا رہا ہوں ۔۔۔۔۔ سر کا درد ابھی کم نہیں ہوا۔"

پاول اوانچ بن سنور کر مقررہ وقت پر مکان سے نکلا۔ پارک میں حسبِ معمول بڑی چہل پہل تھی۔ سرخ۔ سبز۔ زرد۔ گلابی پیراہن میں ملبوس عورتیں مصروفِ گلگشت تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ "ان پریوں میں سے وہ کون ہوگی" وہ متحیر اور ساتھ ہی خوفزدہ تھا "لیکن میں ڈر کیوں رہا ہوں [illegible] کیا میں اب آگے نہ بڑھ سکوں گا ۔۔۔ میں بھی [illegible] ہوں۔ کیوں کس سے [illegible] کیوں خوف کھاؤں ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

نوعمر حسین لڑکی اس [illegible]

[illegible]

وہ شرماسی گئی ہے۔ لجائے ہوتے ہے سارے جسم میں ہلکی ہلکی سی کپکپی ہے اور زیرلب کہہ رہی ہے "میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"کاش میری شادی نہ ہو چکی ہوتی" اس نے چونکتے ہوئے دل میں کہا "پھر بھی میں کوئی گناہ نہیں کر رہا ہوں۔ اپنی زندگی میں یہ میرا پہلا موقع ہے۔ اور میری بیوی بھلا میرے معاملات سے کیا تعلق۔ آٹھ سال تک میں نے اس سے محبت کی۔ بس یہ کافی ہے.... اب میں زیادہ اپنی محبت کی توہین نہیں کروانا چاہتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب اس سے نفرت بھی ہو گئی ہے۔"

یہ سوچتا ہوا وہ پارک کے مغربی گوشے کی طرف آیا۔ اُس کنج میں ایک بنچ پڑی ہوئی تھی جس کو پھولدار درختوں نے اور جنگلی انگور کی بیل نے گھیر رکھا تھا۔ اور سامنے مرمریں لیتا ہوا پانی عجیب منظر پیدا کر رہا تھا۔ "میں وقت سے کچھ پہلے ہی آ گیا ہوں۔" اُس نے اپنے دل میں کہا۔ "غالباً یہاں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ لیکن جونہی وہ داخل ہوا اس نے دیکھا کہ ایک شخص بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا ہے قریب پہنچنے پر پاول اوانچ نے دیکھا کہ وہ اس کی بیوی کا چھوٹا بھائی مٹیا ہے۔

"اوہ تم ہو" اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور ٹوپی اتار کر بنچ پر بیٹھ گیا۔

"جی ہاں میں ہوں" مٹیا نے جواب دیا۔

دو منٹ تک کامل سکوت رہا۔

"معاف فرمائیے گا" مٹیا نے کہنا شروع کیا "کیا میں آپ سے یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ آپ مجھے یہاں تنہا چھوڑ دیں۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ کسی شخص کی موجودگی میں میں کتاب اچھی طرح نہیں پڑھ سکتا۔ خیالات منتشر ہوتے جاتے ہیں۔"

[illegible]

نے نہایت سنجیدگی سے کہا "کیا دیکھتے نہیں ہو یہاں کس قدر تاریکی ہے۔ کھلی فضا تمہارے پڑھنے کے لئے بہت مناسب ہوگی علاوہ اس کے میں کچھ دیر کے لئے یہاں لیٹنا چاہتا ہوں۔ یہاں زیادہ گرمی نہیں ہے۔"

"آپ لیٹنا چاہتے ہیں لیکن میرے پڑھنے کا نقصان ہوتا ہے" مٹیا نے کہا۔ "میرا یہ مضمون بہت اہم ہے اور جناب تو جانتے ہیں کہ میں امتحان میں اول آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

کچھ دیر کے لئے پھر خاموشی ہو گئی۔

پاول اوانچ پھر تصورات کی رنگین رو میں بہہ رہا تھا۔ یکایک وہ چونک پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

"اٹھو مٹیا اٹھو" پاول نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔ "تم چھوٹے ہو۔ دیکھو تم کو میرا خیال کرنا چاہیئے۔ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں کچھ دیر کے لئے لیٹنا چاہتا ہوں۔ جاؤ چلے جاؤ۔"

"یہ بڑی خود غرضی ہے۔ آپ تو یہاں رہیں اور میں مچھروں میں۔ آپ سے پھر کہتا ہوں کہ میں کہیں نہیں جا سکتا۔ مجھے یہاں رہنا ہوگا۔"

"دیکھو میں تم سے بہ عاجزی کہتا ہوں.... مانا کہ میں خود غرض بیوقوف اور جاہل ہوں مگر میں تم سے کہتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں نے تم سے کبھی کوئی خواہش نہیں کی۔ آج ایک درخواست کرتا ہوں۔ مان جاؤ۔ اپنی [illegible] کا ثبوت دو۔"

مٹیا نے [illegible]

عجیب [illegible] یہاں اس سے

کبھی نہ آئے گی۔ ناممکن ہے۔

"مٹیا سنو" اس نے کہا۔ میں تم سے آخری مرتبہ کہتا ہوں ... مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تم بڑے سمجھدار لڑکے ہو۔"

"میں نہیں سمجھتا آپ اس قدر مصر کیوں ہیں؟" مٹیا نے اپنے شانوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "میں کہہ چکا ہوں کہ میں نہیں جا سکتا۔ میں ہرگز نہ جاؤں گا۔ مجھے یہاں ٹھہرنے کی ضرورت ہے۔"

ٹھیک اس وقت اوایخ کو ایسا معلوم ہؤا کہ ایک عورت نے کنج میں جھانکا۔ لیکن ان دونوں کو لڑتا دیکھ کر غائب ہو گئی۔

"وہ چلی گئی" پاول اوایخ نے مٹیا کو دیکھتے ہوئے اپنے دل میں کہا، وہ اس بدمعاش کو دیکھ کر لوٹ گئی۔ تمام بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔"

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ اٹھا۔ اپنی ٹوپی پہنی اور مٹیا سے مخاطب ہؤا۔

"تم نالائق، کمینے اور ذلیل ہو۔ بالکل جانور ... جانتے ہو تمہاری وجہ سے مجھے کتنا نقصان اٹھانا پڑا۔

"یہ سنکر میں بہت خوش ہؤا" مٹیا اٹھتے ہوئے بڑبڑایا "مجھے بھی آپ سے یہ کہنا تھا کہ آپ کی بے جا خلل اندازی سے میرا جو حرج ہؤا اس کی تلافی اب شاید ہی ہو سکے!

پاول اوایخ کنج سے باہر نکل آیا۔ اُسکے ساتھ ساتھ مٹیا بھی چلا۔ تمام پارک اس کی نظروں میں تاریک تھا اور ہر چیز سے وحشت ٹپکتی تھی۔

"زندگی میں ایک ایسا موقع آیا تھا؟" اس نے غصہ میں خود سے کہا۔ افسوس کہ وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اب وہ بگڑ گئی ... [illegible] بھاگ کر چلی گئی۔"

رات کے کھانے پر پاول اوایخ اور مٹیا دونوں نے ایک دوسرے سے نہ آنکھیں چار کیں اور نہ ہی حسب معمول کسی قسم کی گفتگو کی ... ہر ایک دوسرے سے نفرت کر رہا تھا۔

"تم ہنستی کیوں ہو" پاول اوایخ نے اپنی بیوی کو ہنستا دیکھ کر پوچھا۔ "صرف احمق ہی بلا وجہ ہنسا کرتے ہیں۔"

بیوی نے اپنے شوہر کے غصہ سے چہرے کو دیکھا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"وہ کس کا خط تھا آج صبح جو آپ کے نام آیا تھا" بیوی نے دریافت کیا ...

"میرے نام ...... مجھے کوئی خط نہیں ملا" پاول اوایخ نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو؟"

"خوب یہ دروغ گوئی آپ نے کب سے سیکھی۔ خیر لیجئے میں ہی بتائے دیتی ہوں۔ وہ خط میں نے ہی بھیجا تھا ...... ہاں میں نے ہی ... ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔"

پاول اوایخ زرد پڑ گیا۔ اور اپنی رکابی پر جھک گیا۔

"بیہودہ مذاق" وہ بڑبڑایا۔

لیکن میرے [illegible] آپ کی [illegible] کی حفاظت کرتا [illegible] ترکیب تھی۔ وہ [illegible]

جناب پروفیسر احسن مارہروی

نذرِ اقبال

اے ادیبِ خوش بیاں! اے شاعرِ شیریں زباں
تیرے سوز و ساز سے معمور ہے سارا جہاں

تیری میٹھی بات ہے ایران کی شاخِ نبات
طوطیٔ شیراز جس کی مدح میں رطب اللساں

عودِ ہندی بن کے پھیلی تیرے نغموں کی صدا
تو ہے شاگردِ رشیدِ بلبلِ ہندوستاں

پیرِ رومی سے پڑھا ہے معرفت کا فلسفہ
پھر فصیح الملک سے پایا فصاحت کا نشاں

ساحری ہے شاعری تیری کہ ہے پیغمبری
ہے طلسمِ معنوی ہیں جس کے اعجازِ بیاں

تیری تصنیفات ہیں آئینہ بردارِ کمال
جن سے جوہر تیرے مثلِ روزِ روشن ہیں عیاں

کر دیا وہ راز، اسرارِ خودی نے منکشف
نفس کی عزت بڑھی جس سے بنا دل نکتہ داں!

ہیں رموزِ بےخودی میں وہ کنائے واشگاف
غفلتوں نے کر دیا تھا جن کو پردے میں نہاں

ہے زبورِ فارسی تشریحِ اسرار و رموز
معرفت کی جس نے سلجھائیں ہزاروں گتھیاں

کی عطا جاوید نامے نے حیاتِ سرمدی
سلسلہ جس کا زمیں سے لے کے ہے تا آسماں

ہے پیامِ مشرق ایسا کارنامہ جس کے بعد
بن گئی مجذوب کی بڑ گوئٹے کی داستاں

نیل ڈالے جس نے سینے میں وہ ہے ضربِ کلیم
جس سے ہر فرعونِ بےساماں کا دل ہے نیم جاں

نام جس مجموعے کا مشہور ہے بانگِ درا
اُس نے چونکایا جہاں کو کارواں در کارواں

آخری تصنیفِ اُردو یعنی بالِ جبرئیل
عرش پر ہے اُس کا شہبازِ تخیل پرفشاں

علم کی دنیا میں حاصل ہے قبولِ عام اُنہیں
مستفیض و مستفیداں سے ہیں سب خورد و کلاں

قصہ کوتہ، تیرے ارشادات و ملفوظات نے
اہلِ حکمت میں بڑھا دی آبروئے شاعراں!

ورنہ تھی یہ شاعروں کی قدر و عزت فی المثل
ہو کوئی احسن تو اُس پر بھی ہو اکذب کا گماں

زندہ باد اے مصلحِ آئینِ حکمت زندہ باد
دی حیاتِ تازہ تو نے اے مسیحائے زماں!

اور کیا کہئے کہ آئینہ ترا احوال ہے
[illegible] اقبال ہے

جناب صادق قریشی بی۔اے

تاج

(سرزمینِ ہندوستان کا وقارِ نسوانی کو سب سے بڑا خراج)

شاہجہان دکن کی مہمات پر جا رہا تھا کہ برہان پور کے قریب ممتاز محل بیگم ایک بچے کی پیدائش کے وقت اس جہان سے رخصت ہوگئی۔ شاہجہان کے لئے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے دریا کے اس پار ایک باغ میں اپنی متاعِ گرانبہا کو سپردِ خاک کر دیا (۱۶۳۰ء) دریا کے اس پار جنگ برپا تھا۔ بادشاہ آصف خاں خان زماں اور دیگر اکابر کے ساتھ احمد نگر کے جھمیلوں میں گرفتار تھا۔ فتح محمد مرتضٰے نظام۔ شاہ جی بھونسلہ وغیرہم کے ہتھکنڈے فوری توجہ کے قابل تھے۔

غمگین شہنشاہ انہی جھمیلوں میں ہفتہ کے چھ دن گذار دیتا اور جمعہ کے روز دریا کے اس پار دیارِ محبوب میں آتا اور تمام دن گریہ زاری میں گذارتا۔ آہ اے جذبۂ غم! سب سے بڑھکر شان و شوکت اور کرّ و فر رکھنے والے شہنشاہِ ہندوستان کے دل کو بھی تو نے اپنی جولانگاہ بنا کے چھوڑا۔

موت کے بے رحم ہاتھوں نے شہنشاہ کی آغوش سے اُسکے مایۂ راحت کو تو چھین لیا مگر وہ اُس کے غیرفانی جذبۂ الفت کو فنا نہ کر سکے۔ شاید یہ اس عظیم المرتبت شہنشاہ کی دلنواز محبوبہ کا غیرفانی حسن تھا جس نے جمنا کے کنارے ایک مجسم براقی صورت اختیار کر لی۔ اور

[illegible]

تعبیر تھی۔ جو اس نے برہان پور کے باغ میں مرقدِ محبوب کے پہلو میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ اس عظیم الشان وصیت کی بہترین تعمیل تھی۔ ممتاز نے دمِ رخصت آنکھیں اٹھا کر غازی بادشاہ کے مرجھائے ہوئے چہرہ کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ "حق تعالےٰ شمارا چہار پسر و چہار دختر عطا کردہ حاجتِ نکاح دیگر نیست۔ و دیگر آنکہ بہر مرقدِ من چناں مقبرہ بسازید کہ از من یادگارے بماند" اور غازی بادشاہ نے دل و جان سے دونوں وصیتیں گریہ و زاری کے عالم میں قبول کی تھیں۔

تمام دنیا نے تاج محل کی بجا طور پر تعریف کی ہے۔ عجائباتِ عالم میں شمولیت کا اولیں استحقاق اسی عمارت کو پہنچتا ہے۔ جب ہم اس نادرۂ روزگار "دودھیا رنگ کے عجوبہ" کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو تحسین۔ انبساط اور تعجب کے جذبات باہم ملکر ہمارے خیالات کو ایک مرکز پر لاتے ہیں اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ انسانی محبت تاریخ عالم میں اس سے پہلے کبھی بھی اتنی جدوجہد۔ جوش و خروش اور کامیابی کے ساتھ موت کے سحرِ فراموشی کے ساتھ برسرِ پیکار نہیں ہوئی ہندوستان کے سب سے زیادہ دولتمند شہنشاہ نے وقارِ نسوانی کو یہ خراج پیش کیا۔ ارجمند بانو کے لئے الفتِ خسروی کا یہ بہترین مظاہرہ تھا۔ دریائے جمنا کے کنارے آگرہ کے جنوب کی طرف ۱۶۳۱ء میں راجہ مان سنگھ

[illegible]

سال تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ عمارت کے ڈیزائن پر بہت غور و خوض ہوتا رہا۔ پہلے لکڑی کا ایک نمونہ تیار کیا گیا۔ اور اس کے مطابق ۱۶۴۸ء میں عمارت تکمیل کو پہنچی۔ اس کی بلندی چوڑائی سے زیادہ ہے۔ اور تعمیر میں نسوانی نزاکت۔ ملائمت۔ نفاست اور خوبصورتی کا بہت دخل ہے۔ یورپ کے نقادانِ فن اس کے ڈیزائن میں یورپین ہاتھ کار فرما دیکھتے ہیں۔ مگر جدید تحقیقات نے ان کے تمام دعاوی جھوٹے ثابت کر دیئے ہیں۔ سلیمین (Sleeman) کہتا ہے۔ "اس عمارت کا نمونہ کسی فرانسیسی یا اطالوی ماہر تعمیرات نے تیار کیا"۔ یہ ہے یورپ والوں کا دعوےٰ سلیمن کے نزدیک استاد عیسیٰ اس کا ڈیزائنر تھا۔ انکا بیان ہے کہ اس شخص کا اصلی نام ماسٹر جیس تھا اور وہ لازمی طور پر عیسائی تھا۔ ہندوستانیوں نے اس کے نام کا ترجمہ استاد عیسےٰ کر لیا۔ مگر تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ اس کا اصل نام محمد عیسےٰ تھا۔ اور وہ شیراز، روم یا سمرقند سے آیا تھا۔ ان تین مقامات میں سے ایک اسکی جائے ولادت ہے اور ممکن ہے کہ باقی دو میں وہ عرصہ دراز تک مقیم رہا ہو۔ ایک اور یورپین گروہ آسٹن ڈی بورڈ .... (Austin De Bourdeaux) کو تاج کا نقشہ کش مانتا ہے۔ یہ شخص مدت تک شاہجہان کے دربار میں مقیم رہا تھا۔ مگر اسکے متعلق خود محققینِ فرنگ میں اختلاف الرائے ہے۔ اکثریت ان کی ہے۔ جو اس دعوے کو باطل سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد فادر منریق (Father Manrique) نامی ایک عیسائی مبلغ کا دعوےٰ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مشنری شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اس کا بیان ہے کہ مقبرہ کا ڈیزائن ویرونیو (Veronio) نامی ایک اطالوی نے تیار کیا۔ مشہور انگریز مورخ مسٹر وی اے سمتھ .. (V A Smith) مصنف ... کو اس رائے سے

پورا پورا اتفاق ہے۔ سمتھ کے پاس "منریق" کا بیان اس لئے درست ہے کہ وہ ایک مشنری تھا جس سے دروغ گوئی کی قطعاً توقع نہیں کی جا سکتی! دوسرے وہ ممتاز محل بیگم شاہجہان کے باپ آصف خاں سے گہرے تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے مقبرہ بچشم خود بنتے دیکھا اور وہ اس کی تکمیل سے قبل فوت ہوا

ہندوستان کی فارسی کتب تواریخ میں ویرونیو کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ اگرچہ سمتھ اسے سازش پر مبنی سمجھتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تاج کی تعمیر خالصاً ایشیائی ہاتھوں سے ہوئی اور اس کے نقشہ کو یورپ والوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ فن تعمیر کے علما اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ عمارت کی طرز میں مینار اور گنبد اسلامی طرز تعمیر کے نمائندے ہیں اور بیش قیمت زیب و زینت۔ مرمریں نفاست اور تعمیر کے دیگر اجزا ہندوستانی ہیں۔ اور کوئی خفیف سے خفیف سا مغربی لمس اس میں ہے (بفرضِ محال) تو وہ اس کے نقشہ کش استاد عیسےٰ کے یورپ کے قریب تر رہنے کی وجہ سے ہے۔

کتب میں مذکور ہے کہ بیس ہزار آدمی اس مقبرۂ بے نظیر پر روزانہ کام کرتے اور سب کو باقاعدہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ تنخواہیں بھی معمولی نہیں تھیں۔ استاد عیسےٰ نقشہ نویس۔ محمد حنیف سپرنٹنڈنٹ معماران (اکبرآبادی) امانت خاں طغریٰ نویس (شیرازی) محمد خاں خوشنویس (بغدادی) ایک ایک ہزار روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ اسمٰعیل خاں گنبد ساز۔ محمد شریف سر معمار۔ موہن لال پچیکار پانچ پانچ سو روپیہ ماہوار لیتے۔ منوں لال و منوہر سنگھ پچیکار اور کاظم خاں کلس ساز دو سو سے پانچ سو تک ماہوار تنخواہ لیتے۔ دیگر معمار جو اسی۔ پچہتر اپنی قابلیت اور کارکردگی کے لحاظ سے پاتے۔ ادنےٰ سے ادنےٰ مزدور کو ... روپیہ ماہوار سے کم نہیں ملتا تھا۔ ایک

ضروری اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں روپیہ کی بہت قدر تھی۔ اور جنس ارزاں تھی۔ اس زمانہ کے پانچ روپے آج کل کے چالیس روپوں سے کسی صورت کم نہ تھے۔ تو گویا تاج کی تعمیر میں آٹھ آٹھ ہزار روپیہ ماہوار لینے والے کاریگر بھی کام کرتے تھے۔ یہ تنخواہ آج کل کے کسی ہندوستانی صوبہ کے گورنر کی تنخواہ کے برابر ہے۔

عمارت پر قسم قسم کے قیمتی پتھر صرف ہوئے۔ مگر سب سے زیادہ کھپت سنگِ مرمر کی ہوئی جو جے پور کے علاقہ سے آتا تھا پچیکاری اور منبت کاری کے لئے عقیق بغداد سے یمنی یمن سے۔ لہنیہ دریائے نیل سے۔ تانبرہ گنگا سے۔ عورتی کیمے سے۔ لاجورد لنکا سے۔ سنگ مجوز سورت سے۔ سنگِ موسیٰ جھارٹی سے۔ سنگ کھٹو جسلمیر سے۔ فیروزہ تبت کلاں سے۔ سنگِ رخام مکران کے ساحل سے۔ مونگا سمندر سے سلیمانی میسور اور دکن سے۔ سنگ نخود سیگڈھ سے اور اسی طرح سنگ یشب سنگ سرخ۔ سنگ خاد زہر سنگ ابری۔ سنگ خارا۔ سنگِ بلور۔ یاقوت۔ زمرد۔ ہیرا۔ نیلم۔ سماق۔ مقناطیس وغیرہ مختلف مقامات سے اکر صرف ہوا۔ افسوس کہ اب یہ تمام قیمتی پتھر بالکل اسی طرح موجود نہیں۔ جواہرات ہی نہیں گم ہوئے بلکہ بڑی بڑی سنگِ مرمر کی چوکھٹیں طلائی اور نقرئی کواڑ اور موتیوں کی بیش قیمت مرقد پوش وغیرہ سب کا کہیں نشان تک نہیں ملتا۔ شاہ عالم ثانی اور فرخ سیر کے زمانہ میں اور اس کے بعد آگرہ اور دہلی مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ کا میدان بنے ہوئے تھے۔ اور بیچارہ تاج بھلا کیسے ان کی دستبرد سے بچ سکتا۔ مثال کے طور پر تیس سنگِ مرمر کی جوڑیاں منبت کاری سے مزین ۱۷۶۱ء میں سورج مل جاٹ راجہ بھرتپور لے گیا تھا۔

اب ہم تاج کی لاگت کا اندازہ کرتے ہیں۔ بادشاہ نامہ میں تاج کا کل لاگت پندرہ لاکھ روپیہ ... [illegible]

پندرہ لاکھ روپیہ۔ مگر تواریخ میں بالتفصیل اخراجات درج ہیں جو او دھر اس خزانچی کی معرفت خزانہ سے دئے گئے۔ مثال کے طور پر چند ایک اخراجات درج کئے جاتے ہیں:-

خاص عمارت روضہ	۹۷۵۵۳۲۶	روپیہ
مسجد مع حوض در صحن	۸۲۵۸۲۱	”
ہر چہار مینار ہائے روضہ	۵۱۷۷۹۷۴	”
تعویذ ممتاز محل ارجمند بانو بیگم	۴۵۹۲۲	”
تعویذ بالا	۵۹۱۵۷	”
کواڑ سنگ یشب مع جواہرات طلا	۵۴۶۰۶	”
جالی سنگِ مرمر	۶۸۸۵۵	”
تانبے کے کواڑ میناروں کیلئے اور میناروں کے تمام کواڑ	۲۵۳۳۷	”
تسبیح خانہ مع حوض صحن	۸۵۴۶۲۵	”
بیرونی دروازہ باغ	۲۸۱۲۲	”

اس کے علاوہ دو طرفہ برج۔ مکانات۔ بیرونی دروازہ سے مسجد تک۔ نہر۔ فواروں۔ اور دوسری چوکھٹوں وغیرہ کے اخراجات کا اندازہ خود کیا جا سکتا ہے سنگِ مرمر اور دوسرے پتھروں کی قیمت اور اجرت باربرداری وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔ ملازمین کی تنخواہوں کا خرچ گوشوارہ بالا میں جمع کیا ہوا ہے۔

جب مقبرہ ہر طرح سے مکمل ہو چکا تو میر عمارت نے خوشخبری بادشاہ سلامت تک پہنچائی۔ بادشاہ غازی ملاحظہ کے لئے آئے۔ روضہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ممتاز محل کے سرانے بیٹھ کر نامعلوم اس سے کیا کیا باتیں کیں۔ دیکھنے والوں نے تو فقط آنسو بہتے دیکھے۔ تواریخ میں ختم کرد ... [illegible]

اور آثار کے ماتحت ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں (کلام الملوک ملوک الکلام)

زہے مرقد پاک بلقیس عہد | کہ بانوئے آفاق راگشتہ مہد
منور بقا مے چو باغ بہشت | معطر چو فردوسِ عنبر سرشت
بریں بقعۂ پاک والا مقام | ترشح کناں ابر رحمت مدام
ہوا آتش زعفت حجاب آفریں | نسیمش زغنچہ است خلوت گزیں
خداوند روزی رسان حیات | بریں در کند چشم ہیچو برات
اساسش بود چوں زمیں پائدار | چوں ایمانِ صاحبدلاں استوار
چو در محکمیہاش پرداختند | برائے بقا ما منے ساختند

(مکمل نظم میں تئیس ۲۳ اشعار ہیں)

اس کے بعد ہر سال سالانہ عرس منعقد کیا جاتا جس پر کئی ہزار حافظ قاری جمع ہو کر کئی ہزار قرآن ایک دن میں ختم کرتے۔ اور بعد ازاں شرفا کو پر تکلف دعوتِ عام دی جاتی اور غربا و مساکین کی شکم پری کی جاتی۔ قریباً ایک لاکھ روپیہ ہر عرس پر صرف ہو جاتا۔ شاہجہان کے بعد اورنگ زیب نے ایک عرس تو تنتیس ہزار روپیہ میں کیا۔ اور بعدہٗ چند صد تک نوبت پہنچ کر رہ گئی۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ شاہجہان کی وفات کے بعد اُسے اورنگ زیب نے اُس کی محبوبہ کے پہلو میں لٹا دیا۔ حالانکہ یہ اس کی آرزو کے خلاف تھا۔ ممتاز کی قبر گرہ کے عین وسط میں ہے۔ اور بادشاہ اس کی بائیں جانب ابدی خواب میں محو ہے۔

غمزدہ شہنشاہ اسی طرز کا ایک اور مقبرہ جمنا کی دوسری جانب سیاہ پتھر سے بنوانا چاہتا تھا۔ اور عشق و وفا کی ان دو آرامگاہوں کو ایک پل کے ذریعہ آپس میں ملانا چاہتا تھا۔ سنگ اسود کو اس کی تاریکی بخت کا نشان بننا تھا۔ اور سنگِ مرمر اس کی سفید آنکھوں کا نور۔ وہ مصائب ہجر و فراق کی دردناک تفصیل اور یہ بہارستان شباب کی نہ بھلائی جانے والی داستان۔ کلفت اور راحت کے ان مجسم جذبات کو دوش بدوش کھڑا ہونا تھا۔ مگر آہ! انسانی تجاویز تو لمبی چوڑی ہیں۔ مگر عرصۂ حیات اور میدانِ مقدرت بہت تنگ ہے شہنشاہ کے بیٹوں کی خانہ جنگیاں اور بعد میں اس کی زندانی مجبوریوں نے اس کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ قیدخانہ روزن میں سے تاج اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ فگن ہوا کرتا تھا۔ اور بوڑھے شہنشاہ کی آنکھیں ہمیشہ اسکی طرف ٹکٹکی باندھے رہتیں۔ خدا معلوم ان سفید سفید آنکھوں کو کیا کیا کچھ نظر آتا تھا۔ اور اس طرف سے آنیوالی ہوا اُسے کیا کیا پیغام سنایا کرتی تھی۔

وفات ارجمند بانو بیگم عرف ممتاز محل ۱۶۳۱ء

وفات شہنشاہ شہاب الدین شاہجہان بادشاہ غازی ۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء

نوٹ: (۱) خط و کتابت کرتے وقت جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی خط بھیجنا ضروری ہے۔

(۲) رسالہ ہر ماہ دس تاریخ سے پہلے شائع ہو جاتا ہے۔ عدم وصول رسالہ کی اطلاع جلد سے جلد دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے۔

(۳) منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر ضرور لکھئے۔

(۴) ہر قسم کی ترسیل زر کا پتہ خواہ وہ مکتبہ سے ہو یا رسالہ سے مینجر رسالہ ادب لطیف یا مینجر مکتبہ اردو ملا ہور ہونا چاہیئے۔

جناب عبدالرحیم شبلی، بی کام

"ادبِ لطیف" کے سالنامہ ۳۸ء پر

ایک تنقیدی نظر

ہر چند کہ ایک مقالہ نویس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ایک اچھا ناقد بھی بن سکے۔ تاہم اگر ایک باذوق قاری اور صحافت کے عملی پہلو سے تعلق رکھنے والے کی حیثیت سے وہ اپنی مخلصانہ رائے کا اظہار کردے تو میری دانست میں چنداں حرج نہیں۔

کارپردازانِ رسالہ "ادب لطیف" کے مساعی سزاوار صد تحسین آفرین ہیں کہ وہ اس مرتبہ اپنا سالنامہ سب سے پہلے منصۂ شہود پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ اور باوجودیکہ اس وقت تک متعدد سالنامے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی رسالہ بھی ہر پہلو کے لحاظ سے سالنامہ "ادب لطیف" کے معیار تک نہیں پہنچ سکا۔ اسکے لئے تمام مبارکباد کے مستحق جناب میرزا ادیب بی۔ اے اور جناب چودھری نذیر احمد صاحب ہیں۔ اول الذکر کی حسنِ ادارت اور مؤخر الذکر کی انتظامیہ قابلیت مسلمہ ہے جناب چودھری برکت علی صاحب بی۔ اے اگرچہ "خاموش حصہ دار" ہیں۔ لیکن اُن کی صلاحیت کی جھلک ہر مقام پر نظر آ رہی ہے۔

سالنامہ فنی نقطۂ نظر سے

سب سے پہلی چیز جو ایک قاری کی دلکشی کا باعث بنتی ہے۔ وہ سالنامہ کی ظاہری شکل وشباہت "یا گٹ اپ" ہے۔ سرورق چار مختلف رنگوں کے امتزاج سے تیار کیا گیا ہے۔ تصاویر تھوڑی ہیں۔ لیکن چونکہ آرٹ کے نقطۂ نگاہ سے کامیاب ہیں۔ اس لئے بہت کافی ہیں۔

سب سے پہلی تصویر "میر کارواں" کی ہے۔ جس کو اولین نگاہ سے دیکھتے ہی کچھ ہنسی سی آ جاتی ہے۔ کیونکہ جو صاحب "میر کارواں" بنے ہیں۔ ان کی ہیئت کذائی اور شکل وشباہت ہی ایسی ہے لیکن اگر اُس وثوق اور اعتماد کو دیکھا جائے۔ جو اس مختصر سے دیہاتی قافلہ کے چہروں پر پایا جاتا ہے۔ تو انسان کو بہت کچھ سبق حاصل ہوتا ہے۔ اگر ایک آنکھ بند کر کے اِس تصویر کو دیکھا جائے۔ تو پس منظر بھی نہایت دلربا اور دلکش معلوم ہوگا۔

دوسری تصویر "جاپانی دوشیزہ" کی ہے جو اس رسالہ کی جان اور آرٹ کا بہترین نمونہ قرار دی جا سکتی ہے۔

تیسری تصویر "فلورا" یا بہار کی دیوی ہے۔ جس کی بقول مدیر "ادب لطیف" رگ رگ سے بہار کی نشاط طرازیوں کا اظہار ہو رہا ہے۔

چوتھی تصویر "دیہاتی دوشیزہ" کی ہے جو کسی گوشۂ چمن میں نہایت اضطراب وبے قراری کی حالت میں کھڑی ہے۔

علمی مقالات

اسرارِ خودی۔ جناب حکیم عشق امروہی نے ڈاکٹر سر محمد اقبال

کی مثنوی اسرارِ خودی پر ایک مفید مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر اقبال کی فارسی شاعری کی خصوصیات اور اُس جدید فلسفہ اور تصوف پر بھی جو علامہ موصوف نے پیش کیا ہے۔ ایک عجیب بحث ہے۔

فلسفۂ خندہ ۔ جناب عبدالرشید صاحب طارق ایم اے کا یہ مقالہ اُن تمام مقالات سے بہتر اور حقائق افروز ہے۔ جو اس موضوع پر انگریزی اور اُردو میں ابتک میری نظر سے گزرے ہیں

دنیا کی اہم سیاسی تحریکات ۔ یہ مضمون تو عاجز راقم کا ہی ہے لیکن بہترین تنقید وہ ہے جو انسان اپنے اعمال و اقوال پر خود کرے۔ اس لئے اس سلسلہ میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے اس مضمون میں سوشلزم۔ بولشوزم۔ کمیونزم۔ نہلزم۔ انارکزم۔ سنڈکلزم۔ لبرلزم اور فیشزم وغیرہ پر ایک مجمل بحث کی ہے۔ میرا مطمح نظر ان تحریکات کا فلسفہ بیان کرنا رہا ہے۔ نہ کہ اُن کے حسن و قبح کی طرف توجہ کرنا۔ اس لحاظ سے میرا خیال ہے کہ یہ مضمون ایک ایسی علمی واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ جسکی ہر صاحبِ ذوق کو آج کل ضرورت ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں یہ دیکھنا اب قارئین کا کام ہے۔

نغمۂ تحقیق ۔ اس مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب پروفیسر بیخود موہانی (راقم مضمون) نے سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب لکھنوی کی کسی کتاب "ہماری شاعری" پر کوئی تنقید کی تھی۔ جس کا جواب اثر لکھنوی نے دیا۔ لیکن جناب بیخود موہانی کو اُس سے اختلاف ہے۔ اس لئے انہوں نے "نغمۂ تحقیق" کے زیرِ عنوان ایک مبسوط تنقیدی جواب الجواب تیار کیا۔ جواب سالنامہ ادب لطیف کی زیب و زینت ہے۔ اس مقالہ کا لہجہ نہایت کرخت ہے۔ لیکن صاحبِ مضمون نے مولانا عرفی کے اس شعر سے جو مضمون کی پیشانی پر درج ہے۔ اسکے لئے پہلے ہی معذرت کر دی ہے ؎

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

کسان ۔ جناب عطا اللہ صاحب پالوی نے یہ تحقیقی مقالہ لکھ کر شعراء کی توجہ ایک ایسے موضوع کی طرف مبذول کر دی ہے۔ جو ہنوز تشنہ اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت اہم اور ضروری ہے پالوی صاحب نہایت وسیع المطالعہ اور بالغ نظر ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ اور انہیں اخذ و اقتباس کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ جو صحیفہ نگاری کی ایک اہم مشق ہے۔

تنقیدِ ادب ۔ جناب عبدالرشید صاحب بی اے نے یہ مضمون نہایت عالمانہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ اور ایک نقاد کے فرائض و خصائص کی طرف علی الخصوص توجہ دلائی ہے۔ جن پر اگر اردو ادب کے ناقدین عمل کریں تو ہماری تنقید بہت کچھ سدھر سکتی ہے۔ صاحبِ مقالہ نے بتایا ہے کہ ایک نقاد کے اندر تین خصائص ہونا ضروری ہیں

۱۔ لطافتِ ذوق۔ ۲۔ وسعتِ مطالعہ اور ۳۔ جذبۂ خلوص

اور جب تک یہ نہ ہوں کسی شخص کو تنقید ایسے نازک مسئلہ پر قلم اٹھانے کی جرأت نہ کرنا چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موضوع پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ مقالات لکھے جائیں تاکہ ——— (pseudo critic) خود ساختہ ناقدین کی مزید پیداوار بند ہو سکے۔

اندر سبھا ۔ اس موضوع پر جناب سید امتیاز علی صاحب تاج نے ایک بہت اچھا مضمون دہلی سے براڈکاسٹ کیا تھا۔ ادب لطیف والوں نے حضرت تاج سے لیکر درج سالنامہ کیا ہے۔ ریڈیو پر بعض بہت اچھے مقالات پڑھے جاتے ہیں۔ جو اگر رسائل و جرائد والے محفوظ نہ کریں تو غالباً فضا میں ہی تحلیل ہو کر رہ جائیں۔ تاج صاحب کا یہ ناقدانہ

مضمون نہایت دلچسپ ہے علی الخصوص اُس شخص کے لئے جس نے اس موضوع پر میڈن والوں کی فلم بھی دیکھی ہو۔

مزاحیہ مضامین اور ڈرامے

لیٹر بکس کا اغوا ۔ مدت ہوئی اخبار احسان میں ادبِ لطیف والوں کو ایک نوٹس پڑھا تھا کہ ۔۔ "حاجی لق لق صاحب کا لیٹر بکس کلکتہ اردو میں پڑا ہے۔ حاجی صاحب آکر لے جائیں" اُس وقت تو ہم یہ چیستان سمجھ نہ سکا لیکن سالنامہ میں اِس حادثہ کی دلچسپ تفصیل خود جناب لق لق کی زبانی درج ہے۔

مرحوم۔ جناب صاحبزادہ محمد عمر صاحب کا ایک نہایت عمدہ مزاحیہ ڈرامہ ہے

ایک خاوند کی ضرورت ۔ یہ ایک ایکٹ کا مطائبہ جناب خلیل بی۔ اے نے رقم فرمایا ہے۔ اور میری رائے میں سالنامہ کا بہترین مزاحیہ مضمون ہے۔ ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھنا بھی کار بڑے دل والا ہے لیکن حبیب صاحب کے مضمون سے بھی یہ ڈرامہ جناب خلیل نے اقتباس کیا ہے وہ اپنے مقصد میں نہایت کامیاب ہے

ابا جان اور اُنکے صاحبزادے ۔ ایک نہایت دلچسپ مزاحیہ مضمون ہے جناب مشتاق احمد خاں صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی نے کہیں سے مستفاد کیا ہے۔ مصنف نے بچوں کی نفسیات کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور "ابا جان" سے ایک صاحبزادہ کا مکالمہ نہایت دلچسپ پیرایہ میں لکھا ہے۔

افسانے

نالۂ دل۔ جناب صادق الخیری صاحب کا ایک رقت انگیز افسانہ ہے

ایک راز۔ مشہور مصور جناب عبدالرحمٰن صاحب چغتائی کا کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ ایک مصور ہیں۔ اس لئے منظر نگاری نہایت خوبی سے کر سکتے ہیں۔ اس افسانہ میں فقرات کی بندش نہایت حسین وجمیل ہے۔

پریم کا جادو۔ سراج الدین احمد صاحب نظامی نے ایف ڈبلیو بین کا یہ افسانہ نہایت میٹھی زبان میں منتقل کیا ہے۔ زہد و آزادی کو حسن کی تابناک شعاعوں کے سامنے پگھلتے ہوئے اس سے بہتر افسانہ میں دکھانا مشکل تھا۔

قاتل روح۔ محترمہ مسز عبدالقادر (والدہ سراج الدین صاحب ظفر بی۔ اے) اپنے پُر اسرار اور تحیر زا افسانوں کے لئے مشہور ہو چکی ہیں۔ یہ افسانہ بھی آپ کے مخصوص طرزِ نگارش کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے

قیمت:۔ ایم اسلم صاحب کا ایک اچھا افسانہ ہے۔

مشورہ۔ سید بادشاہ حسین صاحب حیدر آبادی کا ایک نیم مزاحیہ اور نیم المیہ افسانہ ہے۔

پریم کہانی۔ جناب ساغر جعفری صاحب کا یہ افسانہ ایک انگریزی رسالہ سے مقتبس ہے جس خوبی سے لائق افسانہ نویس نے انگریزی ماحول کو ہندوستانی بنایا ہے۔ اُس کے لئے اُن کی جتنی تعریف بھی کی جائے کم ہے۔

اخبار والا۔ پلاٹ عام ہے لیکن جناب ابوسعید قریشی نے یہ مختصر افسانہ نہایت دلآویز پیرایہ میں تحریر کیا ہے جو بیک وقت رقت انگیز اور سبق آموز ہے۔

بھوک۔ اختر انصاری صاحب ایک حزنیہ نگار شاعر اور ادیب ہیں میں آپ کی رباعیاں اکثر گنگنایا کرتا ہوں۔ یہ افسانہ کافی حسرت خیز ہے۔

ہر لفظ [illegible]

ایم۔اے کا یہ افسانہ سارے سالنامہ میں بہترین ہے۔اس میں ایک ایسے ادیب کی ذہنی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جو بوجہ بیماری و بیکاری نہایت اندوہناک حالات میں سے گزر رہا ہو۔اور یوں حبیب نے افسانہ کے دوران میں جو بعض نظریات پیش کئے ہیں۔وہ نہایت فکر انگیز ہیں۔افسانے کا آغاز ہی ان فلسفیانہ الفاظ سے ہوتا ہے:۔

"خدا ایک حقیقت مطلق ہے۔ اور مطلقیت کے لحاظ سے
عیب وصواب کا تصور لایعنی ہے۔ بھلائی اور برائی محض
اضافی الفاظ ہیں۔مگر انسانیت کے لئے خدا اور کائنات کی
اضافی حیثیت ہی حقیقت کبریٰ ہے کیونکہ ہم عرش کی سطح کو
نہیں دیکھ سکتے اور خدا کی طرح محسوس کرنے سے قاصر ہیں"

دکھی انسان خدا اور نظام قدرت کے خلاف ہو جاتا ہے لیکن کچھ فطری خوف غالب ہوتا ہے۔اس نے لکھا ہے کہ:۔

"وہ خدا کو بھول جانا چاہتا تھا۔کیونکہ وہ خدا کو برا کہنے کی
ہمت نہیں رکھتا تھا۔"

"وہ سارے نظام سے بغاوت کرنی چاہتا تھا۔اور خدا سے
بھی مگر آخرالذکر امر کی اُسمیں تاب نہ تھی۔"

جب انسان کے اندر کوئی امید کی شعاع نہ ہو تو اُسکی زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے۔چنانچہ یہی حال اس افسانے کے کردار کا ہوتا ہے۔

وہ ایک بے امید۔بے مستقل انسان تھا۔تقدیر کے ٹھوکروں کا
شکار۔امید نہ ہو تو ایمان کی بقا معلوم۔اُس کے سامنے کوئی
مقصد نہ تھا۔اُسکے اعمال کے پیچھے کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔
وہ ڈانواڈول ہو رہا تھا بغیر کسی تمنا کے بغیر کسی خوف کے۔"

"اس کے لئے زندگی کا کوئی اثباتی مقصد نہیں تھا بلکیت
[illegible]

کوئی لب اُس کی رُوح کو محبت کا پیغام پہنچانے والا نہ تھا۔
ہر طرف ایک مہیب و بھیانک خاموشی تھی۔ہر سو سرد مہری
جاوید ایک مہول بھائیں بھائیں کرتی ہوئی تاریکی میں غرق تھا"

ادبیات سے زندگی قابل برداشت ہو جاتی ہے۔افسانے کا کردار ادیب تھا اس لئے:۔

"وہ کشتی کی طرح بے سہارا ہو جاتا اگر ادب کی جل پری اُسکی
محبوبہ نہ ہوتی۔"

وہ ڈرامہ نگاری اور اداکاری کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ

"آرٹ کی تخلیق یا تو وسعت و انبساط کے عالم میں ہوتی ہے۔یا
تحدید و پابندی کی حالت میں۔ وہ فطرتیں جو ایک دنیا سے
سیر ہو جاتی ہیں۔دوسری دنیا کی تخلیق کرتی ہیں۔اور وہ فطرتیں
بھی خالق فن ہوتی ہیں جو اس دنیا کی محرومیوں سے تنگ آکر
عالم نو کی تعمیر پر مجبور ہوتی ہیں۔"

غرض سارے کا سارا افسانہ اسی قسم کے حقائق افروز بیانات سے معمور ہے یہ اقتباسات تو نمونہ مشتے از خروارے ہیں۔

سماج زادی۔نوشتہ حسن عباس صاحب بی۔اے۔ایک "سماج گزیدہ" عورت کی مختصر داستان ہے جو کسی سینما کمپنی میں شامل ہونا چاہتی ہے۔اور سمجھتی ہے کہ وہاں اُس کی عصمت محفوظ رہے گی۔

صحرانورد کا پانچواں خط۔جناب میرزا ادیب بی۔اے نے گذشتہ دو سالوں سے رسالہ ادب لطیف میں صحرائی داستانوں کا ایک رومان خیز اور پُراسرار سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔یہ اُردو ادبیات میں ایک بالکل جدید اور نادر چیز ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ افسانے ہر طبقہ کے لوگوں سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔

سالنامہ ۳۶ء میں میرزا ادیب موصوف نے جا و بال [illegible]

”ہاروت ماروت کا قصہ“ نہایت دلچسپ انداز میں رقم کیا ہے۔ یہ ایک حسین قاتل کی داستانِ عشق ہے۔ جو بابل میں اپنے خون آشام سحر سے ہلاکت آفرینیاں کر رہی تھی۔ بابل ایک نہایت رومان خیز شہر ازمنہ قدیم میں رہا ہے۔ خود مصنف کے الفاظ ہیں:-

میں جب اس کا خیال کرتا ہوں تو میرے تصور کی نگاہوں کے
سامنے ماضی کے بحرِ بے پایاں کی سطح پر ایک ایسا شہر نمودار
ہو جاتا ہے جس کے اونچے اونچے ہیبت ناک مینار، پُر اسرار باغ
شاندار معبد ہزاروں سال پیشتر کی انسانی زندگی کے حالات
سناتے ہیں۔ بابل . . . انسانیت کا اوّلیں گہوارہ، جہاں
دنیائے قدیم کا فاتحِ اعظم اسکندر سو رہا ہے۔ جہاں دریائے
فرات کے کنارے یہودی ولی عذرا ابدی خواب میں محو ہے۔
جہاں نمرود نے خدائی کا دعوےٰ کیا اور پھر انتہائی ذلت کے
عالم میں موت کے گھاٹ اتر گیا۔ جہاں اپنی محبوبہ ”اشارت“
کے لئے ایک قاہر بادشاہ بنوکدنضرِ اعظم نے معلق باغ لگوائے
. . . بابل . . . جہاں عیاش بادشاہ بیلشضر کے شاہانہ غرور نے خاندان ۴
۴ مگر آخری بزمِ عشرت میں مقدس پیالوں کی توہین کی۔ بابل۔
جہاں عیش پرست بادشاہ ہیروڈ نے اپنی سوتیلی بیٹی ”سلومی“
کے سحر زا حسن پر عاشق ہو کر فطرت کے انتظام کو جھنجھوڑا۔ بابل
. . . سحر و جادو کی سرزمین، حسن و جمال کی وادی، عشق و محبت
کا شہر بابل . . . دنیا کے ایک گوشہ میں کھنڈروں کی صورت
میں عظمتِ پیشں پر ماتم کرتا ہوا بدنصیب بابل . . . !!

چنانچہ مصنف نے اس حسن و جمال کی وادی اور عشق و محبت کے شہر کے متعلق جو داستان لکھی ہے۔ وہ بھی فی الواقعہ نہایت رومان خیز، بہار آفریں، دہشت خیز اور وحشت انگیز ہے۔ آپ افسانہ پڑھتے جائیے اور مصنف کی تراوشِ فکر، ندرتِ ساز، حسنِ تخیل اور قدرتِ تحریر کی دل ہی دل میں بے اختیار داد دیتے جائیے کسی صاحب نے گزشتہ ’افسانہ نمبر‘ پر تنقید کرتے ہوئے غلط نہ کہا تھا کہ قدرت میرزا ادیب کو ”ایڈگر ایلین پو“ بنانا چاہتی ہے۔

میرزا ادیب علی العموم طویل افسانے لکھتے ہیں لیکن اُن کا اندازِ بیان ایسا سحر طراز ہے کہ انسان انہیں پڑھتے پڑھتے اکتاتا نہیں بلکہ یہی چاہتا ہے کہ وہ انہیں پڑھتا ہی جائے۔ تاکہ اُس کے ذہن پر کیف و سُکر کی اس قدر بارش ہو کہ وہ اس دنیا و ما فیہا کو بالکل بھول جائے اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ’افسانہ نمبر‘ یا ’سالنامہ‘ محض میرزا ادیب کے افسانوں یا صرف ایک ہی افسانہ سے مرتب کیا جائے تو قاری کو رسالہ کی پوری قیمت وصول ہو جائیگی۔

نیرنگ کا ایک باب۔ پروفیسر سید عابد علی صاحب عابد ایم۔اے ایل۔ایل بی نے اپنی کتاب ’نیرنگ‘ کا ایک باب سالنامے میں چھپوایا ہے۔ جو نہایت دلکش اور سوسائٹی کی صحیح تصویر کا حامل ہے امید ہے پوری کتاب قابلِ دید ہوگی ۔

آخر آستانۂ محبت۔ جناب قیسی رام پوری کا یہ قدرے مغربی طرز کا افسانہ ہے۔ اور خوب ہے۔

جیل کی تنہائیوں سے ایک آواز۔ جناب اشتراکی ادیب باری بھی غالباً ایک کتاب ’افکارِ زنداں‘ لکھ رہے ہیں جس کا یہ ایک باب سالنامہ میں درج ہے۔ اشتراکی ادیب صاحب اسم بامسمّٰی ہیں وہ سوسائٹی اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ اسی کی انہوں نے جیل کی تنہائیوں سے اپنے ایک دوست کو ”آواز“ دی ہے۔

منظومات

سالنامہ کا حصہ نظم افسوس ہے حصہ نثر کی طرح
[illegible] ادبِ لطیف

کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ خود شعرائے کرام کی جنرسی ہی اس کا باعث ہے کیونکہ انہوں نے سالنامہ کے اعتبار سے اپنا شاہکار کلام ارسال نہ فرمایا۔ تاہم روش صدیقی۔ جلیل۔ سراج الدین ظفر۔ مقبول حسین امجد حیدرآبادی۔ پروفیسر فراق گورکھپوری۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ اختر شیرانی ماہر القادری۔ آغا شاعر قزلباش۔ علی احمد علی۔ پروفیسر تپش۔ احسان بن دانش محترمہ حیا میرٹھی۔ میزا نذیر براس۔ عدم۔ الطاف مشہدی اور علی اختر ایسے قادر الکلام شعراء کی کہکشاں محفل ادب لطیف کو جگمگا رہی ہے۔

میرا ارادہ ادب لطیف کے سالنامہ پر استقدر لمبی تنقید لکھنے کا نہیں تھا۔ لیکن نادانستہ طور پر اپنے فل سکیپ کے بائیسویں صفحہ پر پہنچ چکا ہوں۔

از جناب مُلّا رموزی

طلوعِ مہر کو جانِ غزل بنا کے رہا

جمالِ صبح سے مطلع کو میں سجا کے رہا
طلوعِ مہر کو جانِ غزل بنا کے رہا

وہ عشق عشق تھا اظہارِ عشق بھی میرا
غرورِ حسن بھی شرما کے سر جھکا کے رہا

کہاں کا ساقی و پیمانہ کس کا دورِ شراب
شعورِ بادہ کشی ہی مجھے پلا کے رہا

شبِ فراق کو ہمت سے کاٹنے والے
ستارۂ سحری دیکھ جگمگا کے رہا

میں لاکھ روٹھ کے بیٹھا ہزار کی توبہ
جمالِ غمزۂ جاناں مگر منا کے رہا

وہاں نگاہ کے اک حسن موج موج کا رنگ
اُٹھا تو ساری شرابوں پہ آج چھا کے رہا

وقارِ عشق کو یہ مرتبہ دیا میں نے
جمالِ شاہ بھی اک روز گھر پہ آ کے رہا

کمالِ حسنِ نظر دیکھئے رموزی کا
بہارِ رنگ کو غلامِ نظر بنا کے رہا

نوشتہ حکیم طالسطائی

مترجمہ اکرام قمر ہوشیارپوری

حجِ اکبر

(۱)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو عمر رسیدہ آدمیوں نے یروشلم کی زیارت کا ارادہ کیا۔ ان میں سے ایک تو فارغ البال کسان تھا جس کا نام ایفیم تھا۔ دوسرے کا نام ایلی شا تھا اور اُسکی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ ایفیم ایک سنجیدہ اور مستقل مزاج تھا۔ اُس نے نہ تو کبھی شراب پی نہ کبھی نسوار سونگھی۔ اور نہ ہی کبھی اپنی زندگی میں سوقیانہ لفظ بولا۔ اس نے دو دفعہ بحیثیت امیر البلدیہ احسن طریقے سے خدمات سرانجام دی تھیں اُس کے دو بیٹے اور ایک شادی شدہ پوتا تھا وہ تمام بقیدِ حیات تھے۔ وہ خود تنومند توانا اور دراز ریش انسان تھا۔ ایلی شا ایک متوسط الحال نجار تھا۔ مگر اب بوجہ کبر سنی کے گھر پر ہی رہتا تھا۔ اور شہد کا بیوپار کرتا تھا۔ اُس کا ایک بیٹا تلاشِ معاش میں باہر گیا ہوا تھا۔ اور دوسرا اُسکے ساتھ رہتا تھا۔ ایلی شا ایک نیک اور بامذاق شخص تھا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ وہ گاہے بگاہے شراب بھی پی لیا کرتا تھا۔ نسوار کا وہ عادی اور موسیقی کا شیدا تھا تاہم اُس کا سلوک اپنے خاندان اور ہمسایوں سے نہایت شریفانہ تھا۔ وہ کوتہ قامت اور سیاہ فام تھا۔ اس کی داڑھی گھنی تھی۔

ایفیم اور ایلی شا نے ایک عرصے سے قسم کھائی ہوئی تھی۔ کہ دونوں اکٹھے یروشلم کی زیارت کے لئے چلیں گے۔ مگر ایفیم کی گوناگوں مصروفیات کیوجہ سے یہ قسم ابھی تک شرمندۂ تکمیل نہ ہوئی تھی۔

ایک تعطیل کے روز دونوں جھونپڑی کے باہر شہتیر پر بیٹھے گفتگو میں مشغول تھے۔ ایلی شا نے پوچھا "ہاں تو ہم اپنی قسم کو کب پورا کرینگے؟" ایفیم نے نہایت ترشروئی سے جواب دیا "کچھ انتظار کرو! یہ سال بہت مصروفیات کا ہے میں نے مکان کی تعمیر اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے شروع کرائی تھی کہ اس پر سو کے قریب یا کچھ کم و بیش روبل خرچ ہوجائیں گے۔ مگر اس پر تاحال تین سو سے زیادہ خرچ ہوچکے ہیں۔ اور تعمیر ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔ ہم گرما میں انشاءاللہ چل پڑینگے۔"

ایلی شا نے کہا "ہمیں عجلت کرنی چاہئے۔ میرے خیال میں بہار کا موسم نہایت مناسب رہے گا۔" ایفیم نے کہا "وقت تو مناسب ہے مگر میرے مکان کا کیا حال ہوگا؟ میں اُسے کیونکر ادھورا چھوڑ سکتا ہوں" ایلی شا نے کہا "گویا آپ کا کوئی قائم مقام نہیں ہوگا! آپکا بیٹا نگرانی نہیں کریگا؟" ایفیم نے کہا "یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ میرا بیٹا قابلِ اعتبار نہیں ہے اور وہ کبھی کبھی بہت شراب پی لیا کرتا ہے؟" ایلی شا نے کہا۔ "عزیزِ من! ہماری موت کے بعد تو وہ ہمارے بغیر ہی کام کرینگے تو پھر کیوں نہ انہیں ابھی سے کام کا عادی بنایا جائے؟" ایفیم نے کہا۔ "یہ تو سچ ہے! مگر بعض اوقات آدمی جو کام شروع کرتا ہے۔ اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے مکمل ہوتا دیکھے" اس پر ایلی شا نے کہا "عزیزِ من ہم تمام کام مکمل نہیں کرسکتے۔ چند دن قبل عورتیں ایسٹر کے لئے تیاریاں کررہی تھیں مگر وہ تمام کام پورا نہ کرسکیں۔ میری بڑی بہو جو ملکہ شائستہ

اور سلیقہ شعار عورت ہے کہتی ہے: ہمیں خدا کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ تعطیل بغیر ہمارے انتظار کے آجاتی ہے۔ ورنہ خواہ ہم کتنی ہی محنت و مشقت کیوں نہ کریں۔ ہم سے کام کبھی بھی پورا نہ ہو سکے۔"

الیم سوچ میں پڑ گیا۔ اور چند لمحوں کے بعد کہنے لگا: "میں نے اس عمارت پر زرِ کثیر صرف کیا ہے۔ سفر بغیر مال کے نہیں ہو سکتا ہمیں کم از کم سو ربل کی ضرورت ہو گی۔ اور یہ کچھ قلیل رقم نہیں ہے۔"

ایلی شا ہنس پڑا۔ اور طنزاً کہنے لگا "عزیز من! میں آپکو اتنا امیر خیال نہیں کرتا تھا۔ آپ یہ رقم کیونکر اور کہاں سے حاصل کریں گے! . . . . . میں تو تھوڑی سی رقم گھر سے حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر وہ کافی نہ ہوئی تو میں شہد کے دس چھتے اپنے ہمسایہ کے پاس فروخت کر دوں گا۔ جو مدت سے ان کا خواہش مند ہے۔" الیم نے کہا: "اگر امسال شہد بہت لگا تو آپکو افسوس ہو گا۔" ایلی شا نے کہا: "افسوس! عزیز من! افسوس کاہے کا؟ میں سوائے اپنے گناہوں کے اور کسی چیز پر بھی تاسف نہیں ہوا کرتا۔ میرے لئے روح کے سوا اور کوئی بھی چیز قیمتی نہیں ہے۔"

الیم نے کہا: "خوب! مگر غفلت بھی مناسب نہیں ہے" ایلی شا نے کہا: "ہم اپنی روح سے اگر غفلت برتیں تو یہ سب سے بُری چیز ہے ہم قسم کھا چکے ہیں لہٰذا ہمیں ضرور بالضرور چلنا چاہئے۔"

(۲)

ایلی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا۔ اور دوسری صبح الیم ایلی شا کے پاس آیا اور کہنے لگا: "آپ حق بجانب ہیں۔ زندگی کا کیا اعتبار؟ ہم کو بہت جلد چلنا چاہئے۔"

ایک ہفتہ بعد دونوں سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ الیم نے رقم حاصل کر لی۔ سو ربل اُس نے ساتھ لے لئے اور دو سو بیوی کو دیدیئے [illegible] تیار ہو گیا [illegible] نے دس شہد کے چھتے اپنے ہمسایہ کے ہاتھ ستر ربل کو فروخت کر دئے اور ایک سو اپنے رشتہ داروں سے قرض لئے۔ اُس کی بیوی نے اپنی تجہیز و تکفین کے لئے جو کچھ بچا رکھا تھا وہ اُس نے ایلی شا کو دیدیا اور اُس کی بیٹی نے بھی اپنا سب کچھ دیدیا۔

الیم نے اپنے بڑے بیٹے کو مناسب ہدایات دیں۔ اس کے برعکس ایلی شا نے اپنی بیوی کو صرف یہی کہا کہ وہ شہد کی مکھیوں کو اُن چھتوں سے علیحدہ رکھے جو اس نے اپنے ہمسایہ کے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں! اور اس بات کا یقین کرے کہ ہمسایہ نے اپنے حق کو بغیر کسی قسم کے دغا و فریب کے حاصل کر لیا ہے۔ اور خانگی معاملات کے متعلق ایک بات تک بھی نہ کہی اور کہا "وقت کی ضروریات کے مطابق کام کر دا"

دونوں تیار ہو گئے۔ نئے جوتے پہنے، اور ایک جوڑا فالتو رکھ لیا۔ لوگ اُنکے ساتھ گاؤں کی حد تک مشایعت کے لئے گئے۔ اور دونوں بوڑھے زیارت کو چل پڑے۔ ایلی شا گھر سے ہنسی خوشی چلا اور گاؤں سے باہر نکلتے ہی اُس نے تمام خانگی معاملات بھلا دیئے اُسکا کام صرف یہی تھا کہ اپنے رفیقِ راہ کو خوش رکھے۔ وہ دعائیں پڑھتا جا رہا تھا اور کچھ صوفیائے کرام کے تذکرے اُس لبوں پر تھے جب کوئی شخص اُسے سڑک پر ملتا تو اُس سے نہایت عجز و انکساری سے پیش آتا اور دعائیں دیتا۔

الیم بھی چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ وہ زبان اور ہاتھ سے کوئی بیہودہ حرکت نہیں کر رہا تھا۔ مگر اُس کا قلب مسرور اور منور نہیں تھا۔ خانگی معاملات کا خیال اُسکے دل کو ستا رہا تھا کہ کہیں وہ اپنے بیٹے کو کوئی ہدایت دینا تو نہیں بھول گیا اور کیا اُسکا بیٹا تمام کام اچھی طرح انجام دیگا جب وہ آلو لگاتے یا کھاد ڈالتے کسانوں کو دیکھتا تو اُسے خیال آتا کہ کیا اُسکا بیٹا بھی اُسکی ہدایات کے مطابق کام کریگا۔ وہ چاہتا تھا کہ واپس جا کر اُسکو کام کے متعلق ہدایات دے یا خود کام کرے۔

(۳)

دونوں بوڑھے لگاتار پانچ ہفتے سفر کرتے رہے۔ اُن کے جوتے بوسیدہ ہو گئے تھے۔ اور روس کو چک پہنچکر اُنہیں جوتے خریدنے پڑے۔ آغازِ سفر سے لیکر اب تک اُنہیں خوراک اور رہائش کی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ مگر اوس کوچک کے لوگ نہایت خاطر تواضع سے پیش آئے اور مفت خوراک و رہائش وغیرہ کا انتظام کیا۔ علاوہ ازیں اُنہیں روٹیاں اور کیک بھی زادِ راہ کے طور پر دئے۔ دونوں بوڑھے پانچ سو میل تک اس علاقہ میں کچھ خرچ کئے بغیر سفر کرتے رہے۔ مگر دوسرے صوبے میں اُنہیں بڑی دقت پیش آئی۔ وہاں قحط پڑ چکا تھا اور فصلیں تباہ ہو گئی تھیں۔ اگر وہاں کے لوگوں نے بھی اُن کی مفت خدمت کی مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ امراء کو اپنا مال و اسباب فروخت کرنا پڑا۔ متوسط طبقہ لاچار و بیکس ہو گیا۔ غرباء جنہوں نے وہاں سے ہجرت نہ کی تھی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ اُنکو فاقوں پر فاقے آنے لگے اور سرما میں وہ درختوں کی چھال اور راج ہنس کے پاؤں کھانے پر مجبور ہو گئے۔

ایک رات دونوں بوڑھے ایک چھوٹے سے دیہات میں ٹھہرے اُنہوں نے ساڑھے سات سیر روٹیاں خریدیں اور دوسرے دن علی الصبح چل پڑے۔ جب وہ آٹھ میل کے قریب سفر کر چکے تو ایک چشمے کے کنارے بیٹھ کر ایک گلاس پانی سے بھر کر اور روٹی اُسمیں بھگو بھگو کر کھانے لگے۔ ایفم نے کہا "آپ نے ابھی تک نسوار کی عادت نہیں چھوڑی۔" ایلی شا نے سر ہلا کر کہا "یہ عادتِ شنیعہ مجھ سے طاقتور ہے۔" کچھ سستانے کے بعد وہ چل پڑے۔ آٹھ میل چلنے کے بعد وہ ایک بڑے دیہات میں سے گذرے گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ ایلی شا تھکا ماندہ اور پیاسا تھا۔ مگر ایفم نہ ٹھہرا اور نہ ٹھہرنے کو تیار تھا۔

ایلی شا نے کہا "میں صرف پانی پینا چاہتا ہوں" ایفم نے کہا "ہاں! آپ پانی جا کر پی آئیں" ایلی شا ٹھہر گیا اور کہنے لگا "میں پانی پی کر ابھی آیا اور آپ کو ایک دو منٹ میں آ ملوں گا" ایفم سڑک پر چلتا گیا اور ایلی شا ایک جھونپڑی کو گیا۔ یہ ایک خستہ حال و بوسیدہ جھونپڑی تھی۔ ایلی شا نے کھیت میں ایک دُبلا پتلا داڑھی مُنڈا آدمی دیکھا جس کی قمیص اُس کے پاجامہ سے چھٹی ہوئی تھی۔ شاید یہ آدمی سایہ دار جگہ سمجھ کر اُس جگہ لیٹا ہوا تھا۔ مگر اب تو سورج نکل چکا تھا۔ اور اُس پر دھوپ آ چکی تھی۔ نیم خوابیدہ حالت میں وہاں لیٹا رہا۔ ایلی شا نے اُسے پانی کے لئے کہا۔ مگر اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔

ایلی شا نے دل میں کہا "یہ کوئی بیمار یا مصیبت زدہ ہے" دروازہ کے پاس پہنچکر اُسے ایک بچہ کے رونے کی آواز سنائی دی اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہتیری آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔ ایلی شا واپس ہونے والا تھا کہ اُسے خیال گذرا کہ ابھی ایک بچہ کے رونے کی آواز سنی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ کوئی قہر و عذاب نازل ہوا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

(۴)

دروازہ اچھی طرح بند نہیں تھا۔ ایلی شا اُسے کھول کر مکان میں چلا گیا۔ بائیں طرف اینٹوں کی بنی ہوئی ایک انگیٹھی تھی۔ دیوار کے بالمقابل ایک میز اور ایک مورتی تھی میز کے پہلو میں ایک بنچ تھا جس پر ایک ضعیفہ برہنہ سر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سر میز پر تھا اُس کے نزدیک ایک دُبلا پتلا سانولے رنگ کا بچہ تھا جس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اور جو ضعیفہ کا دامن کھینچ رہا تھا اور رو رو کر کچھ مانگ رہا تھا۔ ایلی شا اندر داخل ہوا۔ مکان کی ہوا متعفن تھی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی

اور آسے ایک عورت آتشدان کے پیچھے فرش پر لیٹی ہوئی نظر آئی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور لب متحرک۔ وہ بار بار پہلو بدلتی تھی۔ عفیفہ نے سر اٹھا کر اجنبی کو دیکھا اور اُس سے آنے کا مطلب پوچھا۔ اگرچہ وہ روسی بول رہی تھی تاہم ایلی شا اُس کی بات سمجھ گیا۔ اور اُسے کہا "میں پانی پینے کے لئے آیا ہوں۔" عفیفہ نے کہا "ہمارے پاس کوئی برتن پانی نکالنے کے لئے نہیں ہے۔ اس لئے آپ واپس تشریف لے جائیں۔"

ایلی شا نے پوچھا "کیا آپ میں سے کوئی بھی اس عورت کی تیمارداری نہیں کر سکتا؟" عفیفہ نے کہا "میرا بیٹا قریب الموت ہے اور ہم یہاں موت کا انتظار کر رہے ہیں۔"

بچہ اجنبی کو دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ مگر جب عفیفہ باتیں کرنے لگی تو وہ پھر اُس کا دامن کھینچ کر رونے لگا اور روٹی مانگنے لگا۔ ایلی شا اُس بڑھیا سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ آدمی دیوار پکڑ پکڑ کر اندر داخل ہوا۔ دروازے کے پاس وہ ایک کونے میں گر گیا۔ اور اُس نے اُٹھنے کی کوشش کئے بغیر شکستہ الفاظ اپنی زبان سے ادا کئے "بیماری نے ہمیں آن گھیرا ہے.... اور قحط نے...... وہ بھوک سے ..... مر رہا ہے۔" اُس نے بچہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور سرد آہ بھری۔

ایلی شا نے اپنا بقچہ بنچ پر رکھ کر کھولا۔ ایک روٹی نکال کر چاقو سے اُس کا ایک ٹکڑا کاٹ کر آدمی کو دیا۔ مگر اُس نے بچہ اور بچی کی طرف اشارہ کیا کہ انہیں دو۔ ایلی شا نے وہ ٹکڑا بچہ کو دیدیا۔ بچہ نے جونہی روٹی کی خوشبو پائی اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ٹکڑا لے لیا اور کھانے لگا۔ بچی روٹی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ایلی شا نے اُسے بھی اور عفیفہ کو بھی ایک ایک ٹکڑا دیا۔ عفیفہ نے کہا "سب کے حلق خشک ہیں۔ اس لئے براہ مہربانی تھوڑا پانی لا دیں۔ ہمیں نے کل پاس تھا [illegible] پانی لانے کی کوشش [illegible] مگر گر پڑی

اور آگے نہ جا سکی۔ اگر ڈول کوئی اٹھا کر نہ لے گیا ہو تو وہیں پڑا ہو گا۔"

ایلی شا نے پوچھا کہ کنواں کہاں ہے۔ عفیفہ نے اُسے کنواں بتا دیا۔ ایلی شا نے ڈول میں پانی لا کر انہیں پلایا۔ بچوں اور عفیفہ نے پانی کے ساتھ اور روٹی کھائی مگر آدمی نے زیادہ نہ کھائی۔ اس اثناء میں بیچاری نوجوان عورت نے کسی قسم کی ہوش کے آثار ظاہر نہ کئے بلکہ بار بار پہلو بدلتی رہی۔ ایلی شا گاؤں کی دوکان سے باجرا، نمک، آٹا اور تیل خرید لایا۔ اُس نے ایک کلہاڑی سے لکڑیاں کاٹیں۔ اور آگ جلائی۔ چھوٹی بچی نے بھی امداد دی۔ اُس نے کچھ شوربا بنایا۔ اور ان فاقہ کشوں کو کھانا دیا۔

—— (۵) ——

.... آدمی اور بچی نے تھوڑا سا کھایا اور پانی پیا۔ بچہ اور بچی پھر سو گئے۔ آدمی اور عفیفہ نے ایلی شا کو اپنی نگوں حالی کا تذکرہ سنایا۔

"ہم پہلے ہی بہت غریب تھے اور جب قحط پڑا تو جو کچھ ہم جمع کر سکے وہ بمشکل خزاں تک کا کفیل ہو سکا۔ موسم سرما میں ہمارے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ اور ہم بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ پہلے تو ہمارے ہمسائے ہمیں خیرات دیتے رہے۔ پھر انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ اور جو ہماری مدد کرنا چاہتے تھے وہ خود غریب تھے۔ ہمیں مانگتے ہوئے شرم آتی۔ ہم قرض کے نیچے دب گئے۔" آدمی نے کہا "میں تلاش معاش میں نکلا۔ مگر ناکام رہا۔ اگر ایک دن کام مل جاتا تو دو دن بیکار رہنا پڑتا اس وقت اماں اور بچی نے گداگری شروع کر دی۔ خیرات بہت کم ملتی۔ اناج کی گرانی تھی۔ تاہم ہم نے اتنا جمع کر لیا کہ دوسری فصل تک کے لئے کافی تھا۔ مگر موسم بہار میں لوگوں نے خیرات دینی بھی بند کر دی [illegible]

تھے۔ ایک دن اگر کچھ کھانے کو مل جاتا تو دو دن بھوکے رہنا پڑتا۔ ہم نے گھاس کھانی شروع کر دی۔ گھاس نے یا نہ معلوم کس چیز نے میری بیوی کو بیمار کر دیا۔ وہ نہ تو کھڑی ہو سکتی ہے۔ اور نہ اچھی طرح بیٹھ سکتی ہے۔

عفیفہ نے کہا: "کچھ عرصہ تک میں تیمارداری کرتی رہی۔ مگر بابا کچے میں خود فاقوں کی وجہ سے بیمار پڑ گئی۔ بیچاری بچی بھی دبلی پتلی ہو گئی ہیں نے اُسے کہا کہ کسی ہمسایہ سے جا کر کچھ مانگ لائے مگر وہ جھونپڑی چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اور کونے میں پڑ کر لیٹ رہی۔ پرسوں ایک ہمسایہ نے اندر جھانکا مگر ہمیں بیمار اور فاقہ زدہ پا کر مڑ گیا۔ اب ہم لیٹے ہوئے موت کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ایلی شا نے یہ داستان سُنکر جانیکا ارادہ دوسرے دن پر ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن علی الصبح اُس نے اٹھ کر گھر کو صاف کیا۔ عفیفہ کی مدد سے آٹا گوندھا، آگ جلائی، پھر بچی کے ہمراہ ہمسایوں کے پاس معلومات حاصل کرنے کے لئے گیا۔ کیونکہ گھر کی ہر چیز بک چکی تھی۔ ایلی شا نے تمام ضروریات مہیا کر دیں اور کچھ خرید دیں۔ وہ دوسرے دن بھی وہیں رہا۔ اگلے دن بھی اور اُس سے اگلے دن بھی۔ بچہ میں توانائی آگئی۔ اور جب کبھی ایلی شا بنچ پر بیٹھتا تو وہ اُس کے پاس ٹیک کر بیٹھ جاتا۔ بچی میں بھی طاقت آگئی اور وہ ایلی شا کو ہر قسم کے کاموں میں مدد دیتی۔ وہ ایلی شا کے پیچھے "بابا، بابا" پکارتی ہوئی دوڑتی۔ عفیفہ بھی تندرست ہو گئی اور ہمسایہ کو دیکھنے کے لئے گئی۔ آدمی کو بھی افاقہ ہو گیا اور وہ دیوار کے سہارے چلنے لگا۔ بیوی کی حالت وہی رہی مگر تیسرے دن اُسے ہوش آ گیا۔ اور اُس نے کھانا مانگا۔ اب ایلی شا نے چلنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

—— (۶) ——

چوتھے دن ایک دعوت تھی۔ ایلی شا نے خیال کیا کہ مناسب ہے کہ میں انہیں کے ساتھ ناشتہ کر لوں کچھ اشیا انہیں بازار سے خرید کر لا دوں اور دعوت کھا کر کل شام کو چلوں۔ ایلی شا دودھ، آٹا، اور چربی خرید لایا اور عفیفہ کو کھانا پکانے میں مدد دی۔ دوسرے دن صبح کو وہ گرجے گیا اور آ کر ناشتہ کیا۔ اُس دن بیوی کو بھی آرام آ گیا۔ اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ خاوند نے حجامت بنوائی اور صاف قمیص پہنکر ساہوکار کے پاس گیا۔ جس کے پاس اس کی زمین اور چراگاہ رہن تھی۔ اس نے ساہوکار سے درخواست کی کہ وہ اُسے چراگاہ اور زمین خزاں تک استعمال کے لئے دیدے۔ مگر وہ شام کو بے نیل و مرام واپس آ گیا اور ساہوکار نے اُس سے کسی قسم کی ہمدردی ظاہر نہ کی۔

ایلی شا اب انکے مستقبل کے متعلق سوچنے لگا: "اب انکی گذران کیونکر ہوگی۔ دوسرے لوگ فصلیں کاٹ رہے ہونگے۔ مگر اُن کے پاس کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ان کی تین ایکڑ زمین ساہوکار کے پاس گرو ہے اور میرے جانیکے بعد پھر ان کی وہی حالت ہو جائیگی؟" ایلی شا کے دل میں مختلف خیالات موجزن تھے۔ اور آخر کار اس نے دوسرے دن پر اپنا سفر ملتوی کر دیا۔ اس نے نماز پڑھی اور لیٹ گیا مگر اُسے نیند نہ آئی۔ کبھی تو اس کے دل میں خیال آتا کہ میں نے اپنا بہت سا وقت اور روپیہ اس جگہ خرچ کر دیا ہے اور اب مجھے چلنا چاہیئے۔ اور کبھی ان کی مصیبت کا خیال آتا اور وہ کچھ عرصہ اور ٹھیرنا چاہتا۔

اُس نے خیال کیا "ان کے مصائب کا تو کبھی خاتمہ ہی نہیں ہوگا پہلے تو میں نے ان کو صرف پانی اور روٹی دی۔ کچھ خیال کرنا چاہیئے کہ مجھے ان کے لئے کیا کیا لانا پڑتا ہے۔ اب مجھے چراگاہ اور زمین انکا

" "

ایلی شا اُٹھ بیٹھا، کوٹ اٹھایا اور سوچنے لگا کہ اُس کے خیالات درست ہو جائیں۔ مگر اُس کے غور و فکر کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ اس نے جانیکا ارادہ کیا ایک آواز فضا میں گونجی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُسے کسی نے جگادیا ہے۔ اُسے محسوس ہوا کہ بقچہ پُشت پر اٹھائے اور ڈنڈا ہاتھ میں لئے سفر کے لئے تیار ہو گیا ہے۔ پھاٹک کھلا ہے۔ وہ اُس میں سے گذر نے ہی لگا ہے کہ اُس کا بقچہ ایک باڑ میں پھنس جاتا ہے۔ وہ بقچے کو چھڑانے لگتا ہے۔ تو اُس کا پاجامہ دوسری باڑ میں پھنس جاتا ہے۔ وہ بقچہ کھینچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ باڑ میں پھنسا ہوا نہیں۔ بلکہ چھوٹی بچی اُسے کھینچکر اُس سے روٹی مانگ رہی ہے۔ عفیفہ اور اُسکا بیٹا کھڑکی میں کھڑے اُسے دیکھ رہے ہیں۔ ایلی شا کی آنکھ کھل گئی۔ اور اُس نے صاف اور واضح الفاظ میں کہا "کل میں زمین چھڑا دوں گا"

ایک گھوڑا ایک گائے اور آٹے کی ایک بوری بھی خرید کر دوں گا۔"

اس کے بعد ایلی شا سو گیا۔ اور صبح تک سوتا رہا۔ سویرے جاگ کر سیدھا ساہوکار کے پاس گیا، اور زمین اور چراگاہ چھڑا دی۔ ایک درانتی بھی خرید لایا اور پھر آدمی کو فصل کاٹنے کے لئے روانہ کر دیا اور خود جاکر ایک گھوڑا خرید لایا۔ آٹے کی بوری خرید کر گائے کی تلاش میں نکلا۔ اُس نے دو عورتوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا وہ کہہ رہی تھیں "غالباً شروع میں وہ ان کو جانتا بھی نہیں تھا، انہوں نے اُسے ایک معمولی آدمی خیال کیا، وہ پانی پینے آیا اور وہیں کا ہو رہا۔ اُس نے انہیں کیا کچھ نہ خرید کر دیا؟ آج ہی اُس نے ایک گھوڑا اور ایک چھکڑا خرید کر لا دیا ہے۔ اس قسم کے آدمی دنیا میں بہت کم ہوا کرتے ہیں اُس کی زیارت ضرور کرنی چاہئے۔"

ایلی شا سمجھ گیا کہ اُسی کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ گائے خریدنے کیلئے

جھونپڑی والے گھوڑا دیکھ کر حیران رہ گئے، وہ سمجھ گئے کہ یہ ان کے ہی لئے ہے۔ مگر انہیں پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آدمی نے آکر پھاٹک کھولدیا اور پوچھا "بابا! گھوڑا کہاں سے لیا ہے" ایلی شا نے کہا۔ "کیوں؟ یہ سستے داموں بک رہا تھا اور میں نے خرید لیا ہے۔ جاؤ، کچھ گھاس کاٹ کر لاؤ۔ اور اس کے آگے کھرلی میں ڈالدو، بوری آٹے کی اندر لے جاؤ۔"

آدمی بوری اندر لے گیا اور گھوڑا کھولدیا۔ کچھ گھاس کاٹکر اُسکے آگے کھرلی میں ڈالدی۔ پھر سب سو گئے۔ ایلی شا باہر جاکر برلب شاہراہ سو گیا۔ اُس دن وہ اپنا بقچہ بھی ساتھ لے گیا تھا جب سب گہری نیند میں سو گئے، تو بقچہ اٹھایا پنڈلیوں پر پٹی باندھی اور کوٹ اور بوٹ پہنکر الیم کے تعاقب میں چل نکلا۔

—— (۷) ——

ایلی شا ابھی تک تین میل ہی چلا تھا کہ دن چڑھ گیا، ایک درخت کے سایہ تلے بیٹھ کر اُس نے رقم گنی اُس کے پاس سترہ روبل اور بیس کوپک باقی رہ گئے تھے۔ اُس نے سوچا "اتنی تھوڑی سی رقم کے ساتھ سمندر پار جانیکا ارادہ مناسب نہیں ہے بھیک مانگ کر سفر کرنے سے نہ جانا اچھا ہے۔ الیم میرے بغیر یروشلم پہنچ جائیگا۔ اور میرے نام کی ایک شمع خانقاہ میں جلا دے گا۔ اور میں کبھی اپنی قسم پوری کر سکوں گا؟ خیر خدا مہربان ہے، مجھے اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ یہ سب کچھ اُسی کے لئے کیا گیا ہے۔"

ایلی شا اُٹھا، بقچہ اٹھایا اور گھر کو واپس چل پڑا۔ جاتے وقت اُسے سفر سخت معلوم ہوا تھا اور وہ بمشکل الیم کے ساتھ چل سکتا تھا مگر واپسی پر اُس نے سفر نہایت آسانی سے طے کر لیا اور اُسے

جب ایلی شا گھر پہنچا، فصلیں کاٹی جا چکی تھیں۔ اُس کے رشتہ دار اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور ہر ایک حقیقتِ حال سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ مگر ایلی شا نے اُنہیں کچھ بھی نہ بتایا، یا اُس نے کہا: "خدا کو میرا یروشلم پہنچنا منظور نہیں تھا، راستہ میں نقدی ختم ہو گئی اور میں اپنے رفیقِ سفر سے پیچھے رہ گیا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو!"

ایلی شا نے باقی ماندہ نقدی اپنی بیوی کو دیدی۔ کام حسبِ وجوہ سر انجام ہو رہا تھا۔ تمام خیریت اور اتفاق سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

الیغم کے رشتہ دار اُس کی واپسی کی خبر سنکر اُسی دن الیغم کی خبر لینے کے لئے اُس کے پاس آئے۔ اُنہیں بھی ایلی شا نے یہی جواب دیا۔ "کہ الیغم تیز رفتار ہے، ہم پطرس حواری کے گرجے تک پہنچنے سے تین دن پہلے ہی علیحدہ ہو گئے۔ میں نے اُسے ملنا چاہا۔ مگر چند در چند وجوہ کی بنا پر تمام نقدی ختم ہو گئی اور مجھے واپس ہونے کے سوا اور کوئی بھی چارہ نہ رہا۔"

تمام لوگ ایلی شا ایسے عاقل کی احمقانہ حرکت پر حیران تھے کچھ عرصہ بعد وہ سب یہ بات بھول گئے اور ایلی شا نے بھی بھلا دی اُس نے دوبارہ کام شروع کر دیا۔ اپنے بیٹے کی مدد سے اُس نے سرما کے لئے ایندھن کاٹا۔ غلہ صاف کیا۔ چھت ڈالی، شہد کے چھتے ڈھانپے، اور اپنی رحمدلی سے کام لیکر جتنے چھتے بنے وہ اُسنے سب کے سب اپنے ہمسایہ کو دیدیئے جس کے ہاتھ وہ دس چھتے فروخت کر چکا تھا۔ دس کی بجائے اُس نے ستر چھتے اُسے دیئے سرما کے لئے تمام سامان مہیا کر کے اُس نے اپنے بیٹے کو کام کی تلاش میں بھیجدیا۔ خود جوتے بنانے شروع کر دیئے اور شہتیروں کو شہد کی

(۸)

تمام دن الیغم ایلی شا کا انتظار کرتا رہا۔ آخر کار وہ تھک کر سو گیا، وہ پھر جاگا، اُس کی راہ تکتے تکتے اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں سورج غروب ہونے والا تھا۔ مگر ایلی شا نہ آیا۔ الیغم نے دل میں کہا۔ "جس وقت میں سو رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھے بغیر آگے نکل گیا ہے۔ مگر وہ مجھے دیکھے بغیر کیونکر آگے چلدیا؟ آدمی تو بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔ کیا میں اب واپس چلوں! بفرضِ محال اگر وہ آگے نکل چکا ہے تو اس صورت میں ہم دونوں ایک دوسرے سے زیادہ دور ہوتے جائیں گے اور یہ بہت بُری بات ہوگی۔ لہٰذا مجھے آگے چلنا چاہئے۔ اور جہاں میں رات کو قیام کرونگا وہاں شاید ہم مل جائیں۔"

وہ ایک گاؤں میں گیا اور چوکیدار کو کہا کہ اگر فلاں حلیہ کا بوڑھا آدمی آئے تو اُسے فلاں جھونپڑی میں لے آنا۔ جہاں میں مقیم ہوں۔" مگر ایلی شا کو نہ آنا تھا اور نہ آیا۔ الیغم آگے چل پڑا اور ہر راہرو سے پوچھتا کہ اُس نے کوئی کوتہ قامت گنجا معمر آدمی تو نہیں دیکھا۔ کوئی بھی مثبت میں جواب نہ دیتا۔ الیغم بہت پریشان ہوا مگر وہ چلتا رہا۔ اس نے کہا کہ ہم اوڈیسہ میں یا عرشۂ جہاز پر ضرور ملیں گے۔

راستے میں اُسے ایک اور زائر مل گیا جو کوہِ آتش سے آرہا تھا۔ اور یروشلم کو دوسری مرتبہ جا رہا تھا۔ دونوں ایک جگہ اکٹھے رہے اور ہمسفر بن گئے۔ وہ بخیر و عافیت اوڈیسہ پہنچ گئے۔ وہاں اُنہیں تین دن تک جہاز کا انتظار کرنا پڑا۔ زائرین کا ایک اجتماعِ عظیم تھا۔ الیغم نے ایلی شا کو تلاش کیا۔ مگر بے نیل و مرام رہا۔ الیغم نے پانچ ربل دے کر ممالکِ غیر کا پروانۂ راہداری حاصل کیا، چالیس ربل سے یروشلم کا واپسی ٹکٹ لیا اور زادِ راہ لیکر چل پڑا۔

مگر اس نے ان کی ایک بھی نہ سنی۔ اسباب جہاز پر لادا گیا، الغم اور اسکا نیا رفیق اور دیگر زائرین جہاز پر چڑھ گئے۔ لنگر اٹھایا گیا اور جہاز چل پڑا۔ تمام دن ہوا خوشگوار اور موافق رہی۔ اور جہاز چلتا رہا مگر رات کو بارش شروع ہو گئی۔ جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ عام مسافر خوفزدہ ہو گئے عورتیں آہ و پکار کرنے لگیں۔ بزدل آدمی جہاز میں اِدھر اُدھر جائے پناہ کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ الغم بھی ڈر رہا تھا۔ مگر اس نے خوف کا اظہار نہ کیا اور اُسی جگہ بیٹھا رہا۔ تیسرے روز کچھ سکون ہوا۔ اور پانچویں دن وہ قسطنطنیہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے۔

چند زائرین جامع ایا صوفیا دیکھنے کے لئے گئے۔ جو اب ترکوں کے قبضہ میں ہے۔ الغم جہاز پر ہی رہا۔ چوبیس گھنٹے کے قیام کے بعد جہاز چل پڑا۔ سمرنا و اسکندریہ میں مقام کرتے ہوئے وہ بخیر و عافیت جافہ کی بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ سڑک کے راستے یروشلم وہاں سے چالیس میل تھا۔ جہاز سے اترتے وقت تمام خوفزدہ تھے۔ جہاز بلند تھا۔ مسافر پہلے کشتی میں چھلانگ لگاتے۔ جو اس طرح گردش میں تھی۔ کہ سمندر میں گر جانیکا ہر وقت خطرہ تھا۔ دو آدمی تو سمندر میں گر پڑے تھے۔ مگر آخر کار تمام صحیح سلامت ساحل پر جا اترے۔

وہ پا پیادہ تیسرے دن یروشلم پہنچ گئے۔ اور شہر سے باہر ایک روسی ہوٹل میں قیام پذیر ہوئے جہاں اُن کے پروانہ ہائے راہداری کی پڑتال ہوئی۔ کھانا کھانے کے بعد الغم نے اپنے ہمراہی کے ساتھ مقدس مقامات کی زیارت کی۔ اُس وقت ارض القدس میں جانے کی اُنہیں اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ اس لئے وہ اسقفِ اعظم کے پاس گئے۔ تمام زائرین وہاں جمع ہوئے۔ عورتیں مردوں سے علیحدہ کر کے ایک دائرے میں برہنہ پا بٹھا دی گئیں۔ ایک راہب ایک لمبا لنگ لگائے پاؤں دھونے کے لئے آیا۔ اس نے ہر ایک

کے پاؤں دھوئے، پونچھے اور چومے۔ الغم کے پاؤں بھی دھوئے۔ پونچھے اور چومے گئے۔ وہ مغرب سے لیکر فجر تک عبادت کرتا رہا۔ خانقاہوں میں موم بتیاں جلائیں، اپنا شجرہ نسب بتایا تاکہ اُس کے آبا و اجداد کے نام بھی دعاؤں میں شامل کر لئے جائیں۔ انہیں کھانا اور شراب دی گئی۔ دوسرے دن وہ مریم کی خانقاہ پر گئے۔ یہاں بھی اُنہوں نے چراغ جلائے اور فاتحہ پڑھی۔ یہاں سے وہ خانقاہ ابراہیم کو گئے اور وہ جگہ دیکھی . . . . جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد حضرت عیسٰیؑ کے مولد پر گئے۔ اور پھر تجہیز کے گرجے کو۔ الغم کا ہمراہی اُسے ہر جگہ کے حالات بتلاتا اور نذرانہ کے متعلق ہدایات دیتا۔ دوپہر کو وہ ہوٹل واپس آئے اور کھانا کھایا۔ جس وقت وہ سونے لگے تو اُس کا ساتھی رونے لگا۔ استفسار کرنے پر اُس نے کہا "میرا بٹوا چوری ہو گیا ہے۔ اس میں تیئیس روبل نقد اور دس روبل کے دو نوٹ تھے۔ اور کچھ نقدی بھی تھی۔" اُس نے ایک سرد آہ بھری اور روتا رہا۔ چونکہ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے وہ تمام سو گئے۔

(۹)

الغم کو لیٹے لیٹے خیال آیا "اس زائر کا بٹوا کسی نے بھی نہیں چرایا میرا تو خیال ہے کہ اُس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہی اُس نے کسی جگہ کچھ نذرانہ دیا بلکہ مجھے دینے کے لئے کہتا رہا ہے نیز اُس نے تو مجھ سے ایک روبل بھی ادھار لیا تھا" مگر جلد ہی وہ اپنے دل کو لعنت ملامت کرنے لگا "کسی آدمی کے متعلق اس قسم کا خیال کرنے کا مجھے کیا حق حاصل ہے؟ یہ تو ایک گناہ ہے۔" لیکن جلد ہی پہلے خیالات پھر الغم کے دل میں عود کر آئے "وہ روپے پیسے کے معاملے میں کتنی دلچسپی رکھتا تھا۔ اور جس وقت اُس نے یہ کہا میرا بٹوا چوری ہو گیا ہے

تو اس کی طرزِ کلام کیسی غیر فطری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ واقعہ تمام کا تمام جھوٹا ہے"۔

شام کے وقت وہ کلیسائے مشر" کو گئے جہاں یسوع مسیح کا روضہ ہے۔ زائر تمام جگہ اس کے ساتھ رہا۔ وہ گرجے گئے۔ وہاں بہت سے روسی یونانی، آرمینی، ترک اور شامی زائر بھی آئے ہوئے تھے۔ الغم ایک ازدحام کے ہمراہ باب القدس میں داخل ہوا۔ ایک راہب انہیں اس جگہ لے گیا جہاں یسوع کو صلیب سے اتارا گیا تھا۔ وہاں تو بڑی بڑی شمعدانوں میں موم بتیاں روشن تھیں۔ راہب نے ہر ایک چیز دکھائی اور اس کی تشریح کی۔ الغم نے بھی ایک موم بتی جلائی۔ پھر راہب انہیں گلغوطہ لے گیا جہاں صلیب لٹکائی گئی تھی۔ الغم نے وہاں دعا مانگی۔ انہیں وہ شگاف دکھلایا گیا جہاں زمین دو عمیق گہرائیوں میں تقسیم ہے۔ انہیں وہ جگہ بھی دکھلائی گئی۔ جہاں حضرت عیسےٰ کے ہاتھ پاؤں میخوں سے صلیب میں ٹھونکے گئے تھے۔ اسکے بعد وہ حضرت آدمؑ کے روضہ پر گئے۔ جہاں یسوع کا خون آدم کی ہڈیوں پر گرا تھا۔ انہیں وہ پتھر دکھلایا گیا جہاں حضرت عیسےٰ کے سر پر خار دار تاج رکھا گیا تھا۔ پھر وہ ستون دکھلایا گیا جس سے باندھ کر حضرت عیسےٰؑ کو کوڑے مارے گئے تھے۔ الغم نے وہ پتھر بھی دیکھا جس پر حضرت عیسےٰؑ کے پاؤں کے دو نشان تھے۔ وہ کچھ اور دیکھنے کے لئے جا رہے تھے کہ یکایک ایک شور اٹھا اور لوگ یسوع مسیح کے مزار کی طرف دوڑے۔ لاطینی دعا ختم ہو چکی تھی۔ اور روسی دعا شروع ہونے والی تھی۔ الغم لوگوں کے ساتھ مزار پر گیا۔ جو چٹان میں بنایا گیا تھا۔

وہ زائر سے خلاصی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر زائر نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی مزار پر گیا۔ وہ اگلی صف میں جگہ [illegible]

چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور دعا کرتا رہا کہ خدا اسے بچائے۔ اسے بڑے کا خیال آ جاتا۔ مختلف اوقات میں اس کے دل میں دو قسم کے خیالات آتے کبھی تو وہ خیال کرتا کہ زائر نے جھوٹ بولا ہے۔ اور کبھی سوچتا کہ اگر زائر نے سچ بولا ہے اور اس کا بڑا واقعی گم ہو گیا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آئے۔

---(۱۰)---

الغم وہاں کھڑا گرجے کو غور سے دیکھتا رہا جس میں کتابِ مقدس پر چھتیس فانوس روشن تھے۔ ان فانوسوں کے نیچے الغم نے بھورے کوٹ والا اور گنجے سر والا بوڑھا دیکھا جو ایلی شا سے بالکل مشابہ تھا الغم یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ الغم نے خیال کیا "یہ بالکل ایلی شا کے مشابہ ہے۔ مگر یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی صورت میں بھی مجھ سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا ہم سے پہلا جہاز ایک ہفتہ قبل روانہ ہو چکا تھا۔ وہ اس میں کسی صورت بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔ اور نہ ہی وہ ہمارے جہاز پر نہیں نظر آیا"۔ الغم نے اس کے بعد دیکھا کہ وہی پست قامت بوڑھا نماز پڑھ رہا ہے۔ اور تین دفعہ جھکا ہے۔ جس وقت اس نے اپنا سر دائیں طرف موڑا تو الغم نے اسے پہچان لیا۔ یہ ایلی شا ہی تھا۔ اس کی وہی سیاہ گھنی داڑھی تھی۔ وہی بھویں تھیں وہی آنکھیں اور وہی ناک تھی۔ اور اس کے چہرے کے وہی خدوخال تھے۔ یہ ایلی شا ہی تھا! الغم اپنے رفیق کو پا کر بہت خوش ہوا۔ مگر اس کے پہلے آ جانے پر حیران بھی تھا۔

اس نے کہا: "ایلی شا بہت خوب!! یہ کیونکر مجھ سے پہلے آ گیا ہے، شاید اسے راستہ میں کوئی شخص مل گیا جس نے اسے راستہ بتا دیا۔ اسے باہر نکلتے ہی ملونگا۔ اور اس شخص سے خلاصی حاصل کرونگا۔ شاید وہ [illegible]

الغیم اسی طرف دیکھتا رہا تاکہ ایلی شا نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے نماز ختم ہوتے ہی لوگ حرا کو بوسہ دینے کے لئے آگے بڑھے اور الغیم کو ایک طرف دھکیل گئے۔ اُسے پھر بیٹا گم ہو جانیکا خطرہ لاحق ہو گیا۔ اسے ہاتھ سے پکڑ کر وہ مجمع میں باہر نکلنے کے لئے آگے بڑھا۔ باہر نکل کر اُس نے گرجے کے باہر اور اندر ایلی شا کو بہت ڈھونڈا مگر بے سود۔ اُس نے وہاں سب قسم کے لوگ دیکھے جو کھانا کھا رہے تھے، شراب پی رہے تھے، کچھ پڑھ رہے تھے اور کچھ سو رہے تھے۔ مگر ایلی شا کہیں بھی نہیں تھا۔ الغیم بے نیل و مرام سرائے کو واپس ہو گیا۔ اُس شام اُس کا ساتھی زائر نہ آیا، وہ ریل واپس کئے بغیر ہی کہیں چلا گیا اور الغیم تنہا رہ گیا۔

دوسرے دن پھر اُسی جگہ الغیم ایک دوسرے بوڑھے شخص کے ساتھ وہاں آیا۔ جو اُسے جہاز پر ملا تھا۔ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ اس لئے وہ ایک ستون کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اور وہیں نماز پڑھی۔ اس نے اپنے آگے دور فانوسوں تک نظر دوڑائی۔ کتابِ مقدس کے پاس ایلی شا اپنے ہاتھ ایک پادری کی طرح قربانگاہ پر پھیلائے، کھڑا تھا۔ اس کا گنجا سر چمک رہا تھا۔ الغیم نے کہا: "اب میں اُسے ضرور ملوں گا!" وہ آگے بڑھا مگر جس وقت وہاں پہنچا۔ تو وہاں ایلی شا نہیں تھا۔ وہ جا چکا تھا۔

تیسرے دن پھر الغیم نے اُسے کتابِ مقدس کے پاس کھڑے دیکھا وہ ہاتھ پھیلائے اوپر دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کا گنجا سر چمک رہا تھا۔ الغیم نے کہا: "آج یہ مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ میں دروازے پر کھڑا ہو جاؤں گا اس طرح ہماری ملاقات ضرور ہو گی"۔ الغیم دوپہر کے اختتام تک دروازہ پر کھڑا رہا۔ ہر شخص باہر جا چکا تھا۔ مگر ایلی شا کہیں بھی نظر نہیں آتا تھا

بھی۔ اسنے ایک کفن اپنے لئے خریدا جس پر متبرک آیتیں درج تھیں۔ اس نے یردان سے پانی کی ایک بوتل اور کچھ مٹی تبرکاً لی۔ اور موم بتیاں مقدس آگ پر جلائی گئی تھیں۔ خریدیں۔ آٹھ جگہ پر اسنے اپنا شجرہ نسب بتایا۔ اسکے آبا و اجداد کے لئے دعائیں کی گئیں۔ اُسکی تمام نقدی سوائے سفر خرچ کے صرف ہو چکی تھی۔ وہ جافہ سے ہوتا ہوا اوڈیسہ گیا اور وہاں سے پا پیادہ گھر کو چل پڑا۔

~~~(۱۱)~~~

الغیم جس راستے سے آیا تھا۔ اُسی راستے سے واپس چلا۔ وہ اپنے گاؤں کے نزدیک پہنچتا گیا۔ اُسے اپنے نجی کاموں کی فکر ہونے لگی اُس کا خیال تھا کہ مدتوں کا تعمیری کام چند دنوں کی تخریبی مساعی سے مٹایا جا سکتا ہے۔ وہ حیران تھا کہ اسکے بیٹے نے اس کے بغیر کیونکر، تمام کام انجام دیئے ہونگے۔ موسم بہار کس طرح گذر رہا ہوگا، جانور صحیح سلامت ہونگے یا نہیں اور آیا گھر اُسی طرح ہوگا یا اُس میں تغیر و تبدیل آ چکے ہونگے۔ یہ تھے وہ خیال جو الغیم کے دل میں چکر لگا رہے تھے جب الغیم اُس ضلع میں پہنچا جہاں گذشتہ گرما میں ایلی شا اُس سے علیحدہ ہوا تھا۔ تو اُسے اس بات کا خیال تک بھی نہیں تھا کہ اُس گاؤں میں وہی لوگ رہتے ہونگے۔ ایک سال قبل وہ فاقہ زدہ تھے۔ مگر اب وہ اپنی زندگی امن و چین سے گذار رہے تھے فصل اس دفعہ کامیاب رہی تھی۔ لوگوں کی حالت درست ہو گئی۔ اور وہ گذشتہ مصائب کو بھول چکے تھے۔

ایک شام الغیم اُس جگہ پہنچا جہاں ایلی شا پیچھے رہ گیا تھا۔ جونہی وہ گاؤں میں داخل ہوا ایک چھوٹی سی بچی سفید کرتی پہنے ایک جھونپڑی میں سے نکل اس کی طرف دوڑی آئی۔ اور کہنے لگی۔
~~~

چھوٹی بچی نے اُسے نہ چھوڑا۔ اُس نے ہنستے ہوئے اُس کا کوٹ پکڑ لیا۔ اور اُسے جھونپڑی کی طرف کھینچا۔ جہاں ایک عورت بچہ کو اٹھائے باہر نکلی اُسے سلام کیا اور کہنے لگی "باباجی اندر آئیے کھانا کھائیے اور رات ہمارے پاس بسر کیجئے۔" الیغم اندر چلا گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے ان سے ایلی شا کی بابت پوچھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس جھونپڑی میں وہ پانی پینے کے لئے گیا تھا۔ عورت اس کے ساتھ اُسکا تھیلا اٹھا کر اندر لائی۔ اور اُسے منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی دیا میز پر دسترخوان بچھایا اور اُسے دودھ دہی کیک اور دلیا کھانے کے لئے دیا۔ الیغم نے اُسکا شکریہ ادا کیا۔

مگر اُس عورت نے کہا "زائرین کا خیر مقدم اور اُن کی خدمت ہم کیوں نہ کریں۔ ہمیں بچانے والا زائر ہی تو تھا۔ ہم خدا کو بھلا بیٹھے تھے۔ اور خدا کا عذاب ہم پر نازل ہو چکا تھا۔ اُسی زائر نے ہمیں اصلی زندگی کا راز بتایا۔ گذشتہ موسم گرما میں ہم سب بیمار و لاچار تھے اور ہمارے پاس کچھ بھی کھانے کے لئے نہیں تھا۔ اور خدا اُس زائر کو جو آپ سے ملتا جلتا تھا ہماری امداد کو نہ بھیجتا تو ہم کبھی کے مر چکے ہوتے ایک دن وہ ہمارے پاس پانی پینے کے لئے آیا۔ ہماری حالت کو دیکھ کر اُسکے دل میں انسانی ہمدردی کا ایک جذبہ پیدا ہوا۔ اور وہیں ہمارے پاس رہ پڑا۔ اُسنے ہمیں کھانے پینے کے لئے دیا اور ہمیں ہمارے پاؤں پر دوبارہ کھڑا کر دیا۔ ہماری زمین جو رہن تھی چھڑا دی۔ ہمیں ایک چھکڑا اور ایک گھوڑا خرید دیا۔ اس اثنا میں عفیفہ بھی آگئی اور اُس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "ہمیں معلوم نہیں وہ انسان تھا یا آسمانی فرشتہ۔ اُس نے ہم سب پر رحم کیا اور ہمیں اپنا نام بتلائے بغیر چلا گیا۔ ہم نہیں جانتے کہ کس کے لئے خیر و برکت کی دعائیں [illegible]

ترتیب الٹ تھی۔ جب گئے تو وہاں ایک بوڑھا آدمی اندر داخل ہوا اور پانی مانگا۔ مجھ عاصیہ کو خیال گذرا کہ یہاں کیوں آیا ہے؟ اور اُس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگی۔ ہمیں دیکھتے ہی اُسنے اپنا تھیلا وہیں اتار دیا اور اُسے کھولا" اب چھوٹی بچی نے کہا "دادی جی! نہیں!! پہلے اُس نے تھیلا یہاں اتارا اور پھر اُسے اٹھا کر بیچ پر رکھ گیا۔"

وہ سب اُس کے افعال و اقوال کو یاد کرنے لگے۔ رات کو کسان بھی آگیا۔ وہ بھی بتلانے لگا کہ ایلی شا ان میں کیونکر رہا۔ اور کہنے لگا "اگر وہ نہ آتا تو ہم اسی طرح گناہوں میں مر جاتے۔ ہم مایوس ہو چکے تھے۔ اور خدا اور انسان کے خلاف شکوے شکایت کر رہے تھے۔ مگر اس نے ہمیں پھر ہمارے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ اسکے ذریعے ہم خدا کی ہستی اور انسان کے فضائل کے قائل ہو گئے۔ خدا اُس پر خیر و برکت کی بارش کرے۔ ہم درندوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس نے ہمیں انسان بنا دیا" کھانے کے بعد انہوں نے الیغم کو خوابگاہ بتلائی اور خود لیٹ گئے۔

اگرچہ الیغم بھی لیٹ گیا تھا۔ مگر اُسے نیند نہ آئی۔ اس کے دل میں ایلی شا ہی کا خیال تھا۔ مگر اُسے یہ بھی یاد تھا کہ اُس نے اُسے تین دفعہ یروشلم میں سب سے اگلی صفوں میں کھڑے دیکھا ہے۔ وہ حیران تھا کہ پھر وہ مجھ سے پہلے کیونکر وہاں پہنچ گیا۔ اُسے خیال گذرا کہ شاید میرا حج مقبول نہیں ہوا مگر ایلی شا کا حج تو خدا نے ضرور قبول کر لیا ہے۔

صبح کے وقت الیغم نے اُن کو الوداع کہی۔ انہوں نے کچھ زادِ راہ کے طور پر اُسکے تھیلے میں ڈالدیا۔ اور کاموں پر چلے گئے۔ اور الیغم اپنے [illegible]

(۱۲)

الغیم ایک سال کے بعد موسم بہار کی ایک شام کو گھر پہنچ۔

اُس کا بیٹا گھر پر موجود نہیں تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اُس نے حد سے زیادہ شراب پی ہوئی تھی۔ الغیم نے اُس سے طرح طرح کے سوال کئے مگر اس کے ہر جواب سے یہی آشکارا ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنے باپ کی غیرحاضری میں کام کو اچھی طرح نبھا نہیں سکا۔ تمام روپیہ ضائع کر دیا گیا ہے۔ اور ہر کام سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ الغیم نے بیٹے کو برا بھلا کہا۔ مگر اس نے نہایت ترش روئی سے جواب دیا۔ "آپ خود کیوں گھر پر نہ رہے اور خود کیوں نہ کام کی نگرانی کی؟ آپ تو نقدی لیکر باہر چلے گئے اور اب مجھ سے روپیہ کا مطالبہ کر رہے ہیں!" الغیم کو غصہ آ گیا اور اس نے اپنے بیٹے کو پیٹا۔

صبح کے وقت الغیم امیر البحریہ کے پاس اپنے بیٹے کے روپیہ کے متعلق شکایت لیکر گیا۔ جب وہ ایلی شا کے گھر کے سامنے سے گذرا تو اُسے ایلی شا کی بیوی ملی جس نے اُسے پوچھا "میاں صاحب! آپکا کیا حال ہے؟ آپ بخیریت یروشلم ہو آئے ہیں؟" الغیم گھبرا گیا اور کہنے لگا "ہاں خدا کی مہربانی سے میں یروشلم ہو آیا ہوں۔ آپ کے شوہر میرے ساتھ نہ جا سکے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ واپس بخیریت پہنچ گئے ہیں۔" ایلی شا کی بیوی گفتگو کی دلدادہ تھی کہنے لگی "ہاں! میاں صاحب وہ ایک عرصہ سے واپس آئے ہوئے ہیں۔ اور ہم خدا کے شکرگذار ہیں جس نے اُنہیں واپس بھیجدیا۔ ہم تمام ان کے بغیر اداس رہتے تھے۔ ہم اُن سے کسی قسم کے کام کی توقع نہیں رکھتے کیونکہ اُنکی کام کرنے کی عمر گذر چکی ہے۔ وہ تمام کنبہ کے بزرگ ہیں۔ اور اُن کا سایہ ہمارے سر پر باعث رحمت ہے۔ میرا بیٹا تو اُنکے بغیر ایک تاریک سورج کی طرح تھا۔ ہم سب کو اُن سے محبت ہے اور ہم سب اُن کا خیال

"کیا وہ اب گھر پر ہیں؟" الغیم نے پوچھا۔

اُس نے کہا: "وہ گھر میں شہد کی مکھیوں کے چھتے جمع کر رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اس سال شہد کافی ہے۔ یہ سب خدا کی مہربانی ہے کہ وہ ہم پر ہمارے گناہوں کو درگذر کرتے ہوئے مہربانی کرتا ہے۔ آپ اندر تشریف لایئے وہ آپ کو دیکھ کر یقیناً خوش ہونگے۔" الغیم اندر چلا گیا۔ ایلی شا ایک بھورا کوٹ پہنے۔ بغیر دستانوں یا نقاب وغیرہ کے ایک درخت کے پاس بیٹھا ہاتھ پھیلائے اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کا گنجا سر اُسی طرح چمک رہا تھا جس طرح الغیم نے یروشلم میں کتاب مقدس کے پاس دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سورج کی کرنیں درخت کے پتوں میں سے چھن چھن کر پڑ رہی تھیں۔ اور ارض مقدس کی آگ کا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ شہد کی مکھیاں اُس کے چہرے کے اردگرد گھوم رہی تھیں۔ اور ہالہ کا منظر پیش کر رہی تھیں مگر اُسے ڈنگ نہیں مارتی تھیں۔

الغیم ٹھہر گیا۔ ایلی شا کی بیوی نے اپنے خاوند کو آواز دی۔ کہ اُسکا دوست آیا ہے۔ ایلی شا نے خوش خوش اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر الغیم کی طرف اپنی داڑھی میں سے شہد کی مکھیاں نکالتا ہوا آیا اور پوچھنے لگا "کیوں یار! وہاں بخیریت پہنچ گئے تھے؟" الغیم نے کہا "ہاں! آپکے لئے دریائے یردان کا کچھ پانی لایا ہوں تاآپ براہ مہربانی میرے مکان پر تشریف لاکر اُسے لے جایئے۔ مگر خدا معلوم میرا حج قبول بھی ہوا ہے یا نہیں؟" ایلی شا نے کہا: "خداوند یسوع مسیح آپ پر رحم کرے!"

الغیم نے کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد کہا: "میرا جسم تو وہاں موجود تھا۔ مگر میری روح کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ مگر

یہ سب خدا کی قدرت اور مہربانی ہے۔ "این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" الیم نے کہا۔ "واپسی پر میں اُس جھونپڑی میں گیا تھا۔ جہاں آپ پیچھے رہ گئے تھے" ایلی شا چوکنا ہو گیا اور قطع کلامی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ خدا کی قدرت ہے! اندر آیئے میں آپ کو شہد دونگا۔"

ایلی شا نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا اور خانگی معاملات کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ الیم نے سرد آہ بھری۔ مگر نہ تو اُس نے اُسے جھونپڑی والوں کی حالت بتلائی اور نہ اُس نے یروشلم میں دیکھنے کا واقعہ بیان کیا۔ مگر وہ سمجھ گیا۔ کہ خدا کو راضی کرنیکا طریقہ صرف ایک ہی ہے کہ انسان انسان سے ہمدردی کرے اور ایک دوسرے سے مہربانی سے پیش آئے کیونکہ ؏

"دل بدست آور کہ حج اکبر است"

رکن الدولہ شمشیر جنگ کنور محمد سجاد علی خان صاحب بسمل آف کرنال

سے خطاب

لسان الوقت حضرت راز یزدانی نوجوان طبقے کے روشن خیال اور اصلاح پسند شعراء میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ آپکے شاعرانہ کمال اور آپکے جذبۂ قوم پرستی نے آپکے لئے مزید تعارف کی ضرورت باقی نہیں رکھی ہے۔

پنجاب کی "اردو پرستی" اور "مردم نوازی" کا کھلا ثبوت موصوف کے حسب ذیل اشعار ہیں۔ جن میں ہماری زبان کے لسان الوقت نے اپنی تمام خودداری اہمیتِ ادب کے واقعی اظہار کے ساتھ ساتھ پنجاب کے ایک قابل فخر فرزند کی "نگاہ گلستان شناس" کا اعتراف بھی کیا ہے جس "شاعرانہ پیام" اور "قومی نظریۂ اصلاح" کو راز صاحب نے "بہار من" کہا ہے۔ کاش وہ مجموعی صورت میں ملک کے سامنے آکر باعثِ استفادۂ عام ہو سکے —————— مدیر

من آں نیم کہ قصیدہ نگار بیت بکنم | کہ صاف گویم و صدق و صفا شعار من است
تراتگاہ گلستان شناس می داند | بگیر زود بگیر آنچہ در بہار من است

جناب الطاف مشہدی

انقلاب

تا بکے دامِ غلامی کے اسیر و پابہ حجاب؟
تا بکے مردانگی کے رُخ پہ ذلّت کی نقاب؟
تا بکے تقدیر کے تاروں پہ افرنگی سحاب؟
اُٹھ کے دیکھو ہمتوں سے کہہ رہا ہے اضطراب

انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

زلزلے، طوفان، بادل، آندھیاں، بجلی، شرار
شیر، بچھو، ناگ، ہاتھی، بھیڑیئے، آسیب، مار
دشت، ٹیلے، ندیاں، سبزہ، سمندر، آبشار
کہہ رہے ہیں تلملا کر کب سے با چشمِ عتاب

انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

آستینوں کو چڑھا کر، کھینچ کر تیغ و سناں
موت سے آنکھیں ملا کر، خنجروں کے درمیاں
گولیوں کو گھور کر، اعدا کو کر کے نیم جاں
ہند کو کر دو مہکتے خلد زاروں کا جواب

انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

کھنکھناتی برچھیوں کے زمزموں پہ جھوم کر
دندناتی توپ کے بیہودہ ترا سے چوم کر
کھلکھلاتی بجلیوں کی سیڑھیوں پہ گھوم کر
لیلیٔ مغرب کے چہرے سے اُلٹ ڈالو نقاب

انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

ہند کے دہقان کا حامی ضعیفوں کا عصا
بیکس و ناچار مزدوروں کا واحد آسرا
غم نصیبوں کے لئے تقدیر کا جلتا دیا
ہے اگر کوئی تو دنیا میں فقط اک انقلاب

ہے اسی کی تہ میں پوشیدہ مقدر کا شباب

ہاں ذرا پھر انقلاب و انقلاب و انقلاب

نقد و نظر

دنیائے راز ۔ مصنفہ ابوالفاضل راز چاندپوری کتابت وطباعت دلآویز صفحات ۱۱۲ قیمت دس آنے ۔ ملنے کا پتہ ۔ ایم ۔ اختر چاندپوری ، فیکٹری کوارٹرس اجمل پور (سی پی)

دنیائے راز ابوالفاضل مولانا راز چاندپوری کے کلام کا مجموعہ ہے ۔ مولانا راز دور حاضرہ کے خوشگو اور کہنہ مشق شعراء میں شمار ہوتے ہیں ۔ آپکا کلام اگر ایک طرف نقادانِ فن کے حلقے میں وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو دوسری طرف عامۃ الناس سے بھی خراج تحسین حاصل کر چکا ہے جن حضرات کو ملک کے مقتدر رسائل وجرائد کے مطالعہ کا اتفاق ہوتا رہتا ہے وہ جناب راز کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے ! ۔۔ دنیائے راز پانچ مختلف حصوں میں تقسیم ہے ۔ پہلا حصہ تمہید و تحمید ہے جسمیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے قادر مطلق کی ثنا درج ہے ۔ دوسرا حصہ "خیالستان" ہے اس باب میں عالم تخیل کے مختلف پہلوؤں میں تخیلات و تصورات کے گوناگوں مناظر ہیں ! اور پھر ہر ایک پہلو ہر ایک منظر حسین و دلکش ! بالخصوص نظمیں "شوق دید" اور "افطار" قاری و سامع کے ذہن و دل پر نقش سا کھینچ دیتی ہیں ۔ تیسرا باب سوز و نکات پر مشتمل ہے ۔ چوتھا "مہر دلبراں" اور پانچواں "دامن گلچیں" ہے ۔

جناب راز کی جہاں اور شاعرانہ خصوصیات ہیں وہاں انکی سادگی بھی خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ شاعر فلسفیانہ نکات وحقائق کو نہائیت عام فہم پیرائے میں بیان کر دیتا ہے دریا کو کوزے میں دیکھنا ہو تو دنیائے راز کا مطالعہ ضرور کیجئے ! یہاں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں ۔

افکار پریشاں کے باب میں "لمحاتِ غم" کے عنوان سے ایک دلپذیر نظم درج ہے ۔ اسکا پہلا ایک بند ملاحظہ فرمائیے ۔

اکثر کنارِ آب جو بیٹھا ہوا اندوہگیں گنتا ہوں میں لمحاتِ غم رہ رہ کے تا حدِ بیاں
اٹھتی ہوئی ہیں پے بہ پے گرتی ہیں اٹھکر دمبدم بڑھتی ہیں ساحل کی طرف اٹھ اٹھکے پھر وہ نیم جاں
ٹکرا کے ساحل سے مگر ہٹتی ہیں پیچھے کی طرف جاتی ہیں پھر کچھ دور تک ہو جاتی ہیں آخر فنا
اٹھتا ہوں میں باچشم تر ساحل سے پھر کچھ سوچکر کہتا ہوں دل سے دیکھ لے انجام ہستی کیا ہوا

۔۔۔ میں "الحمد للہ" کے عنوان سے جو نظم درج ہے ۔ وہ ہمارے خیال میں مولینا کی بہترین نظموں میں سے ہے ۔ پہلا بند ملاحظہ فرمائیے ۔

سحر کو مطلعِ مشرق سے جب سورج نکلتا ہے افق سے نور بے پایاں کا اک چشمہ ابلتا ہے
چمن میں سبزۂ خوابیدہ بھی کروٹ بدلتا ہے ہر اک غنچہ چٹکنے کے لئے پیہم مچلتا ہے

تری رحمت سے دور بادۂ گلرنگ چلتا ہے

بنات۔ (زیر ادارت جناب رازق الخیری، کتابت و طباعت جاذب دل و نگاہ، صفحات ۴۴ سالانہ چندہ ایک روپیہ بارہ آنے مقام اشاعت دفتر بنات دہلی)

بنات بچیوں کا واحد ماہنامہ ہے جو مدت سے جناب رازق الخیری کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں متعدد و بلند پایہ اور موقر نسوانی رسائل موجود ہیں مگر بچیوں کیلئے بنات کے سوا کوئی پرچہ نظر نہیں آتا۔ زیر نظر بنات کا جنوری نمبر ہے جسمیں قریباً پچیس کے قریب مضامین نظم و نثر موجود ہیں۔ محترم ایڈیٹر صاحب نے مضامین کی جامعیت افادیت کیطرف خاص توجہ دی ہے تمام مضامین دلچسپ و مفید ہیں بالخصوص مصور غم علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون "اللہ میاں" بیحد مفید ہے اس کے علاوہ محترمہ مس حمیدہ اسد اللہ کا مضمون "شیکسپیر" اور افسر الشعرا آغا شاعر کا مسلسل افسانہ "بن مانس کے لڑکی" بیحد دلچسپ ہیں محترمہ تسنیم کی نظم بھی بہت لائق داد ہے
ایڈیٹر صاحب نے بچیوں کی مزید دلچسپی کے لئے حسابی چٹکلے، پہیلیاں، معمے، لطیفے، بند کلیاں کی ترکیبیں اور دستکاری کے نمونے بھی مہیا کئے ہیں

پریم ترنگ۔ (مصنفہ لالہ کانشی رام چاولہ، کتابت و طباعت اعلیٰ، صفحات ۲۱۲ قیمت بلا جلد ایک روپیہ مجلد ایک روپیہ تین آنے ملنے کا پتہ لالہ کانشی رام چاولہ سپرنٹنڈنٹ دفتر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر ہوشیار پور)

"پریم ترنگ" جناب لالہ کانشی رام چاولہ کے نہایت مفید سبق آموز اور دلچسپ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اسوقت کہ ہندوستان فرقہ وارانہ مناقشات کا شکار بنا ہوا ہے ہمیں ایسے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے جو الفت، اخوت اور رواداری کا جذبہ پیدا کرے بلاشبہ "پریم ترنگ" اپنے موضوع کے لحاظ سے خاص طور پر ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ اس میں مصنف نے فرقہ وارانہ جذبات سے اپنا دامن بچا کر پبلک کو فراخدلی، بردباری، ہمدردی اور اس قسم کے دیگر اہم اوصاف کا سبق دیا ہے۔
آغاز کتاب میں مصنف نے دیباچے میں اس کتاب کے لکھنے کے مقصد پر روشنی ڈالی ہے۔ اسکے بعد مضامین شروع ہوتے ہیں۔ کل مضامین چھبیس ۲۶ ہیں اور ہر ایک کارآمد و مفید ملک کو جناب کانشی رام چاولہ کی اتحاد پرور مساعی کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ امید ہے جناب مصنف اپنی کوشش کو جاری رکھیں گے۔

شمس المشائخ۔ (زیر ادارت جناب مقبول احمد داؤدی، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۳۲ سالانہ چندہ دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ شمس المشائخ شریف پورہ۔ امرتسر)
شمس المشائخ حقیقتاً اپنی طرز کا واحد مذہبی رسالہ ہے جسمیں متعدد مفید علمی مقالات درج ہیں رسالے کے ایڈیٹر جناب مقبول احمد داؤدی ایک کہنہ مشق ادیب ہیں جو کئی رسائل و جرائد کے ادارتی فرائض کو بطریق احسن ادا کر چکے ہیں۔ اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ شمس المشائخ ان کی ادارت میں ترقی نہ کرے۔ رسالے میں مشائخ کی بیجا تعریف نہیں کی گئی۔

سب رس۔ (زیر ادارت صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش، کتابت و طباعت اعلیٰ صفحات ۹۲ سالانہ چندہ چار روپے آٹھ آنے قیمت فی پرچہ چھ آنے مقام اشاعت ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن)

سب رس ایک جدید ادبی رسالہ ہے جسکے نگران مشہور نقاد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی اور ایڈیٹر میر محمد علی خاں میکش ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر زور صاحب موصوف کا ایک مفید مقالہ ہے جسمیں محترم مقالہ نگار نے رسالے کے اغراض و مقاصد کے علاوہ اردو زبان کی ترقی کے ذرائع پر بھی اختصار کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے ضرورت ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس اہم موضوع پر شرح و بسط کیساتھ لکھیں۔ ایڈیٹر صاحب نے مضامین کی ترتیب میں حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ قریباً تمام مضامین نظم و نثر خوب ہیں۔ بگمان میں سب سے قطب شاہی عبدالرزاق لاری کی تصاویر زندگی گیا ہے۔ دو آتشہ، تصویر کا تعلیمی پہلو، ایک چینی سپاہی نو کے عنوانات سے جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ خاص طور پر مفید و قابل مطالعہ ہیں رسالے کے آخر میں بچوں اور طلبہ کے لئے بھی مفید مضامین درج ہیں۔ یہ تنوع رسالے کی افادی حیثیت پر خاص اثر ڈالتا ہے۔ رسالے میں تصاویر بھی ہیں۔ تینوں رنگین ہیں اور یہ دنیائے اردو کی اہم شخصیتیں ہیں۔ پہلی تصویر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ہے دوسری پروفیسر وحید الدین سلیم مرحوم کی اور تیسری مولانا ماجد کی ہے۔ تخلیق اعضا کے نام سے حضرت قیوم کی

دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری

مرتبہ

انجمن ترقی اردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں۔ اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے۔ اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے چند خصوصیات ملاحظہ ہوں :-

(۱) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے۔ انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوگئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں۔

(۲) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے۔ اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں۔ جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں۔

(۳) ہر لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کیلئے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دیدیا گیا ہے۔

(۴) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور انکے نازک فرق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کی وضاحت مثالیں دیدے کر کی گئی ہیں۔

(۵) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لئے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کرسکے اور اس غرض کے لئے تمام اردو ادب بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے۔ یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملےگی۔

(۶) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں۔

(۷) اس لغت کے لئے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے۔ طباعت کے لئے اردو اور انگریزی کے ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں۔ جلد بہت پائدار اور خوبصورت بنوائی گئی ہے۔

(تقطیع ... صفحات ۱۵۰۵ اور ۳۲) قیمت مجلد ... روپیے کلدار علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ: دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

بچوں کیلئے دلچسپ اور سبق آموز کتابیں

سارباں قیمت ۴ر	شیطان کا پرچہ اور دوسری کہانیاں ۳ر	موصل کا یتیم ۳ر	کولمبس ۴ر
چار سہیلیاں قیمت ۶ر	محنت کا پھل ۴ر	چڑیا گھر ۴ر	چند پند ۴ر
[illegible] قیمت ۱۲ر	حقائق اسلام ۴ر	شیر غزنا ۳ر	دو رنگی تحفہ [illegible]
دامن مریم ۸ر	ملک تم تم ۴ر	غیور مسلمان ۳ر	اخلاقی نظمیں ۴ر
غزالی ۱۰ر	حکایات شب بہشت ۶ر	سرفروش مسلم ۴ر	شعور ۶ر
بکھرا شہزادہ ۴ر	طالب علم کی زندگی ۱۲ر	مرزا پھوپیا ۲ر	[illegible]
ہجرت ۳ر	نسیم پیپسی ۲ر	چھوٹا لڑکا ۱ر	ولیم ٹیل ۲ر
دہقان عرب ۴ر	سنہری گیت ۴ر	بہادر لڑکا ۱ر	نپولین بونا پارٹ ۶ر
حکایات عرب ۳ر	پر پرواز ۵ر	سچا لڑکا ۱ر	اچھے گیت [illegible]
انتقام ۳ر	حقیقی شیر ۲ر	مشعل صداقت ۱ر	فن تیغ زنی ۱۲ر
چور اور گرہ کٹ ۲ر	بازیچہ ۴ر	محمدی نور ۴ر	علمی کہانیاں [illegible]
نور ہدایت ۴ر	دربارچہ ۶ر	سوتیلا بھائی ۳ر	منتخب حکایات [illegible]
امانت ۴ر	غنچہ حکمت ۴ر	دکن کی پری ۴ر	[illegible]
بلقیس ملکہ سبا ۲ر	عجیب انتقام ۳ر	چھپتا بھائی ۴ر	[illegible] ۴ر
بیجان وفا ۵ر	نقلی شہزادہ ۴ر	تب تم اچھے بچے ہو ۴ر	آخری سہارا اور دوسری کہانیاں

ملنے کا پتہ مکتبہ اردو [illegible] سرکلر روڈ لاہور

دنیائے افسانہ میں

ایم اسلم کے مندرجۂ ذیل افسانے بہترین تسلیم کئے جا چکے ہیں

ثمرِ گناہ ۔ یعنی تین دلچسپ نتیجہ خیز افسانے۔ ہر افسانہ پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ ۔ ۔ علہ

سیلابِ ہستی } ہندو طرزِ معاشرت کی دلچسپ تصویر۔ یعنی ایک سادھو دھرم کو تیاگ کر تعلیم یافتہ لڑکی

دھرم پتنی } کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ جو پڑھنے کے قابل ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

تفسیرِ حیات } جن اہلِ ادب نے ایم اسلم کے افسانے پڑھے ہیں انکو معلوم ہے کہ زندگی کے وہ معمولی واقعات جو انسان کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے ایم اسلم صاحب ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ لہٰذا قابل مصنف کے ایسے ہی جدید چالیس افسانوں کا یہ نادر مجموعہ ہے۔ ہمارا دعوٰی ہے کہ اردو زبان میں اس شان کی ایسی دلچسپ نتیجہ خیز کوئی کتاب آج تک طبع نہیں ہوئی ضخامت تقریباً سات سو صفحات اور جلد نہایت خوبصورت کاغذ گلیز کتابت طباعت نہایت صاف ہے قیمت صرف عہ

رازِ حیات } یہ تفسیر کا دوسرا حصہ ہے اسمیں بھی ۴۰ جدید افسانے ہیں اور ہر افسانہ نتیجہ خیز دلچسپ اور بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ ضخامت تقریباً ۰۰ صفحات۔ خوبصورت جلد گلیز کاغذ۔ طباعت کتابت پاکیزہ۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے ۔ عہ

آشوبِ زمانہ } اس کتاب میں قابل مصنف نے اپنی وسعت مشاہدہ اور رنگین عبارت سے جذبات و محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ جو اگرچہ مرد اور عورت کے چند خطوط کا مجموعہ ہے لیکن نہایت دلچسپ نتیجہ خیز ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ ۔ ۔ علہ

گناہ کی راتیں } یہ کتاب اپنے انوکھے مضامین کے باعث اسقدر مقبول ہو چکی ہے۔ کہ اس کا چوتھا ایڈیشن ہم نے طبع کیا ہے جس میں انسان کی ریاکاریوں کے وہ افسانے درج ہیں جو نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ۔ علہ

تمام مزاحیہ افسانوں کا ماسٹر پیس مرزا جی حصہ اول و دوم

مرزا جی حصہ اوّل کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوگیا ہے

موجودہ مزاحیہ لٹریچر میں مرزا جی کو جسقدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے تمام اہلِ ادب اس سے واقف ہیں لہٰذا اگر آپ مزاحیہ افسانے اور ذاتیہ مضامین پڑھنے کے شائق ہیں تو مرزا جی ضرور پڑھئے تمام ادبی رسائل و اخبارات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اردو زبان میں مرزا جی کے مقابل اس سے زیادہ سنجیدہ اور اچھوتے مذاق کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی مرزا جی کا حصہ اول ختم ہو جانے کے باعث اسکے دوسرے ایڈیشن کا ملک میں بے حد انتظار تھا۔ چنانچہ اب حصہ اول و دوم دونوں موجود ہیں۔ جن کی مجموعی قیمت مجلد کی صرف پانچ روپے ہے یعنی حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

ملنے کا پتہ: ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب بل روڈ کشمیری بازار لاہور

مکتبۂ اردو کی ہر دلعزیز کتب

پیغمبرِ صحرا } اردو ترجمہ دی پرافٹ آف دی ڈیزرٹ اسمیں مشہور نومسلم بیرسٹر علامہ شیخ خالد لطیف نے پیغمبرِ کائنات کے حالات نہایت دلنشیں اور سیدھے ہوئے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ہر لفظ سے عشقِ رسالت کی خوشبو آتی ہے قیمت مجلد و مطلا دو روپے

چاند کا گناہ اور دیگر افسانے } اس مجموعہ میں دنیا بھر کے نقادانِ ادب کے بہترین تسلیم شدہ افسانے شامل ہیں جو اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ مضبوط جلد بہترین ریپر۔ مصنفہ راجہ مہدی علیخاں۔ قیمت دو روپے صرف۔ عگر

کمپنی کی حکومت ہندوستان میں } داستان ہے اُس صد سالہ دورِ پُرآشوب کی جب ہندوستان کو سیاسی طور پر محکوم اور اقتصادی لحاظ سے غلام بنایا جا رہا تھا تاریخ ادب۔ تنقید۔ مصنفہ اشتراکی ادیب باری۔ قیمت مجلد و مطلا ڈیڑھ روپیہ۔ عہ

تین پیسے کی چھوکری اور دیگر افسانے } یہ افسانے قاضی صاحب کی کاوشِ دماغی کا نتیجہ ہیں یقین واثق کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانے اردو کے حق میں ایک نہایت حسین اضافہ ثابت ہوئے ہیں۔ مصنفہ قاضی عبدالغفار خاں (مصنف لیلےٰ کے خطوط) قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ۔ عہ

آہنگِ رزم } ہندوستانی زبان میں جنگی ترانوں کا پہلا مجموعہ۔ شجاعت اور غیرت کے جذبات ابھارنے والی کتاب۔ دوسرا ایڈیشن دو نئی نظمیں بھی شامل ہیں۔ وقار انبالوی۔ مجلد آٹھ آنے۔ ۸ر

نقشِ دوام } جدید نظم گوئی کے ارتقا اور فلسفیانہ جذباتی رنگِ سخن سے لطف اندوز ہونے والوں کے لئے نقشِ دوام کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ سید عبدالحمید عدم مجلد و مطلا دو روپئے۔ عگر

کولمبس۔ مصنفہ پنڈت میلارام وفا مجلد قیمت آٹھ آنے۔

غیور مسلمان ۳ر شیرِ غرناطہ ۳ر۔ سرفروش مسلم ۳ر۔ مرزا پھوئیا ۲ر۔ سخاوت ۳ر زنجیرِ عدل ۳ر پیامِ رسول ۳ر ذہانت ۳ر پھول باغ حصہ اول ۵ر پھول باغ حصہ دوئم ۴ر پھول باغ حصہ سوئم ۴ر سپر چی والا ۴ر۔ سچا لڑکا ۱ر۔ میونسپل کمشنر ۱ر زندگی کی جنگ ۱ر محمدی بوا ۴ر۔ دکن کی پری ۴ر

زیرِ طبع کتب

فرشتوں کا امتحان ۱۲ر شہنشاہِ حبشہ ۸ر۔ آخری فیصلہ ۱۲ر۔ افکارِ زنداں ۱۲ر شبستانِ الم دنیا کی حور اور دیگر افسانے ۱۲ر عورتوں کے افسانے ۱۲ر پھول اور کانٹے ۱۲ر صحرا نورد کے خطوط عگر

ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ اردو ۱۵۹۔ سرکلر روڈ لاہور

[illegible] تعلیم پنجاب برائے پرائمری و مڈل

جدید جیومیٹری حصہ اول، دوم، سوم۔ مصنفہ چوہدری [illegible] ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی سکول [illegible] منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر ۵۵ صفحہ ۱۴ برائے جماعت ششم ہشتم۔ یہ کتابیں جدید طرز تعلیم پر لکھی گئی ہیں اور ہر قاعدے کی وضاحت عام فہم تجربوں سے کی گئی ہے۔ سوالات حتی الوسع ایسے دیئے گئے ہیں۔ جو طلبا کی لیاقت کے مطابق ہوں اور اُن کے جوابات مشکوک اور حیران کن نہ ہوں۔ مثالیں اور تجربے ایسے تجویز کئے گئے ہیں جو آسان ہیں اور روزمرہ کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۳/ ۲ پائی۔ دوم ۵/ ۲ پائی۔ سوم ۱/ ۲ پائی۔

[illegible]

دیگر بہترین کتب برائے پرائمری و مڈل کلاسز

رہنمائے املا پرائمری و مڈل کی جماعتوں کے لئے اس کتاب میں وہ تمام مشکل الفاظ درج کر دیئے ہیں جن کی املا میں پرائمری اور مڈل کے لڑکے فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ قیمت ۱/

[illegible]

کاپی زبانی حساب

[illegible]

پاپولر انگلش گریمر و کمپوزیشن

حصہ اول [illegible] سوم

مصنفہ چوہدری محمد جمیل [illegible] ایم اے آنرز [illegible] ترمیم کردہ مسٹر ڈی۔ [illegible] سپرنٹنڈنٹ۔ ایم اے اوکسن۔

یہ سلسلہ کتب انگریزی مضامین [illegible] کے نہایت اہم اور ضروری قاعدوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کی زبان عام فہم ہے اور ہر قاعدے کو مکمل طور پر مگر مختصر الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ تمام کتاب میں مشکل الفاظ کے اردو میں معانی لکھے گئے ہیں تاکہ کمزور سے کمزور طالب علم بھی کتاب ہذا سے مستفید ہو سکے۔ ہمارا دعوےٰ ہے کہ اس موضوع پر اس جیسی کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی اور تمام پنجاب کے سکولوں میں بلا تامل رائج ہو رہی ہے۔ ان کتب کا چوتھا حصہ مڈل اور ہائی کلاسوں میں حسب خواہش استعمال کیا جا رہا ہے۔ امید ہے۔ آپ بھی اس کتاب کو اپنے سکول میں رائج فرما کر طلبا کو مستفید ہونے کا موقعہ بخشیں گے۔ قیمت حصہ اول [illegible] دوم [illegible] سوم [illegible] چہارم [illegible] برائے پانچویں چھٹی ساتویں آٹھویں [illegible]

تعلیمی لغات (اردو)

یہ مختصر مگر مکمل لغت طلبا کے لئے نعمت غیر مترقبہ اور استادوں کے لئے نادر تحفہ ہے۔ ہم نے مڈل اور ہائی سکولوں کے بہت سے تجربہ کار مدرسین کے علاوہ محکمہ تعلیم کے بعض افسران کے مفید مشورہ سے لغت تیار کرائی ہے اور اس میں سے وہ تمام خامیاں دور کر دی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر معلومات کا اضافہ کر دیا گیا ہے انگریزی کے عام مستعمل الفاظ اور مشکل محاورات اور ضرب الامثال وغیرہ درج ہیں۔ ایسی مفید لغت آج تک کوئی شائع نہیں ہوئی قیمت [illegible]

عملی سائنس کی نوٹ بک

حصہ اول دوم [illegible] قیمت [illegible]

معین الترجمہ

[illegible] مصنفہ [illegible]

پانچویں چھٹی [illegible] ان کتب کے پڑھنے سے انگریزی ترجمہ کرنے کے اصول طالب علم کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک مشق پہلے اردو کا اور [illegible] عبارت کا ترجمہ کیا گیا ہے [illegible] الفاظ کا انگریزی ترجمہ کتاب کے [illegible] دیا گیا ہے۔ [illegible] تمام مشقیں انگریزی گریمر کے اصولوں پر تیار کی گئی ہیں تاکہ ایک فقرہ ترجمہ کرنے سے گریمر کا اصول سمجھ میں آ سکے۔ اور باقی مشق اسی کی امداد سے حل کی جا سکے۔ قیمت حصہ اول برائے ششم [illegible] دوم برائے ہفتم [illegible] حصہ سوم برائے ہشتم [illegible]

کلید ترجمہ

مصنفہ مولوی [illegible] علی [illegible]

ضروریات کو مد نظر رکھ کر اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے قاعدے درج ہیں۔ قیمت اول [illegible] دوم [illegible] سوم [illegible]

رہنمائے انشاء فارسی

مصنفہ جناب [illegible]

انشاء فارسی کی یہ کتاب مضمون [illegible] کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے تیار کی گئی ہے۔ بڑی مفید ہے۔ قیمت [illegible]

رہنمائے گریمر [illegible]

[illegible]

کتاب گریمر کے جدید اصول کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ [illegible] رہنمائی کے ساتھ چند فقروں کا استعمال [illegible] حصہ اول برائے ششم ہفتم ہشتم قیمت [illegible]

کاپی زبانی حساب

[illegible] ہشتم [illegible]

کتب منظور شدہ محکمہ تعلیم پنجاب برائے ہائی کلاسز!

سٹینڈرڈ ارتھمیٹک

برائے میٹرک ایڈیشن

ترمیم و تصحیح شدہ ایڈیشن۔

مصنفہ ناظر حسن قدوسی بی اے آنرز۔ بی ٹی وڈاکٹر عمر حیات ملک ایم اے منظور کردہ جناب ڈائریکٹر صاحب بہادر بموجب سرکلر نمبر ۱۲۲۴۶ مورخہ [illegible]

یہ کتاب قابل مصنفین نے نہایت محنت اور جانفشانی سے تیار کی ہے۔ اس میں یونیورسٹی سلیبس کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور دیگر ضروریات طلبا کو بھی اچھی طرح پورا کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پہلے سال تین ہزار کا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور دوسرے ایڈیشن پر محکمہ تعلیم نے اس کتاب کو منظور کر دیا ہے۔

قیمت دو روپے۔

سٹینڈرڈ الجبرا

برائے میٹرک ایڈیشن (ترمیم و تصحیح شدہ ایڈیشن)

مصنفہ ناظر حسن قدوسی بی اے آنرز بی ٹی وڈاکٹر عمر حیات ملک ایم اے منظور کردہ جناب ڈائریکٹر صاحب بہادر بموجب سرکلر نمبر ۱۲۲۴۶ مورخہ [illegible]

کتاب ہذا بھی سٹینڈرڈ ارتھمیٹک کی طرح ریاضی کی موجودہ کتب میں نادر تحفہ ہے۔ جو ہر دو مصنفین کے سالہا سال کے تجربہ اور قابلیت کا نچوڑ ہے۔ اس کتاب کو طلبا کی سہولتوں اور ضرورتوں و پنجاب یونیورسٹی کے سلیبس کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سٹینڈرڈ ارتھمیٹک سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل کر چکی ہے اور محکمہ تعلیم کی طرف سے بھی منظور ہو گئی ہے۔ قیمت دو روپے

دیگر بہترین کتب برائے ہائی کلاسز

سٹینڈرڈ انگلش گریمر

دوسرا ترمیم و تصحیح شدہ ایڈیشن۔

مصنفہ [illegible] بی اے وغیرہ محمد سیال ایم اے۔ بی ٹی۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی ہندوستانی انگلش گریمر کا مصنف نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کتاب کی بیشمار خریدیں کر [illegible] انگلش ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے والے حضرات کو [illegible]

[illegible] روپے۔

پاپولر انگلش ٹرانسلیشن

(برائے میٹرک ایڈیشن)

مصنفہ چوہدری طفیل محمد صاحب بیل اے آنرز۔ بی ٹی مصنف پاپولر کمپوزیشن۔

ٹرانسلیشن کی یہ کتاب مصنف نے اپنی پہلی تصنیف پاپولر کمپوزیشن کی طرح نہایت ہی جانفشانی اور کوشش سے مرتب کی ہے۔ اسی لئے ہر سکول میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے کیونکہ اس میں [illegible] دیگر کتب سے بہتر ہے۔ اور گریمر کے اصول [illegible] ہے۔ طلبا [illegible]

تاریخ انگلستان

مصنفہ شیخ عبدالعزیز بی اے۔ بی ٹی و ایم منتصر اللہ ایم اے۔ بی ٹی۔

کتاب ہذا قابل مصنفوں کی کئی سالوں کی کاوش سے جدید سکیم کے مطابق اُردو میں برائے میٹرکولیشن تیار کرائی گئی ہے۔ یہ کتاب جدید سلیبس کے مطابق لکھی گئی ہے اور ان تمام غیرضروری حصے۔ کہانیوں سے مبرا ہے۔ جو کئی سالوں سے سلیبس سے نکال دیئے گئے ہیں اور نہ ہی امتحان میں آتے ہیں۔ طلبا اور اساتذہ بے حد پسند فرما چکے ہیں۔ قیمت مجلد ۱۲/

منیر القواعد فارسی

برائے ہائی کلاسز۔ فارسی کی یہ گرامر کئی ایک فارسی دان تجربہ کار ہیڈ ماسٹروں کے مشورہ سے مرتب کی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب ہذا طلباء میٹریکولیشن کی ہر ضرورت اور سہولت کو پورا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر جگہ مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ قیمت صرف چھ آنے۔

میپ سٹڈیز

اس میں طلبائے ہائی کلاسز کے لئے نقشہ کشی کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ نیز ضروری نقشے کھینچنے کے لئے خاکے دیئے گئے ہیں جن کے ساتھ اُن کو پُر کرنے کے لئے بھی ہدایات لکھی گئی ہیں۔ قیمت مجلد ۱۲/

مفید القواعد اُردو

(دوسرا ایڈیشن)

برائے طلباء میٹرکولیشن۔ یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے جدید سلیبس کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور اس غیر دلچسپ مضمون کو نہایت ہی دلچسپ اور عام فہم طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس کی طوالت اور ضخامت پر زور نہیں دیا گیا بلکہ ہر ایک اصل قاعدہ کو مختصر مگر جامع پیرایہ سے واضح کر دیا گیا ہے۔ ان ہر دو خوبیوں کی وجہ سے کتاب بے حد مفید ثابت ہو چکی ہے۔ قیمت ۸/

رہنمائے ترجمہ فارسی

حصہ دوم مصنفہ پروفیسر غلام ربانی

اس میں طلبا کی مشق کے لئے بہت سا ذخیرہ مہیا کیا گیا ہے نیز گرامر کے اہم اصولوں سے بھی واقفیت کرائی گئی ہے۔ قیمت ۸/

سیمپل انگلش کمپوزیشن

بڑی کارآمد کتاب ہے۔ قیمت صرف ۱۰/

ملنے کا پتہ

پنجاب بک ڈپو۔ لوئر مال ۹ لاہور

علمی ادبی و تنقیدی ماہنامہ

مصوّر ادب لطیف لاہور

ایڈیٹر

چودھری برکت علی بی اے

دارالاشاعت



اس مجموعے میں وہ بہترین افسانے شامل ہیں جو دنیا بھر کے بلند ادب
نظم میں بہترین تسلیم کئے گئے ہیں۔ اور جو اب تک اردو میں منتقل نہیں
تھے۔ "چاند کا گناہ" اور دیگر افسانے [illegible]۔ [illegible]
فریڈرک [illegible]۔ طامس ہارڈی۔ او ہنری [illegible]
[illegible]۔ چیخوف۔ لارڈ ڈنسینی اور دوسرے مشہور دنیا افسانہ نگاروں کی
ہے۔ ان افسانوں کا ترجمہ پنجاب کے مشہور نوجوان افسانہ نگار راجہ مہدی
علی خاں نے نہایت سلیس سادہ اور بامحاورہ زبان میں کیا ہے۔
۲۰۰ صفحے لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب قیمت مجلد [illegible]

قسمت کی آزمائش کا سنہری موقعہ!

موٹر کار کا انعام حاصل کریں



ارسطوئے ماں حضرت مولینا حکیم محمد عبدالخالق قبلہ سابق حکیم راولپنڈی پنڈت ... خاص سے انعام نکالیں گے
ہم نے سال گذشتہ میں اپنے مجربات کی قیمت نصف کردی تھی جس سے اہل ملک نے
کافی فائدہ اٹھایا ہے اب اعلان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ایک نہایت عمدہ
موٹر کار شورلٹ چھ سلنڈر جسکا فوٹو اشتہار ہذا میں دیا گیا ہے اور جو تمام پنجاب چکر ... ہی بطور انعام میں دی
جائیگی ذیل تحفہ جات کے ہمراہ انعامی ٹکٹ دیئے جاتے ہیں مئی ۱۹۳۵ء میں بمقام راولپنڈی کارخانہ صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ میں نتیجہ نکالا جائیگا۔ ... معاملہ ہے مفت میں قسمت آزمائیے قیمتی موقعہ ہاتھ نہ آئیگا آج ہی ذیل کے نایاب مجربات کا آرڈر دیکر انعامی ٹکٹ مفت حاصل کریں۔

سفید بال خوشبودار تیل سے قدرتی سیاہ ہوجاتے ہیں۔

ہندوستان کی ایجادات میں قابل قدر اضافہ۔

ہم نے جو ہیرو سمہ مہندی کو تیل کی شکل میں تبدیل کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا جو بارہ سال کے طویل عرصہ میں پورا ہوا ہے آج ہم نہایت مسرت کیساتھ ڈنکے کی چوٹ سے اعلان کرتے ہیں کہ وہ شوقین جو بال سیاہ کرنے والے تیلوں کا ... کرتے کرتے تھک گئے تھے آج خوشبودار تیل استعمال فرماکر اپنے سفید بالوں کو سیاہ کرسکتے ہیں۔ اگر ہمارے اس تیل سے ایک منٹ میں بال سیاہ نہ ہوں تو دوگنی قیمت واپس دیجائیگی ہم دغاباز اشتہار بازوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ایکروپیہ علاوہ محصولڈاک۔ یہ شیشی کافی عرصہ تک کام دیتی ہے۔

ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے کمیشن معقول دیجاتی ہے

طلا اعظم رجسٹرڈ۔ مردہ اور بے حس رگوں میں جوش جوانی پیدا کرکے بجلی کی طرح تیزی پیدا کرتا ہے مجلوق اور کثرت جماع کے بیماروں کیلئے یہ طلا اکسیر ثابت ہوچکا ہے۔ کجی سستی اور لاغری کا واحد علاج ہے۔ بوڑھے اور نوجوان یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں بالعموم ان کے استعمال کیلئے ... شیشی کی قیمت مع محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا

ممسک گولیاں رجسٹرڈ۔ نوجوانوں کو جریان احتلام سرعت انزال چاہے کسی وجہ سے ہو اور جوہر حیات پانی کی طرح کرنے سے صحت خراب ہوچکی ہو ان گولیوں کے استعمال سے تمام شکایتیں رفع ہوجاتی ہیں۔ سرعت انزال کے مریض کو ان گولیوں کے استعمال سے شرمندہ ہونا نہیں پڑتا۔ زیادہ تعریف خلاف تہذیب ہے۔ بارہ عدد گولیوں کی قیمت ایکروپیہ محصولڈاک بذمہ خریدار تینوں اشیاء کے خریدار کو محصولڈاک معاف۔

صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ آزاد منزل نیا کٹڑہ راجہ بازار راولپنڈی

سب ایجنٹ برائے ضلع ...

اجمل خانِ اعظم

آج دنیا اجمل خاں اعظم کو صرف اسی حیثیت سے جانتی ہے کہ طب قدیم کے مجدد اور امام فن اور اسی کے ساتھ ہندوستان کے قائد اعظم تھے۔ اجمل خاں اعظم کا امام فن اور ریفارمر اور قائد اعظم ہونا بیشک ایک حقیقت ہیں عوام کے علم سے زیادہ دو حیثیتیں ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا نے اجمل خاں اعظم کو جس حد تک سمجھا ہے اپنے لحاظ سے اسی حد تک وہ کامل و اکمل تھے یہ وہ شخص تھا کہ اگر عالمگیر کے زمانے میں پیدا ہوتا تو ہندوستان کا نقشہ کبھی ہرگز نہ ہوتا اور اپنے تدبر و ایثار و قربانی سے ہندوستان میں سب کو دودھ اور شہد کی طرح ملا دیا ہوتا۔ اور سارا ہندوستان پھر ایک "قوم" ہوتا۔

سب سے بڑی چیز جس کی وجہ سے دنیا کی ایک ناقابل فراموش ہستی تھے، ان کی طبی خدمات ہیں۔ جو ان کی سب سے بڑی خدمت انسانیت کے لئے ان کا ایثار اور قربانی ہے۔

صرف انیس برس کی عمر تھی کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی کے ہاتھوں سے دہلی کے مدرسہ طبیہ کا ۱۸۸۳ء میں افتتاح کرایا۔ اور ہندوستان میں ہمارے فن طب کی یہ سب سے پہلی باقاعدہ درسگاہ تھی جس نے انفرادی تعلیم و تعلّم کی بجائے ایک باقاعدہ اور اجتماعی نظام تعلیم کا ہماری طب کے لئے نمونہ پیش کیا جس میں نئی مغربی طب کے بعض مفید شعبوں (مثلاً تشریح اور جراحی) سے بھی استفادہ کا ہمارے طلباء کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی اس چھوٹے سے اسکول کے زیر ہدایت تھے۔ اس ادارہ نے اچھے طبیب پیدا کئے اور انہوں نے ملک میں ہندوستان کی طب کا نام روشن کیا۔ مدت تک یہ ادارہ محض ایک مدرسہ رہا اور ستر روپے ماہوار کے کرایہ کے مکان میں اس کا کام ہوتا رہا۔ آج یہی مدرسہ ہمارا عظیم الشان طبیہ کالج ہے جس پر چند لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ ہز ہائینس سر آغا خاں نے اس کالج میں کھڑے ہو کر فرمایا تھا کہ مجھے حیرت ہے کہ اس وقت میں کیا یورپ میں ہوں یا ہندوستان میں ہوں کیونکہ اس کالج کا وہی نقشہ اور وہی رنگ ڈھنگ ہے جو یورپ کے کسی کالج کا ہے۔

حکومت ہند کے صدر مقام میں ہماری طب کے ایسے عالیشان شاہانہ ادارہ کا ہونا ظاہر ہے کہ ہماری طب کے وقار و منزلت کا کیسا زندہ ثبوت ہے۔ اور کیسا گرانقدر کارنامہ ہے۔ ایک اسکول کو ایک کالج کے درجہ پر پہنچا دینا کیسا مشکل کام ہے۔ آج اس کا اندازہ بھی آسان نہیں ہے۔ اور مرحوم حکیم اجمل خاں نے اس کٹھن اور دشوار گزار منزل کو طے کرنے میں اپنی جان کیلئے کیسی کیسی مشقتیں گوارا کی تھیں۔ اس کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے انہیں یہ منزلیں طے کرتے دیکھا ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی آرام و آسائش اور اپنے ذاتی مفاد ہر چیز کو کالج کی خاطر قربان کر دیا تھا۔ معالجہ کی غرض سے بعض رؤساء ان کے پاس گئے۔ ایک ہزار روپے روزانہ کے حساب سے فیس پیش کی گئی۔ لیکن انہوں نے فیس لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے آپ سے کالج کے لئے اعانت حاصل کرنی ہے۔

پھر اس کالج کے دوام و بقا کے لئے انہوں نے ہندوستانی دواخانہ دہلی کو ترقی کے بلند مقام پر پہنچانے کے سلسلہ میں جو خدمات سالہا سال انجام دی ہیں اور اپنے راحت و آرام کی جو مسلسل قربانیاں کی ہیں اسے صرف وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے پاس رہ کر ان کا دکھ درد اور ان کی جانکاہ محنتوں کو دیکھا ہے۔

آج یہ دواخانہ پچھتر لاکھ روپے سالانہ کی بکری پر آ پڑتی ہے اور ان کے لائق فائق فرزند حکیم **محمد جمیل خاں** صاحب کی کوشش، سرگرمی اور خلوص و ایثار کی بدولت اسکی آمدنی پونے دو لاکھ روپیہ سالانہ تک پہنچ چکی ہے اور یہ سب کی سب آمدنی کالج پر صرف ہو رہی ہے جس سے تمام ہندوستان کے رہنے والے کیا ہندو کیا مسلمان کیا عیسائی کیا پارسی سب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اجمل خاں اعظم ڈاکٹری کے حریف نہ تھے وہ اس کی خوبیوں کے قائل تھے۔ اور اسی لئے انہوں نے اپنے کالج میں مغربی طب کے تمام مفید شعبوں کی عملی تعلیم کو کورس کے نظام تعلیم کا جزو بنا دیا لیکن اس کے ساتھ وہ طب یونانی اور ویدک کی بے مثل خوبیوں کے دلدادہ تھے۔ اور ان کی کوشش یہ تھی کہ ان طبوں کو ترقی کے ایسے درجہ پر پہنچا دیا جائے کہ یہ طبیں بھی ہندوستان کی سرکاری طب ہونے کا چارٹر حاصل کر سکیں۔ غرض یہ وہ شخص تھا جو زندہ رہا تو اپنے تمام بندگان خدا کی بھلائی اور دردمندی کی اور دنیا سے رخصت ہوا تو اپنی یادگار علمی و روحانی ایسی چیزیں چھوڑ گیا جن کی وجہ سے اس بندۂ خاص کی نفع رسانی اسی طرح جاری ہے جس طرح کہ وہ اس کی زندگی میں جاری تھی۔ حکیم **محمد جمیل خاں** صاحب کی اس کار خیر میں مدد کرنی اور **اجمل خان اعظم** کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے حصہ لینا کیا اس محسن اعظم کی سپاس گزاری کا وہ فرض نہیں ہے، جو آج ہم سب کا فرض ہونا چاہیے۔ حضرات! یہ اجمل خاں اعظم کی روح کا پیغام ہے، اور یہ پاک روح آج ہم سے اپنے پیغام کا جواب مانگتی ہے

ناشر

منتظمین یوم اجمل

منظور کردہ محکمہ تعلیم پنجاب و ریاست حیدرآباد دکن

مکتبہ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ ۰ لاہور

ادب لطیف

مارچ ۱۹۳۸ء

ادارۂ تحریر

چوہدری برکت علی بی اے

میرزا ادیب بی اے

مقام اشاعت

مکتبہ اردو لاہور

فی پرچہ ۸ آنے

کتبہ محمد شریف عباسی خوشنویس لاہور

[illegible]

سالانہ چندہ مع خاص نمبر سالنامہ
فی نمبر علاوہ محصول ڈاک

چندہ
ممالک غیر سے
آٹھ شلنگ

مندرجات

جلد ۷ | بابت ماہ مارچ ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

(چوہدری برکت علی بی اے پرنٹر و پبلشر نے دی ینگ کوآپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس ... بلڈنگ لاہور سے چھپوا کر ادب لطیف ... روڈ لاہور سے شائع کیا)

ادارہ

نذرِ اولین

ادب لطیف کے محاسن میں اضافہ - مارچ ۱۹۳۸ء سے ہم نے ادب لطیف کے حصۂ نثر میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس کے قریباً ہر مضمون کی نوعیت ہے یعنی پہلی طرز کی نثر کے لحاظ سے پرچہ ہمہ صفت کو محیط ہو رہا ہے۔ اس رفتہ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ حصۂ نثر کے مضمون نگار ہماری نقل میں [illegible] جناب نظیر بی۔ اے۔ حضرت احسان بی۔ اے، جناب [illegible] [illegible] پیارے لال شاکر میرٹھی کے مضامین نظم [illegible] مضمون حصار [illegible] جناب [illegible] انسان کا مضمون نظر [illegible] [illegible] کی روشنی میں [illegible] نے [illegible] کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور حقیقت ہے کہ ان کی کوشش کافی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ حضرت احسان بی۔ اے کا ترجمہ اقبال [illegible] ہے۔ آپ ادب کے علاوہ ذوق سلیم سے بھی بہرہ وافر رکھتے ہیں۔ آپ کے افسانے ادب لطیف میں شائع ہوتے رہیں گے۔ منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی تشریف آوری ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔ [illegible] آپ کا کلام [illegible] اردو میں بہت مقبول ہے۔ [illegible] [illegible] کامیاب ہے۔ [illegible] عنوان [illegible] شاکر صاحب کے شکر گزار ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ ایک صاحب بھی ہیں [illegible] قریشی بی۔ اے [illegible] دوست [illegible] [illegible] ہے۔ **ادب لطیف** کا افسانہ نمبر اپریل کے بعد شائع ہوگا وہ ادب لطیف کا افسانہ نمبر ہوگا۔ امید ہے ہمارا یہ افسانہ نمبر نہ صرف ادب لطیف کے گذشتہ افسانہ نمبر کے [illegible] ہوگا بلکہ [illegible] کے افسانہ نمبروں سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ [illegible] مضمون ہوں گے ہی نہیں بلکہ اس کی ضخامت بھی [illegible] سامنے سے کچھ کم۔

تنقید کی اہمیت و افادیت سے کسی حالت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تنقیدی مقالات اسی طرح ان کے لکھنے والوں میں انتقادی فرائض کی ادائیگی کی صلاحیت موجود ہو [illegible] بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ ان [illegible] تخریب [illegible] [illegible] ہمت افزائی [illegible] ہاں تعمیری تنقید [illegible] کسی قوم اور کسی ملک کا ادب اس وقت تک بلند سطح پر نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کے [illegible] تعمیری تنقید [illegible] حقیقت یہ ہے کہ انتقاد کی ذمہ داریاں بہت سخت [illegible] [illegible] بہت خطرناک ہوتی ہے مگر یہ کیا قیامت ہے کہ اردو میں ہر شخص جو تنقید نگاری کی مبادیات سے بھی ناواقف ہوتا ہے نقاد بن جاتا ہے اور اس قسم کے انتقاد کا نام نہاد ادبی مسائل تخریبی تنقید کے نمونے [illegible] [illegible] کہ ادب [illegible] ثابت ہوگی خیال غلط نہیں [illegible] [illegible] تخریبی تنقید میں شائع کرنے میں خاص [illegible] رکھتا ہے۔ اس کے جنوری نمبر میں [illegible] مضمون شائع ہوئے ہیں [illegible] تنقید سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ پہلا مضمون [illegible] اردو زبان [illegible] کے مصنف [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible] صاحب اپنی [illegible] پر کچھ غرور [illegible] ہو گیا ہے۔ اور اسی غرور کے زیر اثر [illegible] باتیں لکھ گئے ہیں جو ان کی [illegible] ہیں ․․․․ دوسرا مضمون [illegible] ہم محترم [illegible] کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ یہ موقعہ صوبائی تعصب کے اظہار کا نہیں ہمیں [illegible] اردو کی فروغ و ترقی کے لئے کوشاں ہونا چاہیے۔ آپ اس قسم کے مضامین لکھ رہے ہیں وہ اردو کے لئے زہر ہلاہل کا حکم رکھتے ہیں۔

مولانا تاجور کو ایک شدید صدمہ - [illegible] [illegible] ہوگیا ہے۔ [illegible] داغ ہے جو ان کے سینے پر لگا ہے۔ یہ مولانا ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ اتنے جانگداز اور روح فرسا صدمات کو خندہ پیشانی برداشت کر رہے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے آپکو صبر جمیل عنایت فرمائے۔

جناب حبیب بیدل - چند دن ہوئے ہمارے ایک محترم مضمون نگار جناب حبیب بیدل بیرسٹر ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے ہیں۔ بیدل صاحب لاہور کے مایۂ ناز وکیل شیخ گلاب الدین مرحوم و مغفور کے فرزند ارجمند تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے سند یافتہ تھے۔ اور اخلاق حسنہ کے لحاظ سے قابل تعریف۔ مرحوم ہمارے نہایت عزیز دوست تھے۔ ہمیں پر کیا منحصر ہے مرحوم سے جو شخص ایک بار ملتا تھا وہ مرحوم کا عزیز دوست بن جاتا تھا۔ اس صدمہ جانکاہ میں ہمیں مرحوم کے اعزا سے دلی ہمدردی ہے۔

جناب سید مقبول حسین صاحب احمد پوری بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی۔

بھجن

(۱)

پریم کی آگ جلی آذر[۱] بھیتر — گیان کے تیل نے کی گلکاری[۲]

بھسم[۳] ہوا تن من اور جیون — تو سے چھوٹ پڑی چنگاری

جے جگدیش جگت کے بانی[۴]

راکھ، ہوتی اکسیر، ہماری

(۲)

جب سے ہوتی ہے سن لے رے گیانی — پریم کے دکھ کی ہمیں بیماری،

تب ہی سے ہیں ان دو آنکھوں سے — پریم کی گنگا، جمنا[۵] جاری

جے جگدیش جگت کے بانی

کی ان آنکھوں نے جیداری

(۳)

پریم نے ہم سے خودی کو چھڑایا — اب نہ ستائے ہمیں ناداری[۶]

ہیچ ہے دھن، دولت اور پونجی — پریم میں ڈوبی مایا ساری

جے جگدیش جگت کے بانی

خاک، ہوتی اکسیر، ہماری!

---

۱ "آذر" "اُذر" بمعنی دل "آذر" کا وزن "ذر" ہے۔

۲ فارسی لفظ ہے یعنی پھل بوٹے بنانا۔ آتش بازی کے انار کا تصور کیجئے۔

۳ "بھسم" کا وزن اصل میں "بسم" ہے۔ اردو میں بروزن "قسم" "جسم" بھی لکھتے ہیں۔ دونوں ٹھیک ہیں۔

۴ بانی یعنی پیدا کرنے والا۔ فارسی لفظ ہے۔ ہندی میں بانی زبان کو کہتے ہیں۔

۵ داہنی اور بائیں آنکھ کی رعایت سے یہ دو دریا بطور استعارہ رکھے گئے ہیں۔

۶ ناداری فارسی لفظ ہے یعنی مفلسی۔ نوٹ: محض ذاتی ناداری کا شکوہ نہیں بلکہ بقول شاعر بحر دل مشرق

ہم بھی مفلس ہیں ہمارا ملک بھی کنگال ہے

جناب عطاء اللہ صاحب پالوی

"شراب" اور "اردو شاعری" کے مبحث میں میری ذاتی رائے

یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ جناب عطاء اللہ پالوی کے تنقیدی مقالات کو ملک کے ادبی حلقوں میں بنظر استحسان دیکھا جا رہا ہے پالوی صاحب کو اس میدان میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا مگر اس کے باوجود بعض ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو کہنہ مشق نقادوں کے بھی وہم و خیال میں نہیں آتیں۔ آپکا یہ مقالہ ہر چند کہ دیگر مقالات کی طرح ٹھوس دلائل لئے ہوئے نہیں ہے تاہم اردو میں ایک جدید باب بحث و تحیص کھول رہا ہے!

ایڈیٹر

ہزار بستہ زبانی سے ہم کو رد کا شاد:
مقامِ سرزنشِ قیل و قال آ ہی گیا

بہت زمانہ گزرا کہ حضرت خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے اپنے ملک کے نوجوانوں سے فرمایا تھا کہ ؎

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو! مفتوں　　گردن پہ نہ لو عقلِ خدا داد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اب تم　　کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنوں

گو ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ پھر بھی ہمدردانِ قوم "ترکِ شراب" اور احتراز مے نوشی کی برابر تبلیغ کرتے رہے۔ حتےٰ کہ مارچ ۱۹۳۶ء میں علامہ نیاز فتحپوری نے بھی "نگار" کے صفحات پر تحریر فرمایا کہ:-

"قیامت یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے سب سے زیادہ انہماک کے ساتھ مغرب کی جس ادا کو اختیار کیا وہ وہی ہے جو خود یورپ کے معیارِ انسانیت کو بھی گراتی چلی جا رہی ہے یعنی "شراب خوری" اور "تمباکو نوشی" آپ اسکول کے لڑکوں سے لیکر کالج کے طلبہ و پروفیسر تک جسکو دیکھئے اس مرض میں مبتلا ہے اور ہر وہ لڑکا جو صبح کو آئینے کے سامنے بیٹھکر اپنے بالوں کو سنوار سکتا ہے یہ بھی اپنا فرض سمجھتا ہے کہ جب وہ باہر نکلے تو اسکے منہ میں سگریٹ ضرور ہو اسی طرح ہر وہ نوجوان جو سوسائٹی میں کوئی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے اُسکے لئے لازم ہے کہ وہ شراب پینا ضرور سیکھے"

آگے چلکر "تمباکو" اور "شراب" کے نقصانات کا تذکرہ کرتے اور اپنی قوم کی نادانی پر آنسو بہاتے ہوئے مولانا موصوف نے یہ بھی فرما دیا کہ:-

"ہندوستان کی حکومت سے یہ توقع کرنا کہ وہ اس طرف کوئی عملی قدم اٹھائے گی۔ کوئی معنی نہیں رکھتا"۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" چونکہ علامہ موصوف کے دل سے یہ بات نکلی تھی اسلئے "بادِ ہوا" نہیں بلکہ "نشتر در دل" ثابت ہوئی یعنی جب ہندوستان کی عنانِ حکومت یہاں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت "کانگرس" کے ہاتھ میں آئی تو اس نے منجملہ اور دیگر ہر قسم کی اصلاحات کے اس امر پر بھی زور دیا کہ ہندوستانی تمام منشیات سے عموماً اور تاڑی "شراب" پینے سے خصوصاً قطع تعلق کریں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی ملک میں کسی قسم کی کوئی تحریک زور پکڑتی ہے اُس کا اثر وہاں کے "ادب" پر بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ "کانگرس" کی اس تحریک کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا اور پچاسوں برس قبل کے لگائے ہوئے درخت میں پھر نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں یعنی حضرت اعجاز صدیقی مدیر رسالہ "شاعر" (آگرہ) نے "شاعر" ستمبر نمبر ۳۳ء میں "جرعات" کے تحت اپنی یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ:-

کانگریسی وزارتیں ہندوستان کے تمام صوبوں میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کر دینے کی کوشش میں ہیں کیا وقت کی ضرورت متقاضی نہیں ہے کہ اردو شاعری

سے بھی اس غلیظ و قبیح موضوع کو نکال دیا جائے؟"

ساتھ ہی ساتھ اسی نمبر میں مشہور اور باکمال شاعر علامہ سیماب اکبر آبادی کا شعرائے ہند کے نام ایک پیغام مطبوع ہوا ہے۔

پرہیز سے تائیدِ معالج کر دو رسمِ ترکِ شراب اب رائج کر دو
اب ساغر و پیمانہ کو ٹھوکر مار دو اب شاعری سے بھی ان کو خارج کر دو

اور پھر اس تحریک کی تائید و تجدید میں جناب مرزی آبادی نے شاعر و سمبر میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"میں ہمنواپرست شعرا [illegible] سے پُر زور اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس رسمِ قبیحہ کو جلد از جلد ترک کر دیں جبکہ شاعری کو پیمبری کا مترادف خیال کیا جاتا ہے تو پھر قدرت کے اس عطیہ عظیم کو خرابات نغویات اور ایسے ہی دیگر امورِ ناروا سے ملوث کرنا کیا معنی؟ — جو شرعاً اخلاقاً ہر طرح اور ہر طریقے سے ممنوع ہیں؟"

اور آگے چل کر علامہ سیماب کی رباعی کی تحسین فرماتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"تمام ادبا اور خصوصاً آگرہ اسکول کے مقلدین کا فرض ہے کہ وہ شاعرِ اعظم کے گرانقدر پیام کا احترام کرتے ہوئے آمنّا وصدقنا کہیں۔"

حضرت اعجاز نے ایک سوال چھیڑا تھا اور اپنی ذاتی رائے پیش کی تھی کہ اردو شاعری سے موضوعِ شراب کو خارج کر دیا جائے تو مناسب ہے اور پھر موافق و مخالف آرا کیلئے ہوائے وطن کی رائے طلب فرمائی تھی۔ اسی طرح علامہ سیماب نے بھی بذاتِ خاص اس اصلاح کو (صاحب موصوف نے اس مرتبہ ہی یہ بات نہیں کہی ہے۔ بلکہ آپ نے اپنے اکثر صدارتی خطبوں میں اس امر پر زور دیا ہے) پسند فرما کر اپنا خیال "پیغام" کی صورت میں عام کیا تھا۔ لیکن حضرت مرزی نے اس تحریک پر صرف اپنی ہی تائید کو اٹل اور کافی سمجھ کر یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ اب اس میں بحث مباحثہ کی مطلق گنجائش نہیں اور اسلئے "تمام ادبا" کا "فرض[۱]" ہے کہ وہ بغیر قیل و قال محض "احتراماً" اس پیغام کو "آمنّا وصدقنا" کہیں۔ درآنحالیکہ نہ تو حضرت سیماب کی یہ خواہش تھی کہ لوگ صرف میری شخصیت کا خیال کر کے "احتراماً" مان لیں اور نہ حضرت اعجاز نے کوئی ایسا لفظ لکھا ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ وہ اس کا "حکم" دے رہے ہیں۔

"رحیقِ شنجرف گوں"، "آتشِ سیال" یا "شراب" جہاں ظاہری حالات میں حد درجہ ولولہ انگیز ہے وہاں اپنے زہریلے اثرات کی وجہ سے بلا شبہ ضرت رساں بھی۔ اگر وہ ایک طرف اپنے پرستاروں کو دماغی بلندی عطا کر کے تمام منازلِ فلک طے کرا دیتی ہے تو دوسری جانب اپنے عاشقوں کو جسمانی تنزل میں مبتلا کر کے گوشۂ قبر میں بھی سلا دیتی ہے اسلئے جہاں تک "شراب" کے استعمال کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ واقعی بادہ خوارانِ ہند اور "گھلی ہوئی آگ" پینے والے ہندوستانیوں کو اسکے استعمال سے روک دیا جائے تو ہندوستان کے حصولِ آزادی کی راہ سے کافی رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ اور ملک کی بیشتر عظیم المرتبت ہستیاں خوابِ موت سے محفوظ ہو جائیں۔ مگر اسکا کیا جواب کہ ہندوستان کا ایک باکمال اور بے مثال شاعر (جوش) زمانہ ہوا اور بگاہِ الٰہی میں دعا کر چکا ہے کہ ؎

کشتی مے کو اے خدائے صبوح بخش دے قسمتِ سفینۂ نوح
آنچ آئے نہ مے پرستے معبود تیرے بندے ہیں خستہ و مجروح

اگر یہ دعا قبول ہو چکی ہے تو "شراب" کے وجود کو فنا کرنے کی کوشش عبث ہے۔ اور اگر ہنوز قبول نہیں ہوئی ہے تو ایک عدیم المثال شاعر کی ایک ایسی مرغوب و محبوب شے کو "بقا" کے لئے دربارِ الٰہی میں گڑگڑا کر دعا کر چکا ہے فنا کر کے انکی گرانقدر ہستی کو ختم کر دینا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ؎

مرضِ زیست کا اے جوش زمانے میں علاج
جز مئے کہنہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں

اور ایک ایسا نقصانِ عظیم ہوگا جس کی تلافی عمر بھر نہ ہو سکے گی۔ بہرحال:

---

[۱] فرض اس حکم کو کہتے ہیں جسکے نہ کرنے سے آدمی گنہگار خیال کیا جاتا ہے۔ ورنہ جوابدہی تو ضرور ہی عائد ہوتی ہے۔ عطاءاللہ

یہ تو "حقیقی شغل" کے متعلق ضمناً عرض کیا گیا ہے۔ وہ "قلمی شغل" تو اس کے لئے ذرا تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ "زمانۂ جاہلیت عرب" میں فنِ شاعری نے وہ عروج حاصل کیا تھا جس کی مثال کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی اور جاہل عربوں نے فنِ شعرگوئی میں وہ کمال پیدا کر لیا تھا کہ ساری دنیا کو "گونگے" کہنے لگے تھے۔ چنانچہ رسولِ اکرم کا عرب میں مبعوث ہونا اور قرآن مجید کا عربی میں نازل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی عربوں کی فصاحت و بلاغت اور کمالاتِ شاعری کا جواب دینا انسانوں کی دسترس سے باہر تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی مخفی نہیں کہ "شراب" عربوں کی سب سے زیادہ محبوب نعمت اور سب سے زیادہ پیاری شے تھی۔ غرض جس طرح "شاعری" عربوں کی فطرت میں داخل تھی۔ اسی طرح "شراب" بھی انکی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور جس طرح وہ بغیر کسی قسم کا کوئی علم حاصل کئے عظیم المرتبت شاعر ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ بغیر "شراب" کا ذکر کئے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالتے تھے۔ اس لئے اس صورت سے "عرب" میں "شراب" "شاعری" کا جزوِ اعظم بنکر رہ گئی تھی۔ اور یہ ناممکن تھا کہ عرب کا کوئی شاعر شعر کہے اور اس میں "شراب" کا ذکر نہ کرے۔ چنانچہ حضرت جلیل الرحمٰن اعظمی اپنے مضمون مطبوعہ "نگار" میں فرماتے ہیں :-

"مہلہل بن ربیعہ کو عربی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ماننا پڑیگا کہ عربی شاعری اپنے ابتدائی دور میں بھی شراب سے بیگانہ نہ تھی۔ کیونکہ مہلہل بڑا "جید" شرابی تھا اور ایک مہلہل ہی پر کیا موقوف ہے زمانۂ جاہلیت کا ہر شاعر مئے ارغوانی کا مدح سرا نظر آتا ہے۔ ان میں اعشیٰ کا مرتبہ بہت نمایاں ہے جسکا سارا دیوان خمریات سے بھرا پڑا ہے :"

حقیقت یہ ہے کہ عرب کا ہر مایۂ ناز شاعر یگانۂ روزگار شرابی تھا اور تقریباً ہر بڑا شرابی عظیم المرتبت شاعر۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت کا سب سے بڑا شاعر امرؤ القیس جیسا عدیم النظیر شاعر تھا ویسا ہی فقید المثال شرابی بھی۔ مگر یہ کچھ زمانۂ جاہلیت ہی پر موقوف نہیں [illegible] سمجھے

کہ شراب حرام تھی۔ مگر عرب کے تمام اچھے شاعر شراب پیا کرتے تھے چنانچہ عہدِ اُمویہ کا سب سے بڑا شاعر اخطل زبردست شرابی تھا۔ اسی طرح عہدِ عباسیہ کا نامور شاعر ابونواس بھی (جسکے متعلق علمائے ادب کا خیال ہے کہ اس رنگ اور اس انداز کا کوئی شاعر عرب میں نہیں پیدا ہوا) بڑا بھاری شرابی تھا۔ ابونواس نے پونے تین سو نظمیں صرف "خمریات" سے متعلق کہی ہیں۔ اور ایسی ایسی معرکہ آرا کہ بقول حضرت جلیل الرحمٰن اعظمی۔

"عربی لٹریچر میں اس موضوع خاص پر آپکو لاکھوں اشعار ملیں گے لیکن وہ سب ابونواس کے خمریات کے مقابلے میں ایسے ہونگے جیسے "شراب" کے مقابلے میں "پانی"۔"

نیز خود ابونواس کا دعوےٰ تھا کہ "اشعاری فی الخمر لم تقل مثلها ء" (خمریات میں میرے جیسے اشعار نہیں کہے گئے) شاید اسی وجہ سے تمام شعرائے عرب نے اسے "شعر العرب" اور تمام علمائے ادب نے خمریات کا بادشاہ مانا ہے۔ بہرکیف ابونواس نے نہ صرف شاعرانہ کمالات میں بلکہ مے نوشی میں بھی جو ریکارڈ قائم کیا اُسے عرب کا کوئی شاعر نہ توڑ سکا۔ چنانچہ جناب جلیل الرحمٰن اعظمی نے اس کی مے نوشی کا ایک بالکل معمولی واقعہ یوں لکھا ہے :-

"خلیفہ امین ایک مرتبہ اپنے مصاحبوں کیساتھ بیٹھا شراب پی رہا تھا اسی اثنا میں ابونواس بھی وہاں جا پہنچا۔ اُسکو دیکھ کر امین کی باچھیں کھل گئیں۔ اور اس نے کہا "اچھا آج دیکھیں سب سے زیادہ شراب کون پیتا ہے" ابونواس نے کہا بہت اچھا۔ طے ہوتے ہی شراب و کباب کا دور چلنے لگا۔ نشست تک سب پیتے رہے۔ اسکے بعد ابونواس اور امین کے علاوہ سب بیہوش ہو کر پڑ گئے۔ امین ساتھ دیتا رہا لیکن تا بکے؟ آخر وہ بھی غافل ہو گیا۔ ابونواس کے حواس ابھی تک قائم تھے۔ یہ اپنی جگہ سے اٹھا ایک ایک کو ہلایا جھنجھوڑا۔ مگر سب مُردوں کی طرح بے جان پڑے ہوئے تھے

۔۔۔

حضور! یہ کوئی انصاف نہیں کہ میں پیتا ہوں اور آپ سوتے رہیں" ابنِ جانک اُٹھا اور ابونواس سے کہا "کیا تو آدمی نہیں! یہ سب پڑے سو رہے ہیں مگر تو اس قدر شراب پینے کے باوجود اب تک جاگ رہا ہے" ابونواس نے کہا۔ "حضور! کیا شراب کا مزہ نیند کے برابر بھی نہیں؟"

غرض اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عرب میں جیسا شاعری کا زور تھا ویسا ہی "شراب" کا بھی۔ اور عرب میں شراب شاعری کا جزوِ لاینفک بن گئی تھی۔ چنانچہ شعرائے عرب کا کلام اٹھا کر دیکھ لیجئے کسی شاعر کا کلام ایسا نہ ملیگا جسمیں شراب کا سمندر موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہو۔

عرب کے بعد دوسرا وہ مقام جہاں فنِ شعر نے معراجِ کمال حاصل کیا "ایران" ہے۔ اور گو اس وقت ایران شعر و شاعری کا مخزن تصور کیا جاتا ہے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ عہدِ اسلام سے قبل یہاں شعر و شاعری کا وجود نہ تھا۔ جب عربوں نے اسے فتح کیا اور انہوں نے ایک مدت تک یہاں حکمرانی کے ساتھ ساتھ مشغلۂ شعر و سخن جاری رکھا۔ تب کہیں جا کر اسکا اثر ایران پر پڑا۔ اور ایرانیوں میں بھی مذاقِ شعر پیدا ہوا۔ پھر بھی چونکہ فاتحین کی زبان عربی تھی اور شعر و شاعری کے قدردان صرف عرب تھے اسلئے ایرانی شعراء بھی تقلیداً عربی ہی میں شعر کہا کرتے تھے اور یہ سلسلہ عہدِ عباسیہ تک قائم رہا جب ایرانیوں کے بھانجے[۱] خلیفہ مامون الرشید تختِ خلافت پر متمکن ہوئے اور آہستہ آہستہ امورِ سلطنت میں ایرانیوں کا دخل ہوا یا بالفاظِ دیگر عنانِ سلطنت عربوں سے نکل کر ایرانیوں کے ہاتھ میں آئی۔ اُسوقت ایرانیوں کو اپنی زبان کا خیال ہوا اور اسی زمانے سے فارسی شاعری کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ خود ایران کے باکمال شاعر انوری نے فرمایا ہے:-

شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکہ بود اوّل شاں امرؤ القیس آخر شاں بونواس[۲]

بہرحال! چونکہ ایران میں شاعری عربوں کے ساتھ آئی اور ایرانیوں نے عربی شاعری ہی پر فارسی شاعری کی بنیاد رکھی۔ نیز شعرائے عرب ہی کے کلام سے استفادہ کیا اس لئے فطرتاً وہ تمام اجزاء جو عربی شاعری کے طرۂ امتیاز تھے فارسی شاعری میں بھی داخل ہو گئے۔ اور ان اجزا میں سب سے بڑا جزو "اسی شراب" کا تھا۔ اور چونکہ عہدِ امویہ ہی سے عربوں میں شراب نے دوبارہ رواج پالیا تھا اور انہوں نے میکشی شروع کر دی تھی نیز ایران پر عرب ہی قابض تھے اسلئے ایران میں بھی شراب عام ہو گئی تھی۔ چنانچہ جس وقت فارسی شاعری کی بنیاد پڑی اُس وقت ایران میں شراب کی حیثیت ایک ایسی محبوبۂ رنگین کی تھی جس کی بارگاہِ ناز پر ہر بڑا چھوٹا انسان سربسجود نظر آتا تھا یا ایسے ایک ایسے چشمۂ عام کی حیثیت حاصل تھی۔ جسکے کنارے ہر فردِ بشر کے نقشِ قدم پائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں جبکہ فارسی شاعری کی بنیاد شراب سے نہائی ہوئی عربی شاعری پر رکھی گئی تھی اور خود ایران میں بھی بادہ نوشی معراجِ کمال حاصل کر چکی تھی۔ "شراب" سے جامۂ ادب پاک و دامنِ شاعری محفوظ کیونکر رہ سکتا تھا؟ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران میں بھی شراب شاعری کا ایسا اہم ترین عنصر قرار پا گئی کہ بقول حضرتِ عندلیب شادانی:-

"ایران کے لاکھوں شعراء میں شاید دس پانچ بھی ایسے نہ

---

[۱] چونکہ خلیفہ مامون الرشید کی ماں ایرانی تھیں اس لئے ایرانی انہیں اپنا بھانجا کہتے تھے

۱۵ کا آخری لفظ متن میں فیہ بھی ہے بعض لوگ اسے "ابوفراس" کہتے ہیں جو خلفائے عباسیہ کا ایک معزز قرابتمند تھا۔ اور بعض اصحاب اسے "ابونواس" کہتے ہیں جو عہدِ عباسیہ کا مشہور ترین شاعر تھا۔ میں بذاتِ خود آخر الذکر ہی اصحاب میں ہوں۔ کیونکہ "ابوفراس" کا بحیثیت عظیم المرتبت شاعر کہیں نام نہیں۔ اور انوری تنا نادان نہ تھا کہ امرؤ القیس کے ساتھ ایک ایسے شاعر کا نام لیتا جو عربی شاعری میں کوئی خاص مرتبہ نہ رکھتا ہو۔ برخلاف اسکے "ابونواس" اسلامی عہد کا ایسا قصد آشکار عربی شاعر مانا جاتا ہے۔ جو بحیثیت امرؤ القیس کا ہم رتبہ اور اکثروں کے نزدیک اُس سے بھی بلند مرتبہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ انوری نے "ابونواس" کا ہی کا نام لیا ہے۔ اور کتابت کی غلطی سے وہ "بوفراس" ہو گیا

ملیں گے جنہوں نے شراب کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا ہو۔ جو پیتے
تھے انہوں نے بیانِ واقعہ کے طور پر اور جو نہیں پیتے تھے انہوں
نے اکثریت کی تقلید میں اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے"

گویا عرب کی طرح ایران میں بھی شاعری اور شراب باہم ممتزج ہو گئے اور ان دونوں کا امتزاج ایک فطری شے بنکر رہ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہاں پر یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ جن ایرانی شعراء نے میکشی کے بغیر بھی شراب آلود اشعار نظم کئے ہیں انہوں نے صرف تقلیداً ہی ایسے اشعار نہیں کہے ہیں بلکہ انہوں نے شراب کو عشق و وفا و رنگ دیگر مجازاً اور بطور تشبیہ و استعارہ کے استعمال کیا ہے لیکن یہ بات بہرحال اپنی جگہ اٹل ہے کہ چاہے کسی وجہ اور کسی معنی میں بھی ہو لیکن شراب فارسی شاعری کا جزو قرار پا گئی۔

عرب اور ایران کے بعد گویا گہوارۂ شاعری ہندوستان ہے ہندوستان میں جب مسلمانوں کے ساتھ ترکی ملی ہوئی فارسی زبان پہنچی تو اسکا اثر یہاں کی زبان پر بھی پڑا اور اگرچہ یہاں مسلمانوں کے پہنچنے کے بعد بھی ایک عرصے تک سنسکرت زبان قائم رہی لیکن آہستہ آہستہ فارسی زبان کا اثر قبول کرتی رہی تیموری خاندان کے بادشاہوں کی فیاضی سے تمام شعرائے ایران کھنچکر ہندوستان ہی آگئے تھے۔ اور فارسی شاعری کیساتھ مے پرستی کا یہاں بھی وہی زور تھا۔ جو ایران میں تھا۔ چنانچہ ایک زمانے تک یہاں بھی وہی شاعرانہ رنگ رلیاں رہیں جو ایران میں تھیں۔ جب فارسی زبان کا زور ٹوٹا اور اسکی جگہ اس زبان نے لے لی۔ جو عربی اور فارسی زبان کا خلاصہ تھی اور جسکا نام اردو ہے تو فطرتاً اس پر بھی عرب کے پرانے اور ایران کے نئے ادب کا اثر پڑا نیز اسوقت ہندوستان کے تمام امرا اور سلاطین کے دربار میں شغلِ مے نوشی بھی مستقلاً جاری ہو گیا تھا۔ اسلئے کچھ تو ادبِ قدیم کا اثر اور کچھ ماحولِ جدید کا رنگ غرض مل ملا کر اردو شاعری میں بھی شراب کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہو گیا۔ یا یہ کہئے کہ یہاں بھی شراب اردو شاعری کا جزوِ اعظم بن گئی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس شاعر کا اور جس طرح کا بھی کلام اٹھا کر دیکھئے وہاں کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی عنوان سے شراب ضرور دکھائی دیگی ؂

[illegible]

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہر شاعر واقعی میکش تھا یا ہے اور نہ یہ وجہ ہے۔ کہ تقلیداً ہر شاعر نے اسے زبردستی موزوں کر دیا ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ شراب شاعری کا ایک ناقابلِ قطع جزو ہو گئی ہے۔ اور اس کا ہمارے ذہن و دماغ پر اتنا گہرا نقش ہو گیا ہے کہ شعر کہتے یا پڑھتے وقت شراب خواہ مخواہ جوش مارنے لگتی ہے اور اسکا کیف ذہن و دماغ پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ بغیر اسے دیکھے اور موزوں کئے ہمیں اطمینان نہیں ہوتا۔

اردو شاعری نے جب ہاتھ پیر نکالے تو سب سے پہلے غزل کی بنیاد پڑی اور اب غزل جب انتہائی کمال کو پہنچ گئی تو فطرتاً اردو میں فنِ تنقید کی بھی بنیاد پڑ گئی۔ چنانچہ مولانا حالی مرحوم نے سب سے پہلے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور مقدمہ شعر و شاعری میں جس طرح غزل کی دیگر فرسودہ روایات اور تقلیدی مہملات کی اصلاح کی صلاح دی اسی طرح اردو شاعری کی شراب کے متعلق بھی ایک نوٹ دیا۔ مگر دیگر اصلاحات کی طرح شراب کے متعلق یہ نو نہ کہا کہ اسے بھی اردو شاعری یا غزل سے خارج کر دو۔ البتہ یہ شرط ضرور لگا دی کہ۔

"اصولِ شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا
صرف اُن لوگوں کا حق ہونا چاہئے جو یا تو خود اس میدان کے
مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرایہ میں بطور
مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں"

جہاں تک مجھے اور تمام علمائے ادب اور اُدبائے کرام کو معلوم ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے شراب پینا تو کجا کبھی چھوئی بھی نہیں۔ نیز خود انکا دعویٰ تھا کہ کس نشہ میں ہے چور خدا جانے مقدر۔ حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز مگر چونکہ شراب کو شاعری کے جزو لاینفک ہونیکی حیثیت حاصل تھی۔ اور باوجود کوشش کے بھی شعر سے شراب کو جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے خود مولانا حالی مرحوم کا کلام اس سے خالی نہیں ہے۔ اور جب ان کا دیوان اٹھا لیجئے گا جسکے مقدمے میں یہ قانون مرتب کیا گیا ہے تو دیکھ لیجئے گا۔ کہ دیگر متعینات شاعری کے ساتھ ساتھ قدیم تو قدیم جدید غزلوں میں بھی شراب آلود اشعار موجود ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں:۔

[illegible]

لی ہوش میں آئینگی جو ساقی سے اجازت فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانہ

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں؟

شب کو زاہد سے نہ مڈبھیڑ ہوئی خوب ہوا نشۂ زور پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

کرتے کیا پیتے اگر مے نہ ز عشا تا صبح وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

بزمِ ساقی نے وہی الست ساری خوب بھر بھر کے خم لنڈھائی آج

اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے آج

مولینا حالیؔ مرحوم کے بعد کسی نے باضابطہ طریقے پر اُس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ اور جنہوں نے کی وہ یہ کہکر خاموش کر دیئے گئے کہ ؎

سنوں میں نصیحتِ بے محل کروں شاد ترکِ شراب کو
نہ خدا ہے واعظِ ہرزہ گو نہ رسول ہے نہ امام ہے

البتہ اس طرف حضرتِ اعجازؔ نے پھر یہ تحریک شروع کی ہے اور فرماتے ہیں کہ شراب کو اردو شاعری سے خارج کر دیا جائے مگر جب خود ان کا کلام دیکھئے گا تو وہاں بھی اس قسم کے اشعار مل جائینگے ؎

اے محوِ دید ہاتھ نہ پھیلا نظر اٹھا پیتے ہیں جلوؤں سے شرابِ نظر کہیں

اسی طرح علامہ سیمابؔ اردو شاعری سے شراب کو خارج کرنیکا پیغام دے رہے ہیں۔ اور خود اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ ؎

بغیر واسطہ مخمورِ عشق ہوں سیمابؔ خدا کا شکر کہ شرمندۂ شراب نہیں

مگر جب خود اُن کا دیوان "کلیمِ عجم" اٹھا لیجئے گا اور اُن کے اُن خطباتِ شاعری کو پڑھنے کے بعد جنمیں تقلید و قدامت پرستی کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے اور قابلِ قدر تجویزیں پیش کی گئی ہیں) اُن کے کلام [illegible]

متعلق بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جائیگا۔ دیکھئے:۔

مدتیں گزری ہیں ساقی دعوتِ مینا کئے جنہیں اپنی جگہ رکھدی تھی شیشے کیا کئے

لاؤں کہاں سے جامِ شراب و کنارِ نہر کیوں چھیڑتی ہیں دہولیں بہار کی

کوئی پیالہ کوئی ساغر کوئی مینا ساقی آس باندھے ہوئے بیٹھے ہیں کسی در سے ہم

ساقی نے مجھ کو خوگرِ بادہ بنا دیا دن رات ذکر کرکے شرابِ طہور کا

جنت جو ملے لا کر میخانے میں رکھدینا کوثر سے چھلکتے پیمانے میں رکھدینا

ہاں پلا اتنی لطیف آج اور اتنی گہری عینِ مستی میں اتاروں رگِ جاں تک شراب

غسل کرنے کو روز آتی ہے میرے جامِ شراب میں توبہ

ان کے بعد حضرت رمزیؔ ہیں جنہوں نے اپنی تائید و تجدید میں شراب کو اردو شاعری سے خارج کرنے کی صلاح دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ ؎

"اس مشن کی سعی و تائید میں بطورِ احتجاج میری حقیر نظم بعنوان "قدامت پرست غزلگو سے" شاعر اپریل ۱۹۳۷ء میں شائع ہو چکی ہے"

"میں شراب نوشی اور اس قبیل کے دوسرے مخربِ اخلاق لایعنی اور بے سود موضوعات سے پہلے ہی سے بیزار ہوں"

خوش قسمتی سے میں نے بھی اس نظم کے دیکھنے کی سعادت حاصل کی ہے اس نظم کا چوتھا بند ہے:۔

کبھی پیغمبرانہ نطق سے روحوں کو گرمایا؟
تصوف معرفت حکمت کی دیکھی روشنی تو نے؟
جلال الدین رومی کی پڑھی ہے مثنوی تو نے؟
کبھی تو نے چنے ہیں پھول سعدی کی گلستاں سے؟
کبھی ساغر پئے حافظ کے عرفانِ خمستاں سے؟
کبھی معجز اثر پیغام سے دنیا کو تڑپایا؟

اس بند میں جو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل میں جب جلال الدین رومی کی مثنوی کو اٹھایا تو پہلی ہی جلد میں یہ شعر نظر پڑا ؎

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است
[illegible] ساقی است

پھر جب سعدی اور حافظ کا کلام دیکھا تو وہاں بھی یہی دیکھا کہ ہر جگہ شراب کی چھینٹیں پڑی چھلک رہی ہیں اور متانت و پاکبازی منہ چھپائے پڑی ہے۔ اور ان سب سے زیادہ پُر لطف بات یہ دیکھی کہ شراب کو اردو شاعری سے خارج کرنے کی ''ہدایت'' میں بھی خود حضرت رمزی ساغر نہ پینے پر تنبیہ فرما رہے ہیں :- ؎

کبھی ساغر پیتے حافظ کے عرفانِ خمستاں سے

لیجئے صاحب! بھلا ایسی صورت میں کیوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی ؟"

مگر یہ سب کیوں ہے ؟ اسلئے کہ شراب شاعری کا جزو ہو گئی ہے۔

اب رہا جناب رمزی صاحب کا یہ فرمانا کہ :-

"شاعری کو پیمبری کا مترادف خیال کیا جاتا ہے تو پھر قدرت کے اس لطیف انعام کو خمریات، لغویات اور ایسے ہی دیگر امور نازیبا سے ملوث کرنا کیا معنی ؟ جو شرعاً اخلاقاً قانوناً غرض ہر طریقے سے ممنوع ہیں ۔"

آخر میں صرف اسی قدر عرض کروں گا کہ اردو شاعری سے دیگر ہر قسم کی لغویات اور تقلیدی مہملات کے ساتھ ساتھ 'ذکر شراب' اور 'بیان میکشی' کو بھی محض اس وجہ سے کہ 'کانگریس' اسے ممنوع قرار دینا چاہتی ہے یکسر خارج کرنے کی صدائے احتجاج بلند کرنا بذات خاص ایک مہمل تقلیدی ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے اور بھی کہ اس وقت اصلاح شاعری کے سلسلے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ وہ مولانا حالی مرحوم کی تقلید میں ہے دراںحالیکہ مولانا خود فرما گئے ہیں کہ :-

"اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہونا چاہئے۔ جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرایہ میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں ۔"

مولانا حالی مرحوم نے شراب کے مضمون کو اردو شاعری سے یکسر خارج کرنے کے متعلق کسی جگہ نہیں تحریر فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مجتہد اعظم کی یہ رائے ہے تو پھر مقلدین کا کیا پوچھنا ؟ اس وقت بھی لوگ اس خیال کے موجود ہیں چنانچہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنے مضمون ''دو چار امر اور اردو غزلگوئی'' میں تمام اُن شعرا کے بیان میکشی پر سختی سے اعتراض کیا ہے۔ جنہیں شراب سے حقیقتاً دور کا بھی واسطہ نہیں۔ برخلاف اسکے جگر مراد آبادی کے شراب آلود اشعار ایک دم چھوڑ دیتے ہیں اور فرمایا ہے کہ :-

"جگر نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس لئے قابل اعتراض نہیں کہ اکثر حال ہے محض قال نہیں ۔"

جہاں تک ذاتی خیال کا تعلق ہے۔ مجھے اس میں بھی کلام ہے کیونکہ اس اصول پر کہ جو پیئے وہی کہے' نہ صرف حافظ و سعدی کا سرمایۂ زندگانی لغو ہوا جاتا ہے۔ بلکہ دیگر شعراء کے لئے اس کے جواز کی اجازت نہ دے کر "اردو شاعری" سے اس صنف کو بھی فنا کر دینا ہے جسے 'ساقی نامہ' کہا جاتا ہے اور جس کی اردو ادب میں بے حد کمی اور دوسری زبانوں کے ادب میں بڑی عزت ہے۔ ان سب کے علاوہ جب بقول خیام ؎

گویند بہشت و حورعین خواہد بود وآنجا مے ناب و انگبیں خواہد بود
گر ما مے و معشوق پرستیم رواست چوں عاقبت کار ہمیں خواہد بود

جنت میں 'شراب' موجود ہے۔ اور اس قدر مقبول بارگاہ ہے کہ آدم تو جنت سے نکال دئے گئے۔ لیکن 'شراب' اس وقت سے اب تک نہروں میں بہہ رہی ہے۔ اور حرام ہونے کے باوجود نکالی نہ گئی تو کیا حرج ہے اگر اردو شاعری کی نہروں میں بھی 'شراب' موجیں مارتی پھرے ؟ اور کیا اچھا ہو اگر اس غریب کو بھی اردو شاعری کی جنت سے نہ نکالا جائے ؟

حضرت رازؔ یزدانی

ابلیس اور ایک مردِ خود آگاہ

جاوید نامہ میں حضرت علامہ سر محمد اقبال مدظلہ نے نالۂ ابلیس تحریر کیا ہے جس میں ابلیس حسرتِ "حریفِ کامل" کا اظہار کر کے خدا سے ایک "مردِ حق" ... "کارِ آزمودہ" کے لئے دست بدعا ہے۔

اس نظم کے مطالعہ سے مجھ پر جو تاثر ہوا اس میں اردو کی تہی دامنی اور حسرتِ ابلیس کا جواب دو جذبے بہت زیادہ خلش افزا تھے۔ وہ بہت بڑی حد تک یہی دو جذبے اس نظم کے ذمہ دار ہیں۔ فقط۔

رازؔ یزدانی

ابلیس

اک مردِ خود آگاہ سے ابلیس یہ بولا
دیکھا ہے تری چشمِ بصیرت نے زمانا

انسان سمجھتا ہے مجھے اپنا شکاری
حالانکہ ہے یہ دلکشیٔ "صید" سے عاری

ظالم کبھی ڈٹ کر نہ ہوا میرا مقابل
کھولا نہ مرا خون جلا کچھ نہ مرا دل

ہر بات مرے رعب سے یہ مان گیا ہے
افسوس کہ کس چیز پر ایمان گیا ہے

ضبطِ ضربِ تیر و تفنگ اس میں نہیں ہے
لڑتا ہے مگر ہمتِ جنگ اس میں نہیں ہے

کیا اس سے مقابل ہو مری ہمتِ عالی
ذوقِ طپش افزودِ جراحت سے ہے خالی

وہ صید جو صیاد سے بھاگے نہ کبھی دور
ہو سکتا ہے اس پہ بھی جھپٹ کر کوئی مسرور

شاہیں کیلئے زیست ہے ستیٔ تگ و تاز
افسوس کبوتر میں نہیں طاقتِ پرواز

چاہا تھا کہ تخلیق ہوں میرے بھی مقابل
ہو رنجِ ظفر یابیٔ دشمن مجھے حاصل

سمجھا نہ کسی نے بھی مرے "ذوقِ ابا" کو
یہ خاک کے پتلے جو ہیں محبوب خدا کو

دوزخ کے نمونے پہ ظفر پائینگے کیونکر
شعلے خس و خاشاک سے بجھ جائینگے کیونکر

جو صید کہ تکلیف نہ دے لقمۂ تر ہے
دنیا میں بس اک تجھسے مجھے خوفِ ضرر ہے

اٹھ جنگ پہ تیار ہو لڑ دشمن دیں سے
منکر کی عقیدت کو ملا اپنے یقیں سے

ہو جائے مسائل میں تکلم تو مزا ہے
مجھ سے ہو اگر میرا تصادم تو مزا ہے

"مردِ خود آگاہ کا جواب"

ابلیس کا جب رجز ہوا ختم تو ہنس کر
وہ مردِ خود آگاہ یہ بولا کہ ستمگر!

تو اور یہ انساں سے تصادم کی تمنا
جاہل کو مسائل میں تکلم کی تمنا

یہ کس کو ہے تسلیم کہ تو دشمنِ دیں ہے
ظالم! تجھے "عرفانِ خودی" بھی تو نہیں ہے

جس چیز کو سمجھا ہی نہیں تیرا تکبر
وہ تجھ سے ہو مغلوب بس اب چھوڑ تفاخر

تو دل کی حقیقت کو سمجھتا ہی نہیں ہے
انسان فقط خاک کا پتلا ہی نہیں ہے

ڈر دیدۂ گریاں سے کہیں یہ نہ بگڑ جائے
جا، ورنہ تری آگ پر اب اوس نہ پڑ جائے

انساں کے حضور اتنی بڑائی نہیں زیبا
شعلے کو سمندر سے لڑائی نہیں زیبا

اب تو جو کبھی سامنے انسان کے آنا
کچھ اپنی حقیقت کو بھی پہچان کے آنا

جناب لطیف انور گورداسپوری

اِقرار و انکار

خداوندِ عالم تری بے نیازی
وہ ہے جس کو سمجھا نہ رومی نہ رازی

ترے زیرِ فرمان چودہ طبق ہیں
تری کارسازی کے نکتے ادق ہیں

بہت خوشنما ہیں ترے چاند تارے
بہت دلکشا ہیں فلک کے نظارے

تری قدرتِ کاملہ کے نمونے
کوئی جان جائے تو ہوتے ہیں دونے

مگر میری آنکھوں میں ہے ہیچ سب کچھ
زباں پر نہیں آنے دیتا ادب کچھ

جہاں میں ہوں لیکن نہیں ہوں جہاں میں
کہ محتاجِ نانِ جویں ہوں جہاں میں

جناب اوپندر ناتھ اشک بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

شاعر کی موت

ہم دونوں گیلری سے گذر کر اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ایک اونچے سٹول پر بیٹھا اپنے کام میں محو تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے بھاری رجسٹر سرکا دیا۔ اور سٹول سے اتر کر ہم سے مصافحہ کیا اور حسبِ معمول بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف کرسی سرکا کر میز کے کونے پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں کے لئے میں اپنے آنے کا مقصد بھول گیا۔ اور اسکی اس اداسی میں گویا جذب ہو کر اسکا سبب تلاش کرنے لگا۔ اس وقت ہی کیوں جب کبھی میں اسکے کمرے کے پاس سے گزرتا اور اسے اونچے سٹول پر بیٹھے رقوم کے اندراج میں محو دیکھتا۔ تو ایک دو لمحوں کیلئے رُک جاتا۔ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا اور اسکے دل کی گہرائیوں میں اتر جانے کی کوشش کرتا۔

چھ سال پہلے جب وہ لاہور گیا تھا۔ اسکے کلام کی دھوم پنجاب تو کیا ہندوستان میں مچ گئی تھی۔ لوگ اس کی نظمیں پڑھ کر بیتاب ہو جاتے تھے۔ میں خود انہیں پڑھ کر وجد میں آجاتا تھا۔ لیکن چھ ماہ ہوئے۔ وہ لاہور کی دلچسپ اور دلفریب دنیا کو چھوڑ کر خشک اور بے کیف جالندھر میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی کوئی نظم بھی کسی رسالہ میں نہ دیکھی تھی۔

وہ کیسا خوش طبع تھا' اس کی طبیعت میں کتنی شوخی تھی۔ وہ کس قدر زندہ دل تھا! اور اب وہ کتنا خشک کیسا سنجیدہ اور کس قدر تنہائی پسند! پہلے وہ جس کسی سے بھی ملتا۔ باتوں کا تانتا لگا دیتا۔ مجھے خود معلوم ہے۔ جب کبھی بازار میں مل جاتا۔ تو ہم باتیں کرنے میں ایسے کھو جاتے کہ گھر کے کام کاج کی بھی خبر نہ رہتی۔ لیکن اب بلانے پر بھی وہ کسی کی جانب مائل نہ ہوتا۔ وہ کیوں ادب کے کشادہ محل کو ترک کر کے کلرکی کے خستہ گھروندے میں داخل ہوا۔ کیوں اس کی مسرت پژمردگی میں بدل گئی۔ کیوں اس نے نظمیں کہنا بند کر دیں۔ یہ سوال تھے جو اس وقت میرے دماغ میں گھوم رہے تھے۔

"تشریف رکھئے آپ"

بلونت نے برج کشور کی طرف دیکھ کر کہا۔ جواب تک اسی طرح کھڑا تھا۔

میں نے بھی کہا۔ "بیٹھ جا برج" اور وہ بیٹھ گیا۔

"یہ میرے دوست مسٹر برج کشور مدیر نئی دنیا ہیں۔"

"مدیر نئی دنیا"! . . . وہ ہنسا۔ کھوکھلی اور درد کھی ہنسی۔ اور پھر اس نے اُٹھکر برج سے ہاتھ ملایا۔ اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ وہ مصنوعی شگفتگی جو ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرے پر آئی تھی۔ مفقود ہو گئی۔

"سنائیے کیسے آنا ہوا" اس نے پوچھا۔ میں بولا "یہ میرے دوست آپکے بے حد مداح ہیں۔ انکا رسالہ قریب ایک سال سے علم و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ یہ تو پسند نہیں کرتے لیکن ادبی دنیا میں کچھ رواج سا ہو گیا ہے اور یہ بھی اس کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ چنانچہ سالانہ نمبر نکالنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے مجھ سے بارہا اصرار کیا کہ تم سے کوئی چیز لے دوں۔ میں ٹالتا رہا لیکن آج یہ لاہور ہی سے تشریف لے آئے۔ تو مجبوراً آنا پڑا۔ اب بھائی۔ میرے آنے کی لاج رکھو۔"

بلونت کچھ دیر تک پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کو کریدتا رہا پھر اس نے کہا "دیر ہوئی میں نے تو لکھنا چھوڑ دیا ہے۔"

"میں انہیں پیشتر ہی کہہ چکا ہوں۔ لیکن یہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں میں قدم پکڑ لوں گا۔ نظم لیکر رہونگا . . . ."

"آپ جیسے ادب نواز مہربانوں کے بھروسے پر ہی میں نے یہ حماقت کر دی ہے۔" برج کشور نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

بلونت خاموش رہا۔

"چار پانچ اشعار کافی ہیں" بسج بولا "میں اس عنایت کے لئے تمام عمر ممنون رہوں گا۔"

بلونت کسی قدر مسکرایا لیکن مسکراہٹ درد اور طنز کا پہلو لئے ہوئے تھی۔

میں نے اصرار اور تنگ کے لہجہ میں کہا: "بلونت آخر تم لکھو گے کیوں نہیں ہا"

"دل نہیں چاہتا"

میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا اور اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا: "بس اب سیدھے ہاتھوں نظم دیدو۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ دل نہیں چاہتا۔ میں چلکر آیا ہوں۔ یہ اتنی دور سے تشریف لائے ہیں۔"

اس کی نگاہیں سنجیدہ ہوگئیں۔ اس نے کہا۔۔ "شمبھو تنگ نہ کرو۔ میں نظم کہنا چھوڑ چکا ہوں"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ گویا پوچھ رہا تھا: "آخر کیوں؟"

بلونت بولا: "شمبھو تم نے اتنی بار اصرار کیا ہے۔ لیکن میں خاموش رہا۔ اب یہ اتنی دور سے چلکر آئے ہیں۔ شاید یہ سمجھیں میں ٹال رہا ہوں۔ اس لئے کہتا ہوں کہ درحقیقت میرے جذبات عہد گذشتہ کے ساتھ دفن ہوچکے ہیں۔ اور اب انہیں زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے لکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کیوں؟ سنو!"

میں کرسی میں دھنس گیا۔ ایک لمحہ کے لئے کمرے میں خاموشی چھاگئی صرف سامنے کے ہال میں لگا ہوا کلاک ٹن ٹن کیا۔ بلونت بولا۔

(۲)

"چھ سال ہوئے۔ یہی دن تھے۔ جب میں خوشی خوشی جالندھر سے روانہ ہوا تھا۔ تم مجھے اسٹیشن پر الوداع کہنے گئے تھے۔ میں خوش تھا۔ میرے دل میں جوش تھا۔ وہی جوش جو جنگ میں جانے والے سورما کے دل میں ہوتا ہے۔ بیکسی۔ یہ بزدلی مفقود تھی۔ زندگی سراپا ارمان تھی۔ جیسے نیل آسمان [illegible]

جاتے تھے۔ بلندی کے خیال میں پستی کو دخل تک نہیں تھا۔ ترقی سامنے کھڑی رقص کرہی تھی۔ اس کے بعد تین سال مسلسل خوشی کے سال تھے۔ تمام دن لکھتا۔ پھر بھی نہ تھکتا۔ ہندوستان کا کوئی اخبار۔ کوئی مشہور رسالہ نہ تھا جس میں میری نظمیں شائع نہ ہوتی ہوں۔ لوگ انہیں پڑھتے تھے۔ میری تعریف کرتے تھے میں مسرت کے سمندر میں کھو جاتا تھا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر اڑا جا رہا ہوں۔ یہ تین سال۔ یہ تین سال ہی میری زندگی کا ماحصل ہیں۔ کاش وہ زمانہ پھر آجائے۔ میری نظروں میں غم و مسرت، رنج و شادمانی کے جذبات اس طرح رقص کرتے گویا طلائی زیور میں ہیرے چمک رہے ہیں۔

مجھے بیسیوں خط موصول ہوئے لیکن وہ سب صنف قوی کی طرف سے آتے۔ تین برس کے بعد مجھے اس کا خط موصول ہوا۔ نام میں نہ لونگا۔ نام پوچھ کر تم کیا کرو گے؟ وہ خود شاعرہ ہے۔ ایک نفیس شاعرہ۔ اس کے اشعار نزاکت اور نسائیت سے معمور ہوتے ہیں۔ ان دنوں اسے لکھنا شروع کئے تھوڑی مدت ہی گذری تھی لیکن اچھے سے اچھے ہندی ماہانے میں بھی اس کی نظمیں خاص شان سے شائع ہوتی تھیں۔ میں نے رسالوں میں اس کی تصویر دیکھی تھی جب بھی میں اس کی کوئی نظم پڑھتا تھا اس کا مسکراتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔

اس کا خط کیا تھا۔ بہترین الفاظ کا ایک حسین مجموعہ جس کے ایک ایک لفظ سے محبت چھلکی پڑی تھی۔ وہ ایک لہر تھی۔ جو میرے خیالات کو میرے تصورات کو میرے خوابوں کو اپنی رو میں بہالے گئی۔ اس کے بعد میں کیا کرتا رہا۔ محبت کی کتنی بلندی پر پہنچ گیا۔ یہ لمبی داستان ہے لیکن جب گرا جب ٹھکرایا گیا۔ تو معلوم ہوا۔ جہاں سے چلا تھا۔ وہاں سے نیچے بہت نیچے جا گرا ہوں۔

اس وقت میری حالت اس شخص کی طرح تھی جس کا جہاز تباہ ہوگیا ہو اور جو سمندر کی کسی چھوٹی سی چٹان پر کھڑا اِدھر اُدھر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتا اور پھر سر جھکا کر مایوسی سے مٹی کریدنے لگے [illegible]

کی طرف ایک یاس آمیز نگاہ ڈال کر گرم ریت پر لیٹ جاتا ہے۔

اس وقت بھی میرا دل لاہور سے بھاگ جانے کو چاہتا تھا لیکن میری شہرت نے مجھے نہ چھوڑا۔ ویاس جی نے انہیں دنوں لاہور سے "پریم ساگر" نکالنا شروع کیا تھا۔ پنجاب میں ہندی کا یہ پہلا ہی رسالہ تھا اس لئے خوب چل نکلا۔ کئی مہینوں سے وہ نظموں کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ لیکن میں کسی اور ہی دنیا میں گم تھا نظم لکھنے کی فرصت ہی کسے تھی۔ اب پھر لکھنے لگا۔ دل پر چوٹ لگی ہوئی تھی۔ نظموں میں دل کی جلن نکالنے کے علاوہ کوئی علاج نہ تھا۔ اس لئے جو کچھ کہتا تیر و نشتر ہو جاتا۔

ایک ہی سال میں میں اپنا غم بھول گیا۔ تازہ خوشی نے عارضی دکھ کو بھلا دیا۔ تالاب کے کنارے پہنچ کر مسافر گذشتہ صعوبتوں کو بھول گیا۔

(۳)

کچھ لمحوں کے لئے بلونت رکا۔ پھر بولا۔

"اب پھر میری نظموں کی دھوم ہو گئی۔ پھر مجھے میرے مداحوں کے خط آنے لگے۔ ان میں عورتوں کے بھی ہوتے۔ مردوں کے بھی۔ کئی عنایت ناموں میں محبت کی چاشنی بھی ہوتی۔ لیکن میرا دل سخت ہو چکا تھا۔ اور اب اس میں اس لطیف جذبہ کے لئے جگہ نہیں تھی۔ میں شاید ہی کسی کا جواب دیتا .... شاید ایک دفعہ چوٹ کھا کر محبت کا احساس ہی جاتا رہا تھا۔ اب میں دن رات اطمینان اور طمانیت سے نظمیں کہتا۔ خرچ چلانے کے لئے میں نے ایک اخبار میں کچھ وقت کے لئے ملازمت کر چھوڑی تھی۔ اور ایک طرح کی ادبی زندگی ہی گذار رہا تھا۔

ایک لمحہ کے لئے بلونت چپ ہو گیا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر کہنے لگا۔

"اچھی طرح یاد ہے اس دن میں اپنی کتاب کی آخری نظم کہہ رہا تھا نظموں کے تمام مسودے میرے سامنے پڑے تھے۔ جب کوئی مصرع حسب خواہش نہ بنتا۔ تو دوسری نظم پڑھنے لگ جاتا۔"

بے خودی میں بلونت نے ایک چھوٹا سا رجسٹر سامنے رکھ لیا۔ اور پھر اچانک ہی وہ مصرع اتر آتا۔ ایسا اچھا کہ میں خود اُسے بار بار ــــ آواز نہ رکھنے کے باوجود بھی ــــ گا گا کر پڑھتا۔ میں اپنی غیر مطبوعہ نظموں کا جو مجموعہ شائع کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی آخری نظم تھی۔ اور اس کا عنوان تھا "رخصت" اس کا آخری بند ختم کرنے کے بعد بھی میں اسے دیر تک پڑھتا رہا۔ طبیعت کسی طرح سیر ہی نہ ہوتی تھی۔ اونچے اونچے جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا کہ آواز آئی "بابو جی"! دیکھا چپڑاسی رسائل سامنے کھڑا تھا۔

بلونت میز کے سہارے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

"اس کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ اس نے خط کو میرے سامنے پھینک دیا۔ میں نے اُسے اٹھایا اور ایک ہی نظر میں پڑھ ڈالا۔ مشن کالج کی کسی طالبہ نے میری ایک نظم پر تنقید کی تھی۔ اتنی تیز۔ اتنی سخت۔ کہ میں جھنجھلا اٹھا۔

اس نے میری نظم کو معیار سے گری ہوئی بتایا تھا۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ آگ سی لگ گئی۔ یہ سیکنڈ یا تھرڈ ایر میں پڑھنے والی لڑکی کیا جانے شاعری کس بلا کا نام ہے۔ میں نے اپنا مسودہ وہیں پٹک دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔"

یہ کہتے ہوئے بلونت نے رجسٹر میز پر پٹک دیا۔ اور ذرا تیزی سے کہنے لگا۔

ان دنوں "پریم ساگر" کا دفتر گوالمنڈی کے چوک کے نزدیک ریلوے روڈ پر واقع تھا۔ ویاس جی خود مکان کی بالائی منزل پر رہتے تھے۔ زینہ طے کر کے میں کمرے میں داخل ہوا۔ مس کیلاش کا خط میری جیب میں تھا۔ اور دل میں غصہ کے اٹھتے ہوئے جذبات ــــ اف۔ ویاس جی اور سوپ کشور بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ سوپ بھی شاعر تھا۔ میرا حریف تھا۔ خوبصورت اور خوبرو۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کبھی کبھی خوب کہہ جاتا تھا۔ لیکن عام طور پر عامیانہ چیزیں لکھتا۔ مشن کالج کا سینیر طالب علم تھا۔ مجھ میں اور اس میں خوب چلتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی چیزوں میں نقص نکالا کرتے تھے رسمی آداب کے بعد میں بیٹھ گیا۔

"فرمایئے کیسے آنا ہوا۔"

میں بیٹھ گیا۔

سروپ بہت دیر تک بیٹھا رہا اور جب تک بیٹھا رہا ہنس ہنسکر باتیں کرتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کیلاش کا خط پڑھ لیا ہو گویا میری تذلیل کی اسے بھنک ہوگئی ہو میں چپ بیٹھا اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں کافی باتونی ہوں لیکن نہ جانے کیوں اس دن بات ہی منہ سے نہ نکلتی تھی۔ سروپ کے جانے پر ویاس جی نے میری طرف ایک خط سرکایا۔ اور آہستہ سے کہا — ملاحظہ فرمایئے۔

میں بسرعت تمام خط پڑھ گیا، لکھا تھا۔

شریمان ویاس جی۔

نمستے۔ میں نے بلونت جی کی نظم 'عورت' پڑھی' مجھے حیرت ہے کہ آپ نے ایسی لغو اور بے معنی نظم کو اپنے بلند پایہ رسالہ میں جگہ کیسے دیدی۔ یہ نظم صنفِ نازک کے لطیف دل پر سخت صدمہ پہنچاتی ہے۔ براہ کرم ایسی دلآزار نظموں کو 'پریم ساگر' ایسے رسالہ میں نہ شائع کیا کریں۔

خیراندیش

مس کے۔ بھنڈاری

میرا چہرہ اتر گیا۔ ویاس جی کو اپنا خط دکھانے کا حوصلہ ہی نہ کر سکا۔ وہ بولے۔

"کہو کیا کہتے ہو"

"آپ تو جانتے ہیں نظم کیسی تھی۔"

"جبھی تو اس خط کا جواب دے رہا ہوں"

"جواب لکھ رہے ہیں؟"

"ہاں"

"ذرا انصاف سے کام لیجئے گا"

"مطمئن رہئے۔"

آداب عرض کے بعد میں گردن جھکائے دفتر سے باہر نکلا جب آیا تھا اُس وقت دل میں کتنا غصہ تھا۔ کتنا رنج۔ اب کتنی افسردگی کتنی تھکاوٹ

"تم پوچھو گے" بلونت نے سٹول پر بیٹھتے ہوئے پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "جب میں مشہور ہو چکا تھا تو میں نے اس خط کو اتنی اہمیت ہی کیوں دی۔ آج میں سوچتا ہوں۔ تو خود حیران ہوتا ہوں لیکن اس وقت لکھنے کا میرا شوق نیا نیا ہی تھا۔ تین چار سال کسی شاعر یا مصنف کیلئے بہت نہیں ہوتے۔ جب تک اس کی دو چار کتابیں مارکیٹ میں نہ آجائیں تب تک چاہے رسالوں میں کتنی ہی نظمیں شائع ہوں۔ وہ مبتدی ہی ہوتا ہے۔ میری بھی ایسی ہی حالت تھی۔ آج تک میں اپنی تعریف ہی سنتا آیا تھا۔ میرے کان داد اور حوصلہ افزائی کے الفاظ سے ہی آشنا تھے مخالف تنقید سننے کی استعداد شاید مجھ میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

راستہ بھر میں مس کیلاش کی تنقید کا جواب سوچتا آیا۔ دل ہی دل میں میں نے اپنی نظم کے کئی معانی نکالے۔ اس کی تنقید کو فضول اور بے معنی ثابت کیا۔ جب گھر پہنچا تو دماغ جل رہا تھا۔ نظموں کا مسودہ میں نے ایک طرف اُٹھا کر رکھدیا۔ اور مس کیلاش کو خط لکھنے میں منہمک ہو گیا۔ بہت دیر تک لکھتا رہا ختم کیا تو معلوم ہوا پندرہ صفحے لکھ چکا ہوں۔ اس خط میں سب سے پہلے میں نے شاعری کی تعریف کی۔ انگریز شعرا کے حوالے سے بتایا شاعری کسے کہتے ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے اس کا ذکر کیا۔ نظم کے جو معانی اس نے لئے تھے انہیں رد کیا۔ وضاحت کے ساتھ اپنی نظم کی خوبیاں بیان کیں۔ اور بتایا کہ اس نے نظم کو بالکل نہیں سمجھا غم و غصہ اور طنز سے یہ خط پُر تھا۔ آج اُس بات کو یاد کرتا ہوں۔ تو اپنی حماقت پر ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت میں اپنے کام کی نوعیت۔ اس کی بھلائی برائی کے متعلق سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ جذبات نے مجھ سے جو لکھایا لکھ دیا۔ دوبارہ خط پڑھا تو کئی جگہ تبدیلی کرنے کا خیال آیا۔ لیکن پھر اسی طرح رہنے دیا۔ پہلے سوچا۔ نیچے اپنا نام نہ لکھوں۔ لیکن پھر کسی فوری جذبہ سے متاثر ہو کر اپنا نام اور پورا پتہ لکھ دیا۔

(۴)

کئی دن گذر گئے۔ میں بلاناغہ دفتر سے آکر ڈاک دیکھتا لیکن مایوس ہو جاتا۔ اس نے میرے خط کا جواب ہی نہیں دیا تھا۔ مجھے رنج ہوا۔ ایک

وہ وفعہ شن کالج کے سامنے سے بھی گذرا لیکن اس سے دل کو تسکین نہ ہوتی۔ بار بار سوچتا۔ مجھے جواب کی تمنا ہی کیوں ہے۔ اس کے خط کا جواب دینا تھا۔ دیدیا۔ اب وہ جواب دے یا نہ دے لیکن پھر خیال آتا۔ وہ ضرور جواب دے گی۔ میرا خط کتنا سخت تھا۔ پڑھکر تڑپ اٹھی ہوگی۔ دفتر جاتے ہوئے ایک بار لیٹر بکس پر نگاہ ڈالتا۔ مگر وہ خالی ہوتا۔

نئے سال کا کتنا نمبر شائع ہوگیا۔ اس میں اپنی بات کے نام سے یاس جی شذرات لکھا کرتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اسی کو دیکھا۔ یاس جی نے مس کیلاش کے خط کا جواب دیدیا تھا۔ نہایت مہذبانہ جواب تھا۔ لکھا تھا۔

"۔۔۔۔۔ ہم نے نظم زیر بحث کو کئی مرتبہ پڑھا ہے۔ اور ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ ہماری بہن نے اسکے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس نظم میں مصنف نے مردوں پر واضح کیا ہے۔ کہ اگر تم عورت کی طرف سے بے پروا ہوگے۔ تو عورت بھی تم سے انتقام لینے کو کھڑی ہو جائے گی اور جس طرح وہ روتی ہے۔ اسی طرح تم بھی اپنی غفلتوں کا ماتم کروگے یہ نظم انہیں دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتی ہے۔ اور ان کو راہِ راست پر چلنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ اب بتایئے یہ نظم صنفِ نازک کی توہین ہے یا عورت کی دنیا کی خدمت۔۔۔۔۔"

میں نے اسے دو تین دفعہ پڑھا لیکن اس سے میری تسلی نہ ہوئی۔ اسی موضوع پر میں نے ایک اور نظم لکھی اور اسے چند دن کے نظم نمبر میں دیدیا۔

بلونت بات کو درمیان میں ہی چھوڑ کر ایک کونے میں گیا۔ اور وہاں رکھی ہوئی الماری میں کوئی چیز ڈھونڈنے لگا۔ لیکن پانچ چھ منٹ بعد ہاتھوں کی مٹی جھاڑتا ہوا واپس آیا۔

"کیا تھا" میں نے پوچھا۔

میں یہ دیکھنے گیا تھا۔ شاید کوئی نظم نمبر کا نسخہ یہاں ہو لیکن اب یاد آتا ہے کہ اُسے تو جلا چکا ہوں۔ کتنا شاندار نمبر تھا۔ اس سال جتنے خاص نمبر نکلے تھے۔ ان میں سے یہ گوئے سبقت لے گیا تھا۔ اس میں سب سے پہلے میری نظم تھی۔ مجھے اس کی تعریف میں کئی خط موصول ہوئے لیکن مجھے ان کی تمنا نہ تھی۔ میں سمندر کے پانی سے اس برتن کو بھرنا چاہتا تھا۔ جو آسانی سے ہاتھ آنے والا نہ تھا۔

میں نے اس نمبر کی ایک کاپی مس کیلاش کے نام بھجوا دی۔ اور احتیاطاً اس کی ایک کاپی خود بھی ایک لفافہ میں بند کرکے۔ اپنا پتہ لکھے بغیر اس کے نام ارسال کر دی۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ مجھے جنون سا ہوگیا۔ میں نے تمام تعریفی خط جلا ڈالے۔

ایک لمحہ کے لئے بلونت خاموش ہوگیا۔ پھر بولا۔ ان تمام خطوں کے مقابلہ میں مس کیلاش کا خط کتنا زیادہ قیمتی ہوتا۔ سمجھو۔ لیکن اسکا جواب نہ آنا تھا اور نہ آیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی نظموں کے کٹنگ لفافہ میں بند کئے اور انہیں اسکے نام پر بھیجدیا۔ اور پھر کئی روز تک میں تصور میں ہی کسی حسین ۔۔۔ نازنین کو کوستا رہا میرے دل میں۔ دل کی تمام امیدوں میں ایک تصویر سمائی تھی۔ لیکن میں نے اسے ایک بار بھی نہ دیکھا تھا

بلونت پھر میز پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

"ایک دن صبح کا وقت تھا۔ میں ورزش کر رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ اور میں اندر کمرے میں ہی ہاتھ پاؤں ہلا لیا کرتا تھا۔ کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے سپرنگ الماری میں رکھدیئے۔ اور کہا "آجایئے"

دروازہ ایک حسینہ نے کھولا۔ میں ٹھٹھک گیا۔

"میرا نام کیلاش بھنڈاری ہے"

میں گویا زمین میں گڑ گیا۔ اپنی تمام طاقتوں کو مجتمع کرکے میں نے کہا "تشریف رکھئے" اور دوسرے کمرے میں بھاگ گیا۔ جلدی جلدی کپڑے پہنکر اور بالوں کو درست کرکے باہر آیا۔ آخر لطے بھی تو کس ہیئت کذائی میں اور آکر اسکے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے آپکے درشنوں کی بڑی خواہش تھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس لئے آج چلی آئی"

میں کیا جواب دیتا۔ وہ بولی۔

"آپ ایسی اچھی نظمیں کہتے ہیں۔ اس کا مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ شاعر تو قدرت کی سب سے بیش بہا۔ سب سے خوبصورت چیز ہے

اور میں ہوں کہ میں نے آپ کی شان میں گستاخانہ کلمات لکھ دیئے۔ کیا بتاؤں .....“

دل کی خوشی کو دل ہی میں دبا کر میں نے کہا ”ذرہ نوازی رہنے دیجئے میں آپکی ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ اس نظم میں واقعی نقائص تھے۔ دراصل مرد کے لئے کسی عورت کے جذبات کو قلمی جامہ پہنانا اور ان کی صحیح تصویر کھینچنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ میں احمق ہوں کہ میں نے یہ کوشش کی“

اس نے کہا ”آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں میں نے اس نظم کو صرف سرسری نظر سے دیکھا تھا۔ ویاس جی کے جواب کے بعد اسے دو تین بار پڑھا تو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ جو کچھ ہے اسی کی تصویر کھینچنا ہی تو مصور کا کام نہیں۔ جو کچھ ہونا چاہئے جس منظر کو مصور تصور میں دیکھتا ہے۔ اسے بھی تو صفحۂ قرطاس پر لاسکتا ہے۔ شاعر بھی مصور ہی ہے۔ ایک قدرت کے مناظر کی تصویر کھینچتا ہے۔ دوسرا دل کے جذبات کی تصویر کھینچتا ہے۔ ایک چاہتا ہے۔ ایسا منظر ہوتا تو کیسا تھا۔ دوسرا چاہتا ہے لیسے جذبات ہوتے تو کتنا اچھا ہو۔ آپ نے بھی عورت کو جس روپ میں کھینچا وہ حقیقت سے چاہے بعید ہو لیکن موجودہ زمانہ میں اسی روپ کی ضرورت ہے“

میں گویا آسمان میں اڑا جا رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن الفاظ نہ ملتے تھے۔ ندی میں پانی تو زور سے آرہا تھا۔ پر نکاس کا راستہ رُک گیا تھا۔ جذبات آتے تھے۔ پر گلے تک آکر واپس ہوجاتے تھے۔ میں نے اُسے ایک معمولی کالج سٹوڈنٹ سمجھ لیا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا۔ اس کی نگاہ کتنی باریک بین کتنی گہری تھی۔

وہ بولی۔ ”چاہتی تھی اپنے الفاظ کے لئے آپ سے معافی مانگوں۔ خط لکھنے کا ارادہ تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ کیوں نہ خود ہی جاکر مل لوں۔ اسی لئے آج آگئی ہوں۔ امید ہے آپ مجھے معاف کر دینگے“

میں بے حد خفیف ہوا۔ شاید ندامت میرے منہ پر جھلک اُٹھی۔ آج تک میں نے اپنے آپکو اتنا حقیر اتنا کمینہ کبھی خیال نہ کیا تھا میں نے کہا۔

”آپ اس بات کا ذکر جانے دیں۔ انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اور میں بھی ایک کمزور انسان ہوں۔ شاعر ہوں۔ ناؤ کا خواہشمند ہوں۔ چاہتا ہوں شہرت ہو۔ اور ایسی شہرت ہو جسکے خلاف ایک آواز بھی نہ اٹھے“

وہ صرف مسکرائی۔ میں بھی مسکرایا۔ اور پھر اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ اس کی گہری نگاہوں نے جان لیا اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اور مجھ سے ایک دو نظمیں سننے کی فرمائش کی۔ میں نے اپنی ایک غیر مطبوعہ نظم سنائی۔ سنکر وہ پھڑک اٹھی۔ میں نظم پڑھ رہا تھا۔ اور وہ گویا سراپا کان بنے سن رہی تھی۔ دل میں تمنا تھی کہ تا قیامت اسی طرح بیٹھے رہیں۔

(۵)

اس دن میں کوئی کام نہ کرسکا۔ میرے تصور کی تصویر۔ وہ کتنی حسین تھی کتنی جمیل۔ یہی سوچتا رہا۔ اس دن میں دفتر بھی نہ گیا۔ نئی خوشی اتنی مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ کہ بیان نہیں کرسکتا۔

دوسرے دن وہ پھر آئی۔ اور پھر گاہے گاہے آتی رہی۔ کبھی کبھی خود بھی نظمیں لکھ لاتی۔ کہتی ”بلونت جی تم مجھے انشا پرداز بنا دو گے“ میں مسرت کے سمندر میں گم ہوجاتا اور کہتا ”کیلاش تم فطری شاعر ہو“ اسکی طرف سے جواب ہمیشہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ میں دے دیا جاتا۔

ہم دونوں لاہور کے باغوں۔ سڑکوں اور بازاروں کی سیر کرتے۔ دریا پر جاتے۔ ناؤ میں بیٹھکر پار نکل جاتے۔ جہاں ہماری خلوت میں کوئی حائل نہ ہوتا۔ دریا اپنی خاموش رفتار میں بہتا بعض اوقات ہم زور زور سے باتیں کرتے۔ تو دریا کی لہریں رقص کرنے لگتیں کبھی ہم چپ ہوجاتے تو معلوم ہوتا جیسے دریا نے بھی خاموشی اختیار کرلی ہے۔

وہی باغ جہاں میں نے ایک سال سے قدم نہیں رکھا تھا۔ اب پھر خوشنما معلوم ہونے لگے۔ وہی بازار جو کچھ عرصہ سے میرے لئے بے رونق تھے۔ اب پھر دلچسپی کا سامان بن گئے۔ انسان کا دل سورج مکھی کا پھول ہے۔ محبت کے آفتاب کی روشنی سے کھل اُٹھتا ہے۔ جدائی کی تاریکی اسکی زندگی کو فنا کر دیتی ہے۔ مجھے بھی ہر طرف نئی زندگی۔ نئی روشنی کا احساس ہونے لگا۔ اور میں اس جدید زندگی میں کھو کر رہ گیا۔ نظموں کے مسودے پر الماری میں پڑے پڑے گرد کی تہ جم گئی۔

قمار باز پہلا قرض اتار چکا تھا۔ اور توبہ کرنے کے باوجود پھر بازی لگا رہا تھا۔

(۶)

اس عرصہ میں سروپ نے اپنی نظموں کی کتاب شائع کی۔ ہمارے اخبار میں بھی تبصرہ کی غرض سے آئی۔ میرے دل کو دھکا لگا۔ مجھے بھی اپنی نظموں کا خیال آگیا۔ جو الماری کے کسی کونے میں گمنامی کی حالت میں پڑی تھیں۔ میں نے کتاب کو ایک سرسری نظر سے دیکھا نام تھا "بکھرے موتی" سب مطبوعہ تھیں۔ میری غیر مطبوعہ نظمیں اُن سے کہیں زیادہ بلند تھیں میں نے کتاب کو نفرت سے رکھدیا اور گھر چلا آیا۔ شام کا وقت تھا۔ میں نے الماری سے نظموں کے سوٹے نکالے۔ انہیں جھاڑا۔ پھر خود ہی ایک دو نظمیں پڑھیں نس نس میں ایک نشہ سا چھا گیا۔ کیلاش نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ تم بھی اپنی کتاب شائع کروا دو۔ اصلی شاعر تو تب ہی سمجھا جاتا ہے جب اُس کی کوئی کتاب چھپ جاتی ہے لیکن میں اتنے دنوں اور ہی دنیا کی سیر کرتا رہا تھا آج میں نے فیصلہ کر لیا۔ انہیں ضرور پریس میں دے آؤں گا۔ خرچ بھی بیٹھے کسی نہ کسی طرح انتظام ہو ہی جائیگا۔ کوئی ٹیکسٹ بک ہوتی تو میں پبلشر نکل آتے لیکن ابھی تک ہندوستان میں شعراء کی دماغی کاوشوں کی قدر کرنے والوں کی کمی ہے میں نے مسودہ کو بغل میں دبایا۔ دروازہ بند کر کے نکل رہا تھا کہ کیلاش آگئی۔

"سیر کو نہ چلوگے" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا اسکے چہرے پر پرانی مسرت نہ تھی۔ غم کا ایک ہلکا سا سایہ مجھے صاف نظر آیا۔ شاید اسکی طبیعت خراب تھی۔ یا شاید اسکا دماغ کسی فکر کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا ــــ "میں ذرا کام سے جا رہا تھا لیکن تمہارا چہرہ آج کیسا ہو رہا ہے کوئی خاص بات تو نہیں"؟

"نہیں بالکل نہیں۔ یونہی ذرا طبیعت سارا دن کچھ بھاری رہی اس لئے میں جلدی آگئی کہ چلو ذرا سیر کر آئیں لیکن جب آپ کام کو جا رہے ہیں تو خیر میں پھر آجاؤں گی۔

"نہیں نہیں" ــــ میں نے کہا۔ کوئی ایسا ضروری کام نہیں۔ ذرا یہ نظموں کے مسودے پریس میں دینے جا رہا تھا۔ پھر دے آؤں گا۔

وہ ذرا چونکی۔ پھر اس نے کہا۔ "نہیں نہیں یہ کام بیحد ضروری ہے۔ میرا کیا ہے میں تو پھر آسکتی ہوں"

میں نے کنڈی کھول کر مسودوں کو اندر میز پر پھینکتے ہوئے کہا یہ بھی پھر دئے جا سکتے ہیں۔

وہ میرے پیچھے پیچھے آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔

میں نے کہا "یہ کیا ہے"؟

"سروپ نے اپنی نظموں کو شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اس نے مجھے دی تھی کہ آپکو پہنچا دوں سو لے آئی ہوں۔ کتاب تو اس نے چھاپدی ہے مگر نظمیں کچھ یونہی سی ہیں۔ مجھے تو ایک بھی پسند نہیں۔ اُس نے یونہی اس کا نام 'بکھرے موتی' رکھدیا۔ انکا نام تو بکھرے کنکر ہونا چاہیے تھا۔"

"اچھی نظمیں ہیں مجھے تو پسند ہیں۔"

"ہاں آپکو ہونگی مجھے تو نہیں۔ آپ بھی اپنی نظمیں کتابی صورت میں چھپوا لیتے۔ تو اُسے معلوم تو ہو جاتا۔ کہ شاعری کس چیز کا نام ہے۔"

"میری نظمیں بھی ایسی ہی ہیں۔"

"انکا اور ان کا کیا مقابلہ" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کسر نفسی کوئی آپ سے سیکھ جائے۔ اور ان حضرت کو دیکھو کہ دیباچہ ہی ۵۰ صفحے کا لکھا ہے جیسے کتاب کو دیباچہ کے بل پر ہی تولے جائیں گے۔ میں تو لاتی ہی نہ تھی مگر آپکو دکھانے کے خیال سے لے آئی۔

اس کے بعد اس نے ایک میٹھا قہقہہ لگایا۔ اس وقت اس کے جسم کی تمام سرخی اس کے رخساروں میں کھنچ آئی۔ اس کی تمام رعنائی ان خوبصورت بالوں کی لٹوں میں بھر گئی جو اس کی کشادہ پیشانی پر ادھر اُدھر لہرا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "اس تکلیف کے لئے شکریہ" اور پھر اوورکوٹ لینے اندر چلا گیا۔

(۷)

باغ میں پہنچکر ہم سبزہ زار پر نہیں بیٹھے۔ روش روش ٹہلنے لگے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ اس نے سبزہ پر جادو کر دیا تھا۔ ہم پر دونوں طرف سے

سو رہا تھا جا رہا تھا۔ ایک وارفتگی کے عالم میں اس کے ساتھ سیر کرتا رہا۔ اسکی اداسی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اور اسکی جگہ مسرت اور خوشی نے لے لی۔

اس دن شمبھو بلونت نے میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "اس پر غضب کی پھبن تھی۔ اس دن وہ معمول سے زیادہ ہنسی ضرورت سے زیادہ مسکرائی۔" مجھے محسوس ہوا۔ بلونت مسرت سے نہیں انتہائی جلن سے باتیں کر رہا ہے۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا: "اس دن میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا۔ کہاں وہ اور کہاں میں۔ جب اس کا اور اپنا مقابلہ کرتا تو اپنے آپکو ہیچ سمجھتا۔ اس دن پہلی دفعہ مجھے محسوس ہوا۔ کہ اگر کیلاش کو مجھ سے چھین لیا جائے تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ پہلی دفعہ مجھے یہ خیال آیا کہ میں اپنی محبت کا اس سے اظہار کر دوں۔ اسکے سامنے دل کھول کر رکھ دوں۔ ہم دوسرے تیسرے دن سیر کو جاتے تھے لیکن ہماری گفتگو کا موضوع اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی تھیں۔ دلوں کے جذبات دلوں میں ہی دبے رہتے تھے۔ اس دن میں نے سوچا:"

بلونت کی آواز مدھم ہوتی گئی۔

"کہ اس سے محبت کا وعدہ لے لوں۔ اس سے کہہ دوں۔ کیلاش تمہارے بغیر زندگی بے کیف ہو جائیگی۔ جی نہ سکوں گا۔ لیکن جب بھی میں نے کوشش کی۔ حرف مدعا زبان پر آ کر رک گیا۔"

تقریباً دو گھنٹہ سیر کرکے ہم پلٹے۔ نسبت روڈ پر جدا ہوتے وقت میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ لیکن اس کے دل کی گہرائی تک رسائی نہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ مسرت تھی۔ حد سے زیادہ مسرت تھی لیکن کیا اسکے دل میں بھی وہی جذبات تھے جو میرے دل میں تھے۔ اسبات کا فیصلہ میں نہ کر سکا۔

وہ اپنے گھر کی طرف چلی گئی میں اپنے گھر کی طرف آ گیا۔ راستہ بھر کیا سوچتا رہا معلوم نہیں۔ جب گھر پہنچا تو نو بجے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بٹن دبایا۔ میز پر نگاہ ڈالی۔ وہاں نظموں کے مسودے نہیں تھے۔ الماری میں دیکھا۔ وہاں بھی نہ تھے۔ ایک لمحہ کیلئے میرے تمام ولولے ہوا ہو گئے سر چکرانے لگا۔ شبہ گذرا کہیں [illegible] نے بھرا نہ ہوں لیکن چابی کس نے باہر تو تالا پڑا تھا۔ میں نے پھر ایک دفعہ اِدھر اُدھر تلاش کی لیکن دماغ آنکھوں کی مدد نہ کرتا تھا۔ تلاش بے سود ثابت ہوئی۔ مسودے نہ ملے۔ مایوس ہو کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

شمبھو بلونت نے نہایت بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "اگر امید نہ ہو تو انسان ایک لمحہ نہ جی سکے۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ مسودے گم ہو گئے ہیں تو میں شاید اٹھ بھی نہ سکتا۔ لیکن امید دوسری زندگی ہے۔ میں پھر تلاش کرنے لگا۔ اس دفعہ یکسوئی سے ہر جگہ دیکھ ڈالی۔ لیکن ناکام رہا۔ خیال آیا کہیں اوورکوٹ کی جیب میں نہ ہو! یہ سوچتے ہی دروازہ بند کئے بغیر باغ کی طرف بھاگا۔ خاکی کاغذ پر لکھی ہوئی نظمیں آنکھوں کے سامنے چکر لگا رہی تھیں جس طرح مجھ سے ہو سکا میں نے ان تمام مقامات کو دیکھا جہاں جہاں ہم گئے تھے لیکن رات کا وقت تھا۔ اور ویسے بھی میں تیزی سے دیکھ رہا تھا۔ اگر مسودے وہاں ہوتے تو بھی ممکن ہے نظر نہ آتے آہستہ آہستہ میں واپس ہوا۔ ناکام امیدوار کی طرح۔ مایوس محبت کی مانند!

نسبت روڈ کے قریب پہنچا تو خیال آیا۔ چلو کیلاش کو بھی یہ المناک خبر سناؤں۔ کم از کم دل کی بھڑاس تو نکل جائے۔ تین برس کی محنت اور یوں دم بھر میں رائیگاں ہو جائے۔ لوگ اپنی نظمیں یاد کر لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے مجھے ایک بھی یاد نہ تھی۔ کہانی ہوتی تو پھر بھی لکھی جا سکتی۔ لیکن نظم کہنا اور کہانی لکھنا ایک برابر نہیں۔ اگر ایک دفعہ خیال دماغ سے اتر گیا تو پھر ہزار کاوش سے ہزار محنت سے اُسے لکھنا ناممکن! میں اپنی بے پروائی کو کوس رہا تھا کتنی بار کیلاش نے کہا تھا۔۔۔ نظموں کو حفاظت سے رکھو۔ شاعر کی پونجی اس کی بیش قیمت نظمیں ہوتی ہیں۔ لیکن میری عقل پر پتھر پڑے ہوتے تھے میں نے ان کی پروا نہ کی

چھوٹے سے باغیچہ سے گذر کر میں برآمدہ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ پھر گیلری میں داخل ہوا۔ کیلاش کے کمرے میں بجلی جل رہی تھی۔ دروازہ پر چک پڑی ہوئی تھی۔ اندر سے باتوں کی آواز آئی۔ میں اندر جانے ہی لگا تھا کہ ٹھٹھک گیا۔ کمرے میں وہ اور سروپ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے رات کے وقت [illegible]

تھے۔ اور وہ کیا کر رہے تھے۔ جانتے ہو شمبھو! میں نے وہاں کیا دیکھا؟ انجان سکتے ہو!

...میں نے دیکھا۔ کیلاش ہنس ہنسکر ایک ایک نظم سروپ کو دکھاتی ہے اور پھر اسے پرزے پرزے کرکے کوئلوں کی نذر کر رہی ہے۔ وہ مجھے ذبح کر رہے تھے میرے دل کے ٹکڑوں کو سپردِ آتش کر رہے تھے۔ اور میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔"

بلونت بڑی اونچی اونچی دل رہا تھا۔ لیکن یکدم اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔ بولا۔

"میں نے آنکھوں کو ملا۔ یہ خواب نہ تھا۔ حقیقت تھی۔ خوفناک اور تلخ حقیقت۔

میری عزیز نظمیں جل رہی تھیں۔ اور میں کھڑا دیکھتا تھا۔" اس نے اور بھی مری ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے پاؤں کی طاقت جیسے سلب ہو چکی تھی میرے جسم میں اتنی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ کہ بڑھکر اُس کے ہاتھ سے باقی اوراق چھین لوں۔ اور باقی نظموں کو ضائع ہونے سے بچالوں۔ میرا سر گھوم رہا تھا آنکھوں کے آگے تاریکی چھا رہی تھی۔ میں بے ہوش ہونے کو تھا کہ سروپ نے کہا۔ "بس اب جی! اور ایک بار ہی سب کاغذوں کو آگ کی نذر کرکے اُسے آغوش میں لے لیا۔

اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کیلاش نے کہا۔ "سروپ اب بھی تم مجھ پر شک کروگے۔ اب بھی تمہیں میری محبت کا یقین نہ ہوگا؟"

اور اسکے جواب میں سروپ نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

میری بیہوشی کافور ہوگئی۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انتقام کے تمام جذبات مشتعل ہوگئے۔

بلونت نے میرے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر اسکی آواز دھیمی ہوگئی۔ اور نہایت آہستہ سے اس نے کہا۔

"لیکن شمبھو یادِ گذشتہ کے پانی نے غیظ و غضب کی آگ کو ٹھنڈا کردیا میں نے آخری دفعہ کیلاش کے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر میری آنکھوں میں میرا بدصورت چہرہ پھر گیا۔ غصہ کی بجائے میں دل ہی دل میں ہنسا اور اُلٹے پاؤں چپکے سے آگیا۔ اور اسی رات لاہور سے چلا آیا۔"

ایک لمحہ کے لئے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے بلونت کے چیچک سے بھرے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ جو موت کی طرح سیاہ ہوگیا تھا۔ پھر بیرے کی طرف دیکھا۔ وہ موت کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ گویا اس کی زبان گنگ ہوگئی ہے۔

اچانک بلونت نے ایک گہرا لمبا سانس لیا۔ اس کی نگاہ گھڑی پر گئی۔ اور وہ چونک اُٹھا۔

"اچھا اداب عرض" اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وقت زیادہ ہوگیا ہے۔ پھر کسی وقت ملیں گے۔"

ہم دونوں خاموشی سے اُٹھے۔ اور اس سے ہاتھ ملاکر ریستوران سے باہر نکل آئے۔ میں نے جاتے جاتے مڑکر دیکھا۔

... وہ سٹول پر بیٹھا اسی طرح سر جھکائے کام میں مشغول تھا۔

لطیف انور گورداسپوری

قطعہ

موت آئی کہ چارہ ساز آیا
کیوں نہ اب تک سمجھ میں راز آیا
مجھ کو دوزخ کی حکمرانی دے
خدمتِ خلد سے میں باز آیا

جناب اختر انصاری بی۔اے (آنرز)

غزل

ایک ویرانے میں رہتی ہے پری کیا کہنا ہے امنگ اجڑے ہوئے دل میں بھری کیا کہنا

نگہ شوق کی یہ پردہ دری، کیا کہنا دل کے ارمان کی وہ پردہ نشینی، کیا خوب

دل مدہوش! تری بے خبری، کیا کہنا مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ناکام ہوں میں

نغمۂ روح کی جادو اثری کیا کہنا زندگی راگ میں تبدیل ہوئی جاتی ہے

لال قلعے کی دل افروز پری کیا کہنا ہے تری دھوم زمانے کے دبستانوں میں

ہو کے ناشاد بھی میں خود کو سمجھتا ہوں شاد
واہ اختر مری آشفتہ سری، کیا کہنا

بلاشک موجودہ زمانہ میں روس بین الاقوامیت کی طرف سے بیگانہ روا نظر آ رہا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس چیز کا معتقد نہیں رہا۔ روس داخلی طور پر اپنے آپ کو مضبوط اور اندرونی طور پر اپنے یہاں اشتراکیت کا نمونہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد بین الاقوامی اشتراکیت کی علمبرداری کرے گا۔

ٹراٹسکی اور سٹالن کی نظریاتی جنگ اسی وجہ سے شروع ہوئی تھی کہ اول الذکر بین الاقوامیت کی تبلیغ کو مقدم خیال کرتا تھا۔ اور موخرالذکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر سرمایہ داروں اور فسطائیت نوازوں کے قلعوں پر دھاوا بولنا چاہتا تھا۔

چونکہ روس کی حمایت سٹالن کو حاصل ہوگئی اس واسطے سٹالن نے بین الاقوامیت کے پروگرام کو من سب وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا اور اپنی داخلی قوت کو مضبوط بنانے کے لئے پانچ پانچ سال کے پروگراموں کا آغاز کر دیا۔ باندریں حالات روس کو بین الاقوامیت کے متعلق سرد مہر سمجھنا غلطی ہے۔

جن حضرات کو تحریکِ اشتراکیت سے خواہ مخواہ ڈر لگتا ہے۔ ان کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ مزدوروں کی بہبودی کے لئے تقریباً تمام متمدن ممالک نے خاص خاص قوانین بنا دئے ہیں۔ جن کی موجودگی میں موجودہ نظام کے اندر ان کو کسی انقلاب کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اب وہ انقلاب کی نسبت اصلاح کو کہیں زیادہ اچھا سمجھتے ہیں۔ اس لئے اشتراکیت کی تبلیغ واشاعت بے معنی سی بات ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ موجودہ اقتصادی نظام کی خرابی کا یہ علاج کافی نہیں ہے کہ مزدوروں کے لئے خاص قوانین بنا دئے جائیں۔ کیونکہ یہ قوانین وقتی طور پر شکایات کا ازالہ کر دیتے ہیں۔ مگر سرمایہ دار و مزدور کی طبقاتی جنگ کا سد باب نہیں کرتے۔ ذرا سا غور کرنے کے بعد معلوم ہو جائے گا۔ کہ موجودہ نظام کے ماتحت باوجود اصلاحات وقوانین کے سرمایہ کم سے کم ہاتھوں میں اکٹھا ہوتا جا رہا ہے۔ اور سرمایہ دارانہ ادارے وسیع سے وسیع تر ہو رہے ہیں۔ سرمایہ کے مالک تعداد کے لحاظ سے کم ہو رہے ہیں۔ اور جو آج سرمایہ دار شمار ہو رہے ہیں۔ وہ کل کو مزدوروں کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ اور طبقات کی جنگ ناگزیر ہو کر رہے گی۔ ان اصلاحات اور قوانین سے اتنا ضرور ہو رہا ہے کہ مستقبل کی جنگ چندروز کے لئے ٹل چکی ہے۔

ایک اور اعتراض جو اشتراکیت کے فلسفہ پر کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کو اگر بالکل اڑا دیا گیا۔ تو انسان میں مقابلے کا جذبہ فنا ہو جائیگا۔ دنیا کی بیشتر ترقیوں کا محرک یہی جذبہ ہے۔ اگر انسان اپنی کوششوں کا پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکے تو اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ محنت سے کام کرے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے۔ کہ اشتراکیت ذرائع پیداوار کے حقوقِ ملکیت کو مٹانا چاہتی ہے۔ زمین اور سرمایہ کو جمہوریت اور ریاست کی ملکیت بنا کر سب کو محنت اور مزدوری کی دعوت دینا چاہتی ہے۔ اور اس لحاظ سے کھلے مقابلہ کا سامان مہیا کر دیتی ہے۔ ہر شخص اپنی محنت۔ ذہانت اور جدوجہد کے لحاظ سے انفرادی مفاد حاصل کر سکتا ہے۔ جدوجہد اور مقابلہ کے جذبہ کو اشتراکیت جس احسن طریقہ پر پرورش کرنا چاہتی ہے۔ موجودہ نظام میں اس کا کہیں شائبہ بھی نہیں۔ کیونکہ موجودہ نظام میں خوش حالی اور فارغ البالی کا انحصار قسمت اور تقدیر پر ہے محنت مقابلہ اور جدوجہد پر نہیں ہے ٭

~~~~~~

نوٹ:۔ خط وکتابت کرتے وقت جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی خط بھیجنا ضروری ہے۔

۲ رسالہ ہر ماہ دس تاریخ سے پہلے شائع ہو جاتا ہے۔ عدم وصول رسالہ کی اطلاع جلد سے جلد دفتر میں پہنچ جانی چاہئے۔

۳ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر ضرور لکھئے۔
~~~~~~

جناب احمد ندیم قاسمی بی۔ اے

غزل

اب تو ہیں اُس شوقِ گستاخانہ سے بیگانہ ہم! — اب نظر سے چُوم لیتے ہیں لبِ پیمانہ ہم

ضبط کی حد سے اگر شوقِ فراواں بڑھ چلا — آنسوؤں سے بھر کے پی جائیں گے اک پیمانہ ہم

ہائے وہ دن تشنگی سے جب کلیجے جل بجھے — اب اٹھائے پھر رہے ہیں دوش پر میخانہ ہم

اب نگاہیں حُسنِ لامحدود میں گُم ہوگئیں — ہوگئے ہیں بے نیازِ جلوۂ جانانہ ہم

حشر ڈھائے گا یہ برسوں کا جنوں پالا ہُوا — ہو تو جائیں گے امیدِ وصل سے بیگانہ ہم

رات کو تاروں سے دن کو ذرہ ہائے خاک سے — کون ہے جس سے نہیں سنتے ترا افسانہ ہم

یہ اندھیری رات! یہ بوسیدہ کٹیا! اور آپ! — جا کے پلکوں پر اُٹھا لائیں چراغ خانہ ہم

اب تو یہ دو چار تنکے بھی بگولے سے اڑے — اب سنائیں کس کو اپنا دکھ بھرا افسانہ ہم

کچھ ہماری تیری روزی کا بھی ساماں کیجئے — آپ کی آنکھوں میں پاتے ہیں تجلّی خانہ ہم

وہ بھی دن آئیں گے جب سدرہ کی چھاؤں کے تلے — آپکے ہاتھوں میں دینگے چاند کا پیمانہ ہم

کیوں شکایت ہو ہمیں اپنے مقدر سے ندیمؔ
فی الحقیقت خاک میں مل کر ہوئے دروانہ ہم

میرزا ادیب افسانہ

افسانۂ خونچکاں

(۱)

"تنویر نے کتاب بند کر کے زانو پر رکھدی۔ اور اپنی چھوٹی ہمشیرہ کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ شیریں کون ہے خورشید!"

"بڑے بھولے بنتے ہیں آپ بھائی جان! مجھ سے پوچھ رہے ہیں یہ کون ہے!" خورشید نے سر کو خاص انداز میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"وہی شریر لڑکی تو نہیں جو خیر سے ہمارے چچا غیاث کی صاحبزادی ہیں" تنویر نے مسکرا کر پوچھا۔

"وہی اور کون؟"

"اب سمجھا کب نازل ہوگی؟"

"آج، بلکہ ابھی"

"تو اس کے لئے یہ تیاریاں ہو رہی ہیں!"

"خاص تیاریاں تو نہیں"

"گھر کے کونے کونے میں ایک زبردست انقلاب ہو رہا ہے اور تم کہتی ہو خاص تیاریاں نہیں!"

"آپ تو ہر بات کا مذاق اڑاتے ہیں بھائی جان!" خورشید نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "معمولی سی صفائی کو ایک زبردست انقلاب سمجھتے ہیں۔ خدا کی پناہ۔"

"اچھا تو بات یہ ہے جب وہ بلا نازل ہو جائے مجھے اطلاع دینا — فی الفور یہاں سے بھاگ جاؤں گا!"

"آپ تو اس بلا کے لئے سٹیشن پر موٹر لے جا رہے ہیں۔"

"یہ تم کو کس نے کہا؟" یہ کہتے ہوئے تنویر کا چہرہ قدرے خشمناک ہو گیا۔

"آپ کے ابا جان نے اور . . . ."

"قطعاً نہیں۔ لوگ بلا کا نام سنکر بھاگ جائیں اور تم مجھے اس کو سٹیشن سے لانے کے لئے کہو! میں باز آیا اس قدر افزائی سے۔!"

"آپ ہمارا مذاق اڑا سکتے ہیں مگر باجی شیریں کے سامنے آپ میاں مٹھو بنا کیجئے گا "میاں مٹھو"۔

"وہ کیا؟ ہماری باجی اتنی حاضر جواب ہے اتنی حاضر جواب ہے کہ"

"کہ کوئی شخص اس کے سامنے حاضر ہی نہیں ہو سکتا یہی مطلب ہے نا؟"

دونوں پھر ہنس پڑے

"تو آپ جائیں گے نا بھائی جان!"

"ابا جان چلے جائیں گے!"

"وہ تو ضرور جائیں گے۔ مگر موٹر کی بھی تو ضرورت ہے نا!"

"تو گویا مجھ سے ڈرائیور کا کام لینا چاہتی ہو!"

"یہ بات نہیں بھائی جان!"

"تو اچھا کوئی اور بات سہی۔ . . لیکن میں جاؤں گا نہیں!"

"آپ کو جانا ہوگا . . . . اور آپ ضرور جائیں گے!" یہ کہہ کر خورشید تیزی کے ساتھ دروازے میں سے نکل گئی!

خورشید کے جانے کے بعد تنویر نے کتاب کی طرف توجہ کی مگر مطالعے پر اس کا جی نہ لگا۔ اور اس کی انگلیاں بے پروایانہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگیں۔ ایک دو منٹ تک یہ شغلہ جاری رہا۔ اس کے بعد اس نے کتاب کو پھر زانو پر رکھ دیا اور دایاں ہاتھ کوچ کے بازو پر رکھتے ہوئے خیالات میں محو ہو گیا۔ بے اختیاری کے عالم میں اس کے لب تھرتھرائے اور ان میں سے ایک ہلکی سی آواز شیریں گنگناتی ہوئی پیدا ہوئی۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں مدت سے سویا ہوا جذبہ انگڑائی لیکر بیدار ہو گیا۔ اور وہ تصورات کی رو میں بہتا ہوا بیس سال قبل کے زمانے کی معصوم آغوش میں جا پہنچا

گذشتہ مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اس وقت اس کی عمر دس سال کے قریب تھی، ورزندگی کا ہر دور اس کے لئے ہزار در ہزار دلچسپیاں لئے ہوئے تھا۔ وہ ہر روز اپنے مکان کے پائیں باغ میں پھولوں سے لدی ہوئی روشوں پر طرح طرح کے کھیل کھیلتا، طرح طرح کی دلچسپیوں میں حصہ لیتا ان تمام کھیلوں میں، ان تمام دلچسپیوں میں ایک اور ہستی بھی حصہ لیتی تھی۔ اور وہ تھی اس کی بنتِ عم "شیریں" نو سال کی شریر لڑکی۔ یہ زمانہ بچپن کا معصوم زمانہ تھا۔ اور ان کی محبت بچپن کی معصومانہ محبت کا رنگ لئے ہوئے تھی۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب وہ عالمِ بلوغت میں قدم رکھ رہے تھے۔ ان کی محبت اور کیفیت اختیار کرنے لگی۔ تنویر، شیریں سے لاکھ بے تکلف ہونے کے باوجود جب اسکے روبرو آتا تو اسکا دل دھڑکنے لگتا، شیریں تنویر کو بچپن کا ساتھی سمجھتے ہوئے بھی جب اسکے قریب آتی تو شرم و حیا کی سرخی اسکے چہرے پر دوڑ جاتی۔ بعض اوقات وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے اور اکثر اوقات ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب ہوتے!!

زندگی کے مختلف فرائض نے انہیں صرف انسان بنا دیا تاہم دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کے لئے مضطرب رہتیں، دونوں کے دل ایک دوسرے کے لئے دھڑکتے رہتے!! اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب تنویر تکمیلِ تعلیم کے لئے عازمِ یورپ ہوا۔ دونوں آخری بار ملے۔ دونوں نے رسمی گفتگو کرنے کے باوجود وہ راز جو وہ ہزاروں بار نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو بتا چکے تھے چند لمحوں میں بزبانِ خاموشی آخری بار ایک دوسرے کو بتا دیا! تنویر یورپ چلا گیا۔ اجنبی ملک کی رنگینیوں اور دلچسپیوں نے اسکے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک ان میں کامیاب بھی ہو گئیں۔ تاہم کبھی کبھی شیریں کی یاد شراب کی ایک لہر بنکر اس کے دماغ میں دوڑ جاتی۔ اور جب وہ یہ خیال کرتا کہ اس کی بنتِ عم ہزاروں میل کے فاصلے پر اسکا انتظار کر رہی ہے۔ تو اضطراب انگیز مسرت اس پر چھا جاتی اور وہ گھنٹوں گذشتہ واقعات کے آغوش میں محو رہتا،

مکمل چھ سال کے بعد وہ یورپ سے واپس آیا۔ مگر بہت بدلا ہوا! تہذیبِ جدید نے جہاں اسکے خیالات پر اثر کیا تھا۔ وہاں اسکی معاشرتی زندگی کو بھی بدل دیا تھا۔ اپنے وطنِ مالوف میں آتے ہی اُسے ایک ممتاز کالج میں لیکچرار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ اس کی زندگی کا جدید دور تھا۔ اس جدید دور میں وہ گذشتہ عقائد و خیالات کی زنجیر سے آزاد تھا اسی اثنا میں اُس نے سنا کہ شیریں کی شادی ہو چکی ہے اسکے دل کو سخت رنج پہنچا۔ اُسنے کوشش کی کہ شیریں کی یاد کو فراموش کر دے۔ اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوا۔ علمی اشغال نے پوری طرح اسکی توجہ پر قابو پا لیا۔ اور اسوقت کہ شیریں کی شادی کی خبر کو سنے اُسے ڈیڑھ سال کا عرصہ گذر چکا تھا گذشتہ محبت قریباً قریباً ایک خواب بن چکی تھی۔

وہ اپنے خیالات میں غرق تھا کہ اُسے قہقہے سنائی دیئے۔ اور اسکے ساتھ ہی خورشید کی آواز آئی۔ اُس نے آواز دی۔ چند لمحوں کے بعد خورشید اُسکے سامنے کھڑی تھی۔

"وہ بلا نازل تو نہیں ہو گئی؟" تنویر نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں، وہ خود آ گئی۔"

تنویر نے خورشید کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ تھا

"اچھی بات ہے!"

"وہ آپ کو بلا رہی ہیں!"

"جھوٹ بکتی ہے!"

"اچھا جھوٹ ہی سہی۔ آپ نہ جائیں وہ خود تشریف لے آئیں گی!"

"انہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں!"

"کیوں؟"

"یہ میری مرضی ہے!"

"اور ان کی مرضی ہے کہ وہ یہاں آئیں" یہ کہکر خورشید نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اور چلی گئی۔

تنویر اٹھا کتاب کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھا اور الماری میں رکھ کر ایک اور مجلد کتاب نکالی۔ دو تین منٹ تک اُسے سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد اسکی طبیعت بیزار ہو گئی۔ وہ کتاب بھی اس نے وہیں رکھ دی اسکا دل دھڑک رہا تھا۔ اور اسکی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اسے اپنی

کمزوری پر شرم سی آئی۔ اس نے جلدی سے الماری کو مقفل کیا۔ یکایک گھڑی نے نو بجائے۔ اس نے بعجلت کپڑے بدلے۔ دس بجے اسے کلاس لینی تھی۔ مگر آج وہ ایک گھنٹہ پیشتر ہی کالج کو جا رہا تھا۔

(۲)

جب سے تنویر نے شیریں کی آمد کی خبر سنی تھی اس کا دماغ اضطراب زا خیالات کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ مضطرب تھا اور غیر محسوس طور پر پراگندہ خاطر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک غیر مبہم سی خواہش، ایک دھندلی سی تمنا اس کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ "اس بے چینی کا کیا سبب ہے؟" وہ سوچتا۔ "میں شیریں کو قطعاً کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ مدت ہوئی میرے اس کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے۔ اور یہ تعلقات محبت کی صورت بھی اختیار کر چکے تھے مگر اب انہیں یاد کرنے سے فائدہ؟ گذشتہ واقعات خواب و خیال بن جاتے ہیں۔" اس خیال سے وہ اپنے دل میں بے چینی کو دور کرنے کی کوشش کرتا اور اسمیں کامیاب بھی ہو جاتا۔ سکون کی کیفیت اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی مگر جس طرح متحرک پردے کا سایہ ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا اس طرح کی یہ کیفیت بھی چند لمحوں سے زیادہ قائم نہیں رہتی تھی۔

اپنے متعینہ فرائض ادا کرنے کے بعد وہ کالج سے نکلا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں طرح طرح کے خیالات اسے پریشان کرتے رہے۔ مکان میں داخل ہوتے ہی نازک قہقہوں کی آواز اسکے کان میں گونجی اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسی حالت میں وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ ہیٹ اتار کر کھونٹی سے لٹکائی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے لگا۔ اسے بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ ہی گذرے تھے کہ دروازے سے ہلکی سی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر دروازے پر پہنچا اور باہر دیکھنے لگا۔ ایک طرف خورشید کھڑی مسکراتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"بھائی جان آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ باجی شیریں آپ کو کئی بار یاد فرما چکی ہیں مگر آپ..." یہ کہکر خورشید گردن لٹکا کر خاموش ہو گئی۔

"میں ابھی ابھی کالج سے آیا ہوں۔ کہاں ہے وہ؟..."

یکایک خورشید نے لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے "اوں" کی سی آواز نکالی

تنویر نے خاموش ہو کر بائیں طرف دیکھا۔ اس کی نظر قریب ایک مسکراتے ہوئے دلآویز چہرے پر پڑی۔ یہ شیریں تھی۔

"خاموش کیوں ہو گئے آپ؟" شیریں نے کہا۔ "مجھے ہاتھوں کوئی خطاب دیجئے!"

"تم خود آ موجود ہوئیں شیریں!"

"جی ہاں میں نے کہا پروفیسر صاحب قبلہ کی خدمت میں خود حاضر ہو جاؤں... وقت زیادہ قیمتی تو نہیں؟"

"میں ابھی ابھی کالج سے آیا ہوں...... تمہاری طرف آنے کا ارادہ کر رہا تھا..."

"کہ راستے میں پہاڑ حائل ہو گیا!" شیریں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"خوب تم ابھی پہلی سی ہنس مکھ لڑکی ہو شیریں!" تنویر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں اور آپ بھی پہلے سے حیلہ جو ہیں!"

"آؤ اندر... بیٹھ جاؤ!"

"آتے ہیں تو بیٹھ ہی جائیں گے" شیریں نے اپنی بہن زبیدہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ چاروں اندر آ گئے۔ دونوں بہنیں کوچ پر بیٹھ گئیں۔ تنویر کرسی پر بیٹھ گیا اور خورشید اس کے قریب کھڑی ہو گئی۔

"معلوم ہوتا ہے آج کل آپ بہت مصروف ہیں کیوں پروفیسر صاحب" شیریں نے پوچھا۔

"خاص مصروف تو نہیں... لیکن..."

"لیکن اتنا وقت نہیں ملتا کہ کسی مہمان کے لئے چند منٹ نکال سکیں" شیریں نے تنویر کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال غلط تھا... تم تو خدا کے فضل سے شوخ بیانی میں پہلے سے بھی بڑھکر ہو!" تنویر بولا۔

"اب معلوم ہوا بھائی جان! میں نے سچ کہا تھا نا!" خورشید نے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا کہا تھا" شیریں نے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا کہ . . . . خیر چھوڑیئے اس بات کو"

"تم کیوں نہیں بولتیں زبیدہ! تمہاری بہن کی زبان تو قینچی کی طرح چل رہی ہے!" تنویر نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"میرا فرض بھی باجی ادا کر رہی ہیں!" زبیدہ نے کہا۔

"اس قسم کا فرض تو وہ تمام دنیا کا ادا کر سکتی ہے . . . . تا ہم کچھ کہو کیا حال ہے؟"

"ہمارا جو حال ہے سو ہے آپ اپنا بتایئے۔ ولایت میں کیسے گذری؟" زبیدہ نے پوچھا۔

"یہ بات تو پرانی ہو چکی" تنویر نے جواب دیا۔

"پرانی؟" زبیدہ نے حیرت انگیز لہجے میں کہا۔

"ان کے لئے تو کل کی بات بھی بہت پرانی ہے" شیریں بولی۔

"اس سے اندازہ لگا لیجئے جب میں نے کہا۔ باجی شیریں آ رہی ہیں تو کہنے لگے کون شیریں؟" خورشید نے شیریں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

"سبحان اللہ . . . . " شیریں نے مسکراتے ہوئے کہا "انکے دماغ میں تو ولایت بسی ہے"

"بات کچھ اور تھی شیریں! جب خورشید نے کہا شیریں آ رہی ہیں۔ اس وقت میں شیریں فرہاد کا قصہ پڑھ رہا تھا۔ شیریں کا نام سنکر میں نے سمجھا"

"آپ نے سمجھا کہ فرہاد والی شیریں آ رہی ہے اور آپکو سخت حیرت ہوئی کہ مردہ کیونکر زندہ ہو گیا یہی بات ہے نا؟"

تنویر بے اختیار ہنس پڑا۔

"ہاں کچھ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا!"

خدا کرے یہ خطرناک واقعات ہر روز پیش نہ آئیں"

"وظیفہ پڑھکر دعا کیا کرو" تنویر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"آپ ماشاءاللہ خود زاہد ہیں۔ یہ فرض انجام دے لیا کیجئے!"

"ان باتوں کو چھوڑیئے بھائی جان! باجی کی حاضر جوابی کے سامنے آپکی پیش نہیں چلے گی۔ کچھ ولایت کے حالات سنایئے!" زبیدہ نے اشتیاق انگیز لہجے میں کہا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ باجی شیریں کی حاضر جوابی اپنی مثال آپ ہے۔" زبیدہ بولی۔

"یہ شریر لڑکی بچپن میں بھی مجھے تنگ کیا کرتی تھی" تنویر نے شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دن یاد ہیں شیریں! جب ہم دریا کے کنارے کھیلا کرتے تھے؟"

"کیوں نہیں۔ وہ دن کیونکر بھول سکتے ہیں۔ جب آپ چیخیے چلاتے میرے پیچھے بھاگا کرتے تھے؟"

"میں چیختا چلاتا تھا؟" تنویر نے قدرے شرمندہ ہو کر پوچھا "یہ عادت تو تم میں فطرت ثانیہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ادھر میں نے گڑیا کو چھپایا ادھر تم نے چیخیں مارنا شروع کر دیں!"

"زبیدہ!" شیریں نے بہن کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔ "یہ چیختے چلانے تو قطعاً نہیں تھے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ رونے والا ریکارڈ بج رہا ہے!"

اس پر تمام ہنس پڑے۔

"سنا ہے آپ آج کل افسانہ نگاری کا شوق بھی کیا کرتے ہیں؟" شیریں نے پوچھا۔

"ہے تو درست؟ تم کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟"

"مجھے اعتراض کیوں ہونے لگا۔ میں تو خوش ہوں کہ ہمارے بھائی جان کی بے شمار خصوصیات میں ایک اور زبردست خصوصیت کا اضافہ ہوا" شیریں بولی

"تو ہمیں کوئی افسانہ سنایئے گا" زبیدہ نے التماس کی۔

"افسانہ سنایا نہیں جاتا۔ پڑھا جاتا ہے!"

"یہی تو زبیدہ کہہ رہی ہے۔ آپ اپنا افسانہ پڑھ دیں!" شیریں نے جلدی سے کہا۔

"کوشش کرونگا!"

"کب؟ ہم تو آج ہی سنیں گے!" زبیدہ نے مصر ہو کر کہا۔

"میں نے تازہ افسانہ کوئی نہیں لکھا"

"تو پرانا ہی سہی"

"غور کروں گا"

"اچھا میرا فیصلہ یہ ہے کہ آپ کا افسانہ رات کو سنیں گے" شیریں نے بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"سینما کا بھی تو پروگرام ہے!" زبیدہ بولی۔

"اس کے علاوہ اور بھی پروگرام ہیں۔ ان میں یہ پروگرام بھی شامل کر لو"

اس کے بعد مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں! جب تنویر اکیلا رہ گیا تو اُسے محسوس ہونے لگا گویا اس کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ وہ سوچنے لگا کیا یہ وہی شریر لڑکی ہے۔ جو بچپن میں طرح طرح کی شرارتوں سے اُسے تنگ کیا کرتی تھی۔ جس کی محبت نے اس کے لئے کائنات کی ہر شے کو حسین بنا دیا تھا۔ جو اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی! وہ دیر تک انہی تصورات میں محو رہا ... ہر لمحہ شیریں کا مسکراتا ہوا دلآویز چہرہ اسکے سامنے پھر رہا تھا۔

(۳)

زمین دوز ندی ہماری نگاہوں سے پنہاں اپنے راستے پر بہتی رہتی ہے یکایک زمین کے سینے میں ایک معمولی سا سوراخ پیدا ہوتا ہے اور پانی سیلاب کی صورت میں باہر نکل کر آناً فاناً ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ یہی حال تنویر کے ساتھ پیش آیا۔ شیریں کی محبت کا جذبہ اسکے سینے کی گہرائیوں میں سو چکا تھا۔ لیکن جب اسکی نگاہوں کے سامنے شیریں کا دلآویز چہرہ آیا۔ تو اسکے دل کے ذرّے ذرّے میں ہیجان برپا ہو گیا۔ بچپن کے سہانے خوابوں کی غیرمرئی انگلی نے اس کے بربطِ دل کا وہ تار چھیڑ دیا جو ایک مدت سے خاموش تھا۔ اسکی بے حد خواہش تھی کہ شیریں اسکے سامنے رہے اس کے ساتھ باتیں کرتی رہے اور لمحہ بہ لمحہ یہ خواہش زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں کوچ پر بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد شیریں تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی!

"کیا ہو رہا ہے بھائی جان؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں" تنویر نے جواب دیا۔

"کیا ہے وہ؟"

"ایک افسانہ ہے!"

"افسانہ! خوب معلوم ہوتا ہے کل کے فلم نے آپ پر خاص اثر کیا ہے!"

"خاص اثر؟"

"جی ہاں! جبھی تو آپ افسانہ لکھ رہے ہیں۔!"

"تو تمہارا خیال ہے میں فلم کو افسانے میں منتقل کر رہا ہوں۔!"

"میں نے تو یہ نہیں کہا بھائی جان! اور ہاں ..."

"کیا بولو!"

"مجھے اس وقت ایک عجیب و غریب ضرب المثل یاد آئی ہے اجازت ہو تو کہہ دوں!"

"تمہیں روکتا کون ہے؟"

"وہ ضرب المثل ہے .. کیا ہے وہ؟ ہاں یاد آئی چور ... کی داڑھی میں تنکا!" یہ کہتے ہوئے شیریں نے قہقہہ لگایا۔

"مجھے چور سمجھ رہی ہو!"

"قطعاً نہیں یہاں تو اس چور کا ذکر ہو رہا ہے جس کے داڑھی ہے اور آپ تو خدا کے فضل سے مونچھوں کا بھی صفایا کر دیتے ہیں!"

"بس!"

"یہ بس کیا ہے بھائی جان! مجھے آپ نے کوئی پرندہ سمجھ رکھا ہے؟"

"ہاں اور وہ بھی بلبل"

"اور اگر میں بھی آپ کو کوئی خوبصورت جانور سمجھ لوں تو؟"

"پٹ جاؤ گی!"

"اور پیٹنے والے خیر سے آپ ہونگے؟"

"ہاں بچپن میں بھی میں تمہیں پیٹا کرتا تھا!"

"کب کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"ہاں شیریں .. ایک خواب تو دیکھا تھا مگر اس کی تعبیر ..." تنویر کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی اور وہ ایک آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

"کچھ یاد آگیا؟"

"بہت کچھ یاد آگیا ... کاش ... ہاں تم افسانہ سنو گی۔ غیر مکمل ہے!"

"سنوں گی مگر زبیدہ کو بھی آجانے دیجئے!"

"میں تو اب سنانے کے واسطے تیار ہوں" "زندہ منت دسماجت بھی کرو گی جب بھی. . . ."

"آپ ٹس سے مس نہیں ہونگے یہی کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"ظاہر ہے!"

"تو بسم اللہ!"

"بہتر!" یہ کہکر تنویر نے پیشانی پر ہاتھ رکھا اور خاموش ہوگیا۔

"خاموش ہوگئے آپ سناتے نہیں!"

"تم نے جو کہا تھا بسم اللہ. . یعنی"

"یعنی آپ سنائیے . . . !"

"تنویر کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ اس نے میز کی دراز میں سے ایک کاپی نکالی اور اُسے اپنے سامنے کھول کر شیریں کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"زبانی سنانے کا ارادہ ہے!"

"پڑھکر سناتا ہوں۔ غیر مکمل ہے!"

"آپ سنائیے۔ غیر مکمل ہے تو کیا ہوا!"

"تنویر کاپی کی ورق گردانی کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے دایاں ہاتھ ایک صفحے پر رکھدیا" اس افسانے کا عنوان بھی ابھی قائم نہیں ہوا کیونکہ ابھی مکمل نہیں لکھا گیا۔"

"تو یہ" شیریں نے مسکرا کر کہا" اس کا عنوان غیر مکمل افسانہ ہی کیوں نہیں لکھدیتے؟"

تنویر نے ایک آہ بھری اور پڑھنے لگا" حمید کو اپنی چچا زاد بہن سے اس درجہ محبت تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے جدا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی حال سلیمہ کا بھی تھا' اسکے لئے بھی حمید سے علیحدہ رہنا ایک سخت تکلیف دہ امر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ بچے تھے۔ دونوں ہر روز پھول باغ میں کھیلتے رہتے' کبھی حمید سلیمہ کی گڑیا کسی پودے میں چھپا دیتا' کبھی موقعہ پاکر سلیمہ حمید کی کتاب غائب کر دیتی۔ دونوں لڑتے جھگڑتے مگر یہ لڑائی' یہ جھگڑے ان کی محبت کی آگ پر تیل کا کام کر رہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کی محبت بڑھتی جا رہی تھی . . . بچپن کی محبت بھی عجیب ہوتی ہے" وہ ذرا ٹھہرا اور شیریں کو مخاطب کر کے کہنے لگا" تمہارا کیا خیال ہے شیریں!"

"آپ پڑھتے جائیے . . . سوال وجواب بعد میں ہولیں گے" شیریں نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بات ہے تو سنتی جاؤ" آخر انہوں نے عنفوانِ شباب میں قدم رکھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی محبت نے بھی باقتضائے وقت اور رنگ اختیار کر لیا بچپن کی معصوم محبت کے آغوش میں شباب کی رنگین آرزوئیں انگڑائی لیکر بیدار ہوگئیں۔ اور وہ تمنائیں جو دورِ طفلی کے ذہن پر سادہ خواب بنکر چھائی ہوئی تھیں نوجوانی کے نشے کی تند و تیز لہروں میں تبدیل ہوگئیں۔ حمید کو اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ سلیمہ اس کی ہے اور اسی کی رہے گی۔ سلیمہ کا بھی ایمان تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو حمید سے جدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی . . . !

تنویر ذرا ٹھہر گیا" ابتدا اچھی ہے نا شیریں!"

شیریں نے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا اور تنویر آگے پڑھنے لگا" حمید تکمیلِ تعلیم کی غرض سے یورپ چلا گیا۔ وہاں جاکر گوناگوں دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے باوجود اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی محبوبہ کو فراموش نہ کیا۔ اور کر بھی کیونکر سکتا تھا۔ اگر محبت کا زخم مندمل ہو سکتا تو انسانی زندگی کی تاریخ عشق کی تباہ کاریوں سے خالی ہوتی۔ محبت کو سینے کا داغ کہتے ہیں کاش یہ داغ ہی ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ داغ زخم بنکر گہرا ہوتا جاتا ہے۔ حمید کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ اپنے علمی فرائض ادا کرنے کے بعد وہ اپنے وطن میں آیا . . . اس حالت میں کہ ہزاروں آرزوئیں اس کے سینے میں ہجوم برپا کئے ہوئے تھیں۔ اور ہزاروں خواب اس کی روح کے افق پر جھلملا رہے تھے۔ زمانے کو محبت سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے۔ یہاں بھی اس ظالم نے اپنی چال چلی۔ حمید نے وطن پہنچکر سنا کہ اس کی محبوبہ کی کہیں شادی ہوگئی ہے۔ یہ سنکر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ سلیمہ اسکی راحت تھی' اسکا چین تھی . . . اور اب وہ اپنی راحت اپنے چین سے محروم کر دیا

گیا تھا۔ اس نے انتہائی کوشش کی کہ سلیمہ کو فراموش کر دے مگر ...

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

حمید کی حالت قابلِ رحم تھی۔ کاش وہ سلیمہ کو فراموش کر دیتا مگر یہ بات اس کے اختیار سے باہر تھی۔ عورت فطرتاً کمزور ہوتی ہے اور محبت کے معاملے میں تو اس کی کمزوری کبھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ سلیمہ کو خیال ہونا چاہئے تھا کہ حمید اس سے جدا ہو کر اپنی زندگی کی مسرتوں سے محروم ہو جائیگا.. لیکن وہ خیال کیوں کرتی۔ کمزور فطرت عورت . . . . "

تنویر نے کنکھیوں سے شیریں کو دیکھا۔ شیریں کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا اور وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

"میں نے افسانہ یہیں تک لکھا ہے" تنویر نے کہا "کچھ پسند آیا؟"

"خوب ہے مکمل کر دیجئے"

"جب لکھا ہے تو مکمل کرنا پڑے گا مگر یہ افسانہ اپنی نوعیت کا واحد افسانہ ہے۔ دیکھئے کیونکر مکمل ہوتا ہے!"

شیریں ایک تصویر دیکھ رہی تھی "مجھے یہ تصویر بہت پسند ہے بھائی جان!" اس نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جب جاؤ لے جانا"

"شکریہ . . . آپ بڑے مہربان ہیں بھائی جان!"

"تم تو جا رہی ہو!"

"اب نیند آ رہی ہے . . . شاید آپکو نیند نہ آ رہی ہو۔ آخر افسانہ نگار جو ہیں"

"گویا افسانہ نگار کو نیند نہیں آتی"

"اگر آتی ہے تو چپکے سے سو جائیے" یہ کہکر شیریں نے مسکرا کر تنویر کو دیکھا۔ اور باہر نکل گئی۔!

اس واقعے کے بعد شیریں کی طبیعت میں بظاہر وہی شوخی، وہی شرارت تھی تاہم وہ بے تکلفی جس کا مظاہرہ وہ تنویر کے سامنے کیا کرتی تھی۔ اب ایک حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہ دو دن اور وہاں رہی پھر جالندھر واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد تنویر کو دنیا تاریک نظر آنے لگی۔ آخر اس تاریک دنیا میں روشنی کی ایک کرن چمکی یعنی تنویر کی شادی ہو گئی۔

(۴)

سعیدہ تنویر کی وفادار بیوی ہی نہیں بلکہ اس کی پرستار بھی تھی۔ اس کے وفادارانہ جذبات کا اقتضا تھا کہ وہ تنویر کی مسرت و غم کو اپنی مسرت و غم سمجھے اور اس کے پرستارانہ جذبات مقتضی تھے کہ وہ تنویر کو ایک پجارن کی طرح پوجے۔ اور وہ دونوں فرض ادا کر رہی تھی۔ تنویر سب کچھ دیکھنے کے باوجود خاموش اور گم سم نظر آ رہا تھا۔ ذہنی کشمکش کے لحاظ سے وہ درخت کے اس پتے کی مانند تھا جو شاخ سے ٹوٹ کر ہوا کے تھپیڑے کھاتا ہوا کبھی فضا میں کہیں سے کہیں پہنچ جائے اور کبھی ہوا کے تھم جانے پر زمین کے قریب آ جائے۔ اس کی زندگی اپنے دامن میں ایک نئے انقلاب کی پرورش کر رہی تھی۔ اپنے موجودہ حالات پر غور کرتے ہوئے جب اس کی بیوی کا معصوم چہرہ اس کے سامنے آ جاتا تو اس کی زندگی کے ساکن سمندر میں ایک تلاطم بپا ہو جاتا۔ مگر یہ تلاطم چند لمحوں کے بعد سطحِ آب پر چند حقیر بلبلے چھوڑ کر غائب ہو جاتا۔ پھر شیریں کی یاد طوفان بنکر آتی۔ مگر یہ طوفان بھی کچھ دیر گذر جانے پر، چند کمزور لہروں کی صورت اختیار کر لیتا۔ سعیدہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا عزیز شوہر غمگین رہتا ہے کیوں؟ یہ ایک راز تھا جس سے وہ قطعاً آشنا نہیں تھی تاہم اس کی پُرجوش محبت میں ذرہ بھر کمی نہیں ہوئی تھی۔

شادی سے دو مہینے پیشتر تنویر نے شیریں کو ایک طویل خط لکھا تھا جس میں طوفانی جذباتِ محبت کے اظہار کے بعد تحریر کیا تھا "شیریں! تم جان بوجھ کر انجان بن رہی ہو تم نے مجھے بھلا دیا مگر میں تمہیں نہیں بھلا سکتا۔ میں تمہیں صاف طور پر بتائے دیتا ہوں کہ اگر میری بیتابانہ محبت کی یہی حالت رہی تو زندگی میرے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائے گی!" اسکے جواب میں شیریں نے اس کی ہونے والی بیوی کی بے شمار خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے جلد شادی کرنے پر اصرار کیا تھا۔

شادی ہو گئی اور ایک سال بھی گزر گیا۔ اس اثنا میں نہ تو تنویر نے شیریں کو کوئی خط بھیجا اور نہ شیریں نے تنویر کو کچھ لکھا۔ ایک دن شام کے

وقت تنویر کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اسکے نام ایک تار آیا جس میں لکھا تھا "اصغر علی فوت ہوگئے ہیں" یہ الفاظ پڑھتے ہی تنویر کی رگوں میں خون کی گردش دم بھر کے لئے سست ہوگئی۔ سید اصغر علی یعنی شیریں کے شوہر کی وفات اسے ایک معجزہ معلوم ہوئی۔ اسی شام کو وہ بیوی کے ساتھ جالندھر روانہ ہوگیا۔ شیریں کی آنسو بھری آنکھوں نے اپنی مصیبت کا اظہار کیا۔ اور تنویر کی ہمدرد نگاہیں پیام تسکین دینے لگیں۔ کون جانتا تھا کہ ان ہمدرد نگاہوں کے پیچھے ایک اور جذبہ بھی انگڑائیاں لے رہا ہے!

چند دن ٹھہر کر تنویر اور سعیدہ واپس آگئے۔ آتی دفعہ تنویر نے شیریں سے وعدہ لے لیا کہ وہ ایک آدھ ماہ کے بعد انکے ہاں آئے گی۔ جس دن شیریں آئی تنویر بہت خوش تھا اور چونکہ حیاتِ ازدواجی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ سعیدہ نے تنویر کو مسرور دیکھا تھا۔ اس لئے وہ بھی بے حد خوش تھی۔

شیریں کو آئے ہوئے پانچ دن گذر چکے تھے۔ اس اثنا میں سعیدہ کو شیریں سے کافی محبت ہوگئی تھی تقریباً ہر روز شام کے وقت تنویر سعیدہ اور شیریں سیر کو جاتے تھے۔ آج بھی سیر کی تیاریاں ہو رہی تھیں سعیدہ کی طبیعت خراب تھی۔ اس لئے اس نے چلنے سے معذرت کرلی۔ شیریں نے بھی سعیدہ کی ناسازیٔ طبع کو بہانہ بنا کر انکار کرنا چاہا مگر تنویر کے اصرار کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ دونوں تانگے میں بیٹھ گئے۔ رسمی باتیں ہونے لگیں۔ یہاں تک ان کا تانگہ آبادی سے دور نکل گیا۔ دونوں تانگے سے اترے اور ایک ویران رستے پر چلنے لگے۔

آسمان کی وسعتوں سے تاریکی کے کثیف بادل گر رہے تھے۔ مغرب کے خونیں گوشے میں افسردہ رو آفتاب طوفان کی سہمگیں موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر ڈوبتے ہوئے جہاز کی مانند غروب ہو رہا تھا۔ تنویر کی نگاہیں قریب ایک درخت پر جمی تھیں۔ یکایک اس نے شیریں کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ ایک کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور دوسرے کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"شیریں" تنویر نے مدہم آواز میں کہا۔

"کیوں تنویر؟"

"حیرت ہے حالات نے کس طرح پلٹا کھایا ہے۔"!

"کونسے حالات نے؟"

"ہمارے حالات نے شیریں! میری تمنائیں خاک میں مل چکی تھیں مگر حالات کے تغیر نے مردہ آرزوؤں میں پھر خونِ حیات دوڑا دیا ہے" یہ کہتے ہوئے اُس نے شیریں کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ شیریں ٹکٹکی باندھے دور ایک جھونپڑی کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا اب بھی تم مجھے مایوس کر دوگی شیریں؟"

شیریں خاموش رہی۔

"تم بولتی کیوں نہیں شیریں؟"

"تم جو بول رہے ہو میرے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"!

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اب بھی میرے جذبات سے کھیل رہی ہو!"

شیریں کے چہرے کا رنگ اور متغیر ہوگیا اور اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے تنویر! میں نہ تو تمہارے جذبات کے ساتھ کھیلتی رہی ہوں اور نہ اب کھیل رہی ہوں۔ حالات بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ اس میں نہ میرا قصور ہے اور نہ تمہارا"!

"تو پھر... میں کیا سمجھوں؟ میری دنیا تاریک ہی رہے گی!"

"تمہاری دنیا کیوں تاریک ہونے لگی!"

"اب مذاق نہ کرو شیریں! تم میری تھیں... کیا اب پھر میری..."

"میں تمہاری ہوں... مگر تم میرے نہیں ہوسکتے" شیریں نے کہا۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہوگئی تھیں۔

"تم میری ہو شیریں میری... ہم جدا نہیں ہوسکتے" یہ کہتے ہوئے محبت سے مخمور تنویر نے شیریں کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ ایک دو لمحے شیریں بے حرکت کھڑی رہی... پھر آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ اُٹھنے لگے اور تنویر کی گردن میں حمائل ہوگئے!

گھنٹوں سرمستِ محبت وصیں محبت کے راز و نیاز میں محو رہیں!

یکایک شیریں اُٹھ بیٹھی "اب ہمیں چلنا چاہئے" اسکے لبوں سے نکلا

تنویر بدل ناخواستہ اٹھا۔ اور وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے ان کا ٹانگا گلشن روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے دو موٹریں آئیں۔ ایک تو ٹانگہ کے پاس سے گذر گئی اور دوسری گھوڑے کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ گھوڑا بدکا۔ تنویر نے شیریں کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر دونوں گر پڑے۔ تنویر کو دو تین زخم آئے مگر شیریں کو کافی چوٹیں پہنچیں۔ گھر پہنچکر تنویر نے شیریں کو پلنگ پر لٹا دیا۔ اور سعیدہ اور وہ شیریں کے زخموں کی دیکھ بھال کرنے لگے۔

رات کے آخری حصے میں شیریں کو بخار ہو گیا یہی نہیں بلکہ اس پر نیم بیہوشانہ کیفیت بھی طاری ہو گئی۔ سعیدہ اور تنویر دونوں نے جاگ کر رات کاٹی۔ صبح کے وقت مریضہ کی حالت خطرناک حد تک اختیار کر چکی تھی۔ یہ دیکھکر تنویر مضطرب ہو گیا۔ وہ سعیدہ کو شیریں کے پاس چھوڑ کر ڈاکٹر کو لینے چلا گیا پانچ چھ منٹ کے بعد سعیدہ نے محسوس کیا کہ شیریں کے لبوں کو جنبش ہو رہی ہے۔ وہ یہ سمجھی کہ مریضہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنا چہرہ شیریں کے لبوں کے قریب لیجا کر اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ مریضہ کی آنکھیں بند تھیں مگر اس کے ہونٹوں سے ایک کمزور آواز یہ کہتے ہوئے نکل رہی تھی "تنویر! میرے تنویر! تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی پیارے تنویر! تم بھی تو گرے تھے!" سعیدہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے دل کو دھچکا سا لگا اور اس کا چہرہ صبح کے بے نور مضمحل اور افسردہ چاند کی مانند نظر آنے لگا۔ آہ وہ رنگین تمنائیں جنکے نشہ آلود آغوش میں اس کی زندگی ایک سپنا بنکر رہ گئی تھی اب اس کے سامنے دو کمزور مرجھائے ہوئے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کے درمیان بے رحمانہ کچلی جا رہی تھیں کئی لمحے وہ حیران، گم سم، بے حرکت کھڑی رہی۔ یکایک مریضہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی طرف بڑھنے لگا۔ سعیدہ نے بعجلت اپنا ہاتھ اس کے سینے سے اٹھایا۔ اور منہ موڑ کر دیوار پر، روشندان کے سبز شیشے کے پرتو پر نگاہ جما دی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا زہر کے ذرے اس کے تمام جسم میں تحلیل ہو گئے ہیں! مریضہ نے زور سے سانس لیا۔ سعیدہ نے مڑکر اُسکے چہرے کو دیکھا۔ پھر کھڑکی پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اچانک قریب سے آواز آئی "ڈاکٹر آ رہے ہیں" یہ الفاظ کہنے والا تنویر تھا۔ سعیدہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور لحاف میں منہ چھپاکر زار و قطار رونے لگی۔ اس دن وہ کمرے سے باہر نہ نکلی۔ تنویر تنہا مریضہ کی خبرگیری کرتا رہا۔ شام کے وقت وہ سعیدہ کے کمرے میں آیا۔ اس وقت بدنصیب عورت ٹھوڑی کو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے بیٹھی تھی۔

"کیا بات ہے سعیدہ!" تنویر نے بیوی کے اس رویے کے متعلق استفسار کیا۔

سعیدہ نے حسرت ناک نظروں سے شوہر کو دیکھا اور مضمحل آواز میں کہا "طبیعت ٹھیک نہیں!"

"بڑے افسوس کی بات ہے تمہیں اپنی طبیعت کی معمولی سی خرابی کا خیال پیدا ہو گیا اور یہ نہ دیکھا کہ ایک عزیز مہمان شدید بیماری کے پنجے میں جکڑا پڑا ہے" تنویر نے خفگی سے کہا۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔!"

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔ . . میں سب کچھ کروں گا!" یہ کہکر تنویر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں . . . درست ہے" سعیدہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ اور اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں!

تنویر رات بھر مریضہ کے پہلو میں بیٹھا رہتا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیریں کی تیمارداری اس کی زندگی کا اہم ترین محبوب ترین فرض ہے، پانچ چھ دن کے بعد سعیدہ بھی شیریں کی تیمارداری کرنے لگی چند دن گزرنے پر شیریں کی صحت میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اور وہ اُٹھ کر چلنے پھرنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت بدلتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک ماہ کے بعد اس کی صحت بحال ہو گئی!

(۵)

تنویر سو کر اٹھا ہی تھا کہ اس کا خادم ایک لفافہ لئے ہوئے اندر آیا تنویر نے پتے کی تحریر ہی سے پہچان لیا کہ یہ شیریں کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ ایک مبہم سا خوف اُسکے دل پر طاری ہو گیا۔ اور اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے لفافے کو چاک کیا۔ اور خط کو پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔

میرے تنویر!

تم متعجب ہو گئے کہ میں تمہیں اطلاع دیئے بغیر کیوں جالندھر چلی آئی۔ واقعی یہ بات تعجب انگیز ہے لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور تھی کیوں مجبور تھی۔ اس کا جواب یہ ذیل سطور دیں گی! میرے تنویر! آج میں تمہارے سامنے اپنی زندگی کا وہ گوشہ بے نقاب کرتی ہوں جس سے تم بے خبر ہو! آہ وہ زمانہ مجھے کبھی بھی نہیں بھولا جب ہم بچے تھے۔ جب ہم بچوں کی طرح کھیلا کرتے تھے۔ یہ زمانہ کتنا سہانا! کتنا دلآویز تھا۔ اس کا اندازہ ہم دونوں کے دل ہی لگا سکتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پریم ساگر میں ہماری جیون نیا نے بہنا شروع کیا جب ہمارے لئے محبت کے حسین جادو نے کائنات کے گوشے گوشے کو حسین بنا دیا تم میرے لئے بیتاب رہتے تھے اور میں تمہارے لئے بے چین! اس کے بعد نوجوانی کا زمانہ آیا۔ ہماری محبت میں زیادہ بیتابی پیدا ہو گئی۔ بچپن میں ہم ایک دوسرے کو اس لئے چاہتے تھے۔ کہ آپس میں کھیلیں ایک دوسرے سے روٹھیں! ایک دوسرے کو منائیں۔ مگر نوجوانی میں ہماری آرزو تھی کہ زندگی کے ہر شعبے میں! کائنات کے ہر گوشے میں ایک دوسرے کے رفیق بنیں! ہماری یہ آرزو کوئی نرالی آرزو نہیں تھی۔ محبت کرنے والے دلوں کے ساز سے اسی آرزو کا نغمہ بلند ہوتا رہتا ہے۔ اس اثنا میں تم ولایت چلے گئے۔ اور وہاں جا کر مجھ کو بھول گئے۔ گھر والوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ تم نے ایک میم کو رفیقہ حیات بنا لیا ہے۔ میرے والدین نے میری شادی کر دی۔ مگر وہ زخم جو میرے دل پر لگا تھا کبھی بھی مندمل نہ ہو سکا۔ بظاہر میں تمہیں بھول گئی مگر میرا دل کبھی بھی تمہیں نہ بھلا سکا۔ تم واپس آئے۔ جن لوگوں نے تمہارے متعلق افواہ اڑائی تھی۔ وہ شرمندہ ہوئے۔ مگر ان کے اظہار افسوس! شرمندگی سے کیا ہو سکتا تھا؟ دنیا کی رائے بدل گئی۔ مگر ہماری قسمت نہیں بدل سکتی تھی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب واقعات ایک اور صورت اختیار کرتے ہیں۔ ولایت سے آنے کے بعد نہ تم نے مجھے بلایا اور نہ میں نے آنا چاہا۔ آخر میں آئی میں نے اپنے دل کو قابو میں رکھا اور تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی اس امر کا اندازہ نہ ہونے دیا کہ تم سے علیحدہ ہو کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ تم نے مجھے افسانہ سنایا میں سب کچھ سمجھ گئی۔ تمہارے افسانے کے ایک ایک لفظ نے نشتر بن کر میرے زخم خوردہ دل کو چھیدا۔ اس وقت بھی میں نے ضبط کیا۔ آہ عورت بھی کیا عجیب ہستی ہے۔ اس کا دل زخموں سے بھرپور ہوتا ہے لیکن اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ نہیں جاتی۔ پھر میں جالندھر چلی آئی۔ اس کے بعد تمہیں یاد ہے میں نے تمہاری شادی پر خاص زور دیا تھا تاکہ تم مجھے بھلا سکو۔ اس سے پیشتر تمہارا خط بھی آیا تھا جس میں تم نے گذشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی محبت کا بیباکانہ اظہار کیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے ضبط کیا۔ تمہاری شادی ہو گئی۔۔۔ اس کے بعد تقدیر واقعات کو عجیب پلٹا دیتی ہے میرا رفیق زندگی دنیا سے سفر کر گیا تم نے مجھے بلایا۔ میں تمہارے ہاں چلی گئی پھر وہ ہوا جو نہ ہونا چاہئے تھا میں نے تمہیں سعیدہ سے چھین کر ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔ محبت کرنے والے دل کی مصیبت کا اندازہ وہی دل لگا سکتا ہے۔ جو خود محبت میں مبتلا ہو۔ میں سعیدہ کی مصیبت کو خوب سمجھتی ہوں میں خوب جانتی ہوں کہ اپنی محبت کی ناکامی کو دیکھ کر اس کے دل پر کتنے چرکے لگتے ہیں۔ آہ میں نے اسے کئی بار آنسو بہاتے ہوئے دیکھا ہے۔ کمزور فطرت عورت آنسو نہ بہائے تو اور کیا کرے؟ یہ دیکھ کر میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا میں چاہتی ہوں کہ اس کے راستے سے ہٹ جاؤں اور صرف ایک ہی چیز مجھے اس کے راستے سے ہٹا سکتی ہے اور وہ ہے موت! میں اپنے آپ کو موت کے سپرد کر رہی ہوں! تنویر مجھے معاف کر دو!۔۔۔ معاف کر دو! تم سعیدہ کے ہو اور سعیدہ تمہاری! خدا کی قسم سعیدہ جیسی نیک دل اور نیک سیرت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ وہ تمہیں بیتابانہ چاہتی ہے۔۔۔ تمہاری پرستش کرتی ہے۔ تم بھی اسے چاہو، اپنا دل و جگر اس کے لئے وقف کر دو۔ خدا کرے تم ہمیشہ ہمیشہ مسرور زندگی بسر کرو۔ تم کو، سعیدہ کو میرا آخری سلام اس وقت کہ آخری حروف لکھ رہی۔ میری زندگی کے چند سانس رہ گئے ہیں اور وہ بھی تمہارے لئے دعا کرتے ہوئے نکلیں گے! جس وقت تمہیں یہ خط ملے گا۔ میں دنیا سے رخصت ہو چکی ہوں گی۔

الوداع

شیریں

تنویر کے ہاتھ سے کاغذ گر پڑا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ

دروازے کی طرف بھاگا ۔ ۔ ۔ مگر اس کا پاؤں ایک چھوٹے سے میز سے ٹکرایا ۔ اور وہ دھم سے گر پڑا ۔ آدھ گھنٹے کے بعد جا کر اُسے ہوش آیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک متلاطم سمندر کے کنارے کھڑا ہے " شیریں نے حقیقت لکھی ہے یہ حقیقت ہوسکتی ہے " یہ سوال آتشیں حروف کی صورت میں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا ۔ اس نے فرش پر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی ۔ مگر شیریں کا خط اُسے نظر نہیں آتا تھا ۔ اچانک میز پر ایک لفافہ نظر آیا ۔ اس نے جلدی سے لفافہ اٹھایا اُسے کھولا ۔ اسمیں لکھا تھا ۔

میرے تنویر !

آج میں آخری بار تمہیں میرے تنویر سے خطاب کر رہی ہوں ! میں نے انتہائی کوشش کی کہ تم میرے ہو مگر یہ میری قسمت میں نہیں تھا ۔ شادی کے بعد میں نے تمہیں غمگین ہی دیکھا ۔ میں بہتیرا سوچتی تھی آخر تم غمگین کیوں ہو آخر راز کھل گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے سمجھ لیا تم میرے نہیں بن سکتے کیونکہ کسی اور کے بن چکے تھے ۔ کاش میں شیریں کی قسمت لیکر آتی !!

آج میں جا رہی ہوں ! کہاں ؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتی ۔ مگر یہ جانتی ہوں کہ تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی ہوں ! خدا کرے تم اور شیریں دم واپسیں تک مسرور رہو !

بدنصیب

' سعیدہ '

تنویر کو مکان گردش کرتا ہوا معلوم ہوا ۔ اسکا سانس رکا ہوا تھا یکایک اس کی نظر انگیٹھی کے قریب شیریں کے خط پر پڑی ۔ اس نے خط کو اٹھا لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دونوں خطوں کو دیکھنے لگا ۔

صبح کی کرنیں روشندانوں اور کھڑکیوں سے اندر داخل ہو رہی تھیں تنویر ایک ہاتھ میں شیریں کا خط اور دوسرے ہاتھ میں سعیدہ کی تحریر پکڑے انگیٹھی کو دیکھ رہا تھا جس میں آگ بجھ چکی تھی ۔۔۔ !

جناب خلیق قریشی منشی فاضل ۔

غزل

جبینِ شوق کے سجدے لٹا رہا ہوں دوست
تمہارے در پہ نصیب آزما رہا ہوں دوست

تمہاری یادِ محبت نواز سے دل میں !
تصورات کی محفل سجا رہا ہوں دوست

ہوئی ہے رشکِ جناں دل کی خانہ آرائی
تخیلات کی شمعیں جلا رہا ہوں دوست

نہیں ۔ تمہارا تبسم قصور وار نہیں
میں خود فریبِ تمنا میں آ رہا ہوں دوست

نہ پوچھ کیفِ شباب و شراب و شعر و سخن
ترے لئے نئی دنیا بسا رہا ہوں دوست

نگاہِ مست پہ کر کے بہانے ہوش فدا
متاعِ عشق جنوں خیز پا رہا ہوں دوست

خلیق ! وجد میں آئی ہوئی ہے بزمِ جہاں
وہ گیت تیری محبت میں گا رہا ہوں دوست

محترمہ گوہر اقبال حور

"نقش غم"

محترمہ گوہر اقبال حور صاحبہ کا ماموں زاد بھائی ریل کے تصادم سے جاں بحق تسلیم ہو گیا تھا۔ یہ نظم اس حادثۂ المیہ کے تاثرات لئے ہوئے ہے!

ایڈیٹر

نظام زندگی فانی خمار مرگ بھی فانی
الٰہی! کس قدر مجبور ہے تقدیر انسانی!

بہار نوجواں پر گر پڑی برق فنا شیوہ
ارے، دست خزاں سے شاخ گل کی چاکدامانی

اچانک ریل کے طوفاں نے آکر دیئے ٹکڑے
ہوئی تھی یوں مقدر جسد خاکی کو پریشانی

کفن میں منہ چھپائے نوجوانی زیر مدفن ہے
خمار مرگ سے ہے زیست کو کیسی پشیمانی

اجل کو کچھ ترس آیا نہ اس کی نوجوانی پر
ملا کر خاک میں اس کو کیا یوں نذر ویرانی

یہ سن ستیس اپنے ساتھ اس کو لے گیا آخر
اَلا اے گردش دوراں اترا ذوق ستم رانی

وہ اس بستی میں ہے جسکو تصور چھو نہیں سکتا
اور اسکی موت سے صبح جہاں ہے شام حیرانی

سماعت میں مری اب بھی ہیں اسکے کیف زا نغمے
مری آنکھوں میں ہے اسکے لبوں کی غنچہ سامانی

ابھی معصومیت اور سادگی کے نقش باقی ہیں
وہ ہستی ہو گئی نذر اصول محفل فانی

جوانی اور مرگ ناگہانی! ضبط دے یارب!!
یہ ایسا غم ہے اب جسکی نہ جائے گی پریشانی

وہ تیری رحمتوں کے گلکدے میں سو رہیگا یارب!
ہمیشہ میرا دل مرگ جواں پر رو رہیگا یارب!!

نوشتہ ہرمون سڈرمین (جرمن افسانہ نگار) مترجمہ جناب احسان علی شاہ احسان بی۔ اے

"اقبالِ گناہ"

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے عزیزہ! کہ میں ایک دفعہ پھر اطمینان سے باتیں کرنے کے لئے آپ کے پاس بیٹھ سکا ہوں تعطیلات کا شور و شغب ختم ہوچکا ہے۔ اور آپ میری گفتگو سننے کے لیے وقت نکال سکتی ہیں۔

آہ! یہ بڑے دنوں کا زمانہ! میرا ایمان ہے کہ کسی کینہ توز روح نے ان دنوں کو ہم غیر شادی شدہ نوجوانوں کو پریشان کرنے اور ہماری خانہ برباد زندگی کے بے رنگ پہلوؤں کو خاص طور پر ابھارنے کے لئے بنا دیا ہے۔ یہ دن دوسروں کے لئے تو باعثِ مسرت و راحت ہیں لیکن ہمارے لئے مصیبت خیز و دردناک ہیں۔ ہاں! میں جانتا ہوں کہ ہم دنیا میں بالکل اکیلے بھی نہیں۔ ۔ ہم بھی دوسروں کو خوش کر کے بے پایاں مسرت حاصل کر سکتے ہیں اور یہی ایک ایسی مسرت ہے جو حقیقت میں زمانۂ سیر و تفریح کی روحِ رواں ہے۔

میں کیوں اپنے دل کا سارا راز تمہارے سامنے اگل نہیں دیتا؟ تم پوچھتی ہو۔ تم ہمدردی کی دیوی۔ تم۔ ۔ ۔ تم جو ہمدردی کو اس دریادلی سے استعمال کرتی ہو جس سے تمہاری صنف محروم ہے۔ اس کی بھی وجہ ہے تمہیں یاد ہے کہ "سپیڈیل" نے اپنی نظم "تنہا چڑیا" میں جو تم نے بڑے دنوں کے بعد مجھے بھیجی تھی۔ میرے خیالات کا کتنا صحیح عکس دکھایا ہے۔ "ایک غیر شادی شدہ نوجوان" وہ کہتا ہے "آرام و راحت کا خواہشمند نہیں ہوتا وہ اپنی پریشانیوں سے اکتسابِ مسرت کرتا ہے۔"

ایک اور قسم کے مجرد بھی ہوا کرتے ہیں جو عرفِ عام میں گھرانے کے دوست کہلاتے ہیں۔ اس سے میرا مطلب اُن لوگوں سے نہیں ہے۔ جو خاندانوں کو تباہ کرنے کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور جن کی آنکھوں میں آتشدان کے قریب آرام کرسی پر بیٹھتے ہی حسد و کینہ کے سانپ لہرانے لگتے ہیں۔ میرا مطلب ایسا کے اس تم مکتب سے ہے جو گھر میں چچا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو ننھے بچے کو گود میں لے کر اس وقت لوریاں دینے لگتا ہے۔ جب بچہ اپنی والدہ کو کسی رسالے میں سے قابلِ گرفت فقروں کو چھوڑتا ہوا کوئی مضمون سناتا ہے۔

میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے اپنے دوست کے خاندان کی خدمت کرنے میں اپنی عمریں گذار دیں۔ ایسے آدمی جو ایک ایسی حسینہ کے پہلو میں کوئی خواہش محسوس کئے بغیر برسوں بیٹھے رہے۔ جس کو وہ پرستارانہ عقیدت کے ساتھ چاہتے تھے۔

کیا تمہیں شک ہے؟ شاید کسی خواہش کو محسوس کئے بغیر میں نے تمہیں پریشان کیا ہے۔ ممکن ہے تمہارا قیاس صحیح ہو۔ بہترین دل و دماغ میں بھی کوئی نہ کوئی بدترین خواہش پوشیدہ ہوتی ہے۔ ۔ ۔ میرے الفاظ پر غور کرو۔ ۔ ۔ لیکن یہ خواہش زنجیروں میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے۔

کل سالِ نو کی رات تھی۔ دو بڈھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے یہ گفتگو آپ کو سناتا ہوں لیکن یہ نہیں بتاؤں گا کہ یہ ساری گفتگو کن ذرائع سے مجھ تک پہنچی۔ یہ عرض کر دینا ضروری ہے۔ کہ اسے کسی اور کو بتایئے گا نہیں۔

اس کہانی کے پس منظر کے لئے پہلے اس تصویر کو ذہن نشین کر لیجئے:

ایک اونچی چھت والا کمرہ جو پرانے طرز پر آراستہ کیا گیا ہے۔ اس میں ایک سبز رنگ کے شیڈ والا ایسا معلق لیمپ جل رہا ہے۔ جو بجلی کی ایجاد سے پہلے ہمارے باپ دادا استعمال کیا کرتے تھے۔ روشنی کے دھبے لیمپ کی کپکپاتی ہوئی لو میں سے نکل نکل کر ایک بڑی میز پر پڑ رہے ہیں

میز پر سفید میز پوش ہے اور سامانِ خورد و نوش سے ڈھکی پڑی ہے میز کے وسط میں بڑے بڑے دھبے نمایاں ہیں۔

دونوں بوڑھوں کا نصف جسم لیمپ کے سائے میں ہے۔ اور یہ دونوں کیڑے ساعد رعشہ زدہ آدمی . . . گذرے ہوئے زمانے کی حسرت خیز داستان . . . دھندلی دھندلی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ میزبان پرانے زمانے کا "فوجی" آدمی ہے جو اپنی نوکدار داڑھی تنی ہوئی مونچھوں اور تحکمانہ بردست فوراً پہچانا جاتا ہے۔ وہ گھومنے والی کرسی کے بازو کو بڑی مضبوطی سے پکڑے۔ بالکل بے حس و حرکت بیٹھا ہے صرف اسکے جبڑے حرکت کر رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ چبانے میں مصروف ہے۔ دوسرا شخص اسکے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھا ایک ٹوٹے پھوٹے پائپ سے جو بجھنے کے قریب ہے۔ ہلکے ہلکے کش لے رہا ہے۔ یہ دراز قد اور چھریرے بدن کا آدمی ہے۔ اسکا سینہ چھوٹا، پیشانی مفکروں کی پیشانی کی طرح ابھری ہوئی اور سر بڑا سا ہے۔ اس کے جھریوں سے بھرے ہوئے بے رونق چہرے پر جس پر برف جیسی سفید لکیروں کا ہالہ سا بنا ہوا ہے۔ ایک خاموش تبسم رقصاں ہے ایسا تبسم جو بڑھاپے میں افکار سے نجات ملنے پر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

دونوں خاموش تھے۔ تیل جلنے کی دھیمی گراکر کش لگانے کی بہت ہی ہلکی سرسر سے ملکر کمرے کے سکوت میں ایک لطیف ارتعاش سا پیدا کر رہی تھی۔ پس منظر کی تاریکی میں چھپے ہوئے کلاک نے بلند آواز سے نو بجنے کا اعلان کیا۔

"اسی وقت وہ پنچ بنانا شروع کیا کرتی تھی" کشادہ پیشانی والے بوڑھے نے کہا۔

"ہاں! اسی وقت" دوسرے نے دہرایا۔ اس کی گفتگو کا لہجہ قدرے درشت تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحکمانہ انداز ابھی اسمیں باقی ہے۔

"میں کبھی بھی یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ اسکے بغیر اتنی اداسی پیدا ہو جائے گی" پہلے نے کہا میزبان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسکے جبڑے بدستور متحرک تھے۔

"پچیس دفعہ میں نے اُس کے ہاتھ سے بنا ہوا پنچ پیا ہے" اس کے دوست نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہیں تو تم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یاد ہے نا!" بوڑھے فوجی نے کہا۔

"پچھلے سال ہم کس قدر خوش تھے" دوسرے نے کہا "وہ اس آرام کرسی پر بیٹھی پال کے لئے جرابیں بُن رہی تھی۔ وہ اس کام میں بڑی سرگرم نظر آتی تھی اور کہتی تھی کہ وہ اسے بارہ بجے تک ختم کر دے گی۔ اور اس نے ختم کر کے دکھا دیا۔ پھر ہم نے پنچ پیا۔ اور نہایت اطمینان سے موت کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اسکے دو ہی مہینے بعد وہ چل بسی۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں نے "بقائے خیال" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ تم نے کبھی اُسے غور سے نہیں پڑھا . . . اب تمہاری بیوی کی موت نے اس کتاب کی وقعت میری نظروں سے بھی گرا دی ہے۔ اب تو "دوتشکیل عالم" کا تخیل ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے"

"ہاں وہ اچھی جورو تھی" مرحوم بیوی کے شوہر نے کہا "اُسے میرے آرام کا بہت خیال رہتا تھا۔ جب مجھے صبح پانچ بجے ملازمت پر جانا ہوتا تو وہ چائے تیار کرنے کے لئے مجھ سے بھی پہلے بیدار ہو جایا کرتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسمیں خامیاں بھی تھیں جب وہ تمہارے ساتھ فلسفیانہ بحث میں الجھ جاتی تو . . . . "

"تم اسکے جذبات کو کسی وقت بھی نہ سمجھ سکے" دوسرے نے بڑبڑا کر کہا۔ اسکے ہونٹوں کے گوشوں پر ضبط کئے ہوئے غصے کی ایک ہلکی سی کپکپاہٹ ظاہر ہوئی لیکن وہ نگاہ جو اسکے دوست کے چہرے پر جمی ہوئی تھی ہمدردی اور افسوس سے لبریز تھی۔ گویا پوشیدہ گناہ اس کی روح کی گہرائیوں میں خلش پیدا کر رہا ہے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

"فرانز! مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔ ایسی بات جو ایک مدت سے مجھے دکھ دے رہی ہے۔ اور جس کو ظاہر کئے بغیر میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"تو کہہ ڈالو" میزبان نے کرسی کے قریب پڑے ہوئے ایک بڑے سے پائپ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ایک دفعہ تمہاری بیوی اور میرے درمیان . . . کچھ بات . . . . ہوئی تھی۔"

میزبان کے ہاتھوں سے پائپ گر گیا۔ اس نے حیرت انگیز کھلی ہوئی آنکھوں سے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔

"یہ مذاق کا موقع نہیں ہے ڈاکٹر!" اُس نے متانت سے کہا۔

"یہ ایک تلخ حقیقت ہے فرانز!" دوسرے نے جواب دیا "میں اسے پورے پچیس سال سے اپنے دل کے آخری گوشے میں اٹھائے پھرا ہوں اب اس کے اظہار کا وقت آپہنچا ہے۔"

"کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ . . . کہ مرحومہ نے میرے ساتھ بیوفائی کی" خشمناک خاوند نے گرج کر کہا۔

"شرم کرو فرانز!" اس کے دوست نے نرم اور افسوس میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ بوڑھے فوجی نے کچھ زیر لب کہا اور اپنا پائپ سلگانے لگا۔

"وہ تو فرشتوں کی طرح پاکدامن تھی" دوسرے نے کہا۔ "ملزم ہم دونوں ہیں۔ سنو! پچیس سال گذر چکے ہیں۔ تم نئے نئے برلن میں آئے تھے۔ اور اس زمانے میں میں یونیورسٹی میں پروفیسر تھا تم اُس زمانے میں عیاش مزاج نوجوان تھے۔ تمہیں یاد ہے؟"

"ہوں" میزبان نے کانپتا ہوا ہاتھ اپنی مونچھوں پر پھیرتے ہوئے کہا "اُس زمانے میں ایک حسین فتنہ ایکٹرس کی صورت میں یہاں وارد ہوا۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں اور چھوٹے چھوٹے موتیوں جیسے چمکدار دانت۔ یاد ہے؟"

"ہاں ہاں! اسکا نام بیانکا تھا" دوسرے نے جواب دیا اور ایک اداس مسکراہٹ اسکے مرجھائے ہوئے چہرے پر چھا گئی "یقین جانو وہ چھوٹے چھوٹے موتیوں جیسے دانت کاٹ کھانے کے لئے بڑے تیز تھے" "تم نے اپنی منکوحہ بیوی سے دغا کی۔ اور اُسے اس کا علم ہو گیا۔

لیکن وہ خاموش رہی۔ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی رہی۔ والدہ محترمہ کی وفات کے بعد وہ پہلی عورت تھی جس نے میری نظروں میں وقعت حاصل کرلی تھی۔ وہ میری زندگی میں ایک چمکدار ستارے کی طرح داخل ہوئی اور میں اس کی طرف اس پرستارانہ عقیدت سے دیکھتا جس سے انجم پرست کسی ستارے کی طرف دیکھتے ہیں میں نے اس کی تکلیف دریافت کرنیکی جسارت کی۔ وہ مسکرائی اور بولی کہ اس کی صحت ابھی تک بحال نہیں ہوئی۔ تمہیں یاد ہوگا یہ واقعہ تمہارے پال کی پیدائش سے کچھ ہی دنوں بعد ہوا۔ پھر سال نو کی پہلی رات آئی میں حسب دستور آٹھ بجے یہاں آگیا۔ وہ طلا کا ڈھر رہی تھی اور میں اُسے کتاب سناتا رہا۔ ہم اس طرح تمہارا انتظار کرتے رہے گھنٹے کے بعد گھنٹہ گذرتا گیا لیکن تم نہ آئے میں نے دیکھا کہ وہ زیادہ مضطرب ہوئی جاتی ہے۔ اور آخرکار وہ کانپنے لگی۔ میں بھی کانپنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ تم کہاں ہو۔ مجھے ڈر تھا کہ اُس عورت کی نشہ خیز آغوش میں تم وقت کی رفتار کا اندازہ نہ کرسکو گے۔ ایک تھکا دینے والی خاموشی بھاری بوجھ کی طرح کمرے کی فضا پر مسلط تھی۔ پھر میں نے ایک چھوٹے سے خوبصورت آنسو کو اس کے پپوٹوں تلے سمٹتے دیکھا جو ایک سیکنڈ کے لئے اس کی خوبصورت لمبی لمبی پلکوں کی نوکوں پر تھرتھرایا اور پھر اُس کپڑے پر گر پڑا جو اس کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ میں تمہیں ڈھونڈنے کے لئے اچھل کر کرسی سے اُٹھا مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں تمہیں اُس نجس عورت کی سم آلود آغوش سے کھینچ لانے کے قابل ہوں لیکن وہ بھی اچھل کر اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اسی جگہ سے جہاں میں اب بیٹھا ہوں۔

"تم کیوں جا رہے ہو" اس نے روتے ہوئے کہا۔ وہ بہت خوفزدہ معلوم ہوتی تھی۔ "فرانز کو لانے" میں نے کہا۔ اس نے ایک لرزہ خیز چیخ ماری اور بولی "خدا کے لئے تم تو میرے پاس رہو۔ تم تو مجھے نہ چھوڑو۔"

اور پھر وہ لپک کر میری طرف آئی۔ اپنی دونوں باہیں میرے شانوں پر رکھدیں۔ اور اپنے چہرے کو جن پر آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ میرے سینے سے لگا دیا۔ میری رگ رگ کانپ اٹھی۔ میں نے عمر بھر کسی عورت کو اتنا قریب نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میں نے اپنے آپکو قابو میں رکھا۔ اور اسے

تسلی تشفی دینے لگا۔ ۔ اُسے تسلی کی۔۔۔ اشد ضرورت تھی! اسکے تھوڑی دیر بعد تم بھی آگئے۔ تم میرے جذبات کو نہ سمجھ سکے۔ تمہارا چہرہ تمتمایا ہوا تھا تمہاری آنکھیں محبت کے بوجھ تلے بند ہوا ہی چاہتی تھیں اس دن سے میں اپنے آپ میں ایک عجیب تغیر محسوس کرنے لگا۔ ایک ایسا تغیر جس کا خیال کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب میں نے اس کی خوبصورت صندلی باہوں کو اپنے گلے میں حمایل پایا۔ جب اس کے بالوں کی جانفزا خوشبو نے میرے قلب و دماغ میں مدہوشی کی لہریں دوڑا دیں۔ اُس وقت وہ چمکدار ستارہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اختر تاباں اپنے آسمان سے ٹوٹ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک عورت میرے سامنے کھڑی نظر آئی۔ ایک حسین دلربا عورت جس کا ہر سانس مجھے محبت کی دعوت دیتا معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے آپ کو بدمعاش اور فریب کار شخص تصور کرنے لگا۔ اپنے ضمیر کی پیہم لعنت ملامت سے بچنے کے لئے میں نے تمہیں تمہاری معشوقہ سے جدا کر دینے کا اقدام کیا۔ خوش قسمتی سے اُس وقت میرے پاس کچھ نقدی موجود تھی۔ اور وہ ایکٹرس پیش کردہ روپیہ لیکر خوش ہو گئی اور۔ ۔ ۔ "

"اف!" بوڑھے فوجی نے حیران ہو کر کہا: "تو اُس مصیبت آفریں رقعے کی تہ میں تمہارا ہاتھ تھا جو یا نکا نے مجھ کو لکھا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہے۔ باوجودیکہ اس سے اُسے سخت صدمہ ہوگا؟"

"ہاں میرا ہی ہاتھ تھا!" دوست نے کہا "لیکن سنو تو ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس روپے سے میں اطمینان قلب خرید سکوں گا لیکن اس کے باوجود میں اس نعمت سے محروم رہا۔ پریشان خیالات کا طوفان میرے دماغ میں بڑھتا گیا۔ میں اپنے کام میں ہمہ تن ڈوب گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اسی وقت کی بات ہے۔ جب میں اپنی تصنیف بغمئے خیال کے لئے مواد اکٹھا کر رہا تھا۔ تو خیر اس کام نے بھی مجھے وہ چیز نہ دی۔ جس کے بغیر میں دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک مکمل سال گذر گیا۔ اور سال نو کی رات پھر آگئی۔ ایک دفعہ پھر وہ اور میں اسی جگہ بیٹھے تھے۔ اس دفعہ تم گھر پر ہی تھے۔ لیکن دوسرے کمرے میں صوفے پر پڑے سو رہے تھے۔ ایک پُر لطف دعوت نے تمہیں بے حد تھکا دیا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھا اُس کے زرد زرد رخساروں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت اس دن کی یاد ایک طوفان کی طرح میرے دماغ پر پر چھا گئی۔ میں ایک دفعہ پھر اُس کا لطیف خوشبوؤں میں بسا ہوا سر اپنے سینے پر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ایک دفعہ اس کے لعل پاش ہونٹوں سے ایک بوسہ چرانا چاہتا تھا اور پھر۔ ۔ ۔ ۔ پھر تعلقات کا خاتمہ ایک لمحہ کے لئے ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ میں اپنے پوشیدہ سوالات کا جواب اس کی نگاہوں میں رقصاں پاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی غیر مرئی قوت نے میرا دل اس کے سینے میں رکھ دیا ہے۔ اب ضبط میرے احاطۂ قدرت سے باہر تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے قدموں میں ڈال دیا اور اپنا چہرہ جلتا ہوا چہرہ۔ ۔ ۔ اس کی گود میں رکھ دیا۔

میں شاید دو سیکنڈ تک اسی طرح پڑا رہا۔ اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھوں نے میرے سر کو مس کیا اور اس کی مترنم آواز نے ہمدردی کے لہجے میں یہ الفاظ کہے۔ "ہمت سے کام لو پیارے دوست! ہمت سے۔ اپنے اس دوست کو دھوکا نہ دو جو تم پر پورا اعتماد کر کے اُس کمرے میں پڑا سوتا ہے" میں اچھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور بھٹکے ہوئے راہی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے میز پر سے کتاب اٹھائی اور میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں سمجھ گیا۔ اور اسے یونہی کہیں سے کھول کر بلند آواز سے پڑھنے لگا۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے کیا پڑھا۔ کتاب کے حروف میری نگاہوں کے سامنے ناچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن وہ طوفان جو میری روح کی گہرائیوں میں بپا ہو رہا تھا کمزور ہوتا گیا۔ اور جب بارہ بجے تم اونگھتے ہوئے سال نو کی مبارک باد دینے آئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گناہ کا وہ لمحہ گذرے ہوئے زمانے کا ایک دھندلا بلکہ بھولا ہوا واقعہ ہے۔

اُس دن سے میری روح کو سکون حاصل ہو گیا میں جانتا

تھا کہ اس نے میری محبت کو ٹھکرا دیا اور رحم و ہمدردی کے علاوہ مجھے اس سے اور کسی چیز کی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ سالہا سال گذر گئے، تمہارے بچے جوان ہو گئے۔ اور انہوں نے شادیاں کر لیں۔ ہم تینوں بوڑھے ہو گئے۔ تم نے آوارہ مزاجی کو ترک کر دیا...... دوسری عورتوں کو بھول گئے۔ اور اپنی تمام تر توجہ اس بیوی پر مرکوز کر دی جو تیرے جہانِ آرزو کا واحد مرکز تھی۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں اس سے محبت کرنا ہی چھوڑ دوں البتہ میری محبت نے دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ سفلی خواہشات سب مٹ گئیں۔ اور ہماری روحوں میں ایک لافانی رشتہ استوار ہو گیا۔ تم عام طور پر ہم دونوں کو فلسفیانہ مسائل پر بحث کرتے دیکھ کر ہنس دیا کرتے تھے۔ لیکن اگر تم یہ سمجھ جاتے کہ اس وقت ہم دونوں کی روحیں ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہوتی تھیں تو یقین مانو تم سخت ترین حسد میں مبتلا ہو جاتے۔ اب وہ فوت ہو چکی ہے۔ ممکن ہے کہ آنے والے سال تو تک ہم میں سے کوئی راہ فنا اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔ لہٰذا میرے لئے ضروری تھا کہ میں اس راز کو ظاہر کر دوں۔ فرانز! میں تمہارا گنہگار ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

اس نے ملتجیانہ ہاتھ پھیلا دئے لیکن اس کے دوست نے جواب دیا۔

"کیا حماقت ہے یہ۔ معافی وافی کی کیا بات ہے۔ جو کچھ تم مجھے آج بتا رہے ہو اُسے تو میں بہت مدت سے جانتا ہوں چالیس سال پہلے مرحومہ نے خود اس کا اقرار کیا تھا۔ اور میں تمہیں بتا دوں کہ میں بڑھاپے کے آنے تک دوسری عورتوں کے پیچھے کیوں مارا مارا پھرا۔ کیونکہ مرحومہ نے مجھے اُس وقت یہ بتا دیا تھا کہ اس کی محبت کا ایک حقدار ہے اور وہ تم ہو۔"

میزبان کا دوست متحیر نگاہوں سے اس کی طرف تکنے لگا اور کلاک نے اپنے قدیم درشت لہجے میں آدھی رات کا اعلان کیا۔

جناب اثر چکوالی۔ بی۔ اے

قوموں کی زندگی

وہ قومیں عشق سے جن کی نمو ہے
جنہیں جینے کی فکر و جستجو ہے

فریبِ عقل سے آزاد ہیں جو
فقط آزاد کیا، شہزاد ہیں جو

نگاہِ شوق جن کی رہنما ہے
خودی جن کے لئے بانگِ درا ہے

پرے جن سے کوئی دنیا نہیں ہے
زمین و آسماں زیرِ نگیں ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جن کی
صداقت پر ہے جن کا عشق مبنی!

رسائی جن کی مہر و ماہ تک ہے
ہراساں جن کی فطرت سے فلک ہے

مثالِ شمس تابندہ رہیں گی
ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں گی!

جناب منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی۔

غزل

اللہ ری بے کسی کوئی پہچانتا نہیں
حالانکہ میں وہی ہوں کوئی دوسرا نہیں

عصیاں ہیں بے حساب الٰہی تو کیا ہوا
اندازۂ کرم ہے تو تیرے سوا نہیں

ملنے کو تو ملا ہے بہت کچھ مجھے، مگر
تیری عطا کو دیکھتے کچھ بھی ملا نہیں

آخر میں تیری راہ میں کیونکر نہ مر مٹوں
ہمسر ترا جہاں میں کوئی دوسرا نہیں

شبنم گلوں کے کان میں کہتی تھی باغ میں
رونے کا ہے مقام یہ ہنسنے کی جا نہیں

رنج و غم فراق کہیں اور جا بسیں
دل مسکن حبیب ہے مہماں سرا نہیں

میرے گناہ پھر بھی ہیں محدود اے خدا
لیکن ترے کرم کی تو کچھ انتہا نہیں

آئے ہیں تا بحشر جسے ڈھونڈتے ہوئے
دیکھیں تو اس ہجوم میں وہ بھی ہے یا نہیں

ہر دم خیال اُس کا نہ آئے تو کس طرح
آنکھوں سے تو جدا ہے وہ دل سے جدا نہیں

کیا ہے کہ تو نے رنگِ تغافل کیا پسند
تیرے سوا تو اور مجھے آسرا نہیں

دیکھی مسافرانِ عدم کی سبک روی
ایسے اُڑے زمیں پہ کہیں نقشِ پا نہیں

دشتِ بقا میں پہلے جوانی تھی ہم سفر
اب زندگی تو ہے مگر اُس کا پتا نہیں

اُٹھا مرا غبار تو تھا بیٹھنا محال
بیٹھا تو نقشِ پا کی طرح پھر اُٹھا نہیں

کچھ کم نہ سمجھو طاقتِ مجبوریٔ فراق
میں ناتواں ہوں آہ مری نارسا نہیں

جو راہ ہے وہ عشق کی منزل سے دور ہے
میرے لئے جہاں میں کوئی راستا نہیں

بس ذکرِ آشنائیٔ دنیا نہ کیجئے
سب آشنا ہیں اور کوئی آشنا نہیں

ڈر ہے تو یہ کہ بھول نہ جاؤ وہاں بھی تم
محشر کا روز ورنہ کچھ ایسا بُرا نہیں

اتنا غرور اتنا تبختر نہ کیجئے
شاکر فقیرِ عشق ہے کوئی گدا نہیں

جناب سید راحت مولائی بی۔ اے (علیگ)

تنقید

اردو کے مشہور نوجوان منفرد شاعر حضرت احسان بن دانش کی تکمیل میں ایک کتاب "تنقیدِ ادب" سپردِ قلم کی ہے۔ اس کا پہلا باب پیشِ خدمت کرتا ہوں۔

راحت

قبل اس کے کہ میں اصل موضوع شروع کروں، ناظرین کی توجہ شاعرِ انقلاب کی اس بے پناہ نظم کی طرف لے جاتا ہوں جو نقادِ کم نظر سے کے عنوان سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ شاید دنیا کا کوئی ادب ایسا نہیں جس میں شاعر کی طرف سے نقاد کو اپنی زبان میں مخاطب کیا گیا ہو اور شاعر نے نقاد کے متعلق ذاتی جذبہ و خیالات کا اظہار کیا ہو۔ نقدِ ادب، جوشؔ کی انفرادی چیز ہے۔ جو میرے نزدیک ادب میں ایک مستقل اور نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ میں جہاں تک اس نظم کے عمق میں پہنچ سکا ہوں۔ جوشؔ کے ایک ایک لفظ کو حقیقت و صداقت پر مبنی پایا ہے۔ اس نے کوئی لفظ اور کوئی مصرعہ کسی تنگ نظری، رشک، حسد اور عصبیت کی وجہ سے یا ناقد سے جل کر نہیں کہا ہے۔ ابتدا کس قدر حسین ہے اور اپنی اور ناقد کی مجبوریاں کتنی عریاں۔ اللہ اللہ ؎

رحم اے نقادِ فن!! یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو

ادیب کے متعلق ہر زمانے میں ایک خاص نظریہ رہا ہے۔ ہم تک جو تعریفیں پہنچی ہیں وہ اس قدر متضاد ہیں کہ نہ تو ایک کو دوسری پر فوقیت دی جاسکتی ہے۔ اور نہ ان سینکڑوں میں سے کوئی ایک منتخب کر کے دوسروں کی ذہنی کاوش کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اس اجتماعِ ضدین میں سہولت کے ساتھ نکل جانے کی ایک یہی صورت ہوسکتی ہے کہ یا تو انفرادی قوتِ انتخاب کے مطابق کسی ایک پرچم جا یا جائے یا جس پر قبولیتِ عام کی مہر لگ چکی ہو۔ اسکو اختیار کر لیا جائے۔ دوسری نوع بہر صورت زیادہ خطرناک نہیں۔ میرے خیال میں جنہوں نے اس چیز کو ہمارے ادب میں سب سے زیادہ واضح و مشرح کیا ہے وہ دو ہستیاں تھیں۔ پہلی ڈاکٹر بجنوری مرحوم، دوسری اصغر گونڈوی مرحوم۔ ان دونوں بزرگوں کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی روح میں جذب ہو گئے تھے۔ اور وہاں سے جو کچھ مواد لیا وہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ بعض بعض جگہ یہ دونوں ہستیاں انتہائی بلندیوں پر آتی ہیں۔ اور اصغر مرحوم کی اس صفت کا تو اس وقت اور زیادہ قائل ہونا پڑتا ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنے بڑے شاعر، دل کے پہلو بہ پہلو ایک زبردست صوفی بھی تھے۔

بہر حال ادیب کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ اور ان دو کے ساتھ ساتھ ایک تیسری قسم بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان تینوں کو ذرا تفصیل سے بیان کرونگا۔ پہلا ادیب وہ ہوتا ہے جو ایک مخصوص اجتہاد و انفرادیت کے ساتھ دنیا میں آتا اور دنیا کو کوئی نیا زاویہ نگاہ دیتا ہے۔ اس کی ادب میں جو شان و منزلت ہوتی ہے وہ کسی دوسرے کو عمر بھر نصیب نہیں ہوسکتی۔ اسکا ہر لفظ، ہر قول، ہر خیال اپنے اندر ایک ایسی خصوصیت رکھتا ہے جو اسی کی ذات سے شروع ہوتی۔ اور اسی کی ذات پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے پڑھنے والوں پر طرح طرح سے اثر ڈالتا اور عجیب عجیب طریقوں سے انہیں دنیا سے اٹھا کر اپنی مخصوص دنیا میں لے جاتا ہے۔ وہ پڑھنے والوں کے نفسِ تحت الشعوری پر حکمران ہے۔ اور پڑھنے والوں کے دل کو کبھی اسکا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ غیر مرئی محسوس چیزوں کی پرستش کرتا ہے۔ اس کی یہ انفرادیت جبلی ہوتی ہے اکتسابی نہیں دوسری قسم میں وہ ادیب آتا ہے جو دنیا کے ہر وقتی حسن کو دوام بخشتا ہے وہ دنیا کے ذرے ذرے میں کہیں نہ کہیں سے حسن تلاش کر لیتا ہے وہ غائب چیزوں سے بھی ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ حاضر اشیاء سے اور اپنے

نفس پر ایسے حالات بھی طاری کر سکتا ہے جو ان جذبات سے بہت دور ہوتے ہیں جو حقیقی واقعات کے اثر سے پیدا ہوں۔ اور ان کی ہمہ گیری بے پناہ ہوتی ہے۔ وہ پڑھنے والوں کے شعوری نفس پر حکومت کرتا ہے۔ وہ پڑھنے والوں کو ان کی دنیا میں ہی رکھتا اور خود ان کے جذبات تک پہنچ کر ان سے اپیل کرتا ہے لیکن انداز اس کا بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کا۔ ہاں اس کے مذہب میں غیر مرئی و غیر محسوس اشیاء کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ وہ محسوس اور مرئی چیزوں کا عاشق ہوتا ہے۔ ان دونوں ادیبوں کی شناخت ہم ان کی کامیابی سے کر سکتے ہیں اور جیسا کہ کوئی ادیب اچھی یا بری تنقیدوں سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔ اسی طرح یہ دونوں ادیب بھی اس کا ہدف بنتے ہیں لیکن ان کی کامیابی کا راز ان کی ہر دلعزیزی میں مضمر ہوتا ہے۔ سخت سے سخت تنقید اور خلاف سے خلاف تبصرہ بھی اگر اس کی ہر دلعزیزی کو مجروح نہ کر سکے تو وہ بلاشک کامیاب ہے۔ اور اس کی کامیابی اس کی شان قائم رکھنے میں ممد۔

یہ دونوں قسم کے ادیب اپنے اردگرد اور ماحول پر بڑا اثر ڈالتے ہیں چنانچہ ان کی اثر انگیزی ایک وقت یہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ کہ ان کے بار بار کے مطالعہ اور ان کی پیدا کی ہوئی فضا میں سانس لینے سے ایک نیا گروہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو بغیر کسی قدرتی عطیہ ذاتی تجربہ اور شخصی احساس کے ایک چیز کو بیان کرنے میں ایسا ڈھنگ اور سلیقہ برتتا ہے کہ گویا جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ اس کی ذاتی واردات ہیں اور وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ یہ گروہ آرٹسٹ کہلاتا ہے۔ یہ نہیں کہ مذکورہ بالا دونوں اقسام میں کوئی آرٹسٹ نہیں ہوتا بلکہ وہ دونوں ایک تیسرے کو آرٹسٹ بنانے میں خالق کا کام کرتے ہیں۔ بلکہ . . . بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک ادیب آرٹسٹ بھی ہوتا ہے اور ادیب بھی یا برخلاف اسکے ایک آرٹسٹ ادیب بھی ہوتا ہے۔ اور آرٹسٹ بھی۔ اس کے لئے اردو کا صحیح لفظ میرے خیال میں بھی فن کار ہی ہے۔ کیونکہ یہ فن کی کافی مہارت رکھتا ہے۔ اور اس سے کسی غیر معلوم غلطی کے ارتکاب کا احتمال کم ہوتا ہے۔ میں نے دوسری قسم کا جو ادیب بیان کیا ہے۔ وہ ضرورتاً فن کار بنتا ہے۔ اور اس کی وجہ عدم انفرادیت ہوتی ہے کیونکہ اس قسم کے ادیب کو اپنے ماحول، انسانی جذبات، عام واقعات اور روزمرہ کے تغیرات کو بیان کرنا پڑتا ہے۔ اور اسے بسا اوقات ایسے جذبات و واقعات کا اظہار کرنا ہوتا ہے جن سے وہ کبھی بھی دوچار نہیں ہوا۔ اس قسم کا بہترین ادیب تمام ادیبوں کا سرتاج اردو ادب میں صرف ایک پیدا ہوا ہوا ہے۔ اور وہ ہے میر انیس مرحوم۔

تنقید دراصل ان ہی لوگوں میں مابہ الامتیاز قائم کرنے اور کھوٹا کھرا پرکھنے کے ایک فن کا نام ہے۔ عوام الناس نہ کبھی جان سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں جاننے کا کوئی موقعہ کہ کون سا ادیب کیا ہے کس میں انفرادیت ہے اور کس میں اظہار واقعات و جذبات پر قدرت۔ کون فن کار ہے اور کون ڈھونگی۔ پڑھنے والا ہمیشہ مسرت کا متلاشی ہوتا ہے اور جب اسکا مقصود ملجاتا ہے وہ اپنے دماغ کو زیادہ حیران و پراگندہ نہیں کرتا۔ تنقید اسی لاابالی اور غیر ذمہ دارانہ جذبہ کو فنا کرنے کی کوشش کو کہتے ہیں۔ وہ انسان کو اصلی ذمہ داریاں بتلاتی اور اسکے فرائض سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ تبدیلی کی . . . زندگی کی سی سبکیت کو انسان کی . . زندگی کے بھاری پن میں تبدیل کرتی ہے۔ اس کے نزدیک مسرت حاصل کرنا ہی ادب سے استفادہ نہیں بلکہ مسرت حاصل کرنے کے طریقوں پر بھی ایک نظر غور ڈالنا اور ان کی تحلیل و تشریح کرنا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ اچھی اور بری، جائز اور ناجائز، صحیح اور غیر صحیح مسرت پر بھی حکم لگاتی ہے اور پڑھنے والوں پر بہت سی پابندیاں عائد کرتی ہے۔ وہ بتلاتی ہے کہ پڑھنے والا کہاں سے کس طرح اور کس قسم کی مسرت حاصل کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اسکا میدان عمل اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ خود ادب جیسی عالمگیر چیز اس کا ایک جزو بنکر رہ جاتی ہے۔ اسکے نفسیاتی نکات، اس کی پیدا کردہ صلاحیتیں، اس کی تخلیق کی ہوئی خوش مذاقیاں اس قدر اہم اور اتنی بھاری ہوتی ہیں کہ اگر تنقید آج دنیا سے ختم ہو جائے تو شاید ان کیفیات کی تمام عمر نقاب کشائی نہ ہو سکے۔ اور ان پر بھی اسی طرح کوئی پردۂ رنگیں پڑا رہے جو آجتک فطرت کے رازوں پر پڑا ہوا ہے۔ پھر یہ سب چیزیں نہایت ایمانداری و دیانتداری کے ساتھ عالم وجود میں آتی ہیں۔ نہ ان میں ابلہ فریبی ہوتی ہے اور نہ فریب دہی۔

اگر کوئی شاعر یا ادیب پیغمبر کہلا سکتا ہے تو نقاد کو جبرئیل کہا جا سکتا ہے

لیکن اصغر مرحوم کے الفاظ میں "شاعر ایک بچہ ہوتا ہے۔ عقل یہ سمجھتی ہے کہ وہ بچے کو کھلا رہا ہے۔ حالانکہ بچہ استعداد کی مخفی قوتوں سے خود اسکو کھلاتا ہے۔ اور اپنی ناز برداریوں کیلئے اسے مجنونانہ حرکات کیلئے مجبور کر دیتا ہے۔ بیشک اس طرح شاعر بھی اس مقام پر پہونچتا ہے۔ جہاں فکر و ہوش اور علم و عقل کی مخلوق کی رسائی نہیں۔ اس بلندی سے اس کی آوازیں یقین، جوش اور وجدان کی وہ کیفیتیں ہوتی ہیں جن سے ہم متاثر تو ہوتے ہیں مگر مجال دم زدن نہیں رکھتے۔ اس کی باتیں سنکر ہمارے جذبات میں ایک ہیجان و تلاطم تو پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر ایک برابر والے انسان کی طرح اس سے ردّ و قدح نہیں کر سکتے۔ شاعر مستعار کائنات کا قائل نہیں، وہ رسمیات کے پردوں کو چاک کر کے زمین و آسمان کا نظارہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ اپنے مذاق میں شائستگی و پاکیزگی رکھتا ہے تو وہ اپنا طریق کار بھی خود ہی بہتر جانتا ہے"۔ . . . کیسی شان نے اسی مفہوم کو دو مصرعوں میں بیان کر کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے ؎

نظر غور سے انفاس کو دیکھ اے غافل!!

کس کی مضراب سے جنبش ہوئی ان تاروں میں

ہاں تو بقول اصغر مرحوم شاعری ہر قسم کی تنقید سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ شاعری ایک الوہیت مآب چیز ہے۔ انسانی تخیل مذہبیات کے طلسماتی معتقدات کے وقت بھی کسی فطرتی اور حقیقی مرتبہ کو پیش نظر رکھتی ہے اسکے اندر کسی ایسے عنصر کا ملنا جس کا کسی طرح تجزیہ ہو سکے یا جس کے متعلق اچھے یا برے کا حکم لگایا جا سکے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جوش اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اور ناقد پر نصیحت کے پردے میں لعن طعن شروع کر دی۔ مثلاً

ع　کیا شمیم سنبل و نسریں ہے چکھنے کے لئے؟؟

ع　محو سرگوشی ہے کیا تجھ سے بھی روح کائنات؟؟

ع　حسن مطلق کو بھی دیکھا ہے برافگندہ نقاب؟؟

ع　کیا مصنف کی کتاب دل بھی پڑھ سکتا ہے تو؟؟

یہ آخری سوال ضرور ایسا ہے جسے کچھ جائز قرار دیا جا سکتا ہے جوش بھی اس کا قائل ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اپنے اندر اتنی اہلیت و صلاحیت اور ایسا مذاق سلیم رکھتا ہے کہ مصنف کی "کتاب دل" پڑھ سکے تو شاید تنقید کے کٹھن فرائض کی کچھ ادائیگی ہو سکے۔

اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ایک اور امر بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ فنی حیثیت سے شاعر، حکیم، فلسفی اور سائنس دان چاہے ایک ہی زمرہ میں آ گئے ہوں۔ مگر تاثری حیثیت سے ہر ایک کی دنیا اور ہر ایک کی جولانگاہ علیحدہ ہو جاتی ہے۔ حکیم اور شاعر لاریب دنیا کے معیار زندگی میں توسیع کرتے اور اسکو حیات نو بخشتے ہیں۔ مگر ایک حکیم کی کوشش صرف ایک فرد تک محدود رہتی ہیں اور شاعر کی کاوشیں سارے جہان کو محیط ہیں۔ سائنس دان اور فلسفی بھی شاعر کی طرح حیات تازہ پیدا کرتے ہیں۔ مگر ان کے طرز نگارش میں وہ خوبصورتی اور دلکشی نہیں ہوتی جس سے ہم مسرت حاصل کر سکیں اور جس کی گراں بہا امانت صرف شاعر کو ہی ودیعت کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے شاعر کی حیثیت بہت بلند ہو جاتی ہے — وہ ہر چیز میں روح پھونکتا ہے اور دوسری طرف اسکے روح پھونکنے کا طرز اسقدر دلآویز ہوتا ہے کہ اس کو دیکھ کر ہم ایک نامعلوم سی خوشی محسوس کرتے ہیں یہ طرز یہ طریقہ یہ اسلوب اس کی اپنی پیداوار ہوتی ہے اور ایک خاص شخصیت کا نتیجہ۔ طرز کو ادب میں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ خود ادب کی تعریف کو "اظہار نفس" میں ادا کیا گیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ تعریف ناکافی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا ہے کہ جس سے ہم مسرت حاصل کر سکیں۔ اگر اسلوب میں یہ خوبی نہیں ہے تو ہم بہت جلد اس سے اکتا جائیں گے۔ اور طبیعت مکدر ہونے لگے گی۔ اس لحاظ سے ادب وہ خاص طرز تحریر ہوا۔ جو اظہار نفس اور اقتدار نفس دونوں کا حامل ہو۔ یا جو ادیب کسی الہامی جذبہ سے بے اختیار ہو کر جہاں یعنی اظہار نفس و اقتدار نفس کا سوال ہی نہیں کچھ لکھ جائے اس کو بھی ادب کہا جائیگا۔

اس اظہار نفس و اقتدار نفس کی تحریر و تعبیر میں زمانہ اور ماحول کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ چونکہ انفرادی شخصیت کا اظہار ہی ادب ہوتا ہے۔ اور

افراد کا دماغ ماحول کے زیرِ اثر تشکیل پاتا ہے اس لئے ماحول سے عام زبان پر بے انتہا اثر ڈالتا ہے۔ اردو شاعری میں یہ چیز بڑی نمایاں ملتی ہے۔ ادبِ قدیم کا مطالعہ کرتے وقت بعض مقامات صرف اس لئے حذف کر دینا پڑتے ہیں کہ ہم ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ اور بعض اس وجہ سے کہ وہ ہمارے جذبات و خیالات کو اپیل نہیں کرتے۔ اس وقت کی تمام شاعری سوائے چند مستثنیات کے غیر حقیقی جذبات سے لبریز تشبیہات سے بھری ہوئی۔ اور الفاظ کا گورکھ دھندا نظر آتی ہے۔ اور موجودہ مذاق کے لئے ایک بارِ گراں سے کم نہیں۔ اس دور کو چھوڑ کر اگر ہم موجودہ دورِ رومانیت لیں تو ہمیں عالم ہی عجیب نظر آئیگا۔ ایک طرف اختر شیرانی۔ دوسری طرف روش صدیقی، تیسری طرف احسان بن دانش۔ پھر جگر، اصغر، جوش وغیرہ وغیرہ۔ ان کے یہاں حقیقی کیفیات جذبات کے ایک ایک پہلو کی تشریح۔ واردات کی نازک تحلیل، واقعات کا رنگیں بیان، روحانی ارتقا۔ زبان میں لوچ، خیالات میں رفعت جیسی چیزوں کے علاوہ اور کچھ شاذ و نادر ہی ملیگا۔ جس طرح ادب و شاعری میں زمانہ کے مطابق یہ تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح تنقید بھی خود کو ان سے محفوظ نہیں رکھ سکی۔ آج دیوانِ ولی پر جو تنقید کی جائے۔ وہ اس تنقید سے بالکل مختلف ہوگی جو اب سے کچھ سال پیشتر کی گئی ہو۔ آج بانگِ درا پر جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ آنے والی نسلوں سے بالکل مختلف ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس طرح آج سارا معاشرہ مضطرب و بیقرار ہے۔ اسی بے قراری و بے چینی کے مدنظر ادب بھی کتنی کروٹیں بدلے گا۔ اور کون کون سے نئے چولے اختیار کرے گا۔ اس تباینِ مدت کے علاوہ ہمعصر تنقیدوں میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی صحیح ہے۔ اس کی وجہ انفرادی پسند و ناپسند ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اقبال کی زبان ایسی ہے کہ اگر خدا نے عربی میں کلام پاک نہ اتارا ہوتا تو میں خدا سے یہ عرض کرتا کہ اقبال کی زبان میں اتار دے۔ مگر آپ کے نزدیک اقبال ایک مہمل گو ہے۔ میں جوش کو نظم کا باوا آدم سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ اس کے کلام میں عیب جوئی شروع کر دیں گے یا یہ کہ میرے نزدیک ایک چیز عیب ہے۔ آپ اسی کو مصنف کا حسن سمجھتے ہیں یہ طبائع کا تباین ہے۔ اور اس کا فیصلہ انسان کی انفرادیت یا شخصی مذاق کرتے ہیں۔ لیکن ان آپس کی تفریقوں سے تنقید کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بہت سے لوگ تنقید کو فضول اور وقت ضائع کرنا خیال کرتے ہیں اور بعض بعض تو اس کو مہلک قرار دیتے ہیں ان کا قول یہ ہے کہ تنقید کی گرمی سے بہت سے ہونہار غنچے مرجھا کر رہ جاتے ہیں۔ اس دعویٰ کی دلیل میں یہ لوگ بہت سے ناکام مصنفین کی زندگی پیش کرتے ہیں۔ جنہوں نے ابتدا بڑی امید افزا حالتوں میں کی مگر جن کا انجام نہایت حسرتناک ہوا۔ مثال کے طور پر جان کیٹس (John Keats) کی جو انگلستان کا مشہور نوجوان شاعر تھا، دردناک موت دی جاتی ہے جس کا دل تنقید کے تلخ لہجے نے چور چور کر دیا۔ اور وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ لیکن میں اس دعویٰ اور دلیل کو بیکار سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک اگر کسی کے دل میں ادبی خدمت کا ایماندارانہ جذبہ یا ادبی شوق ہے۔ تو وہ جتنا اس قسم کی آگ پر تپے گا اتنا ہی پختہ ہوگا۔ کمزور طبائع ممکن ہے آتش زیرپا ہو جائیں۔ یا اندر ہی اندر سلگنے لگیں لیکن سنجیدہ فطرتیں فوراً اپنے اردگرد اپنے ماحول اپنے نقائص اپنی کمزوریوں اور اپنی کوششوں کا جائزہ لینا شروع کر دیں گی۔ اور جہاں نقاد کو صحیح دیکھیں گی اسی جگہ اپنی تصحیح کر لیں گی۔ اور اسی پر عمل پیرا ہو جائیگی اردو ادب میں اس بلند فطرتی کی زندہ مثال یاس یگانہ لکھنوی ہے۔ اس پر کہنے والوں نے کیا کچھ نہ کہا۔ مگر وہ اس سے کبھی متاثر نہیں ہوا اور آج اس کی شاعری کی جو شان ہے اس سے یہی نہیں کہ سننے والا محفوظ ہو۔ بلکہ شاید یاس خود بھی لطف اٹھاتا ہوگا قطع نظر اس خارجی چیز کے تنقید سے فی الواقعی جو فائدہ ادب کو پہنچا اور پہنچتا ہے۔ اس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ وہ تنقید کس قسم کی ہے یا تھی ؟؟

بعض لکھنے والوں کو "نقاد" کہلانے کا شوق ہوتا ہے۔ اور بعض یہ جامہ پہننے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ ایک کے اندر سطحیت اور دکھلاوا پن ہوگا۔ دوسرے کے یہاں عمق اور ٹھوس پن۔ جو لوگ فن تنقید سے کما حقہ واقف ہیں۔ اور نیز ہر علم کے ہر شعبہ پر کافی عبور بلکہ بعض بعض مقامات پر کافی قدرت رکھتے ہیں ان کی تنقیدیں بیش بہا لٹریچر اور ادبی شہ پارے ہو گئے

یہاں میں بعض بعض مقامات پر کافی قدرت" سے میری مراد یہ ہے کہ جس چیز پر تنقید کی جائے اس شعبۂ علم سے نقاد پوری طرح واقف ہو۔ مثلاً کسی کی شاعری پر تنقید کرتا ہے تو ناقد کے لئے شاعری سے متعلق ہر چیز سے اور بہ تفصیل سے خوب واقف ہونا ضروری ہے۔ برخلاف اسکے جو لوگ علوم متداولہ سے بالکل مس نہیں رکھتے یا اگر مس رکھتے ہیں تو ان کی واقفیت کا دائرہ بہت محدود ہے ان کا تنقید کے میدان میں کامیاب ہونا ایک وہم سے زیادہ نہیں۔ لوگ شیکسپیر کو اتنا نہیں پڑھتے جتنا اس پر تنقیدوں اور بالخصوص اس مشہور عالم تنقید کو جو بریڈلے کے قلم کی مرہون کرم ہے۔ پڑھتے ہیں یہ کتاب تنقید خود ڈراما پر ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے صرف شیکسپیر پر ہی تبصرہ نہیں کیا ہے بلکہ شیکسپیر کے اصل موضوع یعنی ڈراما پر بھی وہ بیش بہا لٹریچر اور ایسی گراں قدر معلومات بہم پہنچائی ہیں جنکو سند قرار دیدیا گیا ہے۔ اس قسم کی تنقیدوں سے ادب کا دامن بہت وسیع ہوتا ہے ہزار ہا نکات ہیں جو شاعر تو دیتی اور لاشعوری طور پر کہہ جاتا ہے۔ مگر نقاد کو انکی تشریح کے لئے آسمان سے زمین تک دوڑنا پڑتا ہے اور جب کوشش اس قدر بلیغ ہو تو اسے کس طرح لٹریچر میں اعلیٰ جگہ نہ دی جائے گی۔ تنقید داخلی اثر بھی کرتی ہے۔ تنقید سے ہماری عقل میں تیزی ذہن میں سمجھ بوجھ کا مادہ ذکاوت میں گہرائی اور مذاق میں شائستگی و پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ ہمارا مذاق سلیم سدھرتا اور نکھرتا ہے۔ اور ہم میں لاشعوری طور پر ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم صرف وہ چیز پسند کرنے لگتے ہیں جو اعلیٰ ہو [illegible]

کر دیتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اس چیز سے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگ محروم ہوتے ہیں۔ وہ جانتے تو سب کچھ ہیں۔ مگر ایک بے ڈھنگے طور پر ان سے آپ جب کبھی تبادلۂ خیالات کرینگے۔ وہ آپ کو مطمئن تو ہر طرح کر دینگے مگر اس طرح کہ جیسے کوئی سہارنپور سے کلکتہ پہنچنا چاہے۔ اور ٹکٹ لے لاہور تک کا۔ پہنچ تو وہ بہرحال جائیگا۔ لیکن الٹے بانس بریلی ہو کر اور پھر پہنچکر اپنی اس حماقت کا کسی سے تذکرہ بھی نہیں کرے گا۔ لیکن بعض لوگوں کو میں نے ایسا بھی پایا ہے جن کی تعلیم تو کچھ زیادہ نہ تھی، مگر جن کی اطلاعات اپنی اپنی موزوں جگہ پر رکھی ہوئی تھیں اور دریا کی سی روانی کی طرح وہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو ایک آدھ منٹ میں حل کر دیتے تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہمارے پاس تنقید سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ نقاد ہمیشہ رہنما کا کام کرتا ہے وہ ہم کو مصنف کی گہرائی، بلندی، پستی، فطرت، اخلاق غرض ہر چیز سے روشناس کراتا جاتا ہے۔ وہ ہم کو بتلاتا ہے کہ ہم کسی خاص کتاب کو کس طرح پڑھیں۔ اور کسی خاص مصنف کا کیونکر مطالعہ کریں۔ اور جب وہ اپنی رہنمائی کا کام ختم کر دیتا ہے تو فیصلہ صادر کرتا ہے کہ اس قسم کی چیز تمہارے لئے ہمیشہ مفید ہوگی یا یہ چیز تم کو نقصان پہنچائے گی۔ بغیر تنقید کے ہم کسی مصنف کا بھی اس [illegible] جیسا کہ ہم کو چاہئے۔ صحیح مطالعہ نہیں کر سکتے۔ ورنہ پھر ہمیں [illegible] پڑے گا۔ اس لحاظ سے ادب میں تنقید کی اس قدر اہمیت ہے [illegible] دوسرے کے لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

ایک اور امر بھی قابل غور ہے تنقید ہمیشہ [illegible]

[illegible]

بھی کر جو س [illegible]

میں لعن طعن شروع کر دی

کیا شمیم سنبل و [illegible]

موبہر گوشی [illegible]

[illegible]

دقیت نہیں دے سکتے۔ ادب اپنے اندر اجتہادی جراثیم رکھتا ہے۔ ادب ہمیشہ جدت و انقلاب کا متمنی رہتا ہے۔ اور اسلئے ترقی کرنے والے ادب میں ہر روز تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ نئے نئے الفاظ، نئی نئی تراکیب، نئی نئی بندشیں نئے نئے خیالات، خیالات کے اظہار کے نئے نئے ذرائع، ہر روز ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف تنقید ان سب چیزوں سے محروم ہے۔ نہ وہ اجتہادی ہو سکتی ہے نہ انقلابی۔ وہ ہیجان انگیزی نہیں کر سکتی۔ وہ متلون مزاج نہیں بن سکتی۔ وہ بغیر سنجیدگی کے خرافات کا مجموعہ ہو جائے گی پھر دوسری طرف وہ سوسائٹی کے ساتھ چلتی ہے یعنی وہ سوسائٹی کے ان احساسات و مشاعر کی پابند ہوتی ہے۔ جہاں بیداری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بیداری پر خواب طاری ہونے لگے۔ تنقید میں انفرادیت نہیں ہو سکتی۔ اس کا سکہ ہمیشہ اجتماعی منظوری سے چلتا ہے۔ وہ ہمیشہ معاشرتی تغیرات و کیفیات کو مد نظر رکھتی ہے اور اس لحاظ سے ادب سے بہت پیچھے رہتی ہے۔ دنیا کے بہت سے ادب مکمل ہو جانے کے بعد بھی تنقید سے محروم رہے اور ہیں۔ ہر ادب میں ایک عرصہ تک جدت پسند مصنف اور نقادوں میں جنگ ہوتی رہی ہے جب تک کہ اوپر انفرادیت و اظہار نفس کا غلبہ ہوتا ہے، دوسرا تعمیرات کا غلام۔ انگریزی ادب تک میں جہاں تنقید بے انتہا ترقی کر گئی ہے ... مناقشت آج بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ ناقد اب بھی کسی نئی چیز یا ... عمومی سی بیگانگی کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ وہ ضبط کر ہی نہیں سکتا کیونکہ ... اس نے اس کی انفرادیت اور اسکے اجتہاد کو فنا کر دیا ہے۔ اس موقعہ ... الکثر ... شہ ہونے لگتی ہے کہ آیا ادیب ناقد پیدا کرتا ہے یا ناقد ادیب ... سوال بہت تشریح طلب ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں اس سے ... ونگا۔

... نیاں کہا جاتا ہے اور اس لئے اس سے ہر طرح ... لیکن ناقد کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ خار دار ... ت چاک نہ ہونے دے۔ یہی اسکا سبب ... ہے۔ جہاں تنقید اچھے فوائد کی حامل ہے وہاں ... ہو سکتے ہیں۔ اور انسانی کوشش ہونے کی وجہ سے

اس پر تعجب کرنے کا کوئی موقعہ نہیں۔ دنیا کی شاید ہی کوئی چیز ہو جس پر اچھائی و برائی اور نیک و بد کا اطلاق نہ ہو سکتا ہو۔ لیکن ناقد کو نہایت سرد دل ٹھنڈا دماغ اور خاموش فطرت ہونا چاہئے۔ یہ کبھی نہیں ہونا چاہئے کہ اگر کوئی غلطی دیکھی تو ابل پڑے کوئی اچھائی پائی تو تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ اسکا ہر فیصلہ ہر لفظ نہایت جچا اور تلا ہونا چاہئے۔ اگر اس قسم کی تنقید پبلک کے سامنے لائی جائے گی تو اس میں کوئی نقص نہ ہوگا۔ اکثر نقاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ تصنیف کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ وہ خود پر تنقید نہیں کر رہے بلکہ ایک دوسرے شخص پر کر رہے ہیں اور اسی حالت میں ان کا فرض ہے کہ وہ قدم قدم پر دوسرے شخص کی افتاد طبع کیفیت مزاج اس کا ماحول اس کے واقعات زندگی اسکی معاشرت اور اسکے عزیز ترین احباب کی زندگی وغیرہ وغیرہ پر نظر رکھیں۔ تصنیف میں اپنے خیالات پڑھنا یا اپنے خیالات و خیالات کے متوازی کسی چیز کی تلاش کرنا یقیناً بہت بڑا عیب ہے لیکن اس عیب کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اور ناقد خود اس کا ذمہ دار ہے۔ اکثر تنقید میں کسی جذبہ اسفل کے ماتحت معرض وجود میں آتی ہیں جب کسی لکھنے والے کو دوسرے لکھنے والے سے نفرت، بغض، دشمنی، کینہ یا تعصب ہوتا ہے تو اس کی انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس جذبہ کو عملی صورت میں لا کر دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھائے۔ اس صورت میں اس کے اوپر ایک ذلیل مگر شدید جذبہ کا غلبہ ہوتا ہے، جو اسکے دل و دماغ کی فضا کو کبھی بھی صاف نہیں ہونے دے سکتا۔ اس لئے قدرتاً ایسی حالت میں وہ جو کچھ لکھیگا وہ یا وہ گوئی معاندانہ حملوں، بیجا و بے جا نکتہ چینیوں اور بے بنیاد عیب جوئیوں کے انبار کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسے شخص کے ہاتھ میں تنقید ایسا حربہ ہوتا ہے جو وہ جا و بے جا ہر طرح ہر شخص پر ہر وقت استعمال کر سکتا ہے۔ اس سے یہ مطلب کبھی اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ تنقید ہی ایسے جذبات کی محرک ہو جاتی ہے اگر کسی شخص کے پاس بے انتہا دولت ہے مگر وہ اس کو فضول اور غلط طریقہ سے خرچ کرنا شروع کر دے۔ اور دولت کو بھی لٹا دے۔ خود بھی بری عادتوں کا شکار بن جائے تو اس سے دولت کو کبھی ملزم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح ناقد

کی ایسی حرکت ایک طرح کی تنگدلی ہے۔ اور اس کا علاج کوئی نہیں کر سکتا ایسے موقع پر یہی بہتر ہے کہ ایسی تنقید اور ایسے ناقد کو اُس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ چاند پر خاک ڈالنے سے چاند پر خاک نہیں پڑا کرتی۔ ایسے نقاد کی اصلیت زیادہ عرصہ تک پردے میں نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک وقت منظر عام پر آئے گا۔ اور پرکھنے والا اسکو خود پرکھنے لگا۔ ادب میں ایک تیسری قسم کی تنقیدیں بھی نظر آتی ہیں اور یہ ان دونوں سے زیادہ مضحکہ انگیز ہیں۔ یہ تنقیدیں وہ ہیں جو یا تو کسی ادیب نے خود یا کسی ادیب کے دوست نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر لکھی ہیں۔ ایسی تنقیدوں میں صرف ایک جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ اور وہ ہے خوش خیالی کا۔ اگر کوئی خود کسی دوسرے کے پردے میں تنقید کرتا ہے تو اس کا مقصد اپنی کامیابی مقبولیت اور ہر دلعزیزی ہوتا ہے۔ اور اس میں بجائے خدمت کے کاروباری مطلب چھپا ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوست تنقید کرتا ہے تو یہاں دو اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ایک تو ادیب کی شہرت اور اس شہرت سے ناقد کی ذاتی اہمیت۔ دوسری کسی نواب قسم کے لکھنے والے کی تصنیف پر تنقید فرما کر اس سے کچھ اینٹھنا۔ یہ دونوں اغراض انتہائی پست ہیں۔ اور ایک طرح اپنے ہی ضمیر کا خون یا اپنی ہی فطرت سے بغاوت ہے اس کو ادبی خیانت کہا جا سکتا ہے۔ کوئی تنقید ان جذبات کی بنا پر نہیں لکھنی چاہیئے۔ پڑھنے والے کا دل اس طرح کے ہر قسم کے ناپاک جذبات سے صاف و معرا ہوتا ہے۔ وہ جتنا کہ ادیب کا معتقد ہوتا ہے اتنا ہی نقاد کا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تنقید میں اس جذبۂ اعتماد و اعتقاد کی قدر نہ کی گئی اور اس کو کسی ذاتی کاوش پر بھینٹ چڑھا دیا گیا تو اس سے پڑھنے والے کا نقصان نہیں، بلکہ ناقد کی بدنصیبی ہے۔ کسی کا اعتماد، اور اعتماد ہی نہیں۔ بلکہ اکثر اوقات اعتقاد بھی، اگر کسی کو مل جائے تو اس سے بڑھکر دنیا کی اور کیا نعمت ہو سکتی ہے۔ اس لئے ناقد کو اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ اور تنقید ایک نہایت ایماندارانہ کوشش ہونی چاہیئے جس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دکھا یا گیا ہو اور کسی جگہ بھی مصنف کے ساتھ مروت سے کام نہ لیا گیا ہو۔ ناقد کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے بہت سے پڑھنے والوں کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت کا امین ہے۔

اگر کوئی تنقید ان تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے تو اس کو ادب میں بلاشبہ اعلیٰ ترین جگہ ملیگی۔ اور اسی قسم کی تنقید سے لٹریچر میں اضافہ ہوگا۔

ابوالفاضل راز چاندپوری

جاپانی دوشیزہ

ایک تصویر کو دیکھکر

(۱)

دیکھنا اے ہم نشینِ خوش نظر صحنِ گلشن میں ہے کوئی جلوہ گر
اک مجسّم کیفِ صہبائے شباب مستِ سازِ ماہتاب و آفتاب

رُخ پہ سُرخی، آنکھ میں سحرِ حلال　　لب پہ ہلکا سا تبسم بے مثال
غیرتِ گل، رشکِ سروِ چمن　　شمعِ بزمِ گلستانِ جان و تن
خوش ادا، خوش جمال و دلستاں　　درس آموزِ محبت بے گماں
اک ادائے خاص سے استادہ ہے　　حُسنِ فطرت کی مگر دلدادہ ہے
محوِ نظارہ ہے اس انداز سے　　جیسے واقف ہو چمن کے راز سے
حُسنِ صورت سازِ ہے رخ سے عیاں　　دل میں اسرارِ محبت ہیں نہاں
کہہ رہی ہے کچھ نگاہِ نیم باز
مرحبا، صد مرحبا، عمرش دراز!

(۲)

اے سراپا حُسن و دُنیائے شباب　　اے مجسم نشۂ جامِ شراب
مست سازِ میکشانِ آرزو　　فتنہ اندازِ جہانِ رنگ و بو
پوچھتا ہوں تجھ سے میں اتنا مگر　　کچھ تجھے ہے اپنے گھر کی بھی خبر؟
کیا کوئی قانونِ اُلفت ہے وہاں　　کیا کوئی رسمِ محبت ہے وہاں
کیا وہاں حُسنِ وفا موجود ہے　　کیا وہاں راہِ جفا مسدود ہے
کیا مروّت کیش ہے وہ سرزمیں
کیا وہاں انسان بستے ہیں کہیں

(۳)

یہ خموشی، یہ سکوتِ بے محل!　　ہو نہیں سکتا یہ عقدہ تجھ سے حل!
میں نے مانا تو سراپا ناز ہے　　دلربا تیرا ہر اک انداز ہے
دلدہی کے راز سے ہے آشنا　　باندھ سکتی ہے تو پیمانِ وفا
دلنوازی تیری فطرت ہے ضرور　　بیوفائی سے ہے لاکھوں کوس دور
حُسن کی دیوی ہے تو، نامِ خدا　　ہے یقیں مجھ کو تری ہر بات کا
لیکن اے معصوم صورت نازنیں　　چین دل میں تجھکو دے سکتا نہیں
ظالموں سے سخت نفرت ہے مجھے
صرف اہلِ دل سے اُلفت ہے مجھے

مترجمہ یزدانی جالندھری

ایکٹرس

(منشی پریم چند آنجہانی کے ہندی افسانے کا ترجمہ جو براہ راست ہندی رسالہ ماوھوری الہ آباد سے . . . . کیا گیا)

سٹیج کا پردہ گر گیا۔ تارا دیوی نے شکنتلا کا پارٹ ادا کر کے تماشائیوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔ جس وقت وہ شکنتلا کے روپ میں راجہ دشینت کے سامنے کھڑی نفرت، درد اور استحقار سے اپنے جوشیلے جذبات کو آتشناک الفاظ میں ظاہر کر رہی تھی۔ تماشائی تمام اصول و ضوابط کو نظر انداز کر کے دیوانوں کی مانند سٹیج کی جانب دوڑ پڑے تھے۔ اور تارا دیوی کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے کئی سٹیج پر چڑھ کر تارا دیوی کے چرنوں میں سرنگوں ہو گئے تھے۔ سارا سٹیج پھولوں سے پٹ گیا تھا۔ زیورات کی بارش ہونے لگی تھی۔ اگر اسی لمحے مینکا کا اڑن کھٹولہ نیچے آ کر اسے اڑا نہ لے جاتا تو اس دھکم دھکے میں دس پانچ آدمیوں کی جان پر ضرور بن جاتی۔ منیجر نے فوراً سٹیج پر آ کر تماشائیوں کی قدر دانی و حق شناسی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرے روز یہی تماشا دکھانے کا وعدہ کیا۔ ہجوم مطمئن ہو کر رخصت ہونے لگا لیکن نوجوان اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ لمبا قد، روشن چہرہ، کندن ایسا رنگ، دیوتاؤں کا سا حسن، گٹھا ہوا جسم، چہرے سے ایک قسم کا نور برس رہا تھا کسی ریاست کا راجکمار معلوم ہوتا تھا۔ جب تمام تماشائی رخصت ہو گئے تو اس نے منیجر سے پوچھا۔

"کیا میں تارا دیوی سے ایک لمحے کے لئے مل سکتا ہوں؟"

منیجر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ہمارے ہاں اس کی اجازت نہیں!"

نوجوان نے پھر پوچھا۔ "کیا آپ میرا کوئی مکتوب ان کے پاس بھیج سکتے ہیں؟"

منیجر نے اسی انداز میں کہا۔ "جی نہیں، معاف کیجئے گا۔ یہ بھی ہمارے اصول کے خلاف ہے۔"

نوجوان مایوس ہو کر واپس ہوا ہی چاہتا تھا کہ منیجر نے کہا۔ "ذرا ٹھہرئیے آپکا کارڈ ہے؟"

نوجوان نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ اور اس پر کچھ لکھ کر دیدیا۔ منیجر نے اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی . . . . . .

"کنور نرمل کانت چودھری۔ او بی۔ ای"

منیجر صاحب کی ترشروئی غائب ہو گئی۔ کنور نرمل کانت شہر کے سب سے بڑے رئیس اور تعلقدار، وقت کے روشن رتن، موسیقی کے استادِ کامل اور عالم و فاضل تھے، جنکے وظائف و خیرات سے ملک کی کئی سبھائیں چلتی تھیں، اس وقت وہ ایک شوور بھکاری کے روپ میں کھڑے تھے۔ منیجر اپنے رویئے پر سخت نادم ہوا۔ نرم الفاظ میں بولا۔ "معاف کیجئے گا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی میں ابھی تارا دیوی کے پاس حضور کا کارڈ لئے جاتا ہوں۔"

کنور صاحب نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کر کے کہا۔ "نہیں، اب رہنے ہی دیجئے۔ میں کل پانچ بجے آؤں گا۔ اس وقت تارا دیوی کو تکلیف ہو گی۔ کیونکہ یہ وقت انکے آرام کا ہے۔"

منیجر نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ آپکی خاطر اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کر لیں گی۔ میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔"

لیکن کنور صاحب منیجر کی عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کل آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

(۲)

تارا ایک صاف ستھرے اور سجے ہوئے کمرے میں میز کے سامنے کسی

گہری سوچ میں مگن تھی۔ رات کا منظر اس کی آنکھوں میں رقص کر رہا تھا ایسے دن زندگی میں کوئی بار بار آتے ہیں؟ کتنے انسان اس کے درشنوں کے لئے بے قرار ہو رہے تھے۔ سب ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ کتنوں کو اس نے پاؤں سے ٹھکرا دیا تھا... ہاں ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن اس ہجوم میں ایک دیوتا موتی بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کتنا بڑا حسن تھا، کتنا مستحکم عزم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کی دونوں آنکھیں اسکے دل میں چھپی جا رہی ہیں۔ آج پھر اسکے درشن ہونگے یا نہیں۔ کون جانتا ہے، لیکن آج اگر اسکے درشن ہوئے تو تارا اسکو بات چیت کے بغیر نہ جانے دے گی۔"

یہ سوچتے ہوئے اس نے آئینے کی جانب دیکھا۔ کنول کا پھول سا کھلا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ گل نوخیز ۴۵ بسنتوں کی بہار دیکھ چکا ہے۔ وہ حسن وہ نزاکت، وہ شوخی اور وہ شیرینی حسین سے حسین دوشیزہ کو بھی شرمندہ کر سکتی تھی۔ تارا ایک بار پھر دل میں پریم کا دیپک جلا بیٹھی۔ آج سے پچیس سال پیشتر اسے محبت کا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ اس وقت سے وہ ایک قسم کی بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ کتنے ہی عاشقوں نے اپنا دل اس کی نذر کیا تھا لیکن اسنے کسی کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ان کی محبت سے ریا کی بو آتی تھی۔ مگر آہ! آج دامن ضبط اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایکبار پھر اسے دل میں وہی میٹھی کسک کا احساس ہوا، جو بیس سال پہلے ہوا تھا۔ ایک مرد کا حسین چہرہ اس کی آنکھوں میں بس گیا۔ صفحۂ قلب پر کھنچ گیا۔ اسی شخص کو اس نے مُو پر جاتے دیکھا ہوتا۔ تو کبھی ادھر دھیان بھی نہ کرتی۔ مگر اسے اپنے بالمقابل محبت کا تحفہ ہاتھ میں لئے ہوئے دیکھ کر وہ ڈگمگا گئی۔

اچانک داسی نے آکر کہا: "بائی جی! رات کی سب چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ کہئے تو لاؤں؟"

"تارا نے کہا: "نہیں، میرے پاس کوئی چیز لانے کی ضرورت نہیں، مگر ٹھہرو، کیا کیا چیزیں ہیں؟"

"ایک ڈھیر کا ڈھیر لگا ہے بائی جی! کہاں تک گناؤں۔ اشرفیاں ہیں، بروچ، بال کے پن، بٹن، لاکٹ، انگوٹھیاں سب کچھ ہے۔ ایک چھوٹے سے ڈبے میں خوبصورت ہار ہے۔ میں نے ایسا خوبصورت ہار آج تک نہیں دیکھا۔ سب سامان صندوق میں رکھدیا ہے۔"

"اچھا، وہ صندوق میرے پاس لاؤ۔" داسی نے صندوق کو میز پر رکھدیا۔ اُدھر ایک لڑکے نے ایک رقعہ لا کر تارا کو دیا۔

تارا نے للچائی ہوئی نگاہ رقعے پر ڈالی۔ لکھا تھا۔ کنور نرمل کانت، او۔ بی۔ سی۔

اس نے لڑکے سے پوچھا: "یہ خط کس نے دیا ہے؟ وہ تو نہیں جو ریشمی صافہ باندھے ہوئے تھے؟"

لڑکے نے صرف اتنا کہا: "منیجر صاحب نے دیا ہے" اور لپکا ہوا باہر چلا گیا۔

صندوق میں سب سے پہلے ڈبہ نظر آیا۔ تارا نے اسے کھولا تو سچے موتیوں کا سندر ہار تھا۔ ایک طرف ایک کارڈ بھی تھا۔ تارا نے لپک کر اسے نکال لیا اور پڑھا۔ کنور نرمل کانت . . . . کارڈ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ جھپٹ کر کرسی سے اٹھی اور تیزی کے ساتھ کئی کمروں اور برآمدوں میں سے ہوتی ہوئی منیجر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ منیجر نے کھڑے ہو کر آغازِ کلام شروع کیا:—

"میں رات کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔"

تارا نے کھڑے ہی کھڑے پوچھا "کنول نرمل کانت کیا باہر ہیں؟ لڑکا رقعہ دیکر بھاگ گیا۔ اور میں کچھ دریافت نہ کر سکی۔"

"کنور صاحب کا رقعہ تو رات ہی آپکے چلے جانے کے بعد ملا تھا۔"

"تو آپ نے اسی وقت میرے پاس کیوں نہ بھیجدیا؟"

منیجر نے دبی زبان سے کہا: "میں نے سمجھا آپ آرام کر رہی ہونگی۔ تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ڈر رہا تھا کہیں کنور صاحب کو آپ سے ملا کر آپکو کھو نہ بیٹھوں۔ اگر میں عورت ہوتا تو اسی وقت ان کے پیچھے ہو لیتا۔ ایسا دیو روپ شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ یہی جو ریشمی صافہ باندھے کھڑے تھے۔ آپکے سامنے! دیکھا تھا آپ نے!!"

تارا نے گویا نیم خوابی کی حالت میں کہا۔ "ہاں دیکھا تو تھا۔ گیا وہ

پھر آئیں گے؟"

"ہاں، آج پانچ بجے شام کو۔ پڑھے لکھے اور اس شہر کے سب سے بڑے رئیس ہیں۔"

"آج میں ریہرسل میں نہ آؤں گی۔" یہ کہہ کر تارا اپنے کمرے میں آگئی۔

(۳)

تارا آئینے کے سامنے بیٹھی ہے اور دائی اس کا سنگار کر رہی ہے۔ سنگار بھی اس زمانے میں ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے صرف خاص خاص مراسم کے وقت سنگار کیا جاتا تھا۔ شاعروں، مصوروں اور راس کرنے والوں نے سنگار کے اصول وضع کر رکھے تھے۔ آنکھوں کے لئے کاجل لازمی تھا۔ ہاتھوں کے لئے مہندی، پاؤں کے لئے پازیب، ایک ایک عضو ایک ایک زیور کے لئے مخصوص تھا۔ آج وہ زمانہ نہیں رہا۔ آج ہر ایک عورت اپنی خواہش، عقل اور پسند کے مطابق سنگار کرتی ہے۔ اس کا حسن کسی طریقے سے کشش کی انتہا کو پہنچ سکتا ہے، یہی اس کا نصب العین ہوتا ہے تارا اس ہنر میں ماہر تھی۔ وہ پندرہ سال سے اس کمپنی میں تھی۔ اور یہ تمام زندگی اس نے لوگوں کے دلوں سے کھیلنے میں گزاری تھی۔ کس چتون سے کس مسکراہٹ سے .... کس انگڑائی سے کس طرح گیسوؤں کو بکھیر دینے سے دلوں کا قتل عام ہوتا ہے اس کے جاننے میں تارا سے کون بڑھکر ہو سکتا تھا۔ آج اس نے چن چن کر آزمائے ہوئے تیر ترکش سے نکالے۔ اور جب اپنے ہتھیاروں سے سجکر دیوانخانے میں آئی تو معلوم ہوتا تھا گویا عالم کا تمام حسن اس کی بلائیں لے رہا ہے۔ وہ میز کے پاس کھڑی کنور صاحب کا کارڈ دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کے کان موٹر کی آواز کی طرف لگ رہے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ کنور صاحب اسی وقت آجائیں اور اس کو اسی انداز سے کھڑی دیکھیں۔ اس انداز سے وہ اس کے ہر عضو کے حسن کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ اس نے اپنے سنگار کی بنا پر زمانے پر فتح حاصل کر لی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ چنچل حسینہ اس حالت کو پہنچ چکی ہے جب قلب کو اطمینان کی تمنا ہوتی ہے، وہ کسی سہارے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور اس کا غرور نرمی کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔

تارا دیوی کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کنور صاحب شاید ملاقات کے لئے اس سے بھی زیادہ بے چین تھے۔ دس ہی منٹ بعد ان کی موٹر کی آواز آئی۔ تارا سنبھل گئی۔ ایک منٹ میں کنور صاحب نے کمرے میں ورود فرمایا۔ تارا خیر مقدم کے لئے ہاتھ ملانا بھی بھول گئی۔ شباب کے آخر میں بھی محبت کی بے دلی اور بے پروائی کچھ کم نہیں ہوتی۔ وہ کسی شرمیلی دوشیزہ کی مانند سر جھکائے کھڑی رہی۔

کنور صاحب کی نگاہ آتے ہی تارا کی گردن پر پڑی۔ وہ موتیوں کا ہار جو انہوں نے رات نذر کیا تھا چمک رہا تھا۔ کنور صاحب کو اتنی مسرت پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ انہیں ایسا معلوم ہوا گویا ان کی زندگی کی تمام تمنائیں پوری ہو گئی ہیں۔ وہ بولے: "میں نے آج آپکو اتنے سویرے تکلیف دی ہے معاف کیجئے گا۔ شاید یہ آپکے آرام کا وقت تھا۔"

تارا نے سر سے کھسکتی ہوئی ساڑھی کو سنبھال کر کہا: "اس سے زیادہ آرام اور کیا ہو سکتا تھا کہ آپکے درشن ہوتے ہیں اس عنایت کے لئے آپ کی ممنون ہوں۔ اب تو گاہے گاہے ملاقات ہوتی ہی رہیگی؟"

کنور صاحب نے مسکرا کر کہا: "کبھی کبھی نہیں، روز! آپ خواہ مجھے ملنا پسند نہ کریں مگر دن میں ایک بار اس ڈیوڑھی پر سر جھکا ہی جایا کرونگا۔"

تارا نے مسکرا کر جواب دیا: "ہاں جب تک کہ حسن کی کوئی اور دلپسند و منظور نظر مورتی نظر نہ آجائے۔ کیوں؟"

"میرے لئے یہ دل کی پسند کا مسئلہ نہیں، زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہاں تم اسے کھیل سمجھ سکتی ہو مگر کوئی پروا نہیں۔ تمہاری دلی مسرت کے لئے اگر مجھے جان بھی دینی پڑے تو میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھونگا۔"

دونوں طرف سے اسی قسم کے نباہ کے وعدے ہوئے۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اور آئندہ روز کے کھانے کی دعوت دیکر کنور صاحب رخصت ہوئے۔

(۴)

ایک مہینہ گزر گیا۔ کنور صاحب دن میں کئی کئی بار آتے۔ انہیں ایک لمحے کی فرقت بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ کبھی دونوں کشتی پر دریا کی سیر کرتے

کبھی کبھی پارک میں سبزگھاس پر بیٹھے باتیں کرتے۔ کبھی گانا بجانا ہوتا۔ غرضکہ روز نئے پروگرام بنتے تھے۔ سارے شہر میں مشہور تھا کہ تارا دیوی نے کنور صاحب کو پھانس لیا ہے اور دونوں ہاتھوں سے ان کی دولت کو لوٹ رہی ہے لیکن تارا کے لئے کنور صاحب کا پریم ہی ایک ایسی دولت تھی جس کے سامنے دنیا بھر کی دولت ہیچ تھی۔ کنور صاحب کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے کسی چیز کی خواہش نہ رہتی تھی۔

مگر ایک مہینے تک پریم کے اس بازار میں گھومنے پر بھی تارا کو وہ چیز حاصل نہ ہو سکی۔ جس کے لئے اس کی روح تڑپ رہی تھی۔ وہ کنور صاحب کی زبان سے پریم کی بے حد نیکیاں، پریم کی سچے اور بے ریا پریم کی باتیں روز سنتی تھی، مگر ان میں شادی کا لفظ تک نہ آتا تھا۔ گویا پیاسے کو بازار میں پانی کے علاوہ سب کچھ ملتا ہو۔ ایسے پیاسے کو پانی کے سوا کس چیز سے سیری حاصل ہو سکتی ہے؟ پیاس بجھنے کے بعد ممکن ہے اس کی طبیعت اور چیزوں کی جانب راغب ہو لیکن اس پیاس کی حالت میں تو پانی گرانقدر چیز ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کنور صاحب اس کے اشارے پر جان تک قربان کر دیں گے لیکن شادی کی بات ان کی زبان سے کیوں نہیں نکلتی؟ کیا اس مطلب کا خط لکھ کر اپنا عندیہ کہہ دینا مناسب تھا! پھر کیا وہ اسے اپنے دل کا کھلونا بنا کر رکھنا چاہتے ہیں!! اپنی یہ بے عزتی وہ برداشت نہ کر سکی۔ کنور صاحب کے ایک اشارے پر وہ آگ میں کود سکتی تھی۔ لیکن یہ بے عزتی اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی کسی شوقین رئیس کے ساتھ وہ اس سے بجائے پہلے شاید ایک دو مہینے رہ جاتی اور اسے لوٹ کھسوٹ کر اپنی راہ لیتی مگر محبت کا صلہ محبت ہے۔ کنور صاحب کے ساتھ وہ اس بے حیائی سے بسر نہ کر سکتی تھی۔

ادھر کنور صاحب کے رشتہ دار بھی غافل نہ تھے۔ وہ کسی طرح انہیں تارا دیوی کے پنجے سے چھڑانا چاہتے تھے کہیں کنور صاحب کا بیاہ کر دینا ہی اس کا کامیاب علاج ہو سکتا تھا اور یہی ان لوگوں نے کیا۔ انہیں یہ خطرہ تو نہ تھا کہ کنور صاحب اس ایکٹرس سے شادی کریں گے ہاں یہ ڈر ضرور تھا کہ کہیں ریاست کا کوئی حصہ اس کے نام نہ کر دیں۔ اس کے ہونے والے بچوں کو ریاست کا مالک نہ بنا دیں۔ چاروں طرف سے کنور صاحب پر دباؤ پڑنے لگے۔ یہاں تک کہ یورپین حکام نے بھی انہیں بیاہ کر لینے کا مشورہ دیا۔ اسی روز شام کے وقت کنور صاحب نے تارا سے جا کر کہا "تارا دیکھو تم سے ایک بات کہتا ہوں، انکار نہ کرنا۔"

تارا کا دل دھڑکنے لگا۔ بولی "کہئے کیا بات ہے؟ ایسی کونسی چیز ہے جسے میں آپ کی نذر کر کے اپنے آپ کو لائق شریک نہ سمجھوں" یہ بات منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ تارا نے بدل وجان قبول کر لیا۔ اور فرطِ مسرت سے روتی ہوئی کنور صاحب کے پیروں میں گر پڑی۔

(۵)

ایک لمحے کے بعد تارا نے کہا "میں تو مایوس ہو چلی تھی۔ آپ نے بڑی لمبی آزمائش لی۔"

"یہ بات نہیں تارا! اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم میری عرضداشت کو قبول کر لوگی تو میں نے پہلے ہی دن بھیک کے لئے ہاتھ پھیلایا ہوتا لیکن میں خود کو تمہارے لائق نہیں پاتا تھا۔ تم خوبیوں کا مخزن ہو اور میں ..... میں جو کچھ ہوں وہ تم جانتی ہی ہو۔ میں نے عزم کر لیا تھا کہ تمام عمر تمہاری پرستش کرتا رہونگا، شاید کبھی خوش ہو کر تم مجھے بغیر مانگے ہی پریم دیدو۔ بس یہی میری حسرت تھی، مجھ میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہی کہ تم سے پریم کرتا ہوں جب کبھی تم تاریخ، موسیقی یا دھرم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگتی ہو۔ تو میں دنگ رہ جاتا ہوں۔ اور اپنی نااہلیت پر شرمسار ہو جاتا ہوں، تم میری دنیا کا سہارا ہی نہیں بلکہ سرمایۂ عقبیٰ بھی ہو۔ میں حیران ہوں کہ آج میں خوشی سے دیوانہ کیوں نہیں ہو گیا۔"

کنور صاحب دیر تک اپنے دل کی باتیں کہتے رہے۔ تارا سر جھکائے سن رہی تھی لیکن اسکے چہرے سے مسرت کی بجائے ایک قسم کا شرم آمیز درد ظاہر ہوتا تھا۔ یہ آدمی اتنا صاف دل، اتنا بے غرض، اتنا عاجز اور اتنا حوصلہ مند ہے!

اچانک کنور صاحب نے پوچھا "تو میری تقدیر کس دن کھلے گی تارا؟ مہربانی کر کے بہت دنوں کے لئے نہ ٹالنا!"

تارا نے کنور صاحب کی سادگی سے ہار مان کر فکر آلود لہجے میں کہا "قانون کو کیا کرو گے؟"

کنور صاحب نے بے تامل جواب دیا۔ "اس کے متعلق تم مطمئن رہو۔ میں نے وکیلوں سے پوچھ لیا ہے۔ ایک قانون ایسا ہے جس کے ماتحت ہم تم رشتۂ محبت میں بندھ سکتے ہیں۔ اسے سول میرج کہتے ہیں۔ بس آج ہی کے دن وہ مبارک مہورت آئے گا کیوں؟"

تارا سر جھکائے رہی۔ کچھ بول نہ سکی۔

"میں علی الصبح آجاؤں گا۔ تیار رہنا۔"

تارا سر جھکائے ہی رہی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ کنور صاحب چلے گئے۔ مگر تارا وہیں مورتی کی طرح بیٹھی رہی۔ لوگوں کے دلوں سے کھیلنے والی عورت اس قدر مغلوب کیوں ہو گئی ہے!

(۶)

شادی میں ایک دن رہ گیا ہے۔ تارا کو چاروں طرف سے مبارکباد مل رہی ہے۔ تھیٹر کے تمام مردوں اور عورتوں نے اپنی طاقت کے مطابق اسے اچھے اچھے تحائف پیش کئے ہیں۔ کنور صاحب نے بھی زیورات سے بھرا ہوا ایک سنگار دان نذر کیا ہے۔ ان کے خاص احباب نے بھی قسم قسم کے سوغات بھیجے ہیں۔ لیکن تارا کے چہرے پر خوشی کا ذرا سا نشان بھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ مغموم اور اداس ہے۔ اس کے دل میں تین دن سے لگاتار یہی سوال اٹھ رہا ہے... کیا وہ کنور صاحب کی زندگی کو تلخ بنا دے! جس پریم کے دیوتا نے اس کے لئے اپنی برادری کو چھوڑا، اپنے رشتہ داروں سے ناتا توڑا۔ جس کا دل تو دۂ برف کی مانند بے داغ لیکن پہاڑ کی مانند عزم کا پختہ ہے اسی سے دھوکا کرے!! نہیں، وہ اس قدر کمینگی نہیں کر سکتی۔ اپنی زندگی میں اس نے کتنے ہی نوجوانوں سے پریم کا ناٹک کھیلا تھا۔ کتنے ہی پریم کے متوالوں کو وہ سبز باغ دکھا چکی تھی، لیکن اس کے دل میں کبھی ایسی کشمکش نہ ہوئی تھی۔ اس کے دل نے کبھی اس سے سرتابی نہ کی تھی۔ کیا اس کا سبب اس کے سوا کچھ اور تھا کہ ایسا عشق اور ایسی محبت اسے اس سے پیشتر کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

کیا وہ کنور صاحب کی زندگی کو مسرور بنا سکتی ہے؟ ضرور۔ اس بارے میں اسے ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ جگنی کے لئے ایسی کونسی چیز ہے۔ جو حاصل نہ ہو سکے لیکن کیا وہ قدرت کو دھوکا دے سکتی ہے؟؟ کیا ڈھلتے ہوئے سورج میں دوپہر کی سی روشنی پیدا ہو سکتی ہے؟ غیر ممکن... قطعاً غیر ممکن۔ وہ حسن اور وہ شوخی، وہ سادہ خوبصورتی اور وہ مستی، وہ استغنا اور وہ خود اعتمادی۔ جو بہ ارمانِ دوشیزگی ہیں، وہ کہاں سے لائیگی؟؟ نہیں وہ کتنا ہی چاہے مگر کنور صاحب کی زندگی کو خوشگوار اور مسرور نہیں بنا سکتی۔ بوڑھا بیل کبھی نوجوان بچھڑے کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

آہ! اس نے یہ نوبت ہی کیوں آنے دی! اس نے کیوں بناوٹی انداز اور بناوٹی سنگار سے کنور صاحب کو دھوکے میں ڈالا۔ اب یہ سب کچھ ہو جانے پر وہ کس طرح کہے گی۔ کہ میں رنگی ہوئی گڑیا ہوں، جوانی مجھ سے کب کی وداع ہو چکی، اب صرف اس کا نقشِ قدم رہ گیا ہے۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ تارا میز کے سامنے انہیں خیالات میں محو بیٹھی تھی۔ میز پر تحائف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ لیکن وہ کسی چیز کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ ابھی چار دن پہلے وہ انہیں چیزوں پر جان دیتی تھی۔ اسے ہمیشہ ایسی اشیاء کی تلاش رہتی تھی جو وقت کے نشانات کو مٹا سکیں، جو اس کے بجھتے ہوئے چراغِ شباب کو روشن رکھ سکیں۔ اب انہیں چیزوں سے اسے گھن آ رہی تھی... پریم سچ ہے... اور سچ اور جھوٹ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

تارا نے سوچا، کیوں نہ یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں، کسی ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں اسے کوئی جانتا بھی نہ ہو۔ کچھ دن کے بعد جب کنور صاحب کا بیاہ ہو جائے تو پھر آ کر ان سے ملوں۔ اور یہ سارا ماجرا ان سے کہہ سناؤں اس وقت کنور صاحب کے دل پر سخت چوٹ لگے گی۔ نہ جانے ان کی کیا حالت ہو لیکن اس کے سوا کوئی راہ بھی نہیں۔ اب اس کے دن رو رو کر کٹینگے۔ لیکن اسے کتنا ہی دکھ کیوں نہ ہو، وہ اپنے پریتم سے فریب نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے اس بیتے ہوئے پریم کی یاد، اس کی کسک ہی بہت ہے اور اس سے زیادہ اس کا حق نہیں۔

دائی نے آکر کہا۔ "بائی جی! چلئے کچھ کھانا کھا لیجئے۔ اب تو بارہ بج گئے"

"نہیں، مجھے بالکل بھوک نہیں، تم جا کر کھا لو۔" تارا نے جواب دیا۔

"دیکھئے مجھے بھول نہ جائیے گا میں بھی آپکے ساتھ چلوں گی۔" دائی بولی۔

"بیچے اچھے کپڑے بنوا رکھے ہیں نا؟" تارا نے استفسار کیا۔

"مجھے اچھے کپڑے لیکر کیا کرنا ہے۔ آپ اپنا کوئی پرانا کپڑا اتار دے دیجئے" دائی نے کہا۔

دائی چلی گئی، تارا نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ سچ مچ بارہ بج گئے تھے صرف چھ گھنٹے اور ہیں علی الصبح کنور صاحب اُسے "بیاہ منڈپ" میں لیجانے کے لئے آجائیں گے۔

تارا نے ایک سفید ساڑھی پہن لی۔ تمام زیور اتار کر رکھدیئے۔ گرم پانی موجود تھا۔ صابون سے منہ دھویا اور آئینے کے بامقابل جا کھڑی ہوئی۔۔۔ کہاں تھا وہ حسن، وہ نور، جو آنکھوں کو لبھا لیتا تھا۔ روپ ہی تھا لیکن وہ چمک کہاں! کیا اب بھی وہ دوشیزہ کا سوانگ بھر سکتی ہے!

اب اُسے ایک لمحہ بھی وہاں ٹھہرنا کٹھن ہوگیا۔ میز پر پھیلے ہوئے زیورات اور سنگار کے لوازمات گویا اُسے کھانے کو دوڑنے لگے۔ یہ بناوٹی زندگی اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی۔ خس کی ٹٹیوں اور بجلی کے پنکھوں سے آراستہ سرد کمرہ اُسے دہکتی ہوئی بھٹی کی مانند جلانے لگا۔

اس نے سوچا۔ بھاگ کر کہاں جاؤں! ریل سے بھاگتی ہوں، تو بھاگنے نہ پاؤں گی۔ صبح سویرے ہی کنور صاحب کے آدمی چاروں طرف میری تلاش کرنے لگیں گے۔ وہ ایسے راستے سے جائیگی جدھر کسی کا خیال بھی نہ جائے۔

"تارا کا دل اس وقت بے تحاشا اُچھل رہا تھا۔ وہ دکھی نہ تھی، اُداس نہ تھی، پھر دکھ کیوں ہوا اور ناامیدی پاس کیوں بھٹکے؟

اچانک اُسے خیال آیا۔۔۔ ایسا نہ ہو کنور صاحب اُسے وہاں نہ پاکر صدمے کی حالت میں کوئی غضب ڈھا بیٹھیں۔ اس خیال ہی سے اسکے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ایک منٹ کے لئے اس کا دل بے چین ہوگیا۔ پھر وہ میز پر جھککر خط لکھنے لگی:۔

"پریتم! مجھے معاف کرنا میں اپنے کو تمہاری داسی بننے کے لائق نہیں پاتی تمہیں نے مجھے پریم کا وہ نورانی چہرہ دکھا دیا جس کی اس زندگی میں امید نہ کر سکتی تھی میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔ لیکن جب تک زندہ رہوں گی تمہاری یاد میں مگن رہوں گی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریم کی یاد میں وصل سے کہیں زیادہ مٹھاس اور لطف ہے۔ میں پھر آؤں گی میں چھپ آؤں گی۔ پھر تمہارے درشن کروں گی لیکن اسی حالت میں جب تم شادی کر لوگے۔ یہی میرے لوٹنے کی شرط ہے۔ میری جان کی جان! مجھ سے ناراض نہ ہونا یہ زیور جو تم نے میرے لئے بھیجے تھے۔ اپنی طرف سے آپکی ہونیوالی دلہن کے لئے چھوڑے جاتی ہوں صرف وہ موتیوں کا ہار جو تمہارے پریم کا پہلا تحفہ ہے۔ اپنے ساتھ لئے جاتی ہوں تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں۔ کہ میری تلاش نہ کرنا میں تمہاری ہوں اور تمہاری رہوں گی۔۔۔۔!"

تمہاری تارا

یہ خط لکھ کر اس نے میز پر رکھدیا۔ موتیوں کا ہار گلے میں ڈالا اور باہر نکل گئی۔

تھیئٹر ہال سے گانے کی آواز آرہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس کے پیر بندھ گئے۔ پندرہ برس کا آج پرانا رشتہ ٹوٹا جارہا تھا۔ اچانک اس نے منیجر کو آتے دیکھا۔ اس کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ وہ تیزی سے لپک کر دیوار کی اوٹ میں ہوگئی۔ جیسے ہی منیجر گزر گیا وہ احاطے کے باہر آئی۔ اور کچھ دور گلیوں میں چلنے کے بعد اس نے گنگا کا راستہ پکڑا۔

گنگا پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دس پانچ سادھو بیراگی دھونیوں کے سامنے لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ یاتری کمبل زمین پر بچھائے سو رہے تھے۔ گنگا کسی بڑے سانپ کی مانند رینگتی چلی جاتی تھی۔ ایک چھوٹی سی ناؤ کنارے پر لگی ہوئی تھی۔ اور ملاح اس میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

تارا نے ملاح کو پکارا۔ "او ماجھی! ناؤ اس پار لے چلوگے؟"

ملاح نے جواب دیا۔ "اتنی رات گئے ناؤ نہ جائے گی"۔

مگر دگنی مزدوری کی بات سنکر اس نے چپوار اٹھائی اور ناؤ کو کھولتا ہوا بولا۔ "سرکار اس پار کہاں۔۔۔؟"

اس پار ایک گاؤں میں جانا ہے:

"اتنی رات گئے تو سواری نہ ملے گی" "مگر اتنی رات گئے کوئی سواری نہ ملے گی،"

"کوئی ہرج نہیں تم مجھے اس پار پہنچا دو"

ملاح نے ناؤ کھول دی تارا اس پر جا بیٹھی اور ناؤ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ گویا روح کی کشتی دریائے خواب میں رواں ہو۔

اسی وقت اکادشی کا چاند دنیا کے اس پار اپنی حسین کشتی کھیتا ہوا نکلا اور بحرِ فلک کو عبور کرنے لگا۔

جناب منظور بی۔ اے۔

تیری آنکھیں

چشمِ نرگس کو جا کے دیکھا ہے — خوب آنکھیں ملا کے دیکھا ہے
اس کا مجلہ ہے نور سے خالی — سر ہو جیسے شعور سے خالی
وہ ستارہ ضیا نہ ہو جس میں — بانسری وہ نوا نہ ہو جس میں
جام جس میں شراب کوئی نہ ہو — عمر جس میں شباب کوئی نہ ہو
جس میں خنداں جوانیاں ہی نہیں — خوبصورت کہانیاں ہی نہیں

تیری آنکھیں وہ ہو نہیں سکتیں
دل میں نشتر چبھو نہیں سکتیں

چشمِ آہوئے ختن میں دیکھی ہے — دشت و صحرا و بن میں دیکھی ہے
مانا اک حسن اس میں لرزاں ہے — پرتوِ مہر اس میں رقصاں ہے
اس میں بینائی بھی ضیا بھی ہے — جھینپ جانے کی اک ادا بھی ہے
لیکن اس میں سرور و کیف کہاں — مسکراتا سا مستیوں کا جہاں
اس کی پلکوں پہ کھیلتا ہی نہیں — ہلکا ہلکا تبسمِ رنگیں

تیری آنکھوں کو کوئی کیا جانے
گنگناتے ہیں جن میں میخانے

جناب فضلی آندھروی

آندھرا میں اردو

(ایک تلخ حقیقت)

اس زمانے میں جبکہ اردو کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے سارے ہندوستان میں ہر طرف ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے۔ غریب اردو کی کسمپرسی اور اہل زبان کی افسوسناک سرد مہری نہایت افسوسناک ہے اور آنے والے مصائب کو منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔ خصوصاً ملک آندھرا میں اردو کی وہ درگت ہے کہ الاماں والحفیظ۔ یوں تو روز اول ہی سے یہاں کی تحریر اور تقریر کا معیار شمالی ہند کی بہ نسبت کہیں پست و رکیک ہی تھا لیکن اردو کے ادیبوں اور انجمن ترقی اردو کے کارکنوں کی حیرت انگیز غفلت و بے پروائی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب اردو والوں کا وجود محض تبرک کے طور پر رہ گیا ہے۔ جہاں تک ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ اس ابتری کی تمام تر ذمہ داری خادمان اردو کی رسوا کن بے اعتنائی ہے جس کا انہیں ذرا بھی احساس نہیں۔

یہاں کا علمی معیار ملاحظہ ہو۔ جو کوئی اردو پرائمری پاس ہو جاتا ہے وہ اس سرزمین کے خاص محاورے میں "نیم پڑھا سوادی" کہلاتا ہے یعنی پڑھا ہوا آدمی۔ اور یہ عالم و فاضل اپنی برادری میں ایک منشی فاضل سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ اردو خطوط وغیرہ لکھوانے ہوں تو انہیں بے بدل ادیب صاحب کی چاپلوسی کیجئے۔ اور اگر یہ صاحب کچھ عربی عبارت بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اور مسائل کی ایک دو کتابوں سے بھی واقف ہیں تو بس غضب ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے لکھے ہوئے امداد الفتاویٰ پر بھی ناک بھوں چڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہاں کے لوگ اس کو اپنے مخصوص لب و لہجہ میں "اسے وہ مولی سر کا آدمی نارے" یعنی وہ تو مولوی جیسا آدمی ہے کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہے یہاں کا علمی معیار۔

علمی معیار کے بعد ذرا تقریری معیار کا حال بھی سن لیجئے۔ میں نے اسی آندھرا میں رہ کر اپنی زندگی کی تیس بہاریں دیکھی ہیں۔ مگر آج تک کسی جلسے میں کسی آندھروی کو صحیح اردو بولتے نہیں سنا۔ ہماری معلومات میں تو حقیقی معنی میں ایک بھی مقرر یہاں پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ موجود ہے۔ ہمارے علم سے باہر کوئی چھپے رستم ہوں بھی تو خدا ہی جانے۔ مگر وہ تعداد میں صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ یہاں انفرادیت سے کوئی بحث نہیں بلکہ شکوہ ہے۔ اجتماعی پستی کا۔ ایک دفعہ آندھرا کے ایک بڑے شہر میں جس کی کل آبادی بیس ہزار کے قریب ہے میلاد النبی کے جلسے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ دستور عمل پروگرام دیکھا تو اردو مقررین کے ساتھ کہیں لکھنوی کہیں بنگلوری کہیں دیوبندی کی دم لگی ہوئی تھی۔ ہم نے اپنے ایک ہم جلیس صاحب جو وہیں کے رہنے والے تھے دریافت کیا کہ کیا آندھرا میں ایک بھی مقرر نہیں مل سکا جو سب کے سب باہر سے طلب کئے گئے ہیں؟ جواب میں وہ حضرت کچھ کہنے ہی کو تھے کہ ایک مقرر صاحب تقریر کرنے کھڑے ہو گئے۔ اور ہم ہمہ تن گوش ہو کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے موضوع تقریر کو تو طاق نسیاں پر رکھ دیا اور لگے اہل آندھرا کی علمی بے سر و سامانی کا شکوہ کرنے۔ کبھی ارشاد فرماتے ہیں "ہمیں یہ سن کر بے حد حیرانی ہوئی کہ آندھرا مقررین کے وجود سے یکسر خالی ہے" کبھی کہتے ہیں "اگر تمام مدعو مقررین دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیتے تو ہمیں معلوم نہیں کہ اہل آندھرا کیا کرتے ہیں۔ کیا ان کے ہاں ایک بھی مقرر نہیں۔ افسوس . . . . . " ہم حیران تھے کہ یا اللہ یہ کیا راز ہے ان سیٹھ صاحب کو کیا ہو گیا کہ یوں آگ بگولا ہیں حتیٰ کہ اپنی تقریر کے موضوع کا بھی خیال نہیں۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ سیٹھ صاحب کسی تجارتی

سلسلے میں ممبئی سے آئے ہوئے تھے۔ اور کارکنانِ جلسہ کے مجبور کن اصرار سے تقریر کرنے کھڑے ہوگئے تھے۔ یہ ہے اہلِ آندھر کی تقریری خصوصیت۔

اب رہا تحریر کا حال تو یہ بات صحافتی دنیا خود ہی خوب جانتی ہے عیاں راچہ بیاں۔ اعداد و شمار پر روشنی ڈالنا ہمارا مقصود ہے نہ اس سے کوئی نتیجہ۔ ایک آدھ مضمون نگار اگر ہے بھی تو اس کا وجود ہماری بیان کردہ رائے کو غلط ثابت کرنے کے لئے دلیل نہیں ہوسکتا۔

سب سے زیادہ پرلطف بیان آندھری طرزِ تکلم کا ہے۔ واقعی ڈاکٹر اقبال کا مصرع

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

اسی آندھوی طرزِ گفتگو پر صادق آتا ہے۔ یہاں کی بات چیت کا حال کیا بیان کیا جائے۔ کوئی ایک نقص ہو تو بتایا جائے۔ ہم بطور نمونہ چند معروف جملے اور ان کا مدعا و مفہوم بیان کردینے پر اکتفا کرتے ہیں باقی اسی پر قیاس کیا جائے۔

اَیج آتم رکھو (بہائے مخلوط)	مفہوم	ابھی آتا ہوں ٹھیرئے
تمنا کو کیا	"	تمہیں کیا
نبا آتم کلو بول کو چلے گیا	"	کل آتا ہوں کہہ کر چلا گیا۔
تمنا کو کیکو دستا	"	تمہیں کیوں نظر آتا۔
تجھے میں کیا ذ بولم سو؟	"	تجھ سے میں نے کیا کہا تھا۔

اسی قسم کے صد ہا خندہ آفریں جملے اور بھی ہیں جن کے بیان کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ یہاں ہمیں ایک پرلطف قصہ یاد آگیا جس بیان خالی از لطف نہیں۔

میرے ایک رفیق ڈاکٹر ہیں۔ وہ کسی بیمار کو دیکھنے کے لئے گئے انہوں نے دیگر ہدایات کے علاوہ مریض کے عزیزوں کو تاکید فرمادی کہ بیمار کو روٹی دیا کرو۔ کھانا مت دیا کرو۔ بس پھر کیا تھا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کی دوا جاری تھی۔ ادھر گھر والوں نے کھانا (پکے ہوئے چاول) کھلانا شروع کردیا۔ مرض بڑھتا گیا۔ آخر مریض ان تیمارداروں کی کوڑمغزی کو روتا ہوا ملکِ عدم جا پہنچا۔ یہاں کے لوگوں میں جہلِ مرکب کے ساتھ ساتھ حسد اور رشک بھی بہت زیادہ ہے۔ اور ذہنیت ایسی الٹی کہ اگر کوئی ستم رسیدہ صحیح گفتگو کرنے کی کوشش کرے بھی تو اس کا ایسا مذاق اڑایا جاتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ بیچارے کو توبۃ النصوح ہی کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ ذلت یقینی ہے۔ یہاں کے خود ساختہ محاورے میں صحیح گفتگو "لغات جھاڑنا" کہتے ہیں۔ اسی جگ ہنسائی کے اندیشے نے تعلیم یافتہ حضرات کو بھی صحیح تکلم سے باز رکھا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو نوجوانانِ آندھرا میں سراسر جمود پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ آندھرا کے خیر اندیش اور اردو کے بہی خواہ اگر اپنے اس ناروا رویے میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا کرکے وطنِ عزیز کے نوخیز دلوں میں ترویج اردو کا ولولہ پیدا کریں تو بہت کچھ فائدہ ہوسکتا ہے۔ ورنہ وہ دن بہت ہی قریب ہے جبکہ سرزمینِ آندھر زبان اردو کے لطیف جسم پر ایک بدنما داغ ثابت ہوگی۔

اب رہا اردو کا وہ لطیف شعبہ جو ادب کا سرمایۂ عزیز کہلاتا ہے یعنی شاعری۔ تو اس کی نسبت سکوت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے تاہم مختصر طور پر سن لیجئے۔ جس خطۂ پاک کی تقریر و تحریر کا یہ حال ہو جو اوپر بیان ہوا تو وہاں کی شاعری کا پوچھنا ہی کیا۔ ایک آندھری ہونے کے باوجود گھر کا بھیدی بنکر ان تلخ حقیقتوں کو طشت از بام کرتے ہوئے راقم الحروف کے دل میں خفیف سی ندامت محسوس ہوتی ہے لیکن حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اصل بات تو ظاہر ہوکر ہی رہے گی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے آندھرا میں دس پانچ سے زیادہ شاعر نہیں جو آبادی کے تناسب سے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ اس قلیل تعداد میں بھی بہت سے غیر معروف ہیں۔ ان مایوس کن حقائق کے پیشِ نظر ہر ذی فہم سمجھ سکتا ہے کہ اس عجیب و غریب خطے میں زبان اردو کس حد تک پامال ہوئی اور ہورہی ہے۔ ہر ملک کے ادبی ذوق کا پتہ اس ملک کے ادبی رسائل و جرائد کی مانگ سے بخوبی چلتا ہے۔ آندھر کی حالت یہ ہے کہ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن پر ہگنبتم باتھم کمپنی مدراس کا مختصر کتب خانہ پایا جاتا ہے جا بجا ان اردو دکان کھول کر بیٹھے ہیں کہ یہاں انگریزی تلگو ٹمل وغیرہ زبانوں کے گوناگوں رسائل ملتے ہیں۔ مگر اردو رسالہ یا اخبار کسی اسٹیشن پر بھی نہیں ملتا۔ دریافت

کرنے پر جواب ملتا ہے کہ اردو رسائل یہاں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اس کے علاوہ جہاں تک مجھے علم ہے آندھرا کے کسی شہر میں اخبارات اردو کا کوئی ایجنٹ نہیں ہے۔ اور بہت کم لوگ اردو اخبار پڑھتے ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس ابتری کا تن تنہا سبب محض ادیبوں کی تن آسانی ہی نہیں بلکہ جہلا کی بے پروائی بھی برابر کی شریک ہے۔ مگر ہم ادب اردو کے جاں نثاروں کی خدمت میں باادب عرض کرینگے کہ جہلا بیچاری کی بے خبری ہوتی ہے۔ عقلا تو خود ہی نتیجہ شناس اور عاقبت اندیش ہوا کرتے ہیں۔ اب تک دیکھا گیا ہے صوبہ مدراس میں بقائے اردو کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر عملی قدم آج تک نہیں اٹھایا گیا اور نہ اس وقت کوئی ادبی انجمن ہے۔ جو سرگرم عمل ہو۔ یوں تو وقتی جوش کے ماتحت جلسے بھی ہوا کرتے ہیں کمیٹیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ مشاعروں کے ہنگامے بھی بپا ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اخباروں میں بھی "اردو کی ترقی کے لیے قیام انجمن" کی خبر بھی چھپ جاتی ہے لیکن مآل کار ہماری کانفرنس سازیاں اور انجمن بازیاں

نشستند و گفتند و برخاستند

کی عملی تفسیر سے بڑھ کر نہیں ہوتیں۔ اگر تنزل کی رفتار کچھ دن اور یہی رہی۔ تو یقین جانئے کہ غریب اردو ایک نہ ایک دن حرف غلط کی طرح مٹ جائے گی۔ آندھرا کے تعلیم یافتہ نوجوانو! اب بھی آنکھیں کھولو اور اپنی پیاری زبان کی حفاظت و بقا کے لئے کچھ کرو۔ اپنے فرض کو پہچانو تمہیں اپنی عزیز زبان کے لئے عملاً کچھ کرنا ہے۔ یاد رکھو کہ زبان پر قوموں کی زندگی کا مدار ہے۔ جو قومیں اپنی زبان سے غفلت کرتی ہیں رفتہ رفتہ ان کی معاشرت تہذیب تاریخ سب مٹ جاتی ہیں اور آخر میں وہ خود فنا ہو جاتی ہے۔

نقد و نظر

ادارہ

کارواں۔ زیر ادارت جمیل احمد کنہ چودھری بی اے کتابت طباعت اعلیٰ صفحات ۴۴ سالانہ چندہ دو روپے فی پرچہ ۳ مقام اشاعت۔ دفتر رسالہ کارواں بانکی پور، پٹنہ)

کارواں ایک جدید و قیع ادبی مجلہ ہے جو ہونہار انشا پرداز حضرت جمیل احمد کنہ چودھری بی اے کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ موجودہ دور میں تمام صوبے اردو کی بقا کے اہم مسئلے پر توجہ کر رہے ہیں۔ صوبہ بہار بھی اس سلسلے میں امکانی کوششوں کو بروئے کار لا رہا ہے اور کارواں کا اجرا ان کوششوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے جناب جمیل شمیم کی ادارت سے بھی منسلک ہو چکے ہیں ویسے بھی ہونہار ادیب ہیں توقع ہے کارواں خوب ترقی کریگا۔

زر تنقید نمبر میں غریبوں کی جنت ترجمہ علی اشرف جعفری یا دطفلی از جلال ملیح آبادی، سوشلزم ترجمہ عبدالباقی بی اے۔ اور وفاداری ترجمہ جمیل احمد بی۔ اے قابل قدر مضامین نظم و نثر ہیں۔

پریم سوگ۔ (مرتبہ محمد حسام الدین غوری کتابت طباعت اعلیٰ صفحات ۱۱۰ قیمت ۸ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن)

منشی پریم چند مرحوم و مغفور اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے تھے جن پر اردو ہمیشہ فخر کرتی رہیگی اس جلیل القدر افسانہ نگار کے متعلق جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ پریم سوگ میں جناب محمد حسام الدین صاحب غوری نے مرحوم پریم چند کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے ان کی افسانہ نگاری ناول نویسی کی باریکیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے محترم مرتب نے کتاب کو کئی مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے جن میں مرحوم کے حالات زندگی ادبی حیات کے گوناگوں اور افسانہ نگاری اور ناول نویسی کی خصوصیات کو معرض تحریر میں لایا گیا ہے۔

زمانہ۔ پریم چند نمبر مرتبہ دیا نرائن نگم بی اے کتابت و طباعت اعلیٰ صفحات اڑھائی سو قیمت ۲ (ملنے کا پتہ دفتر رسالہ زمانہ کانپور) زمانہ اردو کا مقتدر رسالہ ہے حال ہی میں اس کا پریم چند نمبر شائع ہوا ہے جو اڑھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نمبر تین حصص میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں مرحوم و مغفور افسانہ نگار کے حالات زندگی ہیں جنہیں اردو کے مشہور انشا پرداز حضرات نے لکھا ہے اس حصے میں پریم چند ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے بہت کامیاب مضمون ہے مضمون نگار فراق گورکھپوری ایم اے نے وسعت نظر کیساتھ باریک بینی سے بھی کام لیکر منشی پریم چند کے چیدہ چیدہ حالات زندگی اور ان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے حصہ دوم میں منشی جی کی تصانیف کے کئی اقتباسات کو معرض تحریر میں لایا گیا ہے تمام کے تمام

مضامین خوب ہیں، بالخصوص مسٹر طالب الٰہ آبادی، سید مقبول حسین بی۔ اے کے مضامین پریم چند کے ناول اور پریم چند کا ایڈیشن بہت کامیاب ہیں۔ حصہ سوم میں دو فوٹو کا اخراج تحسین ہے درجہ ادیب کی خدمت میں اس حصے میں جناب بابو بجا ندپوری منشی جگدیش نرائن کی نظمیں بہت خوب ہیں مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بے حد کامیاب بے حد مفید ہے منشی جی کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ منشی صاحب کی حیثیت افسانہ نگار و ناول نویس کوئی ایسی چیز ہی نہیں جس کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ واقعی یہ نمبر اس قابل ہے کہ منشی صاحب کا ہر عقیدتمند اس کا مطالعہ کرے۔ زمانہ کے محترم ایڈیٹر جناب دیانرائن کی کوشش

محبوب خدا۔ (از چودھری افضل حق صاحب۔ کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ صفحات ۲۰۰۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور) چودھری افضل حق صاحب کی شخصیت اب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپکی بے مثل تصنیف "زندگی" نے آپکو اردو کے ملوکادیبوں کی فہرست میں لاکھڑا کیا ہے "محبوب خدا" آپکی تازہ تصنیف ہے۔ جو آپکے تفکر و تدبر کا قابل تعریف نتیجہ ہے۔ اسمیں محبوب خدا صلعم، کی حیات مقدسہ کے چیدہ چیدہ حالات کو نہایت دلنشیں و دلآویز پیرائے میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔ سوانح عمریوں کی طرح اسکا پیرایہ بیان خشک نہیں۔ بلکہ فاضل مصنف نے جابجا شاعرانہ تشبیہات و استعارات سے عبارت کو بہت رنگین و دلچسپ بنا دیا ہے۔ کتاب مجلد ہے اور ٹائیٹل پر نام وغیرہ سنہری حروف میں کندہ کئے گئے ہیں۔

تصویر کشمیر۔ (از ابو الاثر حفیظ جالندھری۔ کتابت و طباعت بہت خوب۔ صفحات ۔ قیمت ۸ ۔ ملنے کا پتہ:۔ اردو اکیڈمی لوہاری دروازہ لاہور)

تصویر کشمیر جناب حفیظ جالندھری کی ایک طویل مگر پر اثر نظم ہے جس میں شاعر نے سیاحت کشمیر کے مشاہدات کو رنگین و دلآویز پیرائے میں نظم کیا ہے۔ کشمیر ایک طرف اپنے رنگین مناظر کی فردوسیت کے لحاظ سے کرۂ ارض پر دلکشی کی کشش رکھتا ہے تو دوسری طرف اپنی جانگداز مصیبت کے باعث "جہنمی عقوبت" کا روح فرسا منظر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے لاتا ہے "تصویر کشمیر" میں یہ دونوں پہلو ظاہر کئے گئے ہیں۔ نظم شروع سے لے کر آخر تک موثر و دلآویز ہے۔ چند اشعار پڑھئے۔

برف کی اونچائیاں، برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بو کی شوخیاں، پھولوں کی بے پروائیاں

سبز قالینوں پہ دیوداروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے، چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں

آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا!
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مطائبات۔ (از سند باد جہازی۔ کتابت و طباعت جاذب دل و نگاہ صفحات ۱۸۱۔ قیمت ایک روپیہ۔ (ملنے کا پتہ اردو اکیڈمی لوہاری گیٹ لاہور) اردو کے فکاہیہ نگاروں میں جناب سند باد جہازی امتیازی خصوصیت کے مالک ہیں۔ نثر میں طنز نگاری آپ ہی کا حصہ ہے۔ مطائبات آپکے (۴۰) چالیس فکاہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اور ہر ایک مضمون نہایت دلچسپ و دلآویز ہے۔

مبادئ سیاسیات حصہ دوم۔ (از پروفیسر ہارون خاں شروانی ایم۔ اے (آکسن) ایف۔ آر۔ ایچ۔ ایس، صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن۔ کتابت و طباعت بہت اعلیٰ۔ صفحات ۴۱۶ قیمت ۔ ملنے کا پتہ: مصنف سے طلب کیجئے)

پروفیسر ہارون خاں شروانی ایم۔ اے آکسن کے عالمانہ مقالات رسائل و جرائد میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔ مبادئ سیاسیات فاضل پروفیسر کی سیاسیات پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس کا پہلا حصہ جس میں مملکت کے متعلق مختلف نظریات ہیں، چار ماہ ہوئے شائع ہو چکا ہے۔ زیر نظر کتاب اس کی دوسری جلد ہے جس میں حکومت کے ترکیبی عناصر اور بین الاقوامی ہیئت پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب تیئیس ابواب کو محیط ہے اور ہر باب میں سیاسیات کے کسی نہ کسی اہم پہلو پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ ابواب کے ساتھ ساتھ چند ایک ضمیمے بھی شامل کئے گئے ہیں اس طرح علم السیاست کا کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑا۔ بہرحال پروفیسر صاحب کی سعی نہایت کامیاب رہی ہے۔ جو حضرات سیاسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں فوراً اس مفید و دلچسپ کتاب کی طرف توجہ کرنی چاہئے!

ہفتہ وار نیر اعظم۔ (زیر ادارت جناب نظامی صفحات ۱۶۔ سالانہ چندہ تین روپے ۔ مقام اشاعت مینجر ہفتہ وار نیر اعظم مراد آباد)

نیر اعظم ایک ہفتہ وار اخبار ہے جو جناب نظامی کی زیر ادارت بڑی کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے مضامین کے تنوع و انتخاب پر جناب ایڈیٹر صاحب خاص توجہ دیتے ہیں زیر نظر نمبر میں "فرمانروایان ہند کا اعلان" کے عنوان سے جو مقالہ افتتاحیہ دیا گیا ہے وہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ دیگر مضامین بھی مفید و کار آمد ہیں۔ اخبار کی کامیابی محترمہ دختر المیس ابن عالی مرحوم کے مرہون منت ہے۔

حوالہ اخبار ضرور دیں

دنیائے خضاب میں ہولناک زلزلہ

"اکسیر حنا" بال سیاہ کریم

رجسٹرڈ

سفید بالوں کو سیاہ کرنے میں یدِطولیٰ رکھتی ہے موجودہ زمانہ میں ہزارہا اقسام کے ولایتی و دیسی خضاب اور کالے تیل تیار ہو چکے ہیں جو کہ رنگ برنگی ہونے کی وجہ سے بہت ہی ضرر رساں ثابت ہوئے ہیں بعض حضرات جو ان نام نہاد خضابوں اور کالے تیلوں سے متنفر ہو چکے ہیں مہندی استعمال کرتے ہیں وہ بھی گھنٹوں بھر کی انتظاری سے اکتا گئے ہیں پبلک کی ان تکلیفات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد ہم نے ایک نایاب بال سیاہ کریم تیار کر لی ہے۔ یہ کریم سفید بالوں کو چند منٹوں کے اندر اندر شبِ دیجور کی مانند سیاہ کر دیتی ہے۔ اس کا نام "اکسیر حنا" رجسٹرڈ ہے یہ اپنے نام اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک بے نظیر چیز ہے یہ نہایت ہی آرام دہ اور قابلِ اعتبار ہے۔ یہ کریم مہندی اور دیگر یونانی ادویات کے مرکب سے کشید کر کے تیار کی گئی ہے اور اسے طبِ جدید کے زریں اصولوں سے بنایا گیا ہے۔ جلد پر دھبہ نہیں ڈالتی۔ نزلہ اور زکام کی شکایت مطلقاً نہیں ہونے دیتی بالوں کو ہمیشہ کیلئے سیاہ، جلد کو نرم، خشکی کو دور کرنے کے علاوہ گرتے بالوں کو بچاتی ہے۔ اس کی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ کو تازگی اور دل کو فرحت پہنچتی ہے۔ زیادہ تعریف کرنا فضول ہے اگر تحریر کے مطابق بالوں کو سیاہ نہ کرے تو قیمت بلاعذر واپس آزمایش شرط ہے۔ قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ۔ نمونہ مفت پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہے۔

مفت نمونہ طلب کرنے والے حضرات کے لئے ۸ آنے کے ٹکٹ ڈاک ارسال کرنے لازمی ہیں۔ ان کے بغیر تعمیل ارشاد نہ ہوگی۔ ایجنٹوں کی ہر شہر میں ضرورت ہے۔ شرائط ایجنسی کیلئے خط و کتابت کریں اپنا پتہ نہایت خوشخط اردو یا انگریزی میں تحریر کریں ＊ (اس اشتہار کا مضمون رجسٹری شدہ ہے)

المشتہر

منیجر نشاط ٹریڈنگ کمپنی رجسٹرڈ لاہور

Regd. No. L 5…

علمی ادبی و تنقیدی ماہوار مرقع

ادبِ لطیف

مصوّر — لاہور

ایڈیٹر

چودھری برکت علی بی اے

فی پرچہ -/۹/-

جلد [illegible]
سالانہ ۳/۱۰

دار الاشاعت

مکتبۂ اردو۔ ۱۵ سرکلر روڈ لاہور



اِس مجموعے میں وہ بہترین افسانے شامل ہیں جو دنیا بھر کے نقادان ادب
نظر میں بہترین تسلیم کئے گئے ہیں۔ اور جو اب تک اُردو میں منتقل نہیں
تھے۔ "چاند کا گناہ" اور دیگر افسانے پڑھ کر ھینز ایند رسن۔ سر اینتھنی ہو
فریڈرک ترینٹ۔ کیتھورن۔ طامس ھارڈي۔ أو۔ھنري۔ جیرم کے جیرم۔ رڈ یڈ کپلنگ
روئیڈا۔ چیخوف۔ لارڈ تینیسن اور دوسرے مشہور ترین افسانہ نگاروں کی
سنئے۔ اِن افسانوں کا ترجمہ پنجاب کے مشہور نوجوان انشاپرداز راجہ مہدی
علی خاں نے نہایت سلیس شستہ اور بامحاورہ زبان میں کیا ہے۔
مضبوط جلد۔ سرورق رنگین۔ لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب قیمت مجلد دو

تاریخ حریت اسلام

مصنفہ مولانا محمد الدین فوق۔ نقل سرکلر ۵؍ مورخہ ۹ اگست ۱۹۲۳ء منجانب ڈائرکٹر صاحب بہادر محکمہ تعلیم پنجاب لاہور بنام تمام ڈپٹی کمشنران و ڈویژنل ڈسٹرکٹ انسپکٹران آف سکولز چیف انسپکٹران آف سکولز چیف انسپکٹرس آف سکولز اعلےٰ افسران گورنمنٹ کالج و سکولز ہیڈ ماسٹر صاحبان اینگلو ورنیکلر سکولز بورڈ اسکنڈری سکولز مینجر صاحبان ایڈڈ و منظور شدہ سکولز پنجاب سپرنٹنڈنٹ بورسٹل انسٹی ٹیوشن لاہور۔ جناب من! مندرجہ بالا کتاب کیلئے بطور انعامی کتاب بہ سکولز لائبریریوں میں خریدے جانے کی سفارش کی جاتی ہے۔ قیمت مجلد مطلا ایک روپیہ

نوٹ:۔ اس طرح صوبہ سرحد بھوپال، بہاولپور، حیدرآباد دکن کے محکمہ تعلیم نے بھی اس کو انعامی اور لائبریری بکس میں منظور فرمایا ہے۔

دختران ہند

مصنفہ مولانا محمد علم الدین سالک ایم۔ اے (علیگ) پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور۔ محکمہ تعلیم پنجاب سے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبری سی ۱۶۲۴۵ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۳۶ء و محکمہ ہائے تعلیم صوبہ سرحد۔ سی پی۔ ریاست جموں و کشمیر نے بھی اسے منظور فرمایا ہے۔ جس کا ایک ایک حرف برسوں کی شبانہ روز تحقیق اور کد و کاوش کے بعد معرض تحریر میں آیا ہے۔ اس میں ہندوستان کی سترہ مسلم خواتین کے درست اور سچے تاریخی حالات درج ہیں جنہیں ذی علم اصحاب اہل الرائے حضرات، ماہران تعلیم، مدیران جرائد اور رہنمایان ملک و ملت نے بے حد پسند فرمایا ہے۔ آج کی لڑکیاں کل مائیں ہوں گی۔ سیاسی، تمدنی، اعلیٰ اخلاق اور زبردست مذہبی کیرکٹر والی مائیں بننا اور بنانا ہو تو یہ کتاب پڑھئے اور پڑھائیے۔ قیمت مجلد و مطلا ایک روپیہ ۔۔۔ عہ

سبق آموز کہانیاں

مصنفہ مولانا محمد الدین فوق۔ جو بچوں میں شرافت و شجاعت نیکی و پاکیزگی۔ ہمت و استقلال فرمانبرداری و خودداری اور اعلےٰ اخلاق کے جوہر پیدا کرنے کے لئے دنیا کے مختلف نتیجہ خیز تاریخی واقعات جمع کی گئی ہیں منظور شدہ محکمہ تعلیم پنجاب بموجب سرکلر نمبر سی ۱۶۲۴۵ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۳۶ء قیمت ۴ر

دیگر منظور شدہ کتب

وشست و شوامتر سرکلر نمبر ۲۰۴۴۲ مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۳۲ء قیمت ۴ر	سیواجی مرہٹہ سرکلر نمبر ۲۰۴۴۲ مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۳۲ء قیمت ۴ر
نوجوان سادھو 〃 〃 〃 ۴ر	نور جہاں 〃 〃 〃 ۴ر
عرب کی کہانی 〃 〃 〃 ۶ر	واقعہ کربلا 〃 〃 〃 ۴ر

کتاب	مصنف	سرکلر نمبر	مورخہ	قیمت
ارمغان عرب	مصنفہ ایم اسلم	سرکلر نمبر ۲۵۰۴۔ بی	مورخہ 9/12/29	قیمت ۴ر
نور ہدایت	〃	〃	〃	۴ر
ساربان	〃	۲۴۸۹	۱۵-۱۲-۲۵	۴ر
انتقام	〃	۶۳۵	۳-۸-۲۵	۳ر
امانت	〃	۶۳۵	۳-۸-۲۵	۳ر
قیدی شیر	آغا طاہر	۲۱۲۳۶	۱۹-۱۲-۳۰	۰-۱-۱۰
غنچۂ حکمت	〃	〃	〃	۰-۲-۰
پر پرواز	آغا شاعر	۲۱۲۳۶	۱۹-۱۲-۳۰	۰-۳-۶
دامن مریم	〃	〃	〃	۰-۴-۶
طالب علم کی زندگی	آغا صفدر	۹-۱۱۵۹۰	۲۹-۱۱-۲۶	۱۲ر

ملنے کا پتہ: مکتبہ اردو ۱۵ سرکلر روڈ لاہور

اردو ادبی لٹریچر کی پاکیزہ کتابیں

صحیفۂ ادب قیمت [illegible]	مراۃ الغالب قیمت [illegible]	غالب قیمت [illegible]	غالب نامہ قیمت [illegible]
طوفانِ ظرافت ۶ر	شرح دیوانِ غالب آسی [illegible]	مے دو آتشہ ترجمہ رباعیات عمر خیام [illegible]	دیوانِ غالب طاہر ایڈیشن [illegible]
حیاتِ مومن ۱۲ر	شرح دیوانِ ذوق [illegible]	ادبیاتِ ایرانِ نو [illegible]	اردو کے اسالیب بیان [illegible]
یادگارِ وارث بہ یادِ وارث شاہ پر مکمل تبصرہ [illegible]	بیاضِ سحر [illegible]	جدید فوٹوگرافی مجلد [illegible]	انقلابی افسانے [illegible]
مذہب اور باطنی تعلیم مجلد [illegible]	نغمۂ زندگی مجلد [illegible]	ادبستان مجلد [illegible]	میری داستانِ حیات [illegible]
دولتِ غزنویہ [illegible]	نغمۂ نوری ۱۲	کامیاب افسانے [illegible]	سحرِ بنگال [illegible]
ایوانِ تصور [illegible]	سرگذشتِ اسیر [illegible]	نغمۂ روح ۱۲ر	دلچسپ افسانے [illegible]
دلگداز افسانے [illegible]	بیتیا اور دیگر افسانے ۱۱ر	[illegible] افسانے نیاز ۲ جلدوں میں فی جلد [illegible] مجلد [illegible]	نگارستان نیاز فتح پوری [illegible]
گلستانِ جلی نیاز فتح پوری [illegible]	شہاب کی سرگذشت نیاز [illegible]	گہوارۂ تمدن نیاز [illegible]	بہارستان ظفر علی خاں کا مجموعۂ کلام [illegible]
سوزِ ناتمام [illegible]	ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش [illegible]	اخوان الشیاطین [illegible]	اسلامی افسانے [illegible]

منظور کردہ محکمۂ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد و ریاست حیدرآباد دکن

مکتبۂ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ ادبِ لطیف لاہور

اپریل ۱۹۳۸ء

ادارہ تحریر

چودھری برکت علی بی۔اے
میرزا ادیب بی۔اے

مقام اشاعت

مکتبۂ اردو لاہور

کتبہ: محمد شریف عباسی خوشنویس لاہور

فی پرچہ چار آنے

چودھری نذیر احمد

سالانہ چندہ مع ضخیم سالنامہ و افسانہ نمبر ۳ روپے علاوہ محصول ڈاک

چندہ ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

مندرجات

جلد ۷ | بابت ماہ اپریل ۱۹۳۸ء | نمبر ۲

ادارہ

نذرِ اوّلین

یوم حشر سامنے کے صفحے پر قارئین کی نگاہوں سے ایک پر اثر پر درد اور پر زور اپیل یوم حشر کے انعقاد کے سلسلے میں گزرے گی! یہ اپیل ارباب بزم فروغ اردو اسلامیہ کالج لاہور کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ اور اس بات کی مستحق ہے کہ قارئین اسے بغور پڑھیں نہ صرف بغور پڑھیں بلکہ منتظمان یوم حشر کا ہاتھ بھی بٹائیں! کون شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ آغا حشر مرحوم و مغفور کی یادگار قائم کرنا اکی اہم اردو خدمات کا ایک معمولی سا اعتراف ہے۔ آغا مرحوم نے اپنی تمام زندگی فن تمثیل نگاری کی خدمت میں صرف کر دی اردو کے فروغ و ترقی کے باب میں انکی کوششوں سے کام لیا اور سٹیج کی ترتیب و تزئین میں دل و دماغ کی تمام صلاحیتوں کو وقف کر دیا! اس لئے آج اس مخلص محسن اردو کے یوم کو شاندار سے شاندار طریقے پر منانا ملک کا فرض ہے۔

دن منانا مسلّمہ ہے اس حقیقت کو کہ کسی محسن کے احسانات کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ یوم حشر بھی ایک اعتراف ہے آغا مرحوم کے ان ناقابل فراموش احسانات کا جو انہوں نے فن ڈراما پر کئے تھے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے اس محبوب ترین ڈراما نگار کی خدمت کا کما حقہٗ اعتراف نہ کریں!

ہم زندہ دلانِ بزم فروغ اردو کی خدمت میں گذارش کرینگے کہ یوم حشر ایک ہنگامی یادگار بنکر نہ رہ جائے۔ کوشش کرنی چاہیئے کہ اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اور وہ اس طرح کہ یوم حشر کے اجلاس میں ذیل کی تجاویز پر غور کیا جائے اور جلد ہی ان پر عمل کیا جائے

(۱) آغا حشر کے تمام ڈراموں کی فراہمی! (۲) آغا حشر کے ڈراموں کی اشاعت!! ہم سب سمجھتے ہیں کہ آغا کی سب سے بڑی یادگار جو قائم ہو سکتی ہے وہ اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم آغا مرحوم کے تمام ڈراموں کو فراہم کریں اور پھر انہیں کتابی صورت میں ملک کے سامنے پیش کر دیں! آغا مرحوم کی یادگار میں کوئی لائبریری کھول دینا یا اسکے نام پر کوئی رسالہ یا اخبار نکال دینا یقیناً ایک مستحسن کوشش ہے۔ اور ہم اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ مگر یہ آغا مرحوم کی سچی یادگار نہیں۔ اُس کے ڈرامے تو ابنائے روزگار کی "خود غرضانہ کوششوں" اور "شخصی فوائد" کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں۔ پہلے ان کی حفاظت تو کیجئے بعد میں لائبریری وغیرہ بھی قائم کر لیجئے! آغا مرحوم نے اپنے ڈرامے مختلف کمپنیوں کو سٹیج کرنے کے لئے دیئے ہوئے تھے۔ اور اب وہ ڈرامے مضحکہ انگیز تغیرات کے ساتھ مختلف ناموں، مختلف اہل قلم کے اسمائے گرامی کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں اور بعض ڈرامے جو بازاروں میں بکتے ہیں اتنے بیہودہ اغلاط لئے ہوئے ہیں کہ انہیں پڑھکر طبیعت پر سخت برا اثر پڑتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کیا اس حالت میں مرحوم کے تمام ڈرامے تلف نہیں کئے جا رہے۔ اور وہ عنقریب تلف نہیں ہو جائینگے؟

ہم ارباب بزم فروغ اردو کی خدمت میں مودبانہ گذارش کرینگے کہ وہ اس اہم امر کیطرف توجہ دیں! اگر ان کی کوششوں سے مرحوم کے ڈراموں کی فراہمی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اور وہ کتابی صورت میں پیش ہو جائیں تو ہم سمجھتے ہیں یہ کام جہاں مرحوم کی سب سے بڑی یادگار ہوگی وہاں اردو پر بھی ایک بہت بڑا احسان!

افسانہ نمبر ادب لطیف کا اگلا نمبر افسانہ نمبر ہوگا۔ اس نمبر کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔ مندرجہ ذیل افسانے دفتر میں پہنچ چکے ہیں۔ قاتل از حضرت ایم اسلم، پریم کا سپنا از حضرت سراج الدین احمد نظامی، گل لالہ از جناب احسان بی اے، پتی ورتا از جناب خواجہ حسن عباس، ملن از پنڈت اوپندر ناتھ اشک بی اے، مزدور از جناب جمیل ایڈیٹر کارواں، دیوانہ از حضرت راز رامپوری، صبح کے بعد، قبر از قیام قاسمی، مجرم کون از جناب ادیب لیگانوی، شرط محبت از جناب باز چاندپوری، خدا سے بغاوت از حضرت الطاف مشہدی، محبت کی دیوی از جناب رشید یزدانی، پریم چند کے عشقیہ افسانے۔ از جناب شیفتی بی اے، اردو میں رومانی افسانے از جناب خیال مراد آبادی! دیگر حضرات کے مضامین۔ اور افسانے منقتہ عشرۃ تک پہنچ جائیں گے ہم افسانہ نگار حضرات کی شرکت کا خواہشمند ہوگا

یومِ حشر

اگر ہم دنیا کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ہمیں ہر قوم کی تاریخ ایسے واقعات سے مالا مال نظر آئے گی جس سے اُس قوم نے اپنے مشاہیر کو زندۂ جاوید بنانے کی کوشش کی مثلاً جب یونان کی تہذیب دنیا پر محیط تھی۔ اور یونان زندہ تھا تو اس نے اپنے فلاسفر شعراء اور ادباء کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اُنکے مجسمے بنائے۔ جو آج تک اُن کی عظمت اور بزرگی کے شاہد ہیں اور اُسکے علاوہ ایسی یادگاریں قائم کیں۔ جنکو دیکھکر اور جن کا حال پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ انکے دل میں اپنے مشاہیر کی کس قدر تکریم ہوا کرتی تھی۔ یہ حقیقت کتنی افسوسناک اور رنجدہ ہے کہ جب ہم ہندستان پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو ہمارے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں کہ ہمارے مشاہیر جنہوں نے ملک وملت کی خدمت کی اور جنکی خدمات کا ہم نے مختلف طریقوں سے اعتراف بھی کیا آج گمنامی کے پردے میں پڑے ہوئے ہیں۔ کیا مولینا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، فضل حسین، حکیم اجمل خاں اور تلک وغیرہ جیسے محبوب رہنماؤں کی یادگاریں قائم کرنا ہمارا فرض نہ تھا۔ ممکن ہے بعض کہیں کہ انکے میدانِ سیاست کے حریفوں نے راستے میں روڑے اٹکائے اور قوم کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔

لیکن ان ادباء سے مجرمانہ غفلت برتنے کے لئے ہمارے پاس کونسی وجہ جواز ہے۔ جنہوں نے ہمارے قومی ادب کو دنیا کی دیگر اقوام کی نگاہوں میں بلند کیا۔ جنہوں نے ملک کی آزادی کے گیت گائے۔ اور قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں تمام عمر صرف کر دی۔ اور مادرِ وطن کی آزادی کی تمنا لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے گروہ میں مشہور ڈرامانگار وشاعر "آغا حشر کاشمیری" بھی ہیں۔

ابھی تین سال کی بات ہے کہ حشر ہم میں موجود تھا۔ اس کی شاعرانہ عظمت اور اُس کی تمثیل نگاری کے کمال کے سامنے ہر صاحب فکر کا سر جھک جاتا تھا۔ اس کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ہمارے لئے زندگی بخش تھا۔ اس کی قومی نظمیں اور حریت آموز اشعار ہمارے سینوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دیتے تھے۔ اُسکے ڈرامے حسن وعشق کے پردے میں ہمیں زندگی کے حقائق ومعارف سے آشنا کرتے تھے۔ اور فطرت کے سربستہ رازوں کا خزینہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب سے وہ پیامِ حیات دینے والا ہم میں موجود نہیں۔ ہم اُس کی ادبی عظمت کو بھی فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ کیا یہ افسوسناک اور تاسف انگیز امر نہیں! ہمارا فرض اولیں یہ تھا۔ کہ اس کی موت کے فوراً بعد کوئی ایسا عملی کام کرتے جو ہمارے دل کی گہرائیوں میں اُسکی دبی ہوئی محبت کا ترجمان ہوتا۔ لیکن افسوس قوم اپنے فرض سے غافل رہی۔

اب اسلامیہ کالج لاہور کی "بزم فروغ اردو" نے اس مسئلہ کی طرف توجہ دی ہے یہ بزم پہلے بھی اپنی ادبی سرگرمیوں کی بنا پر ملک بھر میں احترام اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ اور سید سلیمان ندوی، سر عبدالقادر اور مولانا ظفر علی خاں جیسے ادباء اس کی سرگرمیوں کی تعریف کر چکے ہیں۔ "بزم" نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ ۳۰ اپریل کو "یوم حشر" منایا جائے۔ جلسے کئے جائیں۔ جن میں حشر کی شاعری اور تمثیل نگاری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔ حشر کے آرٹ اور دیگر موضوعات پر مقالات پڑھے جائیں اور تقریریں ہوں۔

آخر میں میں "بزم فروغ اردو" کی طرف سے ہندوستان کی ہر ادبی مجلس سے پر زور استدعا کرتا ہوں کہ وہ تاریخ مقررہ کو یوم حشر منائے۔

عبدالسلام خورشید
سیکرٹری بزم فروغ اردو
اسلامیہ کالج لاہور

جناب عبدالرشید بی۔ اے

"ادب اور اخلاقیات"

"ادب اخلاقیات سے علیحدہ نہیں ہو سکتا، لیکن اس کا مطالبہ روح ادب کو کچل دیتا ہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (گوئٹے)

جرمنی کے اس غیرفانی شاعر فلسفی اور نقاد کا یہ قول اس قدر جامع و مانع ہے کہ اس کے بعد اس مسئلہ پر کسی قسم کے نزاع کی توقع بعید از خیال بھی جانی چاہیئے تھی لیکن تاریخ تنقید کا مطالعہ کرنے والے اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہ مسئلہ پھر بھی وجہ نزاع بنا رہا۔ اور بیسیوں دماغ اس الجھن کو سلجھانے میں مصروف ہیں۔ ادب کے متعلق زاویہ ہائے نگاہ کا اختلاف ایک فطرتی امر ہے۔ اور اس کی وجہ وہ والہانہ اور اندھا دھند عشق ہو سکتا ہے۔ جو ہر نظریہ کے مؤید کو اپنے نظریہ سے ہوتا ہے۔ سیاسیات میں یہ بات ایک حد تک اصولی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ فریق مخالف کے نظریئے اور زاویہ نگاہ کے حسن و قوت کی جانچ نہیں کی جاتی۔ بلکہ صرف قبح اور کمزوری ہی کا تجزیہ کر کے اس کے حسن کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اگرچہ میدان ادب میں اس روش کی موجودگی انتہائی طور پر افسوسناک ہے لیکن ایک ٹھوس حقیقت کی طرح ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور اس کے وجود سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ اکثر مقامات پر یکھا گیا ہے۔ کہ فریق مخالف کے نظریہ کو انتہائی حقارت و نفرت سے نظرانداز کر کے ذاتی نظریئے کے حسن اور اس کی بلندی کی قصیدہ خوانی کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن پرلطف امر یہ ہے کہ جب ان ادبا کی تحریر کے بین السطور کا عمیق مطالعہ کیا جائے۔ تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ کہ وہ نہ صرف ایک دوسرے کے نظریہ کی صحت ہی تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس کی مبالغہ آمیز تعریف سے بھی گریز نہیں کرتے اور اس کے متعلق ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سچ پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے۔ اسے کسی چار دیواری میں خواہ وہ کتنی مضبوط کیوں نہ ہو بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ظاہر ہونے والی چیز ہے ظاہر ہو کر رہتی ہے کسی کوشش سے اسے پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ ہاں مغربی ادبا کی یہ روش تو بھی قابل معافی ہے لیکن چند جوشیلے مشرقی ادبا کی یہ روش براہ راست مغرب سے حاصل کی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جو نہ صرف بری تقلید کا ایک برا نمونہ ہے بلکہ آزادی فکر کا دیوالہ نکالنے میں بھی کافی حد تک ممد ثابت ہوتی ہے

ہمارے سامنے سوال صرف یہ ہے کہ ادب میں اخلاق کا امتزاج ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اگر نہیں تو کس صورت میں اور ہونا چاہیئے۔ تو کیسے؟ نیز کیا ادبیات میں اخلاق کی عدم موجودگی اسے دنیائے ادب سے خارج کر سکتی ہے۔ اور کیا اس کی موجودگی ادب سے ادبیت چھین لیتی ہے؟ اس کے متعلق دو فریق ہیں۔ ایک اخلاق کی موجودگی ناگزیر سمجھتا ہے۔ اور اس کی موجودگی پر مصر ہے دوسرا اسے کسی ہیئت میں بھی دیکھنے کا روادار نہیں۔ اور وہ گلستان ادب سے اس مرجھائے ہوئے (ان کے خیال میں) پھول کو نکال پھینکنے پر تلا ہوا ہے۔

اور ہم ابتدا ہی میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری ناچیز رائے میں گوئٹے کا مقولہ بالا قول قطعی طور پر درست ہے۔ گوئٹے نے اس اخلاق کا کیا مفہوم لیا تھا۔ یہ کہنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ انتہائی کوشش کے باوجود ہمیں وہ تصانیف دستیاب نہیں ہو سکیں۔ جن میں اس نظریہ کو بوضاحت پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کی افسوسناک وجہ یہ ہے کہ ہم خالصتہً "بے ادبی" فضا میں رہتے ہیں تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس درجہ برگزیدہ اور عظیم الشان ادیب کا مفہوم انتہائی طور پر وسیع ہوگا — اتنا وسیع جتنا کہ ادب وسیع ہے۔ ہم اس اخلاق کا کیا مفہوم لیتے ہیں۔ اس کا ذکر آئندہ

شعور میں ہو گا۔ سردست ہم مخالفین اخلاق کے نظریات کا تجزیہ کریں گے تاکہ ان کا نقطۂ نگاہ واضح کر کے اپنی رائے غیر مبہم طریق پر ظاہر کر سکیں۔

ادب میں امتزاج اخلاق کے مخالفین جیسا کہ ہم مقصد ادب میں ظاہر کر چکے ہیں۔ وہی ہیں جو مجموعی طور پر ادب کا اولین فرض "مسرت" بہم پہنچانا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں ادیب کوئی مولوی۔ پنڈت یا پادری نہیں بلکہ ادیب ہے۔ ایک فنکار ہے۔ اور اس کے ادبیانہ فرائض میں کسی قسم کی تعلیم دینا داخل نہیں۔ ہماری رائے میں ادب ذریعۂ مدعا نہیں بلکہ خود ایک مدعا ہے۔ اور ہمارے اس خیال کی تصدیق پروفیسر بریڈلے انگریزی زبان کے ایک مستند نقاد کے اس قول سے ہوتی ہے کہ "ادب بجائے خود ایک مقصد ہے اور فی نفسہ ایک قیمتی چیز ہے۔" ادب مقصد کیوں ہے اور کس کا ہے؟ یہ ہمارا منشا ہے کہ ادیب کا مقصد یا مدعا تخلیق ادب ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں اور ادب مقصد اس لئے ہے کہ دنیا کی بہترین اور بزرگ ترین ایجادات میں سے ایک ہے۔ اور اگر آپ "فن برائے فن" کے اصول کی صحت تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اور اس بات پر مصر ہیں کہ فن کا مقصد فن کے علاوہ کوئی اور شئے ہے۔ تو آپ یقیناً کوئی تسلی بخش وجہ نہیں بتا سکتے کہ یہ مقصد صرف مسرت ہی ہو یا تعلیم اخلاق نہ ہو۔ آپ چاہتے ہیں کہ ادیب پر ایک پابندی عائد کر دیں یہ بے جا مداخلت ہے علاوہ ازیں جس بات میں آپ مسرت محسوس کرتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ دوسرے بھی اسی میں مسرت محسوس کریں اور یہ تو قطعی طور پر ناممکن ہے کہ لوگ آپ ہی کے ذریعۂ مسرت کو صحیح سمجھیں اور اسی پر ایمان رکھیں۔ فرض کیجئے کہ ایک طبقہ اخلاقیات میں مسرت محسوس کرتا ہے تو آپکو یقیناً یہ حق نہیں۔ کہ جس ادب میں اخلاقی تصورات ہوں آپ اس کی مذمت کریں۔ کیونکہ قاری تو اس میں مسرت محسوس کر رہا ہے۔ اور آپ صرف یہ کہتے ہیں کہ ادب کا مقصد مسرت بہم پہنچانا ہے اور یہ نہیں کہتے کہ مسرت اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی ہمارے خیال میں یہ لوگ ادب کو ایک لفظی شعبدہ اور محض ایک کھلونا سمجھتے ہیں جس کے ساتھ یہ کچھ وقت کے لئے دل بہلا سکیں۔ اور اس طبقہ کی نمائندگی مسٹر مونٹیگ ایک فرانسیسی ادیب نے صحیح طور پر یوں کی ہے کہ شاعری عورتوں کے لئے ایک موزوں تفریح ہے۔ یہ ایک پُر از تفنن اور نازک فن ہے جو ایک بھیس بدلے ہوئے بانوئی کی طرح ہمہ تن مشغول مسرت ولہو ولعب ہے" یہ تعریف ہمارے خیال میں نہ صرف مضحکہ خیز ہے۔ بلکہ انتہائی پستئ ذوق کی آئینہ دار بھی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تعریف کیونکر وضع ہوئی لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ فرانسیسی قوم کی خصوصیت (تفریح وتفنن وزن پرستی) کا ثمرہ ہے۔ ادیب مذکور ان ایام میں بقید حیات تھے۔ جب عورتوں کی چاپلوسی اور انہیں ہر طرح خوش رکھنے اور اپنا لینے کی کوشش ہر پیر و جواں کا محبوب مشغلہ تھا صنفی حسن کی پرستش اور اس کی قصیدہ خوانی مجلسی نظام کا ایک جزو اعظم بنی ہوئی تھی۔ اس وقت کا ادب درباری ادب تھا۔ دربار عشرت گاہیں بنے ہوئے تھے۔ اور ادبا و شعرا کو اس عشرت زدہ ماحول کی خصوصیات اور لوازمات کے پیش نظر ادب پیش کرنا پڑتا تھا۔ اور اس زن پرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض فوجی امرا نے بھی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ محولہ بالا اور اس قبیل کی تعریفیں عالم وجود میں آئیں۔ قطع نظر اس کے جب ہم اس مقصد۔۔ مسرت .... کو بنظر غائر دیکھتے ہیں تو یہ انتہائی طور پر مبہم نظر آتا ہے۔ اور اس ابہام کی یہ حالت ہے کہ مغربی ادبا کہیں بھی اُسے تسلی بخش طریق پر واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ جرمنی کے فلسفی نقاد لیسنگ نے اس مقصد ادب پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ سوال کیا تھا۔ کہ اگر فن کا مقصد مسرت ہے تو یہ مسرت "کس قسم کی ہونی چاہئے۔ اور ہم بصد احترام یہ کہنے کی جسارت کرتے ہیں کہ مغربی ادب میں اس سوال کا تسلی بخش جواب کہیں نہیں مل سکتا۔ کولرج انگریزی زبان ادب کا مسلمہ طور پر بہترین اور بزرگ ترین نقاد مانا جاتا ہے۔ اس کی بھی یہ رائے ہے کہ ادب سے مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مقصد نہیں۔ بلکہ ادب کے حقیقی مدعا کے حصول کے بعد مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور ہمیں اس رائے کی صحت تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں۔ اور یہ ظاہر ہو گا کہ بقول کولرج ادب کا حقیقی مدعا مسرت نہیں کچھ اور ہے۔ عصر حاضر کے ایک ادیب مسٹر آگسٹائین نے یہ لکھا ہے۔ کہ "خود فراموشی" روح مسرت ہے۔ اور یہ کہہ کر ادیب مذکور اس ابہام کی

وضاحت کے کٹھن فرض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ اور میں انہیں صحیح طور پر سمجھ سکا ہوں تو اُن کا مطلب یہ ہے کہ ادب کا اولین فرض و مقصد ہے۔ جو قاری کو خود فراموشی تک پہنچا دے۔ لیکن ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کس قسم کا ادب خود فراموشی پیدا کرسکتا ہے۔ لفظی شعبدہ بازیاں خواہ وہ کس قدر تحیر زا کیوں نہ ہوں خود فراموشی پیدا نہیں کرسکتیں۔ وہاں پست اور ادنیٰ طبیعتوں میں یہ خود فراموشی پیدا کردیں تو عجب نہیں۔ لیکن ایک غور و فکر کرنے والا انسان وہاں تک نہیں پہنچے گا۔ ہاں بلندی کردار کا صحیح نمونہ ہر ذی شعور کی تمام تر توجہات جذب کرکے وہ حالت پیدا کرسکتا ہے۔ جسے ادیب مذکور خود فراموشی کہتے ہیں۔ ہماری رائے میں موسیقی و مصوری جداگانہ طور پر ایک ایسی حالت پیدا کرنے کی اہل ہیں جنہیں خود فراموشی کہا جائے۔ اور ہمارے خیال میں شاعری میں موسیقی اور مصوری ہر دو شامل ہیں۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جزو ایک مقصد پورا کرسکتا ہے۔ تو یقینی طور پر کل ایک بہتر اور برتر مقصد پورا کریگا۔ مگر یہ جملہ معترضہ ہے۔ وہ لفظی شعبدہ بازیاں یا زیادہ سے زیادہ وہ لطیف و نازک جذبات جو اس طبقہ کے لئے مسرت مہیا کرتے ہیں۔ وقتی تفریح کا سامان بن سکتے ہیں۔ اور دفع الوقتی کا ایک معصوم اور بے ضرر ذریعہ ہیں۔ لیکن ان میں عظمت و قوت پیدا نہیں ہوتی۔ چنانچہ نتیجۃً یہ کوئی قوی اور دیرپا نقوش نہیں چھوڑتے۔ جو ہمیں خود فراموشی تک پہنچا دیں۔ لیکن تفریح اور دفع الوقتی کے کئی اور ذرائع بھی ہیں۔ اور کسی چیز کی تخلیق یا ایجاد کا مقصد وہ ہوتا ہے۔ جو کسی اور طریق سے ناقابل حصول ہو۔ ہمارے خیال میں خود فراموشی کا واحد معصوم اور بے ضرر ذریعہ بادۂ علم و فضل ہے جس کا وجدان کے ساتھ امتزاج ترقی یافتہ صورت میں عرفان کے سب سے بلند ترین مقام پر لے جاتا ہے۔ یہ بہترین فائدہ ہے۔ بہترین مسرت اور ساتھ ہی ہم کہینگے کہ عدیم النظیر اخلاق۔

بیکن کے خیال میں ادب مصائب و آلام کا دفع ہے لیکن ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس دوائی کا طریق استعمال کیا ہے۔ اور اسکا نتیجہ کس صورت میں ظاہر ہوگا؟ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ ادب ہمیں اپنی تفریحی دلچسپیوں کے ذریعے اس دنیا سے علیحدہ کرکے اپنی طرف جذب کرلے۔ کیونکہ تفریح و لطف میں مصائب و آلام ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ اور اگر ادب یہ بات پیدا کرسکے کہ وہ مخصوص حقیقتوں اور تلخ صداقتوں کو چند لمحوں کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل کردے۔ تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ علاج نہیں بلکہ مرض ہیں۔ نفاذ کرنے کے مترادف ہے اس سے ہم میں ایک نوع کی بزدلی پیدا ہوجاتی ہے گی۔ اور وہ قوت مدافعت جو ہمیں ازل سے ودیعت ہوئی ہے۔ ناکارہ ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوجائیگی اور یہ فائدہ نہیں نقصان ہے۔ علاج یہ ہونا چاہئے اور ہو بھی یوں ہی سکتا ہے کہ ادب ہمارے لئے ایک سرچشمہ طاقت بنے۔ اور اس سے ہم وہ طاقت حاصل کرسکیں۔ جو ہمیں مصائب و آلام کے مقابل ڈٹ جانے کی ہمت دے۔ جو ہمارے ذہنی اور جسمی قواکو مضبوط تر کرتی چلی جائے تاکہ ہم مشکلات سے بچنے کے لئے روایتی کبوتر کی طرح آنکھیں بند نہ کرلیں۔ بلکہ ایک زخمی شیر کی طرح حملہ آور ہو پورے جوش و طاقت سے جھپٹ کریں اور اُسے مغلوب کرلیں۔ ادب ہمارے لئے ایک جائے پناہ ہی نہیں۔ بلکہ تیغ و سپر دونوں کا نعم البدل ہونا چاہئے۔ اس سے ہم میں نسوانی کمزوری نہیں بلکہ مردانہ جرأت پیدا ہونی چاہئے اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ادیب کو جبراً یہ باتیں پیدا کرنی چاہئیں بلکہ مدعا یہ ہے کہ جس ادب میں یہ باتیں مل سکیں۔ وہی بہترین ادب شمار ہونا چاہئے۔ اور یہ بات اس وقت پیدا ہوسکتی ہے۔ جب ادب میں ہمیں اخلاق کا بلند پایہ نمونہ نظر آئے یعنی جب ہمیں مثالی اخلاق نظر آئے۔ اور وہ ہمارا راہنما بن سکے۔

سب سے بڑا اعتراض جو اخلاقِ اخلاق کے متعلق ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ادیب کا کام وعظ کرنا نہیں۔ اور ہم سطور بالا میں اس اعتراض کی صحت تسلیم کرچکے ہیں لیکن اگر ادب میں بالواسطہ وعظ نہیں ہوتا۔ استدلال نہیں کیا جاتا بحث نہیں کی جاتی اور ادیب کے جذبات میں اخلاقی انعکاس پیدا ہوجاتا ہے تو پھر ضابطۂ ادب کی کونسی دفعہ کے ماتحت اس کی مذمت حق بجانب کہی جاسکتی ہے؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی زبان کے ایک ماہر اُستاد پروفیسر سینٹس بری جہاں کہیں

اخلاق کا ذکر دیکھ پاتے ہیں۔ تو اس کی بے محابا مذمت کرتے ہیں۔ پروفیسر مذکور اپنی ضخیم تصنیف "تاریخ تنقید" میں جہاں کسی ایسے نقاد کا ذکر کرتے ہیں۔ جسنے اخلاقی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی ہو تو بلا تامل لکھتے ہیں کہ یہ تنقید اخلاقی تنقید ہے ادبی نہیں۔ اور وہ اس نقاد کو نقاد تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیتے ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہ زبردستی ہے۔ ان کے نزدیک شاعری کی ساری کائنات اوزان و بحور ہیں۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر نے بحر کونسی استعمال کی ہے۔ وزن کونسا ہے۔ اور الفاظ جو استعمال کئے گئے ہیں وہ اوزان و بحور مستعملہ کے لئے کہاں تک موزوں ہیں۔ اور اس طرح موسیقی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں شاعری کے لئے یہ فضا بہت حد تک محدود اور کسی حد تک مسموم بھی ہے۔ شاعری کے لئے نہ تو اس میں سانس لینے کی گنجائش ہے اور نہ اسے گوارا ہے کہ وہ اس زندان میں سانس لے۔ یہ فطرت ہے۔ آپ اسے پابند قیود نہیں کر سکتے۔ یہ آزاد تھی۔ آزاد رہنی چاہئے۔ اور آزاد رہے گی۔ اور اگر یہ قید شاعری خود بخود قبول کر لیتی ہے تو یہ ایک جداگانہ بات ہے۔ علاوہ اسکے ہم پروفیسر صاحب کی اس تعریف شعری کو زیادہ سے زیادہ اوزان و بحور کی پیمائش کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ بھی علم ریاضی کی سی صحت و پیمائش کے ساتھ ہم اسے شاعری کہنے کے لئے تیار نہیں۔ شاعری کہیں تو ایک دردبھرے دل کی بے ساختہ پکار ہے کہیں کسی مرد حق کا نعرۂ مستانہ اور کہیں عامیانہ محبت کے لاابالیانہ جوش کا ایک حسین مظاہرہ جو خود بخود ایک زندہ ہیئت اختیار کر لیتا ہے لیکن پروفیسر مذکور شاعری میں محبت۔ جذبات۔ اور خواہشات کا وجود بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں وہ روح شاعری کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہیں۔ اور ہم بصد احترام پوچھتے ہیں کہ ادب میں اخلاق کس بلا کا نام ہے۔ یہی محبت۔ یہی جذبات اور یہی خواہشات بہترین اخلاق ہیں۔ صرف سمجھنے کا فرق ہے۔ اس محبت۔ ان جذبات اور ان خواہشات میں کبھی علویت و لطافت اور کبھی سفلیت اور عفونت پیدا ہو جاتی ہے اگر آپ ان جذبات۔ اس محبت اور ان خواہشات میں روحانی پہلو تلاش کرتے ہیں کہ آپکی اندرونی اشتہا تسکین حاصل کر سکے۔ تو اور لوگ بجا طور پر ایثار۔ تزکیۂ نفس اور قوتِ عمل کی تلاش کرتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی روح کی پیاس بجھا سکیں۔ اور یہ بات ثابت کرتا رہا ہے اور کرتا رہیگا۔ کہ کونسے جذبات علوی ہیں اور کونسے سفلی۔ کن جذبات کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں اور کن کے گریز پا۔ چنانچہ رومانی شاعری کے متعلق جس کی تعریف میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے جاتے ہیں۔ ایک مقتدر اطالوی نقاد Mr. Mintusma کی یہ رائے ہے کہ رومانی شاعری شاعری تو ہے۔ تاہم یہ وہ شاعری نہیں جس کا ذکر ارسطو اور ہوریس کر چکے ہیں" وہ پھر لکھتے ہیں کہ "یہ شاعری کی ایک ناقص صورت ہے۔ جسے اس کے چند لکھنے والوں کی ذاتی نفاست نے شرف بخشا ہے" ہمارے خیال میں یہ رومانی شاعری جب اپنی انتہائی رفعت حاصل کرے تو ہم اسے لطیف اور عمدہ شاعری کہہ سکتے ہیں اور ایسے شاعر کو ہم ایک لطیف اور اچھا شاعر کہہ سکتے ہیں لیکن ہم اُسے بڑا شاعر نہیں کہہ سکتے کیونکہ لطافت میں برائی نہیں نزاکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سے صرف یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ ہمارے احساسات میں لطافت و نزاکت پیدا ہو جائے۔ لیکن ان میں کوئی طاقت نہیں آ سکتی۔ لیکن جہاں تک ہمارے مطالعہ کا تعلق ہے۔ ادب میں امتزاج اخلاق کی مخالفانہ روش میں جو کٹرپن اور تعصب نظر آتا ہے۔ اس کے لئے مغربی ادب کی ابتدائی حالت بھی بہت حد تک ذمہ وار ہے۔ ابتدا میں تمام اصناف ادب مذہبی یا نیم مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ اور مذہب کے علاوہ کسی عنصر کا دخل شاذ ہی نظر آتا تھا۔ عوام کے جذبات بھی مذہب کی طرف زیادہ جھکے ہوتے تھے۔ مذہبی اور مذہب کی ایک خوفناک تصویر پیش کرتے تھے۔ اس کا اثر ادب میں تھا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح تر ہوگا۔ کہ ادب کا بیج مذہبی لوگوں میں پڑا۔ گویا یہ "کفر" "کعبہ" ہی سے پیدا ہوا۔ لیکن یہ ادب محض پروپاگنڈا تھا مذہبی مسائل کا پرچار کیا جاتا تھا۔ ڈراموں میں افراد ڈراما مذہبی مسائل پر بحث کرتے تھے۔ اور ان ڈراموں کی نمائش گاہ گرجے ہوتے تھے۔ انجیل مقدس کی کہانیاں نیم ڈرامائی صورت میں سٹیج پر دکھائی جاتی تھیں۔ اور مدعا یہ تھا کہ عوام کے دلوں سے مذہب کا رعب زائل نہ ہو جائے

بلکہ عوام زیادہ سے زیادہ مذہبی رنگ میں رنگے جائیں اور اس طرح مذہبی حکومت کی بنیادیں مستحکم تر ہو جائیں۔ یہ تحریک اپنی جگہ پر اچھی تھی یا بری۔ یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن اس سے ادب کو کافی نقصان پہنچا۔ اور ہمارے خیال میں یہی وجہ ہے کہ مغربی شاعری اس قدر اچھے اور بڑے شاعر پیدا نہیں کر سکی جس قدر مشرقی اور بالخصوص فارسی شاعری پیدا کر گئی ہے لیکن یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہمارا اس کہانی کو چھیڑنے سے مدعا یہ تھا کہ اس مخالفتِ اخلاق کے اسباب صحیح طور پر معلوم ہو سکیں لیکن ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ یہ مخالفت حق بجانب نہیں۔ ادب میں امتزاجِ اخلاق کی جس صورت کی مذمت جائز طور پر کی جانی چاہیئے تھی۔ اس کے ساتھ وہ اخلاق کی ہر صورت کی مذمت کے درپے ہیں گویا ایک بُری صورت کے ساتھ ایک اچھی صورت کی مذمت کی جا رہی ہے جسے تنگ نظری کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اصل میں مخالفین اخلاق ادبی اخلاق کی صحیح صورت کا مطالعہ غائر نظروں سے نہیں کرتے۔ اور نتیجۃً اس کا حُسن اور عظمت سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ادب میں اخلاقی عنصر کی محض موجودگی خواہ وہ کسی صورت میں ہو انہیں اس کی مذمت پر آمادہ کر دیتی ہے۔ جسے ادبی تعصب کی بدترین مثال کہنا چاہیئے۔

ایک اور نہایت عجیب اور دلچسپ اعتراض امتزاجِ اخلاق کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ تعلیمِ اخلاق نثر کے لئے وقف رہنی چاہیئے اور شاعری کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ تعلیم اخلاق نثر میں جائز ہے اور شاعری میں ممنوع لیکن کولرج کی رائے میں شاعری کا متقابل نثر نہیں سائنس ہے۔ اور نثر کا متقابل شاعری نہیں نظم ہے۔ اور ہم یہ کہنے کی جسارت کرتے ہیں کہ نثر میں بھی شاعری ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ہمارے بعض ادبا نے اس منثور شاعری کا مفہوم نقش نگاری لیا ہے۔ ہمارے سامنے ہارڈی کی ایک ٹھوس مثال موجود ہے جس کی "منثور شاعری" کئی شاعروں کی "منظوم شاعری" سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور چونکہ اس کے متعلق ہم پہلے بھی اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ مزید تکرار و وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

جن اصحاب کو مغربی ادب کے مطالعہ کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں۔ کہ مغربی ادبا کی ایک خاصی تعداد موضوع (Subject) کے متعلق بے نیاز سی رہتی ہے۔ وہ اسے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ موضوع کچھ ہی ہو سوال یہ ہے کہ نبھاؤ کیسے ہوا؟ اور اس نبھاؤ کی کائنات بحور و اوزان اور ان کی پیدا کردہ موسیقی اور حُسن ہے۔ اور جہاں تک ہم دیکھ سکے ہیں۔ وہ موضوعات کی فہرست سے اخلاقیات کو خارج نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اس نظریئے کے ماتحت بحور و اوزان کا ایک ماہر شخص فلسفہ کے کسی مسئلہ کو نظم کر سکتا ہے۔ مگر ہم اسے شاعری کہنے یا سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ خواہ بحور و اوزان کے انتخاب میں اور ان کے نبھاؤ میں کتنی ہی چابکدستی اور کاوشِ دماغی سے کام لیا گیا ہو۔ لیکن آپ محسوس کریں گے کہ جب موضوع خارج از بحث ہے۔ اور کوئی شخص فلسفہ۔ اخلاق یا تصوف کے مسائل کو بحور و اوزان کا لباس اُڑھا کر پیش کرتا ہے۔ تو مندرجہ بالا اصول کے مطابق ان نظم شدہ مسائل کو شاعری کہلانے کا حق حاصل ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ڈرائڈن ایک انگریزی نقاد اور شاعر نے "تنقید" کے متعلق ایک نظم لکھی تھی۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ اس نظم کو شاعری نہیں بلکہ تنقید شمار کیا گیا تھا۔ اور اب بھی اُسے تنقید میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اسے شاعری کیوں نہ کہا گیا۔ کیونکہ اوزان و بحور کا جیسا حامی شاعر مذکور تھا۔ اور جس قدر محنت و کوشش سے وہ اس پابندی پر عمل کرتا تھا۔ انگریزی ادب میں اس کا ثانی نہیں۔ یہاں اس نظریہ کا کھوکھلا پن ظاہر ہو جاتا ہے۔

اس سارے جھگڑے کی بنیاد ان ادبا کا وہ نظریہ ہے۔ جو ادیب پر ایک ایسی پابندی عائد کرتا ہے جس پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت ادیب کو مظاہر فطرت کے ہر پہلو کا مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور اگر دی جاتی تو یہ دائرہ نہایت محدود ہوتا ہے عورت کا ظاہری حُسن اس کی ساری کائنات ہے۔ مختصراً یہ کہ صرف وہی مظاہر فطرت جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے ماورا ہوں۔ اور جو صرف لذات

جسمانی خواہشات پیدا کر سکیں، شعریت و ادبیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ جہاں کہیں تلخیوں اور ناکامیوں کا ذکر آئے اور ان میں ذہنی و قلبی اذیت یا بلندیٔ فکر و وجدان ہو تو وہ مایوس ہو کر اس سے توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ اور دلیل یہ ہے کہ ان میں تفریح کا سامان نہیں اور دنیا میں پہلے ہی ان تلخیوں اور حسرتوں کی کثرت ہے اور اگر ادب میں بھی یہی کچھ نظر آئے تو ان سے بچاؤ کی کونسی صورت باقی رہے گی؟ اس کے متعلق سطور بالا میں بھی کچھ کہا جا چکا ہے لیکن اب پھر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے بھاگنا مشکل ہے۔ یہ ٹھوس حقیقتیں اور تلخ صداقتیں انسان کا ماحول خصوصی ہیں جب تک دنیا میں محبت، جذبات، اور خواہشات ہیں۔ تب تک بھاگنا مشکل ہے۔ بھاگنے کی تمام راہیں بند ہیں لیکن جب ایک حقیقی شاعر یہ کہتا ہے کہ ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب تلخیاں اور ناکامیاں روپوش ہو رہی ہیں دنیا پاؤں تلے دبی معلوم ہوتی ہے۔ انسانی طاقت کا ایک صحیح نمونہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اور پھر دیکھئے اس میں کوئی وعظ نہیں۔ استدلال بھی نہیں اوزان و بحور کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے موسیقی بھی ہے۔ حسن بھی۔ بلندی بھی اور عظمت بھی۔ یہی اخلاق کا بلند ترین نمونہ ہے۔ ممکن ہے مخالفین اخلاق اس شعر سے خوفزدہ ہو جائیں۔ کیونکہ ان کی جائے پناہ کچھ اور ہے ان میں یہ اہلیت نہیں کہ ایک بلند ضمیر کے حسن۔ اس کی طاقت اور اس کی پرواز کا جائزہ لے سکیں۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ایک حساس دل صرف حسنِ ظاہر ہی کی پرستش نہیں کرتا بلکہ حسنِ باطن کے گیت بھی گاتا ہے۔ اور یہی نہیں وہ فوج بھی سپاہی بھی۔ سر عسکر بھی۔ اور رجز خواں بھی ہے اس کی تخلیق نعرہ جنگ ہے۔ ناکامیوں اور مایوسیوں کے خلاف مثالی اخلاق کے نہ ٹوٹنے والے ہتھیار سے مسلح ضمیر ایک یقینی فاتح ہے اس کے ذہن و یقین میں اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ لفظ شکست اس کی لغت سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور فتح کی دیوی اس کے حضور میں رقص کرتی رہتی ہے۔ مگر سائنس زدہ دماغوں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ ان حقایق کی رفعت کو پہنچ سکیں۔ انہیں اس دربار میں باریابی کا فخر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ادیب نہ ہی فلسفی ہے اور نہ ہی مذہبی یا مجلسی مصلح۔ وہ نہ ہی فلسفہ و منطق کے رموز و نکات پر نظم میں بحث کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی مذہبی اعتقادات کا پروپگنڈا کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی ہمارے مجلسی نظام کی برائیوں کی اصلاح اس کے حصے میں آئی ہے۔ وہ مظاہر فطرت کو ہر پہلو سے دیکھتا ہے۔ یہ اس کی ذہنی اور وجدانی غذا ہے۔ ان کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور پھر اس مطالعہ کے اثرات محسوس کرتا ہے۔ اور چونکہ اس کی قوتِ حس غیر معمولی طور پر تیز اور نازک ہے۔ اس کے یہ تاثرات اس حس کے زیر اثر اپنے لئے ایک موزوں ہیئت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہی ادب ہے۔ خواہ نظم کی صورت میں ہو خواہ نثر کی صورت میں۔ لیکن یہ کہنا پڑے گا۔ کہ نظم ان تاثرات کی بہترین مظہر ہے۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مظاہر فطرت کو ہر پہلو سے دیکھتا ہے۔ تو یہ ناگزیر امر ہے کہ ادب میں رنج و غم، مسرت و شادمانی، کامرانیوں کی شیرینی اور ناکامیوں کی تلخی۔ محبت کا حیوانی پہلو اور عشق کی زندگی بخش صورت موجود ہو۔ یہ بات ہر ادیب کے ذاتی ماحول اور اس کے واقعاتِ حیات پر منحصر ہو گی کہ اس کا دل کس قسم کے اثرات جلد قبول کرتا ہے یہاں یہ کہنا بھی نہایت ضروری ہے کہ بعض واقعات و حقایق ایسے بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جو ایک ادیب کے لئے تو انتہائی طور پر غیر اہم اور قوتِ تاثر سے یکسر محروم ہوں۔ لیکن دوسرے کے لئے وہ کافی حد تک قابلِ توجہ اور قوتِ تحریک و تاثر کے پورے حامل ہوں اس لئے شاعری یا ادب شاعر کی اس قوت کے مطابق ہو گا۔ جو اثر قبول کرتی ہے۔ اس لئے ہمیں ادب کے حسن و رفعت کا جائزہ لینے کے لئے ادیب کی زندگی کا مطالعہ کرنا ہو گا۔ اور جس قدر عظمت، رفعت و لطافت شاعر میں مل سکے گی۔ اسی قدر اس کی تخلیق میں ہو گی

اور ہم یہ کہنے کی جسارت کرتے ہیں۔ کہ جس قدر عظمت۔ رفعت۔ پاکیزگی ایک بلند کردار انسان میں مل سکتی ہے۔ وہ ایک خالی رومان پرست میں ملنی محال ہے۔ ہمارے خیال میں سر والٹر ریلے نے اس مسئلہ کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "سب سے پہلے تو شاعر ایک دیکھنے والا ہے وہ ایک انسان ہے۔ جو اپنے ہم جنسوں سے صرف کم ہے لیکن چونکہ اس کا مشاہدہ صحیح ہوتا ہے۔ نتیجۃً اس کے احساس میں اوروں کی نسبت بہت زیادہ گہرائی ہوتی ہے۔ اور اس کا کام یہ ہے کہ انہیں دیکھنا اور محسوس کرنا سکھائے" ہمارے خیال میں یہ رائے بالکل درست ہے لیکن یہ ایک سوال ہے کہ شاعر کیا دیکھنا اور کیا محسوس کرنا سکھائے ہمارے خیال میں اگر ادیب کے فرائض میں سکھانا داخل نہیں تو یہ بات ضرور ہے کہ بہترین ادب وہی ہے جس سے ہم دیکھنا اور محسوس کرنا سیکھ سکیں۔ اور یہ "دیکھنا" اور "محسوس کرنا" محدود نہیں کیا جا سکتا۔ نقاد مذکور کا کبھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ شاعر صرف وہی مظاہر دیکھنا اور محسوس کرنا سکھائے۔ جن کا تعلق رومان سے ہے۔ ان سطحی چیزوں کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے کسی معلم کی ضرورت نہیں۔ ادیب مذکور کا مطلب یقیناً یہ ہے کہ شاعر ہمیں زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنا اور محسوس کرنا سکھائے۔ تاکہ ہم چند ناگزیر ٹھوس حقیقتوں اور تلخ صداقتوں کا صحیح زاویۂ نگاہ سے جائزہ لے سکیں۔ اور یہ محسوس کر سکیں کہ یہ دنیا ہے ٹھوس اور کرخت اور ہمیں اسمیں کچھ وقت گذارنا ہے۔ وہ کیونکر گذریگا یہی اخلاق ہے۔ محبت جس کا شہوانی پہلو رومان کی تخلیق کا مواد بنتا ہے اس کا پاکیزہ پہلو ایثار۔ قربانی اور قوتِ عمل سکھا سکتا ہے۔ اور ہم میں ایک قسم کی برقی قوت پیدا کر سکتا ہے ان ہر دو باتوں میں دیرپا کون ہے اور گریز پا کون ہے۔ یہ آپ خود اندازہ لگا لیں لیکن ہماری قطعی رائے ہے کہ مؤخر الذکر میں رفعت۔ عظمت۔ پاکیزگی اور دیرپائی کے زیادہ مواقع موجود ہیں۔ اور اول الذکر میں لطافت اور اس کا فائدہ یقیناً گریز پا ہوگا ہمارے خیال میں بہتر و برتر کا حق اسی کو پہنچتا ہے جو مفید تر اور زیادہ پائیدار ہو۔

"مقصدِ ادب" میں ہم یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ ادب تنقیدِ حیات ہے اور سطور بالا میں بھی ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جن سے اس نظریہ کو تقویت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ ظاہر ہوگا کہ دنیا سب پر اثر ڈالتی ہے ان اثرات کا موزوں اظہار ادب کہلاتا ہے لیکن جب اثر کے بغیر کوئی چیز پیدا کی جائے اس میں تصنع کا آنا یقینی امر ہے۔ اور تصنع ادب کے لئے سمِ قاتل سے کسی طور بھی کم نہیں۔ یہ خلوص ہے جو روحِ ادب ہے اور روح سے محروم جسم کو اچھے سے اچھا لباس پہنا کر بھی زندہ نہیں کر سکتے۔ اور جس میں زندگی نہیں اس کی قیمت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ اور جب تک یہ خلوص موجود ہے اخلاقی تاثرات کا ظاہر ہونا قدرتی امر ہے اور اس خلوص کا سرچشمہ مشاہدہ ہے۔ اور یہ مشاہدہ دنیا سے ماسوا کسی چیز کا نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ انسان۔ انسان ہے اور فرشتوں یا جنات کی نوع میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ سر والٹر ریلے ورڈزورتھ کی شاعری کے اخلاقی پہلو پر بحث کرتے ہوتے لکھتے ہیں "جب تک انسان اس دنیا میں ہے یہ بات ناگزیر ہے کہ اس کی شاعری میں نیکی اور بدی کے احساس کا انعکاس ہو۔ خلاق ہر زبان کو اپنے رنگ میں رنگتا ہے۔ اور اسے اس کی امتیازی قوتوں میں سے نازک ترین قوت عطا کرتا ہے۔ آپ شاعر سے اس کے اخلاقی تصورات اور اس کے مشاہدات لے لیں تو آپ ایک طرح اس کے ہاتھ سے ایک مؤثر ترین اوزار چھین لیتے ہیں۔ شیکسپیئر اگر اپنے زبان زدِ عوام اعزاز سے ابھی تک سرفراز ہے۔ تو لامحالہ اس کی تعمیری اور انکشافی قوتوں کی نسبت اس کے متذکرہ صدر تصورات مشاہدات اور واردات کا اس میں بیشتر حصہ ہے" ادب کم و بیش ادیب کی ایک خود نوشت سوانح عمری ہے جس میں ٹھوس واقعات کی نسبت جذبات اور احساسات زیادہ جگہ گھیرتے ہیں۔ اور اس کتابِ حیات میں یہ ضروری نہیں۔ کہ ہر باب کا موادِ زندگی کے ایک ہی پہلو سے لیا گیا ہو۔ زندگی متنوع پہلو رکھتی ہے۔ اس میں رنج بھی ہے۔ مسرت بھی۔ آنسوؤں کے چشمے بھی اس میں بہتے ہیں اور قہقہے بھی سنائی دیتے ہیں۔ کامیابی بھی نظر آتی ہے اور ناکامی بھی۔ حسد و بغض بھی ہونگے۔ قناعت ایثار اور قربانی

بھی ہوگی۔ اور یہ کتاب اسی نوع کے مختلف ابواب پر مشتمل ہوگی یہی اخلاق ہے۔ اگر آپ ادیب سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس کتاب کے لفظ لفظ اور سطر سطر میں رومان ہی رومان ہو تو یہ ناممکن ہے۔ اور ہم کہیں گے کہ اس قسم کی توقع بیہودگی میں شمار ہوگی۔ براؤننگ صرف شاعر ہی نہیں تھا۔ ایک وسیع المطالعہ فاضل تھا۔ ایک اعلےٰ اور بلند کردار کا انسان تھا۔ اس کی رائے ہے کہ "شاعری۔ شاعر کی ذات ہی کی ایک تجلی یا خوشبو ہے۔ جس کا سرچشمہ اگرچہ خود شاعر ہے۔ لیکن یہ اس سے جدا نہیں۔ شاعری کا اندازہ کرتے ہوئے ہم شاعر کا اندازہ کرتے ہیں۔ اُسے سمجھنے میں ہم شاعر کو سمجھ لیتے ہیں۔ اور شاعر سے محبت کئے بغیر ہم اس کی شاعری سے بھی محبت نہیں کر سکتے۔" یہاں سے یہ ظاہر ہوگا کہ شاعر سب سے پہلے انسان ہے بالکل ہم جیسا۔ وہی خواہشات۔ وہی جذبات۔ وہی کمزوریاں۔ وہی قوتیں۔ وہی ضروریات۔ فرق یہ ہے جو بارہا بیان کیا گیا ہے کہ اُس کی بصیرت تیز تر ہے۔ اور اُس کی قوت حس میں زیادہ اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن یہ باتیں اُسے بشریت سے دور نہیں لے جا سکتیں وہ رہتا انسان ہی ہے لیکن عوام سے بلند تر۔ کیونکہ حقیقی شاعری "جزویست از پیغمبری" اور جب تک وہ انسان ہے بقول شیلے اس کی ہر کوشش اپنے ہم جنسوں کی رفاہ اور ان کی بہبودی پر مرکوز ہونی چاہئے۔ شاعر کوشش نہیں کرتا بلکہ اُس سے بیساختہ اور غیر شعوری طور پر ایک عمل ہوتا ہے جس کے متعلق اُسے صرف یہ علم ہے کہ وہ ایک قابل قدر عمل کر رہا ہے۔ اور یہ عمل خود بخود اُس کے ہم جنسوں کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک بے پناہ قوت ہے جس کی مدافعت ناممکن ہے اور یہی قوت اُسے یہ عمل کرنے پر اُبھارتی ہے۔ اور اس حد تک کہ اُس کے لئے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا۔ اور یہ قوت اپنے اظہار کے لئے موقع، مقام اور وساطت تلاش کر لیتی ہے۔ یہ ظاہر ہو کر شاعری کہلاتی ہے۔ اور جب یہ اپنے پورے زور میں ظاہر ہوتی ہے تو اس سے بہترین فائدہ پہنچتا ہے یہ صرف سمجھنے کا فرق ہے کہ اس قدر لطیف اور قیمتی فن کو ایک بے معنی سی اور بے قیمت چیز سمجھا جائے۔ اور اس کی حیثیت ایک کھلونے کے برابر کر دی جاتے۔ شاعر کو ایک پیغام ودیعت ہوا ہے۔ جسے پہنچا دینا اس کا فرض ہے۔ اور جب وہ یہ پیغام موزوں اور مناسب طریق سے پہنچا دیتا ہے تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ یہی پیغام اب اخلاق کہہ لیجئے اور خواہ رومان لیکن پیغام یقیناً اخلاق سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی ادب کا بلند ترین مقام ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم ظاہر کر چکے ہیں۔ مغربی ادبا کا اس بات پر یقین ہے کہ پیغام وغیرہ کی کوئی حیثیت نہیں سوال ذریعۂ اظہار کا ہے لیکن ہم کئی بار یہ ثابت کر چکے ہیں کہ "کیا" اور "کیسے" کو جدا جدا تمیز نہیں کیا جا سکتا۔ اور شیلے بالکل صحیح طور پر کہتا ہے۔ کہ "تخیل خود اپنی زبان پیدا کر لیتا ہے"۔ اس بات کو تسلیم کرنے میں کسی ذی شعور کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ جھوٹی اور مصنوعی بات کبھی صاف طور پر اور بیساختہ انداز میں نہیں کہی جا سکتی اس جھوٹ کو چھپانے کی کوشش کی جائے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ کے ساتھ اسے چھپانے کی کوشش بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ ماننا پڑیگا کہ مصنوعی جذبات کا اظہار لاکھ کوششوں کے باوجود مصنوعی رہیگا آپ اس تصنع کو خلوص میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ لیکن ایک بلند حقیقت۔ ایک رفعت در آغوش جذبہ جسے شاعر انتہائی خلوص سے محسوس کرتا ہے کبھی کسی بھدی یا ناخوش آئند صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک وجدانی سلسلہ ہے اور ناقابل بیان خلوص جذبہ کی نسبت سے اظہار میں حسن و خوبی پیدا ہو سکتی ہے لیکن "کیا" اور "کیسے" کے متعلق ایک نہایت دلچسپ تبصرہ ہمیں براؤننگ کے متعلق ملتا ہے۔ مسٹر شارپ غالباً ایک امریکن نقاد نے براؤننگ کی شاعری پر تنقید کی ہے۔ جس کے جواب میں ایک نقاد لکھتا ہے "براؤننگ کا پیغام اُس کی مصنفانہ حیثیت کا ایک اہم حصہ ہے۔ لیکن اس کی چند بہترین چیزیں یقینی طور پر اُس کے چند ذاتی اور حتمی اعتقادات کا ماحصل ہیں"۔ اصل سوال "مسٹر شارپ لکھتے ہیں" کسی ٹھوس پیغام کا نہیں بلکہ فنی نبھاؤ کا ہے۔ فنکار کا اولیں تعلق اس کے ذریعۂ اظہار سے ہونا چاہئے"۔ ... نہیں۔ اولیں تعلق نہیں۔ یہ ذریعہ وہ زبان ہے جسے پُرزور احساس یا خیال لبریز جذبات

نے خوش آہنگ موسیقی کا التہاب عطا کر دے" اسی خیال کا ایک حصہ ... ہنگ کا پیغام ہے۔ اور اس لئے اس کے اولین متعلق کا ایک حصہ ہے ... بدقسمتی سے بھاؤ ہے" مسٹر شارپ کہتا ہے جس کے ساتھ اساسی طور پر ... کو تعلق رکھنا چاہئے" تسلیم۔ مگر یہ بتاؤ آخر کسی چیز یا بات کا ہونا ... چاہئے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ حقیقی شاعری میں مواد اور اس کے اظہار ... کیونکر جدا کیا جا سکتا ہے۔ اگر پیغام موزوں طریق پر نہیں پہنچایا جاتا تو یقیناً یہ ادب نہیں کہلا سکتا۔ لیکن اگر یہ موزوں طریق پر ظاہر ہوتا ہے۔ ... کچھ بھی ہو شاعر کا اولین تعلق اسکے پیغام سے ہوگا" لیکن یہ پیغام کیا ہے ... طبعی طور پر اسکے ضمیر کی آواز۔ اور یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے ادب میں اخلاق کا امتزاج ہوتا ہے۔ اور اگر ادیب میں یہ صلاحیت ہے۔ کہ وہ بالواسطہ طور پر ہمیں اعلٰے اخلاق کی تعلیم دے سکے۔ تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کی تخلیق کو ادب سے کیونکر خارج کیا جا سکتا ہے۔ اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے بجا ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک ناول نسٹ بہادرانہ قصہ میں سے ایک کردار پیش کرتا ہے کہ ایثار، قربانی، قوتِ عمل ... نیکی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لیکن اس کی تیزی طبیعت اور لاپروائی ... کے رستے میں حائل ہوتے ہیں۔ اور منزلِ مقصود تک پہنچنے نہیں دیتے ... تو اس سے ہمیں ایک شاندار و قابلِ قدر سبق ملتا ہے۔ اور ہمارے خیال ... میں اس کی مذمت صرف اس وجہ سے کرنا کہ اس میں اخلاق ہے اور ... اس سے کوئی سبق حاصل ہوتا ہے پستیٔ ذوق کی انتہا ہوگی۔ اب ایک ... سی جبل کا انسان شاعر کے راستے میں پڑتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات ... اقوال و اعمال اُسے متاثر کرتے ہیں اور یہ تاثرات نظم کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اسکی مذمت کسی صورت میں بھی جائز اور مستحسن قرار نہیں دی جا سکتی ... اس کی مذمت کرنے والوں کے متعلق کم از کم جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے ... جہاں تک سلامت ذوق کا تعلق ہے۔ یہ لوگ دیوالیہ سے کسی قدر بھی کم نہیں۔ لیکن ہم یہ بھی کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر ادیب کے جذبات میں یہ پہلو نہیں اور اس میں روحانی کیفیت زیادہ ہے۔ محبت و جنبہ داری کی نسبت لطافت بالعصر وافر ہے۔ تو ہم اسے شاعر یا ادیب کہہ سکتے ہیں اور اچھا بھی۔ اور اس کی مذمت بھی نہیں کی جا سکتی لیکن اسبات کو فحش نگاری کا لائسنس نہیں سمجھنا چاہئے۔ اگر یہ رجحان اس حد تک فحش ہو جاتی ہے۔ جیسے بعض ادبا منثور شاعری کہتے ہیں (مثلاً وہ افسانات جو چغتائی صاحب نے سپرد بنگال لکھے تھے) تو مذاقِ عامہ میں ایک نوع کا گندہ پن پیدا ہونا قطعی طور پر ناگزیر ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ ادبی زوال کا پیش خیمہ ہوگا۔

اس موضوع پر جیسا کہ سطورِ مافوق سے ظاہر ہوگا۔ ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ اس مسئلہ کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے اور یہ غیر ممکن نہیں کہ ہمیں بعض صورتوں میں نظر کا مجرم گردانا جائے۔ لیکن یہ قول کی مجبوری تھی۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک اچھا مقدمہ ایک نااہل وکیل کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ جسے یہ پتہ نہیں کہ کونسا نکتہ سلجھانا ہے۔ اور کس زاویہ نگاہ سے بحث کرنی ہے۔ اور اس کا نتیجہ ناکامی ہے۔ ان لوگوں کی دلیل وہی ہونی چاہئے تھی جو گوئٹے نے دی تھی۔ شاعر یا ادیب سے کسی قسم کا مطالبہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ۔ وہ کچھ نہ کہے جس کی صدا اُس کے ضمیر سے اُٹھ رہی ہے۔ بلکہ وہ کہے جو لوگ چاہتے ہیں اور اسکا نتیجہ معلوم۔ یقیناً اسے خلوص سے دست بردار ہونا پڑیگا۔ اور اس ادب کا ماتم ہی کیا جائیگا۔ ایک بےساختہ جذبہ جس میں اعلٰے اخلاق کا انعکاس ہو قابلِ تعریف ہے لیکن ایک پہلو ایسا ہے جس کی مذمت ضرور ہونی چاہئے۔ اور وہ یہ کہ ضابطہ اخلاق کے کسی باب پر نظم کی صورت میں بحث کیجاتی یا کوئی فلسفیانہ مسئلہ اسکے تمام رموز و نکات کے ہمراہ ایک پُر از دلائل صورت میں نظم کا جامہ پہنا کر پیش کیا جائے۔ مثلاً آج کل اردو شاعری میں یہ ایک رسم سی بنتی جا رہی ہے کہ مزدور، کسان و سرمایہ دار۔ اور ہندی نزاع کے متعلق ضرور لکھا جاتا ہے اور جہاں تک ہم جانتے ہیں ہمیں سے ایک آدھ ہی ایسا ہے۔ جو وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے۔ یہ سوشلزم کا پراپگنڈا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور قوم نظموں کا ایک سلسلہ ہے جس نے شاعری کی صورت میں ادبی صحائف کی زینت بن رہا ہے۔ یہ ایک نوع کی بیماری ہے۔ اور ہمارے خیال میں مہلک بھی۔ اور جہاں تک ہم اندازہ کر سکتے ہیں یہ کئی ادبا اور شعرا۔ کو اپنا شکار بنا چکی ہے اور اب انہیں وہ بات نظر نہیں آتی جو ان میں ودیعت ہوتی تھی۔ لیکن یہ تو ہی اسکی خودکشی کی صورت کسی چاروں و نے حیثیت مسئلہ کو چاروں کونے چت طور پر پیش کرنا ...

جناب ادیب مالیگانوی

رازِ زندگی

(۱)

زندگی کیفیتوں سے دور تر — بے نمک افسردہ محرومِ اثر
روح نامانوسِ کیفِ آرزو — بے کشش ہنگامہ زارِ رنگ و بو
اک رقابت تھی نوا و ساز میں — رازِ ہستی تھا حجابِ راز میں
وہ سفر بے جادہ و منزل مرا — مجھ پہ خود ظاہر نہ تھا حاصل مرا
یوں گذرتی جا رہی تھی زندگی
زندگی کو کھا رہی تھی زندگی

(۲)

دفعتہً برپا ہوا اک انقلاب — اٹھ گیا حسنِ حقیقت سے نقاب
گھر گیا ہوں حلقۂ افکار میں — یوسف آیا مصر کے بازار میں
اب مرا ہر سانس ہے شور آفریں — سازِ دل ہے اور نوائے آتشیں
موجزن ہے دل میں طوفانِ عمل — میں ہوں اب محشرستانِ عمل
چاہتا ہوں عشق کی تجدید ہو — اسوۂ شبیر کی تقلید ہو
دیدنی ہے صبح و شامِ زندگی
ہو رہا ہے اہتمامِ زندگی

(۳)

السلام اے خواہشِ امن و سکوں — آرزوئے عافیت ہے اک جنوں
بڑھ گیا ہے اس قدر ذوقِ تپش — چاہیے ہر وقت اک تازہ خلش
ہمتوں نے کر دیا ہے بے درنگ — ہر مصیبت کے لئے اعلانِ جنگ
دل کو ارمانِ تن آسانی نہیں — اب پریشانی، پریشانی نہیں
میں ہوں لذت آشنائے درد و غم — کھل گئے سارے رموزِ کیف و کم
موج کو ساحل بنا ڈالوں گا میں — ذرہ ذرہ دل بنا ڈالوں گا میں
میں نے اب جانا کہاں ہے زندگی

وسنت وتی۔ پرساف (روسی افسانہ نگار) مترجمہ جناب احسان علی شاہ احسان بی۔ اے۔

"مرمریں مجسمہ"

اس پر نقب زنی کا الزام لگایا گیا۔ اور عدالت نے اسے ایک سال قید کی سزا دے دی مگر عدالت میں بوڑھے ملزم کا طریقِ عمل اور کچھ نوعیت کچھ ایسی عجیب تھی کہ میں قیدی سے ملاقات کرنے کی اجازت حاصل کئے بغیر نہ رہ سکا۔ فوراً اُس کے کمرہ میں جا پہنچا۔ پہلے پہل تو اس نے میری طرف کوئی توجہ نہ کی اور نہ ہی بات کرنے پر تیار ہوا لیکن میرے عزم کرنے پر وہ مجبور ہو گیا۔ اور اپنی زندگی کی رام کہانی کہہ سنائی۔

آپ ٹھیک فرماتے ہیں" وہ بولا "میں نے بھی اچھے دن دیکھے ہیں میں ہمیشہ ہی سے "کوچہ گرد" نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے اپنی تمام زندگی قانون کے تختوں پر سو کر بسر کی ہے۔ میں اعلےٰ درجے کا تعلیم یافتہ انجنیئر ہوں جوانی کے زمانے میں کچھ نقدی میرے پاس تھی۔ اور میں ہنستے کھیلتے زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ ہر شام کسی نہ کسی محفل میں یا ناچ گھر میں جاتا اور آخر شراب کے دو جام پی کر گھر لوٹ آتا۔ مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے جب چھوٹے سے چھوٹا واقعہ میرے دماغ پر نقش ہے۔ اس کے باوجود زیادہ دامنت میں ایک غیر محدود خلا ہے۔ جس کو پُر کرنے کے لئے میں اپنی بے حقیقت زندگی کے تمام لمحے قربان کر سکتا ہوں ... میں ان لمحات کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ جن کا تعلق مثنا سے ہے۔

اس کا نام نتا تھا جناب! ہاں! نتا۔ مجھے یقین ہے۔ اس کا خاوند ریوے میں کسی معمولی سے عہدے پر تھا۔ وہ غریب تو تھے ہی۔ لیکن نتا اپنے گردوپیش کی ذلیل ترین چیزوں کو خوبصورت بلکہ خاص طور پر دلآویز بنا لینے میں استادانہ مہارت رکھتی تھی۔ وہ خود کھانا پکاتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھ اسی کام کے لئے بنائے گئے ہیں۔ معمولی سے معمولی ملبوسات اسکے گداز جسم تک پہنچ کر ایک خاص دلکشی اور ایک خاص حسن کے حامل ہو جاتے تھے۔ دنیا کے تلخ ترین حقائق جب نتا کی زندگی میں داخل ہوتے تو ان میں خوش آئند خواب کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی اس سے میل ملاپ بڑھ جانے پر خود میری زندگی میں حیرت خیز تغیر رونما ہوا۔ یہاں تک کہ زندگی کی تمام تلخیاں حقیر گرد کی طرح میرے دامن سے جھڑ گئیں۔

اس کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ خدا اس کے اس گناہ کو معاف کرے۔ میں خوبصورت اور نوجوان تھا۔ مجھے ہزاروں شعر زبانی یاد تھے۔ اس کے برخلاف نتا کا ماحول بہت بھدا اور غیر شاعرانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن میں اسے کب اور کیونکر ملا ... یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ اُس حسین ماضی کے مختلف نقوش نسیان کے دھندلکے سے ابھر ابھر کر میری نگاہوں کے سامنے رقص کر رہے ہیں۔ دیکھئے! ہم تھیٹر میں ہیں۔ وہ مسرت و انبساط میں کھوئی ہوئی (یہ گھڑی اُسے بہت کم نصیب ہوتی تھی) ڈرامے کے ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے سن رہی ہے۔ اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے ....

مجھے اس کی دلربا مسکراہٹ خوب یاد ہے۔ اس کے بعد ہم نامعلوم کہاں کھڑے بیٹھے تھے۔ اس نے اپنا خوبصورت سر میری طرف جھکایا۔ اس کے لعل پاش ہونٹ ہلے اور مترنم آواز میرے کانوں میں آبِ حیات ٹپکانے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی "مجھے معلوم ہے کہ میری مسکراہٹوں کی یہ جنت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکے گی لیکن کچھ پروا نہیں۔ اس کی یاد ہی میری زندگی کو خوشگوار بنا دے گی۔" یہ الفاظ اب بھی میری سماعت میں ایک لطیف اور دلنواز ارتعاش پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تمام باتیں حقیقت میں ہوئی بھی ہیں یا نہیں۔

یہ سچ ہے کہ اُس کو چھوڑ دینے کا گناہ مجھ سے ہی سرزد ہوا۔ یہ فعل قطعی غلط معلوم ہوتا ہے۔ میرے تمام دوستوں نے ہمیشہ ایسا ہی کیا۔ وہ شادی شدہ عورتوں کے جذبات سے کھیلے۔ اور پھر تھوڑی مدت بعد انہیں ٹھکرا دیا۔ میں نے بھی اُن کی تقلید کی۔ مجھے احساس تک نہیں ہوا کہ یہ حرکت قابلِ مذمت ہے۔ میرا خیال تھا کہ چوری کرنا۔ قرض ادا نہ کرنا اور دوسروں کی چغلیاں کھانا بہت قبیح افعال ہیں لیکن ایک محبوب عورت کو ٹھکرا دینا کوئی اخلاقی گناہ نہیں۔ دنیا ایسا کرتی آئی ہے اور کر رہی ہے۔ ایک شاندار مستقبل میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ میں اپنے آپ کو ایسی رومان خیز محبت کے حوالے کیوں کر دیتا؟ ننا سے اجتناب کرنا یقیناً سخت تکلیف دہ تھا۔ لیکن میں نے اپنے دل پر جبر کیا۔ اتنا جتنا کسی شخص کو دنیا کی دلفریبیوں سے علیحدہ ہوتے وقت کرنا پڑتا ہے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے سنا کہ ننا کچھ عرصہ بعد اپنے خاوند کے ساتھ مغربی ممالک میں چلی گئی ہے۔ اس کے تھوڑی مدت بعد مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ مر گئی۔ لیکن اُس زمانے میں ننا کو یاد کرنا بڑا تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا میں اُس کے متعلق سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ میں نہ تو ننا کا نام سن سکوں اور نہ ہی اُس کے متعلق کچھ سوچوں۔ میں نے اس کی تصویر جلا دی۔ اس کے خطوط . . . . وہ خطوط جن میں اس نے اپنا تڑپتا ہوا۔ مچلتا ہوا دل رکھ دیا تھا . . . . واپس کر دیئے۔ اور اب میرے اور اس کے درمیان کوئی رشتہ نہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ننا کی یاد کے تمام نقوش میری لوحِ دل سے مٹ گئے۔ آپ سمجھے؟ میں ننا کو بھول جانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اُسے بالکل بھول گیا۔ اسکا چہرہ۔ اس کا نام حتےٰ کہ اس کی محبت تک کو بھول گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ننا کا میرے ساتھ کبھی کوئی رشتہ تھا ہی نہیں۔ آہ! مردوں کی یہ فراموش کر دینے کی عادت کس قدر شرمناک ہے!

وقت گذرتا گیا۔ میں یہ نہ بتاؤں گا کہ میں اپنی زندگی کو کیونکر کامیاب بنا سکا۔ ننا کے بغیر میرے تمام مزعومات دنیاوی کامیابی تک ہی محدود ہو گئے۔ روپیہ میرے تمام تر خیالات کا مرکز بن گیا اور ایک زمانہ وہ بھی آیا۔ جب میری تمام خواہشات پوری ہو گئیں۔ ہزاروں روپے میری جیب میں کھنکھناتے رہتے۔ میں نے شادی کر لی۔ اور تین بچوں کا باپ بن گیا۔ اس کے بعد زندگی کا پانسہ ایک دم پلٹ گیا۔ میرے بنائے ہوئے نقشے ناکام رہے۔ میری بیوی فوت ہو گئی۔ بچوں کی معقول نگہداشت کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ اس لئے میں نے انہیں رشتہ داروں کے ہاں بھیج دیا۔ اب میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ میرے لاڈلے بچے زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں میرا شغل تاش کھیلنے اور شراب کے نشے میں چور رہنے کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا میں نے ایک ایجنسی لی۔ لیکن یہ بھی فیل ہو گئی۔ جو پونجی باقی تھی سب اسی کی نذر ہو گئی۔ میں نے جوا کھیل کر اس نقصان کی تلافی کرنا چاہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں قید ہوتے ہوتے بچا . . . . ہاں! یہ بلاوجہ نہ تھا میرے دوست میری دشمنی پر اتر آئے اور میرے زوال کا زمانہ شروع ہو گیا۔

آہستہ آہستہ میں اس حالت تک پہنچ گیا جہاں آپ مجھے دیکھتے ہیں۔ میں عظیم الشان بلندیوں سے یکدم گر کر بدنامی اور بدکاری کے عمق میں آ گیا۔ ہر وقت شراب کی بدمستیوں میں کھوئے رہنے اور غلیظ اور بدبودار چیتھڑوں میں ملبوس رہنے کی وجہ سے میں کہیں جانے کے قابل بھی نہ تھا۔ کئی دفعہ میں نے شراب چھوڑنے کی کوشش کی اور کئی کئی مہینے ایک معمولی مزدور کی طرح مختلف جگہوں پر کام کرتا رہا لیکن شراب کا چسکا کچھ ایسا پڑا تھا کہ میں پھر اُسی دلدل میں دھنستا گیا اب میں چوروں اور گرہ کٹوں کے بازاروں میں گھومنے لگا۔ میں اپنے ارد گرد بسنے والے لوگوں سے ہمیشہ نفرت کرتا رہا۔ اور ہمیشہ یہی سوچتا کہ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں سے دولت پھٹ پڑے گی۔ اور میں پھر امیر بن جاؤں گا۔ مجھے پوری امید تھی کہ میں کسی ایسی دولت کا وارث بننے والا ہوں جو دنیا پر موجود نہ تھی۔ اور میں اپنے دوستوں کو محض اس لئے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کہ ان کے ذہن ایسی امیدوں سے بالکل خالی تھے۔

خیر! ایک دن میں بھوک اور سردی سے نڈھال ہوکر نہ معلوم کیونکر یا۔ حویلی کی ڈیوڑھی میں جا پہنچا۔ باورچن نے مجھے دیکھ لیا اور پکار کر بولی "اے! تم تالا بنانے والے تو نہیں ہو؟" "جی ہاں" میں نے کہا وہ ...خروں والی میز کا تالا بنوانا چاہتے تھے۔ میں مطالعہ والے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جو پُرتکلف ساز و سامان سے سجا ہوا تھا۔ سنہری فریموں والی تصویریں اور سنہری جلدوں والی کتابیں مناسب مواقع پر سجی تھیں۔ میں نے بہت جلد... تالا بنالیا۔ باورچن نے مجھے ایک ریال دیا۔ میں جانے ہی کو تھا کہ دفعتہً میری نگاہیں ایک مرمریں مجسمے کی طرف کھنچ گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں بے ہوش ہونے کو ہوں۔ نامعلوم کیوں۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ مجسمہ ...... نتا ...... کا ہے!

میں سچ عرض کرتا ہوں جناب! میں نتا کو بالکل بھول چکا تھا۔ ...فراموشی کا احساس مجھے اس وقت پہلی دفعہ ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میں اُسے بالکل بھول چکا ہوں۔ دفعتہً اس کا خوبصورت چہرہ جس کے ہونٹوں کے گوشوں میں مسکراہٹوں کی ہزاروں لہریں مچل رہی تھیں میری آنکھوں کی پتلیوں پر ناچنے لگا۔ ان مسکراہٹوں نے میرے خوابیدہ جذبات، حسیات اور خیالات کی دنیا میں ہلچل ڈال دی۔ گذری ہوئی یاد جس کو میں مردہ سمجھ رہا تھا از سر نو زندہ ہو گئی۔ میرے جذبات محبت میں ایک دفعہ پھر زندگی کی روح دوڑ گئی۔ میرے جسم کی ہر رگ کانپ اٹھی۔ اور میں نے اُس مرمریں مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو بتا دیجئے بڑی نوازش ہوگی آپ کی۔ یہ مجسمہ کس کا ہے؟" "یہ" اس نے جواب دیا "بہت قیمتی چیز ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے۔ پانچ سو سال پرانا" اس نے مجھے اس مجسمہ ساز کا نام بھی بتایا جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ گھر کا مالک اس مجسمے کو اٹلی سے لایا تھا۔ اور اسی کی وجہ سے روس اور اٹلی کے درمیان سیاسی گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے "لیکن" اُس باورچن نے کہا "یہ کچھ ایسی اچھی چیز تو نہیں کہ اس پر یوں متعجب ہوا جائے۔ تمہارا مذاق کچھ بھونڈا سا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو تو کان اپنی اصلی جگہ پر نہیں ہیں اور ناک بھی کچھ بے ڈھنگی سی ہے۔" اور وہ چلی گئی۔

میں بھاگ کر کمرے سے باہر نکلا گویا میرا سانس گھٹ رہا تھا۔ یہ محض مشابہت نہ تھی بلکہ یہ حقیقتاً اس کی تصویر تھی نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نتا نے اس پتھر میں نیا جنم لیا ہے۔ مجھے بتائیے کہ وہ کیا جادو تھا۔ جس نے پندرھویں صدی عیسوی کے فنکار کو ویسے ہی چھوٹے چھوٹے کان جن سے میں خوب مانوس تھا۔ بالکل ویسی ہی قدرت سے ترچھی آنکھیں۔ وہی بے ڈھنگی ناک۔ وہی بلند و ڈھلوان پیشانی۔ جس سے غیر متوقع طور پر ایک عورت کا خوبصورت چہرہ بنا تا تھا۔ بنانے کی ترغیب دلائی؟ وہ کونسا معجزہ تھا جس نے مختلف صدیوں میں ایک ہی شکل و صورت کی دو مختلف ...... عورتیں پیدا کر دیں۔

اُس دن سے میری زندگی بالکل بدل گئی۔ میں سمجھ گیا کہ نتا کو بھول جانا بہت ہی ذلیل فعل تھا۔ میں جان گیا کہ وہ فرشتہ تھی جس کو قدرت نے میری بہبودی کے لئے انسانی قالب میں ڈھالا تھا لیکن وائے بدنصیبی! میں اُس فرشتے کو پہچان نہ سکا۔ ماضی کو حال میں بدل لینا تو ناممکن تھا لیکن اس کی یاد کو زندہ کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ میں نے اُس شخص کی طرح جو ٹوٹے ہوئے کھلونے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر اُس کھلونے کو از سر نو بنانا چاہتا ہے۔ نتا کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن آہ یہ یاد کتنی دھندلی تھی۔ باوجود کوشش کے میں تمام واقعات کو یاد نہ کر سکا۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کے سوا سب کچھ بھول چکا تھا۔ میں نے کئی گھنٹے ان بے ربط واقعات پر غور کیا۔ اور ان کے درمیانی خلاؤں کو پر کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے لوگ میرا مذاق اڑا دیتے تھے۔ لیکن میں اس دماغی کاوش میں ایک خاص راحت ایک خاص طمانیت محسوس کرتا تھا۔ میں بوڑھا تھا۔ زندگی کو از سر نو شروع کرنے کے ناقابل۔ لیکن مجھ میں اتنی قوت ضرور باقی تھی کہ میں اپنے تمام بے ہودہ خیالات سے دل کو پاک کر دوں۔ دوسرے انسانوں کے خلاف خواہ مخواہ کی نفرت سے باز آجاؤں۔ اور اپنے پروردگار کے خلاف بڑبڑانا بند کر دوں۔ نتا کی یاد

نے یہ سب کچھ کر دیا۔

میں ایک دفعہ پھر اس مجسمے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں رات رات بھر اس گھر کے گرد چکر کاٹتا رہا کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر اُس مورتی مجسمے کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ ایسے مقام پر رکھی گئی تھی۔ جہاں میری نظریں پہنچ ہی نہیں سکتی تھیں۔ میں اس گھر میں رہنے والوں کو جانتا تھا۔ میں کمروں کی ساخت تک سے واقف ہو گیا تھا۔ میں نے نوکروں سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ موسم گرما میں گھر کی مالکہ کہیں اور چلی گئی۔ اب اپنی خواہش کو تشنۂ تکمیل دیکھنا میرے احاطۂ قدرت سے باہر تھا۔ میں نے سمجھا کہ اگر ایک دفعہ . . . صرف ایک دفعہ . . میں اس مورتی نتا کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تو شروع سے لیکر آخر تک کے تمام واقعات یاد آ جائیں گے۔ اور یہی میری انتہائی خوش نصیبی ہوگی۔ یہ سوچکر میں اس حرکت کا مرتکب ہو گیا۔ جس کے لئے مجھے یہ سزا ملی ہے۔ آپکو معلوم ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں بال بال میں پکڑ لیا گیا۔

مقدمے کے دوران میں یہ بتایا گیا کہ میں تالا بنانے والے کے بھیس میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ اور میں بسا اوقات گھر کے ادھر اُدھر پھرتا دیکھا گیا ہوں . . . . میں ایک فقیر ہوں میں نے تالے توڑے ہیں . . . خیر جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ بس یہی ہے میری داستان

"لیکن ہم اپیل کرینگے" میں نے کہا۔ "تمہیں بری کر دیا جائے گا۔"

"کس لئے؟" بوڑھے نے پوچھا۔ "کسی کو میرے قید ہو جانیکا افسوس نہیں ہے کون میری رہائی پر خوش ہوگا۔ میں کہیں بیٹھ کر نتا کیمتعلق سوچتا رہوں جیل میں یا شراب خانے کے دروازے پر . . سب ایک سا ہی تو ہے۔

میں لاجواب ہو گیا۔ بوڑھے نے دفعتاً اپنی وحشت خیز دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"صرف ایک چیز مجھے دکھ دے رہی ہے۔ ممکن ہے کہ نتا کا وجود ہی نہ ہو میرے کزورہ اور شراب کے اثر سے مدہوش دماغ نے محبت کی یہ کہانی اسوقت گھڑ لی ہو جب میں اس مورتی مجسمے کیطرف دیکھ رہا تھا۔ شاید یہی ہو۔"

جنگل میں شام

جناب اختر ہوشیارپوری بی۔ اے

سورج کی جبیں جھکی ہوئی ہے
باغوں میں ہوا رکی ہوئی ہے

چہرے پہ شفق کے ہے سیاہی
ظلمت کی ہے جگ میں بادشاہی

چرواہے جو راگ گا رہے ہیں
رک رک کے قدم اٹھا رہے ہیں

کھیتوں سے جو اٹھ رہی ہے خوشبو
خنکی میں بدل رہی ہے پہلو

جنگل میں صدا ہے دھیمی دھیمی
مصروف دشر شہریوں کی

باغوں کے ہے سایوں میں اندھیرا
اب ختم ہے بوم کا بسیرا

تیتر کی صدائیں آ رہی ہیں
جھینگر کی نوائیں آ رہی ہیں

کس شان سے رات آ رہی ہے
ظلمت کے علم اٹھا رہی ہے

محلول ہے نور میں اندھیرا
ظلمت کا ہے روشنی میں ڈیرا

حضرتِ احسان دانش

دعوتِ فکر

ہر سمت ہر طرف نظر آنے لگے ہو تم
یہ کیا فسوں گری سی دکھانے لگے ہو تم

دامن چھڑا رہا ہے جنوں دستِ عقل سے
خوابوں سے اب خیال میں آنے لگے ہو تم

کروٹ بدل رہی ہے مری ہیئتِ شباب
کس رنگ سے نقاب اٹھانے لگے ہو تم

اے کاش خوابِ کنجِ لحد ہو مجھے نصیب
بے خوابیوں کے ناز اٹھانے لگے ہو تم

کرنا پڑے گا خاک کو اکسیر دیکھ لو!
یہ دل لگی نہیں ہے مٹانے لگے ہو تم!

دنیا میں سوئے ظن کی ہوائیں ہیں زور پر
کس وقت یہ چراغ جلانے لگے ہو تم!

انجام سوچ لو مرا انجام سوچ لو
ذرے کو آفتاب بنانے لگے ہو تم!

بازی گہِ وفا میں ہے روحوں کی ہار جیت
کس امتحاں میں جان لڑانے لگے ہو تم

تیناسیب ترجمہ مقبول بیگ بدخشانی بی اے

حوّا کے بچّے

منظر

آدم کا مکان

(مکان کے دو دروازے ہیں۔ دو معمولی سی لکڑی کی کرسیاں پڑی ہیں۔ ایک میز بھی دیوار کے ساتھ لگی ہے لکڑی کے بنے ہوئے آٹھ اسٹول دیوار کے ساتھ ساتھ پڑے ہیں۔ ایک جھاڑو میز پر سے لٹک رہی ہے۔ ایک کرسی پر حوا بیٹھی ہے اس کے ہاتھ میں عصا ہے۔)

حوّا۔ (کچھ تندی سے) اس کائنات میں سب سے زیادہ اندوہگیں انسان میں ہی ہوں۔ ہاں اس لئے کہ میں نے جنت کے شیطان کے جادو بھرے الفاظ کی اطاعت کی اور وہ پھل کھالیا جو ہمارے لئے ممنوع تھا۔ خدا کی پھٹکار ہمیشہ مجھ پر پڑتی رہے گی۔ مجھے جنت کی سہانی سرحدوں سے باہر نکال دیا گیا۔ اب میرا نصیب یہی ہے کہ اپنے گناہ کے آگے سر نیاز خم کر دوں اور اس رنج و اندوہ کے عالم میں بیٹھی تڑپتی رہوں۔

(آدم داخل ہوتا ہے۔ اس کے کندھے پر کدال ہے اور ہاتھ غبار میں اٹے ہوئے ہیں)

آدم۔ پیاری بیوی خدا تمہارا نگہبان ہو۔

(آدم ساتھ کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

حوّا۔ اور خدا تمہارا بھی نگہبان ہو۔ تم بہت ہولے ہولے چل رہے ہو کچھ تھکے ہوئے ہو کیا؟

آدم۔ بیشک کچھ تھک رہا ہوں۔ خدا کی مشیت ہی یہی ہے کہ میں زمین کھودتا رہوں اور اُسے ہموار کرتا رہوں۔ روٹی ہمیں تبھی مل سکتی ہے کہ ہم اپنا خون اور پسینہ ایک کر دیں۔ لیکن پیاری تم یہاں تنہا کیوں بیٹھی ہو؟ تمہیں کیا فکر لاحق ہے؟ تم اداس سی ہو۔

حوّا۔ آدم تم میری اداسی کا سبب پوچھتے ہو تم جانتے ہی ہو ساری مصیبت کا باعث میں ہوں۔ وہ وقت کی روٹی کھانے کیلئے ہمیں کتنے آنسو بہانا پڑتے ہیں۔ کس قدر محنت کرنا پڑتی ہے اس کی وجہ صرف میں ہوں۔ ہم پر، ہمارے بچوں پر، ہمارے پوتوں پر یہ پھٹکار ہمیشہ کے لئے رہے گی ہم ہمیشہ کے لئے دین اور خالق کی توجہ سے محروم رہینگے جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے زندگی بھر کے لئے آنسو بہانے سے کام اور پشیمانی کے ماتم سے غرض ہے۔

(حوا اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیتی ہے۔ آدم اٹھتا ہے اور اپنا ہاتھ اس کے دوش پر رکھ دیتا ہے۔)

آدم۔ میری حوا میری اچھی حوا تم اس قدر غمگین کیوں ہو میں تمہارے لئے بڑی ہی اچھی خبر لایا ہوں۔ مجھے خدا کی طرف سے پیغام وصول ہوا ہے۔

حوّا۔ (حیرت میں اس کا منہ تکتے ہوئے) خدا کی طرف سے پیغام۔ کیا پیغام ہے آدم؟

آدم۔ آج خدا آسمان سے ایک مقدس فرشتے کو ہمارے پاس بھیجے کہ ہمارے گھر کے حالات کا جائزہ لے اور دیکھے کہ ہم اپنے بچوں سے محبت کیونکر کرتے ہیں۔ اور ان کی تربیت اچھے طریق پر کی

ہے کہ نہیں۔

حوا۔ (خوف و ہراس کے عالم میں اچھل کر) مجھے ڈر لگتا ہے آدم! مجھے بہت ڈر لگتا ہے میں خدا کے فرشتے کا خیر مقدم نہیں کر سکتی۔

(حوا منہ پھیر کر جانے کی غرض سے اٹھتی ہے۔ آدم اس کا راستہ روک لیتا ہے)

آدم۔ کیوں حوا تم بھاگنے کیوں لگیں۔ تمہیں گرمجوشی کے ساتھ فرشتے کا استقبال کرنا چاہیئے۔

حوا۔ اے کاش . . . مجھے اس کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔ مجھ سے گناہ سرزد ہو چکا ہے۔

آدم۔ (حوا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) پیاری! خدا نے اپنا فرشتہ ہمارے ہاں دشمنی کی غرض سے نہیں بھیجا۔ وہ ہم پر رحم کرنا چاہتا ہے۔ جاؤ بچوں کو غسل دو۔ تیار کرو۔ اچھے اچھے کپڑے پہناؤ۔ میں کمرے کو جھاڑ پونچھ کر آراستہ کروں گا۔ صحن میں تازہ پودے لگا دونگا فرشتہ جب اندر داخل ہو تو ہر شے قرینے سے پڑی ہو اور جی کو بھائے

حوا۔ میرے خاوند میں تمہارا حکم ضرور بجا لاؤں گی۔ بچوں کو اچھی طرح سے آراستہ کروں گی کہ وہ فرشتے کا خیر مقدم کرنے کے قابل ہو جائیں ممکن ہے خدا اپنی خیر و برکت سے انہیں پھر نواز دے۔ اور خدا کے نزدیک وہ پھر لطف و کرم کے مستحق ہو جائیں۔

آدم۔ (بے صبری کے ساتھ) ہاں ہاں اب تم جاؤ۔ اور جلد واپس آؤ۔

حوا۔ خدا کا شکر بجا لاؤ۔ کہ اس کو ہماری لغزش کے باوجود ہمارا پاس ہے

آدم۔ تم بھی خدا کا شکر بجا لاؤ۔

(حوا باہر چلی جاتی ہے۔ آدم جھاڑو لے کر کمرہ صاف کرنے لگتا ہے۔ پھر صحن میں پھولوں والے چھوٹے چھوٹے پودے لگا دیتا ہے۔ ایک کرسی اٹھا کر وسط میں رکھ دیتا ہے اور آٹھ اسٹول سامنے نصف دائرے کی صورت میں جوڑ دیتا ہے۔ کام جاری رکھتا ہے۔ اور خوش ہو ہو کر گانے لگتا ہے۔)

آدم کا گیت

آفتاب کی بلندی ہمیں پتہ دیتی ہے کہ یہ دوپہر ہے۔
چھٹکی ہوئی چاندنی ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ رات ہے
کلنگ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں اور طویل چونچ سے پہچانا جاتا ہے۔
بلبل اپنے غمگین سروں سے
مور چمکدار کلغی سے
سرخ ہرن تیز خرامی سے
راحت گیت اور قہقہوں سے
اور درد کرب انگیز آہوں سے
مجھے بول اچھی نیت کی علامت ہیں
تکمیل یافتہ کام مزدور کے ہنر کا پتہ دیتا ہے۔
انسان کے اطوار اور وحشیوں کی وحشتوں پر
غور کرو اور صحیح صحیح اندازہ کرو۔
جو شخص نظارہ و آواز سے سبق سیکھتا ہے
اس پر خدا کی برکت نازل ہوتی ہے۔
صحیح قسم کی دانائی اسی کو میسر آتی ہے۔

(حوا پھر داخل ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے اس کے چار بچے ہیں جو اسے بہت زیادہ عزیز ہیں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور سب اچھی اچھی ٹوپیاں اوڑھ رکھی ہیں۔)

حوا۔ میرے شوہر! بچوں کو خود دیکھو۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ ان کے بناؤ سنگار میں کوئی کمی نہیں؟ مجھے یقین ہے جب فرشتہ وارد ہوگا تو وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ اور بڑی مہربانی سے پیش آئیگا

آدم۔ (بچوں کو دیکھتے ہوئے) ہاں ہاں بچے اچھے ہیں۔ بہت ہی اچھے ہیں۔ یہ تو چار ہیں باقی کہاں ہیں؟

حوا۔ (زمانہ سازی کرتے ہوئے) باقی!

آدم۔ ہاں ہاں دوسرے چار بچے۔ فرشتے کی دعا لینے کے لئے تم انہیں ساتھ کیوں نہیں لائیں؟۔

حوّا۔ (خائف ہوکر) میں انہیں پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔

آدم۔ (ذرا تیزی سے) لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟

حوّا۔ دوسرے بچے بہت ناکارہ ہیں۔ کپڑے ان کے پھٹے ہوئے ہیں عادتیں ان کی وحشیانہ ہیں۔ اطوار ان کے بے ڈھب ہیں۔ مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ فرشتہ اگر ایسے نااہل بچوں کو دیکھے۔ اس لئے میں انہیں ساتھ نہیں لائی۔

آدم۔ (خشمناک حالت میں) تم نے انہیں چھوڑا کہاں ہے؟ کہو۔

(آدم اسے شانے سے پکڑ لیتا ہے)

حوّا۔ (جلدی میں) آدم! میرے پیارے شوہر میں تمہیں سب کچھ بتائے دیتی ہوں۔ ایک کو میں نے خس کے انبار کے نیچے چھپا دیا ہے۔ دوسرا اصطبل میں گھاس کے نیچے ہے۔ باقی دو انگیٹھی میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جب تک فرشتہ یہاں سے رخصت نہیں ہو لیتا ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے ہلیگا نہیں۔

آدم۔ (غصے کی حالت میں) تم انہیں ساتھ کیوں نہیں لائیں؟ فرشتہ اچھے چہروں اور عمدہ کپڑوں کی پروا نہیں کرتا۔ ادب اور انکسار کا پاس ضرور کرتا ہے (اپنے چاروں بچوں سے خطاب کرکے) بچو سنو اور غور سے سنو جب فرشتہ گھر کے اندر داخل ہو تو ادب و احترام کی غرض سے سر سے اپنی ٹوپیاں اتار کر کورنش بجا لانا۔ اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے اپنے ہاتھ آگے بڑھانا۔ اور بڑی حلیمی کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دینا وہ تمہارے لئے دعا کہیگا۔

بچے۔ محترم باپ ہم آپ کی ہدایت پر ضرور عمل کریں گے۔

(دروازہ پر تھاپ پڑتی ہے آدم اٹھ کر دروازے کی طرف جاتا ہے اور دروازہ کھول دیتا ہے۔ فرشتہ داخل ہوتا ہے اس نے ایک لمبا سا فرغل پہن رکھا ہے۔ پاؤں میں چپل ہے۔ ہاتھ میں عصا ہے اور پانی کی ایک بوتل بھی۔ ایک گیت گانیوالا اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ اس کے کندھے پر ایک بڑا سا تھیلا ہے۔ بچے ٹوپیاں اتار کر تعظیم کرتے ہیں۔ آدم فرشتے کی بائیں جانب پیچھے کو ہٹ کر حوا کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ بچے دائیں جانب کھڑے ہیں۔)

فرشتہ۔ (اپنے ہاتھ فضا میں بلند کرتا ہوا) اس گھر پر خدا کی رحمت سب کے سب۔ آپ نے غریب خانے کو رونق بخشی ہم سب آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

آدم۔ عالیجاہ! میں اور میری بیوی بڑے ہی شکستہ دل گنہگار ہیں ہم اس عنایت کے ہرگز قابل نہیں۔ کہ خدا ہماری تلاش میں یہ مقرب فرشتہ بھیجے۔

حوّا۔ ہمارے گناہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ کھٹکتے رہتے ہیں۔

فرشتہ۔ میرے بچو اطمینان رکھو۔ خدا رحیم و کریم ہے۔ بہت صبر اور نیکیوں والا ہے مفلس کی مدد کرتا ہے۔ وہ ضرور اپنے الطاف تم پر نازل کرے گا۔ مایوس نہیں ہونا چاہئے تم اس کے وعدوں پر یقین رکھو۔ (بچوں کی سمت مڑتا ہے) کیا یہ تمہارے بچے ہیں۔

آدم۔ (ایک لمحے کے وقفے کے بعد) یہ ہمارے چار بچے ہیں عالیجاہ

فرشتہ۔ ننھے بچو کیا تم مقدس گیت گا سکتے ہو؟

حوّا۔ ہاں جناب وہ اپنے گیت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ کیا آپ سننا پسند فرمائیں گے۔

(بچے یک آہنگ ہوکر گیت گانے لگتے ہیں)

تیرا گھر کتنا خوشنما ہے میرے لئے۔
اے مخلوقاتِ عالم کے بادشاہ
عبادت گاہیں جن پر تیری برکات نازل ہوتی ہیں۔
خدایا وہ کتنی اچھی ہیں۔
تیری بارگاہوں میں ایک دن گذار دینا
دوسری جگہوں کے ہزاروں کے قیام سے بہتر ہے۔
خدا کے گھر کے ایک دروازے پر کھڑے رہنا۔
میرے لئے بدیوں کی خیمہ گاہوں میں
مستقل قیام کر لینے سے بہتر ہے

فرشتہ ۔ ننھے بچو تم نے بہت اچھے گیت گائے۔ تمہاری وجہ سے دنیا میں آبادی پھیلے گی۔ اور اس حد تک پھیلے گی کہ ساری کائنات انسانوں سے بھر جائے گی۔ ان کی تعداد سمندر کی ریت کے ذروں کی مانند ہوگی۔

حوّا ۔ (آرزومندانہ انداز میں) عالی جاہ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ انہیں دعا دیں اور ہر ایک کو مخصوص برکت سے نوازیں تاکہ وہ ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہیں۔ اور زندگی بھر راہ راست پر چلتے رہیں۔ آپ ان کے مستقبل کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرمادیں۔

(بچے جھکتے ہیں فرشتہ ایک ایک کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے گیت گانیوالا آگے بڑھتا ہے اور فرشتے کے بائیں جانب کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور مختلف قسم کے نشان تھیلے سے نکال کر پیش کرتا ہے۔

فرشتہ ۔ (ایک سے خطاب کرتا ہے) تم بڑے طاقتور بادشاہ ہوگے اور رعایا پر بڑے جلال کے ساتھ حکومت کروگے۔ شہزادے اور نواب تمہاری اطاعت کرینگے۔ تم اس شاہی عصا اور تاج کے مالک ہو۔

(تاج اس کے سر پر رکھدیتا ہے۔ اور عصا اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

(دوسرے سے) اور تم ایک غازی بنوگے۔ اور اپنے وطن کو دشمن کی ہلاکتوں سے بچاؤگے۔ بیواؤں اور یتیموں کی سفر اور حضر میں حفاظت کروگے۔ فولاد و آہن تمہارا اوڑھنا بچھونا ہوگا۔ یہ تلوار لے لو۔

(تلوار اس کو دے دیتا ہے)

(تیسرے سے) اور تم شہر کے حاکم بنوگے۔ اور شہریوں پر حکومت کروگے پبلک کی بہبودی کے لئے کام کروگے۔ غلط کار کو سزا اور راستباز کو صلہ دوگے۔ غیر جانبدارانہ فیصلے صادر کیا کروگے۔ یہ انصاف کی چھڑی تمہاری نذر ہے۔ (چھڑی اُسے دیدیتا ہے)

(چوتھے سے خطاب کرکے) تم ایک سوداگر بنوگے غیر ملکوں سے ہر قسم کا کاروبار کروگے یہ میزان تمہارے لئے ہو (میزان اسے دیدیتا ہے) میرے بچو اپنے خدا سے ڈرتے رہو اور اپنے اپنے منصب پر قناعت کرو۔ تم جب تک تم زندہ ہو خدا تمہارا نگہبان ہوگا۔ اب میرے ساتھ آؤ میں تمہیں جنت کے حسین باغ ایک نظر دکھاؤں۔

(فرشتہ شفیقانہ انداز میں اپنے ہاتھ ان بچوں کی طرف بڑھاتا ہے۔ وہ بے حد خوش ہیں۔ اور اس کے ساتھ دروازے کی سمت چلتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ حوا ان کے پیچھے جانا چاہتی ہے)

حوّا ۔ عالیجاہ ہمیں بھی جنت میں جانے کی اجازت دیجئے۔

فرشتہ ۔ (استقلال کے ساتھ) نہیں حوا تم نے وہ پھل کھایا تھا جو تمہارے لئے ممنوع تھا۔ اب تم جنت کو واپس نہیں جاسکتے۔

(فرشتہ بچوں کو لئے جارہا ہے۔ گیت گانے والا ساتھ ساتھ ہے)

حوا ۔ (افسردگی کے عالم میں) آہ آدم اگرچہ ہمارے دوسرے بچے بھدے اور بدنما سے ہیں لیکن اب مجھے افسوس ہورہا ہے کہ میں نے انہیں بھی فرشتے کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے آراستہ کیوں نہ کردیا۔ وہ یقیناً انہیں بھی اپنی اچھی اور بے شمار نعمتوں سے نواز دیتا۔ اور وہ بھی اپنے وقت کے بڑے آدمی بن جاتے۔

آدم ۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ بچوں کی ظاہری حالت کا پاس کسے تھا؟ خداوجاہتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ جس پر چاہتا ہے نوازش کرتا ہے۔

حوّا ۔ (دروازے کی طرف بڑھکر) ہاں ہاں آدم میں ابھی جاتی ہوں۔ اور انہیں خس، گھاس اور انگیٹھی سے نکال لاتی ہوں میں جب تک واپس آجاؤں فرشتے کو باتوں میں لگائے رکھنا۔

(حوا باہر جاتی ہے)

آدم ۔ خوشی خوشی جاؤ اور انہیں جلد یہاں لے آؤ۔

(آدم بے صبری کے ساتھ ادھر ادھر ٹہلنے لگتا ہے۔ سامنے

کا دروازہ پورے زور سے کھول دیتا ہے)

آدم۔ (بلند آواز میں پکار کر) حوا، حوا! فرشتہ مجھے کچھ فاصلے پر دکھائی دے رہا ہے۔ جلدی کرو۔

(فرشتہ گھر میں داخل ہوتا ہے)

فرشتہ۔ آدم آدم تمہاری بیوی کہاں ہے؟ تمہیں جاننا چاہئے میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ سورج غروب ہو رہا ہے اب مجھے وہاں پہنچنا ہے جہاں سے میں آیا تھا۔

آدم۔ آہ عالیجاہ تھوڑی دیر اور ٹھہر جائیے کہ میری بیوی دوسرے بچوں کو بھی لے آئے۔

فرشتہ۔ کیا کہا، تمہارے اور بچے بھی ہیں؟ . . . . اچھا تو آدم میں تمہاری خواہش پوری کرنے کے لئے کچھ دیر اور ٹھہر جاتا ہوں۔

آدم۔ میں جا کر حوا سے کہتا ہوں کہ بچوں کو جلد لے آئے۔ ہاں وہ اپنے خستہ حال گروہ سمیت بھاگتی آ رہی ہے۔

(آدم اس کی طرف اشارہ کرتا ہے)

حوا۔ (اپنے دوسرے بچوں کے ہمراہ جو ان کی توجہ سے محروم ہیں داخل ہوتی ہے سب سے چھوٹے کو وہ اپنے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے ہے۔ اور باقی اس کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں اور فرشتے کو شرمیلی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے لباس بھی دوسرے بھائیوں کے سے ہیں۔ لیکن کٹے پھٹے اور مٹی میں لت پت ہیں، چہرے کونکوں کے سیاہ غبار سے اٹے ہوئے ہیں صرف ایک کے سر پر ٹوپی ہے۔ اور اس میں بھی اتنا بڑا شگاف ہے کہ سر کے بال اس میں سے کھڑے نظر آتے ہیں۔

(حوا فرشتے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے اور بڑے انکسار کے ساتھ بات چیت کرنے لگتی ہے۔ آدم ساتھ کھڑا ہے ندامت سے اس کی آنکھیں نیچے کو جھکی ہیں۔)

حوا۔ عالیجاہ! میں ان بچوں کی سفارش کرتی ہوں۔ دوسرے بچوں کی طرح ان پر بھی عنایت کیجئے اور دعاؤں سے نوازیئے

فرشتہ۔ (قدرے سختی سے) انہیں گیت سنانے دو۔

حوا۔ (ہاتھوں کو بے بسی میں نیچے گراتی ہوئی) افسوس یہ کوئی گیت نہیں جانتے۔

فرشتہ۔ (ملائمت کے ساتھ) بیکس بچو . . . . (حوا سے قدرے درشتی کے ساتھ) اور ان بچوں کے متعلق تم نے کیا سوچا ہے تم بہت غفلت شعار عورت ہو۔ تم نے نہ ان کے جسم کی دیکھ بھال کی نہ روح کی۔ ان بچوں کی پرورش بچھڑوں اور حیوانوں کی مانند بے طرح اور بے ڈھب طور پر ہوئی ہے۔ ان کی مثال بالکل ان بھیڑیوں کی سی ہے۔ جو اپنی منشا کے موافق جدھر چاہتی ہیں چل نکلتی ہیں۔

حوا۔ عالیجاہ! بچوں کی افراط کا یہ حال ہے۔ اور اس پہ دن بھر محنت کرنا پڑتی ہے۔ آدم کی بھی یہی کیفیت ہے۔ محنت کی شدت میں بچے اکثر ہمارے ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جائیگا میں اُن کے جسم و روح میں اصلاح و درستی کرتی رہوں گی۔ آپ انہیں دعا دیں۔ یہ سب بھلے آدمی بن جائینگے

فرشتہ۔ یہ جانتے ہی کچھ نہیں۔ اپنے خالق سے ڈرتے بھی نہیں۔ نہ اس کے آگے جھکنا ہی جانتے ہیں۔ پھر انہیں خدا کی برکتوں کی امید کیونکر ہو سکتی ہے۔

حوا۔ (بچوں کو نیچے جھکا دیتی ہے اور خود بھی گھٹنوں کے بل جھک جاتی ہے) آہ عالیجاہ! مہربانی کر کے آپ ان کی فرد گذاشتوں پر توجہ نہ دیں۔ ان پر بھی ان کے بھائیوں کی طرح نوازش کر کے میری دل کی تمنا پوری کر دیں۔

فرشتہ۔ خدا تمہارے گناہ کی پاداش میں ان بچوں کو سزا نہیں دینا چاہتا۔ اس کی ذمہ داری تم پر اور تمہارے خاوند پر ہے۔ تم نے انہیں نیکی کی تعلیم نہیں دی۔ عزت اور ادب کا سبق نہیں پڑھایا۔ انسان کو پہلے خدا کی سلطنت کی تلاش کرنا چاہئے۔ باقی سب چیزیں بعد میں اسے میسر آ جاتی ہیں۔

(اپنے ہاتھ بچوں کی سمت بڑھا دیتا ہے)

میرے بچو، میرے پاس آؤ تم پر بھی خدا کی برکتوں کا نزول ہوگا۔

(فرشتہ ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور بچے اس کے گھٹنوں کے آس پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ فرشتہ ایک ایک کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھتا ہے اور انہیں تحفے پیش کرتا ہے)

فرشتہ ۔ میرے بچے تم موچی بنو گے۔ چمڑے کو کما کر لوگوں کے لئے جوتے تیار کرو گے اور اپنی روزی پاؤ گے۔ میں تمہیں جوتے کا قالب دیتا ہوں۔

(فرشتہ جوتے کا قالب اسے دے دیتا ہے۔ حوا سر کی جنبش سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے) اور تم جولاہا بنو گے اور کپڑے بنا کرو گے۔ انسان ان سے اپنا تن ڈھانپا کریں گے۔ تمہارے لئے یہ تاری ہے۔

(دوسرے کو فرشتہ تاری دے دیتا ہے۔)

اور تم چرواہا بنو گے۔ بھیڑوں کو دودھ کر چھاچھ اور مکھن تیار کرو گے۔ سرسبز چراگاہوں کی طرف اپنی بھیڑوں کو لے جاؤ گے اور بھیڑیئے کے حملوں سے ان کی حفاظت کرو گے۔ یہ چرواہے کی چھڑی تمہارے لئے ہے۔

(تیسرے کو فرشتہ یہ چھڑی دے دیتا ہے)

اور تمہارے لئے یہ ہل کا پھاوڑا ہے۔ تم ایک کسان بنو گے۔ ہل جوتو گے۔ بیج بو کر دنیا والوں کو لئے روٹی مہیا کرو گے۔

(چوتھے کو وہ ہل کا پھاوڑا دے دیتا ہے

(دوسرے چار بچے جنہیں ماں باپ اور فرشتے کی توجہ سے وافر حصہ ملا ہے پھر داخل ہوتے ہیں اور فرشتے کے دائیں جانب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ محروم التفات بچے بائیں جانب ہیں ان میں سے ہر ایک پر خدا کی برکت نازل ہو چکی ہے۔ اور ہر ایک اپنی روٹی کمانے کے لائق ہو گیا ہے)

حوا ۔ (گنگناتی ہوئی) جناب والا آپ کی یہ تقسیم کتنی غیر مساوی ہے آپ کا ہاتھ کتنا جانبدار ہے۔ یہ سب بچے ہمارے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک سب کے سب برابر ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں تو پھر یہ کیسے مناسب ہے کہ یہ چاروں (ہاتھ سے اشارہ کرتی ہوئی) وقت کے بڑے آدمی نہیں اور یہ چار موچی، جولاہا، کسان اور چرواہے کے ذلیل انجام دیں۔

فرشتہ ۔ میری بیٹی! افسوس کا کوئی مقام نہیں۔ خدا کی نعمتیں خدا کی مشیت کے موافق تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ نعمتیں قابلیت کے اندازے سے عطا کی جاتی ہیں۔ کسی فرد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ خدائے مطلق کو مختلف قسم کے کاروبار کے لئے مختلف افراد کی ضرورت ہے۔ تاکہ ان میں ہر ایک اپنے اپنے منصب کو انجام دے۔ اگر سب ہی بادشاہ غازی، حاکم شہر اور سوداگر بن جائیں تو یہ سب کے سب ایک دوسرے کو پاؤں تلے روند ڈالیں۔ زمین کون کاشت کرے۔ مکان کون تعمیر کرے۔ کھانا کون تیار کرے۔ آٹا کون پیسے۔ کپڑے کون بنے اور رنگے کون؟ اگر کوئی بھی حکمران نہ ہو۔ جو دانشمندی کے ساتھ عوام کی رہنمائی اور نگہداشت کرے تو نظام کیوں کر قائم رہ سکتا ہے؟

حوا ۔ عالیجاہ! یہ میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔۔۔ لیکن یہ بچے (اشارہ کرتی ہوئی) شریف مخلوق کی طرح جنت کے شاداب باغوں میں زندگی بسر کریں گے۔ دوسروں کو سخت محنت کرنا ہوگی۔ انہیں غذا کھانے کو ملے گی اور سخت بچھونے آرام کرنے کو۔ بادشاہوں اور نوابوں کے حضور میں انہیں اپنی گردنیں جھکانا پڑیں گی۔ اگر ان سے عہد کر لیا جائے کہ ان کو بھی دوسرے بھائیوں کی سی نعمتیں عطا کی جائیں گی تو مجھے کوئی گلہ نہیں۔

فرشتہ ۔ نہیں حوا تم نہیں جانتیں۔ ایک پیشہ دوسرے پیشے کے برابر ہی ہوتا ہے۔۔۔ سب لوگ محنت کرتے ہیں اور تھک کر چور ہوتے ہیں۔ بادشاہ، سوداگر، غازی، حاکم شہر اگرچہ ہاتھوں سے مشقت نہیں کرتے لیکن رنج اور تکلیف سے انہیں بھی سابقہ پڑتا ہے

پلیگ، جنگ اور قحط کی شکل میں رحم و بے التفات بچوں کی سمت مڑتے ہوتے ہیں آزاد مرد ہیں۔ انہیں اپنے اور اپنی بیوی کے سوائے کوئی فکر لاحق نہیں۔ جسمانی محنت سے جسم صاف اور تندرست رہتا ہے۔ نیند مزے کی آتی ہے۔ دماغ میں سکون رہتا ہے جس طرح پرندے کو پرواز کی خواہش فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اسی طرح انسان کو بھی کام کرنے کا ارادہ فطرت ہی کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ یاد رکھو۔ جو اپنے جاہ و منصب پر قناعت کریگا۔ زندگی میں اسے بہت کچھ ملے گا۔ (اپنے ہاتھ دعا کے لئے فضا میں بلند کرتا ہے) خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔

سب کے سب۔ اور مقدس فرشتے آپ کو بھی۔

(فرشتہ گھر والوں سے رخصت ہوتا ہے۔ گیت گانے والا پیچھے پیچھے ہولیتا ہے۔ آدم دونوں کرسیوں کو ایک ساتھ رکھ دیتا ایک کرسی پر وہ خود بیٹھ جاتا ہے۔ حوا کے کم نصیب بچے بائیں طرف اور دوسرے دائیں طرف بیٹھے ہیں۔ اور غور سے سن رہے ہیں۔

آدم۔ پیاری بیوی! اب ہمیں چاہیئے کہ خدا کے فرشتے کے الفاظ کو دلوں میں جگہ دے لیں اور اب سے بچوں کو نیکی کی تعلیم دیں اور خدا سے ڈرنا سکھائیں کہ دنیا میں ہر ایک اپنا اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دے۔

(حوا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور سب ایک ساتھ گانے لگتے ہیں۔)

کوئی موچی ہے اور کوئی حکمران
بعض کے جسموں پر چیتھڑے ہیں اور بعض کی انگلیوں پر خاتم۔
ایک کے پاس بہت کچھ ہے اور دوسرا اُس سے محروم۔
ہاں قناعت کرو۔ مجھے آپ سے یہی کہنا ہے۔

ماخوذ

جناب منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی

ایک آرزو

عطا وہ روح کو میری فروغ کر یارب | کہ نور بن کے ہو عالم میں جلوہ گر یارب
فلک پہ بن کے مہ و آفتاب چمکوں میں | فروغ حسن کو ہو بے نقاب چمکوں میں
سوادِ شب کے ستاروں میں ہو ضیا میری | عیاں ہو شعلۂ جوالہ سے ادا میری
فروغ آتشِ گل بنکے اس چمن میں رہوں | مثالِ شمع فروزاں اس انجمن میں رہوں
گدازِ عشق بنوں دل میں نور آنکھوں میں | مئے ازل کا ہو کیف و سرور آنکھوں میں

زبانِ شمع پہ ہو شب کو داستاں میری
ہوں ذرّے ذرّے میں یارب تجلیاں میری

مرے کریم، یہ ہے تجھ سے التجا میری　　کہ نامِ نیک سے دنیا میں ہو بقا میری
شکیبِ خاطرِ غمگیں ہو میرا نظّارہ　　نظر میں صورتِ تسکیں ہو میرا نظّارہ
مشامِ روح کو بوسے مری قرار آئے　　مری شمیم سے قالب میں جانِ زار آئے

شگفتہ ہو کے بہشتِ بریں میں مہکوں میں
وطن کے باغ میں بلبل کی طرح چہکوں میں

مرے وجود کو یارب نہیں جہاں میں بقا　　کہ میری ہستی فانی ہے نقشِ لوحِ فنا
بنا دے ایسا اسے نغمۂ نشاط فزا　　کہ لطف جس کا دلوں میں ہو انبساط فزا
دمِ سماع سکوں جس سے اہلِ درد کو ہو　　قرار سینۂ سوزاں میں آہِ سرد کو ہو
بنائے مستِ مئے شوق جو مغنّی کو　　عروج بزم میں ہو جس سے ذوقِ مستی کو
عطا وہ کر مجھے توفیقِ نیک ربِّ علا　　عصا بنوں میں ضعیفوں کا صورتِ موسیٰ
شریکِ درد ہوں میں غم میں خستہ حالوں کا　　اثر ہو دل میں مرے بیکسوں کے نالوں کا
پھرے نہ شیوۂ مہر و وفا سے سر میرا　　غریب لوگوں کے کام آئے مال و زر میرا
یہ تجھ سے ہے مرے معبود التجا میری　　یہی وظیفہ ہے میرا یہی دعا میری
تری شرابِ محبت کا جوش ہو دل میں　　بنوں میں جامِ حقیقت جہاں کی محفل میں
ہزار پاؤں میں کڑیاں ہوں قیدِ ہستی کی　　ہزار ٹھوکریں کھاؤں میں اوج و پستی کی

مگر نہ دل سے مرے تیرا اعتقاد ہو محو
نہ تیرا ذکرِ محبت، نہ تیری یاد ہو محو

جناب عرش تیموری (حیدرآباد دکن)

بالاکاوی

مرہٹی کا فطرت پرست شاعر

قرنِ اولیٰ سے علماء، شعراء اور فلسفیوں نے معاشرہ (سماج) کے جاہل طبقہ میں علوم اور سچائی کی نشرواشاعت کی، انہوں نے سماج کو پُرمسرت زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے کو اپنا فرضِ منصبی جانا.... دنیا.... جہالت جرائم اور گناہ و شر سے معمور تھی۔ ان حساس طبیعتوں نے انسانیت کی قابلِ رحم حالت کا مطالعہ کیا.... اور آخرکار بے ہودہ سماج کی اصلاح کے کام پر اپنی روح و دل کو بھینٹ چڑھا دیا۔ ان کی صدقدلی سرگرمی اور استقامتِ طبع کی کسی نے قدر نہ کی بلکہ ان محسنوں پر طعنہ زنی کی گئی، قسم قسم کے اتہامات لگائے گئے۔ اور رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ لیکن وہ اپنا کام کئے گئے اور برابر عوام کو تلقینِ نیکی کرتے رہے۔

انگریزی دورِ حکومت سے پہلے مرہٹی شاعروں کا یہ کام ان کے فضل و کمال کا نمونہ تھا۔ مرہٹی شاعری فنا میں اپنا آغاز رکھتی تھی اور سوائے فنا کی نشر کے اس کا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ البتہ گیان دیو، نام دیو اور مکتیشور نے علم الاصنام اور اخلاقی مضامین کو اپنی شاعری کا مقصد قرار دیا اور خدا کی حمد و ثنا کے گیت بھی گائے۔

تقریباً تمام مرہٹی شاعری جو انگریزی حکومت کے قیام سے پہلے کی ہے پند و نصائح کے جواہر سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ بڑے بڑے شعراء جیسے گیان دیو، وامن اور ایکنا تھ وغیرہ نے بھگتی (عبادت و زہد) کی بزرگی کو بیان کیا یا شری رام و شری کرشنا کی کہانیاں سنائیں۔ اور خدا کو یاد رکھنے کی عوام کو نصیحت کی۔ نام دیو کی ایکنا تھی بھاگوت، نام سدھا اور دوسری تمام تصنیفات کچھ اخلاقی اور کچھ ادبی مضامین کی حامل ہیں۔ رام داس کی طرح کچھ اور شاعر بھی تھے۔ جنہوں نے سیاسیات میں سرگرم حصہ لیا لیکن پھر بھی ان کی شاعری پر اخلاقی عنصر ہی غالب رہا اور ان کا اصلی مقصد بھی اخلاقی شاعری تھا۔ لیکن قیامِ حکومتِ انگریزی کے بعد مرہٹی شاعری میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔

شعراء انگریزی ادب سے بہرہ اندوز ہوئے اور مرہٹی شاعری کو ایک نیا جنم دیا۔ اور انیسویں صدی کے وسطی زمانے میں جولانیِ قلم دکھائی اس طرح سے جدید شاعری کی دیوی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ جبکہ فرنگی تاجروں کی سربرآرائی نے ہندوستانی ذہنیت، تمدن، تہذیب اور معاشرت سے ایک چٹکی لی۔

ہمارا نوجوان شاعر بالاکاوی انہیں شعرائے جدید میں سے تھا۔

سوانح حیات

ترمبک باپوجی ٹومبرے بالاکاوی کا پورا نام تھا۔ وہ سنہ ۱۸۹۰ء . . . میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ پولیس کے محکمہ میں عہدہ دار تھا۔ بالاکاوی سلسلہ وار کسی ایک سکول یا استاد کے تحت تعلیم نہ پا سکا . . . اور یہ امر ایک طرح سے اس کے لئے فائدہ رساں بھی ثابت ہوا کیونکہ اس کو اپنے باپ کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے میں حسنِ فطرت کے جاذبِ نظر اور دلکش نظاروں کو دیکھنے کا موقع ملا، جس نے اس کے لئے تفکر و تخیل کا بہترین مواد فراہم کر دیا۔ بالاکاوی کو فطرت سے بہت محبت تھی۔ اور وہ تیرہ یا چودہ سال کی عمر ہی سے نظمیں کہتا تھا۔ عوام نے جب اس خوش الحان نوجوان اور شیدائی فطرت کے نغمے سنے تو اُسے بالاکاوی (یعنی نوجوان شاعر) کا اعزازی خطاب دیا اور یہ ہمارے نوجوان شاعر کیلئے

…قسم کی ہمت افزائی تھی۔

بالاکاوی اچھی طرح تعلیم نہ پا سکا تھا، تاہم اس نے اپنے باپ سے … انگریزی سیکھ لی تھی چنانچہ اس نے کئی انگریز شاعروں اور گجراتی … مشہور شاعر کالاپی کے کلام کا بھی مطالعہ کیا لیکن تلسی رامائن کا اس … میں اثر تھا۔

انگریزی زبان کے مشہور ادیب "گولڈ سمتھ" کی طرح اسے بھی … اپنے عہد حیات میں غربت و تنگدستی کے مصائب سے دوچار ہونا … باپ کی موت کے بعد اسے خاندان کی پرورش کے لئے سخت کشمکش … کرنی پڑی۔ . . . یہاں نہ اس کا وجدان کام آیا اور نہ شیریں سخنی

جب یہ فردوسی شاعر دوزخ بھرنے کے لئے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا … احمد نگر پہنچا تو اس کی مشہور عیسائی شاعر این "دی تلک" سے … کی دوستی ہو گئی۔ اسی عرصہ میں وہ احمد نگر کو خیرباد کہکر پونا چلا گیا۔ تلک … نے اپنے پیارے دوست کی جدائی ناقابل برداشت تھی چنانچہ … اس نے اس موقع پر ایک دلگداز اور اثر انگیز نظم کہی۔

"اے پرند! کیا تو کبھی واپس آئے گا؟"

واقعات نے بالاکاوی کو پونا چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ احمد نگر … واپس چلا گیا۔ دنیاوی مصائب اور زندگی کی تلخیوں سے چھٹکارا پانے … نے اس کا دل و دماغ خودکشی کے خیال کی جولانگاہ بن گیا۔ لیکن اسکی … کی ہر نظر اس کے لئے اطمینان بخش ثابت ہوئی اور یہ حقیقت ہے کہ … یہ محترم ہستی اس شکستہ دل انسان کی ہمت افزائی نہ کرتی تو وہ خودکشی … کر چکا ہوتا۔

یہ تھی وہ امید جس نے اسے دنیا سے باندھ دیا"

الحاصل ایک روز جبکہ وہ پٹری پر سے گذر رہا تھا۔ ریل سے … دیا۔ اور اس طرح اس کی ناگہاں موت سے مرہٹی شاعری کو عظیم … نقصان پہنچا۔

اس کی شاعری

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بالاکاوی اصل میں شاعر فطرت تھا۔ لیکن اس نے فطرت کے حسین و نفیس مناظر کا خاکہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے نہیں کھینچا بلکہ وہ صبح سویرے اٹھ بیٹھتا اور پہاڑی پہاڑی کھیت کھیت فطرت کے حسن سے لطف اندوز ہوتا ہوا چڑیوں کے شیریں چہچہے اور بہتی ہوئی ندیوں کے سریلے راگوں کو سنتا ہوا گھومتا پھرتا۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ اعلیٰ قسم کی شاعری کی رفاقت … اور دلکش مناظر فطرت اس کی زبان سے شیریں اشعار نکلواتے تھے۔ اسکے الفاظ کی نشست اور ترتیب بے حد ترنم ہے۔

مرہٹی ادب کے لئے حقیقتاً ایک بہت بڑا صدمہ ہے کہ اس سے اس قدر جلد ایک قابل فخر و ناز اور جلیل فرزند چھین لیا گیا۔ اس کا کام ضخیم جلدوں پر مشتمل نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ بھی اس نے لکھا ہے نہایت عمدہ ہے کسی شاعر کی برتری اور بزرگی کام کی مقدار پر منحصر نہیں، اصلیت و خاصیت پر ہے۔

اس کی شاعری کسی قسم کی ہے وہ فطرت کے حسن کی عکاسی کرتا ہے پریشان و نالاں دل و دماغ کے احساسات کا اظہار کرتا ہے، فلسفہ کے ساز کو چھیڑتا ہے اور سچے مذہب کو آشکار کرتا ہے۔

اپنے الفاظ میں مسرت و انبساط کو یوں بیان کرتا ہے:-

"فطرت مجھے مسرت بخشتی ہے، آسمانی سکھ اور مسرت جاودانی محسوس کراتی ہے مجھے امن دیتی ہے۔ مجھے انبساط بخشتی ہے اور ہمیشہ میرے دماغ سے سرگوشی کرتی ہے:

"ہر چیز میں شاعری موجود ہے جو آنکھوں اور کانوں کے ذریعے دل میں اترتی ہے بیرونی پوشاک . . . دل آویز اور سہانی نغمے سے ترکیب پائی ہوئی ہے۔ دیکھو پھر یہ مجسم آسمانی تصویر ہے جو نیم فراموشی و بے خودی پیدا کرتی ہے اور ہمیشہ دل سے سرگوشی کرتی ہے۔"

بالاکاوی نے فطرت کی محفل میں صبح کی سرخی دیکھتے ہوئے گھنٹوں صرف کئے۔ اس کی ارونا گوندا گ راجا پر فوقیت رکھتی ہے۔

شاعر ایک بہترین خیال کی دعوت دیتا ہے!۔

"یہ ارونا ہے جو سطح فلک پر رنگ کاری میں مصروف ہے یا یہ ایک

شاعر ہے۔ جو ساری دنیا کو آباد کر رہا ہے یا . . . کیا القائے ربانی کی ہمراہی میں سرخیٔ امید ہے۔ جو تاریکیٔ شب کا پردہ چاک کر رہی ہے"۔

اس کے بعد شاعر خیال کرتا ہے کہ یہ سرخی کچھ بھی نہیں۔ بلکہ فردوسی و آسمانی محبت کا ایک دریا ہے۔ پھر پہاڑوں سے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اے بلند اور اونچے اونچے پہاڑو! اس تنویرِ محبت کو اپنی چوٹیوں پر گرفتار کر لو"

جیسے ہی ارونا کی طرف سے دنیا کو تحفے پہنچے۔ شاعر یوں نغمہ سرا ہوا۔

"ارونا زمین کے قلب میں فردوسی موسیقی اور آسمانی محبت چھڑک گئی تو شاعر نے غروبِ آفتاب سے طلوعِ ماہتاب تک کا منظر نہایت دلکش و حسین پیرائے میں کھینچا ہے۔ دوشیزۂ فلک کے نیلے جوبن کے ڈھانکنے والے ستاروں کا حسن و شوکت، خاکدان پر خاموش بادشاہت اور اسی قسم کے کئی مسرت بخش مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے اس کا دماغ محبت میں ڈوب گیا ہے۔

اس کی پھلرانی ایک سادہ تخیل کی مالک ہے

"پھلرانی خوبصورت مخملی سبز گھاس پر اٹھکیلیاں کر رہی تھی، وہ نیلے کرہ ہوا میں رقص کر رہی تھی۔ وہ اتنی بھولی تھی کہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھنے اور کھینچا تانی کے سوا کچھ نہ جانتی تھی۔

"ساری رات پھلرانی سوتی رہی پھر بادِ صبح کی گدگدیوں سے بیدار ہو گئی، اس نے چمکدار، عالم افروز اور دریا کے گرد دن اٹھاتے ہوئے حبابوں کو دیکھا، اس کے ساتھ چڑیوں کے دلکش راگ۔ اور ہوا کی موسیقی سنی اور پھر کرنوں کی محفل دیکھی۔

"فطرت نے مبارک بادی کے گیت الاپنے شروع کئے، ہوا نے آہستہ آہستہ بانسری بجائی۔ اور کوئل نے اس کے جواب میں نغمات فرداً فرداً کو فضا میں بکھیر دیا، چڑیاں رقص کرنے لگیں۔ اور دریا بڑبڑایا۔ آفتاب کی طلائی کرنیں دو لہا بنی ہوئی تھیں۔ اور پھلرانی دلہن۔ جیسے ہی شبنم رخصت ہوئی وہ دونوں ہم بغل ہو گئے"۔

اس کی نرجھار بہت شیریں اور دلچسپ نظم ہے ایک ندی کھیتوں اور وادیوں میں سے میٹھے اور سریلے گیت گنگناتی گذر رہی ہے۔ اور شاعر کو آسمانی موسیقی سیکھنے کا اشارہ کر رہی ہے۔

"مجھے سکھا! آسمانی موسیقی سکھا۔!!"

اس نظم کو پڑھتے ہوئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ندی کے ساتھ بہتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں جذبات اور بہترین تخیل اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

شاعری کی تعریف میں کہتا ہے:۔

"اے شاعری! تم موسیقی اور الفاظ پر حکومت کرنے والی ربانیت ہو، تم علم ہو اور خدا تم سے علیحدہ نہیں، انسانیت تمہارے نقشِ قدم پر چلتی ہے اور اس سیارہ (دنیا) کے عہدِ عتیق کے لوگوں میں تیز عقل و شعور شعراء کے ذریعے تمہیں نے بخشی۔ ہے۔ تو مختلف شکلوں میں جلوہ ریز، مسکن تحیر زا اور افسوس انگیز ہے۔ مجھے آسمانی محبت اور الفاظ معطر عطا کر!

اس کا طرزِ نگارش سادہ اور فطرتی ہے۔ اس کے ہاں بڑے بڑے مرکب الفاظ، ادق بیان اور ابہام نہیں ہے۔ اس نے اپنی نظموں کو کبھی ظاہری حسن نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی منظومات میں تصنع نہیں پایا جاتا۔ اس نے الفاظ کی شوکت و حسن، درصوتی موسیقیت پر معنویت کو کبھی قربان نہ کیا۔ فطرت کا یہ آتش نوا مغنی اٹھائیس سال کی عمر میں عالم وجود سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔ اس طرح جیسے شہاب ثاقب تھوڑی دیر کے لئے نظر آتا اور پھر نگاہ انسانی سے غائب ہو جاتا ہے

اس نوجوان شاعر کے متعلق انگریزی شاعر کیٹس کی طرح کہا جائے گا۔ کہ وہ "غیر مکمل شہرت کے درثا میں سے ایک تھا"۔

فخر الشعراء حضرت آغا شاعر

سوزِ ناتمام

ساقیا دے بھی کہیں بادۂ سرجوش مجھے
حلق سے اترے تو آجائے ذرا ہوش مجھے

شکوۂ بلبلِ بیتاب بنی گویائی
گل کو حسرت ہے دیئے کیوں لبِ خاموش مجھے

عینِ حکمت ہے جو چپ رہنے کی عادت پڑجائے
ایک دن دیکھنی ہے مجلسِ خاموش مجھے

شمع روشن تھا میں جب تک تھی جوانی باقی
جب وہ جانے لگی تو کر گئی خاموش مجھے

بے خودی میں تو بہت چین سے گذری شاعر
ہوش جاتے رہے آیا جو ذرا ہوش مجھے

جناب آفتاب مسرور

سوزِ میں ساز

زندگی کیا ہے، اک حزیں آواز
موت ہوتی ہے جس کا پردۂ ساز

جب حقیقت نہ ہوگی شعبدہ باز
ٹوٹ جائیں گے سب مجاز کے راز

عمرِ فانی ہے مثلِ دودِ چراغ
ڈھونڈ لے اُٹھ کے سینیوں سے فراز

دل پرشوق کے اشارے پر
کس نے چھیڑا ہے یہ نفس کا ساز

کھلتا جاتا ہے پردۂ اسرار
سامنے آچلا ہے عالمِ راز

قلبِ مضطر میں حسرتیں بے تاب
آدکھاؤں میں تجھ کو سوز میں ساز

محترمہ سیتا دیوی مترجمہ جناب محمد عتیق صاحب صدیقی

انتقام

ذیل کا افسانہ بنگال کی ۔ یہ ناز افسانہ نگار سیتا دیوی کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے ۔ جس زمانے میں یہ افسانہ میں نے پڑھا تھا اُس زمانہ میں بالکل یہی واقعہ ایک جگہ پیش آرہا تھا۔ آپ اس کو جو چاہیں کہیں میں تو اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا کا ہر افسانہ ایک مستقل حقیقت ہے ۔ (مترجم)

کرشن دیال کو عصر حاضر کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا تھا۔ گاؤں میں پیدا ہوا۔ بچپن کا زمانہ ایسے والدین کی تربیت میں گزرا جو فکر و عمل کے لحاظ سے کٹر مذہبی تھے تعلیم کی ابتدا۔ گاؤں ہی کے پاٹھ شالے میں ہوئی۔ اور تیرہ برس کے سن سے پہلے انگریزی حرفوں کی صورت بھی دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ اس کی آنکھیں عورتوں کے ساتھ گائے بیل کا بزناؤ دیکھنے کی عادی تھیں۔ اسلئے کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جدید خیالات اس کے دماغ میں کہاں سے گھس آئے۔ برہمن زادہ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے گاؤں میں رہ کر اپنے چیلوں کی نظروں اور اُن کے تحائف پر گزر اوقات کر سکتا تھا۔ وہ کولن ذات کا برہمن تھا جو بیک وقت بارہ شادیاں کر کے ہر سسر سے کافی رقمیں بطور ٹیکس کے وصول کر سکتا تھا لیکن اُس نے صرف ایک شادی کی۔ اس کی بیوی کا نام راد ہا رانی تھا۔ کرشن دیال اپنے گاؤں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر کلکتہ ایک معمولی وظیفے پر انگریزی پڑھنے چلا گیا۔ اُس کی اس حرکت پر اُس کا باپ سخت ناراض تھا۔ مارے غصہ کے اُس نے خرچ کے لئے اُس کو ایک پیسہ تک نہ دیا۔ کرشن دیال نے بھی احتجاجاً خط لکھنا بند کر دیا۔ وہ ذہین تھا۔ اس لئے برابر وظیفے ملتے رہے۔ اس کے علاوہ اُس کے پاس دو ایک جگہ تعلیم بھی دیتا تھا۔ اس لئے خرچ کی تنگی کا کبھی سوال نہ پیدا ہوا۔ اُسکی لڑکی راجندر رانی اس سال پیدا ہوئی۔ جب ایم اے پاس کرنے کے بعد اسکو ایک معقول ملازمت مل چکی تھی۔

راد ہا رانی کے نقطۂ نظر سے کرشن دیال عقلمند نہ تھا۔ بیکن چند سال سے ایک ساتھ رہنے کے باوجود بھی اُس کی باتوں کا کوئی اثر اُس کی بیوی کی طبیعت پر نہ پڑا۔ وہ اکثر کہتی "اپنی بے وقوفی ذرا غور کرو۔ لڑکی اور وہ بھی برہمن ذات کی مگر تم اُسکی عادتیں کس طرح خراب کر رہے ہو۔ آج کل چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی بر نہیں ملتا۔ لوگ مجبوراً چھوٹی ذات والوں کو روپیہ دیکر لڑکیاں دیدیتے ہیں مگر تو کسی اور ہی سوچ میں ہو . . . کیا لڑکی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گی؟"

"کوئی نہیں" کرشن دیال جواب دیتا" لڑکی جب پیدا ہوتی ہے تو اس خیال سے افسوس ہوتا ہے کہ وہ دوسرے گھر چلی جائے گی۔ اگر لڑکی ہمیشہ ماں باپ کے گھر رہے تو اس سے بڑھکر کونسی اچھی بات ہے"

یہ جواب سنکر راد ہا رانی کا چہرہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ بن جاتا۔ وہ کہتی ہے "ایک بچے کے باپ بن گئے۔ مگر عقل نہ آئی میں کہتی ہوں تم کو سمجھ کب آئے گی" کرشن دیال اپنے مخصوص انداز میں جواب دیتا اس وقت بات ختم ہو جاتی۔ مگر کرشن دیال اپنی جگہ پر سمجھ رہا تھا کہ لڑکی اُن دونوں کے درمیان بنائے مخاصمت بن رہی ہے۔

راجندر رانی برابر اُسی فضا میں پروان چڑھتی رہی۔ رادھا رانی اب دو لڑکوں کی بھی ماں بن چکی تھی۔ اس کو اپنی کشت امید سرسبز نظر آرہی تھی۔ وہ اکثر اپنے شوہر سے کہتی "تم لڑکی کو اپنی محبت میں بگاڑ رہے ہو جانے اس کا انجام کیا ہو۔ لڑکیوں کے ساتھ اس قدر پیار اچھا

نہیں ہوتا۔ اُن کو تو ایک حد تک نظر انداز کرنا چاہئیے۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر قسمت اُن کو کسی غریب گھر لے جاتی ہے تو وہاں بہ آسانی دن گزار سکتی ہیں۔

"اس کے معنی یہ ہیں" کرشن دیال جواب دیتا "کہ لڑکیوں کو شروع ہی سے بھوکوں مارنا چاہئیے تاکہ اگر کسی غریب گھر میں وہ بیاہی جائیں تو وہ بہ آسانی فاقے کر سکیں کیوں یہی مطلب ہے نا؟"

راجدرانی کے پاس اِسکا کوئی جواب نہ ہوتا اور وہ عاجز آکر کہتی۔ "تم تو الفاظ کے بادشاہ ہو۔ تمہیں سامنے بیٹھا کر تمہاری باتیں سنتی رہا ہیں!"

کرشن دیال اگر ایک طرف لڑکی کو اپنی محبت میں بگاڑ رہا تھا۔ تو دوسری طرف وہ اس کی تعلیم و تربیت سے بھی غافل نہ تھا، انگریزی پڑھتا تا اور سینا پرونا وہ ایک استانی سے سیکھتی۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب بنگال میں لڑکیوں کی تعلیم معیوب نظروں سے دیکھی جاتی تھی، گانے بجانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ گاؤں میں لوگوں نے مشہور کر دیا کہ کرشندیال کرشان ہو گیا سماج کے ٹھیکیداروں نے اس کو برادری سے خارج کر دیا لیکن اس کے باوجود جب کسی کو کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ کرشندیال کو لکھتا یا اگر کوئی آدمی کلکتہ آتا تو کرشندیال ہی کے گھر مہمان ہوتا۔

اب راجندرانی کی عمر بارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس کے والدین نے سنجیدگی کے ساتھ اس کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ باپ اس سن میں شادی کر دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر اُس کی ماں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اُس کی شادی ضرور کر دے گی۔ اُس کا شوہر تو احمق تھا اور وہ خود ایسی غلطی کا ارتکاب کر کے باپ دادا کے نام کو بٹہ لگانے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کارِ خیر میں اُس نے اپنے چند اعزا کی امداد حاصل کی اور راجدرانی کے لئے بر کی تلاش شروع ہو گئی۔ کرشندیال اپنے فیصلے پر اڑا تھا۔ جو پیغام اس کے سامنے پیش کیا جاتا وہ کسی نہ کسی بہانے اُسے رد کر دیتا۔ اور راجدرانی کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو جاتا۔ کچھ دنوں تو اس نے صبر سے کام لیا مگر تابہ کے آخر ایک دن وہ اپنے شوہر پر برس پڑی "تمہارا کیا مطلب ہے؟" اس نے سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا" کیا تم نے لڑکی کی شادی نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟"

"شادی کس کے ساتھ کی جائے" اُسی انداز میں کرشندیال نے بھی جواب دیا" میں لڑکی کو دریا میں بہانے کے لئے تو تیار نہیں"

"میں نے آج تک جو نام تمہارے سامنے پیش کئے اُن میں سے کوئی بھی لڑکا اچھا نہ تھا۔"

اس نے سنبھل کر جواب دیا "تمہاری لڑکی کوئی شہزادی تو ہے نہیں جسکے لئے تم آسمان سے بر توڑ کر لاؤ گے"

"ایک نہیں ایک ہزار مرتبہ میں نے کہدیا" کرشندیال نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا" میں اُس کی شادی کمسنی میں نہ کرونگا۔ اور اگر اب بھی تم میرے سامنے بندروں کو پیش کرتی رہو گی تو میں اسی طرح اُنکو بھگاتا رہونگا۔ تم کو معلوم ہونا چاہئیے کہ برہمن لڑکی ساٹھ سال تک کنواری رہ سکتی ہے اور اگر وہ کنواری مر بھی جائے تو کوئی پاپ نہیں۔ اور نہ اس سے باپ دادا کے نام کو بٹہ لگ سکتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تم کو اس قدر جلدی کیوں ہے؟"

"افسوس تو یہ ہے کہ تم میری بات نہیں سمجھتے"۔ وہ پریشان ہو کر بولی "تمہاری لڑکی عیسائی اور برہمو لڑکیوں کی طرح باہر نکلتی ہے اگر تم نے اُس کو زیادہ دنوں تک کنواری رکھا تو وہ اپنی پسند سے شادی کرلے گی۔ اور اگر اس نے نیچ ذات میں شادی کی تو بتاؤ تمہاری کیا عزت رہے گی"

"وہی خاندان سب سے زیادہ اچھا ہوگا جس کو لڑکی خود پسند کرے" کرشندیال نے کہا۔

"یہ تم کہہ سکتے ہو" بیوی نے جواب دیا۔ "میں تو سمجھتی ہوں کہ فرض ہم لوگوں کا ہے۔ کہ لڑکی کی شادی برابر کی ذات میں ہو"

"نہیں انتخاب لڑکی خود کرے گی" کرشندیال نے کہا

اپنی پسند کی ہوتی ہے۔ دوسرے کے انتخاب کی جنت سے بدرجہا اچھی ہوتی ہے۔"

راجندرانی کے والدین جھگڑتے رہتے تھے اور وہ جوان ہو رہی تھی۔ کرشنہ پال نے اس کو سکول میں داخل کر دیا۔ دوسرے سال وہ انٹرنس کا امتحان دینے والی تھی۔ اُس کے بھائی تعلیمی اعتبار سے اُس سے کہیں پیچھے تھے۔ وہ کسی کو نظروں میں نہ لاتی۔ ماں کو اُس کی یہ ادا بہت بُری لگتی بھی دبھاتی۔ مگر وہ بھی مسکرا کر ٹال جاتی۔ رادھا رانی اس عمر میں ایک اور بچے کی ماں بن چکی تھی۔ ——— کرشنہ پال صرف تعلیم نسواں ہی کا قائل نہ تھا۔ بلکہ آزادئ نسواں کا بھی حامی تھا۔ رادھا رانی آج تک سوا اپنے عزیزوں کے کسی اور کے سامنے نہ آتی تھی۔ اگر کبھی باہر نکلنے کی ضرورت ہوتی تو گھونگھٹ اوڑھ کر باہر نکلتی۔ لیکن راجندرانی ان باتوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بے حجابی سے سب کے سامنے آتی اور بے تکلفی کے ساتھ سب سے باتیں کرتی۔ اس کے چھوٹے بھائیوں کو پڑھانے ایک نوجوان لڑکا آتا تھا۔ اس کا نام رانندرا تھا۔ راجندرانی اُس سے خوب باتیں کرتی۔ اور اکثر اپنے سبق میں اُس سے مدد لیتی۔ رادھا رانی کو یہ باتیں پسند نہ تھیں۔ لیکن شوہر کی باتوں کا خیال کر کے وہ دخل دینا مناسب نہ سمجھتی۔ رانندرا کوئی ٹرا دنیا کا نہ تھا۔ خاندانی اعتبار سے بھی اس کا گھرانا دولت و ثروت کے لئے مشہور تھا۔ لیکن اس کو باپ سے کچھ اختلاف تھا۔ اس لئے اپنی روزی خود کما رہا تھا۔ کرشنہ پال نے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے اس کو رکھ لیا تھا۔ مگر وہ اپنا بیشتر وقت راجندرانی کو پڑھانے میں صرف کرتا۔ یہ سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔ رادھا رانی بھی خاموشی کے ساتھ اسکو نظرانداز کرتی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ محسوس کرنے لگی کہ صورتِ حال قابو سے باہر ہو رہی ہے۔ اور اگر راجندرانی کو بروقت نہ روکا گیا تو نہ جانے وہ کیا کر گذرے۔ اس سلسلہ میں اُس کو شوہر سے کسی طرح کی امید نہ تھی کیونکہ وہ تو لڑکی کی ہمت افزائی کرنیکا خوگر تھا۔ راجندرانی دسمبر کے مہینہ میں انٹرنس کا امتحان دینے والی تھی۔ وہ کتابوں میں بُری طرح الجھی ہوئی تھی۔ رانندرا بھی برابر محنت کرنے کا تاکید کر رہا تھا۔ رادھا رانی روزانہ باورچی خانے کا کام چھوڑ کر لڑکوں کی پڑھائی کا جائزہ لیتی۔ اور ہر روز وہ بھی دیکھتی کہ راجندرانی پڑھ رہی ہے۔ رانندرا سکھا رہا ہے۔ اور لڑکے کھیل رہے ہیں۔ ایک دن حسبِ معمول رادھا رانی آئی۔ اس نے جھانکا، راجندرانی حساب کا کوئی سوال حل کر رہی تھی۔ رانندرا اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑے بیٹھا تھا۔ اور لڑکے آپس میں لڑ رہے تھے۔ رادھا رانی کے جسم میں آگ لگ گئی۔ اس نے چیخ کر چلا کر کہا: "ماسٹر صاحب! آپ اپنا کام کیا جا کیجئے۔ اگر ہم لوگ اپنی لڑکی کے لئے ضرورت سمجھیں گے تو کوئی دوسرا آدمی رکھ دینگے" اور اس کے بعد اندر سے ایک خادمہ آئی اور راجندرانی کو بلا کر لے گئی

اس مداخلت کے نتائج غیر متوقع نکلے۔ راجندرانی کو رانندرا سے الگ رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس جدائی نے راجندرانی کو اُن جذبات کو سمجھنے پر مجبور کیا جن سے اب تک وہ بے خبر تھی۔ اس طرف جو کیفیتیں رانندرا کے دل پر گذر رہی تھیں اُن پر خود اُسکو استعجاب تھا۔ رانندرا حسبِ معمول لڑکوں کو پڑھانے آتا۔ مگر اُس کی طبیعت نہ لگتی۔ کسی نہ کسی طرح وقت پورا کر کے چلا جاتا۔ کبھی کبھی راجندرانی کی ایک جھلک اُس کو نظر آجاتی۔ رادھا رانی نے اپنے شوہر کو سمجھا دیا تھا کہ راجندرانی کی موجودگی لڑکوں کی تعلیم میں حارج ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اُس کو وہاں جانے سے روک دیا گیا ہے۔ کرشنہ پال کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔

اسی طرح تین چار مہینے گذر گئے۔ راجندرانی انٹرنس پاس کر گئی تھی۔ مگر اس امتیاز کے ساتھ نہیں جس کی اُس کو امید تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کی صحت بھی گرنے لگی۔ رادھا رانی اس کی ماں تھی۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ لڑکی کو کس روگ نے دبایا ہے۔ "اب تو خوش ہوئے" اس نے طنزاً اپنے شوہر سے کہا۔ "دیکھو اب غریب بچی کا کیا حشر ہوتا ہے۔"

"تم اس درجہ پریشان کیوں ہو" اُس نے جواب دیا۔ "اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو کیا رانندرا کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہو سکتی؟"

"یہ کیونکر ممکن ہے" رادھا رانی نے بپھر کر سوال کیا۔ "کیا تم ذات پات اور خاندانی آبرو کو مٹی میں ملا دو گے؟"

وہ بھی برہمن ہے" کرشن دیال نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہاں ضرور" بیوی نے کہا۔ "اگر کیڑے کو چڑیا کہا جا سکتا ہے۔ تو بندر بھی برہمن ہو سکتا ہے۔ دیکھو اگر تم کو یہی کام کرنا ہے تو مجھ کو زہر دے دو تاکہ میں منہ چھپا کر کہیں نکل جاؤں"

"مگر غور کرو" اب کرشن دیال نے ناصحانہ انداز اختیار کیا "سب سے زیادہ انسان کے اوصاف پر نظر رکھنی چاہئے۔ عقلمند آدمی ... بندر کے مقابلے میں ایک متوسط خاندان کے آدمی کو ترجیح دے گا اور تم ہی کہو ان دونوں میں لڑکی کو کون زیادہ خوش رکھ سکتا ہے؟"

"سکھ اور دکھ بھاگ کے کھیل ہیں" اس نے جواب دیا "کوئی عورت اپنی کوشش سے سکھی نہیں ہو سکتی۔ وہ بے شرم لڑکیاں جو اپنا شوہر خود پسند کرتی ہیں کب سب کی سب سکھ کی زندگی بسر کرتی ہیں؟ وہ لڑکیاں جنکے والدین شوہر کا انتخاب کرتے ہیں کب سب کی سب دکھی رہتی ہیں۔ خیر ہم لوگوں کو باپ دادا کے طریقے پر چلنا چاہئے۔"

"یہ فیصلہ تو نیز دشوار ہے" کرشن دیال نے جواب دیا "کون سکھ کی زندگی بسر کرتا ہے اور کون دکھ کی۔ اور اس سلسلہ میں سرکاری یا غیر سرکاری اعداد و شمار بھی موجود نہیں لیکن میں نے تم کو اپنا خیال اچھی طرح بتا دیا ہے کہ اپنی پسند کا دکھ اسی سکھ سے اچھا ہوتا ہے۔ جسے دوسرے پسند کریں۔"

یہ سب باتیں رادھا رانی کی سمجھ سے باہر تھیں۔ اس نے تو مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ لڑکی کی شادی پرانے دستور کے مطابق جلد سے جلد کر دے گی۔ اس کی برادری کی لڑکیاں آج تک سکول یا کالج میں پڑھنے نہیں گئیں۔ اس کی لڑکی سکول میں تو پڑھ ہی چکی ہے۔ اب اگر وہ کالج میں داخل ہوئی تو اس کی ناک جڑ سے کٹ جائے گی اور وہ کسی کو بھی منہ دکھانے کے لائق نہ رہے گی" کرشن دیال خاموشی کے ساتھ اٹھ کر چلا گیا۔ اب گھر کی فضا طوفان کی آمد کے وقت سمندر کی سطح کی مانند تھی۔ کرشن دیال بیوی سے دور دور رہتا اس لئے کوئی کھلی ہوئی جنگ نہ ہو سکی۔ مگر طرفین کے دل صاف نہ تھے۔ سکول بند تھا۔ لڑکے چھٹیاں منا رہے تھے۔ اور راجندر رانی کے لئے مصیبت تھی۔ راجندرا کو اس کے باپ نے بلا بھیجا تھا۔ اور وہ اپنے گھر جا چکا تھا۔ اگرچہ لڑکیوں کے پاس وہ اپنا پتہ چھوڑ گیا تھا۔ مگر اس کو خط لکھنے کی زحمت کون گوارا کرتا۔ راجندر رانی کی روح راجندرا کا حال جاننے کے لیے بیتاب تھی۔ اگر اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خیریت کے دو حرف بھی وہ دیکھ لیتی تو اس کو تسکین ہو جاتی۔ مگر وہ تو بدنصیب ہندوستانی لڑکی تھی جس کی تخلیق ہوئی ہے۔ گھٹ گھٹ کر مرنے کے لئے۔ پہلے راجندر رانی گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ اور رادھا رانی کا خیال تھا کہ تعطیل کے زمانے میں گھر کا سب کام کاج وہی دیکھے گی۔ مگر برعکس اس کے راجندر رانی نے تو اب وہ کام بھی چھوڑ دیا تھا۔ جو پہلے کیا کرتی تھی۔ پہلے گھر کی صفائی کا اسکو بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔ مگر اب اسکو اس کی بھی پروا نہ تھی۔ ایک دن اسکو خیال ہوا کہ ڈرائنگ روم اور باپ کے مطالعہ کا کمرہ صاف کر دیا جائے۔

بھاری بھاری کتابوں کو جھاڑنے کے بعد ایک طرف رکھ رہی تھی کہ ایک کتاب کے اندر سے ایک لفافہ گرا۔ اس نے جلدی سے اٹھایا۔ انداز تحریر سے نگاہیں صرف آشنا ہی نہ تھیں بلکہ یہ انداز تحریر اس کے دل و جان سے عزیز تھا۔ لفافہ پر اس کے باپ کا پتہ لکھا تھا۔ انتہائے شوق میں وہ یہ بھول گئی کہ خط پڑھنے کا اس کو کوئی حق نہیں۔ خط ختم کرنے کے بعد وہ کمرے کی صفائی بھول گئی کیسی نہ کسی طرح کتابوں کو میز پر رکھا۔ اور اپنے کمرے میں منہ لپیٹ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی ماں کا ادھر گذر ہوا اس نے گھبرا کر کہا "کیسی طبیعت ہے؟"

منہ پھیر کر اس نے جواب دیا۔ "بہت خراب ہے" دو دن تک وہ کمرے سے باہر نہ نکلی۔ یہ خط راجندرا کا تھا جو کرشن دیال کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ پہلے اس نے معذرت کی تھی کہ اب وہ لڑکوں کو نہ پڑھا سکے گا۔ کیونکہ اس کے باپ کی خواہش ہے کہ وہ اب گھر آ رہے۔ پھر آگے چل کر اس نے شکریہ کے ساتھ راجندر رانی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ ایک جگہ اس کی نسبت طے کر چکا تھا۔ اور عنقریب اس کی

شادی بھی ہونے والی تھی۔ وہ اس شادی سے انکار کر کے اپنے باپ کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔

انسان زیادہ عرصہ تک وقف الم نہیں رہ سکتا۔ دو دن کے بعد راجندرانی نے بھی پلنگ چھوڑا۔ لیکن اب اُسکا شباب رخصت ہو چکا تھا۔ اُس کی باتوں میں الم ناک سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد کرشندیال کے نام راسندرا کا ایک لفافہ آیا۔ یہ اُس کی شادی کا دعوتی رقعہ تھا۔ اُسی دن راجندرانی زبردستی اپنے باپ کو کالج لے گئی۔ اور داخل ہوگئی۔ اب اس نے اپنی زندگی کتابوں کے لئے وقف کر دی۔ اور ایک حد تک اپنا غم کتابوں ہی سے غلط کرنے لگی۔ مگر شاید وہ تو پُرسکون زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اُس غریب کو کالج میں داخل ہوتے ابھی پورا ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ کرشندیال بیمار پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا مرض بڑھ گیا۔ راد ہارانی نے رو رو کر گھر کی فضا اور بھی مکدر کر دی۔ وہ اس طرح روتی۔ گویا اُس کا شوہر اُسکے نازک کاندھوں پر تمام ذمہ داریاں چھوڑ کر دنیا سے کوچ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ راجندرانی سنتے سنتے عاجز آگئی۔ یوں تو ماں بیٹیوں کے تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہ تھے۔ مگر ماں کی ان دل آزار باتوں نے رہی سہی وہ جگہ بھی ختم کر دی جو ماں کے لئے بیٹی کے دل میں تھی۔ اُس نے غصے میں ماں سے کہا "تم آخر میری شادی کیوں نہیں کر دیتی ہو۔ دنیا کا بدترین گھر میرے حق میں اس گھر سے اچھا ثابت ہوگا" راد ہارانی یہ جواب سنکر سناٹے میں آگئی۔ وہ اِس جواب کی تلخی کو زندگی بھر نہ بھول سکی۔

راجندرانی کے اس چیلنج کے بعد پیشہ ور مشاطوں نے دوڑ دھوپ شروع کی۔ متعدد مشاورتی کانفرنسیں ہوئیں۔ کرشندیال کی حالت اِس قابل نہ تھی کہ وہ مشورہ دے سکے۔ اس لئے انتخاب کا کام خود راجندرانی کے سپرد کر دیا گیا۔ جتنے نام اُسکے سامنے پیش کئے گئے۔ اُن میں سے اُس نے ایک بوڑھے آدمی کا انتخاب کیا جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ مگر کوئی اولاد نہ تھی۔ لوگ اس انتخاب پر انگشت بدنداں تھے۔ سب نے کوشش کی کہ راجندرانی اپنے فیصلے پر نظرثانی کرے۔ مگر اُس نے صاف اعلان کر دیا: "میں اُسی کے ساتھ شادی کروں گی" بالآخر راجندرانی کی شادی ہو گئی۔ جب وہ رخصت ہونے لگی تو ماں دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ مگر خود اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ ہاں جب بے ہوش باپ کے بستر کے سامنے وہ جھکی تو لوگوں نے دیکھا کہ اُس کی پلکوں پر کوئی چیز چمکی۔ جسکو اُسنے اپنے آنچل میں جذب کر لیا۔ اسی طرح وہ اپنے شوہر کے گھر آئی۔ رسم کے مطابق عورتوں نے اُس کا استقبال کیا۔ پھر اُسکے شوہر کے اعزا کا اُس سے تعارف کرایا گیا۔ اگرچہ سن وسال کے اعتبار سے وہ جوان تھی۔ مگر اُس گھر میں اُس کی پوزیشن بزرگانہ تھی۔ وہ انتہائی متانت و سنجیدگی کے ساتھ کھڑی تھی اُس کی خبند لوگوں سے اُس کا تعارف کرا رہی تھی۔ اُس سے کہیں زیادہ سن کے لوگ آتے اور سلام کرنے کیلئے جھکتے اور وہ بزرگانہ وقار کے ساتھ سب کا سلام قبول کرتی۔ یکایک ایک خوش صورت نوجوان کو اُسکے سامنے پیش کیا گیا جسکو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ "یہ تمہارا بھانجا ہے راسندرا" اُسکی نند نے بتلایا۔ نوجوان تعظیماً جھکا۔ اور پھر مجمع میں غائب ہو گیا۔

دو ایک دن کے لئے وہ میکے آئی اور پھر سسرال واپس چلی گئی۔ اور اُسکے بعد اُس نے اپنے گھر کی شکل صرف اُس دن دیکھی جب اُسکے باپ کا انتقال ہوا۔ صبح کو وہ گئی اور شام کو واپس چلی آئی۔ اُسکا گھر بھی خالی تھا۔ وہ کہیں رک نہیں سکتی تھی۔ اسی خیال سے اُسکے شوہر نے شادی کی تھی۔ اُس کو ایک ایسی لڑکی کی ضرورت تھی جو گھر کی مالک بنجائے۔

باپ کے انتقال کے چوتھے دن اُس نے بڑی دھوم سے باپ کا سالانہ دفاتحہ کیا۔ رات بھر وہ سوئی نہیں بلکہ باپ کی موت پر آنسو بہایا کی۔ مگر جب صبح کو وہ اٹھی تو اُسکا چہرہ سنگ مرمر کی طرح صاف و شفاف تھا اور آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ مہمانوں نے اُس کی صورت دیکھی اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے "یہ بھی کیسی عورت ہے۔ باپ کی موت پر ایک آنسو بھی اُس کی آنکھ سے نہیں نکلا۔ عورت کو ایسا سنگدل بھی نہ ہونا چاہئے۔" پورا دن مہمانوں کی خاطر اور مدارت میں گزرا شام کو فضا کچھ پُرسکون ہوئی راجندرانی اپنے کوٹھے کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ اور اُس کا شوہر

ان مہمانوں کی خاطر مدارت میں مشغول تھا۔ جو ابھی واپس نہیں گئے تھے یکایک راجند رانی کے سامنے رانندرا نمودار ہوا۔

"مجھ کو اب تک تنہائی میں تم سے گفتگو کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اب ان باتوں سے کیا حاصل۔ کیا تم مجھ کو ایک کمینہ انسان سمجھ کر بھول نہیں سکتی تھیں؟"

راجند رانی نے اس سوال پر زور سے قہقہہ لگایا۔ شادی کے بعد آج ہی وہ ہنسی تھی۔ اس نے جواب دیا "میں نے تم سے دو باتیں سیکھی ہیں ایک تو یہ کہ والدین کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرنا چاہئے اور دوسرے روپیہ دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے"

"میرے قصور پر پورے خاندان کو سزا نہ دو" کچھ دیر ٹھہر کر رانندرا نے کہا "تم کو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کی زندگی کا سہارا ماموں کی مہربانی ہے اور"

"لیکن" راجند رانی نے جواب دیا "پہلے تو مجھ کو اپنا فائدہ دیکھنا چاہئے"

اب رانندرا نے مزید گفتگو بیکار سمجھی۔ آج پہلی بار اُس کو اپنے گناہ کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ایک عورت جو پہلے پھول کی پتی سے زیادہ نرم و نازک اور صبح کی اولیں کرن سے زیادہ پاکیزہ تھی آج اس درجہ سنگدل و ظالم بن گئی تھی اور اس پتھر کو گداز کرنا رانندرا کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر چلا گیا۔

یکایک راجند رانی کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ رادھا رانی جو ہمیشہ اپنی لڑکی کی بیوقوفی کا ماتم کیا کرتی تھی۔ اب اس نے محسوس کیا کہ اُسکی لڑکی شوہر کے انتخاب میں اُس سے زیادہ عقلمند نکلی۔ ابھی اُس کی شادی کو پورا سال بھی نہ گزرا تھا۔ کہ وہ اپنے متوفی شوہر کی پوری جائداد کی مالکہ بلا شرکت احدے بن گئی۔ اس کے شوہر کے جتنے اعزا تھے سب کو اُس نے دھتکار بتلا دی۔ وہ سب اُس کو کوستے۔ گالیاں دیتے چلے گئے مگر اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ کچھ دن وہ اپنے گھر میں رہی مگر پھر رادھا رانی اُس کو اپنے گھر زبردستی لے آئی۔ آج راجند رانی بھی بیواؤں جیسے کپڑے پہنے تھی۔ مگر اُس کی آنکھیں اس وقت بھی خشک تھیں

اُس کی ماں آنسو بہاتی مگر وہ خاموش رہتی۔ ماں کا رونا بھی اُس کو اچھا نہ معلوم ہوتا۔ ایک دن ماں کو مخاطب کر کے فلسفیانہ انداز میں اُسنے کہا "تم روتی کیوں ہو۔ آدمی پیدا ہوتا ہے مرنے کے لئے۔ خواہ وہ آج مرے یا کل۔ اُسکے لئے مرنا ضروری ہے" رادھا رانی ٹکٹکی باندھ کر دم بخود تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیسی عورت ہے! آخر اس نے کہا "راجند رانی وہ بہرحال تمہارا شوہر تھا۔ تم نے اتنے دن اسکے ساتھ زندگی گزاری کیا تم کو اُس کے مرنے کا کوئی صدمہ نہیں تم آدمی ہو یا پتھر کی مورت؟"

ماں کے ساتھ بھی وہ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکی۔ خود اُس کا عظیم الشان گھر خالی پڑا تھا۔ مگر وہاں جانے کے خیال سے اُس کو وحشت ہوتی۔ اُسکے پاس کافی دولت تھی۔ مگر وہ بھی اُس کو بے صرف نظر آتی۔ اکثر ماں کے رونے پر کہتی "مجھ کو دیکھو اور سبق حاصل کرو قسمت خواہ کتنی ہی سخت نہ ہو جائے ہم کو تو اُس کا مقابلہ کرنا ہے۔ جب تک زندہ ہیں"

ایک دن اُس نے اپنی ماں سے کہا "مہربانی کر کے میرے بھانجے رانندرا کو بلا دو" رادھا رانی اس کے لئے تیار نہ تھی۔ مگر مجبوراً اُس کو اپنے بڑے لڑکے کو رانندرا کے بلانے کے لئے بھیجنا ہی پڑا۔ جب وہ آیا تو راجند رانی نے اپنے بکس سے ایک بڑا لفافہ نکالا۔ اور لیکر رانندرا کے پاس گئی۔

"تو اس کو احتیاط سے رکھو" رانندرا کی طرف لفافہ بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ کیا ہے" اُس نے سوال کیا۔

"یہ ایک دستاویز ہے" اُس نے جواب دیا "میں نے جو کچھ دوسروں سے لیا۔ وہ تم کو دیتی ہوں"

"یہ کیوں" اُس نے سوال کیا "ہم لوگ اِس کے بغیر مر تو نہیں رہے ہیں اور پھر تمہارا انتقام بھی نامکمل رہ جائیگا"

"نہیں" راجند رانی نے تلخ انداز میں جواب دیا "میرا انتقام اس وقت مکمل ہو رہا ہے۔ دولت کی لالچ میں آکر تم نے ایک معصوم لڑکی کا دل توڑا۔ اُس کی زندگی برباد کی۔ اور آج اسی کے ہاتھ سے تم کو یہ بھیک قبول کرنی ہوگی"

مانند ردستاویز اُسکے منہ پر مار دینا چاہتا تھا۔ مگر غربت و افلاس نے ہاتھ پکڑلیا۔ راجندر رانی کا بھائی کھڑا یہ سب باتیں سن رہا تھا اُسنے کہا "آج تم سخاوت کا دریا بہا رہی ہو لیکن اسکے بعد تم خود کیا کرو گی؟"

"تم پریشان نہ ہو" اس نے جواب دیا "میں تم لوگوں کے سر نہ پڑونگی میری ماں نے مجھ کو غلامی کا خوگر بنانے کی کوشش کی اور باپ نے آزادی کا سبق دیا۔ مگر ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی مجھ کو سکون نصیب نہ ہوا اب میں کوئی دوسری راہ تلاش کرونگی"۔

"تم کہاں جاؤ گی؟" راندرا نے سوال کیا۔

"میں نے غلطی کی محبت اور انتقام دونوں میں" اُس نے جوابدیا۔ "اب کوشش کرونگی تیسرا راستہ ڈھونڈنے کی۔ اور آج رات کو میں اس گھر سے چلی جاؤنگی"۔ "کیا تم مجھ کو اپنا پتہ بتلاؤ گی؟" راندرا نے سوال کیا۔

"نہیں" کچھ دیر سوچ کر اُس نے جوابدیا۔

عُرفی کی ایک غزل

جناب سید مقبول حسین احمد پوری
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

۱ "پیرِ کنعان چمنش گوشۂ بیت الحزن است　عرفی　ہر کجا بوئے گلے باد رساند چمن است"
حضرتِ یعقوبؑ کو ہے گوشۂ غم ہی چمن　ترجمہ　بوئے گُل کی جا ہوا لاتی ہے بوئے پیرہن

۲ "ہر کہ از بندگیِ نفس مرا باز خرد　عرفی　بندۂ اویم اگر زاہد و گر برہمن است"
جو غلامی سے مجھے اس نفس کی لے پھر خرید　ترجمہ　اُس کا بندہ ہوں میں دل سے شیخ ہو یا برہمن

۳ "حدِ حسنِ تو بہ ادراک نشاید دانست　عرفی　ایں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من است"
تیری حدِ حسن ہے ذہنِ رسا سے بھی پرے　ترجمہ　ہے یہ کہنا بھی تو میرے ذہن کی حدِ سخن

۴ "عشق از آدمؑ و حواؑ متولد نشدہ است　عرفی　تازہ برخاستہ ایں شعلۂ آتش زمن است"
عشق آدمؑ اور حواؑ سے ہوا پیدا اگر　ترجمہ　آگ یہ پھر سے لگی جس تن سے ہے وہ میرا تن

۵ "صلۂ شعر بہ عرفی شکر آرد طوطی　عرفی　خبرش نیست کہ او طوطی شکر شکن است"
شعر کا دیتی ہے عرفی کو صلہ طوطی شکر　ترجمہ　یہ نہیں معلوم اُسے وہ خود بھی ہے شکر شکن

جناب سید ضمیر جعفری
جوائنٹ ایڈیٹر "کریسنٹ"

سید ضمیر جعفری اردو کے جوان دل اور جواں افکار شاعر ہیں! وہ شیرینی اور حلاوت جسے رومانی شاعری کی جان کہنا چاہئے آپکے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے! مندرجہ ذیل سانیٹ کتنا حسین اور کتنا دلآویز ہے اسکا اندازہ قارئین خود لگا سکتے ہیں - ایڈیٹر

سرودِ بیخودی

(سانیٹ)

یہ مستانہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، اور یہ برساتیں
زمیں سے آسماں تک ایک لہراتی ہوئی مستی
فضا میں ایک سیلِ نور برساتی ہوئی مستی
یہ موسم، یہ جوانی، یہ تمنا آفریں راتیں
یہ جہلم، یہ حسیں لہریں، یہ لہراتی ہوئی لہریں!
یہ ساون، یہ گھنیرے جھوم کر چھائے ہوئے بادل
بساطِ کہکشاں کو چوم کر آئے ہوئے بادل
یہ لہریں، یہ تھرکتی، ناچتی، گاتی ہوئی لہریں!
یہ تنہائی، یہ رعنائی، یہ رنگینی، یہ آبِ جو!
دلوں کی دھڑکنیں، یہ ایک بے تابی نگاہوں میں
یہ شیرینی سی اشکوں میں، یہ اک لذت سی آہوں میں
یہ میں، یہ میری بدمستی، یہ کوئی زینتِ پہلو
جھکی جاتی ہے روحِ پارسائی میرے قدموں پر
ترے قدموں پہ میں ہوں اور خدائی میرے قدموں پر

جناب میرزا عاشق علی بیگ صاحب خیال مرادآبادی

اقتصادی طبقات کی پیدائش

اور

جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سماج کا فلسفہ

جاگیردارانہ سوسائٹی میں، زمین، جو حقیقی ذریعہ پیداوار ہے۔ زمینداروں کی ملکیت ہوتی ہے اور یہ لوگ اپنے حقِ ملکیت کے نام پر غلاموں یا کاشتکاروں کی محنت کو غصب کرتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ سوسائٹی میں حقیقی ذرائع پیداوار، کارخانے، فیکٹریاں، ریلوے وغیرہ سوداگروں کی ملکیت ہوا کرتے ہیں۔ اور ان میں کام کرنے والے لوگ روزانہ یا ماہانہ حق المحنت کے حقدار ہوتے ہیں۔ اور ان ذرائع پیداوار میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ان مدوں میں سرمایہ لگانے والے سوداگر مزدوروں کی محنت کے ثمرات کو غصب کر جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سے ایسے اسباب تھے جن کی وجہ سے انسانی سماج ذرائع پیداوار کے مالکوں اور مزدوروں کے دو طبقوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ حالانکہ آغازِ تمدن میں اس قسم کی دو قسمیں ہمیں نظر نہیں آتیں۔

ابتدائی آلات اور مصنوعات کے طریقے سماج کے ہر فرد کو براہِ راست کسی نہ کسی چیز کے بنانے کے لئے مجبور کرتے تھے۔ اس زمانہ میں زرعی اور صنعتی پیداوار اس سطح پر نہیں تھی۔ کہ سماج کا کوئی فرد یا کوئی گروہ دوسروں کی کمائی پر گذارہ کر سکتا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پیداوار بمشکل صناعوں اور مزارعین کی ضروریات کے لئے ہی کافی ہوا کرتی تھیں۔ اور اس سبب سے کسی چیز کا ذخیرہ بھی جمع نہیں ہو سکتا تھا۔ ان وجوہ کی بناء پر سوسائٹی کے اندر کسی اقتصادی غاصب گروہ کا وجود از قبیلِ محالات تھا۔ انسانی نسل اس زمانہ میں مساوات کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے قبائل میں تقسیم تھی۔

مشہور اشتراکی ایجلز، اس زمانہ کی زندگی کے متعلق کہتا ہے:

"انسان کی زندگی اس عہد میں اشتراک و مساوات کا صحیح نمونہ تھی متعدد قبیلے مل جل کر رہا کرتے تھے۔ تمام پیداوار اور مصنوعات اجتماعی حیثیت سے استعمال کی جاتی تھیں۔ اور برادری کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھیں۔"

غرض اس عہد میں زمین بھی کسی کی نجی ملکیت نہیں تھی۔ بلکہ سب کی مشترکہ ملکیت کا درجہ رکھتی تھی۔ ہندوستانِ قدیم کی پنچایت سسٹم کی طرح جرمنی، روس، وغیرہ میں بھی جمہوری ادارے موجود تھے۔ اور یہ آغازِ تمدن کے لحاظ سے اشتراکیت کے ابتدائی نشانات تھے۔

لیکن ایک سب سے بڑا سبب جس نے آغازِ تمدن کی انسانی سماج کی پرامن زندگی کو تباہ کیا اور اس کے اندر عدم مساوات کی تخم ریزی کی وہ تجارت پیشگی کا ارتقا تھا۔ اس نئے پیشہ نے مساوات و اشتراک کی زندگی کو تباہ کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ تجارت پیشگی کس طرح وجود میں آئی؟ کیا یہ کسی قبیلے یا چند قبائل کے اولوالعزم افراد کی ایجاد تھی؟

واقعہ یہ ہے کہ "تجارت پیشگی" کا وجود، چند قدرتی اسباب کا نتیجہ تھا جس میں سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انسانوں کے آلاتِ کشاورزی اور آلاتِ صنعت و حرفت رفتہ رفتہ ترقی کر کے اس درجہ تک پہنچ گئے تھے۔ کہ ضروریاتِ زندگی کی پیداوار قبائل کی ضرورت سے زیادہ ہونے لگی تھی

دوا شیاء کا ذخیرہ مہیا ہو جاتا تھا۔ زائد از ضرورت اشیاء تبادلہ کے لئے ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے تجارت کا وجود بالکل قدرتی تھا۔

علاوہ ازیں تجارت کے معرض وجود میں آنے کا ایک اور سبب بھی ہے۔ جس کو کارل مارکس نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

"مختلف انسانی گروہوں نے اپنے قدرتی ماحول سے متاثر ہو کر مختلف ایجادات کیں۔ اور مختلف زرعی اور صنعتی پیداوار کا ملکہ حاصل کیا۔ یہ آب وہوا کا اثر ہے کہ مختلف قومیں اپنی طرز معاشرت اور تہذیب کے لحاظ سے اختلاف وانفرادیت رکھتی ہیں۔ انہی اختلافات کی بدولت جب مختلف قومیں آپس میں ملتی ہیں، تو ان کی بہت سی مصنوعات کے سلسلے میں داد وستد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ سلسلہ اجناس کے "باقاعدہ تبادلہ" کی صورت میں جاری رہتا ہے،" اس لحاظ سے تجارت کا وجود ازبسکہ تمدنی زندگی میں فطری وجوہ کا رہین منت ہے۔

بعض انسانی گروہ اپنے ماحول کے اثر کے مطابق حیوانات کی پرورش و نگہداشت پر مجبور ہوئے اور چند ترقی یافتہ قبائل نے پہلے تو جانوروں کو سدھا کر، پھر ان کے ریوڑ بنا کر پالنے اور چرانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اور اسی کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ اس طرح مویشی پالنے والوں نے اپنے آپ کو وحشی قبائل سے علیحدہ کر لیا۔ اور مختلف ضروریات زندگی کو بعض اپنے جیسے قبیلوں سے کچھ زیادہ مقدار میں پیدا کرنا شروع کر دیا۔ انکے پاس دوسرے قبیلوں کے مقابلہ میں دودھ، گوشت۔ کی بڑی مقدار کے ساتھ ساتھ جانوروں کی کھالیں، اون، پشم، اونی دھاگے اور اونی کپڑوں کی بھی مقدار ہوتی تھی۔ اور چونکہ ان چیزوں کی پیداوار غیر معمولی تھی اور خرچ کم تھا اسلئے "باقاعدہ تبادلہ" تجارت کا رواج شروع ہونا ممکن ہو گیا۔

گلہ بان قبیلوں کے وجود سے قبل اگرچہ اشیاء سے زائد از ضرورت کے تبادلہ کا رواج موجود تھا۔ لیکن اس کی صورت یہ تھی کہ ایک ہی قبیلہ کے افراد آپس میں تبادلہ کر لیا کرتے تھے۔ لیکن گلہ بانی کے رواج کے بعد ایک قبیلہ کے افراد نے دوسرے قبیلہ کے افراد سے اشیاء کا تبادلہ شروع کر دیا۔

انسانی آبادی میں اہل حرفہ کے وجود نے تبادلہ کے بازار کو زیادہ گرم کر دیا۔ اور ان کی زندگی کا دارومدار ہی تبادلہ پر ہو گیا۔ بازار میں اشیائے تبادلہ کے مستقل مد وجزر کے سبب بعض آدمی زیادہ دیکر کم چیز حاصل کر سکتے تھے اور بعض تھوڑی چیز کے تبادلہ میں اشیاء کی کثیر مقدار حاصل کر لیا کرتے تھے۔

اسی کے ساتھ زمین کی نجی ملکیت کا رواج بھی چل پڑا تھا۔ قابل زراعت زمین انفرادی طور پر بعض خاندانوں کو زراعت کے لئے دیدی گئی تھی۔ عدم مساوات اس سے بھی زیادہ اس صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ کہ تاجروں کا ایک گروہ وجود میں آگیا۔ اس گروہ کے وجود کا سبب یہ ہوا کہ تبادلۂ اشیاء کا کاروبار بہت ترقی کر گیا تھا۔ اور اب بائع و مشتری ایک ایسے گروہ سے لین دین کرنے پر مجبور تھے۔ جو اشیاء کی بڑی مقدار کا ذخیرہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اور بغیر تضیع اوقات ہر ایک کی ضرورت پوری کر دیتا تھا۔ یہ تھا تاجروں کے معرض وجود میں آنے کا سبب! یہ گروہ اقتصادی حیثیت سے ایک نئی چیز تھا۔ یہ انفرادی حیثیت سے بازار میں جو سودا کرتا تھا۔ تبادلہ میں کوئی ایسی چیز نہیں دیتا تھا۔ جو اس کی اپنی پیدا کردہ ہو۔ بلکہ یہ دوسروں کی پیداواروں کے الٹ پھیر کا کام کرنے والا تھا۔

تبادلہ کے نقطۂ نظر سے بنائی جانے والی اشیاء کی ترقی نے سوداگر اور تاجر کی ہستی کو اہم بنا دیا۔ آہستہ آہستہ تاجروں کے گروہ نے تمام مصنوعات پر اپنا اقتدار جما لیا۔ اور پیداوار اور مصنوعات کے حقیقی مالکوں کو اقتصادی حیثیت سے اپنی غلامی میں گرفتار کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاجر، اور تو اور، دو پیداوار کرنے والوں کے درمیان بھی حائل ہو گیا۔ اور ایک دوسرے ست اپنی اشیاء بدلنے کی بجائے تاجر کے ذریعہ اپنی ضرورت پوری کرنے لگے اور اس طرح تاجر نے دونوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مشہور اشتراکی اینجلز کہتا ہے:-

"تاجروں کا یہ گروہ اس حیثیت سے کہ اس نے اشیاء پیدا

کرنے والوں کی تکلیف کو کم کر دیا تھا۔ انکو تبادلہ کے آثار چڑھاؤ کے خطرہ سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ان کی پیداوار کو دنیا کی دور دراز کی منڈیوں میں بیچنے کا ذمہ لے لیا تھا۔ سماج کے لئے آیۂ رحمت سے کم نہ تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہی گروہ سماج کے جسم کا خون چوسنے والا فرقہ ثابت ہوا اور لطف یہ کہ یہ اپنے اور پرائیوں سب کا حق غصب کر جاتا ہے۔ اور تجارت کی دودھاری تلوار چلا کر بے قیاس دولت پر قابض ہو چکا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی سماجی خدمت اس قدر منفعت کی مستحق نہیں۔ اشیاء پیدا کرنے والے اس تجارتی بھول بھلیاں میں پھنسکر اپنے حق المحنت اور حق الخدمت کے عشر عشیر بھی فیضیاب نہیں ہو سکتے ستم بالائے ستم یہ ہے کہ سماج میں تاجر عزت حاصل کر چکے ہیں۔ اور صناعین و مزارعین ذلیل و خوار اور محتاج ہو چکے ہیں۔"

علاوہ ازیں انسانی معاشرت میں عدمِ مساوات اور طبقات کی حدبندی کی وجہ یہ بھی ہے کہ ابتدائے تمدن میں اقوامِ باہم نبرد آزمائی کرتی رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ پیداوار کی غیر معمولی ترقی نے [illegible] محنت و مزدوری کی قدر و قیمت میں اضافہ بھی کیا ہے جس کی وجہ [illegible] معاشرت کے ہر فرد کو روزانہ کچھ نہ کچھ کام کرنے اور اشیاء کے پیدا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ فاتحین نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اپنے افراد قوم فارغ البال بنانے کے لئے مفتوحین سے محنت و مزدوری کرائی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جنگ کے قیدیوں کو غلام بنا کر ان سے [illegible] لیا جانے لگا اور قومی محنت و مشقت کا بار ان کے سر پر ڈالدیا گیا۔ [illegible] غلامی کا راز"!!! پس اس سبب سے قدیم معاشرت ہمیشہ آقا اور غلام کے [illegible] طبقوں میں تقسیم ہوئی۔ اور آخر میں مختلف طبقات کی صورت میں نمایاں [illegible] بین الطبقاتی رقابتوں اور غاصبانہ کوششوں کا اب تک بد [illegible] بنی ہوئی ہے۔

موجودہ زمانہ میں اگرچہ غلامی کا انسداد ہو چکا ہے۔ لیکن طبقا [illegible] حدبندی کی غلامی اور مظلومی تا حال موجود ہے۔ اشتراکیت اس غلامی کا انسداد پھر کرنا چاہتی ہے۔ سرمایہ داروں اور تاجروں کی [illegible] آقائیت اور سماج کی "اقتصادی غلامیت" آج برسرپیکار ہیں۔ دیکھئے فتح کس کے نصیب ہے۔

جناب کرپال سنگھ بیدار

بر نتابد ہر دلے

رنگ و بوئے صد بہاراں بر نتابد ہر دلے — جلوۂ حسن پریشاں بر نتابد ہر دلے
منظرِ شمعِ شبستاں بر نتابد ہر دلے — دردِ پنہاں، سوزِ عریاں بر نتابد ہر دلے
الحذر اے چشمِ مشتاقِ تجلی! الحذر!! — کثرتِ انوارِ جاناں بر نتابد ہر دلے
بسکہ پیچیدیم بر خود ما اسیرانِ قفس — خندۂ از ہم صفیراں بر نتابد ہر دلے
در جہاں سرگشتہ ایم و تہمتِ ہر کس کشیم — نشۂ پندارِ ساماں بر نتابد ہر دلے
نفس را دم ساز کن یا عقل را ہمراز کن — حرصِ عیش و ترکِ ساماں بر نتابد ہر دلے

حیرتے طاری شدہ بر دیدۂ بیدار را
منظرِ خوابِ پریشاں بر نتابد ہر دلے

جناب شارق میرٹھی

نشاطِ ماضی

وہ عشرتوں کا زمانہ گذر گیا اے دوست! مسرتوں کا زمانہ گذر گیا اے دوست!
خبر نہیں کہ بہار اب بھی آتی ہے کہ نہیں! کلی چٹک کے ترانے سناتی ہے کہ نہیں!
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہ بھیگی بھیگی نسیم! چمن سے آتی ہے اب بھی وہ میٹھی میٹھی شمیم؟
وہ کالی کالی گھٹائیں وہ بجلیوں کی چمک! سنائی دیتی ہے اب بھی کبھی دلوں کی دھمک؟
سکوتِ شب کا ترنم، وہ لالہ زار کے راگ! سنائی دیتے ہیں اب بھی وہ آبشار کے راگ؟
کبھی فضا کے ترنم کا مست کر دینا! کبھی گلوں کے تبسم کا مست کر دینا؟
وہ بانسری کی صدائیں وہ زیست کی لہریں! وہ جامِ مے وہ سکوت اور وہ حسیں باہیں!
گذر گیا وہ زمانہ گذر گیا اے دوست! نشاطِ قلب و نفس سرد کر گیا اے دوست!
"سکونِ راحتِ رفتہ" کو اب ترستا ہوں "نشاطِ عشرتِ رفتہ" کو اب ترستا ہوں!
نہ اب وہ بے خبری ہے نہ جوشِ بدمستی سکوں نواز نہیں اب ترنمِ ہستی
بہار آتی ہے لیکن خبر نہیں ہوتی نشاط لاتی ہے لیکن خبر نہیں ہوتی
مگر کبھی جو بدلتی ہے کروٹیں قسمت نظر میں کھنچتا ہے نقشِ تخیلِ عشرت
زباں پہ آتے ہیں کچھ بھولے بسرے افسانے وہ میری روح کی گرمی "بخورِ فطرت" کے
وہ جن سے وجد میں آجاتے ہیں در و دیوار خزاں میں ذکر کیا ہے تو آگئی ہے بہار
وہ جن سے رقص میں آجاتے ہیں زمین و زماں وہ جن میں غرق ہوئے مست ہو کے کون و مکاں
وہ جن سے چھائی ہے دنیا پہ تازگی اے دوست! وہ جن سے پائی ہے عالم نے دلکشی اے دوست!
وہ جن سے جھوم کے اٹھی ہے کالی کالی گھٹا وہ جن سے چھا گئی دنیا پہ مستیوں کی ردا

سنائے جاؤ لگاتار گر میں یہ افسانے
بھلانے سے بھی نہ بھولینگے مجھ سے یہ نغمے

محترمہ شکیلہ اختر

بوڑھا مدرّس

کتنے روشن دن بیتے اور کتنی چاندنی راتیں گذر گئیں کتنی ترقیاں ہوئیں اور کتنے علوم و فنون کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا۔ غرض کیا کیا ہوا۔ مگر غریب بوڑھا مدرس اپنی افسردہ دنیا میں خاموش، بے حس و حرکت پڑا رہا، وہ ایک دیہات کے چھوٹے سے گرل سکول کا مدرس تھا، اس کے زیر تعلیم دس بارہ لڑکیاں تھیں جو کبھی تو پڑھنے آجاتیں اور کبھی اپنے گھر کے کاموں میں ایسی پھنس جاتیں کہ مکتب کا خیال تک نہ آتا۔ مگر بوڑھا مدرس ہمیشہ وقت سے پہلے ہی مکتب میں بیٹھا سوچتا رہتا وہ سبق پڑھاتا آموختہ یاد کراتا تختی لکھاتا۔ مگر ہر وقت کسی فکر میں کھویا سا رہتا۔ ہمیشہ کوئی خیال اُسے گھلائے دیتا۔ وہ سوچتا رہتا "آج گھر میں کچھ بھی نہیں ننھے ننھے بچے کیا کھائیں گے؟ سردی کا زمانہ ہے معصوم بچے کب تک ایک ہی پھٹی رضائی میں گھسے دن کاٹیں گے؟" پھر وہ ایک خاموش آہ بھر کر آہستہ سے چھڑی زمین پر ٹیکتا اور ایک مری ہوئی آواز اُس کے لبوں سے نکلتی "لڑکیو! زور سے پڑھو!"

بوڑھے مدرس کی تنخواہ صرف بارہ روپے تھی۔ بارہ روپے اور آٹھ بچے ایک بیوی اور ایک خود۔ بھلا دس آدمیوں کے لئے یہ بارہ روپے کیا حقیقت رکھتے تھے! یہ ضرور ہے کہ جس وقت بوڑھے مدرس کے ہاتھ میں اُس کی تنخواہ آتی تو وقتی مسرت کی ایک لہر اسکے رگ و پے میں دوڑ جاتی مگر پھر جب لوگ اُس سے اپنا قرض لینے آتے تو وہ حسرت بھری نظروں سے اُن کے منہ تکتا۔ آدھی سے زیادہ محنت کی کمائی دوسرے لوگ جھگڑ کر لیجاتے اس کے بعد پھر وہی فکر، وہی تردد اور وہی فاقہ اور وہی قرض۔

جاڑا آتا گرمی آتی برسات گذر جاتی۔ مگر بچارے مدرس کے ننھے بچے ہمیشہ پھٹی ہوئی گدڑیوں ہی میں ملبوس رہتے عید بقر عید اُن بچاروں کے لئے اس دنیا میں تھی ہی نہیں اور غریب بوڑھا مدرس آہ اُس کی جان تو ایک عذاب میں تھی۔ مکتب سے اگر کبھی تو اسے کچھ کھانے کو ملتا اور کبھی وہ نمک ہی چاٹ کر پانی پی لیتا۔ پھر اپنی تسبیح تیزی سے گھماتا اور زیر لب گنگناتا ہوا مسجد کی طرف چلا جاتا وہاں سے رات گئے آتا اور خاموشی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی ایک پلنگڑی پر سو جاتا۔ اسی طرح اس کی قابل رحم زندگی گذر رہی تھی۔

سال میں ایک بار مکتب کے معائنے کے لئے اسکول انسپکٹرس آیا کرتی تھی بوڑھا مدرس اُسکے آنے کی خبر سنکر سہم جاتا تھا۔ وہ پورانی وضع کا مدرس تھا جسکے پاس ٹریننگ کی سند نہیں تھی۔ بستی میں بھی تعلیم کا کچھ ایسا چرچا نہ تھا پھر اگر لڑکیاں وقت پر حاضر نہ ہوتیں تو اس میں اس بچارے کا کیا قصور؟ اگر وہ انہیں مارتا یا ڈانٹتا تو لڑکیاں یہ کہکر اپنا نام کٹوا لیتیں کہ انہیں اپنے گھروں میں بہت سے کام رہتے ہیں اور پھر پڑھنا بھی تو کچھ ضروری نہیں! بوڑھا مدرس سکول انسپکٹرس کی آمد سنکر کہتا "بچو کہ وہ بیمار ہے"۔ اور پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنی پھٹی ہوئی چادر میں لپٹا ہوا دعا کرتا "معبود اُسے میری خبر نہ ہو" آخر یہ بہانا بھی کب تک چلتا؟ دوسرے سال وہ معائنے کے وقت بیٹھا رہا۔ اسکے سامنے سکول کے فائل دھڑا دھڑ غصے میں پٹکے جا رہے تھے منت سماجت سے بلائی ہوئی لڑکیاں اپنا سارا سبق بھلاتے ہوئے خاموش بیٹھی تھیں۔ بوڑھا بچارہ مدرس۔۔۔۔ آہ وہ ایک طرف خاموش بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ سکول انسپکٹرس نے غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا "یہ گرل سکول توڑ دیا جائے گا اور تم بوڑھے میاں اپنے ہاتھ میں صرف چھڑی لئے گھر میں اونگھتے رہو گے" مگر بستی کے لوگوں نے کہا "آہ غریب

بوڑھا مرجائیگا۔ یہی ایک سہارا انکے اور آٹھ سارے بچوں کی زندگی کا ہو۔ سلونی انسپکٹر بس نے گھورتے ہوئے کہا "بس ایک سال کا وقت دیتا ہوں تم اپنی کاہلی دور کرلو"۔

—— (۲) ——

بوڑھے مدرس کے لڑکے کو لوگ دیکھ دیکھ کر کہہ رہے تھے "اسلم اب بڑا ہوگیا ہے۔ اب تمہاری مصیبتیں دور ہونے کے دن گئے۔ باپ اور بیٹے کی کمائی سے دن پھر جائینگے"۔

اسلم نے غربت اور فاقہ کی گود میں جنم لیا تھا۔ اس نے کبھی پیٹ بھر کھانا نہ کھایا تھا۔ غریب والدین نے اپنا اور دوسرے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر بڑی مشکلات سے اُسے مڈل تک پڑھایا تھا۔ اسلم اب جوان تھا بچپن تو گذر گیا۔ مگر جوانی کی نئی نئی امنگوں کو کون روکے؟ اسلم بھی دوسرں کو دیکھ کر شباب کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کا خواہاں تھا۔ مگر اس میں اور دوسرے لوگوں میں ایک بہت بڑا فرق تھا۔ وہی فرق جو امارت و غربت میں ہوتا ہے!

اب اُسے کھدر کی قمیض بری لگتی تھی۔ وہ بھی دھاریوں والی قمیضوں کا متمنی تھا۔ مگر وہ اپنے دل کو سمجھاتا اپنی آنسوؤں کو روکتا اور ایک افسردہ آہ میں اپنی ساری خواہشوں کو تھوڑی دیر کے لئے دور کر دیتا۔

اسلم نے ہوش سنبھالتے ہی گھر کی غربت، فاقہ، ضرورت اور اپنی تمناؤں کی خلش کو محسوس کیا وہ پٹنہ بجلی گھر میں کام سیکھنے گیا۔ اس نے بڑی محنت کی انجینئر نے اس کے کام سے خوش ہو کر اسے جلد نوکری دینے کا وعدہ کر دیا۔ اسی اثنا میں بدقسمتی سے ایک دن انجن صاف کرتے ہوئے اس کا ہاتھ بری طرح مجروح ہوگیا۔ تھوڑے دنوں کی چھٹی لیکر وہ گھر چلا آیا۔ علاج معالجہ پر بھی زخموں نے کافی طول کھینچا۔ بچارے مدرس نے اسلم کے جلد نوکری ملجانے کی امید سے علاج معالجہ پر قرض لیکر خرچ کیا۔ اسلم کے زخمی ہاتھوں کو وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں لیکر دیر تک آہستہ آہستہ دعائیں کرتا اُسے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اسلم کبھی اچھا ہوگا ہی نہیں۔ وہ نیم کی پتیاں لا کر گرم کرتا اور اپنے ہی ہاتھوں سے اسلم کا زخم دھوتا اس خیال سے کہ شاید بوڑھے باپ کے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دھویا ہوا زخم جلد ہی بھر جائے گا۔ . . . مگر . . . بوڑھا مدرس کبھی سوچتا . . . اگر اسلم کا زخم مندمل نہ ہوا اور حرارت بڑھکر زہریلا بخار ہوگیا تو . . . تو پھر! وہ کیا کرے گا؟ کتنی مصیبتوں سے اُس نے اس پودے کو اپنے خون جگر سے سینچ سینچ کر درخت کیا تھا۔ اور اب . . . کیا وہ اتنی آسانی سے اسے جڑ سے گر جانے دیگا . . . اور اسکی پھیلنے والی شاخوں کے گھنے پرسکون سائے . . . کیا اُسے تسکین نہیں پہنچا ئینگے؟ بوڑھا مدرس ان حوصلہ فرسا خیالات کو اپنے دل سے دور کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اسلم کے چہرے کو بیکسانہ نگاہوں سے دیکھنے لگتا . . .

آخر تین ماہ کے بعد اسلم اچھا ہو کر واپس پٹنہ گیا۔ مگر وہاں جا کر دیکھا کہ پہلے انجینئر کی تبدیلی ہوچکی تھی۔ اور اس کی جگہ ایک خشک چہرے والا مدراسی انجینئر اُس سے بولنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ . . . !

وہ افسردہ ہو کر گھر پہنچا۔ بوڑھا مدرس اسلم کے مغموم چہرے کو دیکھکر دھک سے رہ گیا اور . . . پھر حسب معمول اسلم فاقہ سے نڈھال اور بے بجھ بھائی بہنوں کی چیخ پکار بے چین ہو کر سنتا رہتا . . . !

—— (۳) ——

رمضان آیا اور بڑے دھوم دھام سے آیا . . . مگر ان غریبوں کے لئے کونسی نئی بات ہوئی انکے یہاں تو ہمیشہ رمضان رہتا تھا۔ بوڑھا مدرس اسلم اور اسکے سارے گھر والے روزہ رکھتے۔ مگر افطار کبھی تو روکھی روٹیوں سے ہوتا اور کبھی بھنے ہوئے چنے سے۔

بجلی گھر میں کام کرنے سے الاونس کے طور پر اسلم کو دس روپے مل جاتے تھے۔ اور اسی طرح اُسے اچھی خوراک مہیا ہو جاتی تھی۔ مگر یہاں کی سوکھی روٹیاں اسے پسند نہ آتیں وہ دو ایک لقمے کھا کر اُٹھ جاتا اور بوڑھا مدرس محبت سے کہتا "بیٹا تھوڑا اور کھالو کھانے سے بدن میں کچھ تو طاقت رہے گی"۔ اپنی صحت کا خیال کرو اسلم کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کمزور ہو کر کسی کام کے قابل نہ رہو"۔

بیچارا مدرس اونگھتا ہوا ہمیشہ اسلم کی نوکری کی بابت سوچتا رہتا۔ وہ تصورات کی دنیا میں کبھی تو اسلم کو تیس پینتیس روپے کا نیچر محسوس کرتا اور کبھی اُسے جمعدار بنا تا غرض بوڑھے مدرس کے تخیلات کی دنیا شاداب تھی۔ لیکن کبھی کبھی غریب مدرس ان سب نوکریوں سے مایوس ہو کر کہتا: "موٹر کے ڈرائیور بھی تو خوب کما لیتے ہیں۔"

افطار اور سحری ان غریبوں کے یہاں کیا ہو سکتی تھی۔ اور لوگ تو کچھ کھا لیتے مگر بے چارہ اسلم ہمیشہ ہی بھوکا رہتا اس خیال سے کہیں کھانا گھٹ نہ جائے۔!

ایک دن بوڑھے مدرس کے یہاں کسی نے کو کچھ نہ تھا پانی کے دو گھونٹ سے روزہ کھول کر سب کوٹھری میں خاموش بیٹھے تھے۔ غربت کی تاریکیاں ہر طرف چھائی تھیں۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی پلنگڑی پر بیٹھا بوڑھا مدرس تسبیح کے دانوں کو گھماتا ہوا اپنی اور دوسروں کی بھوک کے تکلیف دہ خیال کو دل سے بھلا رہا تھا۔ دوسری طرف اسکی چھوٹی بچی امرود سامنے پھینک کر روٹی کے لئے رو رہی تھی۔ دوسرا بچہ دیوار سے لگا ہوا چیخ رہا تھا۔ اسلم بھی ایک طرف اداس بیٹھا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ آخر اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے اپنے پھٹے ہوئے دامن میں آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "اماں تم چولہا جلاؤ میں کچھ ادھار لے آتا ہوں" ماں نے بیٹے کو حسرت بھری نظروں سے تکتے ہوئے کہا: "کہاں سے لاؤ گے بیٹا اب تو کوئی کچھ بھی نہیں دیتا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں تم آگ جلاؤ اماں" اسلم یہ کہہ کر تیزی سے بازار کی طرف چلا گیا۔ اُسے دور ہی سے آتا ہوا دیکھ کر بنئے نے کہا: "اسی طرف لوٹ جاؤ نہیں تو جانتے ہو کہ بڑے بیچکر اپنی چیزوں کی قیمت لے لونگا" اسلم آنسو پونچھتا ہوا بولا: "بھائی ابا کی تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلے تمہیں دوں گا۔ آج رحم کرو" بنئے نے ڈانٹتے ہوئے کہا: "کیا ملے گا میاں۔ دس کی جگہ پانچ دو گے پھر بھی میرے پانچ باقی ہی رہیں گے اور اس پر آج پھر رحم کر دوں؟ تم پر رحم اور خود پر قہر کر دوں نا؟ جاؤ میں ہرگز نہ دونگا" مگر سنو اسلم نے گڑگڑاتے ہوئے کہا "روزہ رکھ کر ہم سارے لوگ اس وقت تک بھوکے ہیں خبر نہیں جانے دو مگر جانتے ہو میرے ننھے ننھے بھائی بہن بھوک سے تڑپ رہے ہیں جب مجھ سے انکا تڑپنا نہ دیکھا گیا تو میں ادھر کچھ لینے آ گیا۔ بھائی خدا کے لئے اس وقت کچھ دیدو میرے گھر میں چولہا تک نہ جلا تھا۔ ابھی جلوا کر آیا ہوں بچے آگ جلتی دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ بھائی آج پھر دیدو پھر کبھی مت دینا" بنئے نے ہنستے ہوئے دوسرے لوگوں سے کہا: "سنتے ہو بھائی یہ گھر میں چولہا جلا کر آئے ہیں کہ میں جنس لینے جاتا ہوں۔ مجھے اس طرح جیسے اپنے بوروں سے کوئی چاول دال نکالتا ہو" دوسرے لوگ جنس دینے والے قہقہہ مارتے ہوئے بولے: "میاں اسلم! آخر یہ قرض کی ہانڈی کب تک پکے گی؟ روز روز کا ادھار کون تمہیں دے گا" اسلم سر جھکا کے آہستہ سے بولا: "بھائی للہ آج پھر دیدو پھر میں کبھی تمہارے یہاں نہیں آؤنگا۔ بس یہی آخری بار دیدو" مگر بنئے نے ایک نہ سنی اور غریب اسلم خاموش آنسو بہاتا ہوا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر میں داخل ہوا۔ دیکھا تو چولہے کی آگ بجھ چکی ہے اور دونوں ننھے بھائی بہن چولہے کے پاس ماں سے لگے ہوئے اونگھ رہے ہیں۔!

دوسرے دن اسلم سو کر اٹھا تو پھر بچوں کی وہی چیخ و پکار تھی وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی اور بہنوں کو لیکر صحن میں امرود کے درخت کے پاس آیا اور کچھ کچے پکے امرود توڑ کر انہیں دیئے۔ گھر کا حال وہی تھا۔ چولہے میں راکھ پڑی ہوئی تھی۔ اور لکڑیاں ایک کونے میں رکھی تھیں۔ جمعہ کا دن تھا اسلئے اسلم نے اپنے کپڑے دھوئے اور انہیں امرود کے درخت پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیئے۔ گھر میں بچوں کے ہوتے ہوئے بھی آج خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسلم کی ماں افسردہ حال ہی گھڑا اٹھائے قریب ہی دوسرے گھر سے پانی لانے جا رہی تھی۔ اسلم نے آہستہ سے کہا: "اللہ غربت میں شرافت کا نباہنا کتنا مشکل ہے" اُسے دیکھا کہ وقت جا رہا ہے۔ اس لئے جلدی سے پھٹی ہوئی لنگی کاندھے پر ڈال کر صابن ہاتھ میں لئے ستون کی طرف نہانے چلا گیا۔ یہاں آکر اُس نے دیکھا کہ اُس کا باپ اور اُس کا چھوٹا بھائی بھی موجود ہے۔

سون کے کنارے کافی لوگوں کا مجمع تھا۔ تمام نہا رہے تھے۔ اسلم اور اُس کے ساتھیوں نے یہ صلاح کی کہ تیر کر اُس پار جائیں اور وہیں نہائیں بڈھے باپ نے بیٹے کو دیکھا اور بیٹے نے باپ کو سلام تھوڑی دیر ٹھہر گیا لیکن جیسے ہی بوڑھا مدرس دوسری طرف متوجہ ہوا اسلم اور اُس کے ساتھی موجوں میں کود کر تیرنے لگے . . . .

... اُسکے ساتھی اُس پار کے گھاٹ پر غسل کر رہے تھے اور بوڑھا مدرس تھوڑے سے پانی میں کانپتا ہوا ایک کنارے پر نہا رہا تھا۔ اسلم اور اُسکے ساتھی تیر کر واپس آ رہے تھے کہ اسلم اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر آدھی ندی کی طرف غلطی سے چلا گیا۔ ندی کا بہاؤ زوروں پہ تھا۔ غریب اسلم سنبھل نہ سکا اُس نے ڈوبتے ہوئے اپنا ہاتھ مدد کے لئے اوپر اٹھایا۔ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ ملاح کیوں غریبوں کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے؟ آخر لوگوں کی چیخ پکار سے ایک چھوٹی سی کشتی بیچارے اسلم کو بچانے کے لئے گئی۔ جیسے ہی کشتی وہاں پہنچی کہ اسلم ایک بار پھر اُبھرا۔ ایک آدمی نے جلدی سے اُسکے سر کے بال کو پکڑ لیا۔ مگر بال ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں رہ گئے۔ اور پھر وہ پھر نہ اُبھرا۔ لوگوں نے ملاحوں سے سون میں جال ڈلوایا۔ مگر بے سود۔ ایک طرف بوڑھا مدرس حیرت زدہ کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا "ہائے اسلم" اور پھر وہ بھی تماشا دیکھنے لگا۔ جال دوبارہ ندی میں ڈالا گیا مگر لاحاصل تیراک لوگ اس جگہ پہنچے مگر فضول۔ بیچارے اسلم کا پتہ نہ چلا۔ سب لوگ مایوس ہو کر کنارے پر کھڑے تھے۔ ملاحوں نے جال نکال کر کنارے پہ ڈال دیا۔ جال سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ سون کی بیقرار موجوں میں اب سکون تھا سطح آب پر کچھ بلبلے ابھر اور پھوٹ رہے تھے۔ ہوا کی چھیڑ سے ننھی لہریں ایک دوسرے سے مل مل کر فنا ہو رہی تھیں اور بہتے ہوئے گلے سڑے پتے جھاگ میں لپٹے ہوئے ساحل سے لگ رہے تھے۔ افق میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی خونی شعاعیں سون کی لہروں کو شہابی رنگ سے شفق ناک بنا رہی تھیں۔ ہر طرف ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ بوڑھا مدرس یکایک گھبرا کر بولا۔ اُس کی آواز آہستہ اور گلوگیر تھی: "خدا کی مصلحت! میں کہاں سے کفن دفن کا سامان کرسکتا"۔

جناب احمد ندیم قاسمی بی۔اے سے

افکارِ پریشاں

جب منور نشاط گاہوں میں — رقص میں لوگ محو ہوتے ہیں
ایک بیوہ کے چند بھوکے لال — پیٹ پر ہاتھ رکھ کے روتے ہیں

پو پھٹے برگِ لالہ پر شبنم — مثلِ سیماب یوں لرزتی ہے
جس طرح پاسِ ضبط سے بیوہ — ہچکی لیتے ہوئے جھجکتی ہے

شام کو مال روڈ پر اکثر — دل میں چھپتا ہے یہ خیالِ خام
ایک موٹر میں ایک پٹڑی پر — کتنا نازک ہے زندگی کا نظام

جناب مُلّا رموزی صاحب

"فینسی عاشق!"

اُس گھر میں ایسے عاشق کا آج کیا گزر ہو　　جو عشق میں بھی، فدوی، اور خاکسار تر ہو

اتنا حسین یارب اب تو مرا بھی گھر ہو　　سننے کو ریڈیو ہو، پڑھنے کو "پائنیر" ہو

ڈپٹی کلکٹروں سے اونچا اگر خسر ہو　　ایسے خسر پہ یارب داماد کا اثر ہو

بیوی وہی جو ہر دم موٹر میں ساتھ جائے　　شوہر وہی جو ہر دم اُس کا ڈرائیور ہو

باوا سے اپنے بیٹی موٹر دلا رہی ہے　　داماد کا جہاں میں اتنا تو کرّ و فر ہو

بی۔ اے۔ کے بعد بھی جب شوہر نہ ہو ملازم　　بیوی کے گھر میں اُس کی آرام سے بسر ہو

حافظ علی کو اتنا روشن خیال کردو　　بیوی بھی ساتھ ہو جب صاحب کے ہاں ڈنر ہو

اللہ ہی بچائے اُس شخص کو بلا سے　　خفیہ پولس کی خفیہ جس شخص پر نظر ہو

بے پردگی سے عاشق کو بھی تو فائدہ ہے　　وہ عشق کا کیا کہ جس میں سی' آئی' ڈی' کا ڈر ہو

ذی علم ہو رموزی، یہ ہم بھی مانتے ہیں　　عہدہ نہیں تو گویا تم ایک جانور ہو

ہشیار، یہ ہے قسمت اس میں ہے یہ بھی ممکن
یہ بے اثر رموزی اک روز تاجر ہو

جناب مرزا عبدالغنی صاحب بی۔ اے۔

نپولین اعظم کی تاریخ کا ایک باب (۱)

ہمارے محترم و معزز مقالہ نگار جناب عبدالغنی صاحب بی۔ اے نپولین کی ایک ضخیم و مسبوط تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں۔ ذیل کا مقالہ اسی تاریخ کا ایک باب ہے! نپولین کے حالات و کوائف حیات متعدد و ضخیم مجلدات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان تمام کا مطالعہ کرنا اور بغیر سو رغانہ دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے صحیح حالات پیش کرنا کس قدر صبر آزما اور حوصلہ فرسا کام ہے! اور ماشاء عبدالغنی صاحب جس استقلال اور محنت سے اپنے "فرائض" کو ادا کر رہے ہیں اسے مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماشاء صاحب کا یہ علمی کارنامہ واقعی عظیم الشان کارنامہ ہوگا۔!

ایڈیٹر

عہدِ طفولیت

(۱)

کارسیکا جسے نپولین کے مولد ہونے کی وجہ سے اس قدر عظمت حاصل ہو چکی ہے۔ ایک مختصر سا جزیرہ ہے۔ یہ بحیرۂ روم میں اٹلی سے بچاس میل کے فاصلے پر اور فرانس سے سو میل دور اس طرح موجود ہے۔ گویا کوئی انسان اپنے بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے جینوا کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کہ اس سے میری مشکلات کا آغاز ہوا۔ اور اسی کی بدولت مجھے دائمی شہرت نصیب ہوئی۔

اس جزیرہ میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور معمولی معمولی پہاڑ بکثرت ہیں۔ جا بجا ندی نالے موجود ہیں۔ آب و ہوا خوشگوار ہے۔ اور مناظر حسین و دلربا۔ تقریباً تمام کے تمام باشندوں کا اصلی وطن اٹلی ہے خد و خال، زبان اور تمدن و معاشرت کے لحاظ سے اٹلی کے باشندوں سے ہر طرح مشابہ ہیں۔ اور عام کہستانی لوگوں کی طرح بہادر، جنگجو اور حریت پسند ہیں۔ ادنے ادنے باتوں پر خونریزیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ لوگ خاندانی وقار کی خاطر اس عناد کو قرنوں تک جاری رکھتے ہیں۔ اور خون کی ہولی کھیلتے رہتے ہیں۔ اُن کی یہ انتہائی آرزو ہوتی ہے۔ کہ اولاد کی کثرت ہو تاکہ عزت کو برقرار رکھنے کی خاطر ایک زبردست طاقت موجود رہے۔

نپولین کی پیدائش سے کوئی پچاس ساٹھ پہلے اُس کے آبا و اجداد اٹلی سے آکر کارسیکا کی مغربی بندرگاہ اجیشیو میں مقیم ہو گئے تھے۔ بوناپارٹ خاندان اٹلی میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اور اسے اتنی قدامت حاصل تھی جتنی اُس وقت کے جرمن حکمران خاندان ہیپسبرگ کو حاصل تھی بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس خاندان کا اصلی وطن یونان تھا بعض اسے عربی النسل بتاتے ہیں بہرحال اٹلی میں یہ امرا کا ایک عظیم الشان خاندان تھا۔ اور امن ہوتا یا جنگ کا زمانہ اسکے افراد عوام الناس کی قیادت کیا کرتے۔ کارسیکا میں بھی یہ کوئی کم معزز نہ تھے۔ اور جب جینوا کی پبلک مہاجنوں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر کارسیکا کے لوگوں نے قومی مصیبت کے مقابلہ میں متحد ہو کر مادرِ وطن کو آزاد کرانے کی غرض سے ایک مسلسل جنگ کا آغاز کیا۔ تو نپولین کے والد کارلو بوناپارٹ نے اپنی خاندانی روایات کو قائم رکھا اور وکالت کا آرام دہ پیشہ چھوڑ کر اس اولوالعزمی ثابت قدمی اور جوش سے جنگ میں حصہ لیا۔ کہ اُن کا بلند فطرت قائد پاؤلی اُسے اپنا دست راست سمجھنے لگا۔

کارسیکا کے آزاد طبع لوگ کوئی سو سال تک جینوا کے زر پرست مہاجنوں کے غلام رہے۔ اس عرصہ میں اُن کا ہر طرح خون چوسا گیا جینوا

کی زر پرستی ایک جنگاری ثابت ہوئی۔ اور یہ آتش انگیز مادہ یک لخت بھڑک اٹھا۔ جب کُشار ہاتھ سے جانے لگا۔ تو اسے ۱۵ فروری ۱۷۶۸ء کو لوئی پانزدہم والئے فرانس کے ہاتھوں ماسی ہزار پونڈ میں فروخت کر دیا گیا۔ یہ کارسیکا کے زخموں پر نمک پاشی تھی۔ محبانِ وطن نے جب اپنے آپ کو اس طرح مویشیوں کی طرح بکتے دیکھا۔ تو انتہائی غم و غصہ کی حالت میں وہ چند جوش کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا۔ نپولین کی ماں لٹیشیا بھی دوسری عورتوں کے ساتھ جنگ میں شامل ہوئی۔ جنگ کا قیامت خیز شور، دشوار گزار پہاڑوں میں سفر۔ پہاڑی ندی نالوں میں سے وقت بے وقت گھوڑے پر گذر۔ جنگی خیموں میں اور اکثر اوقات پہاڑی چٹانوں پر شب باشی، یہ تمام باتیں اس بلند ہمت خاتون کے دل پر سکون و مسرت پیدا کرتی تھیں۔ وہ خندہ پیشانی سے ہر جگہ موجود رہتی۔ اور اگر اُسے کوئی فکر دامنگیر تھا۔ تو صرف اپنے محبوب خاوند کی جان کا یا کارسیکا کی قسمت کا۔

اکثر اوقات جب اُسے خاوند کہیں خفیہ جگہوں میں چھوڑ جاتا۔ تو وہ تازہ معلومات کے لئے بیتاب ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچ جاتی۔ سرفروشوں کی یہ جماعت مختصر۔ فرانس کی کثیر التعداد فوج کا مقابلہ کامیابی سے نہ کر سکی۔ اُن کا قائد پولی مایوس ہو کر انگلستان چلا گیا۔ کارلو بونا پارٹ جلا وطنی میں بھی پولی کی رفاقت کرنا چاہتا تھا۔ مگر دور اندیش لٹیشیا نے کہا۔ کہ ان دگرگوں حالات میں اُسے اپنی خاندانی وجاہت اور ذاتی قابلیت سے فائدہ اٹھا کر کارسیکا کی خدمت ایک اور رنگ میں کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اُس نے شاہِ فرانس کی اطاعت قبول کر لی۔ اور چونکہ فرانسیسی زبان سے اچھی طرح واقف تھی۔۔

. . . .

. . . . . . اسلئے شاہِ فرانس سے کارسیکا کے لئے ہر قسم کی مراعات حاصل کرنے کی پُر امن کوشش شروع کر دی۔

کارلو بونا پارٹ دبلا پتلا۔ خوش شکل۔ روشن خیال اور پر جوش انسان تھا۔ وہ اس حد تک آزاد خیال تھا۔ کہ گرجا شاذونادر ہی جایا کرتا۔ دوسرے نظریئے اُسکے دل و دماغ کی وسعتوں کو مسخر کئے ہوتے تھے اکثر نئی نئی تجاویز سوچتا رہتا۔ اس لئے مالی حالت خاندانی روایات کے مقابلہ میں کمزور تھی۔ ویسے عام اُمراء کی طرح فضول خرچ بھی تھا۔ اخلاق بڑے پسندیدہ تھے۔ اور قدرتی طور پر سوسائٹی میں بڑا محبوب تھا۔

اس کی نوجوان بیوی لٹیشیا ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اور نسوانی حسن کا ایک دلربا پیکر تھی۔ مگر عادات کے لحاظ سے اپنے خاوند کی ضد تھی۔ ضبط کی عادی، کفایت شعار، قدامت پسند اور مذہب کی دلدادہ۔ چنانچہ جنگ کے اختتام پذیر ہونے پر ۱۵ اگست ۱۷۶۹ء کو وہ گرجا گئی ہوئی تھی۔ جب اُسے عین عبادت کے دوران میں گھر واپس ہونا پڑا۔ تو آکر ایک صوفے پر دراز ہو گئی۔ صوفے پر ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔ جس پر ایلیڈ[1] کی جنگوں اور اُسکے جانبازوں کی تصاویر منقوش تھیں۔ اولوالعزمی، سرفروشی اور حق شناسی کے اس شاندار ماحول میں اُس وقت اُسکا دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام اُس نے نپولین رکھا۔ وہ نام جس سے کچھ عرصے کے بعد اقصائے عالم میں ایک گونج پیدا ہو گئی۔

بچے کے لئے کارسیکا کی ایک خوش پوش خوبرو۔ اور فہیم دایہ مقرر کی گئی۔ ماں اپنی نگرانی میں اُس کی خوراک اور اُسکے آرام کا انتظام کرایا کرتی تھی۔ جب وہ اردگرد کے لوگوں کی آوازیں سمجھنے کے قابل ہوا۔ تو ایثار، جوانمردی اور شجاعت کے الفاظ اُسکے کانوں تک پہنچنے لگے۔ کارسیکا کے جہادِ آزادی کا نتیجہ افسوسناک رہا تھا۔ اس لئے جیسے جیسے نپولین ان واقعات کو سنتا اُسکے ننھے سے دل میں عجیب عجیب آرزوئیں پیدا ہوتیں۔ اُسکا اولیں کھلونا لکڑی کی ایک تلوار تھی۔ جس سے وہ اپنے مفروضہ دشمنوں کو قتل کرتا رہتا یا قریب جوار کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے فوج میں ترتیب دیتا۔ اور فرانس کی موہوم فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا۔ والدہ اُسے کھانے کے لئے سفید روٹی دیا کرتی تھی۔ اُسے وہ لے جا کر ایک غریب سپاہی کو دے دیا کرتا تھا

---

[1] ایلیڈ یونان کے فقید المثال شاعر ہومر کی رزمیہ تصنیف ہے جس میں ٹرائے کے محاصرہ کے حالات اور بہادروں کے جرات انگیز کارنامے نظم کئے گئے ہیں۔

اور خود اسکی بجوری معمولی قسم کی روٹی لے لیتا تھا۔ ایک ماں نے کہا "تم یہ کیا کرتے ہو؟"

"جب مجھے سپاہی بننا ہے۔ تو روٹی بھی سپاہیوں جیسی کھانا لازم ہے۔ اور ساتھ ہی مجھے وہ روٹی پسند بھی ہے" نپولین نے جواب دیا۔

اس کم عمر بچے کے مجاہدانہ جوش اور اس کی فطانت و ذہانت کے آثار دیکھ کر باپ اُسے دوسرے تمام بچوں سے زیادہ عزیز سمجھنے لگا۔ نپولین اس کی گود میں بیٹھ جاتا۔ اور کارسیکا کے محبانِ وطن کے جوانمردانہ کارنامے بڑی دلچسپی سے سنتا۔ ماں اُسے اُن پُرمصائب ایام کی زہرہ گداز داستان بالتفصیل سناتی اور بتاتی کہ کس تحمل اور عزمِ راسخ سے اہلِ کارسیکا نے تمام تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ مٹھیاں ٹیکے، اپنے گالوں کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دیکر ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ اور اپنی ماں کی ولولہ انگیز گفتگو کو سنتا۔ اور پردے ہی پردے میں ایک جنگجویانہ روح کی پرورش کرتا۔ اُسے اپنے والدین پر بڑا ناز تھا...... اُن والدین پر جنہوں نے جنگِ آزادی میں بڑی جانبازی کا ثبوت دیا تھا۔ بعد میں اُس کا عزیز ترین کھلونا پیتل کی ایک تیس پونڈ کی توپ تھی۔ جس کی آواز اُسکے کانوں کے لئے سحر آفریں نغمہ تھی۔ یہ توپ ابھی کارسیکا میں موجود ہے۔

ابھی اُس کی عمر بمشکل پانچ سال تھی کہ اُسے لڑکیوں کے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ جو راہبہ عورتوں نے قائم کر رکھا تھا۔ وہ لباس کے متعلق بالکل بے پروائی کا اظہار کرتا۔ بٹن کھلے ہوتے۔ جرابیں ایڑی تک ہوتیں اور بوسیدہ تسمے عموماً کھلے رہتے۔ دوسرے طلباء اُس پر آوازے کستے۔ مگر وہ مغرورانہ استغنا سے کام لیتا۔ سکول کی ایک ہم عمر لڑکی گیاکومینیٹا کے حسن نے اُسے مسحور کر لیا۔ یہ نپولین کی پہلی محبت تھی۔ لڑکی بھی اس کی بے حد والہ و شیدا تھی۔ دونوں کی محبت بچپن کی سادگی کی آئینہ دار تھی۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر سکول آتے جاتے۔ بڑی عمر کے لڑکے اُن کے گرد ہو جاتے۔ اور مذاق کرتے۔ نپولین ہاتھ میں سنگریزے اور لکڑیاں اٹھا لیتا۔ اور نتائج سے بالکل بے پروا ہو کر بڑے جوش سے حملہ آور ہوتا۔ لڑکے راہِ فرار اختیار کر جاتے اور پھر نپولین اپنی محبوبہ کا ہاتھ فاتحانہ انداز سے پکڑتا۔ اور گنگناتا ہوا چلا جاتا۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر ایک لڑکے نے ایک سادہ سا شعر موزوں کیا۔ جس کا مطلب یہ ہے: "نپولین جس کی جرابیں آدھی پھٹی ہوتی ہیں گیاکومینیٹا سے محبت کرتا ہے" لڑکے جونہی اُسے دیکھ پاتے یہ شعر پڑھنا شروع کر دیتے اور وہ غصے سے لال پیلا ہو جاتا۔

دو ایک سال کے بعد اُسے لڑکوں کے سکول میں منتقل کر دیا گیا۔ اُسکا بڑا بھائی جوزف بھی اُسی سکول میں تھا۔ وہاں اسباق میں دلچسپی اور طلبہ میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لئے انہیں دو فوجوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ ایک فوج کارتھیج والوں کی اور دوسری رومن لوگوں کی ہوتی۔ نپولین کو کارتھیج کی فوج میں شامل کر دیا گیا۔ مگر چونکہ تاریخی بیانات کے مطابق یہ فوج ہمیشہ رومن لوگوں سے شکست کھاتی رہی تھی۔ اسلئے نپولین نے احتجاج کیا۔ کہ اُسے دوسری فوج میں ہونا چاہئے۔ جو ہمیشہ فاتح اور منصور رہی تھی۔ اُسے رومن فوج میں شامل کر لیا گیا۔ اور اُسکے بھائی کو کارتھیج کی فوج میں۔ جوزف کو اس بات کی پروا نہ تھی۔ مگر نپولین کی خودداری طبیعت کے لئے یہ امر ناقابلِ برداشت تھا۔ کہ اپنا تعلق ایک شکست خوردہ فوج سے رکھے۔ وہ بچپن ہی سے فاتح بننا چاہتا تھا۔

جیسے جیسے نپولین کی عمر بڑھتی گئی اُس نے اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیل کود میں حصہ لینا ترک کر دیا۔ وہ سنجیدہ، متین اور خاموش بنتا گیا۔ وہ ہر معاملہ میں بڑی دور اندیشی کا اظہار کرتا۔ اپنے عجیب و غریب خیالات اور ارادوں کی قدر و قیمت اُسے معلوم تھی۔ یہ علم اُسے دوسروں سے بالاتر ظاہر کرتا۔ خودداری اُس کی فطرت بن گئی۔ وہ کبھی کسی سے بے تکلف نہ ہوتا۔ اس کی سادہ اور معمولی حرکات بھی اس قدر وقار آمیز ہوا کرتی تھیں کہ اُسے دیکھ کر جذبۂ احترام خود بخود دل میں پیدا ہو جاتا تھا۔ اسکے لئے باوقار رہنا اس طرح فطری امر تھا جس طرح بطخ کے نوزائیدہ بچے کے لئے پانی میں تیرنا۔ اسی لئے بھائی بہن اُس سے اتنے مانوس نہ تھے اور اسکے مقابلہ میں اُس کا بڑا بھائی جوزف زیادہ محبوب تھا۔

اُس کی روح آزاد تھی اور خیالات بلند۔ وہ اس متانت سے مختصر مگر پُر زور اور پُر مغز گفتگو کرتا کہ معمر لوگ بھی حیران رہ جاتے۔ وہ تقریباً ہر وقت مطالعہ میں منہمک رہتا۔ اُس کی یہ عادت بن گئی کہ ہر شام کتاب ہاتھ میں لے لیتا اور قریبی پہاڑیوں کے ایک غار میں چلا جاتا۔ سامنے کھلا سمندر ہوتا اور بسیط فضائے آسمان۔ خبر نہیں ان لا متناہی وسعتوں کو دیکھ کر اُسکے خیالات نے کس قدر وسعت اختیار کی۔ اور کون کونسے بلند ارادوں نے اُسکے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کیا۔ وہ غار اب بھی متبرک خیال کیا جاتا ہے۔ اور "غارِ نپولین" کے نام سے مشہور ہے۔

اُس کی یہ سیرت ہر ایک پر اپنا اثر کرتی تھی۔ اُس کی ماں نے زیادہ توجہ سے اُس کی تربیت شروع کر دی۔ اُس کی بصیرت نے اُس پر الم نشرح کر دیا۔ کہ اس بچے کو غیر معمولی قوتیں عطا کئے گئے ہیں۔ اُس نے نپولین کے سامنے بلند مقاصد پیش کئے۔ اس کے دماغ میں اعلےٰ اور ارفع خیالات کی پرورش کی۔ اس کی ہر نازیبا حرکت پر مناسب سزا دی۔ ہر پست خیال اور ہر عاقبت نااندیشانہ حرکت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور کسی قسم کی تنگ خیالی اور بے راہ روی کو اُسکے نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ یہ اسی تربیت کا نتیجہ تھا۔ کہ جب نپولین سکولوں میں تعلیم پا رہا تھا تو عام بچوں کی طرح نہ اُس نے اپنی قیمتی وقت کا کوئی لمحہ ضائع کیا۔ نہ کھیل کود کی طرف توجہ دی نہ کوئی اور بُری عادت اختیار کی۔ اور نہ ہی کبھی مشکلات کو دیکھ کر گھبرایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نپولین فطرۃً عظیم الشان قابلیتوں کا مالک تھا۔ مگر یہ اُس کی ماں ہی تھی۔ جس نے ابتدا ہی سے ان قابلیتوں کو راہِ راست پر ڈال دیا۔ اور حق تو یہ ہے کہ نپولین کی عجیب و غریب سیرت کی صورت گری زیادہ تر اسی ماں نے کی تھی۔

اس کے ایک چچا نے بستر مرگ پر کہا کہ "گو جوزف سب بھائیوں سے بڑا ہے۔ مگر نپولین خاندان کا سردار ہے" کارسیکا کا فرانسیسی گورنر کاؤنٹ ماربوف اس بچے کا بڑا مداح تھا اور کہا کرتا تھا کہ اگر حالات نے مساعدت کی تو نپولین دنیا میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لیگا۔ اسی کاؤنٹ کی کوشش سے نپولین دس سال کی عمر میں پہلے آٹن سکول میں داخل ہوا۔ اور بعد میں برین کے فوجی سکول میں چلا گیا۔ جب وہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کارسیکا کو الوداع کہہ رہا تھا تو سخت رنج ہونے کے باوجود ماں کے گلے لگ کر رو دیا۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ کہ نپولین کا فطری غرور ایک لمحہ کے لئے کافور ہو گیا۔ اور اُسکا دلی صدمہ گرم گرم آنسوؤں کی شکل میں نمودار ہوا۔ حالانکہ ایک دفعہ پہلے جب کسی لڑکے کی شرارت کا الزام اُس پر لگا تھا اور اُسے سزا دی گئی تھی۔ تو نہ تو اُس نے اپنی بریت کی کوشش کی اور نہ ہی سزا کے وقت اپنے چہرے پر درد و تکلیف کو منعکس ہونے دیا۔ اور بعد میں جب یہ آٹن سے برین سکول جا رہا تھا۔ تو اس کا بڑا بھائی جوزف اس سے جدا ہوتے وقت رو پڑا۔ کیونکہ اُس نے وہیں رہنا تھا۔ مگر نپولین کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔

(۲)

اب تک نپولین اپنے گھر میں رہا تھا۔ اُسے بالعموم اُن لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ جو اُس کے اعزا و اقارب میں سے تھے۔ اس لئے اُس ماحول میں اُس کی مخالفت نہ ہوئی۔ تمام بچے اُس کی عادات سے متاثر ہو کر اُسے بالا تر شخصیت سمجھتے۔ اور اس سے مرعوب رہتے تھے۔ بڑی عمر کے لوگ اُس کی پیش از وقت پختہ کاری دیکھ کر اُس کی عزت کرتے تھے۔ پرستاروں کے اس حلقہ میں وہ شانِ بے نیازی سے رہتا تھا اُسے توقع تھی کہ برین سکول میں بھی اُس کی قابلیت کے معتقد اور مداح موجود ہونگے۔ اور وہ عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔ مگر وہاں تو حالات ہی دگرگوں تھے۔ امرا کے مغرور بچے اُسے اجنبی اور مفتوح قوم کا بچہ خیال کر کے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ اُسے طنزاً کہا کرتے تھے کہ "تم ہمارے غلام ہو"۔ ایک بار تنگ آکر اُس نے کہہ دیا کہ "اگر تم ہمارے ایک سپاہی کے مقابلہ میں چار ہوتے تو کوئی بڑی بات نہ تھی کارسیکا فتح نہ ہوتا۔ مگر تم تو ایک کے مقابلے میں دس تھے۔ اب میں فرانسیسیوں کی خبر لونگا"۔ اُن مغرور بچوں کے نازیبا رویہ نے نپولین کے دل میں جذبۂ حب الوطنی راسخ تر کر دیا۔ اور وہ اُن دنوں کے خواب دیکھنے لگا جب اُس کے اپنے وطن عزیز کو غیر ملکیوں کے آہنی پنجہ کی گرفت سے آزاد کرایا گا

امرا کے وہ آسودہ حال بچے اُس کی غریبی کا مذاق اڑاتے۔ بیشتر لوگ ایسی بے زیادہ اُن کی آنکھوں میں بھی نہ جچتا تھا۔ اِدھر نپولین کو اپنی خاندانی نجابت و عظمت پر ناز تھا۔ اُن کے اِس ذلت آمیز سلوک کو دیکھ کر وہ خون پی کر رہ جاتا اور اپنے ارادوں کو زیادہ مضبوط کر دیتا۔ اب تک نپولین کے نزدیک عظمت کا معیار صرف قابلیت ہی تھی۔ اسکا اعتقاد تھا کہ ایک انسان جتنا قابل ہو اسے دنیا میں اتنا ہی ممتاز اور معزز رہنا چاہیئے۔ لیکن اب یہ دیکھ کر اس کے احساس دل کو سخت صدمہ ہوا کہ لوگوں کے نزدیک اُس شخص کی زیادہ قدر و منزلت ہے۔ جو دولت مند ہے اور ایک غریب خواہ کتنا ہی قابل اور شریف النسب کیوں نہ ہو۔ ذلیل و خوار ہے۔ اُس نے اپنے ذہن میں ٹھان لیا کہ امرائے ان متکبر بچوں پر واضح کر دونگا کہ دنیا میں صرف قابلیت ہی حقیقی عظمت ہے۔ اُس کا لباس اُس کا لب و لہجہ اور اُسکا نام ان بچوں کے لئے سامان تفنن بن گیا۔ وہ اُسے "ناک پر تنکا" کے نام سے پکارتے۔ کیونکہ نپولین کے مشابہ فرانسیسی لفظ کا معنی یہی تھا۔ وہ فرانسیسی زبان سے بھی ناواقف تھا۔ یہ امر اُس کے لئے اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوا۔

امیرزادوں کی اِس ہٹ دھرمی اور تنگ ظرفی کے باعث نپولین کی ذہنی وسعتوں میں ماضی کے مسلمات کے خلاف جو ہیجان انگیز جنگ شروع ہوگئی۔ اُس کا نتیجہ ایک عالم نے دیکھا تھا۔ ماحول کی اِس ظلم آزمی کو دیکھ کر وہ نامعلوم طور پر جمہوریت نواز بنتا گیا۔ اور اسکے دل پر طبقہ امرا کی تنگ خیالی بے حسی اور سنگدلی نے ایک دائمی اثر چھوڑا۔

طلبہ کا سلوک تو نپولین کے ساتھ یہ تھا۔ مگر اساتذہ بہت جلد اُسکی خداداد ذہانت اور ان تھک کوششوں کے مداح بن گئے۔ کارسیکا کے انقلاب نے اُس کی طبیعت کا میلان بلا ارادہ طور پر تاریخ کی طرف کر دیا تھا۔ اس لئے اس قدرتی مناسبت نے اس کے وسعت پذیر قوا کے سامنے ایک ایسا میدان عمل پیش کیا۔ جہاں اُسے اپنی تمام آرزوئیں پایۂ تکمیل تک پہنچتی نظر آتی تھیں۔ وہ ہر قسم کی تاریخ کا مطالعہ کرتا۔ غیر معمولی انسانوں کے کارہائے نمایاں، قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں مذہب کی شکست و ریخت کے عالمگیر اسباب اور بنی نوع انسان کی بہبود کے ذرائع۔ اس کی توجہات کا مرکز بنے ہوئے تھے علوم ہندسہ میں بھی اُسے ممتاز حیثیت حاصل رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ تمام علوم جنکی معلومات اور جن کے نتائج اور نظریئے حتمی اور یقینی حیثیت رکھ سکتے ہیں۔ اُس کے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث تھے۔ اور اسی لئے وہ ناولوں کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اُسے جغرافیہ سے بھی بڑا اُنس تھا۔ کیونکہ اُس دنیا کے متعلق وہ پوری پوری واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ جہاں اُس نے کوئی دیرپا کام کر کے دکھانا تھا۔ لہٰذا اس نے دنیا کے نقشوں کو بڑی باریک بینی سے دیکھا۔ اور اِس مضمون کے علمی نکات پر بڑا غور کیا۔ ان تمام مضامین میں وسیع معلومات رکھنے کی وجہ سے وہ جلد اپنے اساتذہ میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ وہ لائبریری سے پوری طرح متمتع اندوز ہوتا۔ اور ہر اُس دن کو ضائع شمار کرتا۔ جس دن کوئی نئی بات معلوم نہ کر لیتا تھا۔ اگر اس نے بریَن سکول میں کوئی چیز نہ سیکھی۔ تو وہ جرمن زبان تھی۔ اسی لئے اِس زبان کا معلم نپولین سے بڑا بدظن تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ "میں سمجھ نہیں سکتا۔ لوگ اسے ذہین اور جفاکش طالب علم کیوں کہتے ہیں"۔

نپولین کے متعلق اس مرحلے پر یہ تعریفی کلمات بادی النظر میں حیران کن ہیں۔ مگر جنہیں یہ علم ہو چکا ہے کہ نپولین آغاز عمر ہی سے بڑا پُرجوش تھا۔ اور دنیا کے ہر معاملے پر بڑی سنجیدگی سے غور و خوض کرتا تھا۔ انکے لئے یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں۔ علاوہ بریں یہ شوقِ مطالعہ ایک حد تک اُس کی خواہشِ نمود کا بھی نتیجہ تھا۔ سوسائٹی میں اُسے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس لئے مطالعہ کر کے وہ ممتاز ہو جانا چاہتا تھا۔ اور اپنے ہم مکتبوں پر فوقیت حاصل کر کے انہیں شکست دینے کا آرزومند تھا۔ بریَن سکول میں ہر طالب علم کو ایک قطعہ زمین حسبِ منشا کاشت کرنے کے لئے دیا جاتا تھا۔ نپولین نے اپنے قطعہ میں ایک خوبصورت باغ لگایا۔ اور اُسکے وسط میں ایک سادہ سا مگر دلکش حجرہ تعمیر کیا۔ یہ حجرہ اُسکے کارسیکا کے غار کا قائم مقام بنا۔ اور اُسے اُس نے اپنے مطالعہ کے لئے مخصوص کر دیا۔ غور و فکر اور مطالعہ

کے لئے دوسرے عیش پسند اور آوارہ مزاج طلبہ سے بچکر وہ اس کمرہ میں آجاتا اور تنہائی میں بہترین مفکرین کی بلند پایہ تصانیف کا مطالعہ کرتا۔ نپولین اپنے ماحول سے جس قدر متنفر اور بیزار تھا۔ اتنی ہی زیادہ جانفشانی اور عرقریزی سے اُس نے مطالعہ جاری رکھا۔

روسو کے خیالات سے وہ اپنے باپ کی زبانی واقف ہوچکا تھا اب اُس نے بلاواسطہ اس مفکر کی تعلیمات کا مطالعہ کیا۔ شروع شروع میں روسو کی کتابوں نے اسکے دماغ پر بڑا اثر کیا۔ اور اُسے یہ مصنف اس لئے زیادہ پسند تھا کہ اُس نے کارسیکا کے باشندوں کو "فرزندانِ حریت" کا خطاب دیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے اُس کی خیالات نے پختگی اختیار کی وہ اس پر اعتراضات کرنے لگا۔ اُسے روسو سے اس بات میں تو اتفاق تھا کہ بنی نوع انسان کو اپنی بہبودی کیلئے ذہنی، معاشرتی اور سیاسی انقلاب کی ضرورت ہے۔ مگر سوسائٹی کی تشکیل کے متعلق نپولین کے خیالات بالکل مختلف تھے۔

روسو افلاطون کے فلسفہ کی ایک صدائے بازگشت ہے۔ اور ہمارا مشہور مشرقی فلاسفر علامہ اقبال اُسے مسلکِ گوسفندی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ مسلک جو نفئ خودی سے عظمتِ انسانی پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ روسو کے نظریئے بھی اس تعلیم سے ملتے جلتے ہیں۔ بالخصوص روسو کی کتاب "سماجی عدم مساوات کا آغاز" نپولین کے نئے تمام کی تمام خلافِ واقعہ نظریئے پیش کرتی تھی۔ اُس کی اُس زمانے کی کاپیوں میں اب بھی وہ اعتراضات موجود ہیں۔ نپولین اس بات کا قائل تھا۔ کہ ایک بلند خیال رہنما کی حقیقی متابعت ہی انسانوں کی بہتری کی کفیل ہے۔ مگر روسو نے لوگوں کو آغازِ عالم کی فطری سادگی اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ سادگی جس میں کسی ترتیب کسی نظام یا کسی امیر کی ضرورت نہ تھی۔ اور جس کا انجام غیر منظم آزادی تھا۔ نپولین کو اس نظریئے سے کلیتہً اختلاف تھا۔ اس کی ضبط پسندی اور پیولی کی شاندار قیادت نے بچپن ہی سے اُس کے خیالات کے لئے ایک مخصوص شاہراہ مقرر کردی تھی۔ تاہم روسو کا ایک فقرہ اُس کے حافظہ میں ہمیشہ محفوظ رہا۔

"جس جرأت اور استقلال سے کارسیکا کے بہادر لوگوں نے اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو بحال کیا ہے۔ اور اِس کی حفاظت کی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اب اُن میں ایک ایسا دانا آدمی پیدا ہوجائے جو اسے برقرار رکھ سکے"۔ نپولین کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ وہی روسو کا "دانا آدمی" ہے اور انجام کار اپنے محبوب وطن کا نجات دہندہ ثابت ہونے والا ہے۔ اس مصنف کے علاوہ نپولین نے اور بھی بہت سے مفکرین کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ والٹیر کا ڈراما "محمدؐ" اسے زندگی بھر عزیز رہا۔ والٹیر کے ایک فقرہ نے نپولین کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کرکے زندگی بھر کے لائحۂ عمل کا تعین کردیا۔ والٹیر پارلیمنٹوں کے متعلق لکھتا ہے "چونکہ اطاعت لازمی ہے۔ میں اچھے خاندان کے ایک شیر ببر کی متابعت کرونگا جسے قدرت نے مجھ سے برتر پیدا کیا ہے۔ بہ نسبت اِسکے کہ اپنی نوع کے دو سو چوہوں کا تابع بنوں"۔ اس فقرہ نے نپولین کے دل میں بلند مشرب انسانوں کی عظمت کا سکہ ثبت کردیا۔

نپولین نے پلوٹارک کے بہادروں کے کارنامے بار بار پڑھے۔ اُن یونانی اور رومن عظیم المرتبت انسانوں کے جوش انگیز قصے تھے جنہوں نے اپنے کوہ شکن ارادوں سے دنیا میں پائدار تبدیلیاں کی تھیں۔ نپولین کے دل میں بھی سربلند ہونے کی ایک زبردست آرزو پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اُس نے اپنے والد کو ایک خط میں لکھا "میں کارخانہ کے مزدوروں میں اول رہنا پسند کرونگا۔ بہ نسبت اسکے کہ کسی اکاڈیمی کے فنکاروں میں آخری مرتبہ حاصل کروں"۔ ہومر نے بھی اسکے تخیل کو مسحور کر رکھا تھا۔ ایک بار اُس نے اپنی ماں کو خط لکھا کہ "ہومر بغل میں لیکر اور تلوار ہاتھ میں پکڑ کر میں دنیا میں اپنا راستہ آپ بناؤنگا"۔ یہ فقرہ اچھی طرح ظاہر کرتا ہے کہ اُسکو اپنے آپ پر کس قدر اعتماد تھا۔

اس نے مستقبل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی شروع کردیا۔ ایک مضمون میں اُس نے فرانس کے شاہی خاندان کی زبردست مخالفت کی حالانکہ شاہی عنایات ہی اُسکے تعلیمی اخراجات کی کفیل

نہیں۔ یہ مضمون پروفیسروں نے جلوادیا۔ مگر اس نے ثابت کر دیا کہ نپولین ایک عام طالب علم نہیں، وہ بڑی بلند نظری سے ان دنوں کے حالات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اور اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کہ ایام کا رُخ کس طرف ہے۔ اور اس مضمون سے اُسکے محدود حلقے میں یہ بھی الم نشرح ہوگیا کہ نپولین اپنے خیالات کے اظہار میں بڑی طاقت سے ڈرنے والا نہیں ہے۔ ایک اور موقعہ پر بھی اس نے اپنے اعتقادات کو ظاہر کرنے میں جرأت دکھائی۔ اُسے برین سکول کے پرنسپل کے ہاں اپنی باری پر دوسرے طلبا کی طرح کھانا کھانے کا موقعہ ملا۔ ایک پروفیسر نے پیولی کے متعلق توہین آمیز الفاظ استعمال کئے۔ نپولین نے کہا: نہیں جناب! پیولی بہت عظیم الشان انسان تھا۔ اسے اپنے ملک سے محبت تھی۔ اور میں اپنے باپ کو کبھی معاف نہیں کرونگا۔ کہ وہ کارسیکا کے فرانس کے ساتھ ملحق ہونے پر رضامند ہوا۔ اُسے پیولی کا جلاوطنی میں بھی شریکِ حال رہنا چاہئے تھا۔ فرانس میں رہ کر شاہی خاندان کی مخالفت اور پیولی کے عزائم کو مبارک خیال کرنا ایک جرم تھا۔ مگر نپولین بزدل نہیں تھا۔ کہ مشکلات اور مصائب سے خاموش کر دیتے۔

نپولین کے اخلاق بھی بے حد قابلِ ستائش اور حیرت انگیز تھے۔ وہ غریبوں اور کمزوروں کا مربی سمجھا جاتا تھا۔ ان سے دلی ہمدردی کا بطرح اظہار کرتا۔ متین، شریف اور مؤدب ہونے کے لحاظ سے وہ سکول بھر کے لئے ایک نمونہ تھا۔ وہ ہمیشہ دکانداروں سے معاملات رکھنے میں دوسروں کو بھی دیانتداری کے لئے مجبور کرتا تھا۔ لیکن اسکے اخلاق کا یہ دلپذیر پہلو صرف انہی افراد کے لئے وقف ہو چکا تھا۔ جو اس کے قدردان تھے اپنے بدمزاج اور متکبر ہم مکتبوں کو وہ کبھی معاف نہ کرتا اور ہمیشہ ترکی بترکی جواب دینے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس قسم کے کسی لڑکے کو یارا نہ تھا۔ کہ اُس کے متذکرہ بالا حجرہ میں داخل ہوتا۔ اُسکے انہی اوصاف کو دیکھ کر ایک استاد نے کہا: یہ لڑکا خوبصورت پتھر کا بنا ہوا ہے مگر اسکے اندر آتش فشاں پہاڑ موجود ہے۔

اُسے کھیل کود اور عام سوسائٹی سے نفرت تھی۔ اُسکے دل سے فرحت وانبساط کے جذبات تقریباً مفقود تھے۔ اور انکے بجائے اُسکے چہرے پر کچھ کچھ مایوسی نمایاں تھی۔ یہ مایوسی ظاہر کرتی تھی کہ نپولین بے فکری کے بجائے عمر رسیدہ زمانہ شناس انسانوں کی مانند سوچ بچار میں لگا رہتا ہے۔ وہ بے خوف اور نڈر تھا اور ناجائز دباؤ سے فوراً آپے سے باہر کر دیتا تھا۔ خیالات، معاملات اور رسم و نشست و برخاست میں اُس کا رویہ ہمیشہ فیصلہ کن ہوتا۔ اُسکے لئے کسی معاملہ میں بین بین رہنا امر محال تھا۔

اُسکے اعلیٰ اخلاق بلند عزم اور وسیع معلومات سے آخر کار سکول کے امیرزادے اور دیگر طلبہ بھی مرعوب ہوگئے۔ سنہ ۱۷۸۳ء کے موسم سرما کا ایک واقعہ جبکہ نپولین کو سکول میں داخل ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ اور اُس کی عمر پندرہ سال تھی ہم پر یہ حقیقت بخوبی منکشف کرتا ہے کہ تمام طلباء بلا استثنائے احدے اُس کی فوقیت کے قائل تھے۔ اور اُسکے اطاعت گزار بن چکے تھے۔

اس موسم میں برف باری اس قدر ہوئی کہ تمام راستے مسدود ہوگئے۔ اور میدانوں میں برف کی گہری تہیں پیدا ہوگئیں۔ سکول کے طلباء کو کھیلنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ اور وہ سخت تنگ تھے۔ نپولین نے فنِ تعمیر کے متعلق چند دنوں پہلے کچھ اسباق پڑھے تھے۔ اور خود بھی ادھر اُدھر سے اپنے علم میں اضافہ کیا تھا۔ اس نے اپنے زیرِ ہدایت تعمیر شروع کرادی۔

لڑکوں نے بڑی فرمانبرداری اور مستعدی سے ہر حکم کی تعمیل کی۔ جب یہ قلعہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ تو اس قدر عظیم الشان تھا۔ کہ شہر کے لوگ جوق در جوق اُس کے دیکھنے کے لئے آئے۔ جنگ کے لئے نپولین نے تمام طلباء کو دو فوجوں میں تقسیم کر کے ہر فوج کا ایک ایک جنرل مقرر کیا۔ دونوں فوجوں کی کمانڈ اس نے اپنے ذمہ لی۔ لڑائی سے پہلے اُس نے ایسی ولولہ انگیز تقریر کی کہ تمام کے چہرے جوش اور آنے والی جنگ کی خوشی سے تمتما اُٹھے اب ایک فوج محصور ہوگئی۔ اور دوسری محاصرہ کرنے والی۔ وہ کبھی غیرت دلانے والے الفاظ میں محاصرین کی ہمت افزائی کرتا۔ اور کبھی محصورین کے پاس جاکر انہیں مدافعت کے لئے ہر ممکن قربانی

کرنے پر آمادہ کرتا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ کہ اس نے افواج کو عملاً اپنے زیرِ فرمان ایک جنگ میں لڑایا اور جن قائدانہ صفات کا نپولین نے اس موقع پر مظاہرہ کیا وہ ہر کہ دمہ کے لئے حیرت انگیز تھا۔ جنگ بڑی دلچسپ تھی اور مارچ کے اخیر تک جاری رہی۔ جب گرمی کی شدت سے برف گھلنے لگی اور قلعہ ایک دلربا خواب کی طرح آہستہ آہستہ تحلیل ہو گیا۔

اس عرصے میں اُس کا باپ وفات پا چکا تھا اور امورِ خانہ داری اور بچوں کی تربیت کی تمام ذمہ داری اُس کی ماں کے کندھے پر آپڑی کاؤنٹ ماربوف نے اُسی طرح اپنی نوازشات کو جاری رکھا۔ اُسکی ماں اپنے یتیم بچوں کو ہمراہ کر کے ایک گاؤں میں چلی گئی۔ جوزف اور نپولین کے علاوہ اور بھائی بہن بھی تھے۔ لوسین، لوئی، اور جیروم تین چھوٹے بھائی تھے۔ اور ایلزا، پالین اور کیرولین تین بہنیں۔ گاؤں میں ان کا اپنا مکان تھا۔ اس مکان کے اردگرد کا نظارہ بڑا روح پرور تھا۔ نپولین اپنی تعطیلات وہیں گزارتا تھا۔ بچے تمام دن باغ میں کھیلتے۔ بھتے کبھی وہ اڑتی ہوئی رنگ برنگ کی تیتریوں کے پیچھے بھاگتے اور انہیں پکڑتے، کبھی درختوں میں آنکھ مچولی کھیلتے اور کبھی کیچڑ میں ننگے پاؤں بھاگ کر اپنے کپڑے لت پت کر لیتے اور ماں انہیں ملامت کرتی۔ ان کھیلوں میں کبھی کبھی نپولین بھی اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔ ان تمام کی یہ معمولی حالت اُنکے مستقبل کے شاندار کارناموں سے اس قدر مختلف تھی۔

قاعدہ تھا کہ ہر صوبجاتی فوجی سکول اپنے تین قابل ترین لڑکے جن کی عمر پندرہ سال یا اس سے زیادہ ہو ہر سال پیرس کے مرکزِ فوجی سکول میں بھیجے۔ جونہی نپولین کی عمر پندرہ سال کی ہوئی۔ وہ اس مرکزی سکول میں بھیجدیا گیا۔ یہ اس کی غیر معمولی قابلیت اور جوانمردی کا بہترین ثبوت تھا۔ وزیرِ حرب نے اس داخلے کے موقع پر نپولین کے متعلق مندرجہ ذیل دلچسپ رپورٹ درج کی۔

موسیو رالبونا پارٹ، تاریخ پیدائش ۱۵ر اگست ۱۷۶۹ء۔ قد پانچ فٹ چھ انچ۔ جسم مضبوط اور صحت اچھی۔ نرم مزاج دیانتدار اور احسان شناس ہے طرزِ عمل قابلِ تقلید ہے۔ علوم ہندسہ میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ تاریخ و جغرافیہ کو خوب سمجھتا ہے۔ شائستہ علوم اور لاطینی کی طرف اتنی توجہ نہیں قابلِ جہازران بنے گا۔ برین سکول میں بھیجے جانیکا مستحق ہے۔"

یہ مختصر مگر جامع اندراجات نپولین کی اُس وقت کی حالت کا آئینہ ہیں اور ساتھ ہی یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انسان مستقبل کے تاریک پردوں میں سے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ نپولین ایک عام جہازران نہ بنا۔ بلکہ اس نے خود غرضی ہوس پرستی اور ظلم و تعدی کے طوفانی سمندر میں ملک و ملت اور بنی نوع انسان کی کشتی بانی کی۔

(۳)

نپولین جب ۲۳ر اکتوبر ۱۷۷۹ء کو برین کے فوجی کالج میں پہنچا۔ تو اُسے ایک عجیب عبرت خیز سماں دکھائی دیا۔ کالج کے طلبا جنہیں جنگ کی صعوبتوں کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ بڑی آرام پسندی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ امراء کے وہ ناز پروردہ بچے اپنے ہاتھ سے کام کرنا ہتک خیال کرتے تھے۔ ملازمین ان کی ہر خدمت بجا لانے پر مامور تھے۔ ان کے گھوڑوں کی خبرگیری کرتے تھے۔ اُنکے ہتھیار صاف کرتے تھے۔ اُنکے بوٹوں پر پالش کیا کرتے تھے۔ الغرض اُنکے ادنےٰ سے ادنےٰ اور بڑے سے بڑے کام انہی کے ذریعے انجام پذیر ہوا کرتے تھے۔ اور امیر زادے خود یا تو زندگی کے لطف اٹھانے میں مصروف رہتے یا نرم و نازک بستروں پر محوِ استراحت رہتے۔ ان حالات کو دیکھکر نپولین کا دور اندیش دماغ سخت متردد ہوا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ ایک سپاہی کی زندگی نفاست اور نزاکت کی آئینہ دار ہو۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ "از نازنیناں بناید نبرد" اور "خر از زیرِ پالاں نیاید درست" اب وہ برین سکول کا ناتجربہ کار اور اس لئے کمزور دل طالب علم نہ تھا کہ اس ناپسندیدہ صورتِ حالات کو دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔ عمر، علم اور کامیابی نے اُسے بڑا دلیر اور اولوالعزم بنا دیا تھا۔ اس نے کالج کے پرنسپل کو ایک درخواست لکھی جس میں پُرزور الفاظ میں اُن تمام جرأت آمیز

حقیقت آموز اصولوں اور اعمال کا ذکر کیا۔ جن کو مدنظر رکھ کر ایک سپاہی تربیت کرنا چاہیئے۔ اس نے پرنسپل کو ترغیب دی کہ کالج میں انہی باتوں پر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔ اس درخواست کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اُلٹا بانی مدرسہ اُس سے بدظن ہوگئے۔ مگر اس تحریر نے یہ امر منکشف کر دیا۔ کہ پندرہ سال کی عمر میں جب ہر ایک لڑکا آرام اور آزادی کا خواہاں ہوتا ہے۔ اور بےفکری کی زندگی بسر کرنا ضروری سمجھتا ہے نپولین بڑا زود رس مستقل مزاج اور مشکل پسند تھا۔ شاید کسی آواز نے اُسکے کانوں میں یہ کہہ دیا تھا کہ مستقبل میں تمہیں عظیم الشان کام سرانجام دینے پڑینگے۔ اور اُنکے لئے مناسب تیاری لازم ہے۔

فارغ التحصیل ہونے پر نپولین کی عملی زندگی اس قدر مصروفیت کی زندگی تھی کہ اُسے مطالعہ کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا لیکن پھر بھی وہ مذہبی، سیاسی، انتظامی، علمی، اور دیگر معاملات میں حیرت انگیز وسعتِ معلومات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ یہ ہمہ گیر واقفیت اُس نے کہاں سے حاصل کی؟ یقیناً بریین اور پیرس کے تعلیمی اداروں سے اُسکی غیر محدود معلومات ہی اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔ کہ ایامِ طالب علمی میں اُس نے بڑے انہماک سے محنت کی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جس فرض شناسی اور مستعدی اور جن ان تھک کوششوں سے اُس نے اپنی ذہنی استعداد میں اضافہ کیا۔ شاید ہی کسی نے اسی طرح کیا ہو۔ وہ مخصوص حالات کی بنا پر ترقی کی انتہائی بلندیوں پر نہ پہنچا۔ وہ اپنی عظمت کے لئے دنیا کے کسی مقتدر انسان کا مرہونِ منت نہ بنا بلکہ یہ سب کچھ اُسکے بچپنے کی مسلسل محنتوں اور قوتِ بازو کا ناگزیر نتیجہ تھا۔

پیرس کالج میں آتے ایک دفعہ علمِ ہندسہ کا ایک لاینحل سا مسئلہ پیش آگیا۔ وہ ایک کمرے میں چلا گیا اور اندر سے قفل لگا لئے۔ لگاتار بہتر گھنٹوں تک دماغ سوزی کرتا رہا۔ خورد و نوش اور نیند کو بھلا بیٹھا اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے بعد ہی باہر نکلا۔ جب وہ کمرہ سے باہر نکل رہا تھا۔ تو اس کی عقابی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمک رہی تھیں۔ یہ واقعہ اس بات کی بین دلیل ہے وہ کسی مشکل کے پیش آنے پر اپنی تمام تر توجہات اُس کے حل کرنے پر مرکوز کر دیتا تھا۔

پیرس کے کالج میں بھی نپولین نے تاریخ، علوم ہندسہ، جغرافیہ اور فلسفہ کا بڑی بالغ نظری سے مطالعہ کیا۔ ماضی و حال کی حکومتوں کے دساتیر کو سمجھنے اور انکے حسن و قبیح پر غور کرنے میں اُس نے بڑا وقت صرف کیا۔ فطرتِ انسانی کی متنوع خصوصیت بھی اُسکے لئے کوئی کم توجہ انگیز نہ تھیں۔ دنیا بھر کے بہترین مصنفوں کی بہترین تصانیف نے اُسکے دماغ کی تربیت کی۔ اور اگر کارلائل کا یہ خیال صحیح ہے کہ "غیر معمولی ذہانت کام کے لئے انتہائی استعداد کا نام ہے" تو یہ بات نپولین پر بالکل صادق آتی ہے۔ وہ اپنے تیز حافظہ میں ہر قسم کے نظریوں کو رکھکر ان پر ضروریاتِ زمانہ اور مفادِ عامہ کے مطابق بڑی اچھی طرح بحث کر سکتا تھا۔ وہ علم اور اُسکے متعلقات کی طرف اس طرح مائل تھا۔ جس طرح ایک پودا روشنی کی طرف جھکتا ہے۔ اس کے علم میں جس قدر اضافہ ہوتا تھا اُسی قدر شوق میں افزونی ہوتی تھی۔

اس وسیع مطالعہ نے اُس کے دماغ میں فلسفیانہ غور و فکر کا مادہ بدرجۂ اتم پیدا کر دیا۔ اُس کی گفتگو بڑی پُرزور اور مسحور کن بن گئی۔ اُس کی تحریر حسنِ ترکیبات، معنی آفرینی، اثر انگیزی اور جوشِ بیان کا بہترین نمونہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ اُسکے ایک اُستاد نے کہا کہ "نپولین کی تحریرات مجھے آتش فشاں پہاڑ کی شعلہ آفرینی کی یاد دلاتی ہیں"۔ جرنیل بننے پر اُس نے وقتاً فوقتاً اپنی فوج کے نام جو اعلانات جاری کئے۔ وہ اُس کی قوتِ تحریر کی برق افگنی کا نہ مٹنے والا ثبوت ہیں۔ لکھتے وقت خیالات اُس کے دماغ میں اسی شدت کے ساتھ منظم ہوتے تھے۔ کہ قلم ان کو انتہائی عجلت کے باوجود مشکل معرضِ تحریر اُسکی تحریر اسقدر بدخط ہوتی تھی کہ قدیم مصری رسم الخط کا دھوکا ہونے لگتا۔ ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد اور انتہائی کوششوں کے باوجود اُسکے بہت سے خطوط ابھی تک نہیں پڑھے گئے۔ اُس کا خوشخطی کا استاد اسی لئے ہمیشہ اُس سے شاکی رہتا تھا۔ مگر اُس انسان کو مجبور سمجھتا تھا

چاہیے جسے لکھتے وقت اپنے برق رفتار تخیل کے ہمرکاب رہنا پڑے۔ آغازِ شباب کا نپولین صحرا کی اس پُرسکون شام کی طرح تھا۔ جو اپنے پہلو میں ایک عالمگیر طوفان لئے بیٹھی ہو۔

اس کے غیر معمولی اوصاف کو دیکھ کر تمام استاد اُس کی قدر کرتے تھے۔ اور اکثر اپنے ہاں بلایا کرتے تھے۔ بالخصوص تاریخ کا پروفیسر تو اسکا والا و شیدا تھا۔ اور اُسکے خیالات سے خوب لذت اندوز ہوا کرتا تھا۔ ایک بڑا فاضل اور باتر پادری جس کا نام رینل تھا۔ نپولین کا بڑا مداح تھا۔ وہ اسے اکثر اپنے ہاں ضیافتوں پر مدعو کرتا اور اس کا پیرس کے مقتدر علماء سے تعارف کراتا اور وہ اس نوجوان کے علمی کمالات کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے۔

انہی دنوں میں اُسے ایک بار اپنے ہم جماعتوں کے ہمراہ کسی خوشی کی تقریب پر مارسیلز جانا پڑا۔ وہاں تمام لڑکے کھیل رہے تھے۔ اور اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ محوِ رقص تھے۔ یہ دُور غور و فکر میں منہمک تھا۔ کسی نے طعنہ دیا کہ "تمہارے دل میں جنسِ لطیف کا کوئی احترام نہیں" وہ بولا "آدمی کی تعمیر کھیل کود اور رقص سے نہیں ہوتی" بلند فطرت نپولین چاہتا تھا۔ کہ سوسائٹی کو ارتقائی منازل طے کرا کے تکمیل کے بامِ اعلیٰ پر پہنچا دے۔

بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے اُس نے بڑا وسیع لائحہ عمل مرتب کر رکھا تھا۔ وہ صرف خلقِ خدا کی خدمت کر کے دنیا میں شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پیرس کا کالج چھوڑنے پر جب وہ سترہ سال کا تھا اس نے رینل مذکور کے اس سوال کے جواب میں کہ "کون سے اصول ہیں جن کو استعمال میں لانے سے انسانیت کبریٰ انتہائی مسرت حاصل کرسکتی ہے" ایک مضمون ملک بھر کے ادباء اور فضلا کے مقابلہ میں لکھا اس کا مضمون اول رہا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ زمانہ تعلیم ہی میں ایسے مسائل پر وقتِ نظری اور وسیع الخیالی سے غور کیا کرتا تھا۔ وہ عام لوگوں کو اس لئے برا سمجھتا تھا کہ وہ اپنا وقتِ عزیز فضول کاموں میں ضائع کرتے ہیں۔ اور انکے سامنے کوئی بلند مقصدِ حیات نہیں ہوتا اسی لئے وہ صرف اُسی محدود حلقے میں بے تکلف ہوتا تھا۔ جو کسی حد تک اُس کا ہمخیال تھا۔ تاہم عوام کے دلوں پر اُس کی قدر و منزلت کا نقش ثبت ہو چکا تھا۔

ان دنوں فرانس میں انقلاب کی آگ سلگ رہی تھی۔ اور جیسا کہ قاعدہ ہے۔ دنیا کے انقلاب محض فوری حادثات نہیں ہوتے بلکہ وہ عرصۂ دراز کی بے اطمینانی اور ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہوتے ہیں مجبور مدتِ مدید تک حاکموں کی غفلت شعاریوں اور خود غرضیوں کا شکار بنے رہتے ہیں۔ رعایا کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ انکے حکمران اپنے عیش و عشرت کے لئے انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ اس قسم کے احساسات بڑے عرصے تک دلوں میں پرورش پاتے رہتے ہیں اور آخر کار ایک طوفانِ عظیم بنکر ملک میں وہ قیامت برپا کرتے ہیں کہ انسان اُسکے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہے۔ بادشاہ اور امراء کو تختۂ دار پر لٹکانا عہدِ ماضی کے تمام بھلے یا برے اداروں کو نیست و نابود کرنا کشت و خون اور لوٹ مار میں منہمک ہونا اور عالیشان محلات کو تدر آتش کرنا انقلابیوں کے ادنےٰ مشاغل بنجاتے ہیں اُن دنوں میں بھی زمانہ کا رجحان عین اسی قسم کے ہولناک انقلاب کی طرف تھا والٹیر کے ہنگامہ آفریں اور انقلاب انگیز خیالات نے فرانسیسیوں کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ عوام الناس اپنے پیدائشی حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اخبارات بادشاہ کی بے اعتنائی سرد مہری اور سنگدلی کے خلاف شور مچا رہے تھے۔ مذہب کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ اِسی نے بادشاہ کو ظل اللہ قرار دیکر انکی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط تر بنا دیا تھا۔ سُود خوار مہاجن لوگوں کے لئے ایک بلائے عظیم تھے۔ بادشاہ کا اُنکا خاطر کچھ نہ کرنا اُسے لوگوں کی نظروں میں اور بھی گرا رہا تھا۔ اور ہر ایک جس کی رگوں میں سرخی خون موجود تھی۔ انقلاب انقلاب پکار رہا تھا۔ کائنات متحیر ہو کر کہہ رہی تھی ؎

ہر سینے میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا

نپولین تقاضائے زمانہ کو دیکھتا تھا۔ اور اگرچہ اُسے عوام الناس کی تکالیف اور خواہشات سے دلی ہمدردی تھی۔ مگر وہ انقلاب کی

...درازنفصیلات سے بڑا خائف تھا۔ اور جہاں وہ ایک طرف حکمران ...ندان کی استبدادیت کا قلع قمع چاہتا تھا۔ وہاں اس کو یہ بھی فکر ...س تھی کہ کہیں یہ انقلاب ننگ انسانیت شکل اختیار نہ کرجائے۔ ...ے ان خیالات کا اظہار وہ اکثر اپنی تحریرات میں اور اپنے دوستوں ...کے سامنے علانیہ کیا کرتا تھا۔

جب اس کی عمر سولہ سال ایک ماہ تھی اس کا فوجی ملازمت کیلئے ...خان ہوا جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے، ہر مضمون میں اُسکے نتائج ...شاندار رہے۔ تاریخ کے پروفیسر نے اُسکے دستخطوں کے بالمقابل ...لکھا "پیدائش اور کردار ہر لحاظ سے اہل کارسیکا میں سے ہے۔ اگر قسمت ...نے یاوری کی تو یہ نوجوان اپنے آپ کو دنیا میں ممتاز بنا دیگا" اس امتحان ...کے اختتام پر اُسکے متعلق یہ رپورٹ لکھی گئی:۔

"نیک نیت اور محنتی ہو۔ ہر قسم کی گفتگو سے مطالعہ کو افضل سمجھتا ہے۔ اور اپنے دماغ کی نشوونما اچھے مصنفین کی کتب سے کرتا ہے۔ وہ خاموشی سے خلوت کا دلدادہ۔ خیالات میں محو رہتا ہے۔ ہر معاملہ میں غالب رہنے کی کوشش کرتا ہے اور انتہائی خود پسند ہے۔ اگرچہ کم گو ہے مگر اُسکے بیانات فیصلہ کن اور برمحل ہوتے ہیں اُسے دلائل میں برتری حاصل ہے۔" کتنی بصیرت انگیز رپورٹ ہے! نپولین کو دوم درجے کا لفٹیننٹ بنادیا گیا۔ اوائل عمر ہی میں اس معزز عہدے پر سرفراز ہوکر وہ بڑا نازاں ہوا۔

اس تقرر کے وقت نپولین بڑا دبلا پتلا اور نحیف لیکن تھا بشبانہ روز دماغی محنت نے اسکی جسمانی نشوونما روک دی تھی۔ یہاں تک کہ دن کا کافی حصہ ایک جگہ بیٹھے رہنے کی وجہ سے اسکی ٹانگیں اُسکے بالائی دھڑ سے چھوٹی رہ گئیں۔ اس ملازمت کے ملنے پر جب وہ اسی روز فرحاں و شاداں فوجی لباس میں اونچے اونچے بوٹ پہنکر اپنے واقفکاروں سے ملنے گیا۔ تو ایک نوعمر لڑکی نے بھی بوٹوں میں بلی کہکر اسکی پھبتی اڑائی۔ لیکن اسکا کتابی چہرہ اس کمی کو پورا کردیتا تھا۔ اسکے چہرے کے خدوخال نہایت دلآویز تھے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی آنکھوں کی چمک تھی۔ جو نظر کو خیرہ کردیتی تھی۔ اسکی ابھری ہوئی واضح ٹھوڑی اسکی مستقل مزاجی کی خبر دیتی تھی۔ اور اسکا کشادہ سینہ وسیع حوصلگی پر دلالت کرتا تھا۔ نپولین کی عظمت وجلال کا صحیح اندازہ صرف اُس وقت ہوسکتا تھا۔ جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتا تھا۔ کیونکہ اُس وقت اس کا جسمانی نقص آنکھوں سے اوجھل ہوجاتا تھا۔ اور اسکی تمام ظاہری خوبیاں نمایاں تر ہوجاتی تھیں۔

یہ خیالات رکھنے والا ان اوصاف کا مالک اور اس شکل وشباہت کا نپولین اب کارزار حیات میں قسمت آزمائی کے لئے تیار تھا۔

جناب اختر انصاری بی۔ اے۔ آنرز

غزل

ہائے دو بستیاں اجڑتی ہیں ! اُف مری آنکھیں چھلکی پڑتی ہیں
اے دل! اپنی متاع سے ہشیار اب کے نظروں سے نظریں لڑتی ہیں
شکوہ کیوں کیجئے کہ تقدیریں یونہی بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں
رات کیچڑ ہے اور راستہ خنک! ٹھنڈی ٹھنڈی پھواریں پڑتی ہیں
لیکن اختر یہ تیری آنکھوں سے
کیسی چنگاریاں سی جھڑتی ہیں

محترمہ گوہر اقبال نور میرٹھی

پریم ساگر کی ایک رات

فضاؤں پر اداسی چھا رہی ہے	دلِ غمناک کو سہما رہی ہے
فسردہ رات کی تاریکیوں میں	مری تخئیل کھوئی جا رہی ہے
ہوائیں چپکے چپکے چل رہی ہیں	مری ہر سانس رک رک کر آ رہی ہے
ستاروں کی نگاہیں تھک گئی ہیں	کہ دنیا ان کی سوئی جا رہی ہے
سمندر، رات اور مطلق اداسی	مری کشتی، کہ بہتی جا رہی ہے
کنارے پر درختوں کے وہ سائے	وہ لمبی گھاس جو لہرا رہی ہے
پرندے پر سمیٹے سو رہے ہیں	ہوا کچھ سوہنی سی گا رہی ہے
وہ پھولوں سے بھرا شاداب جنگل	مسلسل جن کی خوشبو آ رہی ہے
میں سب سے دور ہوتی جا رہی ہوں	مجھے ہر چیز چھوڑے جا رہی ہے

افق پر دور اک ننھا سا تارا
امیدوں کا ہے دھندلا سا سہارا

چمک کر اس نے پھر چھیڑا ہے دل کو	کرن پھر اس کی بڑھتی آ رہی ہے
مرا کھویا ہوا وہ عہدِ ماضی	اسی کی یاد دل پر چھا رہی ہے
تصور میں ہے اک گذرا زمانہ	پھر اک امید دل گرما رہی ہے
مری تخئیل، مسحورِ محبت	کہانی پھر وہی دہرا رہی ہے
تباہی میں مجھے ڈالا ہے جس نے	وہی امید پھر بہکا رہی ہے

. . . .	. . . .

شکستہ اور تنہا، میری کشتی	دھندلکے میں بھٹکتی جا رہی ہے

الٰہی! دور تک ساحل نہیں ہے!

جناب ماسٹر عارف صاحب

ماسٹر

کسی گذشتہ اشاعت میں جناب محمد ابراہیم صاحب کا ایک مضمون "ٹیچر" شائع ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے اس میں تلخ ناگوار حقائق کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اسکے باوجود ہمارے کئی کرمفرما "ٹیچر صاحبان" نے سخت شکوے کئے۔ اور بعض نے تو "جوابات" ٹیچر صاحبان کی رعایت سے، بھی بھیج دئے جن میں جناب ابراہیم کی خوب خبر لی ہوئی تھی . . سب سے بڑا شکوہ جو ان حضرت کی طرف سے پیش ہوا تھا وہ یہ تھا کہ ابراہیم صاحب اپنی "برادری" کو بدنام کر رہے ہیں ہاں "برادری نوازی" حقائق کو کیونکر جھٹلا سکتی ہے؟

ذیل کا مضمون بھی مزاحیہ انداز لئے ہوئے ہے۔ مگر غور سے پڑھنے پر معلوم ہوگا کہ مضمون نگار . . . قہقہوں کے پردے میں آنسو بہا رہا ہے۔ جا بجا "طنزیلی رنگ" میں تلخ واقعات پیش کئے ہیں . . جنہیں لکھ کر مضمون نگار نے بھی بار بار سر آہیں بھری ہیں۔ اور جنہیں پڑھکر ٹیچر صاحبان بھی چند آہیں نذر فضا کر دیںگے . . . .

اگرچہ انکے لبوں پر مسکراہٹ ہی ہوگی! ایک اور بات بھی یاد رکھئے مضمون نگار ایک تجربہ کار اور "گرگ باراں دیدہ" کی قسم کے ٹیچر ہیں! جب ٹیچر والا مضمون شائع ہوا تھا تو دو تین "ٹیچر سوں" دو ہی نے بھی اپنے تجربات ارسال فرمائے تھے۔ مگر ان میں کوئی "خاص بات" نہیں تھی۔ شاید انکے کوئی خاص بات۔ الا "مضمون پہنچ جائے"!

ایڈیٹر

یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز جتنی عام ہو جاتی ہے۔ اتنی ہی اس کی قدر گھٹتی جاتی ہے۔ جب لوگ مسجدوں یا معمولی مکتبوں میں تعلیم پاتے تھے۔ تو تعلیم کی بڑی قدر تھی۔ اور نہ صرف تعلیم کی قدر تھی بلکہ معلم بھی بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن آج کیا حال ہے۔ روٹی کے سوال نے معلم اور متعلم دونوں کو دنیا میں رسوا کر دیا ہے۔ سکولوں اور کالجوں سے تعلیم حاصل کرکے ادھر لڑکے ملازمت کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں اور اُدھر مدرسین ہیں کہ اگر دوسرے شعبوں کی بہ نسبت انہیں آسانی سے کہیں "مدرسی" تک رسائی ہو گئی ہے۔ تو وہ کم تنخواہوں اور گریڈوں کے لئے رو رہے ہیں۔ "معلمی" کی جو قدر آج کل رہ گئی ہے۔ اسے محسوس تو سبھی کرتے تھے . . اور کرتے ہیں۔ مگر اس پیشے کے روایتی تقدس کے پیش نظر کسی کو جرأت نہ تھی۔ کہ وہ اس موضوع پر بے باکانہ قلم اٹھائے ادب لطیف کی کسی گذشتہ اشاعت میں ایک مضمون بہ عنوان "ٹیچر" نظر پڑا مضمون نگار نے اس مضمون میں وہ سب باتیں مذاحیہ رنگ میں لکھ ڈالی ہیں۔ جو اگر سنجیدگی اور متانت کا پہلو لئے ہوئے ہوتیں تو استاذ برادری مضمون نگار کا حقہ پانی بند کر دیتی اور ان پر وہ لے دے ہوتی کہ انہیں پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ یہ مضمون جب استاد صاحبان نے پڑھا۔ اور دیکھا کہ لکھنے والے صاحب بھی کوئی غیر نہیں ہیں بلکہ "انہی کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں تو خندۂ زیر لب سے کام لیکر چپکے ہو رہے۔ دعائیں مانگنے لگے کہ کہیں خدا مضمون نگار کو اس قسم کا اور مضمون لکھنے کی توفیق ارزانی نہ فرمائے۔ ورنہ ہمارا وقار خاک میں مل جائیگا۔ مجھے اس موضوع پر کچھ لکھنے کی جرأت اسی مضمون کی اشاعت نے دلائی ہے۔ سطور ذیل سے اسی مضمون کی تائید مقصود ہے۔

جب سے انگریزی زبان کا چرچا ہوا ہے۔ لوگوں نے نہ صرف اپنے تمدن اور طریق بود و ماند کو مغربی سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ بلکہ زبان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ ہم جب اپنی مادری زبان میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ تو جب تک انگریزی زبان کے الفاظ بکثرت نہ بولیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنا مافی الضمیر ظاہر ہی نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اب معلم اور مدرس کو ماسٹر اور ٹیچر کہنے لگے ہیں۔ مگر جیس

طرح بائیسکل کو پہلے خاص خاص لوگ استعمال کرتے تھے۔ اور بعد میں اس کا استعمال اتنا عام ہو گیا کہ ہر گلدستہ کا کام بھی اس سے لیا جانے لگا۔ اسی طرح ماسٹر کا لفظ اپنے معنوں وسعت اپنے اندر لئے ہوئے تھا کہ دنیا میں ماسٹر کی بیسیوں قسمیں ظاہر ہونے لگیں۔ مثلاً ٹیلر ماسٹر، بینڈ ماسٹر، اسٹیشن ماسٹر، سکول ماسٹر وغیرہ وغیرہ۔ اب سکول ماسٹر کا کب امتیاز باقی رہا؟ اس لئے اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ جس شخص کو ماسٹر کہہ کر پکارا جا رہا ہے۔ وہ ماسٹر کی کونسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ تو اس میں دقت پیش آتی ہے۔ بہرحال سکول ماسٹر کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو اسے دوسرے ماسٹروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں۔ جس طرح مسلمانوں کے پانچ "ککے" مشہور ہیں۔ اسی طرح ماسٹر کے دو "چے" اس کی خاص علامت ہیں۔ یعنی دو ایسی چیزیں جنکا ابتدائی حرف "چ" ہے۔ ایک چاک دوسرا چاک۔ لیکن اس علامت کے ذریعے پہچاننا تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب کسی ماسٹر کے متعلق شک ہو کہ وہ کس قسم کا ماسٹر ہے اور اس کی جیب کی تلاشی لی جائے۔ اس لئے دوسری علامت یہ ہے کہ جو شخص گفتگو میں تبادلہ، گریڈ اور چھٹیوں کا ذکر کثرت سے کرے اور بیٹھتے اٹھتے سوتے جاگتے انہی چیزوں کی رٹ لگاتا ہو۔ اسکے متعلق وثوق سے جان لیجئے کہ وہ سکول ماسٹر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اگر ماسٹر کی بجائے لفظ استاد استعمال کیا جائے تو کیا ہوگا۔ اسکے متعلق ایک لطیفہ عرض کر دینا کافی ہوگا۔ ایک لڑکا اپنے باپ کے ساتھ کہیں جا رہا تھا راستے میں ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ تم بڑے استاد ہو۔ لڑکا سنکر باپ سے کہنے لگا "یہ بھی کسی سکول کے ہیڈ ماسٹر ہونگے۔ باپ نے کہا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہنے لگا "ماسٹر جی نے بتلایا تھا کہ ہیڈ ماسٹر کے معنے ہوتے ہیں بڑا استاد۔"

لفظ ماسٹر ٹیچر یا مدرس کے زبان پر آتے ہی مسکنت و کسمپرسی کا کچھ ایسا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ گویا ان الفاظ کے معنے ہی یہی ہیں۔ کوئی شخص بی ٹی ہو ایس اے وی ہو اور تنخواہ

بھی معقول پا رہا ہو۔ پھر بھی جب وہ کسی کے اس سوال کے جواب میں کہ آپکا شغل کیا ہے یہ کہے کہ میں ٹیچر ہوں تو سائل کو یہ سنکر اتنی خوشی بھی نہیں ہوتی جتنی کسی کے معمولی کلرک ہونے کی اطلاع پاکر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو خلقت بھی اس کی چنداں قدر نہیں کرتا، دوسرے یہ خود بھی اپنی ہستی کو بلند کرنے سے گریز کرتا ہے۔ غور کیجئے کہ یہ ساری عمر اسی فخر میں پھولا نہیں سماتا کہ فلاں افسر میرے شاگردوں میں سے ہے۔ اس کے سامنے کسی بڑے سے بڑے افسر کی تعریف کیجئے۔ اس موقعہ پر اگر اس کے دل میں حسد نہیں تو رشک ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اسے اپنی کمزوریوں کا کچھ احساس ہونے ہی لگتا ہے اور جھٹ ایک خیال سے اسکا چہرہ تمتما اٹھتا ہے اور اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لئے بے دھڑک کہہ دیتا ہے کہ وہ تو میرے ادنےٰ شاگردوں میں سے ہے پھر اس موقعہ کو یونہی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ لگے ہاتھوں اور بھی کئی بڑے بڑے آدمیوں کو اپنے تلامذہ کے زمرے میں شامل کر کے داد طلب نگاہوں سے مخاطب کی طرف دیکھتا ہے۔ شاگردوں میں کوئی ڈپٹی کمشنر بنا ہوا ہے۔ کوئی وکالت کر رہا ہے۔ اور کوئی ڈاکٹر ہے۔ لیکن اپنا حال یہ ہے کہ اگر ان ترقی یافتہ شاگردوں میں سے کوئی اتفاقاً بیس سال کے بعد اسے آ کر ملے تو یہ حضرت وہیں کے وہیں ہیں۔ گویا یہ ایک ایسی مشین ہیں جس میں شاگرد تیار ہو ہو کر مختلف عہدوں پر پہنچتے رہتے ہیں۔

اس کی آمدنی جس قدر کم ہے۔ اسی نسبت سے خدا نے اسے اولاد کثرت سے دے رکھی ہے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ جن طلبہ کے باپ مدرس یا ٹیچر ہوتے ہیں جب وہ بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور ملازمت کے لئے کرتے ہیں۔ تو استاد ان کے نیچے بجز تعلیم کے سوا کوئی اور کام کیوں کرنے لگے۔ اتنے تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے یہ روپے کہاں سے لاسکے۔ دوسرے محکموں کی نسبت تو سنا ہے کہ وہاں کچھ اہل ... ہوتی ہے۔ اور کچھ "بالائی آمدنی" بھی ہو جاتی ہے یہاں اگر کوئی بہ خوش قسم کا شاگرد مل جائے (جو آج کل بہت کم ملتے ہیں خصوصاً بڑے

…دوں میں، تو ساگ کاٹ ... لگانے کو چارہ "ال" وغیرہ کا سبق بھی ...
یہ عدم اطمینان کا باعث ہوتا ہے۔

...یاں معقول تعداد میں مل جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے اور محکموں والے
... پر حسد کرتے ہیں۔ اگر چھٹیوں کی طرح اس کی آمدنی میں بھی اضافہ
ہو ... پھر تو شاید حاسد اسے جینے ہی نہ دیں۔

گریڈ کے لئے یہ اکثر پیچتا چلاتا رہتا ہے۔ مگر گریڈ آج کل ... عقا
... بالخصوص دیسی زبانوں کی تعلیم دینے والے مدرسین کے ساتھ تو
... نے عجب ستم ظریفی روا رکھی ہوئی ہے یعنی مدرسے میں وہ پڑھاتے
... اردو، فارسی، عربی یا ہندی وغیرہ مگر گریڈ ملنے کے لئے زبان انگریزی
... کوئی امتحان پاس کرنا ضروری ہے۔ اس گریڈ کے لالچ میں آپ دیکھئے گا
... اچھے خاصے مولانا جن کی صورت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زبان انگریزی
... سیکھنے کے سخت مخالف ہو گئے یا کم از کم ان کی طرف انگریزی دانی کو
... کرنا ایک اچنبھا معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی کتابوں کو اس طرح ...
پھرتے ہیں جس طرح کبھی وہ قرآن کی بعض ... ازبر کیا کرتے تھے۔

اس کیلئے دو وقت بہت مشکل ہوتے ہیں ایک وہ جبکہ لڑکے شور
مچانے پر تل جائیں اس وقت یہ میز پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہیں چیخ
چیخ چلاتا ہے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چپ کرانے کی کوشش کرتا ہے مگر
... یہ کارگر نہیں ہوتا۔ اس وقت اس کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ
کاش کوئی دفتر کا کلرک اس وقت میری مشکلات کا اندازہ کرے تاکہ استادوں
کو انہیں زیادہ ملنے پر حسد یا رشک نہ کر سکے۔

دوسرا مشکل وقت اس کے لئے وہ ہوتا ہے۔ جب انسپکٹر صاحب
معائنہ کے لئے آتے ہیں۔ یہ بے چارہ سال بھر لڑکوں کو محنت کرا کرا کے تھک
جاتا ہے لیکن اس کی بدقسمتی سے جو باتیں اس نے بار ہا پڑھائی ہوتی ہیں۔
... موقعہ پر لڑکے بھول جاتے ہیں۔ یا بعض دفعہ شرارتاً نہیں بتاتے
یا ... کی روزانہ ڈائری مکمل نہیں ہے یا رجسٹروں اور بعض نقشوں وغیرہ
میں کچھ فروگذاشت رہ گئی ہے تو ساری کی کرائی محنت پر پانی پھر جاتا
ہے۔ کیونکہ آج کل زیادہ تر نمائشی کام کی زیادہ قدر ہے۔ خاص طور پر

وہ استاد جو تعلیم و تدریس میں خواہ کچھ لیاقت نہ رکھتے ہوں ۔ مگر
... میں نمایاں حصہ لیتے ہوں یا دیہات سدھار وغیرہ میں
کام کیے ... آدھ دفعہ افسروں کو خوش کر چکے ہوں۔ وہی ترقیوں کے
مستحق سمجھے جاتے ہیں محض علمی قابلیت چنداں قابل قدر نہیں ہے
یہی وجہ ہے کہ جب ... ٹریننگ کے لئے کالج میں داخل ہوتے ہیں۔ تو
اس ... کام ان سے بکثرت کرائے جاتے ہیں۔ جو تعلیمی محکمے میں
... ترقی ہو سکتے ہیں۔ بی ٹی اور ... انہیں ... کے ...
... ہوتے ہی ... کہ ... ڈرل ... بھاگ دوڑ غرض سب
کچھ کر سکتے ہیں۔ فارسی اردو پڑھانے والے بھی اب زیادہ تر ... طرز تمدن
کو ... ہوتے ہیں۔ جو انگریزی پڑھانے والوں کا یا دفتر کے بابو
لوگوں کا ہے لیکن مصیبت ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ جو عربی پڑھانے
کے لئے اپنی خدمات پیش ... ہیں ... چہ ... زمانے کا ... اثر
انداز ہو ... عام ... لوگ ہوتے ہیں ...
... بطرف ہوتا ہے۔ دوران ... قطع بھی ... مذہبی ہے ۔
ان لوگوں کو بھی دوسروں کی ... کو ... کھیل کود اور ڈرل
وغیرہ میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ یہ اپنی عربی دانی کا ... ثبوت دیں ...
... ہرگز ... پڑھانے کے قابل نہیں سمجھتا تاوقتیکہ
یہ ٹریننگ کالج میں خلاف ... میں شامل ہو کر ٹریننگ کی سند
نہ حاصل کر لیں۔ ان حضرات کو ڈرل اور کھیل کود میں جو حرکات کرنی پڑتی
ہیں۔ ان کا ان کی وضع سے مقابلہ کیجئے۔ اور پھر آپ اپنی ہنسی کو ضبط کیجئے
ایک دفعہ مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ ٹریننگ کا کورس پورا کرنے کے بعد
جب ڈرل وغیرہ کا امتحان لیا جا رہا تھا تو مولوی لوگوں کو وہ حرکات
دکھانی پڑیں۔ جو ان کے نزدیک بازیگروں کی حرکات سے مشابہ تھیں
ٹریننگ کالج میں آنے سے پہلے تو وہ اس عقیدہ کے پابند تھے کہ مردوں
کو رونکر وغیرہ نہ پہننی چاہیئے جس سے گھٹنے ننگے ہوتے ہوں ۔ لیکن
جب اس کالج کی فضا میں چند دن گذارے تو وہ سب کچھ کرنا پڑا۔ جسے
یہ معیوب سمجھتے تھے۔ آخر کیا کرتے روٹی کا سوال تھا اور روٹی بغیر اوٹی

ملتی نہیں ۔ ؎

ایں ہم اُستاد "ٹیچری" بالائے غم ہائے دگر

دیہات کے استاد اس نازک وقت سے جسے معائنہ کہتے ہیں بہت گھبراتے ہیں ۔ وہاں عموماً انہوں نے مدرسہ کو بالکل اپنا گھر بنا رکھا ہوتا ہے ۔ اکثر سنا گیا ہے کہ استاد صاحب عمارت مدرسہ کے اندر چارپائی پر پاؤں پھیلا کر لیٹے یا بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اور نہایت آزادی سے حقے کے کش لگا رہے ہیں ۔ کہ اسی اثنا میں کوئی افسر معائنہ آ نمودار ہوتا ہے اس وقت جس گھبراہٹ میں وہ ادھر اُدھر دوڑتے اور سنبھلنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ اس قابل ہوتی ہے کہ اس وقت ان کا فوٹو لے لیا جائے ۔

جناب ایم کمار لال ہوش میرٹھی

جذباتِ ہوش

دل مضطرب ہے تیری زیارت کے واسطے　　سب صورتیں ہیں بس اسی صورت کے واسطے

بس کھل چکی زبان شکایت کے واسطے　　یہ تو بنی ہے شکرِ محبت کے واسطے

ساکت ہیں اس طرح سے ترے مُنہ کو دیکھ کر　　آئے نہیں تھے جیسے شکایت کے واسطے

واقف ہے کون دِل کے سوا جورِ یار سے　　محشر میں کس کو لائیں شہادت کے واسطے

ہیں جائے گیر اُن کی نگاہوں میں شوخیاں　　اب کیوں جگہ رہیگی مروت کے واسطے

میری تمام عمر کا سرمایہ ہیں گناہ　　لایا ہوں نذر جو تری رحمت کے واسطے

اچھا تو ہے کہ دِل مرا حیراں بنا دیا　　اک آئینہ ملا نہیں زینت کے واسطے

رکھو نہ ہوش راحت و آرام سے غرض
پیدا ہوئے ہو تم تو مصیبت کے واسطے

مکتبہ اُردو لاہور کی ہردلعزیز مطبوعات

پیغمبر صحرا مشہور نومسلم ہر ہنر شیخ خالد لطیف گابا نے حضور رحمۃ اللعالمین کی پاک و مقدس زندگی کو نہایت دلآویز اور دلنشیں پیرائے میں لکھا ہے۔ ہر ہر لفظ سے عشق رسالت کی خوشبو آتی ہے۔ پیغمبر صحرا اس مشہور عالم کتاب کا دلپذیر ترجمہ ہے قیمت .. عہ

تین پیسے کی چھوکری اس مجموعے میں اردو کے مشہور و مقبول انشاپرداز قاضی عبدالغفار کے نہایت حسین و جمیل اور دلچسپ افسانے شامل ہیں! جن حضرات نے لیلیٰ کے خطوط کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ قاضی صاحب کتنے بے پناہ صاحب قلم ہیں۔ ان افسانوں میں آپ کا پورا زور قلم نمایاں ہے! قیمت .. .. .. عہ

چاند کا گناہ اور دیگر افسانے اس مجموعے میں دنیا بھر کے کامل الفن افسانہ نگاروں کے بہترین مسلّم شدہ افسانے درج ہیں۔ یہ افسانے ابھی تک اردو میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ راجہ مہدی علی خاں نے نہایت محنت و جانفشانی سے انہیں ترجمہ کیا ہے۔ ہر ایک افسانہ نہایت دلآویز اور نہایت دلپذیر ہے۔ قیمت مجلد عہ

کمپنی کی حکومت داستان ہے اس صد سالہ دور پرآشوب کی جبکہ ہندوستان کو سیاسی طور پر محکوم اور اقتصادی لحاظ سے غلام بنایا جارہا تھا۔ ملک کے مشہور ادیب جناب باری (علیگ) نے زور بیان کے ساتھ ساتھ مورخانہ ذمہ داریوں کو بھی مجروح نہیں کیا۔ قیمت مجلد مطلّا ایک روپیہ آٹھ آنے .. عہ

کولمبس دوسری زبانوں میں کولمبس کے متعلق کئی کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ مگر اردو میں اس "ماہر بحریات" پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ خوش قسمتی سے پنڈت میلارام وفا نے یہ کتاب لکھ کر اردو دان حضرات کو کولمبس کے حالات زندگی و بحری واقعات سے روشناس کرادیا ہے! قیمت .. .. عہ

نقش دوام جدید نظم گوئی کے ارتقا اور فلسفیانہ رنگ سخن کا نہایت کامیاب نمونہ۔ ہر نظم نکات کی حامل۔ ہر غزل جذباتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ آپ ہر ایک شعر پر جھوم جھوم جائیں گے۔ عہ

رسالہ ادب لطیف رسالہ ادب لطیف اردو کے ممتاز ترین ماہناموں میں سے ہے۔ جس میں اردو کے نامور ادباء کے نگارشات عالیہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اپنی گوناگوں خوبیوں کے باوجود سب رسائل سے ارزاں ہے۔ یعنی سالانہ قیمت صرف تین روپے چار آنے۔ اس چندے میں ایک ضخیم سالنامہ اور ایک ضخیم افسانہ نمبر بھی مستقل خریداروں کو دئے جاتے ہیں! قیمت فی پرچہ .. ۴؍

منگوانے کا پتہ

مکتبہ اردو ۱۵ سرکلر روڈ۔ لاہور

سفید بال خوشبودار

قسمت کی آزمائش کا سنہری موقعہ

موٹر کا انعام حاصل کریں

ارسطوئے زماں فخر اطباء ہند عالیجناب مولینا محمد عبدالخالق صاحب قبلہ شاہی حکیم راولپنڈی اپنے دست مبارک سے انعامی ٹکٹ نکالینگے

ہم نے سال گذشتہ میں اپنے مجربات کی قیمت نصف کردی تھی جس سے اہل ملک نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اب اعلان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۳۸ء میں ایک نہایت عمدہ موٹر کار فورڈ چھ سلنڈر اور جو تمام پنجاب میں چکر لگا رہی ہے انعام دیجائیگی ذیل کے تحفہ جات کے ہمراہ انعامی ٹکٹ دیئے جاتے ہیں مئی ۱۹۳۸ء میں بمقام راولپنڈی کارخانہ صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ میں نکالا جائیگا۔ آموں کے آم گٹھلیوں کے دام والا معاملہ ہے۔ مفت میں قسمت آزمائیے یہ قیمتی موقعہ پھر ہاتھ نہ آئیگا آج ہی ذیل کے تحفہ جات کا آرڈر دے کر انعامی ٹکٹ مفت حاصل کریں شاہی حکیم قبلہ کا نام نامی ہی ہماری بادیانتداری کی ضمانت ہے ان کی سرپرستی میں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوسکتی بلکہ ہم نے حکیم صاحب قبلہ کے سپرد کردیا ہے۔

سفید بال خوشبودار تیل کا زندہ معجزہ سر پر نافع ... سے قدرتی سیاہ ہو جاتے ہیں ہندوستان کی ایجادات میں قابل قدر اضافہ۔

ہم نے جوہر وسمہ مہندی کو تیل کی شکل میں تبدیل کرنیکا وعدہ کیا تھا جو بارہ سال کے عرصہ میں پورا ہوا ہے آج ہم مسرت کیساتھ ڈنکے کی چوٹ سے اعلان کرتے ہیں کہ وہ شوقین جو بال سیاہ کرنیوالے تیل کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے آج خوشبودار تیل استعمال کرکے اپنے سفید بالوں کو سیاہ کرسکتے ہیں اگر ہمارے اس تیل سے ایک منٹ میں بال سیاہ نہ ہوں تو دگنی قیمت واپس کردی جائیگی ہم دغاباز اشتہار بازوں پر لعنت بھیجتے ہیں قیمت فی شیشی عہ یہ شیشی عرصہ تک کام دے سکتی ہے۔

ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے کمیشن معقول دی جاتی ہے۔

طلائے اعظم (رجسٹرڈ) چالیس دن کے استعمال کیلئے شیشی کی قیمت عہ

ممسک گولیاں (رجسٹرڈ) بارہ گولیوں کی قیمت ایک روپیہ محصولڈاک بذمہ خریدار انتہائی اشیاء کے خریدار کو۔

ملنے کا پتہ: صوفی اینڈ کو (رجسٹرڈ) آزاد منزل نیا کٹڑہ راجہ بازار — راولپنڈی

سول ایجنٹس برائے ضلع لاہور: میاں محمد امین ڈبی بازار متصل سنہری مسجد لاہور

Regd No L-3521

علمی ادبی و تنقیدی ماہوار مرقع

ادب لطیف

مصور — لاہور

ایڈیٹر

چوہدری برکت علی بی اے

فی پرچہ -/4/-

چندہ سالانہ 3/4/-

دارالاشاعت

مکتبۂ اردو - ۱۵ سرکلر روڈ - لاہور

[illegible] چٹان پریس [illegible] روڈ لاہور میں طبع ہوا

مکتبہ اردو کی ہر دلعزیز مطبوعات

پیغمبرِ صحرا مشہور نو مسلم سر شیخ عبد اللہ شیخ خالد لطیف نے پیغمبرِ کائنات کے حالات نہایت دلنشیں اور سلجھے ہوئے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ہر لفظ سے عشقِ رسالت کی خوشبو آتی ہے۔ اردو ترجمہ

پرافٹ آف دی ڈیزرٹ مترجمہ خالد لطیف گابا مجلد و مطلا دو روپے

کمپنی کی حکومت داستان ہے اُس عہد سیاہ و پرآشوب کی جب ہندوستان کو سیاسی طور پر محکوم اور اقتصادی لحاظ سے غلام بنایا جا رہا تھا۔

مترجمہ اکیڈیب باری مجلد ڈیڑھ روپیہ

چاند کا گناہ اور دیگر افسانے اس مجموعہ میں دنیا بھر کے نقادانِ ادب کے بہترین تسلیم شدہ افسانے شامل ہیں۔ جو اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔

راجہ مہدی علی خان مجلد مطلا دو روپے

تین پیسے کی چھوکری (اور دیگر افسانے) افسانہ نگاری کے شائق اور افسانوں میں حقیقی روح دیکھنے والوں کے لئے ان افسانوں کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔

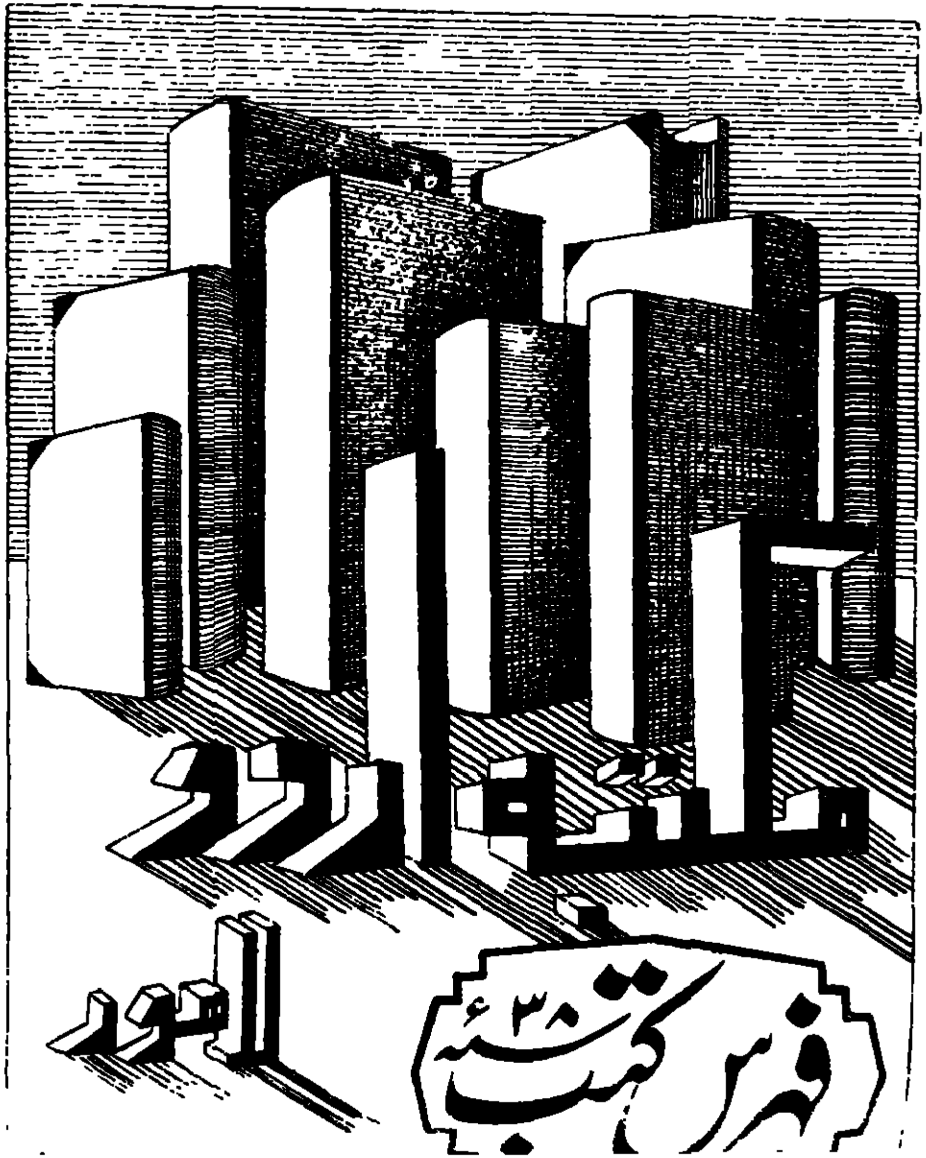
قاضی عبد الغفار خان (مصنف لیلیٰ کے خطوط) مجلد ڈیڑھ روپیہ

آہنگِ رزم ہندوستانی زبان میں جنگی ترانوں کا پہلا مجموعہ۔ شجاعت اور غیرت کے جذبات بھڑکانے والی کتاب۔ دوسرا ایڈیشن۔ نئی نظمیں بھی شامل ہیں۔

وقار انبالوی مجلد آٹھ آنے

دنیا کی حور اور دیگر افسانے یہ کتاب خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ بالکل ہماری معاشرت و تمدن کے مطابق ہے۔ طبیعت پر بجز و اعتدال کا اثر قبول کرتی ہے۔

کوثر چاندپوری مجلد ایک روپیہ



منظور کردہ محکمۂ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد ریاست حیدر آباد دکن

مکتبۂ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

ادبِ لطیف

رسالہ • لاہور

جولائی ۱۹۳۸ء

ادارۂ تحریر

چودھری برکت علی بی۔ اے

میرزا ادیب بی۔ اے

مقامِ اشاعت

مکتبۂ اردو لاہور

مکتبہ
ابوالمعظم محمد شریف عباسی لاہور

سالانہ چندہ مع ضخیم سالنامہ
و افسانہ نمبر
عہ علاوہ محصول ڈاک

چندہ
ممالک غیر سے
آٹھ شلنگ

مندرجات

جلد ۷ | بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۸ء | نمبر ۵

[illegible] پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور سے چھپوا کر ادب لطیف [illegible] سے شائع کیا

نذرِ اوّلین

سنسکرت آمیز ہندی کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ ۔ متعدد بار یہ سوال صحافتی فضاؤں میں گونج چکا ہے کہ آخر ہماری فلم کمپنیاں سنسکرت آمیز ہندی کی اشاعت و ترویج پر اس قدر کیوں مصر ہیں، کونسا جذبہ ہے جو صنعت فلم سازی کے ارباب حل و کشاد کو اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ ہندوستان کی مشترکہ زبان سے بالکل قطع تعلق کرتے ہوئے اپنے کرداروں سے وہ زبان استعمال کرائیں جو ہندی کی بجائے سنسکرت آمیز ہندی کہلانے کی زیادہ مستحق ہے ۔ اس تنگ نظری میں ہندو ذہنیت اور اس انتہائی مکروہ فرقہ پرستی کے خلاف مسائل پر اکثر مسلسل مضامین لکھے جا رہے ہیں سینما وں کے ناظرین بار بار اس بات میں شکوہ و شکایت کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن اس تمام مخالفت شور و شغب اور گلہ و شکایت کے باوجود ارباب فلم سازی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی ؛ آخر وہ کونسے مصالح مخصوصہ ہیں جن کی بنا پر وہ مسلمان فلم ساز کمپنیوں کے محترم مالکوں کا مقصد حیات بن چکا ہے ؟ ہزاروں نے فلم جوالا دیکھی ہوگی، اور سینکڑوں نے اسکی زبان کو کتنے سمجھا ہوگا ؟ اور یہ ظاہر بات ہے کہ فلم کے ایکٹروں اور کرداروں اور دیگر حضرات کے نام جو آتے ہیں تو وہ بھی ناگری رسم الخط میں ! یہ اردو دشمنی کا بین ثبوت نہیں تو اور کیا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ دو چار کو چھوڑ کر باقی فلم کمپنیوں کے ارباب محترم کا یہ شیوہ خصوصی ہو چکا ہے کہ وہ جہاں تک ان کی کوششوں کا تعلق ہے فلموں کے ذریعے سنسکرت آمیز ہندی کی نشر و اشاعت کریں ۔ موجودہ دور میں فلم کو ہماری زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ کسی زبان کی اشاعت کا بہترین ذریعہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔ اور اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے کمپنیوں کے متعصب مالک ایکٹروں کی زبان سے اس قسم کی زبان استعمال کراتے ہیں جسے اردو کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں :

فلم جوالا اپنی چند ایک خصوصیات کے لحاظ سے قابل قدر فلم ہے ۔ اور ہم خوش ہیں کہ ہماری فلم کمپنیاں ترقی کے ایک خاص میدان میں پہنچ چکی ہیں اور اگر یہی رفتار رہی تو یقیناً مستقبل میں یورپ کی نہایت ترقی یافتہ فلم کمپنیوں کے شاہکاروں سے بے نیاز ہو جائینگے ۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہی کمپنیاں وہ زبان استعمال کر رہی ہیں جسے ہندوستان میں مشترکہ زبان کی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ وہ چند ایک مخصوص حلقوں کی زبان ہے ۔ جب زبان ہی پبلک کے فہم سے بالا تر ہو تو فلم کی کامیابی معلوم ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ جوالا اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک کامیاب فلم ہے صرف زبان کی بے ہودگی کے باعث سخت ناکام رہی ۔ ہمارے ایک عزیز دوست جناب تنویر نقوی نے تو جوالا کی فلم دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ اس کے کردار اگر تمام ڈرامے میں صُمٌّ بُکْمٌ رہتے تو اچھا تھا ۔

فلم کمپنیوں کے ارباب کو اگر ہندوستان کے مفاد کا خیال نہیں تو کم از کم ذاتی مفاد کا خیال ہی رکھیں ! اردو ہی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اور جو کمپنی اس زبان سے بے نیازانہ عمل کریگی وہ یقیناً حقیقی مقبولیت نہیں حاصل کر سکے گی ؛ یہ وہ نکتہ ہے جسے فلم کمپنیوں کے مالک نہ سمجھتے ہیں ۔ پھر اردو دشمنی کا مظاہرہ کس بات پر مبنی ہے ؟ ظاہر ہے اس کی وجہ صوبائی " تعصب " کے سوا اور کچھ نہیں ! وہ صوبائی تعصب کتنی ہولناک مصیبت ہے ۔ یہ آپ جانتے ہیں !

اس نمبر کے مضامین ۔ اس شمارے کا سب سے پہلا مضمون ہمارے محترم نقاد جناب شیدا کے قلم سے ہے ۔ جناب شیدا نے منشی پریم چند مرحوم و مغفور کے عاشقانہ افسانوں کا نہایت کامیابی کیساتھ تجزیہ کیا ہے ۔ !

پتر پر پریمی ۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب سید علی عباس حسینی ایم اے کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے ۔ افسانے میں ایک طرفہ لطافت ہے ۔ جو شروع سے لیکر آخر تک چھائی ہوئی ہے ۔ سید صاحب بہت جلد اپنے افسانوں کا مجموعہ

" باسی پھول " اور دیگر افسانے " کے نام سے مکتبہ اردو کے زیر انتظام عنقریب اشاعت پذیر ہو جائیگا !

گیت ۔ یہ وجد آور دلآویز گیت ہمارے دوست سید تنویر نقوی کے قلم سے ہے ! تنویر صاحب ایک کامیاب ڈرامانویس ہیں ۔ اور گیت لکھنے میں تو خاص صلاحیت کے مالک ! یہ گیت لاہور ریڈیو سٹیشن سے نشر ہو کر بہت مقبول ہو چکا ہے !

منشی عزت علی نے ریڈیو خریدا۔ ہمارے قابل احترام بزرگ شیخ عباد اللہ صاحب نے اس مزاحیہ مضمون میں دلچسپی کا ایسا سامان مہیا کر دیا ہے کہ قاری مضمون ختم کرنے کے بعد آرزو کرتا ہے کہ کاش شیخ صاحب اور لکھتے!

کیا ہم امید رکھیں کہ شیخ صاحب قبلہ اس سلسلے کو جاری رکھیں گے؟

اس شمارے میں محترمہ زیب گولڈ سمیڈ لسٹ کی ایک کامیاب نظم شائع ہو رہی ہے! ہم محترمہ موصوفہ کے اس عنایت کے لئے شکر گذار ہیں!

علامہ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ہمیں متعدد مضامین نظم و نثر موصول ہوئے تھے لیکن اس وقت چونکہ افسانہ نمبر زیر ترتیب تھا اس لئے ہم نے مضمون نگاروں کی اجازت سے وہ مضامین اخبار احسان کے اقبال نمبر میں درج کرا دیئے۔ امید ہے مضمون نگار حضرات اپنے مضامین کی اشاعت سے باخبر ہو چکے ہونگے۔ اس نمبر میں دو نظمیں ڈاکٹر مرحوم و مغفور کے متعلق شائع ہو رہی ہیں۔

اس نمبر میں "دیر ادب لطیف" کا ایک غیر مکمل افسانہ شامل ہو رہا ہے۔ اور جیسا کہ افسانے کے اختتام پر درج ہے۔ ہر مضمون نگار اس کی تکمیل میں حصہ لے سکتا ہے! امید ہے یہ سلسلہ بہت دلچسپ رہیگا!

فریب تخیل ۔ اس عنوان سے ڈاکٹر فانس کے زندہ جاوید رومان نگار تھیو فائیل گاشیر کا ایک نہایت دلچسپ دل آویز رومان ——

( ) شائع ہونا شروع ہو جائیگا! افسانہ غالباً تین اقساط کو محیط ہوگا! اس کا ترجمہ اردو کے ہونہار مترجم جناب احسان بی اے کے قلم کا رہین منت ہے!

مدیر ساقی کو صدمہ ۔ ہمیں یہ سنکر بہت رنج ہوا کہ ہمارے معزز ہمعصر ساقی کے مدیر محترم جناب شاہد بی اے (آنرز) کی رفیقۂ حیات دنیا سے رخصت ہو گئی ہیں! ہمیں اس صدمہ جانکاہ میں اپنے محترم دوست سے دلی ہمدردی ہے خدا مرحومہ کو مغفرت میں جگہ دے۔

افسانہ نمبر دوسروں کی نظر میں ۔ افسانہ نمبر کے متعلق ہمیں متعدد رائیں موصول ہوئی ہیں جن کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

علامہ برجموہن کیفی دتاتریہ فرماتے ہیں: تسلیم۔ ادب لطیف کا افسانہ ملا۔ بہت ممنون ہوا۔ آپ کی کوشش نہایت کامیاب رہی جس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کیا مقالات کیا افسانچے اور کیا منظوم افسانچے سب دلفریب اور سبق آموز ہیں۔ آپکی نظر انتخاب و حسن ترتیب و لیاقت داد چاہتی ہے۔

(نیاز کیش۔ برجموہن دتاتریہ کیفی)

. . . . ادب لطیف نے اس سال ایک ضخیم اور پر مغز "افسانہ نمبر" شائع کر کے اردو جرنلزم میں افادیت کی ایک حیرت انگیز مثال قائم کی ہے۔ ظاہری و باطنی محاسن کے لحاظ سے یہ نمبر تمام دیگر افسانہ نمبروں سے جو آج تک ہندوستان میں شائع ہوئے ہیں بازی لے گیا ہے۔

یہ امر موجب مسرت ہے کہ افسانہ نگاروں میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی ہے لیکن ان کی تحریر کی پختگی۔ خیال آفرینی۔ مطالعۂ حیات اور قوت انجذاب پچھلے سال دو سال کے رشحات قلم کی نسبت کہیں زیادہ پر از کشش دلآویز اور کیف افروز ہے۔

ہر افسانہ میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہے۔ اسلئے اپنی پسند کے افسانے کا انتخاب میرے لئے ممکن نہیں ہے۔

اس نمبر کے افسانوں میں "قنوطیت" "مایوسی اور حزن و ملال" کا عنصر غالب طور پر نمایاں ہے لیکن یہی جز سارے افسانہ نمبر کی کامیابی کا بالبداہت ثبوت ہے۔ آج کل بیکاری اور بیماری ہندوستان کے خاص مسائل حیات ہیں قریباً ہر نوجوان ان سے دوچار ہے صحیح ادب وہی ہوتا ہے جو زندگی کا آئینہ دار ہو۔ چنانچہ افسانہ نمبر کی کہانیوں میں بیکاروں بیماروں اور حرماں نصیبوں کی نفسیات کا تجزیہ نہایت خوبی سے کیا گیا ہے جس نتیجہ پر افسانہ نگار پہنچے ہیں بہت ممکن ہے کہ مبصر حضرات اس کو نشتر نظر آجائیں لیکن یہ ادیب کا کام نہیں کہ وہ کسی فعل کے حسن و قبح پر بحث کرے۔ اسنے تو اپنے افسانہ میں صرف یہ دکھانا ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے "کیا ہونا چاہیئے" سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بہرحال "افسانہ نمبر" میں ادبا نے جو نقشہ موجودہ سوسائٹی کا کھینچا ہے وہ بالکل صحیح اور قابل ستائش ہے ■

منظوم افسانے بھی اچھے ہیں
فن افسانہ پر مضامین بھی بہت باموقع اور وقیع ہے۔
(شبلی بی کام)

جناب رشید بی اے

منشی پریم چند کے عشقیہ افسانے

ادب اردو میں یہ ایک ناقابل شکست سا رواج ہو چکا ہے کہ ادیب اپنی زندگی میں اپنے رسوخ۔ اور کچھ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر کچھ نہ کچھ شہرت حاصل کر لیتا ہے۔ اور اپنی ذہنی وقلبی کوششوں کا معاوضہ وصول کر لیتا ہے۔ مگر بالجبر رسائل وجرائد اُسکے کارناموں پر شاندار ریویو لکھتے ہیں۔ کتابوں کی خرید کی سفارش کی جاتی ہے لیکن اس ہمدردی اور اس ادب پروری کا منتہائے کمال یہیں تک ہوتا ہے۔ ادیب نے آخری سانس لی اور پھر "آہ فلاں" "وائے فلاں" کے سے عنوانوں کے ماتحت ایک زمانہ آہ وبکا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ دوسرا دور ہے۔ اس آہ وزاری کی صدائے بازگشت کچھ وقت کیلئے تو کانوں کے ذریعے دل کو زخمی کرتی رہتی ہے۔ اور نہ معلوم پھر کونسی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ یا کونسے گوشے میں محبوس ہو جاتی ہے۔ کہ اسکی بازیافت یا اُس کی آزادی کی توقع سراب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی طویل وقفوں کے بعد کبھی کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ جیسے کسی ویرانہ؟ جھونپڑے سے گاؤں میں کسی بچے کی نیم شبی چیخ ہو جو اس کی ماں کی تھپکی کی نذر ہو جاتی ہے۔ یا اس سکوت نیم شبی کی وسعت میں گم ہو جاتی ہے کیا اردو کے لئے یہ ٹریجیڈی سے کچھ کم ہے؟ حشر کا کیا حشر ہوا کس قدر شور وغوغا بلند ہوا کتنی قراردادیں پاس ہوئیں کس قدر اپیلیں شائع ہوئیں اور کیا ہوا؟ جلسے۔ قراردادیں اور بس۔ یہی حال منشی پریم چند کا ہوا۔ اپنی زندگی میں وہ شہرت کے مالک تھے۔ اردو کے جلیل القدر افسانہ نگار تھے۔ انعام بھی انہوں نے حاصل کیا۔ اُن کی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ اور رسالے بھی انہیں کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہوا۔ لیکن اُنکی موت سب کچھ ساتھ لے گئی۔ اب منشی پریم چند کا نام صرف انکی تصنیفوں پر ملیگا۔ اور کہیں ڈھونڈھیئے تو عنقا۔ یہ نا ممکن نہیں کہ آئندہ نسلیں انکی وہی تجدید وتکریم کریں۔ جسکے مستحق ہیں اور انہیں اسی مقام پر پہنچائیں جو اُنکے لئے موزوں ہے لیکن ہماری موجودہ بے حسی اور اسکا رد عمل عوام کی قدر ناشناسی ایک ستم ہے جسکا ازالہ استداد زماں ہی سے ہوگا جسپر رحم رکھنے والی خوش نصیب آئندہ نسلیں ہی ہونگی کسقدر افسوسناک امر ہے کہ یورپ میں ایک اچھے مصنف کے دس بیس نقاد نکلیں۔ اور کہاں یہ حالت کہ اردو میں دس مصنفوں کے لئے ایک نقاد بھی نہ نکل سکے۔ جو اُن کی قابلیتوں کو عوام کے سامنے لا کر سکھے اور اُنسے وہ کچھ وصول کرے۔ جو کچھ وصول ہونا چاہیئے تھا۔

منشی صاحب سے ہیں اُن کی "Anti-Illusion" سرگرمیوں سے کد تھی لیکن اردو افسانہ کے لئے جو کچھ وہ کر گئے۔ اسکا اعتراف نہ کرنا۔ اخلاقی جرم ہے۔ وہ اردو افسانہ کے مربی تھے۔ انہوں نے اُسے حضیض حقارت سے اٹھایا۔ اور بام رفعت تک پہنچانے کی ایک جنونی حد تک کامیاب کوشش کی۔ اور اگر صیاد اجل کا جان لیوا تیر کچھ دیر اور ترکش ہی میں رہتا تو منشی صاحب کا شہباز قلم اردو افسانے کے ننھے سے پرندے کو ایک ایسے آشیانہ پر لے جاتا جہاں یورپ کے سبک بال وتیز پرواز عقاب بیٹھے ہیں۔ اور ان عقابوں کو بھی کبھی اور آشیانہ کی تلاش کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اردو دنیا نے منشی صاحب کو "فطرت نگار" کے خطاب سے نوازا ہے۔ اور آپ اُس کے مستحق بھی نظر آتے ہیں۔ آپکے افسانوں میں تنوع موضوع کا ایک غیر مختتم سلسلہ اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ کہ آپ افسانہ کی روح پہچان چکے ہیں۔ آپ کی جزرس۔ تیز بیں۔ عقابی نگاہیں۔ زندگی کے اسرار ورموز

کے پردوں کو چیرتی ہوئی دل کے اندر جا پہنچتی ہیں۔ اور وہ کچھ نکال لاتی ہیں۔ جو موجودات کی حرکات و سکنات میں مستور ہوتا ہے۔ آپ حقیقت پرست معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت اور افسانویت کو کچھ اس طرح مزوج کر دیتے ہیں کہ درمیان میں کوئی امتیازی لکیر کھینچنا انتہائی طور پر مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ خیال رہتا ہے کہ وہ افسانہ نگار ہیں۔ انہیں اپنے گرد و پیش کو افسانے کی صورت میں پیش کرنا ہے۔ بغیر اس کے کہ ہر دو میں سے کسی ایک کو مجروح کیا جائے۔ انہیں معلوم ہے کہ افسانہ اور حقیقت میں فرق ہے لیکن لگاؤ بھی ہے۔ چنانچہ اس لگاؤ اور اس فرق کو وہ کچھ ایسے طریقے سے نبھا جاتے ہیں کہ اردو کے بہت سے مقتدر افسانہ نگار بھی اتنی کامیابی سے نہیں نبھا سکتے۔ لیکن اس حقیقت پرستی نے کہیں کہیں آپکو گمراہ بھی کیا ہے۔ اور بعض افسانے محض واقعات بنکر رہ گئے ہیں۔ اور ان میں افسانویت کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے۔ کردار نگاری بعض مقامات پر آپکی نادر معدوم ہوتی ہے۔ جذبات علوی ہوں یا سفلی، مذکری ہوں یا تانیثی۔ کردار پیر ہو یا برنا، خطیب ہو یا بھاری، سرمایہ دار ہو یا مزدور۔ دیہاتی ہو یا شہری۔ تہذیب نو کا غازہ زینت رخسار کئے ہو یا قدامت پرستی کے عنبر میں اٹا ہو۔ رومان پرست ہو یا زاہد خشک۔ آپ اپنے افسانے کی ضروریات کے پیش نظر سے کچھ اس طور پر عریاں کر کے رکھ دیتے ہیں کہ شک کی گنجائش صرف اسقدر رہ جاتی ہے جسقدر ایک صحیح و سالم انسان کو اپنے وجود کی موجودگی کے متعلق ہو سکتی ہے لیکن جیسے کہ بڑے بڑے آدمیوں سے بڑی بڑی غلطیوں کا سرزد ہونا ممکن ہے "منشی صاحب" اُس کی تصدیق کرتے ہوئے بعض اوقات ایک بیاد Caricature پیش کر جاتے ہیں کہ ہمیں شک ہوتا ہے کہ منشی صاحب کے فطرت نگار دماغ کا نتیجہ نہیں۔ ہاں آپ اُن محاکات سے اکثر مجتنب رہتے ہیں۔ جنہیں ہمارے بعض یورپ زدہ افسانہ نگار فطرت پرستی کے غلط نام سے پکارتے ہیں۔ اور اُسے مغلوبہ شاعری کہتے ہیں۔ خواہشات کی آپ کے ہاں جگہ نہیں اور اگر کہیں آپکے افسانوں کا مرکز تحریک بہیمیت و نفس امارہ بھی ہو تو آپ مسطور پر کمال سے اُس کی نمائش نہیں کرتے۔ آپ اپنے تمام احساسات کو بیدار کر کے قلم اٹھاتے ہیں۔ ایک بین السطور عکس تخیلی طور پر قاری کی ذہنی فضا میں داخل کر دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات نہیں ایک اشارہ کے دامن میں چھپا دیتے ہیں۔ اور یہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن آپکو محاکات نگاری کا وصف بھی ہے۔ محاکات نگاری آپکی حقیقت پرستی کی ایک شاخ ہے۔ جس کا استعمال منشی صاحب اکثر زائد طور پر کر گئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ بات آپکی کہانی کو کمزور کر جاتی ہے۔ ایکشن رک جاتا ہے۔ اور بعض اوقات افسانہ بھی ایک واقعہ بن جاتا ہے۔

منشی صاحب دم زدن میں افسانہ نگار سے مورخ بنجاتے ہیں۔ اور ہم یہ محسوس کرتے ہیں منشی صاحب دنیا کے افسانہ سے الگ ہو کر فضائے شعر میں داخل ہو گئے ہیں لیکن یہ فریب یا خود فراموشی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ آپ لوٹ آتے ہیں لیکن تیر ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے اور نشانہ پر جا پہنچتا ہے۔ اور افسانہ کو کسی حد تک مجروح کر جاتا ہے کہیں کہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ منشی صاحب کہانی کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اُن کے ہاں جذبات کی فراوانی ہے۔ جذبات ہی میں کہانی ہے۔ آپ اس میں اتار چڑھاؤ دکھاتے ہیں اور اس کو انجام پر پہنچاتے ہیں۔ اسلئے ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے افسانوں کا بیشتر حصہ ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتا۔

ہم منشی صاحب کے افسانوں کو تین حصوں پر تقسیم کرینگے۔ روزمرہ زندگی کے واقعات جو عشق کی چاشنی سے محروم ہیں۔ سوشل اصلاح جس میں دیہات سدھار کو کافی دخل ہے۔ مذہبی دقیانوسی و توہم پرستی کیخلاف جہاد۔ دوسرے حصہ میں زندگی کے وہ واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ جنہیں عشق و محبت کی نیرنگیاں رقصاں ہیں عشق ادب کا سرمایہ ہے۔ کیونکہ ادب دنیا کا ایک تخیلی عکس ہے۔ اور دنیا کیا ہے عشق کی مختلف حیثیتوں کی ایک بکھری ہوئی داستان۔ تمام زندگی عشق ہی کے اجزا منتشرہ ہیں۔ جو مختلف ماحول و مختلف مقامات کے زیر اثر مختلف جسم حاصل کر چکے ہیں۔ اردو کے بعض افسانہ نگار اصحاب کا متاع ادب ہی عشق ہے۔ اُن کی فنی قابلیت کی پرواز کا محور عشق ہے

ان کی رنگین تحریر کا محرک عشق ہے۔ اور یہ وہ عشق ہے۔ جو کسی باغ، کالج، سینما یا کلب سے شروع ہوتا ہے۔ اور اکثر اوقات شادی پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار اسے عشق کہتا ہے اور کالج سے نکلے ہوئے یا کالج میں پڑھنے والے اسے عشق سمجھتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں اس عشق کے اجزائے ترکیبی میں ہوائے نفس کا حصہ بیشتر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے متعلق کسی تفصیل میں جانا غیر ضروری اور طویل بحث چھیڑنے کے مترادف ہے۔ یہاں صرف اسی قدر کافی ہوگا۔ کہ افسانوں کا پچانوے فیصدی حصہ غیر ممکن عشق کی تصویر ہوتا ہے۔ زندگی جس کی تصویر ان افسانوں میں نظر آتی ہے۔ وہ عقلی اور عملی طور پر ایک ناممکن زندگی نظر آتی ہے۔ منشی صاحب کے وہ افسانے جن میں عشق کی چاشنی نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے ایک استثنا خیال کئے جانے چاہئیں۔ ان کی محبت کالج، سینما، کلب یا کسی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی وہ الٹ پھیر کھا کر شادی پر ختم ہوتی ہے۔ ان کی محبت گھر کی چار دیواری میں بڑھتی پھولتی ہے۔ پھر مرجھا جاتی ہے۔ اور اکثر شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور اسی بعد از ازدواج محبت کے نتائج و عواقب اور اس کے عوائد و فوائد اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔ اور اگر کہیں یہ محبت کا بیج شادی سے قبل پڑ بھی جائے تو وہ محب و محبوب کو شادی کی زنجیروں میں نہیں جکڑتے۔ ممکن ہے رومان پرست نوجوان اسے اپنے لئے ایک سخت سزا سمجھیں۔ لیکن منشی صاحب جانتے ہیں کہ دنیائے محبت میں شیرینی تو ہے۔ لیکن تلخی کچھ اس سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور منشی صاحب جہاں اپنے تمام قوا کی مجموعی کوششیں بروئے کار لاتے ہیں۔ وہاں افسانہ کو وہ کچھ بنا جاتے ہیں جو اُسے بننا چاہئے۔

افسانے کے نقاد کو مختصراً چار چیزوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہئے۔ پہلی اور اولی ترجیحت ہے۔ دوسرے واقعہ بیان شدہ کی ممکنیت۔ تیسرے کردار نگاری اور چوتھے دلچسپی۔ ہم یہاں یہ غیر مبہم الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ افسانے کے ان اجزائے ترکیبی یا ان خدوخال کی علم الریاضی کی سی صحت و پیمائش سے یا کوئی سانچے میں ڈھلی ہوئی تعریف ناممکن ہے۔ تاہم کار افسانوں کا وسیع مطالعہ ہمیں ان کے اجزاء کو ذہنی گرفت میں لانے میں مدد دیتا ہے۔ اور اس طرح مختلف النوع افسانے پڑھ کر ہم اپنے لئے ایک قریب قریب صحیح نمونہ قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہیئت ان تمام اجزاء کا ایک مرکب ہے۔ اسلئے ہمیں ہیئت کا خاص اہتمام سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہ بات تسلیم کرنی پڑیگی کہ ہر چیز کی تجسیم میں ایک نوع کا تناسب لابدی ہے۔ ورنہ یا تو تقیہ کا رنگ ہوگا یا بھدا پن۔ یہی افسانہ کی روح ہے۔ جس طرح جسم انسانی میں تناسب اعضاء حُسن جسمانی کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اسی طرح افسانوں میں بھی اُن کے اجزائے ترکیبی کا متناسب ہونا اور اس تناسب کی سطح پر حسن کی چمک بھی ضروری ہے۔ ہمیں جو چیز افسانوں میں دیکھنی ہے وہ یہ ہے کہ افسانہ نگار جو واقعات بیان کرتا ہے اس کی مختلف کڑیاں کہاں کہاں ملی ہیں اور کیا ان کا یہ ملاؤ افسانے کے ایکشن میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ڈال رہا؟ اور آیا یہ واقعات جو معمولی طور پر ایک واقعہ بن گئے ہیں۔ ان میں کوئی حصہ ایسا تو نہیں جو کہیں جوڑ نہیں کھاتا۔ اور اگر جبراً اسے ملایا بھی گیا ہے تو اسکا نتیجہ کیا ہوا ہے۔ اور آیا یہ مختلف واقعات اپنے اپنے موزوں مقامات پر رکھے گئے ہیں۔ یا یونہی بکھیر دیئے گئے ہیں۔ جنہوں نے دریمی سی پیدا کر دی ہے۔ اور ہمیں یہ دقت محسوس ہوتی ہے۔ کہ واقعات کی کڑیاں ملاتے رہیں؟ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ واقعات کا بیان کسی ایسے طریق سے تو نہیں ہوا جیسے جابجا غیر ضروری اجزاء داخل کر دیتے ہیں جو بار سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور افسانے میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتے۔ یہی چیزیں ہیں جو مختصراً افسانہ کی کائنات ہیں جن سے دنیائے افسانہ آباد کی جا سکتی ہے۔ اور جن سے دور رہ کر دنیائے افسانہ سونی سی نظر آنے لگتی ہے۔ .... منشی صاحب کے افسانوں کے تمام مجموعے ہمیں انتہائی کوشش کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکے لیکن جو مواد اکٹھا ہوا۔ اس میں بھی تنوع کا یہ عالم ہے کہ اگر ہر موضوع کے ایک دو افسانے لیکر ان پر جداگانہ تنقید کی جائے۔ تو رسالے کا تمام حصہ اسی میں کھپ جائے۔ اس لئے ہم صرف

انہیں افسانوں پر اکتفا کریں گے۔ جن میں عشق کی چاشنی ہے جو محبت کی فضا میں پھلتے پھولتے ہیں اور امیدوں کے آبحیات سے ان کی آبیاری ہوتی ہے۔ لیکن یاس کی خزاں انکو پھل پھول تباہ کر جاتی ہے لیکن جیسے کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مواد پورا موجود نہیں۔ اسلئے تصویر کے تمام خدوخال۔ لائٹ اور شیڈ سامنے نہیں آسکیں گے تاہم کوشش کی جائے گی۔ کہ حصہ زیادہ سے زیادہ صاف اور غیرمبہم نظر آئے۔

قبل از ازدواج یہ یوں سمجھئے کہ رومانی عشق کا نمونہ ہمیں "کشمکش" میں ملتا ہے کشمکش کیا ہے۔ دو ایسی ہستیوں کے عشق ناکام کی ایک مسخ شدہ تصویر جنکے نزدیک انسان کی شرافت پیدائش سے نہیں اطوار سے ہوتی ہے۔ کہانی یہی ہے کہ شردھا۔ کو کلا طوائف کی لڑکی جو تحصیل علم کی دلدادہ ہے۔ اتفاقاً۔ بھگت رام ایک چمار نوجوان سے جو ایم۔ اے میں پڑھتا ہے۔ کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح بھگت رام اسکا والا و شیدا ہو جاتا ہے۔ اور بات شادی تک پہنچ جاتی ہے لیکن آخری وقت پر یہ رشتہ الفت ٹوٹ جاتا ہے۔ اور بھگت رام اس بات کے زیر اثر کہ "عنوان کا اثر زائل نہیں ہو سکتا۔ شادی سے انکار کر دیتا ہے۔

ہمارے خیال میں یہ افسانہ کامیاب نہیں ہئیت کا خیال تو شاید امر میں رکھا ہی نہیں گیا۔ اور افسانہ ایک مارواڑی سیٹھ کی مانند ہے جو موٹا۔ بھدا۔ پیٹ بڑھا ہوا اور حرکت کرنے کے قابل نہیں اور اگر حرکت کر سکتا ہے تو سہارا لیکر۔ غیرضروری تفاصیل کی بھرمار۔ افسانے کے ڈھانچے کا بے ڈھنگا پن۔ عدم تناسب۔ واقعات کا ایک نات ابل وصل فصل۔ اسے ناکام بناتا ہے۔ اور کردار نگاری میں بھی یہاں منشی صاحب افسانے کے ہیرو کو ایک ناقابل فہم و ناممکن شخصیت بنا گئے ہیں افسانہ اپنے عنوان کو جھٹلاتا ہے۔ تمام افسانے میں کشمکش کا شائبہ تک موجود نہیں۔ بھگت رام کی حرکات و سکنات سے اسکے اطوار گفتگو کسی سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ اسکے اندر کوئی کشمکش جاری ہے ہمیں اس کشمکش کا پتہ تب چلتا ہے۔ جب شادی کے ابتدائی مراحل طے ہو چکے ہیں۔ دو چار دن کو شادی ہونے والی ہے۔ اور بھگت رام شردھا کو کاندھے پر دو پگنیں لئے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھتا ہے۔ اور شردھا سے بیان کی سلامتی کی بھینٹ مانگتا ہے۔ اس کیفیت کا یک بیک ظہور جب پہلے کوئی اشارہ تک موجود نہیں۔ بے محل۔ نامعلوم ہوتا ہے۔ اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ منشی صاحب نے اسے یہاں ٹھونسا ہے۔ اور اس طرح ٹریجیڈی بناتے ہوئے آپ ہیرو کے کیریکٹر کو بالکل نابود کر گئے ہیں۔ ہم ایک دھکا سا محسوس کرتے ہیں جو شخص ابتدائی افسانہ میں ایک ناآشنا لڑکی کی پاکیزگی نفس پر حملہ کرنے کی وجہ سے دوسروں کو ملامت کرے جب وہ جانتا ہے کہ وہ لڑکی ایک طوائف کی لڑکی ہے اور جب اسکے ماں باپ وہاں شادی سے انکار کریں تو وہ شردھا ہیروئین سے کے سامنے زہر کھا لینے کے جذبہ کا اظہار کرے۔ اسے یہ طریق کار زیب نہیں دیتا۔ ہم یہ فرض کرنے پر مجبور ہیں کہ بھگت رام کا یہ طریق کار محض ریاکارانہ تھا۔ وہ شردھا کے جذبات سے کھیلنا چاہتا تھا۔ اور کتنا عرصہ کھیلتا رہا لیکن منشی صاحب ایسا کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کی پہلی گفتگو اس الزام کی تردید کرتی ہے۔ وہ ماں باپ کے سامنے بجاجت کرتا ہے۔ خوشامد کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اگر اس کی شادی وہاں نہ ہوئی تو وہ اور کہیں نہیں کرے گا منشی صاحب چودھری و چودھرائن کے قدامت پسند طبیعت شردھا کی خدمت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں لیکن بھگت رام ایک تعلیم یافتہ نوجوان جسے تین سال شردھا کو دیوی سمجھا ہو آخری وقت پر خون کے مسئلہ میں الجھ کر یہ طریق اختیار کرے ہمارے ممکن ماننے کو تیار نہیں۔ یہ محض ٹریجیڈی بنانے کے لئے کیا گیا ہے۔ اور عام رسم سے علیحدہ رہنے کے لئے کیا گیا ہے۔ لیکن منشی صاحب اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ کہ انکے افسانے کی ساخت و تعمیر خود فن افسانہ کی ایک ٹریجیڈی ہے۔ چودھری و چودھرائن کی قدامت پسندی کی شکست جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ ایک بھرتی ہے۔ اور اگر کشمکش دکھانا مقصود تھا تو یہ دونوں غیرضروری تھے۔ ان کے بغیر کشمکش دکھائی جا سکتی تھی اور اس سے اچھی جیسے کہ پہلے دکھائی

ہے۔ کہ کلا کی گذشتہ زندگی کو تفصیل سے بیان کرتا ہیں
ہو سکا کیوں ضروری تھا؟ پہلا منزل کے جلسے بھی بھرتی سے
رہیں، ایک ناگوار ہو سکتا ہے لیکن دوسرے کی شمولیت محض
ہے کہ محبت کا جو بیج پہلے پڑا تھا وہ پڑھنے والے بالمقصد چیز تھی۔ اسلئے
نے مقصد بھی پورا کیا۔ افسانہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اور بہ واقعہ
کا ... معلوم ہوتا ہے۔ اسے افسانے کے دوسرے حصوں سے
کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک جال ہے جس کی سب گرہیں کھلی
ہیں۔ پھر شریعا اور بھگت رام کی پہلی ملاقات کا طریقہ بھی انتہائی
عجیب ہے۔ اور ان تمام باتوں کی ذمہ داری منشی صاحب کی حقیقت
کے سر ہے جس نے آپکو افسانویت سے علیحدہ کر دیا اور کلیۃً
ت کا سامنا کرایا۔ ورنہ منشی صاحب سے ٹریجیڈی بنا سکتے
... جیسی طرح مختصر یہ کہ منشی صاحب اس افسانہ میں وہ منشی
نہیں جو آپکو بعد کے افسانوں میں نظر آئیں گے

اس کے بعد ہمیں نیم تاریخی رنگ میں رنگی ہوئی ایک ٹریجیڈی بعنوان "راجپوت کی بیٹی" ملتی ہے۔ یہ ٹریجیڈی عشق کے دو متوازی چلنے والے جذبوں کی ٹکر ہے۔ جذبہ اولی نے آنکھوں اور دل سے جذبہ پھر ہارا اور دوبارہ جیت لیا۔ جذبۂ ثانی نے دل سے ہارا مگر تلوار سے جیت کر بھی ہار کھائی۔ چتوڑ کے رانا بھوجراج کی رانی میرا بائی تشنہ کامان معرفت کے لئے ایک اتھاہ ساگر تھی۔ اور سارے راجپوتانہ کی زمین اس ساگر سے سیراب ہوتی تھی۔ منشی صاحب ابتدا کرتے ہوئے۔ راؤ صاحب جھالاوار کو مہاراجکماری پربھا چتوڑ میں لاتے ہیں اور تعقب میں مندسور کے راجکمار کو بھی لے آتے ہیں۔ کمار اور کماری کی نگاہیں نامہ بران الفت کا فرض ادا کرتی ہیں اور میرا "نگاہوں" کی ہم آغوشی سے واقف میرا۔ ایک دن دونوں کے ہاتھ ملواتے ہوئے راؤ صاحب سے کہتی ہے: آپکو یہ داماد مبارک ہو، یہاں پر ایک قسم کی قطعیت پیدا ہو جاتی تھی۔ منشی صاحب نے نگاہیں۔ ہاتھ اور دل ملا دیئے۔ لیکن منشی صاحب فوراً ہی پیچیدگی پیدا کر جاتے ہیں۔

"رانا بھوجراج منڈپ میں داخل ہوتے ہیں پربھا کو دیکھتے ہیں اور سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے"۔ قطعیت کا احساس زائل ہو گیا۔ ایکشن بڑھ چلا۔ کہانی نے پیچیدگی اختیار کر لی اور ہمارے سینے میں ایک اضطرار آمیز انتظار ہے۔ دل ہی دل میں پوچھتے ہیں۔ بھوجراج کیا کریگا منشی صاحب جانتے ہیں کہ طوفان آنے سے پیشتر سطح سمندر پر ایک موت کا سا ناقابل شکست سکوت چھا جایا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ آج والے طوفان کا پیش خیمہ پربھا کی شادی کی چہل پہل میں دکھاتے ہیں۔ لیکن پربھا کا دل بیٹھا جاتے ہیں "کوئی میرے دل میں بیٹھا کہتا ہے کہ اب ان سے ملاقات نہ ہو گی" کے سے الفاظ نکلواتے ہیں اور ہمیں واقعات مستقبل کے متعلق بے چین رکھتے ہیں۔ یہاں سے ایکشن سرعت کے ساتھ بڑھتا ہے۔ اور جیسا کہ توقع تھی غل مچا کر بارات آئی "مگر دم کے دم میں مسلح سواروں کی ایک فوج شاہی محل کے سامنے آگئی" یہ رانا بھوجراج تھے۔ راؤ صاحب معاملہ کی نوعیت کو سمجھ جاتے ہیں اور ہم ایک عالم بیخودی میں پکار اٹھتے ہیں "اب کیا ہوگا؟ کشت و خون کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ راؤ صاحب پربھا سے تہ خانہ میں چلے جانے کے لئے کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خونریزی کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ یہاں صورت حالات انتہائی طور پر نازک ہے اور اسے نبھانے میں منشی صاحب نے جس عمیق النظری کا ثبوت دیا ہے۔ وہ انکے افسانوں میں کم ہی ملیگا۔ راؤ صاحب کی موجودگی میں ہی وہ بھوجراج کو پربھا کے سامنے لے آتے ہیں اور اس کے منصفانہ پر کہہ آیا۔ پربھا چلنے کو تیار ہے۔ پربھا کے منہ سے وہ کچھ نکلواتے ہیں جس کی توقع نہ تھی "ہاں چلوں گی" کے دو لفظوں میں وہ کچھ بھر دیا جسنے جھالاوار کے سالخوردہ راؤ صاحب کے بدن میں غم و غصہ کی آگ لگا دی۔ لیکن "میں جھالاوار کی گود میں پلی ہوں۔ کیا اسے خون سے رنگواؤں" نے ایثار کی ایک صورت دکھا دی لیکن اس سے ہماری تسکین نہیں ہوتی لیکن منشی صاحب سمجھتے ہیں "راجپوت کی بیٹی اپنی حفاظت خود کر سکتی ہے۔ اسلئے خون بہانے کی ضرورت نہیں"

کتنی مشہور دلیل ہے۔ یہاں توقعات پوری ہو گئیں۔ منشی صاحب نے گرتی ہوئی دیوار سنبھال لی اور بطریق احسن۔ اور ساتھ ہی ایک اشارہ بھی کر گئے اور ہمیں مستقبل کیلئے پھر بے چین کر گئے۔ منداکار راجکمار کیا کریگا؟ اس کا جواب تو یہی تھا کہ عام افسانہ نگار کی طرح منشی صاحب راجکمار کو غیرت دلوا کر رانا سے بھڑوا دیتے کشت و خون ہوتا۔ لیکن منشی صاحب عامی سے زیادہ جہاندیدہ ہیں۔ اس طرح سے منشی صاحب ایک قصہ بنا جاتے یا تاریخ کا ایک ٹکڑا۔ لیکن یہاں وہ افسانہ نگار بن رہے ہیں مورخ نہیں رانا کی اسی قسم کی مجنونانہ حرکت سے عام آدمی یہی توقع کریگا کہ وہ اپنی منوانے میں زبردستی سے کام لیں گے اُدھر پربھا بھری بیٹھی ہوگی۔ وہ راجپوت کی بیٹی ہے۔ وہ اپنی حفاظت کرے گی نتیجہ کیا ہوگا۔ پربھا کی خودکشی یا رانا کے رفتہ زندگی کی شکست لیکن منشی صاحب یہاں پھر فنی ماحول میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ رانا کے منہ سے ایک طویل الاصبر آزما تقریر نکلواتے ہیں جس میں ان کے اس فعل کے اقدام کے جواز میں دلائل ہیں اور ساتھ ہی لجاجت آمیز اظہار ندامت بھی۔ اُدھر آگ ہے منشی صاحب تیل کی بجائے پانی دلواتے ہیں۔ آگ مدہم پڑ جاتی ہے بجھتی نہیں۔ شدت دور کر گئے کیونکہ محسوس کر رہے ہیں کہ انکا ٹھہرنا "ناگوار" گزر رہا ہے۔ اب منشی صاحب ہمیں سانس لینے کی مہلت دیتے ہیں اور ہماری توجہات ابھی ہوئی پربھا کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ جو ماضی۔ حال و مستقبل پر ایک جذبِ باقی نظر ڈالتی ہوئی اس فیصلے پر پہنچتی ہے کہ نہیں میں اسی قید میں جاؤں گی رانا کے ظلم سہونگی۔ مرونگی مگر اسی گھر میں۔ بیاہ تو جس سے ہونا تھا ہو چکا۔ بیاہ صرف ایک بار ہوتا ہے دل میں اس کی پرستش کروں گی مگر زبان پر اس کا نام نہ لاؤں گی۔ یہ کیوں؟ کیونکہ وہ دنیا کی نظروں میں رانا کی ہو چکی۔ اب پھر ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کہ کشمکش میں حرکت ہے۔ کیونکہ آگ ابھی بجھی نہیں دبک رہی ہے اور بھڑکنی چاہیے چنانچہ منشی صاحب رانا کو بلواتے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ کچھ تلخ باتیں ہوں لیکن رانا پھر بھی عفو خواہانہ انداز اختیار کرتے ہیں لجاجت کی

ملتجی دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ رانا پریم بھکاری بنتے ہیں۔ لیکن جواب ایک عضر سے بھری نہیں میں ملتا ہے۔

رانا۔ بھالدوار جانا چاہتی ہو؟

پربھا۔ نہیں!

رانا۔ مندار کمار کے پاس بھیجدوں؟

پربھا۔ ہرگز نہیں۔

رانا۔ مگر تمہارا کڑھنا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔

پربھا۔ آپکو اس کڑھنے سے بھی نجات مل جائے گی!

اس مختصر سے مکالمے میں منشی صاحب جہاں پربھا کے طوفانی جذبات کو لپیٹ کر رکھ گئے۔ وہاں رانا کی ندامت پشیمانی اور عذرِ گناہ کو بھی عریاں کر گئے لیکن نجات ملجائیگی "ہمیں ایک اور فضا میں داخل کر جاتا ہے۔ اب منشی صاحب ہمیں اس کیلئے تیار کرتے ہیں۔ مندار کمار پھر ظاہر ہوتے ہیں۔ اُن کا پارٹ ابھی باقی تھا۔ وہ اپنے مرکزِ تمنا سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ اور انہوں نے ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے۔ وہ بھی راجپوت تھے۔ لیکن منشی صاحب اُسے مسلح کر کے نہیں لاتے۔ وہ انہیں فقیر کے بھیس میں لاتے ہیں۔ اور میرا بائی چتوڑ کی رانی سے چور دروازہ کھلوانے کا وعدہ لے لیتے ہیں۔ میرا پچھتاتی ہے۔ خاوند کی وفاداری۔ پاس وعدہ دونوں ٹکراتے ہیں۔ پیچھے کوئی نہیں ہٹتا۔ منشی صاحب اُسے شوہر کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ رانی کو بھیک ملجاتی ہے۔ راجکمار چور دروازے سے محل میں داخل ہوتا ہے۔ رانا چھپا ہوا دیکھ رہا ہے پربھا خودکشی کی تیاری میں مصروف ہے۔ یہاں پھر ایک نازک موقعہ ہے۔ کیا محبوب کے سامنے ہوتے ہوتے پربھا کا جذبۂ محبت پھر عود کر آئیگا؟ وہ بے اختیار ہو جاتے گی لیکن منشی صاحب کو پربھا کا عہد یاد ہے۔ مگر اس کی محبت کو نہیں بھولتے۔ پربھا طعنے سنتی ہے ملامت آمیز باتیں برداشت کرتی ہے لیکن اُسے واپس چلے جانے کے لئے کہتی ہے۔ کیونکہ اُسے خیال ہے کہ رانا اُسے زندہ نہ چھوڑینگے

ملن محبت میں ناکامی بعض حالات میں حسد پیدا کرتی ہے۔ اور آگ کچھ ایسی ہے جو بجھاتے ہوئے اور تیز ہوتی ہے۔ راجکمار رنگدار کا رے کچھ اور ہی سمجھے یعنی یہ کہ اس پر رانا کا جادو چل گیا" اور اب وہ جگ سے وہ اقدام کراتے ہیں جو راجپوت نہیں کرتے۔ عورتوں پر تلوار چلانا . . . مگر راجکمار پہلے عاشق تھا۔ اب حاسد ہو گیا تھا دماغ ماؤف ہو چکا تھا: تلوار لیکر جھپٹا کہ رانا سامنے آ گئے۔ تلوار اس طرف منتقل ہو گئی جو خالی گئی۔ اور جوابی تلوار چل گئی گر یہی ہوئی پر بجا حشم زدن میں راجکمار کی ڈھال بن گئی "تلوار کا پورا ہاتھ شانے پر پڑا دسینہ تک چلا گیا" پربھا نے شرط وفا نبھا دی۔ محبت کا تجرفانی شوہر نے بہم پہنچا دیا اور اپنا عہد بھی نبھا دیا۔ وہیں مر گئی" راجکمار کے سینے میں حسد کی آگ مشتعل تھی خون کی دھاروں سے بجھ گئی "عالم بے خودی سے نکلتے ہی راجکمار کی تلوار اسکے سینے میں تھی یہ پریم کی زنجیر ٹوٹ سکی۔

"دونوں ایک ساتھ رخصت ہو گئے" کمار نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی۔ کہانی بیان کرتے ہوئے ہم نے کسی قدر تفصیل سے کام لیا ہے لیکن ایکشن کی رفتار۔ واقعات کا الحاق اس کے بغیر نہیں دکھایا جا سکتا۔ ہمارے خیال میں یہ افسانہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ ایک نظر رانا بھوجراج کی حرکت کی خدمت کر سکتی ہے اس کی راجپوتی بہادری پر ایک بدنما دھبہ کہہ سکتی ہے۔ حماقت کا خطاب اسے مل سکتا ہے۔ ہمارے ضابطۂ اخلاق کی کئی دفعیں اسپر عاید کی جا سکتی ہیں لیکن منشی صاحب نے اسکا جواز پیش کر دیا۔ ہمارے پاس راجپوتانے کی تاریخ میں کئی ٹھوس واقعات اس قسم کے موجود ہیں۔ جہاں راجپوت اپنی منظور نظر کو بزور شمشیر لے اڑے۔ قنوج کے راجے جے چند کی لڑکی سنجوگتا کا واقعہ تاریخ پر چمک رہا ہے۔ اور یہ ایک مثال ہے۔ مندار کمار کا پربھا پر تلوار اٹھانا۔ اور پربھا کو بے غیرت کہنا۔ انتہائی بزدلی اور حماقت کہی جا سکتی ہے بالخصوص ایک راجپوت کی طرف سے۔ لیکن واقعات کی رفتار نے

ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کی منگیتر کسی دوسرے کے محل میں رہے اور عدد کے ساتھ، ناگوار ہے دوسرے محبت کے بعد جب حسد کی حکمرانی ہوتی ہے تو قوائے تیز ہو جاتے ہیں فطری احساسات مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اور آگ اور دھوئیں دماغی فضا میں بھر جاتے ہیں۔ جو قوائے ذہنی کے محل میں سدراہ بنتے ہیں اُس وقت انسان جو کچھ کر گزرے غیر ممکن نہیں اس لیے یہ حرکت بھی جائز ہے۔ اور ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ منشی صاحب اس افسانے میں اچھی طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ یہاں پر نکتہ گیری ممکن نہیں۔

اس کے بعد ہمیں ایک ایسے عشق کی مثال ملتی ہے جس کی سرزمین ہندوستانی مغرب زدہ عورتوں کی رومانی ترقی ہے۔ اور جہاں تک ہم غور کر سکتے ہیں یہ افسانہ "پورب پچھم" کے مکروہات کی تشہیر کے لئے لکھا گیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ افسانے کی تمام فضا پراسرار کی گھٹائیں محیط ہیں۔ ایک دھند ہے جس کے اندر ہی اندر کچھ ہو رہا ہے جس سے ہم بے خبر رہتے ہیں لیکن کہیں کہیں روشنی نظر آ جاتی ہے۔ اور ہماری آنکھوں سے یہ پردہ رفتہ رفتہ اٹھ جاتا ہے۔ افسانہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

"دن رات سے گلے ملتا تھا۔ اور لکھنؤ کے ایک قطعہ باغیچہ میں محبت کے دو متوالے باہم بغلگیر ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آنکھوں کی آڑ میں اشتیاق۔ التجا۔ آرزو اور کشش کے راز و نیاز ہو رہے تھے۔ پیڑوں کی پتیاں خاموش اور پھولوں کی زبانیں بند تھیں۔ ہاں نرگس کی نیم باز آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر ان میں بھی رازداری تھی۔ کیونکہ بیگناہ کا نظارہ تھا۔ صرف نسیم غماز پتیوں میں چھپکر سنتی تھی۔ اور مسکراتی تھی:

یہ گناہ کا نظارہ تھا۔ لیکن گناہ کیوں؟ محبت کے دو متوالوں کا ملنا گناہ نہیں ہو سکتا۔ نہ جانے وہ کون ہیں۔ ان میں کیا تعلق ہے۔ ہم گناہ کا حکم کیسے لگائیں لیکن منشی صاحب اسکے پردہ راز

میں رکھتے ہیں۔ قاری کو اور مستقبل کے منتظر کر دیتے ہیں اور فوراً ہی بعد اس نظارۂ گناہ کی ایک جھلک دکھا جاتے ہیں "پھر کب ملاقات ہوگی؟ "گیارہ بجے رات کو" دوسرا کہتا ہے۔ یہاں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ تواسے آزادانہ طور پر نہیں ملتے اور نہ ہی مل سکتے ہیں ان کے درمیان کوئی بات حائل ہے لیکن وہ کیا ہے منشی صاحب سے یونہی رکھ دیتے ہیں اور ایک اور رام کہانی شروع کرتے ہیں جسے بظاہر اس سے کوئی تعلق نہیں لیکن یہاں سے ہمیں اس بات کا پتہ چل جاتا ہے۔ جوان بغلگیر ہونے والوں کے درمیان حائل تھی۔ پنڈت رمانا تھ بیرسٹر تھے۔ ان کی بہن کامنی قربجات کے ہاتھوں بک ہوئی تھی۔ کامنی کے شوہر مسٹر رام گوپال ناتھ ایڈنبرگ میں تحصیل علم کر رہے تھے۔ لکھنؤ میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی۔ اور کامنی کے لئے یہ دلہن عیسیٰ کی واقعہ۔ سنیئے منشی صاحب اس پردۂ راز کو اٹھانے کے سامان مہیا کرتے جاتے ہیں "حدیث عشق کی مسلسل تلقین ... اور طرح کے روزانہ درد و ذکر کا قلب پر اور شاید بھی عادت شباب ہیں چنانچہ اثر ہونا چاہیئے تھا" جو منشی صاحب نے پیدا کر دیا۔ ایک خوش وضع شکیل نوجوان کی نگاہیں کامنی کی طرف اٹھنے لگیں۔

اور اس کے بعد کیا ہوا "خاموشی کی مہر ٹوٹی۔ تعارف ہوا (جو مغربی تہذیب میں بہت آسان ہے، زبان گویا نے پہلے کتابوں سے پھر لطافت سے کام لیا۔ نظم کے بعد نثر کا دور آیا۔ وصال کے دروازے پر جا پہنچے" اس کے بعد جو کچھ ظہور میں آیا منشی صاحب اس کی جھلک پہلے دکھا چکے ہیں۔ یہاں ہمیں یہ کہنا پڑیگا کہ منشی صاحب پردہ راز تو اٹھا گئے۔ اور وہ اس طرح کہ پہلے واقعہ کو اس سلسلہ میں منسلک کر گئے یہ گرہ بالکل ڈھیلی معلوم ہوتی ہے۔ اور نہ جانے آگے بڑھتے ہی کھل جائے۔ تو یہ ہے افسانوں کی بالمقصد تحریر کا نتیجہ۔ یہی وہ مقام تھا۔ جہاں منشی صاحب کی فنی قابلیت کا مظاہرہ بہترین طریق پر ہونا چاہیئے تھا۔ مظاہرہ ہوا۔ لیکن ایسا نہیں جیسے کہ توقع تھی۔ یا جیسا کہ فن کا مطالبہ تھا۔ ہم اس رفتارِ واقعات میں بہت سے سوالوں کو ہوا نہیں وقت محسوس کرتے ہیں۔ اس سے منشی صاحب ہمیں اپنی عمیق النظری کا ثبوت دیتے ہیں۔ تو گویا جا بیں پہنچی ہوئی ہے۔ علاوہ ہمیں یہ حقیقت ہے کہ حسن ظاہر کس طرح اچھے بھلے آدمی کو بہکا سکتا ہے۔ روپ چند کا کیرکٹر دکھلاتے لکھتے ہیں "روپ چند پنجاب کا رہنے والا سنسکرت کا شاستری فارسی اردو میں دستگاہ کامل۔ انگریزی کا ایم اے لکھنؤ کے بلند وسیع لوہے کے کارخانے کا مالک تھا۔ گھر میں حسین بیوی۔ اور پیارے پیارے بچے۔ اپنے ہم جلیسوں میں نوٹ مشہور نہ شباب کی مستی تھی نہ مزاج کا چھچھورا پن۔ عیالداری کی زنجیر میں جکڑا ہوا معلوم نہیں یہ کونسی کشش۔ کونسی ترغیب تھی جو اسے اس سلسلہ میں لے گئی جہاں زمین آگ ہے اور آسمان شعلہ ہے۔ جہاں ذلت ہے۔ تباہی ہے گناہ ہے" انداز تحریر ہمدردانہ ہے۔ اور اسکے خلوص میں کچھ شک نہیں لیکن چند سطور میں ایک طرف ہے اور دکھایا گیا ہے تہذیب مغرب کے آزادانہ روی کہاں سے کہاں لے جاتی ہے مگر ہمیں کوئی حرکت محسوس نہیں ہوتی لیکن "رات کے گیارہ بجے" ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے۔ یہاں منشی صاحب مغرب پرست عورتوں کی دانائی بیان کرنے کے لئے کامنی سے دو خط لکھواتے ہیں۔ جو نہ لکھواتے تو اچھا ہوتا۔ نہ تو یہ کہانی میں کوئی اضافہ کرتے ہیں۔ اور نہ ہی ایکشن کی رفتار میں کوئی مدد دیتے ہیں۔ بلکہ افسانے کے اس جال کو اور ڈھیلا کر جاتے ہیں۔ ایک خط روپ چند کے نام تھا۔ اور دوسرا ڈیر گوپال کو جو تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ گو یہ ہوئی بات سے لکھوا رہا ہے۔ دونوں خط ایکشن روک دیتے ہیں۔ ورنہ ایک دلچسپی سی پیدا کر دیتے ہیں۔ روپ چند کا سرقہ بالجبر کے الزام میں گرفتار ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جسے ہم گذشتہ واقعات کا نتیجہ کہہ سکتے اور نہ ہی پسے سابقہ حالات سے ملحق کر سکتے ہیں ہمارے ذہنی فضا میں "گیارہ بجے رات" کی نسیم چلتی ہے لیکن کامنی

خود سے معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ایک مہینہ لگے گا۔ اس مہینہ میں کیا ہوا ہمیں پتہ نہیں۔ اور منشی صاحب قاری کو لکھنؤ کے سیشن جج کی عدالت میں کس راستے سے لائے یہ انہیں کو معلوم ہوگا۔ ہمارے سامنے کوئی واقعہ یا کسی واقعہ کا اشارہ موجود نہیں جو ہمیں ذہنی طور پہ بہت قتل کردے۔ ہاں گیارہ بجے رات پھاٹک کا دروازہ کھلا رکھنا" اس سے مل سکتا ہے لیکن کامنی کا خط اس تعلق سے آتا ہے۔ اور یہ زنجیر ٹوٹ جاتی ہے لیکن اس کی تلافی منشی صاحب روپ چند کی سیرت نگاری میں کر جاتے ہیں۔ مردانہ کردار کی علوئیت جس زور سے یہاں بیان کی گئی ہے کبھی کبھی ہوا کرتی ہے۔ کامنی کے بیان ہیں میں اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ کوئی ایک بجے کے قریب چور چور کا غل سن کر چونک اٹھی اور اپنی چارپائی کے قریب چار آدمیوں کو ہاتھا پائی کرتے ہوئے پایا میرے بھائی صاحب اپنے دو چوکیداروں کے ساتھ ملزم کو پکڑتے تھے اور وہ اپنے تئیں چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا" یہ دو سطور یہاں واقعہ کو کتنا تیز بیان کر جاتی ہیں۔ اور کامنی اور بالخصوص مغرب زدہ لڑکیوں کی اونچی ذہنیت کی منہ بولتی تصویر کھینچ گئی ہیں۔ اور شکر ہے کہ منشی صاحب یہاں اپنی حقیقت پرستی کے دام میں نہ آئے۔ ورنہ وہ صاف صاف کہہ جاتا کہ اصل کیا ہے لیکن کنایۃً بیان کر کے وہ ایک ادبی نکتہ حاصل کر گئے ہیں جو تفصیل میں پڑنے سے چھن جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ قاری معاملہ کی اصلیت کو بھانپ جائیگا۔ کون مانے کہ روپ چند چور ہے اور وہ بھی سرقہ بالجبر کا۔ پولیس کہتی ہے تو کہا کرے۔ اس سلسلہ میں منشی صاحب عدالت کا سین جو سب سے زیادہ دلچسپ، زیادہ حیرت انگیز اور زیادہ یاس خیز ہے، نہایت خوبی سے نبھاتے ہیں۔ وہ رد عمل کے لئے ایک بیک گراؤنڈ تیار کرتے ہیں۔ وہ اس قسم کا ایک ماحول تیار کر لیتے ہیں۔ بیم و امید سے مرکب ایک ہوا کمرہ عدالت میں چل رہی ہوتی ہے۔ کامنی دعا کرتی ہے لیکن "کیا تم حلفاً کہہ سکتی ہو کہ تم نے اسے محبت آمیز خطوط نہیں لکھے" ایک کاری ضرب ہے جو اسے رُلا دیتی ہے۔ اس کا وہ قلعہ جس میں وہ پناہ لے رہی تھی چشم زدن میں گرتا ہوا نظر آتا ہے

روپ چند کی آنکھوں میں ایک شیطانی تبسم نمودار ہوا جہاں پھول تھا وہاں کانٹا پیدا ہوا۔ یہ بالکل فطرت کے مطابق تھا۔ اس حملہ کا جواب یہی تھا۔ جذبہ انتقام سب سے پہلے بھڑکتا ہے لیکن کامنی کی گھبراہٹ بھی قابل دید ہے۔ کہنے لگی "میں عورت ہوں، کمزور ہوں، اکیلی ہوں، تم مرد ہو ہوشمند ہو عالی ہمت ہو۔ کینہ پروری تمہاری شان سے بعید ہے" اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ منشی صاحب اس سطر میں عورت اور مرد کی سیرت کو روشن ترین رنگ میں نمایاں کر گئے۔ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ لاکھ تحسین کہنا چاہیں۔ اگر روپ چند کے بیباک گئے ہوئے ہاتھ وہ چٹھیاں نکال لائیں جو نکالنے کے لئے وہ داخل ہوئے تھے تو روپ چند باعزت ہو جاتے لیکن یہ انتقام ہوتا اس سے جو کبھی آغوش میں چھپی رہی تھی۔ اور واقعات اسے جدا کر رہے تھے۔ یہ مردانہ فطرت کی علوئیت کے شایاں نہیں۔ ممکن ہے بعض اصحاب اسے جہالت کہیں۔ اور یہ جہالت بھی ایک ذی حس آدمی کی۔ لیکن میرے خیال میں یہ مردانہ اوصاف کی زنجیر کی ایک نہایت اہم کڑی ہے۔ بالفرض منشی صاحب وہ چٹھیاں نکلوا لیتے۔ روپ چند باعزت طور پر بری ہو جاتا تو افسانے کی ساری دلچسپی زائل ہو جاتی۔ فریب قصہ قائم نہ رہتا۔ افسانہ ایک معمولی واقعہ بن جاتا۔ کمزور آدمی سے کمزوری ہی کی توقع ہو سکتی ہے۔ رحم۔ وفا۔ ایثار مرد کو عطا ہوا ہے۔ روپ چند نے اقبال جرم کر لیا۔ لوگوں کی امیدیں ختم ہو گئیں۔ کمرے میں حسرت برسنے لگی لیکن کامنی کی امید پوری ہو گئی۔ لیکن اس کے دل پر حسرت چھائی رہی۔ اور منشی صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے مردانہ کردار کے علوئیت کو ثابت کر دیا۔

اس افسانہ میں اگر کوئی چیز ہے تو صرف کامنی اور روپ چند کے کیریکٹر۔ ورنہ اس میں کوئی اہم بات نہیں۔ افسانہ کی تعمیر تو مسلمہ طور پر واقف ہاتھوں اور کامل دماغ کا نتیجہ نہیں جس کے متعلق ہم کہانی بیان کرتے ہوئے مختصراً کہہ گئے ہیں لیکن ایک بات جو مزید معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ منشی صاحب ادبی اقتصادیات سے واقف

نہیں۔ اور نہ ہی اتحاد داخلی کو زیر نگاہ رکھتے ہیں۔ کیلاش ناتھ کی شمولیت جہاں تک ہم سمجھ سکتے ہیں کسی طور پر بھی جائز نہیں۔ عدالت کے سین میں ہم اسے قبول کرنے کو تیار ہیں لیکن جہاں پہلے پہلے نہیں داخل کیا گیا ہے۔ بہرحال انکا ایک ہیول کیریکٹر پیش کیا گیا ہے۔ سارے افسانہ میں انہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے بلکہ ایکشن کے رستے کا روڑا بن گیا ہے۔ اور ہم نہیں سمجھ سکے کہ منشی صاحب کس جذبہ کی تحریک سے کیلاش ناتھ کو شامل کرنے پر مجبور ہوئے۔ یا کونسا ایسا فنی مسئلہ تھا جو کیلاش ناتھ کی شمولیت کے بغیر حل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے افسانہ بلحاظ ہیرو ہیروئین کامیاب ہے کہ وہ اچھی طرح بیان ہوئے گو ہیئت کو نہایت بھدا اور بے ڈھبا کر کے پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ہمیں ایک افسانہ بعنوان "خونِ حرمت" نظر آتا ہے۔ اور ہمارے خیال میں یہ افسانہ منشی صاحب کے افسانوں کی صف اولیں میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ یہ عشق و ہوس کے تصادم سے پیدا کی ہوئی ایک خونی ٹریجیڈی ہے۔ جو انتقام پر جاکر ختم ہوتی ہے یہاں صرف بدنی خون ہی سے ہولی نہیں کھیلی جاتی بلکہ انسانیت کے خون سے بھی ہاتھ رنگے جاتے ہیں۔ اور یہ انسانیت کا خون کہیں زیادہ خوفناک اور کہیں زیادہ روح فرسا ہے۔ انسانیت عفت۔ پاکیزگی نفس کی شہ رگ پر حیوانیت۔ سیہ کاری جسن فروشی کی کند چھری رک رک کر چلتی ہے۔ اور حسرتناک پہلو یہ ہے کہ چھینٹے قاتل پر نہیں پڑتے۔ مقتول ہی مجرم ٹھیرتا ہے لیکن منشی صاحب انصاف سے کام لیتے ہیں۔ اور قاتل اپنے ہی خون میں نہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اپنے ہی ہاتھوں سے۔ یہاں منشی صاحب ثابت کرتے ہیں کہ بدی خود اپنی قبر کھودتی ہے۔ خواہ وہ ہنگامی طور پر ظفرمند ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی یہ کامیابی ہی اس کی شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ زبیدہ اور سعید خاوند بیوی ایک دوسرے کے متوالے تھے۔ سعید نے سب کچھ زبیدہ کو دے دیا تھا۔ اور زبیدہ ہمہ تن سعید کی تھی لیکن اور دیا دا مارت سعید کے سیلاب محبت کو ایک بازاری عورت زرینہ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ زرینہ گھر میں آتی ہے۔ زبیدہ سے دوچار ہوتی ہے اور کچھ تلخ حقائق انکے کانوں میں پہنچتے ہیں اور زرینہ زبیدہ کو زبیدہ کے گھر میں سعید کی موجودگی میں قمچیوں سے بے حال کر دیتی ہے یہ "خونِ حرمت" زبیدہ کو انتقام کی طرف لیجاتا ہے۔ زبیدہ حسن فروش بنتی ہے۔ سعید کی خاندانی وجاہت اور غرور کا معطل شدہ جذبہ بحال ہوتا ہے۔ زرینہ کے گردن پر خنجر چلتا ہے۔ سعید کے دل میں پستول کی گولی گھر کرتی ہے۔ یہ ہے کہانی۔ لیکن کہانی کا ایکشن۔ اسکا اتار چڑھاؤ انتہائی نفاست سے دکھایا گیا ہے۔ اور جو کمی ہیئت کے متعلق محسوس ہوتی تھی۔ وہ یہاں پوری کر دی ہے۔

سعید اور زبیدہ کی رنگینیٔ محبت میں منشی صاحب تھوڑی سی بدمزگی پیدا کرتے ہیں۔ اور پلاٹ کو الجھا دیتے ہیں۔ سعید کے محبت کے چشمے کا بہاؤ کسی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جسکا ردعمل زبیدہ کی شمع محبت کی بے رونقی تھی۔ اس کچھ وقت سے زرینہ کی آمد کے لئے راستہ صاف کرتے ہیں۔ وہ آتی ہے۔ اور اپنی شعلہ ریز آنکھوں میں انتقام کی سرخی لئے چلی جاتی ہے۔ اب اس انتقام کے جذبہ کو بھڑکانے کی ضرورت ہے منشی صاحب زبیدہ اور زرینہ میں تصادم کراتے ہیں۔ اور بالآخر زبیدہ کو "حیا فروش" اور دوسروں کی اگلی ہوئی ہڈیاں چچوڑنے والی کتے سے موزوں خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ اب کیا ہوگا۔ ہم سانس روکے منتظر رہتے ہیں۔ لیکن مستقبل کس قدر خوفناک۔ حسرت خیز اور کس قدر انسانیت سوز ہے۔ ضمیر کو دھکا لگتا ہے۔ ایک رلا دینے والی ضرب پہنچتی ہے۔ زرینہ ایک عصمت فروش عورت۔ زبیدہ کی سی پاکباز عورت کو اسی کے گھر میں ہتھن سے بندھوا کر اس کے شوہر کے سامنے قمچیوں سے اڑا دیتی ہے اور زبیدہ کا شوہر پتلے کی طرح کھڑا دیکھتا ہے۔ ایک بار اگر سعید زبیدہ کی لجاجت پگھلتی بھی ہے تو نگاہیں خالف ہیں۔ یہ ہے بازاری حسن کے

عشوہ و ناز کا اثر۔ زرینہ کو روکا جاتا ہے لیکن وہ قہر آلود ناز اُسے پھر ساکت کر جاتا ہے۔ غرور خاندانی رخصت ہو چکا ہے۔ زرینہ اُسے دغاباز خیال کرتی ہے۔ اُس کے جذبات خود داری پھر بھی بیدار نہیں ہوتے کیونکہ وہ نفس کے ہاتھوں بک چکا تھا۔ یہ تھا حملہ جوابی حملہ ہوگا یا نہیں؟ یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور منشی صاحب ہمیں ایک اُلجھن میں ڈالدیتے ہیں۔ ایک کمزور عورت کیا کر سکتی ہے۔ جبکہ اُس کا شوہر بھی اُس کی پشت پر نہیں۔ لیکن عورت، وقت پڑنے پر کیا کچھ کر گذرتی ہے۔ اسکا جواب ہمیں منشی صاحب سے ملتا ہے۔ وہ ایک عجیب منطق زبیدہ کے دماغ میں داخل کرتے ہیں "بے حرمتی پر سیاہ داغ آچکا ہے۔ مجھے کیونکر ایک ہی صورت تھی: ذلت کے قعر سیاہ میں گر پڑوں تاکہ سارے پیرہن کی سیاہی اس داغ سیاہ کو چھپا دے:" ایسے وقت میں ایسے ہی خیال پیدا ہوتے ہیں اور ہمیں منشی صاحب کی نفسیاتی قابلیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے چنانچہ زبیدہ کہتی ہے: "میں نے اپنی تباہی کو اور بھی مکمل، اپنی ذلت کو اور بھی مرتفع اور اپنی روسیاہی کو اور بھی مطلا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا: تنہائی۔ سیاہ رات۔" یہ سلوک اگر وہ یہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔ اس وقت رضا بہ قضا رہنا عورت کی فطرت کے خلاف ہے۔ صبح زبیدہ بے حجابانہ چلی جا رہی تھی کہاں؟ "وہیں جہاں ذلت کی قدر ہے۔ جہاں کسی پر کوئی ہنسنے والا نہیں۔ جہاں رسوائی کا بنا ناآراستہ ہے۔ جہاں حیا بکتی ہے اور شرم لٹتی ہے:" آہ کہاں لے گئے منشی صاحب سعید کو کیوں نہ مروا دیا۔ زرینہ پر جوابی حملہ کیوں نہ کیا؟ لیکن یہ سب وہ کچھ ہے جس کی ہم توقع کر رہے ہیں۔ یہ دنیا ہے منشی صاحب مانتے ہیں کہ سعید کو بازاری عشوہ و ناز نبھا چکے ہیں وہ یہاں آئیگا اور منشی صاحب اُسے بھی آتے ہیں۔ یہاں اُس کے دل میں کشاکشی جو زرینہ کی قسموں سے کہیں تیز اور خون ریز تھی ممکن ہے بعض اصحاب اسے سختی کہیں لیکن منشی صاحب نے دکھا دیا کہ کمزور و نازک اور کم حوصلہ عورت جذبۂ انتقام سے

بھری ہوئی حصول مقصد میں اُس چیز کو بھی قربان کرنے دریغ نہیں کرتی جو اسکا عزیز ترین متاع حیات ہے۔ منشی صاحب سعید کو اُسکی ظالمانہ روش کی سزا دینا چاہتے تھے جیسے کہ زبیدہ بھی ہے وہ سزا دلوائی گئی جسمانی طور پر بھی روحانی طور پر بھی اور جسطرح پہلے اُسے دماغی اذیت پہنچائی تھی اسطرح پہلے کئے ہوئی اذیت ملی زرینہ کا نشہ حسن کی غرور سر اور رانیوں سے چٹکیاں بھنوانے والا دریا چڑھ سعید کے خنجر خونخوار کی نذر ہوا۔ اور سعید میاں اپنی ہی گولی کا نشانہ بن گئے اور یوں تلافی مافات کر گئے۔ زبیدہ گھر لوٹی اور اب خیال کرتی ہے کہ چند دنوں میں سعید کی بے وفائی اور بے رحمی کا زخم پر ہو جائیگا۔ اپنی ذلت کی یاد بھی شاید مٹ جائے مگر اس کی چند روزہ محبت کا نقش باقی رہیگا۔ اور اب یہی میری زندگی کا سہارا ہے" زبیدہ کی واپسی نے افسانہ کو ایک واقعاتی رنگ دیدیا صیغہ متکلم میں لکھی ہوئی کہانیوں کا اکثر یہی حشر ہوتا رہا ہے۔ اردو ہی میں نہیں انگریزی، فرانسیسی میں بھی۔ جب بھی ادیب ایک سامع کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ اور جب بھی وہ اپنے آپ کو افسانہ سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس میں واقعیت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ خواہ وہ کس قدر احتیاط سے بھی کام لے یہی حال اس افسانے میں ہوا ہے۔ انتہائی کوشش کے باوجود اس سے پہلا افسانے ترنم میں جذب نہیں کر سکتے۔ کیا ہوتا۔ اگر زبیدہ گھر نہ لوٹتی۔ افسانے سے کچھ نہ ہو جاتا۔ اور اگر اس سے کم ہوتا بھی تو وہی حصہ جسکا وجود غیر فائدہ مند ہونے کے علاوہ نقصان دہ بھی تھا لیکن یہاں پھر آپکی حقیقت پرستی نے آپکو گمراہ کیا ہے۔ بہرکیف یہ ایک کامیاب افسانہ کہا جا سکتا ہے۔

موجودہ پیش نظر میں جو آخری قابلِ توجہ حقیقی افسانہ ہے ۔ وہ "سہاگ کا جنازہ" ہے۔ عنوان بجائے خود کہانی کے المیہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اسکے پڑھنے ہی سے ایک آہ سرد بیساختہ طور پر نکل جاتی ہے۔ دل میں، بدن میں دماغ میں ایک لرزش۔ ایک کپکپی۔ ایک جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے۔ افسانہ کیا ہے؟ تمناؤں کے

خون آرزوؤں کے [illegible] محلات کے رُلا دینے والے انہدام۔ مستقبل کے سنہرے خواب کے ایک پریشان کن تعبیر کا ایک مرقع۔ یہ منشی صاحب کا کمال فن سمجھئے کہ وہ اپنے افسانے کے حسرتناک انجام کے پیش نظر ایسا ماحول پیدا کر لیتے ہیں۔ جہاں گو بظاہر ایک تسکین ایک اطمینان سا محیط ہے۔ لیکن اندر ہی اندر یاس و حسرت بھی طاری ہے۔

"نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ پیاری۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کہیں نہ جاؤں۔ میں نے طے کر لیا ہے۔ میں نے تمہاری خاطر سے ہاں کہلا یا تھا۔ مگر اب جانے کو دل نہیں چاہتا۔ تین سال کیسے گذرینگے" یہ نوجوان کیشو تھا اور پیاری۔ سبھدرا اس کی ارمانوں بھری بیوی تھی۔ کیشو سبھدرا کی محبت کا اتھاہ ساگر تھا جسمیں وہ مچھلی بنکر تیرنا چاہتی تھی۔ اُس کے ارمانوں کا محور رہتا۔ جس کے گرد وہ پرواز کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی مستقبل کی تمناؤں کا مرکز جب کا نظر سے اوجھل ہونا اُسے گوارا نہ تھا۔ لیکن وہ عالم خواب میں تھی۔ اور خواب ایک سہانا خواب تھا۔ وہ اس عالم میں رہ کر تین سال کی فرقت برداشت کرے گی۔ جبکہ اُسے پتی ولایت ہونگے۔ کیشو کے والدین اُس کی سیاحت انگلینڈ کے شدید مخالف تھے۔ لیکن سبھدرا نے کیشو کو جبراً رضامند کر لیا۔ لیکن بھولی سبھدرا کیا جانے کہ جس پودے کو بعد میں وہ سہاگ کا جنازہ کہے گی۔ اسکا بیج وہ خود اپنے ہی ہاتھوں ڈال رہی ہے۔ جسے وہ امرت سمجھ رہی ہے وہ اُس کے حق میں زہر ہلاہل سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ لیکن انسانی ارادے اور اُن کے عمل کے نتیجے اکثر اوقات خلاف توقع ہوا کرتا ہے۔ محبت کی کھیتی میں شکوک کے شگوفے بھی ہوا کرتے ہیں۔ سبھدرا کہتی ہے "دیکھنا کہیں ولایتی مسوں کے جال میں نہ پھنس جانا۔" "اچھا تو میں جاؤنگا ہی نہیں۔" یہ کیشو کا جواب تھا۔ "نہیں میں نے دل لگی کی تھی۔ خط ضرور بھیجتے رہنا۔" "ہاں ہفتہ وار لکھا کرونگا" یہ وعدہ کچھ دیر تو پورا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ختم ہو جاتا ہے۔ منشی صاحب نہایت خوبصورتی سے افسانہ کو یہاں تک لے آئے۔ اسکا ردعمل کیا ہوگا سبھدرا کا کیا حال ہوگا۔ وہ غم غصہ دکھائی دیتی ہے۔ دل میں ہوکیں اٹھتی ہیں۔ اتنی جلدی کیشو اُسے بھول گیا۔ اُسے یقین نہیں آتا۔ پھر خط کیوں نہیں آتا۔ دشمنوں کی طبیعت تو خراب نہیں۔ اس قسم کے خیالات سبھدرا کے دل میں اُٹھتے ہونگے۔ اس عالم اضطراب میں منشی صاحب وہ کچھ کراتے ہیں جو محبت کے ہاتھوں بکی ہوئی عورتیں کرتی ہیں۔ سبھدرا انگلستان پہنچتی ہے اور اتفاق سے اُسی حصہ میں قیام کرتی ہے۔ جہاں اُسکے روٹھے ہوئے پیا رہتے تھے۔ یہ اتفاق ہے۔ اور اتفاق اکثر حالتوں میں کہانی کو کمزور کر جاتا ہے۔ اُس میں ایک تصنع سا پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اتفاق کی یہ [illegible] افسانے کے ترنم میں جذب ہو سکتی ہے۔ اور ہم اس پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ ہماری دلچسپی بڑھتی ہے۔ کیونکہ ایکشن بڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بے چینی بھی ہے۔ کیا سبھدرا کیشو سے مل سکیگی اور ملیگی تو کیا ہوگا۔ یہ سوال ہیں جو ہمارے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن منشی صاحب ملائیں گے تو کسی انوکھے طریقے سے۔ وہ اب سبھدرا کی تلخ زندگی میں ایک اور تلخی پیدا کرتے ہیں۔ اور اسے مطلع کرتے ہیں کہ کیشو ایک ولایتی "مس" کا نہیں ایک ہندوستانی مس کا شکار ہو چکا ہے۔ ابھی وہ اسی ضرب سے نہیں سنبھلی ہوتی کہ ایک اور پڑتی ہے۔ وہی ہندوستانی مس اُس کے پاس کپڑے سلوانے کے لئے آتی ہے۔ جو وہ شادی میں پہننا چاہتی تھی۔ لیکن وہ انکی تیاری میں کچھ تاخیر کرانا چاہتی تھی۔ لیکن سبھدرا اس نیک کام میں خلل نہیں ڈالے گی اور انعام حاصل کرے گی" وہ یہ کہتی ہے۔ اور تقدیر کے ہونٹوں پر ہمیں ایک خندۂ استہزا نظر آتا ہے۔ سبھدرا کیا جانے کہ تقدیر کی ناقابل فہم روش اُس کے سہاگ کے جنازے کے سامان اُسی کے ہاتھوں تیار کرا رہی ہے۔ لیکن منشی صاحب اُسے بے خبری ہی میں مارنا نہیں چاہتے۔ اور نہ ہی یکایک افسانے کو انجام پر لانا چاہتے ہیں۔ ایکشن کی رفتار میں ایک وقار ہے۔ وہ

س وقار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو چھچھورا پن پیدا نہیں کرنا چاہتے وہ اس نیک کام کی حقیقت عریاں کر دیتے ہیں۔ شادی کشیو کے پیارے شوہر سے ہونے والی تھی۔ یہ ضرب سجدرا کیلئے ایسی تھی۔ جسنے اُسے رلا دیا۔ "وہ کشیو کے ساتھ شادی کا ارادہ ضرور انجام کرے گی" اور اس طرح وہ منصوبے خاک میں ملادیگی جو اس کی تباہی کے لئے گئے بارہے ہیں۔ یہاں منشی صاحب پھر اپنے روشن رنگ میں ہیں۔ ہمیں نتیجہ کے لئے بیقرار کرتے ہیں۔ اور بغیر کسی مدافعت کے سجدرا کو شکست دلواتے ہیں۔ "وہ رکتی ہوئی بولی۔۔۔ ہاں انہوں نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔" ارملا کے یہ الفاظ کافی سے زیادہ تھے سجدرا پڑی تک تک کر بے حال ہو رہی تھی۔ جب اُس نے چوٹ لگانے کی کوشش کی۔ تو وہ اسی پر پڑی۔ یہ ظاہر ہے کہ ناکامی کی نفرت کا نتیجہ مایوسی ہوتا ہے۔ اور مایوسی یا تو پر و بال نوچ ڈالتی ہے یا پرواز کے جذبہ کو زیادہ مشتعل کر جاتی ہے۔ عورت ناکامی سے چڑ جاتی ہے منشی صاحب سجدرا کو اُس مقام پر لے آتے ہیں جہاں عورت انتہائی یاس کی صورت میں پہنچتی ہے۔ وہ اپنی امیدوں کے قاتل کو قتل کرے گی۔ ایک مصمم ارادہ لئے ہوئے وہ پستول لیکر اُس مندر پر پہنچتی ہے۔ جہاں کشیو اور ارملا بیاہے جانے والے تھے "کیا وہ اپنے خوفناک ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے گی؟" ہاں ذہن میں تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ سجدرا مندر میں پہنچ کر دولہا دلہن کو دیکھتی ہے۔ اپنا وقت یاد آتا ہے اور واقعات ماضی میں کھو کر خود فراموشی تک پہنچ جاتی ہے۔ شادی ختم۔ اور سجدرا کھوئی کھوئی سی واپس ہوتی ہے۔ لیکن اب وہ کیا کرے گی؟ خودکشی؟ لیکن منشی صاحب انسانی خون گرانا نہیں چاہتے۔ وہ کہانی کو ایک اور دلچسپ رنگ دیتے ہیں۔ سجدرا کے دل سے بغض و حسد رخصت ہو چکا ہے۔ اُسکی سوت اُس کے گھر آتی ہے لیکن اب سجدرا کے دل میں زہر کی بجائے محبت چھلک رہا تھا۔ وہ انتہائی فیاضی سے اپنے گہنے ارملا کو پہنا دیتی ہے۔ یہ سجدرا اور کشیو کی ملاقات کا پیش خیمہ ہے۔ کشیو زیور پہچان لے گا۔ منشی صاحب نے خوب چالاکی سے واقعات کو اس طرف رجوع کیا ہے کہ کشیو پہنچتا ہے۔ اور یہاں فطرت نگار قلم پھر جولانی میں دکھائی دیتا ہے کہ کشیو کو شکست ملی تھی جو سجدرا کی فیاضی اور ایثار نے دی تھی اُس کے خونی ارادے نے نہیں۔ وہ مغلوب ہے بے زبان کلام نہیں۔ یہ منشی صاحب کی وسیع النظری ہے کہ وہ الفت باہمی کی تجدید نہیں کرتے۔ اور نہ ہی مصالحت کراتے ہیں۔ دونوں کو بیگانے خطا کرتے ہیں اور کامیابی سے۔ اگر وہ یہاں کوئی سمجھوتہ کرانے تو ہمیں پیچیدگی کے لئے وہ ہمیں یہاں تک لے آئے ہیں وہ ہمیں غلطی اور ہمیں مایوس ہونا پڑتا۔

سجدرا انگشت کیوں آئی؟ کشیو کی محبت سے کھنچی ہوئی۔ یہ احساس کشیو کے دل میں پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تجدید الفت کا بیج بو دیا جاتا ہے۔ کونپل بھی نکلتی ہے کشیو رات کے دس بجے سجدرا سے ملنے جاتا ہے جیسا کہ واقعات بتا رہے تھے لیکن ایک مجرم کے شکوک دل میں لے کر لیکن۔ ہاں مسز کشیو کے نام ایک پیکٹ ملتا ہے۔ یہ کونپل خشک ہونے لگتی ہے اور پیکٹ کے کھلنے پر گر پڑتی ہے۔ پیکٹ میں کیا تھا؟ ایک زرد رنگ کی ساری چھوٹی سی سیندور کی ڈبیہ۔ اور کشیو کی عکسی تصویر اور ایک لفافہ جس میں لکھا تھا "بہن میں جاتی ہوں" "یہ میرے سہاگ کا جنازہ ہے" کہنے کو تو ایک جملہ ہے۔ مگر اس میں ایک دنیائے حسرت آباد ہے اس میں ارمانوں کے منہدم شدہ محل کے اجزائے منتشر نظر آتے ہیں تمناؤں کے خون کی بو اس سے آتی ہے

اگر منشی صاحب "بہن میں جاتی ہوں" نہ لکھتے تو اور بھی اچھا ہوتا اس افسانہ میں ایکشن کی رفتار میں وہ سرعت نہیں جو "راجپوت کی بیٹی" میں ہے۔ اور افسانہ کے ماحول کے زیر نظر ایکشن میں غیر معمولی سرعت غیر فطری سی بن جاتی۔ تمام فضا پر ایک حسرت محیط ہے۔ اور حسرت کڑوی ہوا کرتی ہے۔ اور کڑوی چیز رک رک کر ہی اترتی ہے اس سلسلہ میں منشی صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اپنے

افسانے کے جملہ لوازمات کو برقرار رکھا۔ کردار نگاری میں سعیدہ کی تصویر تمام سیاہ و سفید اور زرد و سرخ کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بالخصوص اُس کی سوت سے ملاقات اور پھر اس سے برتاؤ منشی صاحب کے فطرت نگار قلم کی ایک مثال ہے۔ کیشو کے کیریکٹر میں بھی ہمیں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ اُسے ٹھگ دیا گیا تھا عورت کے عشوہ و ناز کے سامنے کمسنی ... دیر تک آدمی محفوظ کہاں رہ سکتا ہے جس ماحول کی تصویر آپ نے کھینچی ہے۔ وہاں ایک بھی نہیں ملے گا۔ جو تھوڑے عرصہ کے لئے ان تیروں اور تلواروں سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس لئے کیشو کا طریق کار اخلاقی نقطۂ نظر خواہ کیسا ہو۔ وہ بے وفا کہلائے لیکن واقعات کی رفتار میں وہ وہی کچھ کر سکتا تھا جو اُس نے کیا۔ اس لئے ہم اُس کے عمل کی مذمت نہیں کر سکتے۔

سطور بالا سے ظاہر ہوگا کہ منشی صاحب کو ٹریجیڈی بہت پسند ہے۔ اور اس بات کا راز یہ ہے کہ وہ دنیا کی حقیقت سمجھ چکے ہیں۔ جانتے ہیں کہ یہاں ٹریجیڈی ہے لیکن اُن کی ٹریجیڈی میں تقدیر کی کارفرمائی کو بھی کافی دخل ہے۔ اور اس کے باوجود وہ اپنے کردار کی انفرادیت نہیں کھوتے۔ اُنکے کردار۔ چلتے پھرتے باتیں کرتے انسان ہیں۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ آپکے قلم کے ساتھ ساتھ کاتب تقدیر بھی مصروف تحریر ہوتا ہے۔ اُن کے کردار کرتے کچھ ہیں اور کسی خاص مقصد کے لئے لیکن نتیجہ خلاف توقع برآمد ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ عشق اور "وفا و مشکلہا" کے فلسفہ سے خوب واقف ہیں۔ اور اس بات نے انہیں ٹریجیڈی کی طرف راغب کیا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر ٹریجیڈی سے لطف اندوز ہونا صرف ایک انتہائی طور پر مہذب و ترقی یافتہ قوم کا حصہ ہے" تو ٹریجیڈی لکھنا بھی ایک انتہائی طور پر مہذب و ترقی یافتہ دماغ کو ودیعت ہوا ہے۔ معمولی دماغ اس کے ایک کنارہ کو بھی اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ اس کی وسعت کسی چھوٹے سے دماغ کی تنگنائے میں نہیں سما سکتی۔ اور یہاں ہم یہ کہنے کے لئے مجبور ہیں کہ اس لحاظ سے ابھی اردو کی دنیائے افسانہ نے منشی پریم چند کا ثانی پیدا نہیں کیا

مضمون ختم کرتے ہوئے ہمیں یاد پڑتا ہے۔ کہ افسانوں کی دلچسپی کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ کیونکہ قصہ گوئی حقیقت سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ "دلچسپی انسانی روح رواں ہے" منشی صاحب کے افسانوں میں دلچسپی ہے یا نہیں ایک ترقی یافتہ انسان خود اندازہ لگا سکتا ہے۔ البتہ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ دلچسپی کے لئے کوئی خاص ذرائع استعمال نہیں کرتے آپکا موضوع رومانٹک ہو یا مشکلات کی کوئی شاخ آپ اُسے نبھاتے ہی ایسے طریقہ سے ہیں جو کافی سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے لیکن آپکے ہاں جو دلچسپی ملتی ہے وہ اوچھے پن سے نہیں ملتی۔ نہ اُسمیں عامیانہ مذاق نظر آئیگا۔ اور نہ ہی منشی صاحب ہماری دلچسپی کے لئے کسی شعبدہ بازی سے کام لیتے ہیں آپ سچ کہتے ہیں۔ وہ سچ جو دنیا میں ہو رہا ہے لیکن افسانے میں لاکر اور کہتے ہیں انتہائی سنجیدگی سے چھچھورے پن سے نہیں اور اس سنجیدگی میں جو دلچسپی ہمیں محسوس ہوتی ہے وہ کبھی کبھار اردو افسانوں میں ملتی ہے۔ دلچسپی اسی بات میں نہیں کہ کوئی محیر العقول واقعہ یا کوئی حیرت افزا منظر دکھا دیا جائے۔ دلچسپی وہ ہوتی ہے کہ ہم آہستہ آہستہ مصنف کے ہمنوا ہوتے جائیں۔ اور اپنے آپکو اس افسانے کی فضا میں کھوتے جائیں۔ افسانے کے کرداروں میں ہم اپنی ذات نظر آئے اُنکا فعل ہمارا فعل دکھائی دے۔ اُنکی حرکات اپنی حرکات معلوم ہوں۔ اُنکے درد سے ہمارے دل میں ٹیس پیدا اُن کی خوشی میں ہمارے منہ سے بھی قہقہہ نکلے۔ یہ ہوتا ہے دلچسپی کا اور اس لحاظ سے منشی صاحب کے کامیاب افسانے دلچسپی سے خالی نہیں

جناب اختر صہبائی، ایم اے ایل ایل بی

جامِ صہبائی

یہ دورِ کشش خلد و روئے زیبائے بہار
یہ جشنِ ازل کی جانِ غنائے بہار
یہ ارض و سما میں ایک ہنگامۂ شوق
لائے ہیں پیامِ کس کا گلہائے بہار

سامانِ صد اضطراب ساماں کی تلاش
سو دید کا ایک دردِ درماں کی تلاش
اپنی ہی تلاش میں سرگشتہ شب و روزِ ازل
شیطاں کی تلاش کر رہی یزداں کی تلاش

رنگینیِ ہست البیلی نوا سے کی بہار
اور نغمہ و رنگ بن کے چھپی تیکھی بہار
بے جوش ترے بھی ان اوراق آتشیں کیا
گزری ہوئی محفلیں بھی لا سے گی بہار

تھا کتنا طرب فزوں ز اندازۂ شباب
پُر نغمہ جس سے تھا ہر اک سازِ شباب
پھر نغمۂ جس سے آواز میں رنگ
ہر شے میں جمال تھا بہ آغازِ شباب
آغازِ شباب آہ آغازِ شباب

جناب سید علی عباس حسینی ایم اے

پوتّر برہمن

آگرہ کا سٹیشن، گرمیوں کا زمانہ، مسافروں کا ہجوم، پھر صرف آنٹرو رجے کا ٹکٹ، اگر میں گھبرایا ہوا تھا تو کوئی جائے تعجب نہیں۔ ڈر تھا کہ گاڑی بھری ہوئی آئے گی۔ اطمینان سے لیٹنے بیٹھنے کی جگہ نہ ملے گی۔ راستہ بھر ہنگامہ، شور و شغب رہے گا۔ اور نہ معلوم کتنی قسم کی نئی ہڑلیوں کا دھواں انگیز کرنا پڑے گا۔ میں نے اسی لئے اس دن کا لیڈر، پائنیر، اسٹیٹسمین اور ہندوستان ٹائمز خرید لیا۔ پھر وہیلر کے کتاب گھر سے اوپنہم کا ایک تازہ ترین ناول خرید لیا کہ میری رائے میں انگریزی مصنفین میں ویلس اور وڈ ہاؤس کی طرح اوپنہم کی کتابیں بھی ریل کا سفر کاٹنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اس مصنف میں "شرلک ہومس" کے مصنف کی طرح قوت استقرا تو نہیں لیکن اس کے پلاٹ میں پیچیدگیاں الجھاوے اور اسرار نیلی چھتری سے زیادہ قرین عقل ہوتے ہیں۔ پھر اس کی تحریروں میں جو ایک شگفتہ ظرافت ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جو اس مصنف کو مہذب و متین طبائع کے لئے مرغوب بنا دیتی ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ جیسا عرض کیا، میں نے اخباروں کے ساتھ ساتھ اوپنہم کا ایک پھڑکتا ہوا ناول بھی خریدا۔ اور اب گویا پوری طرح مسلح ہو کر اپنے آرام و اطمینان کی دشمن بی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

بارے بی صاحبہ آئیں۔ خراماں خراماں، جھجکتی، ٹھٹکتی، بل کھاتی، انگڑائیاں لیتی آئیں۔ اور ان کے رکتے ہی مسافروں کا ٹڈی دل ان پر ٹوٹ پڑا۔ اترنے والے مسافر ڈبوں میں کھڑے ہیں، قلی ان کا سامان اتارنے کی فکر میں منہمک ہیں۔ مگر جانے والوں مسافروں کے قلی ان پر اس طرح غرا رہے ہیں جس طرح کوئی کتا اپنے محلہ میں اپنے کسی اجنبی ہم جنس کو دیکھ کر غراتا ہے۔ اس عجلت کے دو سبب ہیں۔ ایک تو اپنے مسافر کے ساتھ ہمدردی جتا کر اس سے مقررہ و موعودہ مزدوری کے علاوہ انعام لینے کا بہانہ۔ دوسرے اپنے بابوجی کو ٹھکانے لگانے کے بعد اترنے والے مسافروں میں سے کسی کی گٹھڑی اٹھانے جانے کی امید! چنانچہ میرا قلی بھی نہ جانے کتنے قلیوں کو ٹھڑ کتا اور بیسیوں مسافروں سے بھڑتا میرے اسباب سمیت ایک ڈبے میں گھس ہی تو گیا۔ اور میرا بکس اور بستر ایک خالی "برتھ" پر رکھ کر ایک اترنے والے مسافر سے مزدوری چکانے لگا۔ مجھے بھی اپنے اسباب کی خاطر مع اپنے اخباروں اور ناول کے اس کشمکش سے گزر کر اسی ڈبے میں داخل ہونا۔۔۔ پڑا اور میں نے جھٹ پٹ اپنا بستہ کھولکر پوری برتھ پر پھیلا کر اس پر قبضہ جما لیا۔

یہ ریل پیل اور یہ ہنگامہ صرف چند ہی منٹ کا تھا۔ اسلئے کہ میرا پورا ڈبہ اس اسٹیشن پر خالی ہو گیا۔ اور گاڑی چھوٹنے سے پہلے ہی میں سالکرک کی طرح "جو کچھ نظر آتا تھا ان سب کا مالک و مختار تھا۔" میں نے پسینے میں ڈوبی ہوئی شیروانی اتار کر اپنی برتھ سے قریب والی کھونٹی پر لٹکائی، پان اور سگریٹ کی ڈبیاں سرہانے تکئے کے نیچے رکھیں، پرس کرتے کی جیب میں ڈالی اور سارے اخبارات و رسائل پہلو میں رکھ کر بنچ پہ دراز ہو گیا۔ مگر برتھ سے پیٹھ نہ لگنے پائی تھی کہ محسوس ہوا کہ جل گیا۔ سیٹ اس قدر گرم تھی کہ الامان والحفیظ۔ اور فضا میں لو کے جھونکے،

تھے۔ بلکہ آگ کے لوکے۔ نہ معلوم آگرے کی سرزمین میں اس بلا کی حدت کہاں سے آگئی ہے۔ شاید یہ ہزارہا کشتگانِ ناحق کے خون کی حرارت ہے۔ جس سے اس شہر کی مٹی کا خمیر بنا ہے۔ یا یہ اس آتشِ عشق کا ہے۔ جس نے شاہجہان کو تاج سا عجیب و غریب مقبرہ بنوانے پر بھی ایک لمحہ چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ بہر نوع وجوہ خواہ جذباتی ہوں یا کیمیائی۔ جغرافیائی ہوں یا شاعرانہ۔ نتیجہ یہی کہ آگرے سے ملتا جلتا شہر جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ ہندوستان بھر میں کم ہی نکل سکے گا۔ میں نے اسی لئے پٹنہ سے وہی کام لینا شروع کیا۔ جو آپ کو اس اخبار کے اشتہار کے سلسلے میں چند پولیس اکثر لیتے دکھائی دیگا یعنی بجائے اسے پڑھنے کے اس سے پنکھا جھلنا شروع کیا۔

ابھی پسینہ خشک بھی نہ ہونے پایا تھا اور میں مذکورہ اشتہار کے اس ٹکڑے پر کہ "تم اسے پڑھ بھی سکتے ہو" عمل پیرا ہونے کا قصد ہی کر رہا تھا کہ دفعتہً گاڑی کا دروازہ کھلا اور ایک بابو جی داخل ہوئے یہی کوئی بائیس چوبیس برس کے ہونگے۔ ننگے سر بال چھوٹے چھوٹے مشین سے کٹے ہوئے، پیشانی پر قشقہ، قمیص، دھوتی، اور چپل پہنے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اینچی، دوسرے میں ایک کمبل میں تکیہ لپٹا ہوا۔ آئے اور برابر والی برتھ پر کمبل بچھا اور تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ اینچی کو انہوں نے اسی طرح سامنے رکھ لیا جس طرح پان بنانے والیاں پاندان سامنے رکھکر بیٹھتی ہیں۔

میں نے اُن کی شکل و صورت کا اخبار کے پیچھے سے جائزہ لیا چہرے مہرے سے خاصے تیز اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ پیشانی بڑی اور چمکتی ہوئی۔ آنکھیں اوسط قد کی بھوری۔ کلا چوڑا، دانت سپید چمکتے ہوئے، داڑھی مونچھ دونوں صاف ٹھوڑی بڑی اور بیچ میں ذرا دبی ہوئی۔ قد و قامت اوسط اور جسم سڈول۔ بحیثیت مجموعی اک جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔

انہوں نے اپنا اینچی کھولا اور اس میں سے اوپر ہی رکھا ہوا تولیہ نکالا، چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھا پھر میری طرف مڑ پڑے۔

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"کانپور" میں نے کہا۔

"کیا وہیں دولت خانہ ہے؟" پھر سوال کیا گیا۔

"جی نہیں۔ دو ایک دن کے لئے وہاں قیام کر کے چند دوستوں سے ملنا ہے۔" میں نے ذرا روکھے پن سے کہا۔

اس خیال سے ممکن ہے کہ کوئی اور سوال کر بیٹھیں اور میں اپنے اخبار اور ناول کے پیچھے بھی نہ وصول کرسکوں۔ جلدی سے ان کی طرف "لیڈر" بڑھا کر میں نے کہا "لیجئے آج کا لیڈر ملاحظہ فرمائیے۔"

انہوں نے شکریہ کے ساتھ اخبار میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور گاڑی رینگ چلی۔ میں اخبار دیکھنے میں مشغول ہو گیا مگر یہ بار بار محسوس کرتا رہا کہ جس طرح گاڑی پٹڑیاں بدلتی رہی اسی طرح میرے ساتھی بھی پہلو بدلتے رہے وہ جلدی ہی جلدی اخبار کے سارے ورق الٹ گئے پھر انہوں نے کھڑکیوں سے جھانکنا شروع کیا، پھر سیٹی بجانے لگے۔ پھر اینچی کھولا۔ اس میں سے کچھ کاغذات نکالے۔ انکو الٹتے پلٹتے رہے۔ پھر انہیں بھی رکھ کر تولیہ سے منہ اور گردن کا پسینہ پونچھا۔ اور میری جانب بڑی حسرت سے تکنے لگے۔

میں نے اُن کی بے چینی سے متاثر ہو کر بالآخر اخبار رکھ دیا اور پوچھا "کیا کوئی دوسرا اخبار دوں؟"

وہ عجیب طرح مسکرا کر بولے "جی نہیں میں نے ابھی یہی نہیں پڑھا۔" میں نے پھر اپنا اخبار اٹھایا۔ وہ فریادیوں کی طرح ہاتھ پھیلا کے بولے "اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ آپ بھی اخبار نہ پڑھیں۔" میں نے انہیں ذرا چیں بجبیں ہو کر دیکھا۔ وہ بعجلت بولے "میرا مطلب یہ ہے کہ بجائے اخبار بینی کے ہم کچھ باتیں کریں"

میں اس عجیب وغریب فرمایش پر یقیناً کوئی سخت جواب دیدیتا۔ مگر میں اُنکے ملتجی چہرے اور اُنکے حسرت بھرے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ شخص انسانی ہمدردی کا حد درجہ بھوکا تھا اسکے دل پر کسی اہم راز کا بوجھ تھا۔ جسے وہ کسی اجنبی سے کہکر ہلکا کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اخبار رکھدیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور ان کی طرف سگریٹ کی ڈبیا بڑھا کر کہا:۔ "بسم اللہ شوق کیجئے"

انہوں نے تسلیم کر کے ایک سگریٹ نکال لی۔ پھر میری طرف اسی کو بڑھا کر بولے "اب آپ میری جانب سے اسی سگریٹ کو پیجئے"۔ میں نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ وہ بولے "جی میں اس نعمت سے محروم ہوں"۔ میں نے ان سے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا دولت خانہ لکھنؤ ہے؟"

انہوں نے مجھے استعجاب سے دیکھ کر پوچھا "جی ہاں، مگر یہ آپ نے کیونکر جانا؟"

میں نے کہا: "آپ کی گفتگو اور تہذیب سے!"

وہ بولے "جی ہاں، غریب خانہ وہیں ہے۔ میں برہمن ہوں اور وہ بھی بڑے کٹر برہمنوں کے خاندان سے۔ اس لئے اس طرح کی کوئی چیز استعمال نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا: "تو آپ بڑے خوش قسمتوں میں سے ہیں۔ ہم لوگ خواہ مخواہ پیسے بھی ضائع کرتے ہیں اور صحت بھی برباد کرتے ہیں۔"

کہنے لگے "جی آپکا ارشاد بجا درست ہے۔ مگر یہ بھی ضرور ہے کہ لطفِ صحبت بغیر ان چیزوں کے حاصل نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "خیر یہ تو آپ میرے خیال اور خاطر سے کہتے ہیں۔ مگر اتنا ضرور سچ ہے کہ بعض اوقات اس سگریٹ سے غم غلط کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔"

میری زبان سے "غم" کا لفظ نکلتے ہی انکے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہوں نے جلدی میرے ہاتھ سے سگریٹ لیکر منہ سے لگا لی۔ میں نے دیکھا اُنکے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور چہرے کی زردی پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی میں نے ان کی طرف دیا سلائی بڑھا دی۔ انہوں نے سگریٹ جلائی۔ جلدی جلدی اُسکے دو تین کش کھینچے اور کھانسنے لگے۔ اُن کے آنسو آنکھوں سے بہکر گالوں پر آگئے۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ "اجی اسے پھینک دیجئے۔ آپ عادی نہیں ہیں چکر آجائیگا۔"

انہوں نے سگریٹ پھینک دی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر سسک سسک کر رونے لگے۔

میں گھبرا کر اپنی سیٹ سے اٹھا۔ اور اُنکے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ میری قربت محسوس کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

اب ذرا آپ میری بے بسی کو محسوس کیجئے۔ ایکسپریس پوری رفتار سے چلی جارہی ہے۔ پورے ڈبے میں ہم دو آدمی ہیں۔ دونوں اجنبی ضرور ہیں مگر دونوں پڑھے لکھے نوجوان۔ آپس میں اب تک جتنی باتیں ہوئیں وہ بھی تہذیب و شائستگی کی۔ اُن میں سے ایک اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے دفعتہً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے دوسرا سوائے اس کے اور کیا کرسکتا ہے کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اس کی دلدہی کرے۔ اور اُسکے غم کی وجہ دریافت کر کے اس سے اظہارِ ہمدردی کرے۔ یہی انسانیت کا تقاضا ہے۔ اور یہی فطرت و بشریت کا اقتضا۔ میں نے اُن کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "پنڈت جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ذرا خود کو سنبھالئے۔ اس طرح کا رونا تو مردوں کو زیب نہیں دیتا!"

وہ سسکتے ہوئے بولے: "مگر جس طرح کا غم مجھ پر پڑا ہے۔ اگر پہاڑ پر بھی پڑتا تو وہ بھی پانی ہو کر بہہ جاتا۔ میں تو پھر انسان ہی ہوں۔"

میں نے کہا: "تو آپ مجھ سے بیان کر ڈالئے۔ اس سے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ اور طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔"

انہوں نے اپنے تولئے سے آنسو پونچھ ڈالے میں نے اپنی جیب سے چند الایچیاں نکال کر انہیں دیں۔ وہ انہوں نے جلدی جلدی

جاؤں گا۔ پھر بولے "آپ نے سچ کہا ہے۔ مجھے زیادہ تکلیف شاید اسی لئے ہے کہ میں نے آج تک کسی سے اس قصے کو بیان نہیں کیا۔ مجھے خاندان کے نام کی بڑی لاج تھی۔ آپ اجنبی ہیں، ریل کا ساتھ ہے۔ خدا جانے آپ سے پھر کبھی اس جنم میں ملاقات ہو یا نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں آپ سے کہہ ڈالنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیں، میں بھی اسے کبھی زبان پر نہ لاؤں گا۔"

وہ میری طرف مڑ کر بولے "اچھا تو سنئے۔ میں نے جیسا کہ آپ سے عرض کیا۔۔ کال کبجی برہمن ہوں۔ اور میرا خاندان بڑا کٹر ہے۔ بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ میں اپنے گھر کا پہلا آدمی ہوں جس نے انگریزی پڑھی۔ ورنہ میرے خاندان میں کسی نے سوائے فارسی اور سنسکرت کے کوئی دوسری زبان پڑھی ہی نہیں۔ سب ہمیشہ ہندو تعلقہ داروں کے خاندانی پروہت رہے۔ میرے متعلق بھی یہی خیال تھا۔ مگر میرے والد نے مجھے غیر معمولی طور پر تیز دیکھ کر کچھ کشمیری دوستوں کے اصرار پر انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا۔ سارا خاندان اس پر اُن سے خفا ہو گیا۔ دو چار نے تو کھانا پینا۔ آنا جانا بند کر دیا۔ مگر وہ بھی اپنی ضد پر قائم رہے۔ اور میں انگریزی پڑھتا رہا۔ بس انہوں نے اتنا ضرور کیا کہ مجھے انگریزی کے ساتھ ساتھ اپنی آبائی زبان سنسکرت اور مغلیہ تہذیب کی یادگار فارسی بھی پڑھاتے رہے۔ میں تمام امتحانات میں اول آتا رہا بلکہ دو چار درجوں میں میں نے ایسے انعامات بھی پائے جو شاید ہی کسی کو اس اسکول میں ملے ہوں۔ یہ دیکھ کر پتا جی کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ اور انہوں نے طے کر لیا کہ وہ مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ جس سال میں نے انٹرنس کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ اُنکی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انہوں نے مجھے خبر بھی نہ دی اور اپنے مخصوص دوستوں سے قرض لیکر ایک بہت بڑا ہون کیا اور برادری بھر میں مٹھائیاں تقسیم کیں۔ ایف۔ اے کی تعلیم کا انہوں نے کیونکر انتظام کیا۔ اسے بھگوان جانے۔ مگر کتابوں کے دام دیتے وقت ماتاجی نے یہ ضرور کہا کہ "بیٹا خوب جی لگا کر پڑھنا۔ اور ایسا کچھ کرنا کہ برادری بھر میں ہماری ناک اونچی رہے۔" میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہو گا۔ کیننگ کالج میں نام لکھوایا اور پڑھنا شروع کیا۔ وہاں تعلقہ داروں کے لڑکوں کا ساتھ۔ اُن سے ہر وقت کا ملنا جلنا۔ خواہ مخواہ ٹھاٹ باٹ بڑھنے لگا۔ ماں باپ کا یہ حال کہ جو کچھ میں کہتا وہ جیسی خوشی پورا کرتے۔ سائیکل لے دی۔ سوٹ بنوا دیئے۔ فاؤنٹن پن خرید دیا۔ اور علاوہ تمام خرچوں کے دس روپیہ ماہوار بطور جیب خرچ کے دیتے رہے۔ یہ رقم روزانہ کے چاٹ کے لئے مشکل سے کافی ہوتی۔ پھر سینما کا بھی شوق۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی اور میرا فیشن بڑھتا ہی گیا۔ لیکن پتا جی اور ماتاجی کے چہرے پر ملال نہ تھا۔ لوگ اُن سے میری شکایت کرتے۔ میری فیشن پرستی اور فضول خرچی کی کتھا بیان کرتے۔ مگر وہ مجھے نہ ڈانٹتے اور نہ روکتے۔ اُنکو خود پر پورا بھروسا تھا۔ بہرحال ایف۔ اے کا امتحان سر پر آ پہنچا اور میں تیار تو نہ تھا مگر بیٹھ گیا۔ محنت بھی کی تھی تو وہی آخری وقت جب نتیجہ نکلا تو میں پاس تو ہو گیا مگر تیسرے درجے میں۔ بابوجی کو اتنا رنج ہوا کہ وہ بیمار ہو گئے۔ انہیں دل کی بیماری پہلے ہی سے تھی۔ میرے تیسرے درجے میں پاس ہونے سے زیادہ ہم چشموں کے طعنے اور برادری والوں کے ہنسنے نے اُنکے ساتھ وہی کیا جو ٹمٹماتے ہوئے دیئے کے ساتھ ہوا کا تیز جھونکا کرتا ہے۔ ایک دن اُن کے دل کی حرکت دفعتہً بند ہو گئی۔ اور میرے لئے ساری دنیا اندھیری رات بن گئی!

پتا جی کا کریا کرم جیسے بنا کیا گیا۔ ہاں اُنکے انجام دینے میں ماتاجی کی سونے کی منسلی ہاتھوں کے کڑے اور کچھ چھوٹے چھوٹے زیور بیچ ڈالنا پڑے۔ اب آپ ہی سمجھئے کہ میں اچھا خاصا ہٹا کٹا جوان، ایف۔ اے پاس بجائے اسکے کہ ماں کو کما کر کھلاتا، ان کو ڈھارس دیتا۔ ان کا سہارا بنتا۔ بیکاروں کی فہرست میں نام لکھوائے

بیٹھا تھا اور باپ کے آخری کاموں کے لئے ماں کے زیور لوگوں کے ہاتھ اونے پونے بیچ رہا تھا میرے دل پہ جو کچھ گذر تی تھی وہ آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے نوکری ڈھونڈھنا شروع کردی۔ مگر نوکری تلاش کرلینا آج کل اتنا ہی آسان کام ہے جتنا کہ پیال سے لدی ہوئی بیل گاڑی میں چھپا کر رکھے ہوئے زعفران کے بیج کا ڈھونڈھ نکالنا۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر، ایک دوکان سے دوسری دوکان، ایک بنگلے سے دوسرے بنگلے، ایک کارخانے سے دوسرے کارخانے پھیرا کرتے کرتے پاؤں گھسنے لگتے۔ جوتے کا تلا واقعی گھس گیا۔ مگر نوکری کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

خیر یہ مصیبتیں تو ہر نوجوان کو جھیلنا پڑتی ہیں میرے معاملے میں جو بری بات ہوئی وہ یہ تھی کہ جیسے جیسے میری مایوسی بڑھتی جاتی تھی ویسے ویسے مجھ میں جھلاہٹ پیدا ہوتی جاتی تھی۔ نہ کوئی بہن تھی نہ کوئی بھائی تھا اور نہ اب کوئی نوکر چاکر کہ اس پر یہ غصہ نکلتا، بس ماتا جی تھیں اور میں تھا۔ اسی لئے ساری جھلاہٹ کا نشانہ وہی بنتیں! وہ سیدھی بات بھی کہتیں تو میرے مرچیں سی لگ جاتیں، انکی ہمدردی دشمنی معلوم ہوتی۔ اور ان کی مامتا بالکل بکاری اور خودغرضی!"

میں سگریٹ جلانے لگا تو انہوں نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا میں نے پھر ایک سگریٹ کا خون گیا۔ انہوں نے اُسے بڑی مشکلوں سے جلایا۔ اور دو تین کش جلدی جلدی کھینچے۔ عادت نہ ہونے سے کھانسی جو آئی تو انہوں نے اُسے چٹکیوں میں مسل ڈالا۔ پھر ذرا رُک رُک کر بولے:۔

"بھگوان ہی جانے کہ واقعی مامتا کوئی چیز ہوتی بھی ہے یا نہیں مجھے تو اس میں بڑی خودغرضی دکھائی دیتی ہے۔ ماں باپ بچوں سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ انہیں بہت دکھ پاکر پاتے ہیں مگر جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے جاتے ہیں ان سے محبت محض اسلئے رہ جاتی ہے کہ وہ بالکل اُنکے محکوم ہوتے ہیں۔ اُنکے اشاروں پہ بندوں کی طرح ناچتے ہیں۔ بڑے ہوگئے خاصے جوان ہیں اپنا برا بھلا سوچ سمجھ سکتے ہیں۔ مگر ذرا ماں باپ کی رائے کے خلاف چلے:۔ ساری محبت ختم ہوگئی آنکھیں بدل گئیں ہر شخص سے کہتے پھرتے ہیں جی وہ میرے کہنے میں نہیں جائے جہنم میں بات کیسے معلوم تھا کہ ہم سانپ بچھو پال رہے ہیں کہ بڑا ہوتے ہی ڈسے گا! غرض مجھے تو صاحب یہ مامتا وامتا سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا معلوم ہوتی ہے۔"

غالباً میرے چہرے سے وہ سمجھ گئے کہ میں اُن کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتا۔ اس لئے جلدی سے بولے۔ "جی میں بحث کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ آپ خود ہی میری آپ بیتی سن لیں اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ خیر تو یہ کہہ رہا تھا کہ میں نوکری ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اتنا عاجز آگیا تھا۔ کہ مجھے اکثر یہ خیال آتا کہ لاؤ ماتا جی کو ختم کرکے اپنے کو بھی چھرا بھونک لوں کہ سارے جھگڑوں سے فرصت ملے۔ . . . کاش میں نے ایسا اسی وقت کرڈالا ہوتا تو آج! . . ."

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر تھوڑی دیر کانپتے رہے پھر آہستہ آہستہ بولے: "ٹھیک اس وقت جبکہ میں دنیا سے مایوس ہوچکا تھا۔ بابو لچھمی پرشاد صاحب آگئے۔ یہ ذات کے کرمی ہیں اور آریہ سماجی۔ مگر پتا جی کو بہت مانتے تھے۔ شاید کسی وقت ان سے دو چار کتابیں پڑھی تھیں۔ بابو لچھمی پرشاد متھرا سے ایک ہندی اخبار نکالتے ہیں اور وہاں ان کا بڑا اثر اور بڑی عزت ہے۔ وہ اس زمانے میں کسی کام سے لکھنؤ آئے تو انہوں نے پتا جی کے مرنے کی خبر سنی۔ ہمارے ہاں مجھ سے اور ماتا جی سے ملنے آئے ماتا جی نے رو رو کر بابو جی سے سارا دکھ کہہ ڈالا۔ بابو جی پر بہت اثر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے متھرا ساتھ چلنے کو کہا۔ ماتا جی نے بھی اصرار کیا۔ اور میں تین دن بعد بابو جی کے ساتھ متھرا پہنچ گیا۔

متھرا پہنچتے ہی میری زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب آگیا بابو لچھمی پرشاد جی کی سجی ہوئی بڑی کوٹھی میں۔ رہنے کے لئے ایک

عمدہ کمرہ۔ اچھے سے اچھا کھانے کے لئے ایک باورچی خانہ اور انہیں کے اخبار کے دفتر میں ملازمت۔ مگر ان سب چیزوں سے زیادہ جس نے کایا پلٹ کر دی وہ ان کی تیرہ برس کی لڑکی رمو تھی۔ میں اس کی صورت شکل آپ سے کیا بیان کروں؟ ایک اوسط قد کی دبلی پتلی لڑکی، گندمی رنگ، ہنس مکھ چہرہ، آنکھیں بڑی بڑی، شرارت سے بھری ہوئی، ہر وقت ہنستی اور چھیڑ چھیڑ کر ہنساتی تھی۔ ایک سیکنڈ اس سے نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا کبھی مجھ سے بحث کر رہی ہے کبھی کسی اور سے ممکن ہی نہیں کہ آپ اُس کے قریب بیٹھے ہوں۔ اور پھر آپ کے چہرے پر شکن بھی ہو، آپ کو کسی امر کا غم بھی ہو یا آپ کسی بات کی فکر بھی کر سکیں۔ اگر آپ بابوجی کے سن کے ہو تو مجھے تو علیحدہ بیٹھے ہنستے ہونگے۔ لیکن اگر آپ کہیں نوجوان ہیں، میں نے فکر بھگت، تو آپ لاکھ متین بننے کی کوشش کریں مگر تھوڑی ہی دیر میں رمو کی شرارتوں میں شریک دکھائی دیں گے اور عجب نہیں جو اسکے ساتھ فرش پر قلا بازیاں کھاتے ہونگے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے گا۔ کہ رمو کوئی بے وقوف مسخری لڑکی تھی جی نہیں وہ بلا کی ذہین بھی تھی اور اُس کا حافظہ تو شاید ہی کسی کو ملا ہوگا وہ جس کتاب کو ایکبار پڑھ لیتی وہ اسے حرف حرف یاد ہو جاتی، وہ بابوجی کا پورا پورا ایڈیٹوریل اخبار دیکھنے کے بعد پورا پورا انکے سامنے دہرا دیتی اور پھر باپ کے سامنے ہی انہیں کے کسی لفظ یا کسی فقرے کو لیکر ایسے ایسے جملے تراشتی، ایسی ایسی پھبتیاں کستی کہ وہ بھی ہنسی سے بیتاب ہو جاتے۔ اس ذہانت اور اس حافظے کے بعد یہ کہنا کہ وہ اپنے درجے میں برابر اول آتی تھی۔ اور اپنی پرنسپل اور استانیوں کی بھی لاڈلی تھی۔ ایک بیکار سی بات ہوگی۔

"میں جب متھرا پہنچا ہوں تو وہ دسویں درجے میں تھی۔ اور گھر پر گانا اور ناچنا سیکھتی تھی۔ چونکہ میں نے ایف۔ اے ریاضی میں پاس کیا تھا۔ اس لئے بابوجی نے اس مضمون کی نگرانی میرے سپرد کر دی۔ رمو ریاضی میں دوسرے مضامین سے نسبتہً کمزور تھی۔ اس کی وجہ بھی ظاہر تھی۔ وہ کسی مضمون پر جم کر کئی گھنٹے محنت نہیں کر سکتی تھی اور ریاضی بغیر اسکے اچھی طرح قبضے میں نہیں آتی۔ بہرحال جب اس مضمون کا ذمہ دار مجھے بنا دیا گیا تو مجھے اس کے اچھی طرح سکھانے کی فکر ہوتی۔ مگر پہلے ہی دن سے رمو نے بجائے ایک استاد کی طرح عزت کرنے کے مجھ سے ایک کھلونے کی طرح کھیلنا شروع کر دیا۔ اسے بہت دنوں کے بعد ایک ایسا شخص ملا تھا جو اسکے گھر میں رہتا تھا اور بہت حد تک اس کا ہم عمر بھی تھا"

"ہم عمر" کا لفظ مجھے کچھ دل میں کھٹکا سا تھا۔ اس لئے کہ پنڈت جی مجھے بتا چکے تھے۔ کہ وہ اس وقت انیس بیس برس کے تھے اور خود رمو کا سن انہوں نے تیرہ برس کا بیان کیا تھا۔ گویا خاصا چھ سات برس کا فرق تھا۔ مگر میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ شاید میرے چہرے نے میرے خاموش اعتراض کی غمازی کی جسے دیکھ کر وہ رک کر کہنے لگے

"شاید آپ نے چھ سات برس کے فرق کو عورت و مرد کی عمر کے خلاف سمجھا ہے۔ مگر یہ نہیں ہے۔ رمو معمولی لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ جتنی شریر، شوخ، چنچل اور تیز تھی۔ اتنی ہی تیز اور ذی فہم بھی تھی۔ اس میں یہ خاص بات تھی کہ اگر وہ ایک منٹ پہلے آپ کو ایک تیرہ برس کی بھولی لڑکی محسوس ہوئی۔ تو دوسرے ہی منٹ میں ایک مکمل عورت۔ مزاج کیا تھا برسات کی رت تھی۔ ابھی ابر کا ٹکڑا اٹھا تو وہ تیز دھوپ کہ سارا گھر جل اٹھا۔ ابھی بادل ہجوم کر کے آیا اور گرج کے برسا تو وہ ٹھنڈک وہ آرام کہ بے ارادہ آنکھ بند ہو جائے۔ ایسے سمے میں باتیں بھی ایسی پیاری کرتی تھی کہ معلوم ہوتا بجلی گرانے والی رمو نہیں بولتی بلکہ آکاش کو پھولوں سے بھر دینے والی دیوی لوری دے رہی ہے! آپ ظاہر بظاہر جاگتے رہیئے۔ اور بھلا رمو کے پاس بیٹھکر کس کی شامت آئی رہی کہ وہ سو جائے۔ مگر آپکی عقل آپکی خودداری، آپکی آزادی رائے سب کچھ سو جائے گی۔ آپ کی حالت بالکل ہی مسمریزم کے ذریعے معمول

کئے ہوئے انسان کی ہو جائیگی"۔

پنڈت جی نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ پھر سلسلۂ کلام یوں جاری رکھا۔

"اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ ایک بیس برس کا جوان اور ایک اسطرح کی نوجوان لڑکی رات دن کا ساتھ، تخلئے کی کوئی کمی نہیں، پڑھنے کا بہانہ، بڑا بوڑھا کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں، پھر اگر میں یہ سوال بھول گیا کہ میں برہمن ہوں اور رمو ایک شودر، تو تعجب کی کونسی بات ہے۔ میری باتوں سے تو آپ سمجھ ہی گئے ہونگے کہ رمو میں تمام وہ خوبیاں اور صفتیں موجود تھیں جن کی ایک معشوقہ یا ایک بیوی میں تلاش ہوتی ہے۔ وہ جس گھر میں بھی بیاہ کے جاتی وہاں شوہر کے دل کی ملکہ بنتی، ساس سسر کی آنکھوں میں طراوت لاتی اور اپنے پرایوں کا من موہ لیتی۔ مگر میں نے شاید آپ سے یہ نہیں بیان کیا کہ میرے معاملے میں ان سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے اس کا دیوانہ بنایا وہ اس کا انشا پردازی کے بارے میں ذوقِ سلیم تھا۔ آپکا یہ خادم بھی اس فن سے خاص مناسبت رکھتا ہے چنانچہ بابو جی کی نگرانی میں چند دنوں ہی میں نے اخبار کے ادبی حصہ نظم و نثر کو "اوڈٹ" کر کے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ میرے مضامین اور نوٹوں کی پبلک میں دھوم مچ گئی۔ اور رمو ڈرمو کی یہ حالت تھی کہ وہ تعریف کرتے کرتے چشم پُرآب ہو جاتی تھی!...

...اُف.....!..

"بھائی صاحب دنیا میں انشا پردازوں اور شاعروں سے زیادہ تعریف اور چاپلوسی کا بھوکا کوئی رئیس اور بادشاہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہم مصنفوں ہی نے اپنا عیب، اپنی کمزوری چھپانے کیلئے بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں کے سر منڈھ دیا ہے۔ بادشا اپنی طاقت، اپنی حکومت، اپنے اختیارات کی وسعت پر اگر گھمنڈ کرتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی چاپلوسی سے خوش ہوتا ہے جن کی جان عزت و آبرو اسکے قبضۂ قدرت میں ہے تو جائے تعجب نہیں۔ لیکن ہم انشا پرداز اور شاعر جنکے قبضے میں سوائے ایک ٹوٹے ہوئے قلم اور ایک سادہ کاغذ کے کچھ نہیں ہوتا، چند ٹیڑھے ترچھے نشانات بنا کر اتنا گھمنڈ کرتے ہیں کہ شداد و فرعون، دریودھن اور راون کا غرور بھی اسکے سامنے شرماتا ہے۔ پھر اگر کہیں تعریف کرنے والے بھی مل گئے تو ہم سچ مچ پنجوں کے بل چلنے لگتے ہیں۔ اور اپنے ہذیان کو الہام سے کسی طرح کم درجہ نہیں دیتے... بہرحال مجھے تو رمو کی چھیڑ نے مارا۔ اسکے تعریف کرتے ہوئے چمکتے چہرے اور اسکی نم آلود غزالین آنکھوں نے اس طرح بیخود و بدحواس بنا دیا کہ میں اپنی اصل اور اس کی نسل، سب کچھ بھول گیا!.... ہائے اس بھول جانے میں کیسا امن، کیسا سکون اور کیسا رس تھا۔ بس اس سلسلے کا ایک واقعہ مثال کے طور پر بیان کر دوں۔ میں آپ کو زیادہ زحمت تو نہیں دے رہا ہوں؟"

میں نے کہا "نہیں، بالکل نہیں، میں بہت دلچسپی سے سن رہا ہوں!"

انہوں نے خود بڑھکر میرے سامنے رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا اٹھالی اور پھر سگریٹ نکالکر جلائی۔ مگر دھواں حلق سے اتارتے ہی کھانسنے لگے اور پھر اسے نیم سوختہ جلدی سے کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ میرے مسکرا دینے پر وہ ذرا چونکے۔ شرماکر بولے "بھائی صاحب معاف کیجئے گا۔ میں نے بغیر آپ کی اجازت کے پھر آپکی، ایک سگریٹ کا خون کیا!"

میں نے کہا "پنڈت جی اب تو میرے اور آپکے تعلقات ان تکلفات سے بالاتر ہو چکے ہیں"۔

انہوں نے ہاتھ جوڑ کر بڑے خلوص سے مجھے سلام کیا اور کہا "آپ واقعی بڑے شریف اور نیک ہیں.... ہاں تو میں آپسے ایک چھوٹا سا قصہ رمو کی قدر دانی کا بیان کرنے کو تھا۔ آپ اسی سے سمجھ لینگے کہ اس چھوٹی سی لڑکی کی تعریف میں کیسا جادو بھرا تھا۔ ایک دن میں نے عشق مجازی و حقیقی سے

بحث کرتے ہوئے اخبار میں لکھا "پریمی بدن کے بان کا شکار ہوتا ہے۔ مگر سیتا اسی بان کا نشانہ بنتا ہے جس نے مدن کو پریم کا دیوتا بنا دیا!" میں فقرے کو دیکھنے پر خود بھی خوش تھا۔ لیکن جب اخبار نکلنے پر میں گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ تازہ اخبار ہاتھ میں لیے رمو پھاٹک پر منتظر کھڑی ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف جھپٹی اور اس نے میرا ہاتھ اپنے کنول سے ہاتھوں میں لیکر اپنی ہرنی کی سی آنکھوں سے لگا لیا۔ اور یہ ساری حرکتیں اس عجلت بیساختگی اور خلوص سے کی گئیں کہ میں ایک لفظ بھی زبان سے نکال نہ سکا اور یہ انوکھا اظہار عقیدتمندی انجام پا گیا۔ میں نے کوئی نصف منٹ بعد جب اس بظاہر دلربا مگر بباطن صاعقہ گرانے والی بلا سے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے ایک جوہی کی ٹہنی سے زیادہ نازک انگلی گلاب کی پنکھڑی ایسے ہونٹوں پر رکھ کر اشاروں میں مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا اور ہاتھ پکڑے مجھے میرے کمرے میں کھینچ لائی جہاں میں نے ایک چھوٹی سی مورتی کرشن بھگوان کی رکھ چھوڑی تھی۔ میں نے دیکھا تو آج اس مورتی کے سامنے کچھ پھول اور مٹھائی رکھی ہے۔ اور ایک موم بتی جل رہی ہے۔ مجھے تعجب سا ہوا کہ رمو آریہ سماجن کو اس طرح کی پوجا سے کیا مطلب۔ مگر وہ مجھے کھینچتی ہوئی مورتی کے سامنے لائی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی "اے بھگوان تو سدا ان ہاتھوں کو اور ان میں رہنے والے قلم کو اپنے شرن میں رکھنا!" پھر مورتی کے سامنے رکھے ہوئے ہار اٹھا کر میرے گلے میں ڈال دیئے!

میں نے گھبرا کر پوچھا "ارے یہ کیا کر رہی ہو رمو؟ تم کو آج کیا ہو گیا ہے؟" وہ ہر لمحہ ہنسنے والی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر بولی "مدن کے بان کی شکار ہونے والی جاتیاں خود مدن کو شکار کرنے والے کی یونہی پوجا کرتی ہیں!" . . . . اف کیسی سندر کیسی من موہنی گھڑی تھی . . ."

پنڈت جی تھوڑی دیر کے لئے رکے۔ اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگے "غرض دو برس کے اندر رمو صرف انٹرنس پاس کر کے ایف اے کی طالبہ ہی نہ بنی بلکہ مدن کی رتی اور کرشن کی رادھا بھی بن گئی۔ اور میں صرف ایڈیٹر اور ماسٹر ہی نہ رہ گیا بلکہ ایک دیوتا اور ایک پجاری بھی بن گیا!"

ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ دو ایک نئے مسافر ہماری گاڑی میں بھی سوار ہو گئے۔

ہم دونوں تخلیہ باقی رکھنے کے لئے کھسک کر ایک دوسرے سے اور قریب ہو بیٹھے۔ گاڑی چلتے ہی میں نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

وہ آہستہ سے بولے "جال میں نئی پھنسی ہوئی چڑیا کی طرح میں پھڑپھڑانے لگا۔ ماں کا ڈر۔ وہ کٹر سناتنی بڑے خاندان کی بیٹی بڑی سختی سے رواج کی پابند۔ ادھر رمو کی کشش وہ شودر اگرچہ اور کٹر سماجی کی بیٹی یہ کیسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ماں بوڑھی بیکس تھی میں ہی تو اس کا آسرا اس کا سب کچھ تھا۔ مگر رمو [illegible] گلاب کی خوشبو کی طرح دل و دماغ میں بس گئی تھی۔ مشکل یہ کہ رمو میرے محسن کی بیٹی تھی۔ ایسے آدمی کی جس نے مجھے صرف میری پسند کا کام ہی نہ دیا بلکہ اپنی کوٹھی میں جگہ دی۔ تن کو ستر دیا اور کھانے کو بھوجن۔ اس کی رمو چہیتی لاکھوں روپیہ کی وارث مجھ سے پریم کرتی تھی۔ میرے ایک ایک لفظ پر جھومتی۔ اور ایک ایک مضمون کو سو سو بار دہراتی تھی۔ بس یہ ٹوٹی ہوئی ناؤ پریم ساگر میں بہ چلی۔ نہ طوفانی جھونکوں کا ڈر اور نہ کنارہ لگنے کی آس!

نہ جانے کیا ہوتا۔ ہم کہاں ڈوبتے اور کیسے ابھرتے کہ دفعتہ ماتا جی کی چٹھی ملی "تمہارے لئے کنیا ڈھونڈ نکالی ہے۔ تم خط دیکھتے ہی آ جاؤ تاکہ میں چاند سی بہو گھر میں لاکر اپنے کھنڈر میں اجالا کروں" سچ مانئے معلوم ہوا کسی نے سوتے میں "فاختہ" اڑا دی۔ سکھ آنند کی نیند سے چونکا ہوا سا لگا۔ رمو پاس ہی بیٹھی تھی چہرے پر

سے میری ملاوٹ کو بھانپ گئی۔ ہزاروں سوگند دیکر مجھ سے خط لیکر اس نے پڑھ ڈالا بس اسی سے رمو کی محبت کے بارے میں اندازہ کیجئے کہ وہ اس خط کو دیکھ کر نہ تو روئی، نہ رنجیدہ ہوئی بلکہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے جب اُسے ذرا غصے اور تعجب سے دیکھا تو وہ بولی "اس چٹھی میں کونسی نئی بات لکھی ہے جس پہ اتنا لمبا چہرا بنایا جاتا ہے۔ یہ تو ہنسنے کی بات ہے تمہیں تو ایک کی جگہ دو دو دلہنیں مل جاتی ہیں۔ ایک تو خود دنیا رہے، دوسری کو ماتا جی اپنی خوشی سے لاتی ہیں۔"

میں نے جھلا کر اسکا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے پیار میں کسی اور کو بھی شریک کر سکتا ہوں؟"

وہ پھر مسکرائی اور بولی "نہیں، سی کا تو ڈر نہیں اسی لئے تو میں ہنسنے کو کہتی ہوں!" میں نے اسکا نازک ہاتھ جھٹک کر کہا "تم پریم کو بچوں کا کھیل سمجھتی ہو؟"

وہ متین بنکر بولی "نہیں تو، میں تو اُسے انسان کو دیوی دیوتا بنانے والی چیز سمجھتی ہوں۔ مدن کے بان کا شکار مدن کے بنانے والے کا پریمی بن سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر انسان ایک ہی کا تو ہو کر رہ سکتا ہے، وہ ہر کھلونے سے نہیں کھیل سکتا!"

وہ پھر مسکرا کر بولی "مگر دیوتا تو کھیل سکتا ہے!" اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ اور چند منٹ میں بابو جی کو ساتھ لیکر آپہنچی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رمو اپنی عادت کے موافق انہیں ایسے کام سے اٹھا لائی تھی جس میں وہ منہمک تھے۔ بابو جی کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ رمو نے جھپٹ کر کرشن جی کی مورتی ہمارے درمیان والی میز پر رکھ دی۔ اور بابو جی کو مخاطب کر کے بولی "پتا جی، آپ میرے دیوتا ہیں، اور ان پنڈت جی کے دیوتا کی مورتی انکے سامنے رکھی ہے۔ میں آپ دونوں دیوتاؤں کے سامنے سوگند کھاتی ہوں کہ میں اس جنم میں اور ہر جنم میں بس انہیں کی داسی بنکر رہوں گی۔ چاہے اس پر آپ ناخوش ہوں چاہے اس پر بھگوان ناراض ہوں مگر آپکی رمو اب دل سے انہیں کی ہے۔ انہیں کی رہے گی انہیں کی رہتے میں اپنے لئے نروان اور مکتی سمجھتی رہیگی"

بابو جی گھبرا گھبرا کر "رمو! رمو! کیا کہتی ہے بیٹی؟ ارے تجھے کیا ہوا بیٹی!" وہ کہتے ہی رہے۔ مگر اس نے جب تک سوگند نہ کھالی وہ نہ رکی۔ میں سر پکڑے بیٹھا رہا۔ میں چاہتا تھا بابو جی مجھ کو دغاباز، پاجی، کمینہ کہکر جوتوں، ڈنڈوں سے مار کر گھر سے نکال دینگے۔ میری یہی سزا ہے جو ایک چور رکھنے کی رسوئی میں گھس جانے پر ہوتی ہے۔ میں احسان فراموش محسن کش تھا میں نے جس برتن میں کھایا تھا اُسی میں چھید کیا تھا جس شاخ پر بیٹھا تھا اُسی کو کاٹ دیا تھا! مگر وہ خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے انہوں نے دو مرتبہ کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ مگر نہ اُٹھ سکے۔ انہوں نے مجھے بڑی حسرت سے دیکھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس نظر میں کتنی شکایت کتنی امید کتنی تمنا مکتنا درد ایک ساتھ سمویا ہوا تھا۔ میں کانپنے لگا۔ بھگوان ہی کتنا نیچ تھا کہ میں نے دنیا کے سب سے بڑے دیالو آدمی کو اتنی تکلیف پہنچائی!

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بابو جی میں بھی رمو کو اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔ اور دیویوں سے زیادہ اس کی عزت کرتا ہوں مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم دونوں پریمی ہیں، پاپی نہیں ہیں!"

میرے آخری فقرے پر انکے چہرے سے وہ تناؤ، وہ خشکی اور وہ روکھا پن گم ہو گیا۔ جو اس پر رمو کی باتوں کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے دو مرتبہ آہستہ آہستہ کہا۔ "بھگوان کا شکر ہے! بھگوان کا شکر!"

رمو کا چہرہ یکبارگی اس طرح لال بھبوکا ہو گیا جیسے کوئی بجلی کے بلب پر سرخ شیشہ چڑھا دے۔ وہ گھٹنوں کے بل بابو جی

کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیکر آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر پوچھا: "پتا جی، کیا آپکو اپنی رمو پر شبہ تھا؟"

وہ کچھ شرمندہ ہوکر بولے: "نہیں بیٹی! نہیں بیٹی!"

وہ اسی انداز میں بولی: "اگر مجھ کو اس کا یقین ہو جائے کہ آپ مجھ پر شبہ کر سکتے ہیں تو ابھی اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ کر جان دیدوں!"

وہ چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولے "نہیں بیٹی۔ بھلا میں اپنی رمو پر شک کر سکتا ہوں!"

میں نے باپ بیٹی کی اس بحث کو ختم کرنے کے لئے جلدی سے ان کی طرف ماتا جی کا وہ خط بڑھا دیا۔ جو آج ہمارے دلوں کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکانے والا ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے اسے شروع سے لیکر آخر تک پڑھ ڈالا۔ رمو جو چند منٹ پہلے ایک الزام لگانے والی مدعیہ کی صورت بابو جی کی روبرو مونڈھے پر بیٹھی تھی، اب انکی کرسی کے پیچھے کھڑی تھی۔ اور اپنے پتا جی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھی خط ختم کرتے ہی بولی: "پتا جی! بس اتنی سی بات کے لئے یہ دل کڑھاتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا دیوتاؤں کی سینکڑوں داسیاں ہوتی ہیں۔ میرے دیوتا کے بھی ایک کی جگہ دو سہی۔ میرا دل کیوں کڑھیگا میں تو خوش ہونگی کہ میں جس سے پریم کرتی ہوں وہ میری ایک دوسری بہن کی نظر میں بھی پوجے جانے کے لائق ہیں!"

پنڈت جی ذرا رکے تو میں نے دبی زبان میں غالب کا شعر پڑھا۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

پنڈت جی نے بڑے درد سے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ پھر وہ بولے "شاید وہاں بھی بات کی تہہ یہی تھی اور یہاں بھی! بہرحال بابو جی نے مڑ کر رمو کو دیکھا۔ انکی آنکھیں اس کی ان باتوں سے خوشی سے چمک رہی تھیں، لیکن وہ اسے شاباش دینے کی بجائے ذرا جھڑک کر بولے "یہ ساری باتیں بچپنے کی ہیں رمو! میں تم دونوں کی شادی کی اجازت دے سکتا ہوں۔ مگر تمہارے لئے سوکن لانے کی نہیں!"

وہ مچلکر بولی "کیوں بابو جی! جب میں خود راضی خوشی سے اسکے لئے تیار ہوں تو آپ کو اس میں ۔ سوچ؟"

انہوں نے جھنجھلا کر کہا "تم لاکھ پڑھی لکھی سہی، مگر تم سوکنوں کے جلاپے آپس کی تو تو میں میں، کو کیا سمجھو! پھر وہ برہمنی ہوگی کسی پرائے گھر کی۔ تم سے ذات میں بڑی۔ وہ تم کو شودر کہکر گھر سے کھڑے کھڑے نکال دے گی!"

وہ ہنسکر بولی "میں انکے محل کے پاس ایک پھونس کا جھونپڑا ڈالکے اس میں رہ لوں گی!"

انہوں نے بیٹی کی طرف حسرت سے دیکھا۔ میں نے کہا "بابو جی ان کی باتوں پر نہ جایئے۔ میں تو سوائے انکے اور کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا۔ کیا رمو کے سے پریم کا جواب یہی ہے۔ کہ اسکے سر پر سوکن لاکر بٹھا دی جائے؟"

بابو جی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ رمو تڑاق سے بولی "یہ سچ سہی۔ مگر آپ شاید اپنی ماتا جی کو بھول گئے۔ وہ تو شاید میری سی شودر کو اپنی بہو کی حیثیت سے سوچ بھی نہ سکیں گی!"

بابو جی نے گھبرا کر کہا "اچھا بھئی تم اب اپنے کمرے میں جاؤ میں ترلوکی جی سے اکیلے میں باتیں کروں گا۔"

رمو سے یہ زندگی میں پہلی دفعہ بابو جی نے کسی بات کے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ شاید کوئی اور موقع ہوتا تو وہ باپ سے لڑ پڑتی مگر وہ اس وقت چپکی کمرے سے باہر چلی۔ دروازے کے پاس ذرا ٹھٹکی، مڑ کر بولی: "پتا جی! آپ دونوں میرے لئے جو چاہیں فیصلہ کریں۔ لیکن اتنا دھیان رہے کہ اگرچہ رمو ان کی ہمیشہ داسی بنیگی مگر استری اسی وقت بنے گی جب یہ اپنی ذات برادری میں شادی کر لینگے۔ اور اپنی ماتا کے لئے بہو بیاہ لائیں گے!"

وہ یہ کہکر کمرے کے باہر چلی گئی۔ بابو جی جھلا کر کرسی سے اٹھکر

کھڑے ہو گئے۔ اور بولے "تم دونوں نے ملکر مجھے کہیں کا نہ رکھا خیر وہ تو بچہ ہے۔ لڑکی ہے۔ تم کو کیا ہوا تھا؟ تم نے چپکے چپکے ہنڈیا پکالی۔ اس بھولی بھالی لڑکی کا دل چھین لیا۔ اُسے بالکل اپنے بس میں کر لیا۔ اور آج جا کر مجھ پر یہ بھید کھلا!..."

میں نے بات کاٹ کر ہاتھ جوڑ کے کہا "بابو جی! میں اپنے قصور کا اقرار کرتا ہوں۔ میں یقیناً نیچ اور کمینہ ہوں۔ مگر میں آپ کو اس کا بھی یقین دلانا چاہتا ہوں کہ سوائے آج کے ہم میں کبھی بھی پریم کے بارے میں بات چیت نہیں ہوئی!..."

وہ بولے "یہ سب سہی۔ مگر تم کو اپنے دل کی حالت تو معلوم تھی! تم خود رمو کی کیفیت تو دیکھ رہے تھے۔ میرے ہی گھر میں بیٹھے میری ہی لڑکی سے پینگ بڑھاتے رہے۔"

میں نے ان کا پاؤں چھو کر کہا "آپ پتا جی کی جگہ ہیں۔ مجھے آپ نے سدا بیٹے کی طرح مانا۔ میں اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں۔ مجھ سے چوک ہوئی۔ میں نے قصور کیا۔ مجھے آپ ہر طرح کی سزا دے سکتے ہیں۔"

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے "بیٹے اب میں تمہیں سزا دیکر کیا پھل پاؤں گا۔ رمو قسم کھاتی ہے کہ وہ سوائے تمہارے کسی سے شادی نہ کریگی۔ پھر اس بات پر اڑی ہے کہ تم سے بیاہ اسی سمے کرے گی جب تم ایک برہمنی بیاہ کے لا چکو گے۔ تم کہتے ہو کہ تم سوائے اسکے کسی سے بیاہ نہ کرو گے۔ تمہاری ماتا رمو سے تمہارا بیاہ ہونے پر کسی طرح راضی نہ ہونگی۔ اور میں چاہے تم اور رمو دونوں یونہی جنم بھر بن بیاہے رہو مگر میں سوکن ہوتے ہوئے رمو کو تم سے نہ بیاہونگا!... تم کہتے ہو بھول ہوئی۔ چوک ہوئی۔ یہاں اتنی سی بات میں ایسی گتھی پڑ گئی کہ جس میں چار پانچ زندگیاں برباد ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ تمہاری ماں کی، میری، خود تمہاری اور ان سب سے زیادہ رمو کی! ہے بھگوان میں کیا کروں!"

میں نے کہا "اچھا تو میں آج ہی ماتا جی کے پاس جاتا ہوں ممکن ہے وہ مان جائیں!"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے "اچھا تم یہ بھی کر دیکھو۔ مگر مجھے اس بات کا یقین ہے کہ وہ نہ مانیں گی۔"

لکھنؤ کے لئے ایک ہی گھنٹے میں گاڑی روانہ ہونی تھی۔ جلدی میں نے انہیں کے سامنے جھٹ پٹ اپنا سامان درست کیا اور رمو سے بغیر ملے ہوئے چل کھڑا ہوا۔ راستہ بھر ماتا جی کی ناخوشی سے زیادہ اسی کا خیال رہا کہ رمو اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی کہ میں اس سے ملے بغیر یوں بھاگ آیا۔ اور پھر میں نے اسے جن جن دنوں میں اسے اس دن دیکھا تھا۔ وہ بار بار آنکھوں کے سامنے پھرتے تھے۔ اور ہر ایک ان میں سے اتنا پیارا تھا کہ جی چاہتا کہ بس اسی طرح دیکھتے جاؤ! اف!"

وہ ذرا رکے تو میں نے ان کی طرف سگریٹ بڑھا دی۔ انہوں نے بے پروائی سے وہ سگریٹ جلائی۔ جلدی جلدی پی اور آدھے سے زیادہ یونہی پھینک دی۔ پھر وہ بولے "جب میں گھر پہنچا تو میں نے دیکھا ماتا جی نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے سارے سامان کر رکھے ہیں۔ پرتاب گڑھ کوئی شاستری جی تھے ان کی لڑکی تھی۔ ماتا جی خود لڑکی کو دیکھ آئی تھیں۔ انکے نزدیک وہ سورج اور چاند دونوں کو شرماتی تھی۔ اور ایسی نیک تھی کہ معلوم ہوتا سیتا اور ساوتری نے پھر سے جنم لیا ہے۔ غرض انہوں نے اس کی تعریف میں لمبے چوڑے قصیدے پڑھنا شروع کر دئے اور میرے پہنچنے کے ایک گھنٹہ بعد تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اب میری مشکل پر غور فرمائیے۔ وہ تو ادھر ہونیوالی بہو کے گن گا رہی ہیں، ادھر میں پہلو بدل رہا ہوں کہ کسی طرح چپ ہوں تو میں اپنی رام کہانی سناؤں۔ مگر وہ کہاں چپ ہونیوالی تھیں۔ مدتوں کی سوکھی ہوئی ندی میں روانی آگئی تھی، دریا تھا کہ امڈا چلا آرہا تھا۔ میں نے آخر عاجز آکر ان کی بات کاٹی اور کہا "ماتا جی ذرا میری بات بھی سن لیجئے!" اور انہیں کچھ متعجب ...

ہوکر چپ ہوجانے پر گردن نہوڑا کر ساری کتھا سنا ڈالی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے انہیں سکتہ سا ہوگیا ہے۔ وہ بالکل چپ میری ساری باتیں سناکیں۔ جب میں نے اس جملے پر اپنی تقریر ختم کی کہ "ماتا جی! موشو دیسی نگر ایسی اچھی کنیا اس لوک اور پرلوک میں مجھے نہیں مل سکتی۔ اور میں اگر بیاہ کرونگا تو اسی سے!" وہ چونک کر ایکبار بولیں "ارے تو کیوں ہندو دھرم کو بدنام کرتا ہے پاپی! جو برہمن ہوکر شودروں سے بیواہ کریگا اسے مکتی کہاں نصیب"

میں نے جوابدیا "بھگوان اتنا ظالم نہیں ہوسکتا کہ خود ہی دو دلوں میں پریم ڈالے اور خود ہی اتنی سخت سزا دے!"

وہ جھڑک کر بولیں "چل، چل! تو بڑا بھگوان کا گیانی آیا۔ کرمن سے آشنائی کرے گا . . ."

بس وہ اتنی سی بات کہنے پائی تھیں کہ مجھے ایسا جان پڑا کہ ایک آگ کا لوکا سا اُٹھا اور میرے سارے جسم کو بھسم کر گیا۔ میں نے بڑے تاؤ سے ماتا جی کے منہ پر طمانچہ مارا۔ وہ بھونچکی ہوکر تھوڑی دیر تو میرا منہ تکتی رہیں۔ پھر اپنا گلا بھلا کر آنسو بہاتے بولیں "اگر میں نے تجھے اپنے پیٹ سے نہ جنا ہوتا تو آج ایسا شراپ دیتی کہ تو ستر جنم تک اس کا بھوگ بھوگتا۔ مگر میری ماتا سے نہیں ہوتا۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گی کہ تو اپنی کرمن کو اس برہمنوں کے گھر میں میرے جیتے جی نہیں لا سکتا۔ ہاں پہلے میرا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ دے پھر تیرا جو جی چاہے کر!"

ماتا جی تو اسی طرح کوستی اور برا بھلا کہتی رہیں لیکن میری یہ حالت تھی کہ میں انہیں طمانچہ مارتے ہی کانپنے لگا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ معلوم ہوا جیسے کالی رات میں بجلی سی چمک گئی۔ میں نے آج پریم کے کرتوتوں اپنی ماتا پر ہاتھ اٹھایا! میں کتنا گر گیا تھا۔ پریم اگر انسان کو اسی طرح اندھا بنا دیتا ہے۔ تو لوگ بے پریم ہی کے اچھے۔ میں نے دوڑ کر ان کے چرنوں میں سر ڈالدیا۔ اور اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹکر رونے لگا

وہ بھی اس وقت بڑی سنگدل بن گئیں۔ انہوں نے میرے جھکے ہوئے سر کو نہ اٹھایا۔ بلکہ مجھے پیچ ہی ٹھوکر ماری وہ بھی اتنی زور کی کہ میں زمین پر گر پڑا۔ اور کہتی ہوئی "مجھے نہ چھو پاپی!" دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔"

پنڈت جی نے سوکھے ہوئے ہونٹ چاٹے اور ایک الائچی مجھ سے مانگ کر بغیر چھیلے ہی منہ میں رکھ لی۔ بڑے زور زور سے اسے دانتوں سے کچلا۔ پھر منہ بنا کر اسے کھڑکی کے باہر تھوک دیا۔

میں نے کہا "کیا خراب تھی؟ دوسری دوں؟"

وہ بڑی مایوسی سے بولے "نہیں اس وقت امرت بھی زہر معلوم ہوگا۔ منہ کا مزا ہی کڑوا ہے!"

میں خاموش ہوگیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولے "ماتا جی سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ دوسرے دن صبح تک اپنے کمرے سے نہ نکلیں۔ میں مجبوراً متھرا چلا آیا۔

یہاں آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ باپو جی نرمو کو سمجھا بجھا کر دو تین ہفتے کے لئے الٰہ آباد اپنے ایک عزیز کے ہاں بھیج دیا ہے۔ میں نے ان سے ماتا جی کی باتیں دہرائیں تو وہ صرف اتنا بولے کہ "میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ بات انہونی ہے!" میں نے اسی دن ان کی کوٹھی چھوڑ دی۔ اور دفتر سے قریب ایک چھوٹا سا مکان لیکر اسمیں اٹھ آیا۔ وہ روکتے رہے۔ مگر میں نے انہیں یہ کہکر چپ کرا دیا۔ کہ "کافی نمک حرامی ہو چکی اب اس سے زیادہ ممکن نہیں!"

نئے مکان میں رہتے ہوئے کوئی ایک ہفتہ ہوا تھا کہ مجھے موہنا کا ایک لمبا چوڑا خط دفتر کے پتہ سے ملا۔ اس میں اس نے کوٹھی چھوڑ دینے اور نئے مکان میں کرایہ پر رہنے کی شکایت کی تھی۔ اس کے چند جملے میرے دل پر لکھے ہیں۔ وہ میں مرتے دم تک نہیں بھول۔ اس نے لکھا تھا "پتا جی کے خط سے معلوم ہوا آپ نے کوٹھی چھوڑ دی۔ جاتے سمے جب انہوں نے روکا تو آپ نے کہا۔ کافی نمک حرامی ہو چکی اب اس سے زیادہ ناممکن ہے!" میں آپکے

جملے کا مطلب ـ سمجھی، کیا پریم کرنا نمک حرامی ہے؟ اگر محبت نمک حرامی ہے تو نمک حلالی کسے کہتے ہیں؟ آپ نے کسی کی کوئی چیز چھین نہیں لی ہے۔ چرائی نہیں ہے۔ پجارن نے دل کا چڑھاوا چڑھایا۔ آپ نے دیوتا کی طرح اس کی نذر قبول کر لی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ میں آپکو سچ مچ کا دیوتا بنانا چاہتی ہوں۔ اور آپ اب تک ایک مزدور مرد ہی بننے پر اصرار کرتے ہیں۔ دیوتا کے دل میں سب کے لئے پریم ہوتا ہے۔ اور آپ کے دل میں صرف ایک کے لئے! دیوتا برہمن، شودر پر ایک ہی نظر ڈالتا ہے۔ اور آپ صرف ایک کرمن ہی کو دیکھ سکتے ہیں! خیر کہاں تک اس کے خط کے الفاظ دہراؤں۔ بول کیا تھے۔ امرت کی بوندیں۔ مگر بات وہی تھی جو بابوجی کے سامنے کرشن بھگوان کے سامنے آ چکی تھی۔ خط کے آخر میں ایک ایسی بات لکھی تھی کہ میں حد سے زیادہ گھبرا گیا۔ اس نے لکھا تھا کہ میں سوچ رہی ہوں کہ دو ایک دن لکھنؤ چلی جاؤں اور اپنی کانجی ماتا سے مل کر کچھ باتیں کر آؤں میں یہ پڑھتے ہی بابوجی کے پاس پہنچا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں ماتاجی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ رمو کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جائیں گی اور عجب نہیں کہ اس کے ساتھ وہی سلوک کریں جو منو کے سمے میں برہمن شودروں سے کرتے تھے۔"

وہ بھی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے طے کیا کہ ایسے موقع پر ان کا بیٹی کے پاس پہنچ جانا ہی بہتر ہے۔ وہ اسی وقت الہ آباد روانہ ہو گئے وہاں سے یہ معلوم کر کے کہ رمو لکھنؤ گئی وہ میرے مکان پر لکھنؤ پہنچے مگر کس وقت؟ جبکہ میری "ماتا" پاگل دیوانی ماں رمو کو ہزاروں ننگی گالیاں دیکر رسوئی کی جلتی ہوئی لکڑی سے مار مار کر گھر سے باہر نکال رہی تھی۔ بابوجی نے اپنی نازوں پلی ہوئی رمو کو گود میں اٹھا لیا اور تانگے پر لاد کر سٹیشن لائے اور وہاں سے سیدھے متھرا!"

پنڈت جی نے رک کر سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی سے ڈبیہ کی آخری سگریٹ پیش کی۔ انہوں نے اسے جلایا۔ دو تین کش کھینچے کھانسے اور کہا: "ماتاجی کی زہریلی باتوں نے رمو کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ گاڑی پر سوار ہوتے ہی بیمار ہو گئی اور متھرا پہنچتے پہنچتے اسے پورا سرسام ہو گیا۔ میں رات دن اس کے سرہانے بیٹھا رہا اور وہ برابر یہی کہتی رہی: "میں شودرن ہوں! اچھوت ہوں، بیسوا ہوں، پاپن ہوں۔ میں نے ایک بھولے بھالے برہمن لڑکے کو پھنسا لیا۔ اسے بیدھرم کیا۔۔۔ ارے چپ رہے ڈائن، نکمی، نیچ، کمینی، ہرجائی!"

پنڈت جی پھر چپ ہو گئے۔ انکے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ خشک سسکیاں لے رہے تھے۔ گاڑی کانپور اسٹیشن پر رکنے کیلئے پٹری بدل رہی تھی۔ میں نے اس دردبھری کہانی کا انجام سننے کے لئے پوچھا: "تو اب تو وہ اچھی ہیں؟"

انہوں نے مجھے پاگلوں کی طرح دیدے پھاڑ کر دیکھا اور ہنس کر بولے "جی، بالکل اچھی ہے۔ مگر کل شام کو وہ ایسی جگہ چلی گئی جہاں نہ میری پوتر ماتا کی سی نفرت اگلنے والی بولیاں ہیں اور نہ مجھ سے ان کے لوٹنے ہونے پاک و پاکیزہ برہمن! میں نے کل شام کو رمو کی چتا اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے جلتی دیکھی!"

اس ملاقات کے تیسرے دن میں نے حقیقت اخبار میں یہ خبر پڑھی:

"کل گنیش گنج میں ایک درد ناک قتل ہونے کہا جاتا ہے پنڈت نراؤ کی جو متھرا میں کسی ہندی اخبار کے ایڈیٹر تھے، اپنی ماں کے قریب زخمی تڑپتے ہوئے پائے گئے۔ انکے پاس ہی انکی دونالی بندوق بھی پڑی تھی محلہ والوں کا بیان ہے کہ وہ جب فیر کی آواز سنکر مکان میں گھسے تو پنڈت جی کی ماں کی زبان کٹی پڑی تھی اور گولی انکے سینے کے پار تھی۔ پنڈت جی نے ماں کے قتل کرنے کے بعد اپنے سر پر گولی لگائی۔ اسلئے کہ انکا آدھا سر اڑ گیا تھا اور وہ دم توڑ رہے تھے۔ وہ اسی حالت میں میڈیکل کالج پہنچائے گئے۔ جہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد وہ مر گئے۔ پنڈت جی اس عرصے میں صرف نصف منٹ کے لئے ہوش میں آئے اور انہوں نے "رموا" کہتے دم توڑا۔۔۔۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے"

نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل

غزل

چال سے فتنۂ خوابیدہ جگاتے آتے ۔۔۔ آپ جب آئے قیامت ہی اُٹھاتے آئے
نالۂ گرم نے اتنا نہ کیا تھا رسوا ۔۔۔ اشک کمبخت تو اور آگ لگاتے آئے
طے ہوئی آہ کی تائید سے منزل اپنی ۔۔۔ جا بجا راہ میں ہم شمع جلاتے آئے
اس غرض سے کہ نہ دیکھے کوئی صورت اُنکی ۔۔۔ خرمنِ ہوش پہ بجلی وہ گراتے آئے
دل کو میں اُن کی نگاہوں سے بچاتا کیونکر ۔۔۔ دُور سے تیر نشانے پہ لگاتے آئے
اُنکی کیا بات جو ہنس ہنس کے لبِ رنگیں سے ۔۔۔ پھول برساتے گئے باغ لگاتے آئے
چال بھی مست نظر مست ۔ ادا میں مستی ۔۔۔ ذرّے ذرّے کو وہ میخانہ بناتے آئے
آئے ہم سوئے قفس چھوڑ کے جب گلشن کو ۔۔۔ آہ سے آگ نشیمن میں لگاتے آئے

آتے بھی وہ جو مرے پاس تو یوں آتے جلیل
شعلۂ آہ سے دامن کو بچاتے آتے

میرزا ادیب

غیر مکمّل افسانہ

سعیدہ نے کمرے میں داخل ہوکر قد آدم آئینے کے سامنے اپنے پریشان ریشمین بالوں کو درست کیا۔ آئینے کی دائیں طرف رکھے ہوئے پیانو پر بے پروایانہ انگلیاں پھیریں، اور پھر دھیمے دھیمے میٹھے میٹھے سروں میں گاتی ہوئی کھڑکی کے قریب کوچ پر بیٹھ گئی۔

سورج غروب ہوچکا تھا اور فضا کی لامتناہی وسعتوں میں شام کے نزہت آفریں نظارے چھائے ہوئے تھے۔ سعیدہ ان رنگین و دلآویز نظاروں سے لطف اندوز ہونے لگی۔ دلنشین مناظر کی فردوسی لطافتیں اس کے دل و دماغ میں ایک پراسرار کیف، ایک عجیب و غریب لذت اور ایک ناقابل بیان مسرت بکھیرنے لگیں۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی روح، فراوانی کیف و نشاط میں، فضا کے حسین نظاروں میں تیرتی، ہر طرف بکھرے ہوئے رومان آفریں دھندلکوں میں ہچکولے لیتی، اونچی ہی اونچی، بلند ہی بلند اڑتی جا رہی ہے۔ آج اس کے لئے سنسار ایک سنہرا سپنا اور جیون ایک مدھر راگ بن گیا تھا۔ رنگین تصورات نے اس کے اردگرد لذتیں ہی لذتیں، نزہتیں ہی نزہتیں بکھیر دی تھیں۔ اور وہ ان لذتوں، ان نزہتوں میں محو تھی۔ ہمیشہ کے لئے محو رہنا چاہتی تھی!

وہ بے حد مسرور تھی کیونکہ اس کی سب سے بڑی تمنا پوری ہو رہی تھی۔ اور یہ سب سے بڑی تمنا کیا تھی؟ کامرانیٔ محبت! تین دن کے بعد اس کی شادی یوسف سے ہو رہی تھی۔ یہی وہ ہستی تھی جس کے لئے وہ تمام دنیا کو ٹھکرا دینا ایک معمولی بات سمجھتی تھی۔ جس کی یاد ایک موجِ کیف بنکر ہر وقت اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، اور جو اسے کائنات کی ہر عزیز سے عزیز شے سے بھی بڑھکر عزیز تھی!

کمرے میں تاریکی پھیل رہی تھی۔ سعیدہ نے اٹھکر سوئچ دبایا اور پھر جاکر کوچ پر بیٹھ گئی اور اب اس کی نگاہیں دور افق کے سینے پر ایک چھوٹے سے سیاہ نقطے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ سیاہ نقطہ پرندے کی صورت اختیار کرنے لگا۔ سعیدہ نے کوچ کے بازوؤں پر سر رکھدیا، اور محبت کے تصورات میں کھو گئی۔ دو تین منٹ کے بعد یہ تصورات شام کی تاریکی میں آہستہ آہستہ گم ہوتے ہوئے رنگین پھولوں کی طرح گذشتہ واقعات کی یاد میں تبدیل ہوگئے۔ گذرے ہوئے حالات جنہیں وہ بزعم خویش بھلا چکی تھی۔ ایک ایک کرکے اسے یاد آنے لگے۔ آج سے دس برس پیشتر وہ لاہور میں اپنے والد کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ والدہ بچپن ہی میں فوت ہوچکی تھی۔ اسکا والد تعلیم نسواں کا بہت بڑا علمبردار تھا اور یہی وجہ تھی کہ اسنے اپنی اکلوتی بیٹی کو اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم دلانے میں ذرہ بھر کوتاہی نہ کی۔ سعیدہ کے دل میں بھی تعلیم کا از حد شوق پیدا ہوگیا اور وہ ہر وقت کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہنے لگی۔ یہاں تک تو اس کی زندگی ایک صاف و شفاف چشمے کی مانند تھی۔ جس کی سطح پر نظر ڈالتے ہی اس کی تمام گہرائیاں آئینہ ہوجاتی ہیں۔ اس کی زندگی میں کوئی خلش نہ تھی۔ کوئی پیچیدگی نہ تھی۔ یکایک اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کے سینے میں ایک ہلکا سا اضطراب پیدا ہوگیا ہے۔ وہ جب ناولوں میں، ڈراموں میں داستانہائے عشق پڑھتی تو اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک خلش سی بیدار ہوجاتی تھی۔ وہ سوچتی یہ اضطراب کیوں ہے۔ اس خلش کی نوعیت کیا ہے؟ مگر کبھی بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا۔

اثنا میں جبکہ وہ بی۔اے کی متعلمہ تھی۔ اس کے تعلقات اپنے ایک ہم جماعتی تنویر سے بڑھنے لگے۔ سعیدہ کے خیالوں میں رنگینیاں نے لگیں۔ وہ خود کو بدلا ہوا محسوس کرنے لگی۔ تنویر اس کے دل کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اس کے دل پر چھا گیا۔ ایک سال گذر گیا۔ اس کے بعد سعیدہ نے تنویر کی شخصیت کا اندازہ لگا لیا۔ اس پر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ تنویر ایک آوارہ مزاج اور اوباش طبع نوجوان ہے' جو معصوم فطرت لڑکیوں کو دھوکا دینا ہی جانتا ہے۔ جس کی محبت' سوز و گداز' درد و خلوص سے یکسر عاری ہے' اس حقیقت کے معلوم ہونے پر وہ تنویر سے متنفر ہو گئی۔ اسقدر متنفر کہ اب تنویر کی گفتگو' تنویر کی صورت اس کے لئے ایک بار گراں ثابت ہونے لگی۔ دریا کی لہریں ساحل کی چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آتی رہتی ہیں۔ مگر جب دریا میں طوفان آجاتا ہے اسوقت یہ مضبوط چٹان' جس کے اکھڑنے کی کبھی توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی' تنکے کی طرح موجوں کی ٹھوکریں کھاتی' پانی میں بہہ جاتی ہے

بدقسمتی سے سعیدہ کا والد بھی دنیا سے رخصت ہو گیا سعیدہ اپنے چچا کے ہاں کراچی میں آگئی۔ اس کے چچا "مینک سالٹی" کے ایک بہت بڑے کارخانے کے مالک تھے۔ وہ اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے ہندوستان گیر شہرت کے مالک۔ کارخانے کی شہرت و مقبولیت کے جہاں اور اسباب تھے وہاں سب سے بڑا سبب یوسف کی ایماندارانہ مسلسل جد و جہد بھی تھا۔ یوسف کارخانے کا محنتی' ہردلعزیز اور ایماندار منیجر تھا۔ سعیدہ کے چچا کو اس سے بڑی محبت تھی اور اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کے گھر میں رہتا تھا۔ سعیدہ نے جب پہلے پہل یوسف کو دیکھا تو اس کے دل نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ مگر جب پے در پے اسے یوسف سے ملاقات کرنیکا موقعہ ملا تو وہ اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ ان ملاقاتوں کے تاثرات نے محبت کی صورت اختیار کرنی شروع کر دی اور آج جبکہ سعیدہ کو کراچی میں آئے ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ وہ یوسف کو دل و جان سے چاہ رہی تھی۔ سعیدہ کے چچا کو اس محبت کی خبر ہو گئی تھی اور وہ خوش تھا کہ اس کی دو عزیز ہستیاں ایک دوسرے کی معیت میں زندگی بسر کرنے پر رضامند ہیں۔

ایک عجیب بات جس کو سعیدہ ابھی تک نہیں سمجھ سکی تھی۔ وہ یہ تھی کہ یوسف بعض اوقات اس کے پہلو میں بیٹھے بیٹھے مضطرب و بیقرار نظر آنے لگتا۔ سعیدہ اس سے اس اضطراب اس بیتابی کی وجہ پوچھتی۔ مگر یوسف کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ اور اگر وہ زیادہ اصرار کرتی تو اپنی نازک ذمہ داریوں یا اپنے کسی عزیز کی بیماری کا ذکر چھیڑ کر سعیدہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تاہم سعیدہ سمجھ رہی تھی۔ کہ یوسف کی یہ مضطربانہ حرکات اس کی اندرونی خلش کا اظہار کر رہی ہیں۔ اور اس کے ساتھ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ یوسف کے اضطراب و اضطرار کی نوعیت کو سمجھ جائیگی۔!

فضا میں زیادہ تاریکی پھیل گئی تھی۔ آسمان کی نیلگوں پہنائیوں میں کہیں کہیں ستاروں کی ننھی ننھی شمعیں روشن ہو چکی تھیں ظلمت کے دامن میں کائنات اس طرح روپوش ہو رہی تھی جس طرح ایک سہانے سپنے کے نقوش آہستہ آہستہ دل و دماغ سے محو ہو جاتے ہیں۔ سعیدہ اٹھی' .... اور آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی میز کے پاس بیٹھ گئی' ٹیبل لیمپ کو روشن کیا۔ میز پر سے کتاب کو اٹھایا اور اُسے کھولا۔ اچانک اس میں سے ایک لفافہ نکلکر اس کی گود میں آگرا۔ لفافے کے پتے پر نگاہیں پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہریں دوڑ گئیں اس نے لفافے کو اٹھا لیا اور اُسے کھولکر کہیں کہیں سے پڑھنے لگی۔ یہ وہ لفافہ تھا۔ جو اس نے یوسف کو لکھا تھا۔ یوسف اس وقت کارخانے کے کسی ضروری کام کے سلسلے میں بنارس گیا ہوا تھا۔ خط کی ہر سطر میں ہر لفظ میں جذبات محبت انگڑائیاں لے رہے تھے۔ آغاز یوں تھا:۔

"تم ہر خط میں لکھتے ہو میں دو تین دن تک واپس آجاؤنگا

مگر ہفتوں پہ ہفتے گزر رہے ہیں۔ اور تمہاری صورت نظر نہیں آتی۔ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہیگا؟ تم نہیں ہو تو باغ میں اداسی چھائی ہوئی ہے۔ کمروں میں افسردگی کے سائے لرز رہے ہیں۔ اور میری حالت کیا ہے؟ یہ نہ پوچھو! معلوم نہیں تم کب آؤ گے ۔ ۔ ۔ تم نہیں جان سکتے کہ میرے دل کی کیا کیفیت ہے"۔

یکایک ہلکا سا شور پیدا ہوا۔ سعیدہ نے سمجھا کہ اس کی چچی کمرے میں آئی ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی اس نے لفافے کو میز کی دراز میں رکھدیا۔ اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ چند لمحے گزر گئے۔ وہ اٹھ کر پیانو کے پاس پہنچی ۔ ۔ ۔ اچانک اس کے منہ سے حیرت کی ایک چیخ نکل گئی۔ کھڑکی میں سے تنویر کا سر ابھر رہا تھا۔ تین چار لمحے گذر گئے۔ اور اب اس کے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جس سے اُسے سخت نفرت تھی۔ جس کی تکلیف دہ یاد کو بھی اس نے بھلا دیا تھا۔

"تم کون ہو"؟ سعیدہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"اتنی جلدی مجھے بھلا دیا؟ شاید جان بوجھکر یہ سوال کر رہی ہو!" تنویر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر یہاں تمہارا کیا کام؟"

"گھبراؤ نہیں سعیدہ! میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا"!

سعیدہ نے اپنے آپ کو سنبھالا اور غصے سے کہا: "میں پوچھتی ہوں یہاں تمہارا کیا کام اور تم ہو کون؟"

"میں کون ہوں یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تم مجھے بہت اچھی طرح جانتی ہو اب رہ گیا یہ سوال کہ میرا یہاں کیا کام؟"

"جانتے ہو اس وقت تمہاری کیا پوزیشن ہے؟ تم ایک چور کی حیثیت رکھتے ہو!"

"تمہارا یہ خیال درست ہو سکتا ہے۔ مگر میں تمہاری ان حقیر چیزوں کو قطعاً چرانے نہیں آیا۔ میرا مقصد کچھ اور ہے"؟

سعیدہ تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف چلی۔ تنویر نے عجلت آگے بڑھکر اس کی کلائی پکڑ لی اور کہا: "سعیدہ اس چیز کی بالکل ضرورت نہیں میں تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ اگر تم نے اب بھی میری باتوں کا یقین نہ کیا اور کوئی بے جا حرکت کی تو شاید میں بھی کوئی غیر مناسب حرکت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ میں صرف دو تین منٹ میں جو کچھ مجھے کہنا ہے کہدوں گا۔ اس کے بعد جس راستے سے آیا ہوں اسی راستے سے چلا جاؤں گا۔ تم بالکل مطمئن رہو"۔ یہ کہتے ہوئے تنویر نے دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔

"لیکن تمہاری اس ذلیل روش سے کیا مراد ہے؟ چوروں کی طرح کسی کے گھر میں آنا کیا مطلب رکھتا ہے؟"

"یہی میں بتانے لگا ہوں۔ مہربانی کرکے دو تین منٹ کے واسطے سکوت اختیار کر لو ۔ ۔ ۔ سعیدہ! تم وہ وقت بھول گئیں جب میں تمہاری تمناؤں کا مرکز تھا۔ جب تم مجھے پوجتی تھیں، اور جب تم ۔ ۔ ۔"

"میں یہ بیہودہ باتیں سننا نہیں چاہتی" سعیدہ نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

تنویر نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا: "اور جب تم میرے بغیر بے چین ہو جایا کرتی تھیں افسوس تم وہ وقت بھول گئیں لیکن مجھے وہ وقت خوب یاد ہے۔ اس وقت کے تمام مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ اور دم واپسیں تک پھرتے رہیں گے!" تنویر نے ٹھنڈی آہ بھری "تم نے مجھے اور میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ صرف لوگوں کی باتوں سے متاثر ہو کر"

"میں نے ایک بار کہدیا ہے اس قسم کی واہیات باتیں میں نہیں سنوں گی!" سعیدہ نے غضبناک ہو کر کہا۔

"تمہیں سننی پڑیں گی" تنویر نے بھی غضبناک لہجے میں کہا "میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم نے لوگوں کی باتوں سے متاثر ہو کر جلد ہی اور خود کو ایسے شخص کے حوالے کر دیا جو قاتل ہے!"

سعیدہ کو ایسا محسوس ہوا گویا اس پر بجلی آگری ہے۔

"تمہارا ہونے والا شوہر قاتل ہے ۔ ۔ قاتل ۔ ۔ ۔ جس ــــ

نے پھانسی کی رسی منتظر ہے!"

"قاتل . . . تم کہہ رہے ہو" سعیدہ کے لبوں سے نکلا۔

"ہاں میں کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے یہ کہنے کا حق ہے . . . کیونکہ دنیا میں سوائے میرے یہ راز کوئی بھی نہیں جانتا۔"

سعیدہ سنبھلی۔ تنویر کی حیثیت کا اندازہ لگایا اور بولی "تمہاری یہ ذلیل باتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں ایک مکار شخص کی ——"

"سعیدہ! اپنی زبان کو لگام دو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست ہے۔ اگر میں چاہوں تو چند منٹ میں تمہارے یوسف کو گرفتار کرا سکتا ہوں۔ تم شاید ثبوت مانگتی ہوگی . . . اور میں اس کے لئے بالکل تیار ہوں سنو! تمہارے چچا کے کارخانے میں آنے سے پہلے یوسف سیٹھ بہاری لال کے کارخانے میں ملازم تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔ سیٹھ بے حد ظالم سفاک اور خونخوار انسان تھا۔ اس نے ایک معمولی سی بات پر کارخانے کے مزدوروں کی تنخواہیں روک دیں۔ یوسف خیر سے پرجوش لیڈر سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس نے کارخانے میں مزدوروں سے ہڑتال کرا دی۔ اور سیٹھ کو دھمکیاں دینے لگا۔ اس نے سیٹھ کو کئی خطوط بھیجے جن میں مالی نقصان کے علاوہ قتل کی دھمکیاں بھی دیں۔ ایک خط میں تو خوفناک انتقام کا اعلان بھی کر دیا۔ ابھی دنوں سیٹھ کی کسی غیر آباد جگہ پر یوسف سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یوسف نے جوش اور غصہ میں سیٹھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

وہ ذرا ٹھہرا اور پھر کہنے لگا "میں تم پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ خطوط جنہیں سیٹھ کو طرح طرح کی دھمکیاں دی گئی ہیں۔ میرے قبضے میں ہیں اور اس وقت بھی میری جیب میں ہیں۔ کیا ان خطوط کی شہادت یوسف کو پھانسی کے تختے تک لے جانے کے لئے کافی نہ ہوگی"

سعیدہ پھٹی پھٹی نظروں سے تنویر کو دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"ابھی تمہیں میری باتوں پر اعتبار نہیں آیا۔ خیر میں ناقابل تردید ثبوت رکھتا ہوں یہ دیکھو!" یہ کہہ کر تنویر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکالا۔ اسے کھولا۔ اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے سعیدہ کے سامنے رکھ دیا۔ واقعی یہ یوسف کی طرز تحریر تھی۔ صاف صاف لکھا تھا۔

سیٹھ جی!

"تم غریب مزدوروں کو بے حد تنگ کر رہے ہو! اگر تمہارا یہ ظالمانہ طریقہ جاری رہا۔ تو مجھے بھی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑیگا۔ مزدور فاقہ کر کر کے مر رہے ہیں۔ اور تم عیش و عشرت میں مشغول ہو لیکن یاد رکھو تمہاری زندگی بھی سخت خطرے میں ہے! انتہائی سزا کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

اس تحریر کے نیچے یوسف لکھا تھا۔

سعیدہ نے یہ تحریر پڑھی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی رنگین دنیا خاکستر کی صورت میں تبدیل ہو کر سیاہ حروف پر چھا گئی ہو! تاریک سائے اس کی آنکھوں کے سامنے لرزنے لگے۔ ایک لمحے کے لئے اس کے ہاتھوں میں بجلی کی سی سرعت پیدا ہوئی . . . مگر تنویر نے فوراً مسکرا کر کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

"تم متعجب ہوگی کہ سیٹھ نے ان چٹھیوں کو پولیس کے حوالے کیوں نہ کیا؟ یہی بات ہے نا؟ سنو! میرے یوسف کے ساتھ نہایت اچھے تعلقات تھے۔ اور میری وجہ ہی سے یوسف کو ان خطرناک اقدامات کے باوجود ذرہ بھر نقصان نہ پہنچ سکا! مگر آج میرے اور یوسف کے درمیان ایک دنیا حائل ہے! مجھے جو کچھ کرنا ہے کر کے رہوں گا! اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ یوسف کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے سیٹھ بہاری لال کے قاتل کی تلاش برابر جاری ہے . . . مگر قاتل کا پتہ سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں جانتا! ہاں ایک اور بات بھی سنو!"

سعیدہ نے اس کی طرف دیکھا۔ تنویر مسکرایا۔

"میں یوسف کو موت کے منہ سے بچا سکتا ہوں۔"

سعیدہ کی آنکھوں میں امید کی جھلک اس طرح پیدا ہوئی جس طرح ایک سوکھے ہوئے تالاب میں پانی کی ایک باریک سی لہر پیدا

ہو جاسنے۔!

"میں یوسف کو پھانسی سے بچا سکتا ہوں۔ مگر ایک شرط پر۔ اور وہ یہ کہ تم اپنا رفیق زندگی اس خاکسار کو منتخب کر لو"

سعیدہ تڑپ اٹھی۔ گویا اس کی رگ و پے میں بجلی کی رو دوڑ گئی ہے۔ تنویر نے اس کی حالت کا جائزہ لیا اور کہا "تو بہتر ہے یوسف کو کیفر کردار تک پہنچنے دو۔ چند گھنٹوں کی بات ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا!"

"تنویر!" سعیدہ نے پہلی دفعہ مایوسانہ لہجے میں کہا: "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ کہہ دیا" تنویر نے جواب دیا۔

"تم کیا کرو گے؟ تم کیا کر سکو گے؟"

"جو کچھ میں کر سکوں گا وہ میں نے بتا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب بتاؤ تم کیا کرو گی؟"

"میں ۔ ۔ ۔ میں"

سعیدہ گھبراؤ نہیں۔ اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرو تمہاری شادی ترسوں ۔ ۔ ۔ ہو رہی ہے میں پرسوں اسی وقت یہاں آؤں گا! اس وقت آخری فیصلہ سنا دینا۔ ترسوں صبح کو یا تو تم میرے آغوش میں ہو گی یا یوسف موت کی آغوش میں"

"اس وقت جاؤ ۔ ۔ ۔ جاؤ" سعیدہ نے گھبرا کر کہا۔

"میں جا رہا ہوں۔ مگر اس بات کو بھولنا نہیں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ کر کے بھی دکھا دوں گا۔ یوسف کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے ۔ ۔ ۔ یاد رہے ناممکن سے ناممکن بات ہو سکتی ہے مگر میرے الفاظ کی صداقت میں ذرہ بھر فرق نہیں آئیگا"

تنویر نے یہ کہا، کھڑکی کے پاس پہنچا اور پھر غائب!

تنویر چلا گیا اور سعیدہ مضطربانہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کی دنیا جو آدھ گھنٹہ پیشتر مسرتوں رنگینیوں اور خوشبوؤں سے لبریز تھی اب روح فرسا مایوسیوں کے بھیانک سایوں میں غائب ہو رہی تھی اس کی امیدوں کی روشنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی آرزوؤں کا سنہرا خواب اس کی محبوب ترین ہستی زندگی اور موت کے درمیان لٹک

آ رہی تھی۔ چند لمحے ٹہلنے کے بعد اس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا، پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ چٹھی جو یوسف نے سینٹھ بہاری لال کو لکھی تھی۔ اور جو ابھی ابھی تنویر نے اسے دکھائی تھی اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ الفاظ خونی دھبوں کی طرح اس کی آنکھوں تلے ناچنے لگے۔ اسی اثنا میں کلاک نے نو بجائے۔ سعیدہ کی نگاہیں بے اختیار کلاک کی طرف اٹھیں۔ کلاک کے قریب ہی روشندان کی رسی لٹک رہی تھی۔ اس کی نگاہیں کلاک سے ہوتی ہوئی رسی پر پڑیں۔ اور وہ پھانسی کی رسی کے تصور سے کانپ اٹھی۔

صوفے پر بیٹھی ہوئی وہ بھیانک خیالات میں غرق تھی۔ اس کے سامنے تصورات کے دھندلکے میں یوسف کا گھبرایا ہوا چہرہ، پھانسی کی رسی اور تنویر کے الفاظ پھرتے رہے۔ کئی منٹ گذر گئے کئی قسم کے خوفناک خیالات اس کے ذہن میں آئے۔ کئی طرح کے بھیانک تصورات نے اسے کشمکش میں ڈالدیا۔ وہ ڈر ڈر کر سوچتی رہی۔ سوچ سوچکر ڈرتی رہی۔ آخر دل میں ایک نئے جذبے کے پیدا ہونے سے وہ اٹھ بیٹھی۔ پیشانی سے پسینے کو پونچھا اور ٹہلنے لگی محبت کے راستے میں ہزاروں مصیبتیں ہیں۔ مگر میں ان مصیبتوں کا مقابلہ کروں گی" اس نے دل میں کہنا شروع کیا "تنویر ۔ ۔ بدترین انسان ۔ ۔ مگر محبوب کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا! یوسف کی زندگی خطرے میں ہے۔ اور میں اپنی قربانی سے اسے بچاؤں گی۔ وہ زندہ رہے گا ۔ ۔ وہ زندہ رہیگا کوئی اسکا بال بھی نہیں بیکا کر سکتا" یہ کہتے ہوئے اسکے چہرے پر جوش کی سرخی دوڑ گئی۔ معاً اسے اپنے اس خط کا خیال آیا جسے میز کی دراز میں رکھ چکی تھی۔ وہ میز کے پاس پہنچی۔ دراز کو کھولا اور خط دیکھنے لگی۔ خط کے قریب ہی اسے کئی خطوں کا بنڈل نظر آیا۔ سمجھا یہ سب اس کے خطوط ہیں جو وہ یوسف کو جبکہ وہ کہیں باہر بھیجتی رہی ہے۔ اس نے خط کے ساتھ ہی بنڈل کو بھی باہر نکالا بنڈل کے ریشمی تاگے کو توڑا۔ تمام خطوط میز پر بکھر گئے خط کو اٹھایا۔ پتہ یوسف ہی کا تھا مگر طرز تحریر اجنبی معلوم ہوتی

تھی، تاہم اس خیال کو اس نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور لفافے کو کھولا
کہ ایک دروازے پر دستک ہوئی۔ سعیدہ خطوط کو چھپانے لگی تھی۔ کہ
یوسف کی آواز اس کے کان میں آئی۔ اس نے خطوط کو وہیں رہنے دیا۔
تیزی کے ساتھ جاکر دروازہ کھول دیا۔ یوسف مسکراتا ہوا اندر
داخل ہوا۔

"مجھے آج سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔" سعیدہ نے جوش سے کہا

"کیا ؟" یوسف نے پوچھا۔

"تمہارے اضطراب کی وجہ! تمہاری خلش کی نوعیت!"

یوسف چلتا چلتا میز کے پاس پہنچ گیا۔ جونہی اس کی نگاہ خطوط
پر پڑی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں
"تم سمجھتے تھے کہ میں اس بھید کو نہیں جان سکوں گی۔ . . . مگر
میں نے جان لیا ہے۔ . . تاہم . . ."

"سعیدہ . . . !" یوسف نے گھبرا کر کہا۔

"میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں اگرچہ عورت ہوں . . .
کمزور دل والی عورت تاہم تم دیکھو گے . . ."

"سعیدہ! خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا گناہگار ہوں
میں تمہارا مجرم ہوں۔ لیکن خدا کے لئے سوچو!"

"تم گھبرا کیوں رہے ہو ؟؟"

"مجھے شرمندہ نہ کرو سعیدہ! میں تمہارا مجرم سہی۔ مگر خدا کے لئے
سوچو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ وہ عورت دل و جان سے مجھے چاہ
رہی ہے . . . مجھے . . ."

"کیا ؟" سعیدہ نے اضطراب انگیز لہجے میں کہا۔ اسے ایسا محسوس
ہوا گویا کسی نے اس کے دل کو جھنجھوڑ ڈالا ہے!

"وہ عورت دل و جان سے مجھے چاہ رہی ہے میں نے تمہارے
ملنے سے پیشتر اس سے شادی کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر میری سعیدہ!
تم نے تو میری دنیا ہی بدل ڈالی . . ."

"کونسی عورت ؟" سعیدہ نے مضطربانہ پوچھا۔

"نہیں . . . تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو . . . لیکن تم جانتی ہو میں
مجبور ہوں۔ یہ خطوں والی بیچاری بیکس عورت ———"

سعیدہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یوسف کو دیکھنے لگی۔ دو چار لمحے
اسی طرح گزر گئے۔ سعیدہ کی نگاہ خطوں پر پڑی۔ خطوں میں ایک
تصویر بھی پڑی تھی۔ سعیدہ نے اُسے جلدی سے اٹھا لیا اور دیکھا۔
یہ تصویر رشیدہ کی تھی۔ رشیدہ یوسف کی ایک عزیزہ تھی۔ سعیدہ کو
کئی بار شک ہوا تھا کہ رشیدہ یوسف کو چاہتی ہے . . . اور اسی لئے
اسے رشیدہ سے ایک قسم کی دشمنی سی ہو گئی تھی . . . محبت میں رقابت
کتنی خوفناک چیز ہے۔

"میری سعیدہ! مجھے معاف کر دو۔ بھلا دو ان چیزوں کو" یوسف
نے خطوط کو اکٹھا کرتے ہوئے کہا۔ سعیدہ نے جلدی سے ایک لفافہ
کھولا۔ دو چار سطریں ہی پڑھنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا کہ رشیدہ
اس کے محبوب کو چاہتی ہے . . . . اسکا محبوب اس کے حق میں
خیانت کر رہا ہے۔ اسے دھوکا دیتا رہا ہے۔ اس نے خط اور تصویر
کو نیچے پھینک دیا۔

"اتنا فریب! اتنا دغا ؟" سعیدہ کے لبوں سے نکلا۔

"مگر میری مجبوری پر بھی خیال رکھو۔"

"مجھے دھوکے میں رکھ کر تم اس ڈائن کو چاہ رہے ہو . . ."

"سعیدہ! تم میری مجبوریوں کا خیال نہیں کرتیں۔ رشیدہ۔"

"رشیدہ . . . ! رشیدہ!! رشیدہ کیا کر سکتی تھی۔ تم مجھے دھوکا
دیتے رہے ہو۔"

"مگر سعیدہ! سوچو میں اس کا کیا علاج کر سکتا تھا ؟"

"اسکا علاج کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ تم مجھے دھوکے میں رکھ
سکتے تھے۔ اور بس یہی تم نے کیا۔ . مجھے معلوم نہ تھا یہ بھولی بھالی
عورت اتنی زہریلی ناگن ہے۔ اب جاؤ۔ . . جاؤ"

یہ کہہ کر سعیدہ ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی کمرے سے باہر
نکل گئی ؎

ظاہر ہے یہ افسانہ نامکمل ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ میری بجائے کوئی اور صاحب اسے مکمل کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ افسانہ نگار حضرات کی خدمت میں التماس ہے۔ کہ وہ اس طرف توجہ دیں۔ آئندہ پرچے سے اہل قلم م

جناب سید تنویر نقوی

گیت

شیام نہ اب تک آئے سکھی ری
شیام نہ اب تک آئے!

آؤ من مندر میں آؤ
بھولے بسرے گیت سناؤ
میں روؤں اور تم مسکاؤ
یہ چنتا کلپائے سکھی ری
شیام نہ اب تک آئے

چھپکے چھپکے پیار کی باتیں
ہلکی ہلکی سی برساتیں
ساون کی وہ بھیگی راتیں
پریتم بھول نہ جائے سکھی ری
شیام نہ اب تک آئے

دنیا ہے یہ آنی جانی
جیون جیسے بہتا پانی
جوبن پھول کی رام کہانی
کلی کھلے مرجھائے سکھی ری
شیام نہ اب تک آئے

میری دنیا ڈول رہی ہے
آشا آنسو تول رہی ہے
من کے موتی رول رہی ہے
آم پہ کوئل گائے سکھی ری
شیام نہ اب تک آئے

کنول سکھی! جل میں مسکائے
سارس جوبن پر اٹھلائے
کوئی بول ہردے میں سمائے
آئے پھر نہ جائے سکھی ری
شیام نہ اب تک آئے

منشی خیرات علی نے ریڈیو خریدا

منشی خیرات علی یادش بخیر، بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ گو شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے پہلے کی پیداوار یادگارِ محل کے آس پاس کی پود ہیں۔ مگر آنکھیں رکھتے ہیں ان سے کام لیتے ہیں علوم مروجہ کے نظریات و مشاہدات کے قائل ہی نہیں بلکہ عامل بھی ہیں۔ اور محض اخلاقِ جلالی اور مثنوی مولینا روم کے زور پر ہی دنیا کو آگے لگائے نہیں پھرتے۔ اکثر اوقات بایں ریش دراز بیسویں صدی کی رنگینیوں میں یوں کود پڑتے ہیں کہ دیکھنے والے مایوس ہو جاتے ہیں کہ اب تو لاش ہی ہاتھ آئے گی۔ مگر تھوڑی دیر میں کنارے کھڑے خشک دامنی کا دعوے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

منشی خیرات علی اترنے کو تو دلی کے سٹیشن پر اتر گئے مگر نہ کسی نے پوچھا اور نہ انہوں نے بتایا کہ کیوں اترے اور کس تقریب سے۔ خیر سٹیشن پر اترے سسرال میں پہنچے نسبتی بھائی کے بیٹے کی شادی میں شریک ہوئے۔ خوش دامن کو سلام کیا، اس نے بلائیں لیں دیورانی جیٹھانی آئے۔ بھائی بندوں سے مصافحہ کیا، بغلگیر ہوئے اور بیٹھ گئے۔

شادی کی تقریب اور برات کے ہنگامے تھے۔ گھر اور باہر کے سب خوشیاں منا رہے تھے گراموفون بج رہا تھا "یاد نہ کر دلِ حزیں" الا بیکار ڈھچر ڈھا تھا۔ اہلِ دل سر ہلا رہے تھے۔ لڑکے بالوں کا جمگھٹا تھا۔ مگر منشی خیرات علی کو کہاں گوارا کہ اس خوشی کی محفل میں زندگی کی بےثباتی کا راگ الاپا جائے۔ فوراً بول اٹھے۔

میاں عیدو! یہ کیا لگا رکھا ہے۔ اگر کوئی چیز ہے تو سناؤ ورنہ یہ بھیرگ اٹھاؤ۔ یہاں محفلِ شادی ہے ماتم بازہ تو نہیں۔

عیدو۔ بہت اچھا لبا بھائی! میرا خیال تھا کہ آپ موٹر لاری سے سفر کرتے آ رہے ہیں جہاں قدم قدم پر دنیا فانی نظر آتی ہے آپ ہی کی خاطر یہ ریکارڈ چڑھا دیا تھا اور بیچئے۔

منشی جی۔ ارے میاں ہم نے زندگی کا بیمہ نہیں کرا رکھا کہ لاری سے سفر کریں۔ ریل سے آیا ہوں، پھول کی طرح پہنچا ہوں۔ ہاں "پریم نے آگ لگا دی من میں" دیکھو تو کوئی بات تو ہو۔ یہ اور بات ہے کہ آج ہندوستان کو پریم کا بھوت بہت بدحسب ہو کر لپٹا ہے۔ خدا ہی بچائے گا۔ اس پریم کہانی سے کہو کوئی حقانی چیز بھی ہے۔

منوں۔ (منشی جی کا صاحبزادہ) ابا! امی جان بلاتی ہیں۔ اس پیغام نے منشی جی کا لطف کرکرا کر دیا۔ اٹھ کر زنانخانے میں چل دیئے۔

بیوی۔ اے باہر سے آئے باہر ہی بیٹھ گئے اندر آ کر بچوں کے سر پر ہاتھ تو پھیرتے۔ گلنار آپا نے بھی کہا کہ بھائی کیسے سخت دل ہیں۔

منشی جی۔ بچوں اور گلنار کی تو خیر آپ اپنی کہیئے کہ یہ گل خیر آپ کی مزاج پرسی کے لئے کیوں حاضر نہ ہوا۔ کہیئے کیا ارشاد ہے۔

بیوی۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ یہ بچے گراموفون کے لئے سر ہو رہے ہیں۔

منشی جی۔ کیا مضائقہ ہے لیتے چلیں گے "ہز ماسٹرز وائس" اچھا رہیگا۔

بیوی۔ نہیں وہ کہتے "ولایت کے لئے کہتے ہیں"۔

منشی جی۔ ہاں ہاں کتابی تو اپنے مالک کی آواز پر کان لگائے

بیوی۔ ہاں دیکھی۔ لو اب چلئے آرام تو کیجئے۔

منشی جی۔ اچھا دیکھا جائیگا۔

منشی خیرات علی حسبِ معمول بیٹھک میں پلنگ پر ٹانگیں رکھے حقے کے کش اڑا رہے تھے کہ مرزا علیداد [illegible]

کی خرید کے بعد منشی جی کی بیٹھک خوش فکروں کا ٹھکانہ بنگئی تھی
منشی جی۔ تشریف مرزا صاحب کدھر رہے۔
علمدار۔ کئی روز سے گراموفون کی آواز نہیں آتی۔ کل ہی بنارسی کباڑی کی دوکان پر ایک بے بس سا گراموفون دیکھا قطع وضع سے بالکل آپکا سا تھا مگر شکل وشباہت نہ تھی میں نے خیال کیا کہ پوچھوں گا۔
منشی جی۔ اے صاحب چھوڑیئے اس جھگڑے کو۔ یہ گراموفون بھی ہماری زندگی کا ایک سنگین حادثہ ہے۔ شکر ہے اس سے نجات ملی۔
گراموفون کیا تھا۔ ایک آفت تھی۔ ہر وقت بجا۔ دن رات بجے۔ گلی گلی، محلہ محلہ بجا۔ بجتا ہوا چھوڑ کر دفتر جاتے اور جب واپس آتے بجتا پاتے۔ جب کسی اپنے پرائے نے مانگا معہ ریکارڈوں کے دے ڈالا سوئیاں بھی گھر سے دیتے کہ کہیں لوگ جاپانی سوئیوں سے کام لیکر ریکارڈ بیکار نہ کر دیں۔ مگر معلوم نہیں ظالم مانگنے والے سوئی کے بجائے کیا کچھ استعمال کرتے کہ ریکارڈ تیسرے دن بیکار ہو جاتے۔ پھر کہیں کمپنیوں کو معلوم ہوگیا کہ ہم نے گراموفون خریدا ہے۔ پھر کیا تھا۔ ہر ڈاک سے ریکارڈوں کی فہرستیں آنے لگیں۔ اور ہر روز ایک دو نئے اور تازہ ریکارڈوں کے لئے بیوی کی فرمائش ہونے لگی لیکن غنیمت ہے جلد ہی مشین کا چرخا ڈھیلا ہوگیا ایک روز آکر دیکھا کہ ننھے میاں گراموفون کی انتڑیاں نکالے پوسٹ مارٹم میں مصروف ہیں۔ ریکارڈ تو ہر روز ٹوٹتے تھے مگر اس دن ننھی نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ہم نے یہ منظر دیکھ کر بنارسی کباڑی کو بلا بھیجا۔
علمدار۔ صاحب یہ تو ناقابل تلافی حادثہ ہے میں کبھی ایسے فیصلہ کی تائید نہ کرتا۔ مل بیٹھنے کا ایک سلسلہ بنا۔ سوچتا رہا۔
منشی جی۔ بےشک ملال تو ہوتا ہے۔ مگر مفت کے شوقینوں کا کیا علاج۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ لوگوں کو پرائی چیز برتنے کا سلیقہ نہیں۔
علمدار۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ انہیں اب قدر معلوم ہو جائے گی
لیکن کہنا پڑتا ہے۔ ہمارے بھائیوں کی ترقی وتعلیم کے معاملہ میں ایسی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔
منشی جی۔ میں خدانخواستہ شکایت نہیں کرتا محض تجربہ کا اظہار ہے دلبستگی کی کوئی اور صورت پیدا ہو جائیگی۔ دہری عافیت خطرے میں ہے۔ کیونکہ بیگم صاحبہ بھی ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہیں۔ گھر والیوں کے لئے اب اور تو کوئی کام ہی نہیں رہا۔ سینا پرونا۔ کوٹنا پیسنا مدت ہوئی جاتا رہا۔ کیا گانا بجانا بھی نہ ہو۔ اب بتایئے بیچاریاں کریں تو کیا کریں۔ کھانا پکانا اور بچوں کی پرورش بھی ان کے بس کا روگ نہیں۔ باورچی اور نرسیں عام ہیں۔ اگرچہ ان کاموں کے متعلق ہمیں اس غریب سے کوئی شکایت نہیں۔ تاہم بے وقت کی سمع خراشی سے مہلت مل سکتی ہے۔ یہ تجربہ گراموفون سے حاصل ہوا ہے۔ میں خود فکر میں ہوں۔ تفریح کی کوئی اور صورت نکل آئے گی۔
مرزا علمدار گئے تھے۔ کہ میر باقر آ پہنچے۔ گراموفون تقریب ملاقات تھی۔
میر باقر۔ کہئے حضرت۔ کیا دھن چھیڑ رکھی ہے۔ وہ بیتا بیکانا کیسا رہا؟
منشی جی۔ آں قدح بشکست۔
میر باقر۔ اللہ ساقی کو سلامت رکھے۔ خیریت تو ہے۔
منشی جی۔ آپ کو تو معلوم ہے۔ وہ گراموفون مدت سے [illegible] دگرگوں رہا تھا ختم ہوگیا۔
میر باقر۔ واہ صاحب غضب کیا۔ خیر ہم سناتے ہیں۔ [illegible] سیٹھ خوش بخت رائے کے ہاں دعوت تھی [illegible] میں سیٹھ جی کا دم غنیمت ہے۔ اس محفل میں شیخ و برہمن [illegible] امتیاز ہی نہیں۔ محفل گرم تھی۔ رہ رہ کر آپ کا ذکر آیا صاحب تو سنا ہے۔ ریڈیو کس کیفیت کی چیز ہے۔ آپ جانتے [illegible]

سیٹھ طرشجنت تو دوستوں کے دوست ہیں۔ انہوں نے ریڈیو لگوالیا ہے۔ بڑی تاکید کر رہے تھے۔ آپ آج ضرور تشریف لائیں۔ ورنہ انہیں شکوہ ہوگا۔

منشی جی۔ خوب یعنی چلیں گے۔ ہم نے ریڈیو سنا ہے۔ اچھی چیز ہے۔ مگر بڑے تردد کا آلہ ہے۔ اور پھر اپنا گھر مہنتوں اور جانی موالی۔ اس کے علاوہ غیر ممالک کا پروگرام اپنے لئے بے سود ہے ساتھ بجلی کا خرچ۔ اور آپ سے کیا چھپانا۔ اس گراموفون کا تجربہ تلخ رہا۔

میر باقر۔ گراموفون تو ریڈیو کے مقابلہ میں گرد ہوگیا۔ سے بھول ہی جائیے۔ ہمارا تو اپنا ارادہ ہے کہ ریڈیو لگوالیا جائے مگر ابھی بجلی کا انتظار ہے۔ بجلی کمپنی کو روز تقاضا کیا جاتا ہے سارا محلہ چلا رہا ہے۔ اندھیر پڑا ہے۔ کوئی نہیں سنتا۔ آپکے ہاں تو ماشاءاللہ بجلی کی آسانی ہے۔ پھر تردد کیا ہے۔

منشی جی۔ مگر یہ عفت کی فرمائش کون پوری کریگا۔ کہ خالو ابا ذرا ریڈیو سننا چاہیے۔ اور خالہ ریڈیو سننا چاہتی ہیں کب فرصت ہوگی۔ "گویا ریڈیو کیا لگوایا ہم نے محلہ بھر کے مہمانوں کی تفریح کا ذمہ لیا ہے۔ اور سنئے۔ آنے گئے۔ اور ایسے مہمانوں کی اگر کچھ تواضع نہ کی جائے تو مشکل۔ فوراً کہدینگے کہ شربت تو درکنار پان تک کے لئے نہ پوچھا۔

باقر۔ آپ تو بہت دور پہنچ گئے۔ اگر اسی کا خیال کیا جائے تو زندگی مشکل ہوجاتی ہے۔ دنیا کے کام کاج بند ہوجائیں گے آپ مذاق نہ کیجئے۔ ذکر ریڈیو کا ہے۔ نہ ریکارڈ کی ضرورت۔ نہ سوئی کی کسی چیز کا تردد ہی نہیں۔ شہر شہر کا نمبر علیحدہ علیحدہ۔ پروگرام جدا جدا۔ اور گانے والے کیا کہنا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں سٹیشن قائم ہیں جس شہر کا گانا سننا چاہیں۔ سوئی گھمادیں بس پھر کیا ہے آسمان سے نغمے آنے لگتے ہیں بچوں والے گھروں میں یہ چیز ضرور ہونی چاہئے۔ گھر کی رونق کے لئے یہ ہنگامہ لازم ہے۔

منشی جی۔ بہت خوب میں گھر میں بات کرونگا۔

میر باقر۔ زیادہ غور کی تو چنداں ضرورت نہیں بیگم جی کے ہاں تو آج شام تشریف لائیگا۔

منشی جی۔ میاں ہم جانتے ہیں کہ ریڈیو اچھی ایجاد ہے۔ مگر بیوی سے بھی تو مشورہ کرلیں۔ خیر شام کو ملاقات ہوگی۔

بانو۔ یہ وقت آنے کا وقت ہے۔ کچھ اپنی تندرستی کا بھی خیال ہے

منشی جی۔ لو ایک خوشخبری سنلو۔ بھلا بتاؤ تو۔

بانو۔ مجھے ان پہیلیوں کا کیا پتہ ہے۔ کپڑے بدلئے تولیا صابن رکھا ہے۔ ہاتھ منہ دھوئیے۔ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہورہی ہے

منشی جی۔ بس بارگینز سنئے ہم نے ریڈیو خرید لیا ہے۔

بانو۔ وہی جس کا ذکر تھا۔ بھلا یہ کیا وحشت ہے۔ گراموفون سے نجات ملی تھی ایک اور نیا ہنگامہ شروع ہوجائیگا۔

منشی جی۔ بانو! اس میں زیادہ ہنگامہ نہیں۔ ریڈیو والے خود آکر ہر ایک چیز کیل کانٹے سے درست کرجائینگے۔ ہمیں صرف سوئی گھمانی ہوگی۔ اور بس پھر کیا ہے۔ ع

مطرب بہ نغمہ۔ ہزن تمکین ہوش ہے

بانو۔ یہ تو گھر پھونک تماشا ہے۔ گانا سنواؤ اور باتیں سنو۔

منشی جی۔ اب تو ہم سودا کر آئے ہیں۔ اور شکوے تو تمہاری ہمیلیاں ہی سنتی ہونگی۔

بانو۔ زیادہ بحث نہ کیجئے کپڑے بدلئے۔ چائے تیار ہے۔

اتوار کا دن تھا۔ منشی خیرات علی کو فرصت تھی۔ ریڈیو اور ریڈیو لگانے والے پہنچ گئے منشی جی کبھی اندر جاتے کبھی باہر جاتے باتوں باتوں میں خبر اڑ گئی کہ منشی خیرات علی نے ریڈیو خرید لیا۔ ایک ہنگامہ تھا۔ محلے کے لڑکے بانس لگتے دیکھ خوشی سے بلیوں اچھلنے لگے۔ مرزا علمدار پہنچے میر باقر بھی آموجود ہوئے۔ تو چل میں چل تانتا بندھ گیا

علمدار۔ منشی جی یہ کیا تعجب ہے
منشی جی۔ مرزا قصہ کیا ہونا تھا بس ہم نے ریڈیو خرید لیا ہے یہ بانس کے کھمبے لگنے کی دیر ہے۔
علمدار۔ خوب۔ یہ تو واقعی مزے کی چیز ہے میں نے خوش بخت رائے سیٹھ کے ہاں سنا طبیعت خوش ہو گئی۔
منشی جی۔ کیونکہ نہ ہو مغرب والوں کی جدت طرازیاں ہیں۔ مگر میر باقر کو دیکھ کر یہ صاحب کے انداز بیان کا اثر ہے۔ ورنہ اپنی طبیعت سے آپ واقف نہ تھے۔
میر باقر۔ خوب۔ آپ ذرا اپنے دل سے تو پوچھئے سیٹھ کے ہاں کیسے محو ہو رہے تھے۔
منشی جی۔ چلئے یوں ہی سہی۔
علمدار۔ فرمائیے۔ کب تک مکمل ہو جائیگا۔
منشی جی۔ آج شام کا پروگرام سن لیجئے۔
میر باقر۔ واقعی کلکتہ بمبئی اور دہلی میں پانچ چار چیزیں سننے کے لائق ہیں۔
علمدار۔ پانچ چار چیزیں۔ واقعی؟
منشی جی عجیب لطف رہے گا!
میر باقر۔ اس میں کیا شک ہے!

. . . .

علمدار۔ تو پھر جلدی کیجئے۔
منشی جی۔ میاں سچ پوچھو تو عجیب چیز ہے۔ پریوں کا شیشے میں اترنا تو سنتے آئے تھے لیکن آواز کو باندھ کر پر لگا دینا ریڈیو کا حصہ ہے
میر باقر۔ فرمائیے۔ ارباب بزم کو تو معلوم ہو گیا ہو گا۔
منشی جی۔ ابھی باقاعدہ اطلاع تو نہیں دی۔ بھائی علمدار دوست احباب کو مطلع کر دینا۔
علمدار۔ کیوں نہیں۔ ضرور۔ اطمینان رکھئے۔ ابھی گھر گھر خبر ہو جائے گی۔
میر باقر۔ ایک غیر رسمی سی افتتاح کا اعلان کیوں نہ کر دیا جائے ایک تقریب ہے۔ محض چائے وائے کا تردد ہو گا۔
منشی جی۔ خیال اچھا ہے۔ کیا مضائقہ ہے۔ بھائی علمدار اسی طریق سے اطلاع کر دیجئے۔ آخر اپنے دوست احباب تو ہیں۔ شام چھ بجے کا وقت مناسب ہو گا۔
علمدار۔ بالکل درست ہے

ریڈیو کا قائم کر دینا بات ہی کیا تھی۔ بانس کھڑے کر دیئے پھیلا دی گئیں۔ اور بجلی کے تار جوڑنے کی دیر تھی۔ کہ ریڈیو چلنے لگا پھر بھی ریڈیو والوں کی ہستی کی داد دینی چاہئے۔ کہ دیکھتے دیکھتے ہزاروں میل سے مطلب کی آوازیں اتارنے لگے اور دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ منشی جی کو خوب معلوم تھا۔ کہ ریڈیو کی خرید کے متعلق بیوی کا اعتراض رسمی کارروائی ہے۔ جو خالص اتفاق الرائے کی سند ہے۔ واقعی بیوی کا شوق میاں سے دو قدم آگے تھا۔ میاں نے تو بعد میں سوچا تھا۔ مگر بیوی نے پہلے ہی سے اپنی سہیلیوں کو رقعے جاری کر رکھے تھے۔ شربت پان الائچی کا انتظام تھا۔ اور میاں کے دوستوں کے لئے چائے بسکٹ کی ترکیب تھی۔ نوکر چاکر مشغول تھے۔ آمد و استقبال کی تیاریاں تھیں۔ ڈولی اور تانگے آنے لگے۔ میاں منو اور انکے دوست دنیا کے معاملوں میں ہر جگہ ادھم مچا رہے تھے۔

خیر منشی جی کے احباب پہنچے۔ گھر والی کی سہیلیاں اور بے شمار خالائیں پہنچ گئیں۔ بیوی پھولی نہ سماتی تھی۔ باہر مردان خانے کا انتظام و استقبال مرزا علمدار اور میر باقر کے ذمے تھا۔ منشی جی ... رکھکر۔ ادھر ادھر ہر جگہ مصروف تھے۔ دوست احباب کی آمد تھی ... نے وہ شیروانی پہن رکھی تھی۔ جو کبھی کبھی ایسے موقعوں پر نمودار ہو پھر غائب ہو جاتی تھی۔ چھ بجنے والے تھے۔ افتتاح کی رسم کا ... آ رہا تھا۔ مگر بعض لوگوں کو اپنی روحانی ذمے داری کا ہر وقت دھیان

ہے۔ مغرب کی نماز کا وقت بھی قریب تھا۔ چنانچہ فوراً قرار پایا کہ نماز سے فارغ ہو کر افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ پاس ہی مسجد تھی۔ اس غریب کے نصیب جاگ اٹھے۔ چھوٹے صحن میں جمعۃ الوداع کا نظارہ دکھائی دینے لگا۔ مہمان نماز سے فارغ ہو، دعائیں مانگ منشی کے دیوانخانہ میں آ دھمکے۔ لمبی دعائیں مانگنے والوں کو آواز دی گئی۔ زنان خانہ کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مستورات چھوٹی چھوٹی جماعت پسند کرتی ہیں۔ کونے کونے میں خطبہ ہو رہا تھا۔ بات سننے کا کوئی امکان نہ تھا۔

افتتاح دہلی کے پروگرام سے ہوئی۔ کیوں نہ ہوتی۔ بیوی کے میکے اور میاں کے سسرال کا شہر تھا لیکن لوگوں پر یہی ظاہر کیا گیا کہ دارالحکومت کا پروگرام ہے سلطنت کی عظمت کا لحاظ لازم ہے افتتاح سے پہلے میر باقر نے ایک مختصر مگر جامع تقریر کی۔ جسے مقامی ایڈیٹروں نے پرمغز قرار دیا۔ اس میں منشی جی کے وسیع النظر اور مہمان نواز ہونے کا اعتراف کیا گیا۔ اس کے جواب میں منشی جی نے چند الفاظ میں ریڈیو کی اختراع اور اس کی تعلیمی برکتوں اور خوبیوں کی تشریح کر کے میر باقر سے افتتاح کرا دی۔ اب کیا تھا۔ اندر باہر سناٹا چھا گیا۔ ریڈیو کے بکس پر سب کی نگاہیں لگی تھیں۔ گڑ رز۔ گڑ رز زیرپڑ۔ گر پڑ۔ سائیں سائیں وغیرہ آوازوں کے بعد سریلی آواز نکلی۔ غزل شروع ہوئی "قرار ہو تو کہوں بے قرار کس سے کہوں" واہ وا۔ خوب کیا کہنا۔ اک نظر ادھر بھی۔ واللہ بے قراری! اس قسم کی داد کے چشمے پھوٹ پڑے۔ مگر میر باقر نے خاموشی کے لئے تاکید کی۔ اور کہا کہ ریڈیو کے معاملے میں داد و تنقید کے حقوق صرف اخباروں اور رسالوں کے لئے محفوظ ہیں۔ اور سامعین کا کام خاموشی سے سنتے رہنا ہے یہ مشفقانہ ہدایت موثر ثابت ہوئی۔ افتتاحی غزل کے بعد اور چیزیں سنی گئیں۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ لاہور۔ پشاور کی چیدہ چیدہ چیزوں کا لطف اٹھایا گیا۔ دنیا کی خبریں۔ دیہات سدھار کی رفتار۔ ڈرامے۔ افسانے۔ ہر ایک کے نمونے سنے گئے۔ حاضرین عش عش پکار اٹھے

زنان خانے میں کچھ اور رنگ تھا۔ بوڑھی بیبیاں حیرت میں تھیں۔ بال بچے والیاں غیر جانبدار۔ اور نئی روشنی والیاں اپنے اپنے انداز و مذاق کے مطابق لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ مگر میر باقر کی ہدایت کے باوجود کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

افتتاحی پہلی نشست کے بعد چائے بسکٹ سے حاضرین کی تواضع کی گئی۔ اور پان سگرٹ کا دور تو پروگرام کے دوران میں جاری رہا۔ پان کھانے والوں سے دم بدم دیواروں کا رنگ بدل رہا تھا۔ اور منشی جی دیکھ دیکھ کر کباب ہوئے جاتے تھے۔ بیوی کے ہاں تو کوئی کہنے والا ہی نہ تھا۔ کہ پرایا گھر ہے۔

پروگرام بخیر و خوبی ختم ہوا۔ مہمان اپنے اپنے گھر سدھارے۔ بعض کھانا کھا کر رخصت ہوئے۔ بہت واہ وا ہوئی۔ آئندہ کے لئے وعدے ہوئے۔ یہ بزم نشاط بہت کامیاب رہی۔ میر باقر نے مبارکباد دی۔ اور مرزا علمدار نے بعض مہمانوں کی بے شعوری کا شکوہ کیا۔ مگر منشی جی نے یہ کہہ کر ہمارا ملک ہے۔ رفتہ رفتہ شعور آ جائے گا۔ بات ختم کر دی۔ اور انہیں شکریہ کے ساتھ رخصت کیا۔ پھر گھر میں گئے بانو کو خوش دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ دن بھر کی کوفت بھلا دی۔ رکھ رکھاؤ سے فرصت ملی۔ آرام کیا۔ منو میاں کی باتیں سنیں۔ سو رہے۔

منشی جی۔ کہئے بانو! رات ریڈیو کا کیسا لطف رہا؟

بیوی۔ کیا بتاؤں گلنار آپا اور نگہت کو تو یقین نہیں آتا کہ گانیوالیاں کلکتہ اور بمبئی میں تھیں۔ البتہ ایک بات ضرور ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کچھ ہونے کو ہے۔

منشی جی۔ سنتی جاؤ۔ دیکھتی رہو۔ یہ نہ پوچھو کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے کو ہے۔ ایک سیلاب ہے۔ اس تہذیب کی کشتی دیکھئے کونسے کنارے لگتی ہے۔ اور کون کون پار اترتا ہے۔ اچھا اب اور سنئے گا۔ ریڈیو کا آلہ بہت نازک ہے بغیر مجھے نہ چلانا۔ اور منو سے تو بہت بچا کر رکھنا اور آئے گئے کو بھی چند روز دور ہی رکھنا۔

بیوی۔ میری جانب سے اطمینان رکھئے مگر منو کا ذمہ نہیں لیتی۔

منشی جی۔ خیر میں نے کہدیا ہے۔

منشی جی نے ریڈیو کیا خریدا دوست آشناؤں کے لئے ایک تماشا ہوگیا اور ساتھ ہی حلقہ احباب وسیع ہوگیا۔ بیوی کی نئی سہیلیاں پیدا ہوگئیں۔ پان چھالیا کا خرچ بڑھ گیا۔ صبح وشام چائے بسکٹ کے دور چلنے لگے۔ ایک ہنگامہ رہنے لگا۔ کبھی کبھی میاں اور بیوی کے بچوں کا شوق حریفانہ کیفیت پیدا کر دیتا۔ ایسی صورت میں ریڈیو زنانخانے اور بیٹھک کی درمیانی محراب میں رکھدیا جاتا۔ مگر اکثر اوقات ادھر ریڈیو چلتا ادھر بیوی کی سہیلیاں اپنے اپنے ریڈیو شروع کر دیتیں۔ اس رقیبانہ فضا میں بیچارا ریڈیو دم بخود ہو جاتا۔ کبھی کبھی منوں کی مہربانی اور احباب کی بے احتیاطی سے غریب ریڈیو کی کل بگڑ جاتی تو منشی جی کو دس پانچ روپے کی زائد چپت لگتی۔ بہرحال ایسی کیفیت کچھ عرصہ جاری رہی۔ مگر کب تک۔

علمدار۔ اخبار دکھا کر۔ منشی جی یہ ریڈیو سیٹ کی فروخت کا آپ نے اشتہار دیا ہے۔ کیا طبیعت سیر ہوگئی۔

منشی جی۔ بیشک نئی چیز ہے۔ مگر بعض دفعہ جہاں سوز بربتی کا لگا ہو رہا ہے اور ہم مجبور ہیں۔ پھر دوست کچھ سننا چاہتے ہیں اور ہم کچھ اور بیوی اور ان کی سہیلیاں اپنی فرمائش کرتی ہیں ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہٹاؤ اس خرخشے کو۔

علمدار۔ یہ تو قیامت ہوگئی۔ تمام بزم کا سرور سوز جاتا رہا۔ کیا سیٹ مکمل ہے!

منشی جی۔ ہاں یہ ڈبہ اور اوپر دو بانس اور تار ہیں۔

علمدار۔ اور باقی ٹھاٹھ؟

منشی جی۔ وہ سب منوں نے سیکھنے کے لئے رکھ لیا ہے۔

علمدار۔ یہ کون لیگا؟

منشی جی۔ ڈبہ ہیر پھیر کے کام آسکتا ہے اور بانس کبوتروں کی چھتری کیلئے مزدون ہے

علمدار۔ تو بھیجوں شبراتی کبوتر باز کو؟

منشی جی۔ ضرور۔

محرزیب عثمانیہ گولڈ میڈلسٹ

سرِّ خودی

زبانِ حال سے کہتی ہیں موجیں نوجوانوں سے
جنہیں ذوقِ عمل ہے سر پٹکتے ہیں چٹانوں سے

مسلماں کے امانت دار ہونے میں کسے شک ہے
خدا نے اس کو فرمایا ہے اپنے رازدانوں سے

تنِ آسانی کی حسرت تم کو لے جائیگی جنت میں
مسلمانوں کو ورنہ کیا غرض ان بوستانوں سے

وہ انساں اپنا میرِ کارواں ہے کارواں ہو تو
جو آگے بڑھ گیا جبریل جیسے ہمعنانوں سے

چمن میں میں نے کچھ ایسے قرینے سے چنے تنکے
نکل کر آئے طائر دیکھنے سب آشیانوں سے

تجھے آگاہ کرنا تیری منزل کے نشانوں سے
کوئی یہ بات کیا پوچھے حرم کے پاسبانوں سے

اجل نے مجھ کو مہلت دی تو پہلا کام ہے میرا
ستمگاری سے اپنے ہاتھوں آپ تیر [illegible] تم نے

علمدار۔ آپ بجا ہے۔

جناب عدمؔ

غزل

پھر اک حسین وعدے سے بے اختیار ہے ۔۔۔ نادان دل ہے اور ہوسِ اعتبار ہے
فطرت کی بخشش کی شکایت ہے ایک جرم ۔۔۔ لب پر ہنسی ہے رُوح میں پیوست خار ہے
ہیں دل کے ساتھ آئینہ خانے لگے ہوئے ۔۔۔ میری نگاہ سے مرا غم آشکار ہے
اک شعرِ شعلہ رنگ ہے شب کی زبان پر ۔۔۔ مت خون کر یہ کہہ کے کہ شمعِ مزار ہے!
ہے زندگی بذاتِ خود اک دلفریب جھوٹ ۔۔۔ پھر کیا گلہ جو عشقِ دروغ اعتبار ہے
اُن کے حسین رُخ پہ ہے رنگِ حجاب و ناز ۔۔۔ کیا جھینپتا ہوا سا فسونِ بہار ہے
ہے تیرے سنگِ در پہ مری رُوح سجدہ ریز ۔۔۔ روزِ ازل سے موج کو ساحل سے پیار ہے
ورنہ یہ جلوہ گاہ کچھ اتنی اہم نہیں ۔۔۔ سب کچھ کرشمۂ نظر و اعتبار ہے
یہ زندگی ہے معنیٔ شعلہ کی ایک حس ۔۔۔ دل بھی ہے اک شرار جگر بھی شرار ہے
اظہارِ غم کا خاص سلیقہ ہے خامشی ۔۔۔ اے عندلیب پھول بھی سینہ فگار ہے
ہیں آشکار آپ ہی معنیٔ حیات کے ۔۔۔ دیکھو تو ایک برق کی لو بے قرار ہے!
از وہم تا بخواب ہے یک گامِ اضطراب ۔۔۔ پھر بھی یہ زیست کتنا طویل انتظار ہے

کیا پوچھتے ہو منزلِ موہوم کا سراغ
یہ کائنات راہِ عدمؔ کا غبار ہے

جناب ایم۔ اسلم۔

نواب ہم بھی بنے تھے

کسی حکیم کا قول ہے کہ افسانہ نگاری کار ہیکاراں است!

اور ہے بھی یوں ہی۔ آپ ہماری طرف دیکھئے! نہیں! نہیں! آپ ذرا اپنی طرف دیکھئے کہ ہمیں خواہ مرنے کی بھی فرصت نہ ہو لیکن زبردست کے ٹھینگے کی طرح آپ کا تقاضا موجود۔ ہم نے افسانہ نگاری محض اس لئے شروع کی تھی کہ چلو وقت کٹ جائے گا۔ لیکن اب تو گلے کا ہار ہو رہی ہے۔ ہزار طرح سے ٹالتے ہیں۔ سو سو بہانے بناتے ہیں۔ لیکن ہمارے مہربان ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ عجب مصیبت میں جان پھنسی ہے کسی اللہ کے بندے کو اتنا بھی ترس نہیں آتا۔ کہ ہم ٹھہرے پنجابی! جانے ہماری بلا کہ "زبان" کس جانور کا نام ہے۔ افسانہ نگاری تو وہ کرے جو ساڑھے سولہ آنے اردو زبان سے واقف ہو۔ اور اردو بھی وہ جو صرف دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھنے والے بولتے ہیں یا مدراح صحابہ پر سر پھوڑنے والوں کے یہاں بطور تبرک استعمال ہوتی ہے۔ اور آپ کے ہی سر کی قسم! ہمیں ان لوگوں پر ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی جو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہم سے مضامین مانگتے رہتے ہیں۔ شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ اردو کے اورنگ آبادی علمبردار غلط زبان لکھنے پر وارنٹ بلا ضمانت جاری کر دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں جب اردو کے گلے پر ہندی کی چھری چلانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اردو کے خادموں کی حوصلہ افزائی کرنے کا صرف یہی ایک طریق رہ گیا ہے کہ ان کی ادبی خدمات پر جب تنقید کرنے بیٹھیں۔ تو نفس مضمون کو چھوڑ کر صرف زبان کا رونا لے بیٹھیں۔

لیکن فی الحال اس موضوع پر بقول اشک صرف اتنا ہی عرض کریں گے کہ ؎

بات منہ سے پھر نکلنے کی نہیں
مجھ کو ہر دم اے زبان آور نہ چھیڑ

تو آپ جانئے! ہمیں شکار کا بہت شوق ہے۔ کسی قسم کا شکار تشریح کی ضرورت نہیں۔ کبھی کا ذکر ہے کہ ہم ہرن کے شکار کے لئے کہیں سونی پت جا نکلے۔ ہمارا تانگے والا "واحد العین" ہونے کے علاوہ پرلے درجے کا "چھٹا ہوا" بھلا مانس سا آدمی تھا۔

سردی کا موسم تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اور چشمۂ آفتاب کا یہ حال کہ "نیم دروں نیم بروں"۔ ہم چاہتے تھے کہ منزل پر جلد پہنچ جائیں۔ اس لئے بیٹھے ذرا تانگے والے کو ڈانٹ ڈپٹ بھی دیتے۔

"ابے چل! ہانک جلدی"

اور وہ کم بخت جواب دیتا

اجی جناب۔ ۔ ۔ ۔ ! ابھی پہنچتے ہیں۔

گھوڑا جو کسی فلسفی خاندان کا چشم و چراغ معلوم ہوتا وہی لگے چال چل رہا تھا۔ نیشکر کے ایک کھیت کے پاس ایک کالا ہرن کھڑا تھا۔

شکاری بولا۔

"حضور! وہ کالا کھڑا ہے۔ دیکھئے نا ایک سالے کو!"

ہم تانگے سے اترے اور رائفل سنبھال کر زمین پر بیٹھ گئے
ب بانے ہماری عینک کے تال بدلنے والے تھے یا منزل پہنچنے
کی جلدی تھی۔ بہرکیف نشانہ چوک گیا۔
شکاری بولا
"سالے کی موت نہیں آئی تھی۔ بچ گیا۔"
اور تانگے والے نے ذرا سر ہلا کر کہا۔
"بھئی! نواب صاحب جو ہوئے۔ مارا مارا نہ مارا نہ سہی!"
یہ سنکر ہمیں ہنسی آگئی۔

جب منزلِ مقصود پر پہنچے تو نہر کے کنارے پٹسال نویس
کی کوٹھڑی میں قیام ہوا۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ کھائیں گے کیا
رات ہو چکی تھی۔ اور آبادی کوئی دو پونے دو میل پر تھی۔ شکاری
کو بھیجا کہ جو کچھ ملے کھانے کو لے آئے۔
وہ کم بخت آیا بھی تو پہر رات گئے۔ ہم اس وقت کچھ سوتے
تھے کچھ جاگتے تھے۔ باہر سے کھس پھس سی سنائی دی کان لگا کر جو سنا
تو شکاری تانگے والے سے کہہ رہا تھا۔
"۔۔۔ صرف دال اور چپاتیاں ملی ہیں۔"
تانگے والے نے جواب دیا۔
"تو بس ٹھیک ہے نا پنجاب کے نواب ہیں نا۔ دال ہی کھا لیں گے۔"
یہ سنکر ہمیں ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ لیکن مناسب یہی سمجھا کہ
اپنے آپ کو سوتا ہوا ظاہر کریں گو انتڑیاں کسی عابدِ شب زندہ دار
کی طرح قل ہو واللہ کا ورد کرتی رہیں۔

جناب اثر چکوالی بی۔ اے

سوزِ تمام

اظہارِ محبت کے ان سے جب دل کی زبانی کہتا ہوں
جذبات کے رنگیں طوفاں میں تنکے کی صورت بہتا ہوں

کیا جانئے میری فطرت میں کیسا یہ تغیر آیا ہے
کیوں غم کے تاثر سے پیہم اللہ فسردہ رہتا ہوں

جز شغل کے دنیا میں جینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے
میں جان کے آہیں بھرتا ہوں میں جان کے صدمے سہتا ہوں

کہتے ہیں محبت میں لازم ہے ضبط کی شرطِ رُخ گسل
وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں میں اُن کو دیکھتا رہتا ہوں

انسان حوادث کے ہاتھوں دکھ درد کی زندہ مورت ہے
گو عیش کے ساماں حاصل ہیں میں پھر بھی غمگیں رہتا ہوں

جناب حکیم آزاد انصاری صاحب

رحلتِ اقبال

یعنی وہ نوحہ جو ۵ جون ۱۹۳۸ء کو بہ تقریب یومِ اقبال دہلی ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ کیا گیا

اے فیلسوفِ دوراں، اے عاقلِ زمانہ اے گنجِ علم و عرفاں، اے کاملِ زمانہ
اے عالمِ سخن راں، اے فاضلِ زمانہ اے شاعرِ ہمہ داں، اے حاصلِ زمانہ

اے دوست دارِ حکمت اے اہلِ رائے دانا
اے حق گزارِ ملت، اے رہنمائے دانا

اے ہم کو بے حسی پر غیرت دلانے والے اے ہم کو زندگی کے رستے پہ لانے والے
اے ہم کو حق کی خاطر لڑنا سکھانے والے اے ہم کو کرگسوں سے شاہیں بنانے والے

اے ہم کو حریت کا پیغام دینے والے
اے فرضِ خدمتِ حق انجام دینے والے

تو روحِ زندگی تھا، تو جانِ زندگی تھا تو بحرِ زندگی میں طوفانِ زندگی تھا
تیرا وجود ازل سے شایانِ زندگی تھا تیرے لئے ابد تک فرمانِ زندگی تھا

آخر اجل کا قابو تجھ پر چلا تو کیونکر
اس ساحرہ کا جادو تجھ پر چلا تو کیونکر

مانا کہ تو نے خاصی دنیا میں عمر پائی مانا کہ تو نے کافی تقدیرِ فن جگائی
مانا کہ تو نے پوری شانِ وطن بڑھائی پھر بھی ابھی وطن تھا محتاجِ رہنمائی

ہر چند اس جہاں سے تجھ کو کدورتیں تھیں
لیکن ترے وطن کو تیری ضرورتیں تھیں

تیری دعا زمیں سے تا چرخ جا چکی تھی — حق سے قبولیت کی توفیق پا چکی تھی
تیری فغاں جہاں میں ہل چل مچا چکی تھی — مشرق کی مخلصی کو ممکن بنا چکی تھی

ایسے میں تیری رحلت اک سخت حادثہ ہے
منحوس حادثہ ہے، کم بخت حادثہ ہے

اے کاش! ابھی نہ تجھ کو پیغامِ مرگ آتا — اے کاش! ابھی نہ طالع ہم سے تجھے چھڑاتا
جانا تو لازمی تھا، لیکن ابھی نہ جاتا — کچھ اور زندہ رہتا، کچھ اور عمر پاتا

تو بھی وطن کو اپنے آزاد دیکھ لیتا
آزاد دیکھ لیتا، دلشاد دیکھ لیتا

کون اب ہماری سوتی تقدیر کو جگائے — کون اب ہماری بگڑی تدبیر کو بنائے
کون اب ہمیں مسلسل سوئے خودی بلائے — کون اب ہمیں ابھارے، کون اب ہمیں اٹھائے

کون اب ہمیں حیاتِ دائم کی دعوتیں دے
کون اب ہمیں نجاتِ دائم کی دعوتیں دے

اب اس غم و الم کا چارہ کریں تو کیونکر — اجزائے ہوشِ برہم یکجا کریں تو کیونکر
ایسا ادیبِ فاضل پیدا کریں تو کیونکر — اتنی بڑی کمی کو پورا کریں تو کیونکر

وا حسرتا! وفاتِ "علامہ سر اقبال"
وا آفتا! مماتِ "علامہ سر اقبال"

جناب اختر ہوشیارپوری بی۔اے

آہ اقبال

(۱)

آہ اے اقبال اے قندیلِ بزمِ شاعری — ہاں بجا ہے شاعری جزویست از پیغمبری
ہائے اے اقبال اے شعر و سخن کے تاجدار — کس بلندی پر سفر کرتا تھا تیرا راہوار
تیرے ہر اک شعر میں رقصاں ہے خونِ زندگی — تو نے پھونکا ہے زمانے میں فسونِ زندگی
کر دیا بیدار تو نے خفتگانِ ہند کو — قندِ پارس سے بڑھایا داستانِ ہند کو
نوجوانوں کو جوانی کے بتائے تو نے راز — بیدلوں کو کامرانی کے بتائے تو نے راز
تو وہ رہبر تھا کہ سارے کارواں کی جان تھا — کارواں کی جان کیا ہندوستاں کی جان تھا
ماتمی ہے آہ ساری انجمن تیرے لئے — مدتوں خوں روئیگا چرخِ کہن تیرے لئے
تیرے رتبہ کا نظر آتا نہیں انساں کوئی — کاش بھیجے تجھ سا دانا گردشِ دوراں کوئی
تیرے دم سے علم و حکمت کا جہاں آباد تھا — درس سے تیرے ہر اک ناشاد بھی دلشاد تھا
ضو ملی تھی شمعِ قرآں سے ترے پیغام کو — پا گیا تھا تو رموزِ حکمتِ اسلام کو
درسِ آزادی دیا تو نے غلام آباد میں — نغمۂ شادی الاپا محفلِ ناشاد میں
تو نے بھر دیں نوجوانوں کے لہو میں بجلیاں — دیکھتے ہیں رند بھی جام و سبو میں بجلیاں
ہے تری بانگِ درا اک رہنمائے زندگی — زندگی کو تو نے بخشی ہے قبائے زندگی
نوعِ انسانی کو تو اللہ کا انعام تھا — فلسفی تھا۔ رہنما تھا۔ شاعرِ اسلام تھا
شاعری تیری خدا کے حکم کی تعمیل ہے — تیری پروازِ تخیل شہپرِ جبریل ہے
برف زاروں میں پڑھا جائے اگر تیرا کلام — تند شعلوں میں بدل جائے ہواؤں کا نظام
کوہساروں میں ترے نغموں سے پیدا ہو گداز — کڑکڑا اٹھے رعد پاروں کی نوا ہو تیرا ساز

(۲)

گو ترے ہر شعر میں ہے ساز و سامانِ حیات — آہ مسلم میں نہیں لیکن یہ ارمانِ حیات
اک یہی تیرا مخاطب ہے کہ محوِ خواب ہے — ہائے اک ذوقِ ترقی ہم ہی میں نایاب ہے
آہ تیری جانشینی کے لئے کوئی نہیں — نکتہ چیں ہیں خوشہ چینی کیلئے کوئی نہیں

جناب علی احمد صاحب

مکتوبِ محبت

یہ خطوط یونان کی مشہور شاعرہ سیفو کی ایک نظم سے ماخوذ کئے گئے ہیں

(۱)

دُور افتادہ شاہد! . . . اپنی وارفتہ ساحرہ کا سلام لو۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، کہ تم مجھ سے رخصت ہو کر گئے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں عرصہ سے نہیں دیکھا۔ . . سچ کہنا شاہد! کیا مجھے اب تمہاری یاد ہی کے سہارے زندہ رہنا ہوگا۔ . . تم چلے گئے۔ میری دنیا ہی بدل گئی۔ . . میرے نغمے اب مجھ کو بھول چکے ہیں اور میرا رباب ٹوٹ چکا ہے۔ . . تمہاری جدائی نے جو آنسو پیدا کئے تھے وہ میری آنکھوں کو اندھا کر رہے ہیں۔ میں جل رہی ہوں۔ او جس طرح ہوا سے اڑائے ہوئے تنکوں پر شعلہ تیزی سے لپکتا ہے۔ اُسی طرح میری آزردگی کی آگ مجھ پر لپک رہی ہے۔ . سمندر کی نیلی فضائیں اب تک اسی طرح حسین ہیں لیکن میں جاتی ہوں تو انہیں جاذبِ نظر ساحلوں سے درد لیکر لوٹتی ہوں۔ . . اور تنہائی میں بیٹھکر سوچتی ہوں کہ اب میں دنیا میں . . . اس وسیع دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ میرا کوئی نہیں کوئی نہیں . . . .

دلنواز شاہد! میں جانتی ہوں کہ اگر تم مجھ کو بھول گئے ہو۔ مجھ سے متنفر ہو گئے ہو تو . . . پھر دنیا کی تمام آگ بھی تمہاری سرد مہری کو نہیں گرما سکتی۔ . . . وہ دن تمہیں یاد ہوگا شاہد! جب تم نے میری تاریک دنیا کو روشن کر دیا تھا۔ . . آہ وہ راتیں وہ مسرتِ ابدی کی عرفانی خوشگوار راتیں۔ . . جب میرے آزاد اور بیباک نغموں نے تمہیں مسحور کر لیا تھا۔

میں سچ کہتی ہوں شاہد! میں تم سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میری دراز زلفیں اب ہوا کو پھولوں کی خوشبو سے معطر نہیں کرتیں . . . . وہ سنہرے بال جن سے تم گھنٹوں کھیلا کرتے تھے۔ اب ہر وقت منتشر رہتے ہیں . . . دیکھنا لکھتے لکھتے میں رونے لگی۔ اور مجھے اشکوں کی وجہ سے اب کچھ سجھائی نہیں دیتا . . . اب خط ختم کرتی ہوں۔ رخصت۔

غم نصیب ساحرہ"

(۲)

روح نواز شاہد! غمزدہ ساحرہ کا سلام قبول کرو۔ تمہارا خط ملا۔ لیکن مختصر بہت ہی مختصر . . . اور تم نے کیا لکھا تھا میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی . . . لیکن اب میں سمجھ گئی کہ جاتے وقت تم کیوں . . . . ایک بوسہ۔ ایک آنسو یا ایک لفظ بھی اپنی یادگار دئے بغیر رخصت ہو گئے تھے . . . تمہاری خاموشی بے رحمی کی حامل تھی اور تمہاری مسکراہٹ بے معنی تھی . . . اور شاہد! سچ کہنا کیا دمِ رخصت ایک بات بھی تمہاری زبان سے نہ نکل سکتی تھی۔ کاش تم "خدا حافظ" ہی کہدیتے . . اور تمہیں یاد ہے جب تم مجھ سے جدا ہو رہے تھے . . . . تو میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کوئی تحفہ نہ تھا۔ اور آخری وقت تم سے کہنے کے لئے میرے پاس کوئی بات بھی نہ تھی . . . ہاں میں نے تم سے یہ ضرور کہا تھا: "زندگی کو نہ چھوڑنا مجھ کو نہ بھولنا" . . . . اور تم نے سنا . . . تمہارے جانے کے بعد جب میں کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتی تھی . . . یہی کہ تم چلے گئے تو دفورِ غم سے میں پتھر کی طرح ہو جاتی تھی . . . خاموش بالکل خاموش۔ جیسے میں نے کبھی بات

ہی نہیں کی۔ ۔ ۔ ۔ ہاں اک آہ میرے منہ سے نکل جاتی تھی اور ایک گرم آنسو میری آنکھوں سے ٹپک پڑتا تھا۔ ۔ ۔ ۔

آہ مگر رات کے وقت۔ ۔ ۔ یقین جانو شاہد! میں تمہارے پاس ہوتی ہوں۔ ۔ ۔ تمہاری باہیں میری گردن میں حمائل ہوجاتی ہیں اور میں تمہاری روح سے مسرت اندوز ہوتی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جب رات رخصت ہوجاتی ہے۔ اور دن آتا ہے۔ ۔ ۔ تو میں سرسبز مرغزاروں میں اپنے ویران۔ برباد اور اجڑے ہوئے دل کی کھوئی ہوئی مسرتوں کو ڈھونڈتی ہوں۔ ۔ ۔ لیکن میں دیکھتی ہوں کہ وہ جگہ جہاں ہم اور تم بیٹھتے تھے۔ اب ویران ہے۔ پرندے خاموش ہیں اور درختوں کو بادِ خزاں نے بے برگ و بار کر دیا ہے۔ ۔ ۔ شاہد! تمہیں بتاؤ کہ حسین تاروں کے اشاروں پر اور چاند کی مست کر دینے والی کرنوں سے دھڑکنے والے شوریدہ دل کو میں کس طرح سمجھاؤں۔ ۔ ۔ تسلی دوں۔ ۔ ۔ اور اب تو کشاکشِ حیات کی روح فرسا الجھنوں سے تنگ آگئی ہوں۔ دنیا والوں کی سرد مہری سے گھبرا گئی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور چاہتی ہوں کہ اس تلخ زیست کو موت کی آغوش میں دے دوں۔

سنتی ہوں کہ محبت کرنے والوں کی زندگی کبھی تاریک نہیں ہوتی کاش ایسا ہی ہو۔ خدا حافظ۔

فرقت زدہ ساحرہ

(۳)

بیوفا شاہد! تمہاری خاموشی سے تنگ آکر پھر خط لکھ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کے تم نے میرے خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ ۔ ۔ اچھا کیا۔ اب میں بھی تمہیں کچھ نہ لکھوں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہیں پریشان نہ کروں گی۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ ۔ ۔ آخری۔ ۔ ۔ سوچتی ہوں کہ ایک صرف ایک مرتبہ میں خود اپنے بھولنے والے کو دیکھ آؤں

۔ ۔ ۔ لیکن ڈرتی ہوں شاہد! اگر تم مجھے اور پستی میں گرادو گے اور اس برباد شدہ دل کو ٹھکرادو گے۔ جس نے تم سے محبت کی ہے۔ اور اب بھی محبت کرتا ہے۔ ۔ ۔ آہ وہ نغمے جسے تم "روح کی آواز" کہتے تھے اب مجھے چھوڑ رہے ہیں۔ ۔ ۔ میرا رباب۔ ۔ خاموش۔ ۔ ۔ موت کی طرح خاموش ہوگیا ہے۔ ۔ ۔ اور کیوں نہ ہو شاہد! جب تم ہی نہیں ۔ ۔ ۔ اب یہ لب زندگی کا راگ الاپنے کے لئے کبھی بیدار نہ ہونگے۔ ۔ ۔

تم نے میرا دل توڑ دیا شاہد۔ ۔ ۔ اب میری روح اُس پہلی سی تڑپ کے ساتھ نہیں گا سکتی۔ عشق کی بھڑکتی ہوئی آگ اب میرے دل کو نہیں گرما سکتی۔ ۔ ۔ اب میرے پردرد نغمے بھی شاید نہ میرے محبوب میری زندگی۔ میری کائنات۔ ۔ ۔ تم کو واپس نہیں لا سکتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اب میں تمہیں بلاتی بھی نہیں۔ ۔ ۔ ۔

اور شاہد! جب میں یہاں ساحلِ سمندر پر پڑی روتی ہوں تو میں سنتی ہوں۔ ۔ ۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہے۔ ۔ "ساحرہ! تم بد نصیب ساحرہ! اٹھ اور اپنے جسم کو جو نہ پیدا ہوتا تو بہتر تھا لہروں کے حوالے کردے نیلی نیلی تڑپتی ہوئی موجوں کے حوالے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اٹھتی ہوں لڑکھڑاتی ہوئی اور روتی ہوئی تنہائی میں خاموشی کے ساتھ۔ ۔ ۔ روانہ ہوجاتی ہوں۔ ۔ ۔ میں ڈرتی ہوں مگر ڈر سے زیادہ میری محبت ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اب تو سمندر کی نیلی لہریں تم سے زیادہ شفیق اور رحمدل معلوم ہوتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ خوشنما اور خوبصورت موجیں اب یا تو مجھے موت کی آغوش میں سلادیں گی یا۔ ۔ ۔ ۔ اگر میں زندہ رہی۔ ۔ ۔ ۔ تو فراموشی

بیزارِ حیات

ساحرہ

جناب سید الطاف مشہدی

قربانی

جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن

سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ملاقاتیں
فسوں نواز جوانی کی رازداں راتیں
گلے کو چومنے والی حسین نرم باہیں
دیارِ دوست کی مخمور و دلنشیں راہیں
گلِ گلاب کی صورت گداز رخسارے
لبوں میں کروٹیں لیتے سے شہد کے دھارے
نشے میں چور جوانی کی دلربا تانیں
مہِ جواں[1] کی قاشوں سے بھی حسیں رانیں
شرابی آنکھ پہ چھائے ہوئے سیہ گیسو
گھٹا کی نرم ہتھیلی میں جیسے جام و سبو
کسی کی ہوش ربا و جنوں فروش نگاہ
ہماری پاک محبت کا اولین گناہ
وطن کے نام پہ سب کچھ نثار کرتا ہوا
دیارِ ہند کو وقفِ بہار کرتا ہوا
خوشی سے جھومتا، گاتا، گرجتا آؤں گا
مثالِ ابر زمانے پہ گھر کے چھاؤنگا

جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن

[1] میرے نزدیک یہاں نون کا اعلان جائز ہے

میرزا ادیب

ایک ایکٹ کا ڈراما

فرض

اشارات

سولہویں صدی کے وسط میں جونپور کی سلطنت نے کافی قوت و طاقت حاصل کر لی تھی ... اور حاصل کرتی جا رہی تھی۔ اس زمانے میں تختِ دہلی پر وہ شخص متمکن تھا۔ جسے دنیا اکبرِ اعظم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ مغلیہ فوجیں فتح پر فتح حاصل کرتی جونپور پر بھی حملہ آور ہو گئیں۔ دونوں طرف سے بہادر داد مردانگی دینے لگے۔ مندرجہ ذیل واقعات اس وقت رونما ہوتے ہیں جب جنگ پورے شباب پر تھی۔ اکبر کی فوجیں جونپور کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تلی ہوئی تھیں اور جونپور کے بہادر سپاہی جانیں دے دے کر وطن پرستی کا ثبوت دے رہے تھے۔

منظر
میدان جنگ

(شام کی تاریکی ہر طرف پھیل رہی ہے۔ مغلیہ افواج کا سپہ سالار نادر شاہ اپنے خیمے کے آخری کمرے میں شیر کی کھال کے اوپر متفکرانہ سر جھکائے بیٹھا ہے۔ پاس لکڑی کے تخت پر بڑی بڑی موم بتیاں جل رہی ہیں۔ نادر شاہ سر اٹھاتا ہے اور دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔ بہرام دروازے پر چپ چاپ کھڑا ہے۔ اپنے آقا سے چار آنکھیں ہوتے ہی بہرام مؤدبانہ سر جھکا لیتا ہے)

نادر شاہ۔ بہرام! وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ میں نے تو تمہیں نہیں بلایا۔

(بہرام آہستہ آہستہ آتا ہے اور نادر شاہ کے روبرو کھڑا ہو جاتا ہے)

بہرام۔ آپ نے مجھے نہیں بلایا مگر میرے دل نے یہاں آنے پر مجبور کر دیا، حضور!

نادر شاہ۔ کیوں، کیا بات ہے بہرام!

بہرام۔ جب آقا غمگین ہو تو غلام کو کیونکر چین آ سکتا ہے؟

(نادر شاہ محبت انگیز نظروں سے بہرام کی طرف دیکھتا ہے۔ بہرام نگاہیں فرش پر گاڑ دیتا ہے۔ چند لمحے خاموشی طاری رہتی ہے)

نادر شاہ۔ تم نے کیونکر جانا میں غمگین ہوں۔!

بہرام۔ حضور جب سے آپ یہاں آئے ہیں غمگین ہیں۔ نمک خوار غلام سے یہ بات کیونکر پوشیدہ رہ سکتی ہے!

نادر شاہ۔ تمہیں دھوکا ہوا بہرام۔ میں قطعاً غمگین نہیں ہوں۔ اگر ہوں بھی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ سپہ سالار کو ہزار قسم کے اندیشے ہوتے ہیں!

بہرام۔ درست ہے حضور! مگر پہلے بھی تو آپ کئی بار جنگ میں آ چکے ہیں۔ اور میں سائے کی مانند ساتھ رہا ہوں لیکن آپ کو اتنا غمگین آج تک نہیں دیکھا۔

نادر شاہ۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ (دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد) ایک کے سوا تمام بتیاں گل کر دو اور ... جاؤ (بہرام آہستہ

آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بتیوں کے قریب جاتا ہے۔ تین بتیوں کو گل کر دیتا ہے۔ فضا میں روشنی کا ایک مختصر سا حلقہ نمودار ہے۔ نادر شاہ کنکھیوں سے بہرام کو دیکھتا ہے۔ بہرام کا چہرہ افسردہ ہے۔ اور وہ دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ نادر شاہ آہ بھرتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر رکھ دیتا ہے۔ بہرام دروازے پر پہنچ چکا ہے۔ اردگرد کے خیموں سے گانے کی آوازیں آتی ہیں۔ یکایک زور سے قہقہے بلند ہوتے ہیں اور گانے کی آوازیں ان میں ڈوب جاتی ہیں۔ بہرام مڑ کر دیکھتا ہے۔ نادر شاہ اسے ہاتھ کے اشارے سے بلا لیتا ہے۔ وہ تیزی سے آتا ہے)

بہرام۔ حکم حضور!

نادر شاہ۔ جعفر ابھی تک کیوں نہیں آیا؟

بہرام۔ معلوم نہیں حضور!

نادر شاہ۔ اسے ضرور آنا چاہئے۔۔۔ تم تھوڑا سا پانی دو۔

(بہرام ایک گوشے میں جاتا ہے۔ صراحی سے چاندی کے گلاس میں پانی ڈالتا ہے۔ اور اسے بتی کے قریب لاکر غور سے دیکھتا ہے۔ یہ گلاس نادر شاہ کی طرف بڑھاتا ہے نادر شاہ چند گھونٹ پی کر گلاس اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

بہرام۔ حضور بہت تھک گئے ہیں اب آرام کریں۔

نادر شاہ۔ تم جاکر سو رہو۔!

بہرام۔ میں لیٹنے کو تو لیٹ جاؤں گا حضور! مگر نیند کہاں آئیگی۔

نادر شاہ۔ کیوں؟

بہرام۔ اس لئے کہ آقا بے چین ہے!

(نادر شاہ دوبارہ اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتا ہے۔ بہرام گلاس کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لے لیتا ہے)

نادر شاہ۔ بیٹھ جاؤ بہرام! (اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیتا ہے) واقعی میں آج تک اتنا غمگین نہیں ہوا۔ اور اس کی وجہ جنگ کی کشمکش نہیں۔ بلکہ کوئی اور ہے!

بہرام۔ وہ کیا حضور!

نادر شاہ۔ بہرام! تم دس سال سے میرے ہمراز ہو اس عرصے میں شاذ و نادر ہی کوئی بات میں نے تم سے چھپائی ہے۔ اور آج غمگین ہونے کا راز بھی تمہیں بتائے دیتا ہوں۔

بہرام۔ یہ حضور کی۔۔۔

نادر شاہ۔ (بہرام کے الفاظ کاٹتے ہوئے) سنو بہرام! آج سے پچیس سال قبل میں بدنیوں کی فوج میں معمولی سپاہی تھا اس ادنی حیثیت کے باوجود میں بے حد خوش و خرم تھا۔ کیونکہ مجھے اپنی بیوی سے از حد محبت تھی۔ اور میرا بیٹا سلیم تو میری آنکھوں کا تارا تھا۔ بدقسمتی سے جب سلیم چھ سال کا ہوا تو اس کی والدہ دنیا سے رخصت ہو گئی۔

(نادر شاہ کی آنکھیں نم آلود ہو جاتی ہیں)

مجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس وقت سلیم کی محبت میرے زخم کے لئے مرہم ثابت ہوئی۔ اور میری تمام توجہ اس پر مرتکز ہو گئی جب سلیم گیارہ برس کا ہوا تو میں فوج کے ہمراہ باہر چلا گیا۔ میری عدم موجودگی میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ آٹھ ماہ کے بعد جب میں واپس آیا تو مجھے بتایا گیا کہ اس خانہ جنگی میں سلیم کہیں کھو گیا ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ وہ مار ڈالا گیا ہے۔ یہ صدمہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا میں ہر جگہ اسے مجنونانہ تلاش کرنے لگا۔ مگر وہ کہاں؟ مجھے یقین ہو گیا کہ خانہ جنگی میں خاندان کے دشمنوں نے اسے ہلاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد میری زندگی میں بے شمار انقلاب آئے۔ سب سے بڑا انقلاب تو یہ کہ میں مغلیہ فوج میں شامل ہو کر سپہ سالاری کے عہدے تک پہنچ گیا۔ مگر اس کے باوجود وہ زخم جو سلیم کی عدم موجودگی نے میرے سینے پر لگایا تھا اب تک مندمل نہیں ہوا۔ اب تم نے سمجھ لیا میں یہاں آکر کیوں غمگین ہوں۔

(نادر شاہ رومال سے آنسو پونچھتا ہے)

بہرام۔ حضور! ممکن ہے سلیم زندہ ہو!

نادر شاہ۔ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو میرا غم دور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مجھے اس کے متعلق کوئی خبر نہیں!

(ایک منٹ تک کامل خاموشی طاری رہتی ہے)

اب تم جا کر جعفر کو بلا لاؤ۔

(بہرام آہستہ آہستہ چل کر دروازے سے باہر نکل جاتا ہے نادر شاہ سر جھکا لیتا ہے چند لمحوں کے بعد بہرام جعفر کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔ دونوں نادر شاہ کے قریب آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

بہرام۔ یہ خود ہی تشریف لا رہے تھے!

نادر شاہ۔ (جعفر سے) ہاں تم نے کہا تھا ہمارے آدمیوں نے دشمن کے ایک سپاہی کو گرفتار کر لیا ہے۔

جعفر۔ حضور! وہ سپاہی نہیں بلکہ ایک سردار ہے ہم نے لاکھ کوشش کی کہ اس سے کوئی بھید معلوم کریں مگر اس سلسلے میں ایک لفظ بھی اس کے لبوں سے نہیں نکلا۔

نادر شاہ۔ انعام کا لالچ دینا تھا۔

جعفر۔ یہ چال تو ہم چل چکے۔ مگر اسکا دل پسیجتا ہی نہیں!

نادر شاہ۔ ہے کہاں؟

جعفر۔ میرے پیچھے ہیں!

نادر شاہ۔ جاؤ اسے یہاں لے آؤ۔

(جعفر چلا جاتا ہے)

بہرام تم بتیاں جلا دو۔

(بہرام بتیاں جلانے لگتا ہے۔ کمرے میں کافی روشنی پھیل جاتی ہے)

بہرام۔ کافی روشنی ہے حضور؟

(نادر شاہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ بہرام نادر شاہ کے قریب آ کے اپنے الفاظ دہراتا ہے۔ نادر شاہ اس کی طرف دیکھتا ہے)

نادر شاہ۔ ایک اور بتی جلا دو۔

بہرام۔ بہتر آقا!

(بہرام بتی جلا کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے۔ باہر سے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ تین چار سپاہی ایک نوجوان کو اندر لاتے ہیں جس کے چہرے سے شجاعت و جرأت ٹپک رہی ہے۔ جعفر بھی پیچھے پیچھے آتا ہے نادر شاہ اٹھ کر نوجوان قیدی کے قریب آتا ہے)

نادر شاہ۔ تمہیں قیدی ہو؟

نوجوان قیدی۔ ہاں!

نادر شاہ۔ اور جانتے ہو اس وقت تم کس حالت میں ہو؟

نوجوان۔ ہاں میں یہ بھی جانتا ہوں۔

نادر شاہ۔ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ قیدی کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔؟

نوجوان۔ یہ بھی معلوم ہے (اس کے چہرے سے حقارت کے اثرات مترشح ہیں)

نادر شاہ۔ تو ایک بات اور بھی تمہیں یاد ہونی چاہئے!! یہ کہ ہم بہادروں کے قدردان ہیں۔ اور تم بہادر معلوم ہوتے ہو۔ اس لئے ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک ہرگز نہیں کریں گے جو ایک معمولی سپاہی کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہاں تمہاری عزت ہو گی جو جونپور میں بھی تمہیں حاصل نہیں تھی۔ مغل فوج تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ اور ان تمام کے بدلے ہم تم سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہماری کچھ مدد کرو۔ تم دشمن کی فوج کے سردار ہو۔ اس لئے ہماری مدد کرنا تمہارے لحاظ سے بعید نہیں!

نوجوان قیدی۔ وطن کے ساتھ غداری کرنے سے جو عزت ملے وہ عزت نہیں لعنت ہے۔

نادر شاہ۔ تم بھولتے ہو نوجوان!

نوجوان قیدی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا!

نادر شاہ۔ یہ الفاظ تم نوجوانانہ جوش کے زیر اثر کہہ رہے ہو۔ سوچو تمہاری موجودہ حالت کیا ہے۔ اور ہم تمہیں کیا دے رہے ہیں۔!

نوجوان قیدی۔ اگر میں مغلیہ افواج کا سپہ سالار بھی بنا دیا جاؤں جب بھی میں وطن کے ساتھ غداری نہیں کروں گا: یہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے۔!

نادر شاہ۔ سوچ کر جواب دو نوجوان۔! ایک طرف عزت اور دولت ہے۔ اور دوسری طرف بے رحمانہ موت۔!

نوجوان قیدی۔ میں ہر قسم کی بے رحمانہ موت کے لئے تیار ہوں!

نادر شاہ۔ پھر سوچ لو!

نوجوان قیدی۔ میں نے جو کہا ہے سوچ کر کہا ہے۔

(یکایک نادر شاہ کی آنکھیں پھیل جاتی ہیں۔ وہ نوجوان قیدی کے بالکل قریب آجاتا ہے۔ اور اُسے غور سے دیکھتا ہے نوجوان قیدی اور سپاہی اس کی اس حرکت پر حیران ہیں چند لمحے خاموشی طاری رہتی ہے۔ پھر نادر شاہ کے چہرے پر خشونت چھا جاتی ہے اور وہ غضبناک لہجے میں کہتا ہے)

نادر شاہ۔ بیرحمانہ موت یا ہمیشہ کی عزت و دولت!

نوجوان۔ بیرحمانہ موت . . .

نادر شاہ۔ تو جاؤ بیرحمانہ موت تمہارا انتظار کر رہی ہے جعفر! اسے باہر لے جا کر گولی سے اڑا دو! (نوجوان قیدی کے چہرے پر خوف کا معمولی سا اثر بھی رونما نہیں۔ نادر شاہ اسے آخری بار دیکھتا ہے اور منہ پھیر لیتا ہے جعفر اور قیدی سپاہی کو باہر لے جاتے ہیں۔ کمرے میں نادر شاہ اور بہرام رہ جاتے ہیں۔ دروازے کی طرف اسکی پشت ہے۔ آہستہ آہستہ چلکر وہ تخت کے قریب آتا ہے۔ باہر سے گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ نادر شاہ دھم سے تخت پر گر پڑتا ہے۔ بہرام تیزی سے آتا ہے اور نادر شاہ پر جھک جاتا ہے۔)

بہرام۔ کیا ہوا حضور۔!

(نادر شاہ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں اوپر اٹھاتا ہے۔ مگر خاموش رہتا ہے)

کیا ہوا آقا؟

نادر شاہ۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔

بہرام۔ کیا آقا!

نادر شاہ۔ (تھکر بیٹھتے ہوئے) یہ قیدی میرا بیٹا تھا۔

بہرام۔ (فرط حیرت سے کانپتی ہوئی آواز میں) آپ کا بیٹا سلیم!

نادر شاہ۔ ہاں۔

بہرام۔ آپ نے . . . اسے کیونکر پہچانا۔

نادر شاہ۔ بچپن میں اس کے رخسار پر ایک زخم لگا تھا جسکا نشان ابھی تک موجود تھا۔ دوسرے اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر اسکی والدہ نے میرے اور اپنے نام کے ابتدائی حروف گوندھے ہوئے تھے

بہرام۔ تو آپ نے اپنے بیٹے کو خود ہی . . . .

نادر شاہ۔ (اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے) کیونکہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا تھا . . . . اور میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ میری پدرانہ محبت اس کے اور اس کے فرض کے درمیان دیوار بن جائے افسوس نہ کر بہرام! میں خوش ہوں۔ کیونکہ آج میں اس بیٹے کا والد ہوں۔ جسنے فرض کی راہ میں بہادرانہ جان دی۔

(بہرام حیرت سے نادر شاہ کو دیکھتا ہے۔ نادر شاہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا ہے۔)

جناب سید مقبول حسین احمد پوری بی اے ایل ایل بی

غزل!

جب مرا دل دکھ رہا ہو یاد آجاتے ہو تم
یاد کیا آتے ہو رگ رگ میں سما جاتے ہو تم

حسن کی آمیزشوں سے تلخیوں میں عشق کی
اک نئی دنیائے کیفیت بسا جاتے ہو تم

میری اِن محروم آنکھوں اور دلِ مہجور کو
ایک جھلکی سی امیدوں کی دکھا جاتے ہو تم

کم نہ تھی بیم و رجا سے یوں بھی دل میں کشمکش
یاد آکر اور بھی ہلچل مچا جاتے ہو تم

خوگرِ گریہ تھیں یہ آنکھیں ازل ہی سے مگر
سیلِ غم کا اور اک دریا بہا جاتے ہو تم

خونفشاں ہے دیدۂ پُرنم کی صورت زخمِ دل
کیسی بیدردی سے آکر دل دکھا جاتے ہو تم

سچ بتاؤ تم کو ان مخمور آنکھوں کی قسم
اِن اُداس آنکھوں کو میری کیوں رلا جاتے ہو تم

اعترافِ کیف بھی ہے شکوہ ہائے درد میں
میری بگڑی یاد سے اپنی بنا جاتے ہو تم

ہم بھلا دیتے تمہیں مقبولؔ پر اک بات ہے
چھیڑ کر تارِ رگِ جاں گیت گا جاتے ہو تم

جناب محمد صادق قریشی بی اے

ننھی جمیلہ سے!

جمیلہ! تو پاک فضاؤں میں بستی ہے!

تو معصوم ہے !

معصومیت نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کرتی۔

ہمارے سامنے نیکی اور بدی کے دو راستے کھلے ہیں ہم گناہوں کے چنگل میں گرفتار ہیں اور دوسرے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ اگر کوئی نیک فعل ہم سے سرزد ہوتا ہے تو نمود و نمائش، خود بینی اور خواہش تشہیر اس نیکی کو برباد کرنے کے لئے آجاتے ہیں۔ اے کاش ہم نیک ہوتے نہ بد، بلکہ معصوم ہوتے۔

جمیلہ تیرے جیسے معصوم!

جب تیرا جی چاہتا ہے تو ہنس دیتی ہے کوئی کام اپنی خواہشات کے خلاف ہوتا دیکھتی ہے تو آگ بگولا ہونے اور دانت پیسنے کی بجائے رو دیتی ہے اور جب میں تیری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا ہوں تو تیرا تمام غم و غصہ کافور ہو جاتا ہے

لیکن آہ! غم و غصہ کے موقع پر مجھے اگر کوئی مسکراتا ہوا دیکھتا ہے تو میرا غصہ دوبالا ہو جاتا ہے۔

اے کاش میں تیری طرح عہد ماضی کی تمام باتیں بھلا سکتا مستقبل کا خیال بھی نہ کرتا، اور فقط عہد حاضر کی دلچسپیوں سے تعلق رکھتا!

جمیلہ! تیری دنیا کس قدر رنگین اور طرب افزا ہے، میری دنیا تو تلخ حقائق اور سنگین ٹھوکروں سے مرکب ہے، تیری دنیا میں راحت اور شادمانیت کی پریاں رقص کرتی ہیں، میری دنیا میں غم و الم کے دیو اپنے زہر آلود دانت نکالے کھڑے ہیں۔

تیری دنیا چاندنی رات میں خاموش ندی پر تیرنے والی سنہری کشتی ہے، میری دنیا طوفانی سمندر میں ہچکولے کھاتا ہوا جہاز ہے۔ تو اپنی ہستی اور دنیا کے نظام سے ناواقف ہے میں انہیں دریافت کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں اور یہ ناکامی مجھے اور بھی پریشان کر دیتی ہے۔

تو دنیا والوں کی باتیں سنتی ہے اور فراموش کر دیتی ہے میں سنتا ہوں اور دل میں بٹھا لیتا ہوں۔

تیرے پاک دل میں حسد ہے نہ رقابت بغض ہے نہ کینہ، دنیا کا کوئی ذی روح تجھے کسی گناہ کی مرتکب نہیں ٹھہرا سکتا، یہی دنیا والے مجھے ناکردہ گناہوں کی بھی سزا دینا چاہتے ہیں سب لوگ تجھ سے محبت کرتے ہیں جو پاک ہوتی ہے، میرے ساتھ ان کی محبت خود غرضی اور ریاکاری پر مبنی ہوتی ہے۔

جمیلہ! تو دنیا اور ما فیہا سے غافل ہو کر اپنے کھلونوں میں مصروف ہے اور میں ایک عالم کے تفکرات میں گم تیرے سامنے بیٹھا ہوں ایک طرف تو بلند قہقہہ لگاتی ہے اور دوسری طرف میں سرد آہ بھرتا ہوں۔ آہ مصائب، پریشانیاں اور الجھنیں!

جمیلہ تو رات کو اپنے بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیتی ہے اور سو جاتی ہے، مگر میری آنکھوں میں نیند کہاں! آنکھیں بند ہوتی ہیں اور وہی مصائب تفکرات اور پریشانیاں سامنے ہوتی ہیں کبھی خیالات کا جمگھٹ ایک طرف دھکیل کر لیجاتا ہے کبھی دوسری طرف ریل دیتا ہے۔ اس کشمکش میں بہت رات گذر جاتی ہے، آخر مجھے نیند آ ہی جاتی ہے۔ مگر کب تک؟ جلد ہی کوئی پریشان سا خواب دکھائی دیتا ہے میں خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھتا ہوں... اور تو اس وقت اپنا ننھا سا سر اپنے بازو پر رکھے نہایت سکون اور آرام سے سو رہی ہوتی ہے.....

معصوم جمیلہ! مقدس بچپن.......

جناب احسان دانش

انتسابِ حیات

اے عروسِ شعر و نغمہ اے نگارِ دلنواز
بے نیازی اور اپنے بندۂ بیدام سے

میں سراسر نامرادی کا مرقع ہی سہی
دب سکا لیکن نہ اب تک گردشِ ایام سے

پستیٔ غم سے ہے میری زندگانی کا طلوع
ایک دن پھوٹیں گی کرنیں مطلعِ انجام سے

آندھیوں سے شمع میری جھلملا سکتی نہیں
روشنی کھینچی ہے میں نے ظلمتِ آلام سے

میں نے انگاروں کی چادر سے نچوڑی ہے شراب
میری مستی بے تعلق ہے مئے گلفام سے

مدتوں سے ہوں مزاجِ آب و گل سے آشنا
میں کبھی الجھا نہیں خار و خسِ اوہام سے

میرے عصیاں میں بھی ہیں طاعت کے پہلو آشکار
لڑکھڑا جاتا ہوں لیکن بادۂ بے جام سے

میرے شہپاروں کی کھائیں گے قسم اہلِ ادب
میں نے سیارے تراشے ہیں چراغِ شام سے

گر قبول افتد زہے عز و شرف اے جانِ شوق
میں معنون زندگی کرتا ہوں تیرے نام سے

ادبی وسیاسی لٹریچر کی پاکیزہ کتب

ہندوستان — ایک روپیہ
…ادیشں مالا — دس آنے
…دیکہ دک درشن (مہاتما گاندھی)
…م آزادی - ایک روپیہ بارہ آنہ
…ت بہادر - بارہ آنہ
…دا وطن — آٹھ آنہ
…ہلپت راچھوت (حصہ) بارہ آنہ
…ین بھارت — بارہ آنہ
…یں دیپک — نو آنہ
…د وطن — دس آنہ
…ران ملک — آٹھ آنہ
…کل اکانولی - ایک روپیہ آٹھ آنہ
…ش نصیب کا آدمی - آٹھ آنہ
…ین بونا پارٹ - دس آنہ
…ستائی — دس آنہ
…ی تلوار — بارہ آنہ
…ج یوگ — بارہ آنہ
…لتی کی راہ پر — بارہ آنہ
…ر اشتکار — ایک روپیہ آٹھ آنہ
…ش حق — ایک روپیہ سوا…
…افرشیلا بھیلی — … آنے
…م شہنشاہ — ایک روپیہ چار آنہ
…ج یوگ — آٹھ آنہ

آخری تحفہ

انشا:- منشی پریم چند آنجہانی کی سب سے آخری کتاب ۲۲۴
صفحات بہترین پلاٹ رنگین سرورق - مجلد - کاغذ - لکھائی چھپائی نفیس - قیمت ایک روپیہ چار آنہ -

زادِ راہ :- از پریم چند آنجہانی اُجرت ایک روپیہ - غبن ہر دو حصہ قیمت دو روپیہ چھ آنہ

مسلمانوں کا روشن مستقبل

از سید طفیل احمد منگلوری (علیگ)

اس کتاب میں ہندوستان کی گذشتہ تین صدیوں کے اقتصادی اور تمدنی - تعلیمی اور سیاسی حالات کی جانچ کر کے انہیں آئینہ کی طرح روشن کر دیا گیا ہے - علی گڑھ کی تعلیمی اور سیاسی تحریک - کانگرس اور مسلم لیگ - خلافت کمیٹی اور جمعیت العلما احرار اسلام اور خدائی خدمت گاران نیز شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے تاریخی حالات و واقعات دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں - اور جمہوریت انگورہ کی تطبیق ہندوستان کے حالات سے کر کے دکھایا گیا ہے - کہ مسلمانان ہند کے انحطاط کا دور ختم ہو رہا ہے - اور ان کا مستقبل روشن ہے - کاغذ لکھائی اور چھپائی اعلیٰ حجم ۲۰۵ صفحات رنگین ٹائیٹل مجلد (قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنے)

کامیابی کے راز :- سوامی رام تیرتھ جی ایم اے کی مشہور کتاب "سیکرٹ آف سکسس" کا پر لطف اردو ترجمہ سدا بہار سی و پاکیزہ خیالات بنانے والے طریقے -
قیمت صرف چار آنہ

رادھا سوامی — بارہ آنہ
کبیر بھجناولی — دس آنہ
کرم یوگ — آٹھ آنہ
کرلٹ کے راز — دس آنہ
بربادی ہند (اردو ہندی) آٹھ آنہ
پرچار (مہاتما گاندھی) چھ آنہ
مہاتما گاندھی — دس آنہ
نیری رودس یاترا — (شوکت تھانوی)
آہنگ رزم — آٹھ آنہ
مطائیبات — ایک روپیہ
افکار زنداں — ایک روپیہ
پیغمبر صحرا مجلد — دو روپیہ
دنیائے تبسم — ایک روپیہ چار آنہ
انقلاب فرانس — بارہ آنہ
چاند کا گناہ — دو روپیہ
کولمبس (ریلا رام وفا) آٹھ آنہ
نقش دوام — دو روپیہ
انقلابی افسانے — ایک روپیہ
کمپنی کی حکومت — ایک روپیہ آٹھ آنہ
تین پیسے کی چھوکری (قاضی عبد الغفار) ایک روپیہ آٹھ آنہ

محصولڈاک بذمہ خریدار

نیشنل انڈسٹری بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور -

Regd. No. L.-3521

علمی ادبی و تنقیدی ماہوار مرقع

ادب لطیف

مصور لاہور

ایڈیٹر

چودھری برکت علی بی اے

فی پرچہ
-/4/-

چندہ سالانہ
3/4/-

دار الاشاعت

مکتبۂ اردو - ۱۵ سرکلر روڈ - لاہور

صرف سرورق پرنٹنگ پریس بل روڈ لاہور میں طبع ہوا

دوشیزوں کا امتحان ملک کے مشہور مزاح نگار حاجی لق لق کے بہترین مزاحیہ مضامین کا [illegible] جس کے پڑھنے سے آپ کا دل کشتِ زعفران بن جائیگا ۔

حاجی لق لق — ایک [illegible]

نقشِ دوام جدید نظم گوئی کے ارتقا اور فلسفیانہ جذباتی رنگِ سخن سے لطف اندوز ہونے والے نئے نقشِ دوام کا مطالعہ کریں ۔

سید عبدالحمید عدم — مجلد و مطلا دو روپے

صحرا نورد کے خطوط روحانی نگینہ دنیا میں بھٹکنے والے صحرا نورد کی کتاب زندگی ہیجان خیز ورق جس کا ایک ایک لفظ آپ کو قعرِ حیرت میں گم کر دے ۔

میرزا ادیب بی۔ اے — ڈیڑھ روپیہ

شہنشاہِ حبشہ دنیا کی سطح پر ابھی ابھی ایک نہایت دلدوز، لرزہ خیز اور دہشتناک تمثیل ہوا ہے جس کا ہولناک نتیجہ دنیا کبھی نہیں بھول سکتی ۔

اختر [illegible] ایم۔ اے — آٹھ [illegible]

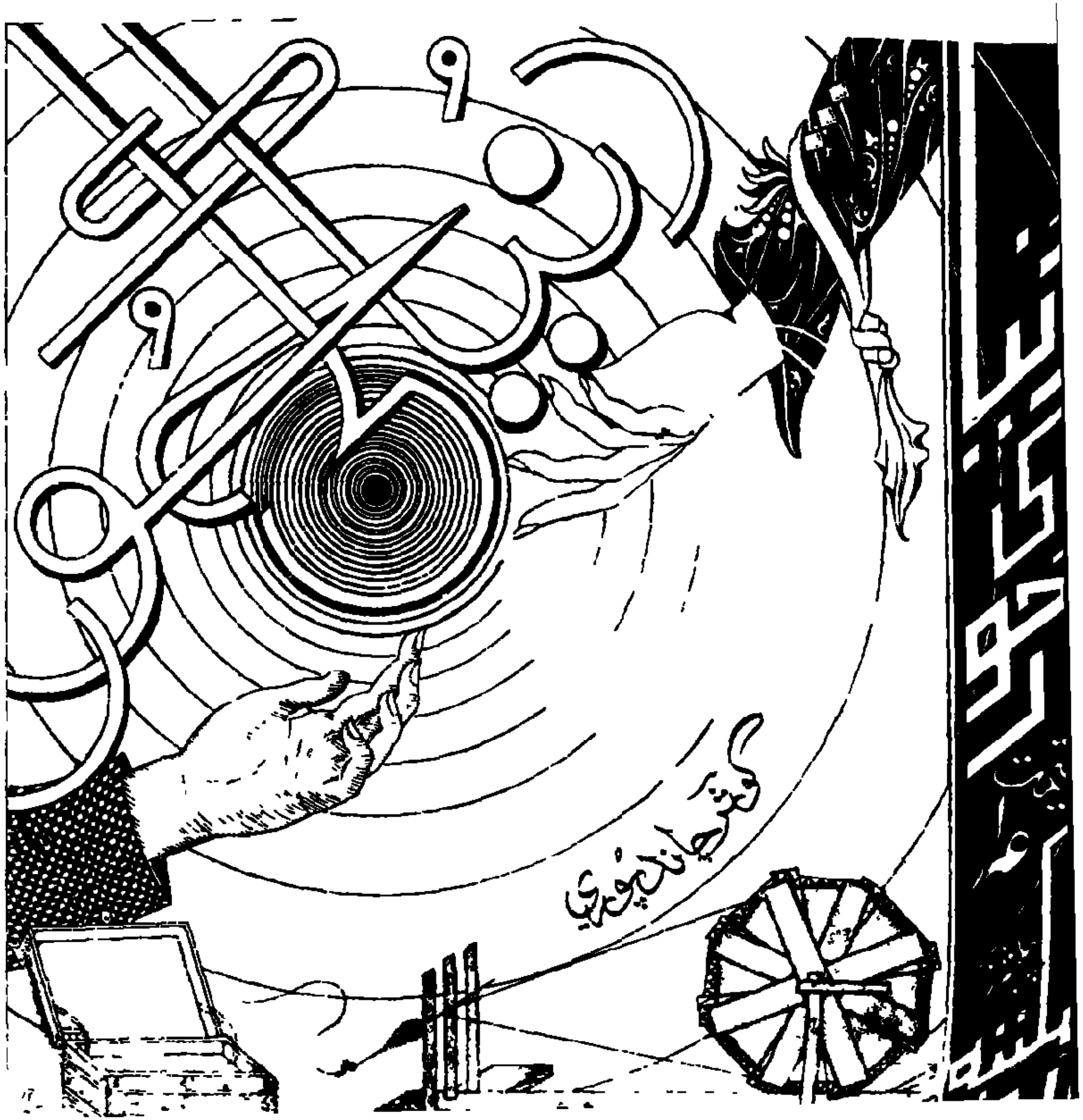
عورتوں کے افسانے ہندوستان کی عورتوں کے دکھ درد کو سمجھنے اور [illegible] دلوں کی آوازیں سننے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری [illegible]

کوثر چاندپوری — ڈیڑھ رو[illegible]

پھول اور کانٹے ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سوسائٹی کے تمام شعبہ ہائے حیات سے [illegible] ہیں اور اس قدر پاکیزہ ہیں کہ [illegible] بہن کو پیش کر سکتا ہے

گوپال متل بی۔ اے — بارہ [illegible]

افکارِ زنداں خطوط میں اُن قیدیوں کے جن کی جبینوں پہ حماقت، مذہب اور قانون [illegible]



منظور کردہ محکمہ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد ریاست حیدر آباد دکن

مکتبہ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ ادب لطیف لاہور

اگست سنہ ۱۹۳۸ء

ادارۂ تحریر

چوہدری برکت علی بی۔ اے

میرزا ادیب بی۔ اے

مقامِ اشاعت

مکتبہ اردو لاہور

فی پرچہ

چار آنے

پرنٹر پبلشر

چوہدری نذیر احمد

(کتبہ: محمد شریف عباسی لاہور)

سالانہ چندہ بمعہ ضمیمہ سالنامہ
وافسانہ نمبر
عـــہ علاوہ محصولڈاک

مندرجات

چـــنـــدہ
ممالک غیر سے
آٹھ شلنگ

جلد ۷ | بابت ماہ اگست ۱۹۳۸ء | نمبر ۵

چودھری برکت علی بی اے پرنٹر پبلشر نے دی برانچ کوآپریٹو کیپٹل پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور سے چھپوا کر ادب لطیف کے دفتر سے شائع کیا

ادارہ

نذرِ اوّلین

فلموں کے ذریعے سنسکرت آمیز ہندی کی ترویج

"ادب لطیف" کے جولائی نمبر میں "نذرِ اولین" کے ماتحت فلم کمپنیوں کے ارباب بست وکشاد کی اردو دشمنی کے باب خاص میں کچھ لکھا گیا تھا چونکہ یہ ایک ضروری مسئلہ ہے اس لئے اکثر مدیران رسائل وجرائد میں نے اس شذرے کی تائید میں نوٹ لکھے ہیں۔ بعض اہل نظر نے خطوط کے ذریعے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس اہم مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں اردو کے نامور ادیب جناب قیصر عثمانی کے خیالات درج کئے جاتے ہیں

"جولائی کا پرچہ ملا۔ نذرِ اولیں کے مطالعے سے بڑی خوشی ہوئی آپ نے فلم کمپنیوں کی اردو زبان سے بے اعتنائیوں کا شکوہ بجا کیا۔ یہ تکلیف دہ خیال میرے دماغ میں عرصے سے تھا۔ اور سوچتا تھا کہ کونسی ترکیب ہو سکتی ہے۔ جو خداوندانِ فلم سازی کی توجہ اس طرف دلانے کے لئے بروئے کار لائی جا سکتی ہے؟ خیر آپ نے اس طرف توجہ کر کے وقت کے ایک اہم مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے ارقام فرمایا ہے کہ بعض فلمیں ایسی بنائی گئی ہیں۔ جن کی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔ بے شک یہ درست ہے میں نے ایک فلم سازی (بمبئی ٹاکیز) دیکھی تھی جس کی "جذباتی زبان" میں بالکل نہ سمجھ سکا۔ مزا یہ کہ میرے ایک ہندو دوست بھی اس زبان کے سمجھنے سے بالکل قاصر تھے زبان کے لحاظ سے نیو تھیٹرز قابل مبارکباد ہے اس کی تقریباً تمام فلمیں مثلاً دیوداس، مکتی، منزل پریذیڈنٹ کر دڑپتی اردو زبان میں ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو نیو تھیٹرز کی مقبولیت کی ایک یہ وجہ بھی ہے کہ اس کے ڈراموں کی زبان "اردو" ہوتی ہے!

بمبئی ٹاکیز کی فلمیں بھی مثلاً جیون پربھات، جیون نیا، اچھوت کنیا وغیرہ وغیرہ اردو میں ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی ہے کہ انہیں اردو یا ہندوستانی سے موسوم نہیں کیا جاتا۔ کمپنی والے بھی اشتہار کی تعداد پر ہندی پروڈکشن لکھواتے ہیں۔ آخر کیوں؟ زبان تو اردو ہوتی ہے لیکن نام خواہ مخواہ ہندی کا ہوتا ہے۔ البتہ فلم سازی کی زبان کو میں اردو نہیں کہہ سکتا۔"

یہ ہیں خیالات جولائی کے شذرے کی تائید میں! جناب قیصر عثمانی نے چند حقائق پیش کئے ہیں۔ اور یہ وہ حقائق ہیں۔ جن کی طرف متوجہ ہونا ہر محب اردو کا فرض ہے! جیسا کہ عرض کیا گیا تھا موجودہ دور میں فلم کو ہماری زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور ظاہر ہے کہ کسی زبان کی نشر و اشاعت کا ذریعہ اس سے بڑھ کر کوئی اور نہیں ہو سکتا! اردو زبان نے ہندوستان گیر مقبولیت حاصل کر لی ہے اس لئے ہر وہ فلم جس کی زبان اردو نہ ہو گی فلم بین حضرات کے طبقے میں زیادہ مقبولیت حاصل کرنے سے قاصر رہے گی یہی وجہ ہے جیسا کہ جناب قیصر صاحب نے اشارہ کیا ہے نیو تھیٹرز کے ڈرامے اتنے مقبول ہوتے ہیں۔

کاش خداوندانِ صنعت فلم سازی وقت کے اس اہم مسئلے کی طرف متوجہ ہوں ورنہ ان کی متعصبانہ روش ان کے اپنے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگی! اردو لسان عمومی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فلم ساز کمپنیوں کے مالک اردو میں ڈرامے تیار نہ کریں؟

ہم جناب قیصر صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس مسئلے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا! ہم دیگر ادبا کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ بھی اس طرف توجہ کریں!

مبسوط تنقید "ادب لطیف" میں اسکے ہر خاص نمبر پر مبسوط تنقید شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس دفعہ بھی حسبِ معمول "افسانہ نمبر" پر بزرگ نامور نقاد حضرت عطاء اللہ پالوی کی تنقید درجِ رسالہ کی جا رہی ہے۔ اس تنقید میں کئی مقامات پر گنجائشِ اعتراض نکل سکتی ہے تاہم پالوی صاحب نے حقِ تنقید نگاری ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

سرقہ آج کل دیکھا جا رہا ہے۔ کہ سرقے کا مرض دنیائے ادب میں پھیلتا جا رہا ہے، اخبارات و رسائل میں اس "بیہودہ مرض" کے متعلق اکثر مضامین نظر سے گذرتے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں "سارق" کو اس "حرکت" سے کیا فائدہ پہنچتا ہے! بظاہر حصولِ شہرت کا جذبہ اس کا محرک سمجھا جاتا ہے، مگر غور فرمائیے سرقہ سے شہرت حاصل ہوتی ہے یا بدنامی؟

قارئین کو یاد ہوگا کہ "ادب لطیف" کے ایک نمبر میں "ایڈیٹر ادبِ لطیف" کا ایک ڈراما "پریم کا جادو" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ ڈراما اتنا مقبول ہوا تھا کہ متعدد رسائل و جرائد نے اسے نقل کیا۔ نقل کرنا کوئی عیب نہیں۔ مگر آج اس ڈرامے کو کسی اور صاحب کے نام سے فلم لائٹ دہلی کے ایک تازہ نمبر میں دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی —

کیا ہم امید رکھیں کہ ہمارے مہربان "آئندہ اس سلسلے میں محتاط رہیں گے"؟

اثر صہبائی اس نمبر میں بھی گذشتہ نمبر کی طرح اردو کے جلیل القدر شاعر حضرت اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی کی وجد آور رباعیات شائع ہو رہی ہیں۔ اثر صاحب رباعی کہنے میں خاص صلاحیت کے مالک ہیں۔ اور آپکی رباعی ان تمام محاسن کو لئے ہوتی ہے جو ایک کامیاب اور حقیقی "رباعی" میں ہونے چاہئیں! رندی و مستی آپکی شاعری کا موضوعِ خاص ہے۔ اس کے علاوہ حقائقِ حیات کو انتہائی دلآویز پیرائے میں بیان کرنا بھی آپکا حصہ ہے!

امید کامل ہے آپ گاہے بگاہے بزمِ ادب لطیف میں شامل ہوتے رہیں گے! ہم جہاں اثر صاحب کے ممنونِ احسان ہیں۔ وہاں ادبِ لطیف کے سرگرم قلمی معاون حضرت رشید بی۔ اے کے بھی شکرگزار ہیں کہ ان کی وساطت سے ہمیں اثر صاحب کا کلام حاصل ہوا!

واسطہ: سید الطاف مشہدی ایک آتش اثر شاعر ہیں اور حب الوطنی کا جذبہ آپکی بیشتر نظموں میں کارفرما ہوتا ہے۔ نظم بھی آپ کا مخصوص رنگ لئے ہوئے ہے!

فریبِ تخیل حسبِ وعدہ اس نمبر سے فرانس کے شہرۂ آفاق رومان نویس تھیو فائیل گاتیئر کا بہترین رومان شائع ہو رہا ہے۔ یہ رومان تین اقساط کو محیط ہوگا! گاتیئر کی پر از تشبیہات و استعارات عبارت کو کامیابی کے ساتھ کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ایک بہت دشوار امر ہے۔ ہمارے مکرم دوست سید احسان بی اے نے اسکا ترجمہ کرنے میں کافی محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے۔ ہم بجا ادبی حلقوں میں آپ کی کوشش کو سراہا جائیگا!

غیر مکمل افسانہ ادب لطیف کے جولائی نمبر میں ایڈیٹر کے قلم سے ایک غیر مکمل افسانہ درجِ رسالہ کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں درخواست کی گئی تھی کہ وہ اسے مکمل کریں! چونکہ جولائی نمبر بہت تاخیر کے ساتھ ادبا کی خدمت میں پہنچا تھا، نیز اسکے شائع ہونے سے چند دن بعد اگست نمبر کی کتابت مکمل ہو چکی تھی۔ اس لئے کسی صاحب کا "تکملہ" اس میں نہ جا سکا! تاحال سید اختر ادریوی ایم اے حضرت احسان بی اے اور محترمہ شکیلہ اختر نے اسے مکمل کیا ہے! ستمبر نمبر میں سید اختر کا تکملہ اشاعت پذیر ہوگا!

امید ہے دیگر اہلِ قلم بھی اس طرف توجہ کریں گے!
اس سلسلے میں اگر زیادہ افسانے پہنچ گئے تو ستمبر نمبر اسی موضوع پر مشتمل ہوگا۔

جناب سید اختر اورینوی ایم۔ اے

ادب میں روایات اور تبدیلیاں

ہر ادب کی اپنی روایت ہوتی ہے۔ خیالات اور طرزِ عمل کی نسلاً بعد نسلٍ اخلاف تک رسائی کو روایت کہتے ہیں۔ حیات کے دوسرے مظاہر کی طرح ادب میں بھی روایت کا وجود پایا جاتا ہے۔ ہر زندہ شے روایات سے متاثر ہوتی ہے۔ اور چونکہ ادب بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔ لہٰذا اس پر بھی روایات کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

روایت اگر ادب کا مکمل ڈھنچر نہیں تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ضرور ہے۔ آیندہ ہونے والی ترقیاں اسی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں۔ لچک کے لئے گوشت، پٹھوں اور جوڑوں کی ضرورت ہوتی ہے اور استواری کے لئے سخت ہڈیوں کی۔ روایات ادب کی سخت ہڈیاں ہیں۔ اگر روایات کا وجود نہ ہو تو ادب ایک رکٹ زدہ Rickety بچہ کی طرح ہو جائے جو اپنے پاؤں کے بل کھڑا تک نہیں ہو سکتا۔

بہت سی خصوصیات ادب کی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی دورِ حاضر تک پہنچتی ہیں۔ ہر ادب چند خصوصیات ورثہ میں حاصل کرتا ہے۔ یہ روایتی خصوصیات ایک فضا پیدا کر دیتی ہیں اور مستقبل میں نقش ہونے والی تصویر اس فضا سے ایک خاص رشتہ رکھتی ہے۔ ماضی کے خطوط و دوائر مستقبل کے رنگ و روغن سے نا آشنا نہیں۔

ادب میں مختلف قسم کی روایات ہوتی ہیں۔ خیالات و عقائد و نظریۂ زندگی کی روایت، طرز و اشکال کی رعایت، روایت صنفیات و اسالیب کہانیوں، قصوں، ضرب الامثال، چٹکلوں، محاوروں وغیرہ کی روایت، تشبیہ و استعارات کی روایت وغیرہ وغیرہ۔ ادب روایت کی ان ساری صورتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اپنے سرمایہ میں اضافہ کرتا ہے۔ روایت ماں کی طرح ادب و زبان کے بڑھنہار بچہ کو دودھ پلاتی ہے، دولتِ روایت ہی ادب کی پرورش کرتی ہے۔ روایت ایک دریائے رواں کی مثال اپنے دور سے لائے ہوئے ذخیروں سے زمینِ ادب کو زرخیز و شاداب بناتی ہے۔

بعد میں آنے والی تبدیلیاں معاون ندیوں کی طرح ہیں جو اپنے خزانے دریا میں انڈیلتی ہیں۔ اور نچلے دھارے کی قسمت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ پانی کی مجموعی مقدار کو بڑھاتی اور بہاؤ کے رُخ کا فیصلہ کرتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں صرف مختلف ذخائر کی معاونت سے ہی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ جان بخش و تازگی بداماں جھڑی اچانک درفشانی کرنے لگے، مثال کے طور پر انگریزی ادب کو لیجئے۔ اس کی روایت کی تاسیس و تخلیق مختلف ذرائع سے ہوئی۔ قدیم اہلِ برطانیہ کی زبان اپنے ماحول میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ شاندار شاہ بلوط کے درخت اس پر سایہ فگن تھے، غاروں اور وادیوں میں پُراسرار ڈروائڈز Druid، عبادتِ نغمہ و رقص سے اس کی رگوں میں خون دوڑا رہے تھے۔ کہ شمال کی قوموں نے آکر اپنی سنگت جمائی۔ وہ اپنے ساتھ اپنے خیالات و عقائد، اپنے معبود اور اپنے نظریہ ہائے اخلاقیات و حیات لائی تھیں۔ اس منڈلی کی گیتوں نے بھی زبان و ادبِ برطانیہ کے ساز میں ایک نیا آہنگ پیدا کیا۔ بعد ازآں قیصر کی فتوحات کے بعد لاطینی و رومی نغمے فردوس گوش ہوئے۔ دورِ نشاۃ

(Renaissance) نے بھی اپنی جادو بھری تانوں سے انگریزی ادب کے کورس (Chorus) میں ایک حسین اضافہ کیا۔ الزبتھ کے زمانہ میں عروج و استیلا کے اثر سے سحر نوا مغنیوں نے نغمہ سرائی کی اور انگریزی ادب کو مالا مال کر دیا۔ یہ ساری تبدیلیاں رفتہ رفتہ ہوتی رہیں۔ مگر ایک تبدیلی اچانک ہوئی۔ یہ انقلاب فرانس کی پیدا کی ہوئی تبدیلی تھی۔ انیسویں صدی میں آتش نوا مغنیوں نے انگریزی ادب کو شعلہ بداماں کر دیا۔۔۔ انقلاب فرانس نے سارے یورپ کے ادب میں اچانک طور پر تبدیلی پیدا کر دی۔ غرض انگریزی ادب کی روایات ان سارے اثرات کی پیدا کردہ ہے۔ قدیم روایت سے نئی تبدیلیاں نکلتی رہیں اور ایک جدید روایت کی تخلیق ہوتی رہی ہے۔ کبھی تو یہ تبدیلیاں تدریجاً پیدا ہوئیں اور کبھی یک بیک ظاہر ہو گئیں۔

ہمارا اپنا ادب بھی کچھ اسی قسم کی ارتقائی منزلوں سے گذرا ہے۔ ہماری ادبی و لسانی روایات دور پراکرت سے شروع ہوتی ہیں۔ ہماری ہندوستانی زبان اپنے چمن زاروں میں پھول پھل رہی تھی کہ مسلمانوں کی آمد آمد ہوئی۔ عرب پہلے آئے اور اپنے ساتھ عربی اشجار و ثمر لائے۔ پھر ترکی اور فارسی پودے نصب ہوئے۔ عربی اور فارسی قلمیں خوب لگیں اور پھوٹ کر بار آور ہوئیں۔ ہماری زبان و ادب کے چمن زاروں میں رنگا رنگ کے پھول کھلے اور قسم قسم کے پھل آئے۔ پراکرت نے چولا بدلا اور سنور کر ایک دلکش اور نئی نویلی دلہن بن گئی۔ اس ہندوستانی عروس کو اب مغربی گہنوں اور غازوں کا شوق ہوا۔ ذرا دیکھئے تو سہی، اسے یہ آرائش بھی کتنی بھلی لگتی ہے کیسی پیاری صورت پائی ہے۔ اللہ اللہ! اور اس پر یہ جامہ زیبی! روپ و رنگ کے ساتھ ساتھ من کے بھی ستو گن رکھتی ہے۔ اس کے من کی سندرتا ہی تو اصل من موہنی ہے۔

غرض دوسری زبانوں کی طرح ہماری ہندوستانی اردو زبان کی بھی روایات ہیں۔ اور ان روایات کی تعمیر و تشکیل مختلف عناصر سے ہوئی ہے۔ جدا جدا دوروں میں جدا جدا تبدیلیاں تدریجاً ہوتی رہی ہیں اور اس دور جدید میں بعض تبدیلیاں اچانک بھی ہوئی ہیں۔ مثلاً احیائے قومیت کے اثر سے حب الوطنی کے نغمے بلند اٹھے ہیں اور انقلاب روس نے "کسان" اور "مزدور" اور پسماندہ طبقوں کی ہمدردی میں نالوں کو اکسایا ہے۔ چونکہ "فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔" لہذا "نالۂ ہمدردی" "پابند لَے" ہو کر [illegible] پسندانہ افسانوں کا بھی شور و شیون سنائی دے رہا ہے

روایات کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اب آئیے ذرا تبدیلیوں کی قیمت لگائی جائے۔

ادبی تبدیلیاں ضروری، لازمی، فائدہ رساں اور فطری ہیں چونکہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا جب کبھی آثار حیات میں تبدیلی ہوگی ادب اس سے ضرور متاثر ہوگا۔ زندگی ہمیشہ نئے قالب بدلتی رہتی ہے اور اسکا لازمی اثر ادب پر پڑتا ہے۔ زندگی اور ادب کی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ ارتقا کے دھارے کی روانی کو روکنا ناممکن ہے۔ کسی ادب کا وہ ۔۔۔۔ دبستان جو تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ "بقائے اصلح" کے اصول سے "تنازع للبقا" کے میدان میں پسپا ہو جاتا ہے۔

تبدیلیاں دلیل حیات و قوت ہیں یہ بالیدگی کی علامتیں ہیں۔ صرف وہ چیزیں جو زندہ ہیں غذا حاصل کر کے اپنے نشو و نما کرتی اور بڑھتی رہتی ہیں۔ تبدیلیوں سے وسعت اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ نئے خیالات نئی طرزیں نئے رجحانات ادب کو ہر دلعزیز، دلچسپ، شاداب اور مفید بناتے رہتے ہیں۔ جب "زندگی" کی تبدیلیاں خیالات اور پسندیدگیوں کو متاثر کرتی ہیں تو ادب اسی وقت تک پسندیدہ ہوگا جب تک وہ زندگی کی تبدیلیوں کا ساتھ دیگا۔

اگر ایک تالاب میں تازہ پانی کی آمد کو روک دیا جا—

زائدہ پیدا ہو جائے گی۔ اور رفتہ رفتہ تالاب خشک ہو جائیگا تبدیلیاں تازگی اور روانی پیدا کرتی ہیں۔

اگر ادب سے تبدیلیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ تو وہ آثار قدیمہ میں شامل کئے جانے کی چیز ہو جائے اور اس کے اوراق کتب خانوں کی بجائے عجائب خانوں کی زینت بنیں۔ تبدیلیوں کے بغیر ادب، انجمادی اور فرسودگی کا مخزن بنجائے۔ تبدیلیاں ادب کے سکے کو رائج الوقت بناتی ہیں۔ تبدیلی گویا چہرۂ شاہی ہے جو ادب کے سکے پر ڈھالی جاتی ہے۔

تبدیلیاں ادب میں لچک پیدا کرتی ہیں۔ لچک زندگی کے لئے ضروری ہے۔ جمود حیات کے منافی ہے۔ ادب ہماری تشنگی ذوق کو اسی وقت تک بجھا سکتی ہے جب تک اس میں لچک اور روانی ہو۔ لچک ادب کو ہمہ گیری بخشتی ہے۔ اور اسے قبول عام کی سند عطا کرتی ہے۔

الغرض ہمیں معلوم ہوا کہ روایات اور تبدیلیاں دونوں اہم چیزیں ہیں۔ دونوں کے درمیان مفاہمت قائم کرنا صحیح و صالح ذوق ادب کی دلیل ہے۔ اسی مقام پر قوت نقد و بصر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ روایات اور تبدیلیوں کے باہمی تعلقات پر سنجیدگی سے غور و تدبر کرنا ادب کی فطری ترقی و بقا کے لئے ضروری ہے۔ روایات شجر ادب کی جڑیں ہیں اور تبدیلیاں شاخیں، روایات سرمایۂ ادب ہیں۔ اور تبدیلیاں منافع۔ لہذا ایک زندہ، ترقی کناں، پھلنے پھولنے والے ادب کو اپنی روایات سے وفاداری برتنی چاہئے۔ اور اپنی فطری تبدیلیوں کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔

یہ امر قطعی ذہن نشین کر لینے کے قابل ہے کہ روایات سے وابستگی کے معنی "اخذ فرسودگی" نہیں اور نہ تبدیلی کا مطلب "قلب ماہیت" ہونا چاہئے۔ روایات کی لکیر کا فقیر ہونا ارتقا کیلئے سخت مضر ہے۔ طفل ادب ہمیشہ اپنی ماں کا دودھ نہیں پی سکتا اور نہ رزمگاہ حیات میں انگلیوں کے سہارے ہمیشہ چل سکتا ہے۔

بدلتی ہوئی فضا کے لئے تقاضے ادب میں تبدیلی پیدا کرنی ضروری ہے۔ بدلنے والا ماحول نئی نئی ضرورتوں کو سامنے لاتا ہے۔ اور ان تازہ احتیاجوں کی بھوک رفع کرنے کے لئے جدید غذاؤں کی ضرورت ہے۔ زندہ و پائندہ ادب کے دریائے رواں میں نئے خیالات، تازہ طرز ادا، جدید اسالیب، نو بہ نو تشبیہات و استعارات، رنگا رنگ اصناف کی معاون ندیوں کا آملنا تازگی و حیات کا ضامن ہے۔ مگر حد سے زیادہ تبدیلی انفرادیت ادب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے۔ اور اکثر ہلاکت کی باعث ہوتی ہے۔ تہذیب جدید کے پیدا کئے ہوئے شہروں کی سیر کیجئے اور دیکھئے کہ مغرب زدگی کے اثر سے ہماری ہندوستانی اردو زبان کس طرح بگڑ رہی ہے آپنے خانساماؤں سے "میم آتا ہے" "تم کیا کہنے مانگتا" "اچھا مانگ" تو سنا ہی ہوگا اور کلکتہ کے نیو مارکیٹ کی زبان سنی ہوگی۔ کالج کے طلباء کی دخیل گفتگو نے بھی آپ کی سمع خراشی کی ہوگی نیز آپنے ان ادباء کے شاہکار ملاحظہ فرمائے ہونگے جو "ادب لطیف" "ٹیگوریانہ نظم معرا" وغیرہ لکھتے وقت "انگڑائیوں کی مسکراہٹیں" "نگاہوں کے قہقہے" "خندہ گریاں" آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ سارے مظاہر تبدیلی کی غیر احسن صورتیں ہیں اور خطرناک۔ نئی ترکیبیں، نئے خیالات، جدید اسالیب، تازہ اصناف داخل کرتے وقت ہمیں بہت زیادہ چھان پھٹک سے کام لینا چاہئے نئی غذائیں اگر ہضم نہ ہوں تو ادب کو ضعف معدہ ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی تبدیلیاں ادب العالیہ کی تخلیق میں مانع ہوتی ہیں۔ اقبال، جوش، عظیم عظیم آبادی، حفیظ دور جدید کے شعراء ہیں۔ اور انہوں نے ادب میں انقلاب پیدا کر دیا ہے تاہم یہ روایات ادب اردو کے زبردست حاملین میں سے ہیں۔

بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی نظریہ کی پیروی کے جنون میں مبتلا ہو کر یا نسلی تعصب کے شکار بنکر یا ادبی گمراہی میں پھنسکر ہمارے سرمایۂ ادب کے کسی حصے کو رائیگاں کر دینا چاہتے ہیں مثلاً

وہ خالصے (Purists) جو عربی، فارسی الفاظ کو زبان ہندوستانی سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں۔ یا وہ لوگ جو غزل گوئی کے خلاف علمِ جہاد بلند کئے ہوتے ہیں۔ یا وہ گروہ جو صرف رسمی عربی اور عبرانی تلمیحات، ایرانی تشبیہات و استعارات وغیرہ سے متنفر ہے۔ اول الذکر جماعت بیشتر نسلی تعصب کے زہریلے اثرات کے ماتحت ہماری ہندوستانی زبان کے جاندار حصہ کو علیحدہ کرنا چاہتی ہے۔ عربی و فارسی الفاظ تو ہماری زبان کے روائتی سرمایہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب تو یہ ہمارے ہو سکتے ہیں۔ ان کو پھینک دینا افلاس نذیر کی بین دلیل ہے۔ روایتِ زبان و ادب کے کسی زندہ و صالح حصہ کا ترک تہی دامنی کو دعوت دینا ہے۔ وہ لوگ بھی صدورجہ بداندیش ہیں۔ جو فصاحت کے جنون میں نرم و نازک رسیلے ہندی شبدوں کو ادب کے سرمایہ سے نوچکر پھینک دیتے ہیں۔ اگر یہی طور طریقہ رہا تو ہماری ادبی پونجی گھٹتے گھٹتے ہمارا دیوالہ نکال دیگی۔ ثانی الذکر جماعت جدت اور انوکھے پن کے نشہ میں ہر قدیم صنفِ ادب سے روگرداں ہے۔ یہ جماعت کہتی ہے کہ غزل گوئی ایک پرتصنع شغل ہے۔ غزل میں صداقت و اصلیت نہیں ہوتی۔ غزلگو شاعر بلا تجربہ واقعات و واردات کو تحریر میں لے آتا ہے۔ یہ اعتراضات محدود تخیل کا نتیجہ ہیں۔ خارجی اور ذہنی تجربہ کے علاوہ "تجربۂ وجدانی" کا بھی وجود ہے۔ یہ تجربہ بھی اصلی اور سچا تجربہ ہے اگر غزلگو شاعر اس نوع کے واردات پیش کرتا ہے۔ تو کیا گناہ کرتا ہے؟ آرٹ کی قلمرو میں صرف فطرت کی "ارسطوئی نقالی" (Aristotalian Imitation) ہی داخل نہیں، بلکہ "خلاقی" (Creation) بھی شامل ہے۔ ملٹن کی "فردوس گمشدہ" اور شیکسپیئر کی "طوفان" اور "وسط گرما کا خواب شبانہ" تجربۂ وجدانی اور خلاقی کی رہین منت ہیں۔ ہمارے جدت پسند خشک نقادوں کو ان شہکاروں میں صداقتِ خارجی کا کوسوں پتہ نہیں ملے گا۔ ہاں یہاں وجدانی صداقتیں ہر طرف نظر آئیں گی جو انکی

کو باطن نگاہ نہیں دیکھ سکتی۔ جناب محمد حسین ادیب مرحوم نے اپنے فاضلانہ انتقاد کے سلسلے میں کبھی تحریر فرمایا تھا۔ کہ "غزل وہ صنفِ ادب ہے۔ جسکے لئے مغربی ادب ترس رہا ہے۔ ادبی مینا کاری اور ایجاز بلیغ غزل کا طرۂ افتخار ہے۔ البتہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ ہمارے یہاں بہت سے مبتذل گو غزل نویس ہیں اور گذر چکے ہیں۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ ایسے لغو گو نظم نگاروں کی بھی کمی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی روایاتِ ادب سے اُن چیزوں کو مٹا دیں جو بُری ہیں مثلاً امرد پرستی اور مبتذل گوئی۔ آخر الذکر طائفہ وطنیت کے جوش میں عربی، فارسی، عبرانی تلمیحات و تشبیہات سے قطع تعلق کر لینا چاہتے ہیں۔ گل و بلبل سوسن و یاسمن لالہ و ریحان، نرگس و سنبل کے نام سے یہ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھنے لگتے ہیں۔ شراب و ساقی کے جلووں سے انہیں پسینہ آنے لگتا ہے اور رستم و اسفندیار، ہاروت و ماروت خضر و مسیح، سلیمان و بلقیس، یوسف و زلیخا کے سایہ سے بھی انہیں پرہیز ہے۔ مگر یہ سب زبانی قیل و قال ہے مستحکم روایات سے یہ لوگ عملی طور پر ترکِ موالات نہیں کر سکتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ نظریہ ہی سرے سے غلط ہے کہ غیر ملکی چیزوں کو دیس نکالا دیا جائے۔ جن چیزوں کا ہندوستان میں جنم نہیں ہوا لیکن اب وہ یہاں رس بس کر گھل مل گئی ہیں وہ قطعی ہندوستانی ہیں۔ ان کی فائدہ رسانی بھی انکے زیرِ استعمال لائے جانے کی دلیل ہے ریل، مشینیں اور سینکڑوں دوسری چیزیں بیرونی ہیں۔ مگر انکا استعمال کیا جاتا ہے۔ خیالات و اصول بھی اپنائے جاتے ہیں۔ جمہوریت ہندوستانی الاصل نہیں لیکن کانگریس کے پنڈال سے اب اس کی گرجدار آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ ایرانی، عربی و عبرانی تلمیحات، تشبیہات و استعارات بھی ہندوستانی ادب کی روایات میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور انکو زبان و ادب سے علیحدہ کرنا ادب و زبان کے بھرے گھر کو ویران کرنا ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا پھول اور طائر ہندوستان میں نہیں پائے جاتے۔ یہ بھی غلط ہے۔ مغلِ اعظم انہیں اپنے ساتھ ہندوستان لایا اور یہاں کے باغوں میں ان کی کاشت اور پرداخت کی۔ مغل باغوں اور چمن زاروں میں ان کی کثرت تھی۔ ہندوستانی نوٗ مسلم کے یہاں اب تک یہ گل و شجر و طائر پائے جاتے ہیں۔ عمومی طور پر بھی کشمیر و صوبہ سرحد و بلوچستان میں آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ شراب و ساقی کی سحر کاریاں بھی ہندوستانی درباروں میں چشمِ فلک نے دیکھی ہیں

دوسری بات یہ ہے کہ تشبیہات و استعارات کے سلسلے میں کون شاعر کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے؟ اس کے تخیل کی کارفرمائی سارے کائنات میں آوارہ پھرتی ہے۔ وہ ہر بحر سے موتی رول سکتا ہے وہ ہر کوہ سے زرِ خالص حاصل کر سکتا ہے' وہ ہر کان سے یاقوت والماس نکال سکنے کا مجاز ہے۔ وہ بیابان و خیابان سے یکساں گل ترجیح کرنے کا اہل ہے۔ شاعر ختن سے مشک' بحرین سے موتی' اور گولکنڈا سے ہیرا لائیگا۔ وہ عراق کے نخلستانوں میں بلبلِ ہزار داستان کے نغمے سنتا ہے' ہندوستان میں کوئل کی آواز پر سر دھنتا اور کوہِ البرز کے دامن میں لانبی گردن والے سارس کے دودھ جیسے سفید و بُراق جوڑوں کو محوِ پرواز و مشغولِ نغمہ دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہومر کی ایلیڈ و اوڈیسی' آزاد کی سہراب و رستم' ملٹن کی "فردوسِ گمشدہ" و "بازیافت" کا مطالعہ فرمائیے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ان شاعروں کے تخیل پابند نہیں۔ تشبیہات و استعارات کے بارے میں بھی یہ اکثر آزاد ہیں۔ بہت سے انگریز شعراء و ادیب غیر برطانوی تشبیہات و استعارات آزادانہ استعمال کرتے ہیں۔ تو آخر ہندوستانی شعراء پر سودیشی کی پابندی کیوں عائد کر دی جائے؟

تلمیحات و قصص کے متعلق عرض ہے کہ جس طرح ہماری ہندوستانی اردو زبان عربی' ایرانی و عبرانی سرمایہ سے فیضیاب ہے

بالکل اسی طرح انگریزی ادب یونانی و رومی صنمیات و قصص اساطیر سے بھرا پڑا ہے۔ ہم تو ارجن کا بان مارا" بھی کہہ لیتے ہیں' راون' ہنومان' کمبھ کرن کو بھی جانتے ہیں۔ اور ان کی باتیں ادب کی زبان میں کرتے ہیں' اور رام' کرشن سے بھی واقف ہیں۔ اور انکی سمرن جپتے ہیں۔ مگر انگریز شاعر و ادیب تو اپنے اینگلو سیکسن اساطیر کو بھول چکے ہیں۔ وہ تو صرف یونانی صنمیات کے دلدادہ ہیں۔ ملٹن اور کیٹس کی شاعری سے صنمیات یونان کو علیحدہ کر لیجئے پھر انکے پاس رہ کیا جاتا ہے؟

ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ گذارش بھی کرنی ہے کہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو نرا عربی و ایرانی نہیں بن جانا چاہئے ہمارے ہندوستانی پھل پھول' بیل بوٹے' پنکھ پکھیرو بھی بڑے رسیلے اور پیارے ہیں کنول' گینڈا' سرسوں' کٹھل' کیتکی' چمپا' موتیا' کامنی' جوہی' بیلا' چنبیلی' سنگرہار وغیرہ ہمارے ہندوستان کو مہکاتے اور لہلاتے ہوئے ہیں۔ کوئل' شاما' بھنگراج' تیتر' فاختہ' پپیہا' پوربی مینا' طوطا وغیرہ بھی کیسے خوش آواز و دلچسپ پرندے ہیں۔ ان کے گیتوں اور نغموں سے ہمارے شہر و صحرا آباد و زندہ ہیں۔ ہمارا ہندوستانی صنمیات اینگلو سیکسن خرافیات جیسا بربریت بداماں نہیں کہ ہم اُسے قطعی ترک کر دیں۔ بلکہ ہماری دیومالا بہت ہی شاعرانہ ہے۔ ہمارے مہا پرش یونانی مہا پرشوں سے کسی طور پر کم نہیں' ہماری دیویاں بہت سی خصوصیات میں اُن کی دیویوں سے بہتر ہیں' ہمارے سورما زیادہ جگر دار ہیں الغرض ہمارے قصے زیادہ سبق آموز دلچسپ اور فنکاری کی بھی ان کہانیوں میں کمی نہیں۔ غرض خالص ہندوستانی اساطیر' تشبیہات' استعارات' تلمیحات وغیرہ کو ہمیں پورے طور پر ہندوستانی اردو ادب میں استعمال کرنا چاہئے۔ یہ ہمارے پرانے خزانے ہیں۔ اس گنجینۂ گرانمایہ کو نئے سکوں کی صورت میں ٹکسال بنا کر بازار میں لے آنا چاہئے۔ ایشور کی کرپا سے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا دھیان اب اس طرف پھرا ہے۔ یہ نہایت ہی خوش

شگون ہے۔

اور ان لوگوں کا تذکرہ ہوا جو ادبی روایت کی پونجی لٹانے پر تلے ہوتے ہیں۔ اب اس گروہ کی سنئے جو تبدیلیوں کی مخالفت میں ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ یہ لوگ اسلاف کی ہڈیوں سے چمٹے ہوئے مرثیہ و ماتم میں مشغول ہیں۔ غزل ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اور طلسم ہوشربا و فسانۂ عجائب ان کی غذا۔ یہ ٹولی ہر ترقی و جدت کا نام بدعت و کفر رکھتی ہے۔ یہ منڈلی نئے خیالات، نئے رجحانات نئے اسالیب اور نئی طرزوں کو بغاوت و طغیان کا نام دیتی ہے تقلید اور اندھی تقلید اس ٹولی والوں کا پیشہ ہے۔ رخ کی تشبیہ اُنکے یہاں صرف گل و مہتاب سے دی جانی جائز ہے۔ اور گیسو کی سنبل سے۔ ان کی زبان پر وہی ہجر و وصال کے چرچے ہیں اور اُسی فرسودہ انداز میں۔ کوئی نئی کیفیت ان کے دل کو نہیں گرماتی کوئی جدید خیال ان کے دماغ کو نہیں چھیڑتا۔ یہ لوگ اردو ادب کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ اور تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اسکو ٹھکانے لگانے میں مشغول ہیں۔ زمانہ خود انہیں مٹا کر چھوڑے گا۔ مگر نقادوں کو ان کی قبریں کھود کر رکھنی چاہئیں۔

ادب اور معیار۔ موجودہ موضوع کا ایک پہلو "ادب اور معیار" بھی ہے کیسی خاص صنفِ ادب میں معیار کا قیام روایات کے زیر اثر ہوتا ہے۔ مثلاً شاعری کا معیار، افسانہ نویسی کا معیار، ڈرامہ اور ناول کا معیار، دورِ گذشتہ کے اساتذہ ایک خاص طرز قائم کر جاتے ہیں اور شاگرد اس کی پیروی کرتے ہیں نیز آنے والے دور کے ادبا بھی انہیں اصول و ضوابط کی اطاعت کرتے رہتے ہیں۔ تاآنکہ کوئی "نابغہ" ([Genius]) طرحِ نو کی بنا ڈالتا ہے۔ مثلاً سوفوکلس، ایروپیڈیز، اشائیلس وغیرہ یونانی ڈرامہ نویسوں نے ایک خاص طرز کے ڈرامے لکھے اور ارسطو نے انکی تصنیفات سے اصول اخذ کر کے اپنی کتاب "شعریات" (Poetica) میں منضبط کر دیئے انہیں اصول و قواعد کی زمانہ تک پیروی ہوتی رہی یورپ کے مختلف ممالک نے انہیں کی پیروی کی۔ انگلستان میں بالآخر شیکسپیئر نے سولہویں صدی عیسوی میں ان کلاسی اصولوں کے خلاف بغاوت کی اور رومانی ڈراموں کی بنا ڈالی۔ مدت تک شیکسپیئر ہی یورپ بھر کا معیار بنا رہا۔ مگر انیسویں صدی میں ناروے کے شہرۂ آفاق ڈرامہ نویس ابسن نے "حقیقت نگاری" کی ترویج کی۔ برنارڈ شا اور گالزوردی بھی انہیں اصولوں کے پیروکار ہیں۔ ڈرامہ کے ساز و تعمیر میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ دورِ وکٹوریہ کے جدت پسند شاعر براؤننگ نے "نظمیہ ڈرامہ" **Lyric Drama**؛ "پپا پاسز" اور کئی "ڈرامائی وحدانیہ" (**Dramatic monologue.**) تصنیف کئے۔ مذکورہ بالا تبدیلیوں کے باوجود ڈرامہ کے بنیادی اصولوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ عمل، کشاکش، انتظار، عروج وغیرہ اپنی حالت پر قائم رہے۔ الحمرا، دمشق، قسطنطنیہ، شیراز و اصفہان اور دہلی و آگرہ کے گنبدوں میں شکل و صورت کا فرق ہے مگر وہ سب کے سب میناروں اور دوسرے اشکالِ تعمیر سے منفرد کئے جاسکتے ہیں یہی حال ان مختلف ڈرامائی طرزوں کا ہے۔ وہ آپس میں مختلف ہوتے ہوئے بھی متحد ہیں اور دوسرے اصنافِ ادب سے ممیز طور پر علیحدہ کئے جاسکتے ہیں۔ صرف ڈرامہ ہی میں نہیں بلکہ ناول کے طرز میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ انگلستان ہی کے ناولوں کو لیجئے۔ ڈکنس، تھیکرے، ہارڈی، ویلس اور ہکسلے کی تصانیف میں طرز کا بہت اختلاف ہے مگر ناول کی انفرادی خصوصیات کہیں مفقود نہیں۔ قصہ، نفسیاتی تحلیل ہر جگہ موجود ہے۔ آلڈس ہکسلے نے اپنی بعض تصانیف میں سلسلہ تعمیر کی جدتیں بھی پیدا کی ہیں۔ یہی حال افسانہ مختصر کا بھی ہے۔ موپاساں، ایلن پو، اسٹیونسن، چیخوف، ترجنیف، گورکی کے فسانوں میں اسلوب کا فرق ہے۔ مگر افسانہ کی فنی حیثیت کہیں فنا نہیں ہوتی۔ ہمارے ادب میں بھی مختصر افسانوں کے مختلف طرز ہیں۔ مگر افسانہ کی ملی انفرادیت ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ [illegible]

پریم چند، اعظم کریوی اور حجاب امتیاز علی کے اسالیب و طرز میں فرق ہوتے ہوئے بھی انکے کارنامے فنی معیارِ افسانہ پر پورے اترتے ہیں۔

غرض ہم نے دیکھا کہ ادب میں معیار قائم ہوتے ہیں۔ اور انکی پیروی کی جاتی ہے۔ اور گاہے گاہے معیار میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ معیار کی تبدیلی زمانہ کے رجحانات یا کسی نابغہ کی شدید انفرادیت کی رہینِ منت ہوتی ہے کبھی "نابغہ" ماحول و زمانہ کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور کبھی زمانہ کا رد عمل۔ اول الذکر اپنے زمانہ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اور آخر الذکر خالق ماحول و پروردگارِ زمانہ وہ ایک انقلاب برپا کرتا ہے۔

انگریزی شاعری کے کلاسی معیار کو زمانہ کے رجحانات نے فنا کر دیا۔ انقلاب فرانس نے رومانی کرنا پھونک کر دورِ جدید کا آغاز کیا۔ شیلے کیٹس اور ورڈز ورتھ ایسے نابغہ تھے جو زمانہ کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ اور زمانہ کو استحکام و حیات بخشتے ہیں۔ دوسری قسم کے "نابغہ" کی مثال براؤننگ حالی اور اقبال ہیں۔ براؤننگ میں شدید انفرادیت تھی۔ اس نے شاعری کا نیا معیار قائم کر دیا۔ کہاں دورِ وکٹوریہ کی ادبی وضع داری اور کہاں براؤننگ کی مخصوص طرزِ خیال کی نظمیں! وہ ایک زبردست رومانی تھا۔ ہرچند کہ آنیوالے زمانہ نے اس کی طرز کی پیروی نہیں کی، شاید اس کی نقل دشوار تھی، پھر بھی اسنے بیسویں صدی کے شعرا کو طرح طرح کی جدتوں کی طرف متوجہ کر دیا اور سب سے بڑھکر یہ کہ براؤننگ نے انفرادیت کا پیغام سنایا۔ حالی اور اقبال نے بھی عالمِ نو کی تخلیق کی۔ انہوں نے اردو شاعری کو فرسودگیوں سے نجات دلائی اور ادب میں ایک زندگی بخش انقلاب برپا کر دیا۔ یہ لوگ زمانہ کے نمائندہ نہ تھے۔ بلکہ باغی تھے۔ موجودہ اردو شاعری انہیں کو اپنا معیار تسلیم کرتی اور ان کی پیروی کرتی ہے۔

بات یہ ہے کہ زندگی ہمیشہ نئے جولانگاہ کی تلاش میں سرگرم ہے حیات اور مظاہرِ حیات کی تحدید و پابندی نہیں کی جا سکتی۔ انسان اور اس کی پسندیدگیاں ہمیشہ ارتقا یا انقلاب سے روشناس ہوتی رہتی ہیں۔ انسان اور اس کے رجحانات کے لئے کوئی فارمولا تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ ادب زندگی کے تلوّن سے متاثر ہوتا رہتا ہے لہٰذا اصنافِ ادب کے لئے ایک قطعی اور آخری معیار کا تصور ہی سرے سے غلط ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی صنفِ ادب کے معیار میں ایسی گہری تبدیلی ہوتی ہے، کہ بنیادیں متزلزل نظر آتی ہیں، یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سے ایک نئی صنف کی تاسیس شروع ہوتی ہے۔ یہ بہت ہی نازک موقع ہوتا ہے۔ نیا انقلاب یا تو بربادی و تباہی ساتھ لاتا ہے۔ یا تخلیق جدید کا باعث بنتا ہے۔ نظمِ مقفیٰ، نظمِ معرا اور نظمِ منثور کی علیحدہ صنفیں اسی طرح وجود میں آتی ہیں قصہ، ناول ڈرامہ اور افسانہ کی صنفیں بھی اسی طور سے پیدا ہوئی ہیں۔ دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی اس قسم کی تبدیلیوں کی مثال ملتی ہے، اس نوع کی بنیادی تبدیلیاں کبھی تدریجاً ہوتی ہیں۔ اور کبھی اچانک ظاہر ہے کہ ایسی تبدیلیاں بھی "نابغہ" کی انفرادیت و جدت کے زیرِ اثر اور زمانہ کے رجحانات سے متاثر ہو کر پیدا ہوتی ہیں۔

مگر ادب میں معیار کا وجود بھی نہایت ہی اہم چیز ہے۔ اگر معیار نہ ہو تو طوائف الادبی پیدا ہو جائے۔ مملکتِ ادب میں تاراج کا دور دورہ ہو۔ ہر واہیات چیز شہکارِ ادب ہو کر پیش ہونے لگے ۔ اور ہر کس و ناکس ملک الشعرا اور ادیب الملک بنا پھرے۔ زرِ خالص اور خزف ریزوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ میتھیو آرنلڈ نے اسی قسم کی حد سے بڑھی ہوئی رومانیت و آزادروی کے خلاف قلم اٹھایا تھا اگرچہ وہ خود تفریط کا شکار ہو گیا۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ معیار کا ترک ادبی فسق و فجور ہے۔ ہر ایں و آں معیار کے خلاف قدم اٹھانے کا مجاز نہیں۔ اس سے اقلیمِ ادب کا امن اٹھ جائیگا۔ شکستِ معیار صرف "نابغہ" کے ہاتھوں ہو سکتا اور ہوتا ہے۔ "نابغہ" ہی صاحبِ شریعتِ جدید بننے کا اہل ہے۔ زمانہ کے رجحانات بھی نابغہ ہی

کو اپنا نمائندہ بناتے ہیں۔ پھر شکست معیار کا بھی ایک اصل الاصول ہے۔ جس سے نابغہ بھی سرتابی نہیں کر سکتا۔ یہ تبدیلی اور شکست اسی وقت حق ہے۔ جب معیار نو حیات و ادب کے کسی نئے اندازِ حسن کو بے حجاب کرے۔ زندگی کے نو بنو جلوؤں سے علم فطرت ہی فیضیاب ہو سکتا ہے۔ ہر معیار شکن کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ نقاد کا فرض ہے کہ وہ صادق و کاذب میں تفریق کرے۔ اور کھرے اور کھوٹے کو علیحدہ کر دے۔ ایک فطری نقاد اصطلاحات کا غلام نہیں ہوتا۔ وہ نورِ پیشانی سے نابغہ کو پہچانتا ہے اور اس پر ایمان لا کر اسکی صداقتوں کی تبلیغ کرتا ہے۔ ایک بلند پایہ نقاد متوسط درجہ کے فنکاروں کے ہجوم سے نابغہ کو چن لیتا اور اسے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ چسٹرٹن نے براؤننگ کا کھوج نکالا اور اس کی خوبیوں کو منظرِ عام پر لایا۔ اگر نابغہ ظاہر ہو چکا ہے تو نقاد کا صرف یہ فرض رہ جاتا ہے کہ اسکے محاسن کو عالم آشکار کرے۔ اور اس کی جدتوں کو نوامیس فطرت کی کسوٹی پر صادق ثابت کرے۔ نقاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کاذبوں کے کذب سے اہل ادب کو آگاہ کرتا رہے' ادبی گمراہوں' خطا کاروں' خام کوششوں اور باغیوں پر نگاہ رکھنا بھی اسکا کام ہے۔

ختم کلام پر مجھے صرف یہ عرض کرنی ہے کہ سارے مذکورہ بالا امور میں توازن قائم رکھنا اور حصولِ صداقت آپکے اپنے ذوقِ ادب پر منحصر ہے۔ نقادوں کی خامکاریاں بھی تو روزمرہ کا مشاہدہ ہیں جس حد تک آپ فطرت کی گہرائیوں سے زیادہ واقف ہونگے اسی حد تک آپ میں قوتِ نقد و بصر کا صحیح و صادق نشو و نما ہوگا۔ غیر جانبداری بھی ایک اہم اصولِ تنقید ہے اور یہ بھی وسعتِ تخیل اور لامحدود ہمدردیوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جہانتک صداقتِ مطلق کا تعلق ہے' وہ تو چھپائے چھپ نہیں سکتی۔ آپکی انفرادی غلطی یا میری خطاکاری صداقت کو محجوب نہیں بنا سکتی۔ صداقت تو اس سے بھی روپوش نہیں ہوتی کہ غلط رجحانات' و نامسعود اقدامات کے سبب کوئی ادب تباہ و برباد ہو جائے۔ دنیا تعمیر میں بھی صداقت کو دیکھتی ہے' وہ تخریب میں بھی اپنی

محترمہ زیب عثمانیہ گولڈ میڈلسٹ

سرِ خودی

تیری بستی میں کہاں یارب کوئی ویرانہ ہے
اور صحرا میں نہیں کچھ سبزۂ بیگانہ ہے

مٹ گیا شبنم کے قطرے نے جو دیکھا صبحدم
وہ چمن میں غیر ہے اس سے چمن بیگانہ ہے

چشمِ استغنا سے ساقی نے بتایا ہے تجھے
خود سمجھتا ہے وہ گر خالی ترا پیمانہ ہے

وسعتِ دنیا کو زاہد تو نے دیکھا ہی نہیں
تیرے کعبے کے سوا بتخانہ ہی بتخانہ ہے

مجھ سے سچ پوچھے تو لیلیٰ ہر نہ شیریں ہر کوئی
دل کا دیوانہ ہے تو اور دل ترا دیوانہ ہے

حسن کا دریوزہ گر ہی کیوں نہ ہو اچھا نہیں
زیبؔ اس نکتہ پہ مرتا ہے جو فرزانہ ہے

جناب اثر صہبائی ایم اے۔ ایل ایل۔ بی

جامِ صہبائی

یہ اپنی ہی پیاس نے دُونا کیا
پیمان میں جس نے ہزار بار تمنا کیا
یزداں کو زیر کر کے تو شیطاں کو بھی پار
انساں کے حضور بھی سجدہ کرنا کیا

پایا نہ جو میری نظر نے ثریا سے بلند
سدرہ سے بلند نخلِ طوبیٰ سے بلند
رہ جائے سمٹ کے ایک نقطہ دنیا
اٹھی جو مری نگاہ دنیا سے بلند

اک محشرِ سوز و ساز کر دے مجھ کو
اک نالۂ جاں گداز کر دے مجھ کو
بیگانۂ زیان و سود ہے ایمانِ شوق
اس فکر سے بے نیاز کر دے مجھ کو

میخانے میں مستی ہے تو کعبے میں نماز
یہ بھی ہے مجاز اور وہ بھی ہے مجاز
دونوں سے بہت پرے ہے اپنی منزل
عرفاں کی راہ ہے بہت دور دراز

جناب یزدانی جالندھری

فرانس کا شہرہ آفاق طربیہ نگار

مولیئر

ابتدائی حالات

فرانس کا شہرہ آفاق تمثیل نگار مولیئر ۱۶۲۲ء میں بمقام پیرس پیدا ہوا۔ اس کا اصل نام جین بپٹسٹی پوکلن ہے۔ ابھی دس برس ہی کا تھا کہ اس کی والدہ (میری کریسی) کا انتقال ہوگیا۔ چودہ برس تک آبا و اجداد کے موروثی پیشہ خیاطی میں مصروف رہا۔ اتفاق سے اس کے والد کو شہنشاہ لوئی سیزدہم کے خاصہ کے ملازموں میں جگہ مل گئی۔ شاہی تھیٹر میں ڈرامے دیکھ کر نوجوان پوکلن کے دل میں فطری جذبات ابھرنے شروع ہوئے اور تعلیم کا شوق دل میں موجزن ہوگیا۔ فرانس کے مشہور فلاسفر گوسندی کے حلقۂ درس اور کالج ڈی کیلارمنٹ میں کچھ عرصہ جانکاہی سے تعلیم حاصل کر کے ۱۶۴۱ء میں سند حاصل کی۔ ۱۶۳۲ء میں اس کے باپ نے اپنی جگہ بیٹے کے تقرر کی منظوری حاصل کر لی تھی چنانچہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اس کو باپ کی بجائے بطور ویلے خدمات انجام دینے کے لئے شہنشاہ کے ہمراہ سفر پر جانا پڑا۔ اس سفر میں اس نے درباریوں کی عادات و خصائل کا خوب مطالعہ کیا۔ جو آئندہ چل کر اس کی تمثیل نگاری میں ممد و معاون ثابت ہوا۔

اداکاری اور تمثیل نگاری کی ابتداء

سفر سے واپس آکر پوکلن نے قانون کا مطالعہ کر کے وکالت کی اجازت حاصل کی لیکن تھیٹر کا شوق ایسا بھڑکا کہ سب کچھ چھوڑ کر اسی جانب متوجہ ہوگیا اور چھوٹی چھوٹی تھیٹریکل کمپنیوں سے تعلقات پیدا کرنے شروع کئے۔ جو کارڈینل رشیلو کی زیر سرپرستی جا بجا قائم تھیں۔ جب باپ کو ان واقعات کا علم ہوا تو اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اور اس نے ایک دوست کو اسے راہ راست پر لانے کے لئے بھیجا۔ لیکن پوکلن سے ملتے ہی وہ دوست بھی اس کا ساتھی ہو کر رہ گیا۔ چونکہ ان ایام میں اداکاری کو مبتذل پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے تمام خاندان نے پوکلن سے قطع تعلق کر لیا۔ اہل خاندان کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے اس نے اپنی کنیت مولیئر اختیار کی۔ اور آج تک اسی نام سے معروف ہے۔

تین سال کے بعد جب ملکہ این کی نائب السلطنتی کے عہد میں ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہوگیا۔ تو مولیئر جنوبی فرانس چلا گیا۔ اور ۱۶۴۶ء تا ۱۶۵۶ء یعنی دس سال تک اپنی کمپنی لا السٹر تھیٹر (L. Illustre Theatre) کو شہر بشہر لئے پھرتا رہا۔ اس زمانہ میں اس نے چند نقلیں تیار کیں۔ جن کا نشان تک آج ناپید ہے۔ اسی سیاحت کے دوران میں فرانس کے پرنس کانٹی سے ملاقات ہوئی اور وہ شہزادے کا پرائیویٹ سیکرٹری بن گیا تھوڑے عرصہ بعد اس نے ملازمت سے استعفےٰ دیدیا۔ اس کی وجہ وہ خود لکھتا ہے "سیکرٹری کا کام میرے مذاق کے خلاف ہے۔ ممکن ہے میں برا بھلا مصنف بن جاؤں لیکن میں بدترین سیکرٹری بننے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا"۔ اسی شہزادے کی وساطت سے وہ لوئی چہاردہم کے دربار میں پہنچا۔ اور ۱۶۵۸ء میں پیری کا رنیل کی ایک ٹریجیڈی اور اپنی چند نقلیں دکھائیں۔ جس کے صلے میں اُسے ایک تھیٹر مل گیا۔ جہاں اس نے دوران سیاحت کی لکھی

ہوئی وہ طربیہ تمثیلیں سٹیج کر کے قبولیتِ عام حاصل کی۔ آئندہ سال نئی طربیہ تمثیل تیار کی۔ جس کی ہجویہ طرزِ نگارش نے فرانس کے ادبی مذاق میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ یہی تمثیل مولیئر کی عظمت کا سنگِ بنیاد ہے۔

اس سے پیشتر فرانسیسی انشاپرداز مبالغۂ لفظی، صنائع بدائع بندش کی چستی اور محاورہ بندی کو سرمایۂ کمال سمجھتے تھے لیکن مولیئر کی ظرافت آمیز طرزِ انشا نے رنگ ہی بدل دیا۔ ۱۶۶۱ء میں دو اور طربیہ تمثیلیں تیار کر کے سٹیج کیں اور بادشاہ کا منظورِ نظر بن گیا۔

شادی اور طوفانِ مخالفت

بیجارڈ خاندان سے مولیئر کے دیرینہ تعلقات تھے مشہور ایکٹرس میڈالن اور اس کی چھوٹی بہن ارمنڈے اس کی گہری دوست تھیں۔ جنوبی فرانس کی سیاحت کے دوران میں میڈالن اس کی رفیقِ سفر رہی تھی۔ بقول محمد عمر نور الٰہی صاحبان ۱۶۶۲ء میں اور بقول محمد حسین ادیب ۱۶۶۱ء میں اس نے میڈالن کی چھوٹی بہن ارمنڈے سے شادی کر لی۔ یہ شادی اس کے لئے وبالِ جان ثابت ہوئی۔ کیونکہ دونوں کی عمروں میں بیس سال کا تفاوت تھا۔ اس کے علاوہ ارمنڈے حد سے زیادہ فضول خرچ اور آوارہ مزاج واقع ہوئی تھی۔ ان چیزوں کو مولیئر کسی طرح برداشت نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اکٹھے رہنے کے باوجود سٹیج کے سوا کبھی آپس میں گفتگو نہ کرتے تھے۔ اسی سال مولیئر نے ایک لطیف کومیڈی سٹیج کی جس کی کہانی یہ تھی کہ ایک بوڑھا ایک نوعمر لڑکی کو اس امید میں پرورش کرتا ہے۔ کہ جوان ہونے پر اس سے شادی کرے گا لیکن لڑکی کے جوان ہونے پر یہ تجویز ملیامیٹ ہو جاتی ہے۔ جب ایک نوجوان پانچ منٹ میں بوڑھے کی عمر بھر کی محنتوں اور تمناؤں پر پانی پھیر دیتا ہے اور لڑکی اس نوجوان سے شادی کر لیتی ہے۔

یہ تمثیل اگرچہ مقبولِ عام ہوئی لیکن اس کے خلاف اعتراضوں ہجووں اور گالیوں کا بھی ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ہر ایک مخالف نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس طوفانِ مخالفت کے جواب میں مولیئر نے ایک اور طربیہ تمثیل سٹیج کی۔ جس میں سب مخالفوں کو پانی پی پی کر کوسا تھا۔ انہیں میں ایک کندۂ ناتراش رئیس بھی تھا جسے اپنے علم و فضل پر بڑا غرور تھا وہ میدانِ ادب میں تابِ مقابلہ نہ پا کر جسمانی نقصان پہنچانے کے درپے ہوا۔ چنانچہ ایک دن مولیئر کو ملا تو اس انداز سے بڑھا گویا معانقہ کرنا چاہتا ہے جب مولیئر اس سے بغلگیر ہوا تو کمبخت نے اس کا سر پکڑ کر اپنے کوٹ کے بٹنوں سے اس قدر رگڑا کہ بیچارے ڈراما نویس کے ہوش و حواس بجا نہ رہے۔ جب بادشاہ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو اس نے رئیس کو خوب ڈانٹا اور آئندہ کے لئے تنبیہہ کی۔ ساتھ ہی مولیئر کو ایما ہوا کہ اپنے حربوں سے کام لے۔ وہاں کیا دیر تھی فوراً ایک تمثیل تیار ہو گئی۔ جس میں سب رئیسوں کی مٹی پلید کی گئی تھی۔

بادشاہ کی حمایت و سرپرستی مولیئر کے لئے ایک نعمتِ عظمیٰ تھی۔ چنانچہ جب مولیئر کے گھر بچہ پیدا ہوا تو خود بادشاہ اس کا گاڈ فادر بنا۔ اور ایک ہزار فرانسیسی فرانک سالانہ اس کی اور سات ہزار فرانک سالانہ اس کی کمپنی کی پنشن مقرر ہوئی۔

ستمبر ۱۶۶۵ء میں اس کی وہ مشہور تمثیل سٹیج ہوئی جس میں ڈاکٹروں کی خبر لی گئی ہے۔ ڈاکٹروں کے غرور و نخوت کا جو نقشہ یہ تمثیل پیش کرتی ہے وہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے لیکن اس زمانہ کے ڈاکٹروں کے حالات کو مدِنظر رکھا جائے تو بالکل درست اور جائز ہے۔ مولیئر کو ڈاکٹروں پر چنداں اعتماد نہ تھا۔ دائم المرض ہونے کے باوصف دوا کا استعمال نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ کے یہ دریافت کرنے پر کہ وہ بادشاہ کی جانب سے مقرر کردہ معالج سے کیا کام لیتا ہے۔ اس نے کہا: جہاں پناہ! ہم دو گھڑی مزے سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ نسخہ دیکر چلا جاتا ہے۔ اور میں اُسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں اور اسی لئے اچھی

تک زندہ ہوں":

نیا دور اور پادریوں سے کشمکش

"بگڑے دل" سے اس کی تمثیل نگارانہ زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس تمثیل کو اسکا شاہکار خیال کیا جاتا ہے۔ "بگڑے دل" دنیا، اہلِ دنیا اور تمام تکلفات سے حد درجہ بیزار اور ان کی اصلاح کے لئے لڑ مرنے کو تیار ہیں۔ فرانسیسی نقاد اس کی ادبی شان کے از حد معترف ہیں۔ روسیو اس تمثیل پر بہت چیں بجبیں ہوا تھا کہ اس میں ڈک ڈی مونٹیا سیر جیسے صاحبِ اتقا و پابند اصول شخص کا مذاق اڑایا گیا ہے کسی نے ڈک ڈی مونٹیا سر سے کہا کہ "بگڑے دل" کے کیریکٹر سے آپکی ذات مراد ہے تو اُسے بہت رنج ہوا۔ وہ یہ تمثیل سٹیج پر دیکھنے گیا اور کھیل کے خاتمہ پر چلا اٹھا "میری اتنی قسمت کہاں کہ مولیئر مجھے اس عزت کے قابل تصور کرتا"۔ روسیو کے اعتراض کا اس سے بہتر جواب اور کیا ہو سکتا ہے۔

اب مولیئر مذہب کی جانب متوجہ ہوا اور "رنگے سیار" کے عنوان سے طربیہ تمثیل تیار کی جس میں پادریوں کی ریاکاری کا تار و پود بکھیر اگیا ہے۔ جب یہ تمثیل سٹیج ہوئی تو بادشاہ اور دیگر اکابرین کے علاوہ پادری بھی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے خفیف ہو کر چلانا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ حتٰے کہ بادشاہ کو آئندہ کے لئے اس تمثیل کی نمائش روک دینا پڑی۔ پھر بھی بادشاہ اور امراء اپنے محل اور مکانوں میں اسے دیکھتے رہے جس سے پادری اور بھی بھڑک اُٹھے اور گالی گلوچ تک اتر آئے سب سے سرگرم پادری لیٹر واس تھا۔ اس نے مولیئر کی تکفیر کا فتوٰے صادر کرتے ہوئے اُسے لچا، شہدا اور شیطان کا قائمقام وغیرہ کے خطاب عطا کئے۔

جب کفر کے فتوے ہی ملنے تھے ستائش میں
کیوں تو نے سکھائی تھی یارب یہ غزل خوانی؟

اسی پر بس نہیں ہوئی بلکہ ایک پادری نے بادشاہ سے کہا کہ مولیئر کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ سب طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اُسے برکاتِ کلیسا سے محروم رکھا جائے۔ کچھ اس وجہ سے کہ اُس عہد میں اداکاری کا پیشہ مبتذل خیال کیا جاتا تھا۔ اور کچھ پادریوں کی مہربانی سے مولیئر کو کئی روحانی و جسمانی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک دفعہ شاہی محلات کے ملازموں نے اس کے فرائض کی بجا آوری میں مدد دینے سے انکار کر دیا۔ دربار فرانس کے ملک الشعراء بلاک نے اپنی خدمات پیش کرکے اس مشکل کو حل کیا۔ اس طرح ملازموں نے اس کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے سے انکار کر دیا تو بادشاہ نے اسے اپنے میز پر مدعو کر لیا۔ اور درباریوں سے مخاطب ہو کر کہا: "میں نے مولیئر سے عرض کی ہے کہ وہ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو۔ کیونکہ وہ اس قابل نہیں کہ میرے نوکر اس کے ساتھ کھانے کی ذلت گوارا کریں"۔ بادشاہ کے اس طرزِ عمل نے سب کی آنکھیں کھول دیں۔

یہی تعصب اُسکے اکیڈیمی کا ممبر ہونے کی راہ میں حائل ہوا حالانکہ اکیڈیمی کے ممبروں میں سے کوئی بھی ادبیات کے لحاظ سے مولیئر کا مدمقابل نہ تھا۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ اگر وہ اداکاری کو ترک کرکے صرف تمثیل نگاری سے تعلق رکھے تو وہ اُسے ممبر بنانا باعثِ فخر سمجھیں گے۔ لیکن مولیئر نے جواب دیا کہ میری کمپنی کے بیشمار ملازم میری بدولت روٹی کھاتے ہیں۔ اس لئے اس پیشہ کے ترک کرنیکا میں خیال تک نہیں کر سکتا۔

آخر مولیئر کی وفات کے ایک سو سال بعد اکیڈیمی کو ہوش آیا۔ اور نہایت احترام کے ساتھ اس کی تصویر اپنے حال میں آویزاں کرکے اس کے نیچے کتبہ لکھا: "اس کے نام کو کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ لیکن ہماری عزت نامکمل ہے کہ اس کا نام ہماری فہرست کا طغرائے امتیاز نہیں"۔

آہ مردہ پرست دنیا!

۱۶۶۶ء میں اس کی طربیہ تمثیل "بخیل" شاہی محل میں سٹیج ہوئی لیکن بادشاہ خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ اس کے لب تبسم سے آشنا تک نہ ہوئے۔ جب مولیئر بحیثیت ویلے حاضر ہوا تو بادشاہ نے منہ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ زمانہ شناس درباریوں نے سمجھا کہ مولیئر بادشاہ کی نظروں سے گر گیا ہے انہوں نے بادشاہ کے کان اور بھرنے شروع کئے۔ ایک ڈیوک نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ اب مولیئر ایسے پیر فرتوت سے کومیڈی بن آنی دشوار ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی نوجوان مصنف اس کام کو سنبھالے ورنہ فرانسیسی کومیڈی اطالوی نقلوں کے مشابہ ہو جائے گی۔ پانچ دن تک مولیئر بے کسی کے عالم میں بیار و مددگار نڈھال پڑا رہا چھٹی رات جب یہ تمثیل پھر سٹیج ہوئی۔ تو بادشاہ نے مولیئر سے کہا۔ کہ اس کی کوئی تصنیف بھی اس قدر شاہ پسند نہیں ہوئی جتنی کہ "بخیل" اور گزشتہ رات اس نے اس لئے اظہار رائے نہ کیا تھا۔ کہ اسے اس امر کا اندیشہ تھا۔ کہ شاید اس کامیڈی کے اس قدر پسند خاطر ہونے میں مولیئر کی اداکاری کا اثر بھی شامل ہو۔ بادشاہ کی زبان سے یہ لفظ نکلتے ہی درباریوں نے تمثیل کی تعریف کے پل باندھ دیئے۔ اور ڈیوک مذکور نے کہا "مولیئر کی زبان سے جو نکلتا ہے اعجاز ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں اس کی نظیر ناممکن ہے۔"

شہیدِ فن کے آخری لمحے

مولیئر ایک مدت سے دق میں مبتلا تھا۔ اور انتہائی پرہیز کے طفیل معمولی درجہ کی صحت قائم رکھے ہوئے تھا۔ ۱۶۷۳ء کے آغاز میں بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ مگر اس نے قلم ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ جان باز سپاہی کی طرح میدانِ ادب میں ثابت قدم رہا۔ ۱۷ فروری ۱۶۷۳ء کو اس کی ایک طربیہ تمثیل سٹیج ہونا تھی طبیعت بہت بگڑ چکی تھی احباب مصر رہے تھے کہ آج سٹیج پر نہ جاؤ لیکن وہ ایثار پیشہ شہیدِ فن باز نہ آیا اور جواب دیا کہ پچاس سے زائد جانیں اپنی روزی کے لئے مجھ پر انحصار رکھتی ہیں۔ پارٹ کرتے وقت جو زحمت اٹھانا پڑی اس سے طبیعت اور بھی بدتر ہو گئی لیکن وہ حسن کا پکا کام کرتا چلا گیا۔ یکایک ہوک اٹھی اور وہ بے بس ہو کر رہ گیا۔ ... تماشا بند ہو گیا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر مکان پر لے گئے۔ ...... گھر جاتے ہی اسے زور سے کھانسی آئی۔ اور ایک شریان پھٹ گئی۔ بار بار بلانے پر بھی کوئی پادری نہ پہنچا۔ اور تقریباً اکیاون برس کی عمر میں ۱۷ فروری ۱۶۷۳ء کو ۱۰ اور ۱۱ بجے شب کے درمیان یہ بے نظیر تمثیل نگار و اداکار دنیا کی سٹیج سے رخصت ہو گیا۔ مولیئر نے پندرہ سال کے عرصہ میں تیس طربیہ تمثیلیں لکھیں اور ہر ایک میں خود پارٹ کیا۔

وہ طبعاً کم سخن اور خاموشی پسند تھا۔ اسی لئے جو لوگ اسکی گفتگو میں بھی ڈراموں کی ظرافت چاہتے تھے انہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ فرانس کے مشہور شہر پیزنس میں ایک آرام کرسی بطور یادگار و تبرک رکھی جاتی ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس پر بیٹھ کر مولیئر گھنٹوں لوگوں کی حرکات و سکنات خاموشی سے دیکھتا رہتا تھا۔ مولیئر سوسائٹی میں رکن کی حیثیت

خلیق قریشی۔ بی۔ اے

رُباعی

اعزازِ غمِ عشق کو تسلیم کرو
اس لطفِ خداوندی کی تکریم کرو
میں راہِ محبت میں ہوں یکسر ایثار
اے دوستو! اٹھو مری تعظیم کرو

سید ضمیر جعفری بی۔ اے

روداد یک شب

یہ چاندنی رات، اور یہ جہلم کا کنارا
تاحدِ نظر چاندی کا بہتا ہوا دھارا
گاتے ہوئے پانی پہ یہ کرنوں کے سفینے
اُٹھتی ہوئی موجوں کے دلآویز قرینے
لہروں میں سے رستا ہوا حوروں کا ترنم
پھیلا ہوا دریا پہ فرشتوں کا تبسم
بکھرے ہوئے ہیرے ہیں دمکتے ہوئے پتھر
تاروں کی طرح صاف، چمکتے ہوئے پتھر
یہ ساحلِ خاموش، یہ گاتا ہوا پانی
یہ چاند کی کرنوں میں نہاتا ہوا پانی
مستانہ ہوا، روح کو چھو جاتی ہوئی سی
احساس کے شعلوں کو بھڑکاتی ہوئی سی
خوبانی کی خوشبوؤں سے مہکا ہوا موسم
لچکا ہوا، بہکا ہوا، لہکا ہوا موسم
پیپل کے درختوں میں سے کوئل کی صدائیں
ساون کی یہ مستانہ و مخمور ہوائیں
سانسوں سے ترے ساری فضا مہکی ہوئی سی
بہکی ہوئی باتوں سے ہوا بہکی ہوئی سی
سینے سے مرے یہ ترے لپٹے ہوئے بازو
دل کی مرے دھڑکن، یہ تری آنکھ کے آنسو

سب زیست کے طوفانِ بلا بھول گیا ہوں
واللہ میں اس وقت خدا بھول گیا ہوں

فرانس کے زندہ جاوید رومان نگار
تھیوفائیل گاشیر کا شاہکار

مترجمہ
جناب سید احسان علی شاہ صاحب بی اے

فریبِ تخیّل

عزیز دوست! تمہارا سوال ہے کہ میں نے کبھی محبت کی یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے محبت کی ہے۔ میری محبت کی داستان اس قدر تعجب خیز اور خوفناک ہے کہ میں زندگی کے چھیاسٹھ سال گذارنے کے باوجود اس کی یاد کو کریدنے سے گھبراتا ہوں۔ تمہارے سوال کو خاموشی سے ٹال جانا تو خیر میرے لئے ناممکن ہے لیکن میں اپنی اس بپتا کو کسی کمزور دل و دماغ کے سامنے بھی نہیں رکھ سکتا۔ یہ داستانِ محبت کچھ ایسی تحیّر انگیز ہے کہ اس پر یقین کرتے ہوئے خود مجھے پس و پیش ہوتی ہے تین سال سے زیادہ عرصے تک میں ایک عجیب و غریب شیطانی خواب کے پیچ در پیچ اور تعفن زا راستوں میں بھٹکتا رہا ہوں۔

میں ایک معمولی سے گاؤں کا غریب پادری تھا۔ لیکن میرے خوابوں کی دنیا۔۔۔ خدا کرے کہ وہ خواب ہی ہوں۔۔۔ ایسے رنگین لمحات سے آباد ہوتی۔۔۔ نہیں بلکہ ایسے گناہوں کی دنیا بن جاتی جسکو دیکھ کر جہنم کے شعلے بھی کانپ اٹھیں! اس عورت کے حسن پر ڈالی ہوئی ایک نظر میری روحانی گہرائیوں میں تلاطم برپا کر دیتی۔ آخر خدا کے فضل اور مقدس سینٹ کی مدد سے میں اس خبیث روح کے پنجوں سے بچ نکلا۔ وہ زندگی جو میں دن کے وقت گذارتا ایک مدت تک میری رات کی زندگی سے بالکل مختلف رہی۔ دن کے وقت میں خدائے قدوس کی بارگاہ میں سر جھکانے والا پادری ہوتا۔ سارا سارا دن عبادت اور دوسرے مقدس اشغال میں مصروف رہتا۔ لیکن رات کے وقت پلک سے پلک جھپکاتے ہی میں ایک نوجوان رئیس بنجاتا۔ عورتیں، کتے اور گھوڑے میری زندگی کے عناصر بنجاتے۔ جوا کھیلنا، شراب پینا اور خدا کے خلاف گالیاں بکنا میرا مشغلہ ہوجاتا۔ جب میں صبح کے وقت بستر سے اٹھتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا سو رہا ہوں۔ اور سوتے میں دیکھ رہا ہوں کہ میں پادری ہوں۔ اس مجموعۂ اضداد زندگی کے چند پہلو اور دو چار الفاظ مجھے اب بھی یاد ہیں جن کو میں باوجود ہزار کوشش کے بھی نہیں بھلا سکا

میں سچ کہتا ہوں کہ میں گرجے کی چار دیواری سے ایک منٹ کے لئے بھی باہر نہیں نکلا لیکن میرے اس بیان کو پڑھنے والے سمجھیں گے کہ میں دنیا کے لذائذ سے اکتا کر مذہب کے دامن میں آگیا ہوں میں نے ایک پر آشوب زندگی کے پیہم ہچکولوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے خدا اور خلقِ خدا کی خدمت شروع کر دی ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھ سکے گا۔ کہ میں ایک معمولی پادری ہوں۔ جس کی زندگی کے تمام طوفانی لمحات اس بے رنگ و بے کیف حلقے میں بسر ہوئے ہیں۔ کوئی یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کریگا کہ میری جوانی کی رنگینیاں اسی گھنے جنگل کے وسط میں جو بیرونی دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہے، بڑھاپے کی تلخیوں میں بدل گئیں۔

ہاں! میں نے محبت کی اور محبت بھی ایسی محبت کہ باید و شاید۔۔۔ ایک مجنونانہ اور طوفانی جذبہ۔۔۔ اتنا طوفانی کہ میں خود حیران ہوں کہ کیوں میرا دل پاش پاش نہ ہوگیا؟

آہ کیا راتیں تھیں ..... کتنی عجیب راتیں!

بچپن ہی سے مجھے پادری بننے کی خواہش تھی۔ میرا تمام مطالعہ اسی نصب العین کے مطابق ہوتا۔ چوبیس سال کی عمر تک میری زندگی ایک راہب کی زندگی رہی۔ دینیات کی تعلیم ختم کر لینے کے بعد میں نے بڑی آسانی سے ابتدائی اسناد حاصل کریں اور میری غیر معمولی قابلیت کو دیکھ کر ارباب حل و عقد نے مجھے آخری اور سب سے بڑی سند دیدی۔ میرا اتقا ضرب المثل ہو چکا تھا۔ دنیا میرے لئے ایک مہمل لفظ تھا۔ میرا عہد جوانی مدرسے کی چاردیواری کے اندر ہی محدود رہا۔ دنیا میں عورت ہی ایک ایسی خوفناک چیز تھی۔ جسے میں نے ہمیشہ اپنے اور اپنے خیالات سے دور رکھا۔ میں ایک معصومانہ زندگی بسر کرتا۔ اور سال میں صرف دو دفعہ اپنی بوڑھی ماں سے ملنے جاتا۔ یہی دو موقعے ایسے تھے جنمیں میں بیرونی دنیا کے شور و شر میں داخل ہوتا۔

مجھے تارک الدنیا بننے کا ذرہ برابر افسوس نہ تھا۔ میں آخری اقدام کرنے میں مطلق نہ گھبرایا۔ ایک مسرت اور ایک اضطراب میری رگ رگ میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ میری راتیں عاشق کی ہجر نصیب راتوں سے کہیں زیادہ پریشان کن اور صبر آزما تھیں۔ میں خواب میں بھی یہی دیکھتا کہ میں نماز پڑھوا رہا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ پادری بننے سے زیادہ خوشی اور کسی بات میں ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں تک کہ بادشاہت اور شاعری کو بھی اس کے مقابلے میں ٹھکرا سکتا تھا۔ یقین کرو میں اس سے زیادہ بلندی کا وہم بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ان واقعات کا اظہار میں نے محض اس غرض سے کیا ہے۔ کہ تم کو سمجھا دوں کہ زندگی میں آنے والے واقعات کس حد تک غیر فطری تھے۔ اور میں ایسے خوفناک جادو کے شکنجے میں جکڑ لیا گیا تھا جس سے چھٹکارا ممکن ہی نہیں۔!

آخر وہ دن بھی طلوع ہوا جس دن مجھے پادری بننا تھا.....

.... میں اپنے آپکو فرشتہ سمجھ رہا تھا۔ اور اپنے ساتھیو کے متین اور افکار زدہ چہروں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے تمام رات عبادت میں گذاری تھی۔ اور اس وقت مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسقف خدا ہے۔ جو اپنی کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ اور باغ جنت اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ گرجے کے محراب میں سمٹ آیا ہے۔

آپ اُن رسوم سے واقف ہی ہیں۔ ہر دو طریقوں سے برکت اور منشاء ربانی تو مریدوں کے تیل سے مساح اور اسقف سے تخلیہ غرض یہ رسمیں ادا ہو رہی تھیں۔

آہ! جناب یعقوب کا وہ قول کہ بے وقوف وہ ہے جسکی نگاہیں اس کے اختیار میں نہ ہوں۔ کسقدر صحیح ہے! میں نے اتفاقاً اپنا چہرہ کا ہو اُمر اٹھایا اور اُسے اپنے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اُسے چھو سکتا ہوں ..... باوجودیکہ وہ مدرسے کی سیڑھیوں سے پرے کھڑی تھی۔ ایک دلربا عورت شاہانہ لباس میں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دفعۃً میری آنکھوں پرسے کہر کا بادل سا ہٹ گیا ہے۔ مجھے اس وقت یہ تلخ احساس ہوا کہ میں اس سے قبل اندھا تھا۔ اور میری بصارت اب عود کر آئی ہے۔ وہ اسقف جو چند منٹ پیشتر جمال و سطوت کا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ دفعۃً معمولی انسان نظر آنے لگا۔ مقدس شمعیں طلوع مہر کی تابناک وسعتوں میں ڈوبتے ہوئے ستاروں کی طرح دھندلی پڑ گئیں۔ اور طویل و عریض گرجے کی منور فضا پر تاریکی مسلط ہو گئی۔ وہ عورت گناہ کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک معصوم اور حسین فرشتے کی طرح ظاہر ہوتی۔ وہ خود تابناک دکھائی دیتی تھی۔ اور تاریکی کے جگر کو کاٹ ڈالنے والی شعاعیں اس کی حسین آنکھوں اور نازک ہونٹوں سے نکل رہی ہیں۔

میں نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ دوبارہ ادھر نہ دیکھونگا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ بیرونی چیزیں میری روح کو اپنے پنجوں میں جکڑ رہی ہیں۔ میرے دل کی گہرائیوں میں طوفان سا برپا ہو گیا تھا جو دمبدم بڑھ رہا تھا پھیل رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے یہ بھی خبر نہ رہی کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر میں اسے پھر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے چہرے سے نور کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ حسن کا ایک ایسا سورج ہے جس کے پُر نور چہرے پر شفق کی رنگینیاں قربان ہو رہی ہیں۔

وہ عکس قدر خوبصورت تھی۔ اور وہ چابک دست مصور جس نے مینڈونا کی تصویر میں جنت کی دلفریب رنگینیوں کو مستور کر دیا تھا۔ اس پیکرِ حسن کا وہم بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جو میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ شاعر کا فلک پیما تخیل اور مصور کا یوسف نگار موقلم اس حسن کی گرد راہ کو بھی نہیں پا سکتا تھا۔ وہ سروقد تھی۔ اور دیوی کی طرح باوقار! اس کے سنہرے رنگ کے ملائم بال دو حصوں میں منقسم تھے۔ اور سیال سونے کی دو لہراتی ہوئی ندیوں کی طرح اس کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ وہ پرستان کی ملکہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سنہری مائل سفید پیشانی کی پُرسکون وسعتیں اس کی غیر معمولی سیاہ بھنوؤں کی محرابوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ان خوبصورت بھنوؤں کی سیاہی اس کی آنکھوں کی گہری نیلاہٹ کے ساتھ نہایت ہی دلکش تضاد پیدا کر رہی تھی۔ کیا آنکھیں تھیں وہ! ان آنکھوں کی ایک نظر تقدیر کو بنا بھی سکتی تھی۔ اور بگاڑ بھی۔ انہیں ایک ایسی زندگی۔ ایسی چمک۔ ایسا اضطراب ....

اور ایسا قدر رقص کر رہا تھا جو میں نے کسی انسانی آنکھ میں آج تک نہیں دیکھا! ان میں سے برقی شعاعیں تیروں کی طرح نکل رہی تھیں اور میں دیکھ رہا تھا کہ یہ تیر ــــ میرے سینے میں ڈوبتے جا رہے ہیں! میں نہیں جانتا کہ وہ آگ جو ان آنکھوں میں تڑپ رہی تھی جنت سے مستعار لی گئی تھی یا دوزخ سے لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسی آگ اس خاک کی دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ وہ عورت یا تو فرشتہ تھی یا شیطان یا شاید دونوں کا امتزاج۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے لعل پاش باریک ہونٹوں کے اندر سے موتیوں جیسے چمکدار دانت برق افگنی کرتے ہوئے نظر آتے۔ اور اس کے ریشم جیسے ملائم اور سیب جیسے سرخ گالوں میں چھوٹے چھوٹے نہایت دلآویز گڑھے پڑ جاتے۔ اس کی ستواں ناک سے جس پر خسروانہ غرور و نزاکت تھی۔ خاندانی علویت مترشح تھی۔ اس کے نیم عریاں کندھوں کی۔ مرو نازک کھال پر قندیلوں کی شعاعوں کا عکس کانپ رہا تھا۔ بڑے موتیوں کی مالا جو اس کی گردن کی طرح خوبصورت تھی۔ اس کے سینے پر لٹکی ہوئی تھی۔ جب وہ سہمی ہوئی ناگن یا ڈری ہوئی ہرنی کی طرح ......

.. اپنی گردن اٹھاتی تو لیس کے گلوبند میں چاندی کی جالی کی طرح اس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ ایک لطیف سی حرکت پیدا ہو جاتی۔

اس نے نارنجی رنگ کے مخملیں کپڑے پہن رکھے تھے۔ کرتے کی آستینوں کے کنارے پر لیس لگی ہوئی تھی۔ اور ان آستینوں میں سے اس کے مدہوں جیسے نازک ہاتھ جھانک رہے تھے۔ وہ ہاتھ اس قدر شفاف تھے کہ زہرہ سحر کی انگلیوں کی طرح شعاعیں ان میں سے ہو کر گذر جاتی تھیں۔ یہ تمام چیزیں مجھے اس طرح یاد ہیں گویا میں نے انہیں کل ہی دیکھا ہے۔ باوجودیکہ ان مشاہدات نے اس وقت مجھے انتہائی روحانی کرب میں مبتلا کر دیا تھا تاہم میری نظروں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ سب کچھ! عکس کا خفیف سے خفیف پہلو۔ ٹھوڑی کے سرے پر چھوٹا سا سیاہ نکتہ ہونٹوں کے گوشوں کا خفیف ترین جھکاؤ۔ کچھ ریشم جیسی نرم بھنویں گالوں پر لمبی لمبی پلکوں سے کانپتے ہوئے سائے میں نے ان تمام چیزوں کو دیکھا۔ اور خود حیران ہوں کہ ان جزئیات کو ایک ایک کر کے دیکھ لینے کی حیرت خیز قوت مجھ میں کہاں سے آگئی تھی۔

اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے دل کے وہ دروازے جو ابھی تک بند تھے۔ یکدم کشادہ ہو گئے ہیں۔ ترقی کی وہ راہیں جو ابھی تک مسدود رہی تھیں کھل گئی ہیں۔ اور زندگی نے بالکل نیا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جس سے میں ابھی تک ناواقف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک نئی دنیا میں آگیا ہوں جس کا نظام پہلی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ ایک عجیب اور ہولناک غم میرے دل میں دہکتی ہوئی سلاخیں گھونپنے لگا۔ زندگی کا ہر لمحہ بیک وقت سیکنڈ کی سی سرعت اور صدی کی سی طوالت لئے ہوئے معلوم ہونے لگا۔ جس کے لئے میں نے اپنی زندگی کے چوبیس سال ضائع کئے تھے بہت پرے ہٹ گیا۔ میری تمام قوتیں اُن الفاظ کی مخالفت کر رہی تھیں، جو میں سلسلے اپنے ضمیر کے خلاف کہے۔ پھر میں نے اس جگہ

ـــــ (اُس دنیا سے)

ہاں کہہ دی۔ جہاں نہیں کہنا چاہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی غیبی قوت نے مجھے ان الفاظ کو ادا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ شاید یہی قوت لڑکی سے بھی اس خاوند کے لئے قبولیت کے الفاظ کہلوا دیتی ہے۔ جس سے شادی کرنے سے انکار کرنے کے لئے وہ مصمم ارادہ کر کے قربانگاہ کے سامنے آتی ہے۔ اور یقیناً یہی وہ طاقت ہے جو راہبوں کو اُس وقت نقاب اوڑھنے اور بیعت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب وہ اُسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ بے تعداد حاضرین میں اپنی بدنامی کروانے کی کون جرأت کر سکتا ہے۔ اور کون پتھر کے دل گردے والا ایسا ہے جو ہزاروں آدمیوں کا منہ چڑانے کی جسارت کر سکے؟ تمام حاضرین کی نگاہیں اور ارادے آہنی زنجیروں کی طرح تمہارے خیالات کو جکڑے ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھکر اسکا انتظام ایسا مکمل ہوتا ہے اور حالات کو پیش از وقت ایسے عمدہ طریقے سے ترتیب دیا جاتا ہے کہ انسان کے تمام ارادے اُن کی رو میں بہ جاتے ہیں۔

جیسے جیسے رسوم کی ادائیگی ہوتی گئی۔ ویسے ویسے اُس نامعلوم حسینہ کے چہرے کے تاثرات بدلتے گئے۔ پہلے پہل اس کی نگاہوں سے محبت جھلکتی نظر آتی تھی۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پشیمانی اور کوفت اس کے چہرے پر مرتسم ہوگئی ہے۔ گویا اس کی نگاہیں اس کے قلبی حالات کی آئینہ داری کرنے میں ناکام نہیں رہی تھیں۔

پہاڑ تک کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے والے ارادے سے میں نے پکارنا چاہا کہ میں پادری نہ بنوں گا لیکن میری آواز میرے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں گنگ ہوگیا ہوں میں نے محسوس کیا کہ انکار کا ایک لفظ بول کر اپنے جذبات کا اظہار کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ باوجودیکہ میں بیدار تھا تاہم مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک خوفناک خواب دیکھ رہا ہوں۔ اور مجھ میں اتنی قوت نہیں۔ کہ ایک ایسا لفظ بول سکوں جس پر میری زندگی کا دار و مدار ہے۔

اس کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے اس کرب سے واقف ہے۔ میری ہمت بندھانے کے لئے اس نے میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں پیمانِ وفا جھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مجسم شعر تھیں اور اُس کی ہر نظر ایک پیارا گیت!

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔

"اگر تم میرے بن جاؤ تو میں تمہیں جنت پر حکمرانی کرنے والے خدا سے زیادہ مسرور بنا دوں گی۔ فرشتے تم سے حسد کرنے لگیں گے اس کفن نما چغے کی دھجیاں بکھیر دو جسکو تم پہننا چاہتے ہو میں حسن ہوں! میں جوانی ہوں! میں زندگی ہوں۔ میری طرف آؤ۔ ہم دونوں ایک دوسرے میں کھو جائیں گے اور عشق بنجائیں گے۔ کیا یسوع تمہیں یہ سب چیزیں دے سکتا ہے؟ ہماری زندگی خواب کی طرح حسین ہو جائے گی۔ ایک طویل بوسے کی طرح دلکش۔

مقدس کٹورے میں بھری ہوئی شراب پھینک دو۔ پھر تم آزاد ہو جاؤ گے میں تمہیں نامعلوم جزیروں میں لے چلوں گی۔ تم خود رو پھولوں کے فرش پر آسمان کے نقرئی چتر کے سائے میں میرے سینے پر سر رکھ کر سو جاؤ گے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اس لئے میں تمہیں تمہارے اُس خدا سے بہت دور لے جاؤں گی جس کے سامنے ہزاروں قلوب محبت کے ترانے گاتے ہیں لیکن یہ ترانے اُسکے کانوں تک پہنچتے پہنچتے ایک ناقابلِ شنید سسکی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔"

یہ الفاظ لطیف خوشبوؤں کے پروں پر اڑتے ہوئے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں سچ مچ بولتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور وہ الفاظ جو اس کی آنکھوں نے ادا کئے میرے دل کی گہرائیوں میں گونج اُٹھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ الفاظ اُسکے ہونٹوں میں سے نکل رہے ہیں۔ میں خدا تک کو چھوڑ دینے پر تیار ہوگیا لیکن پھر بھی میری زبان نے اُن تمام رسوم کو ادا کر دیا۔ جنکا ادا کیا جانا!! تھا۔ اُس حسینہ نے پھر میری طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں یاس اور آرزو کا ایک جہان مچلتا ہوا نظر آتا تھا۔ ان نگاہوں نے میرے دل میں بھالے گاڑ دیئے اور میں ایسا محسوس کرنے لگا

کہ میرا سینہ مقدس مریم کے سینے سے کہیں زیادہ زخم خوردہ ہے۔

سب کچھ فنا ہو گیا۔ میں پادری بنا دیا گیا۔

میں نے آج تک روحانی کوفت کے اتنے گہرے نقوش اور کسی انسانی چہرے پر نہیں دیکھے۔ اپنے محبوب کے جنازے کو دیکھنے والا عاشق، اپنے مردہ بچے پر جھکی ہوئی ماں، بہشت کے دروازے پر پہنچی ہوئی حوا، اپنے بیش قیمت جواہرات کی جگہ پتھر کا ٹکڑا دیکھنے والا کنجوس، اپنا مسودہ جلا ڈالنے والا شاعر اس قدر رنجیدہ نظر نہیں آسکتا جتنی وہ نظر آرہی تھی۔ اسکے چہرے کی سرخی مفقود ہو چکی تھی اور وہ سنگ مرمر سے بھی زیادہ سفید نظر آتی تھی۔ اس کی خوبصورت سڈول بانہیں بیجان ہو کر لٹکنے لگیں گویا دفعتہً اس کے پٹھوں کی قوت سلب کر لی گئی ہے اور اس کے تھکے ہوئے اعضا اتنے سست ہو گئے کہ اسے کھڑا ہونے کے لئے ستون کا سہارا لینا پڑا۔ میں مردوں کی طرح بے جان قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا گرجے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرات چمکنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی غیرمرئی ہاتھ میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔ گرجے کی محرابیں میرے اوپر گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارے جہان کا بوجھ میرے سر پر آپڑا ہے۔

جب میں ڈیوڑھی میں سے گذرنے لگا تو میرا ہاتھ ایک نرم و نازک ہاتھ نے اپنی انگلیوں میں دبا لیا ۔ ۔ ۔ ایک عورت کی انگلیوں میں ۔ ۔ ۔ میں نے آج تک عورت کے ہاتھوں کو نہیں چھوا تھا۔ وہ ناگن کی کھال کی طرح سرد تھا پھر بھی اس کے نشانات میری کلائیوں پر قائم ہو گئے۔ ان نشانات میں ایسی جلن تھی گویا جلتی ہوئی سلاخوں سے داغ دیئے گئے ہیں۔ یہ وہی تھی۔ "بدنصیب دوست! یہ تم نے کیا کیا؟" اس نے آہستہ سے کہا اور ہجوم میں غائب ہو گئی۔

بوڑھا اسقف میرے قریب سے گذرا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک   ترش اور متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ میرے چہرے پر دہشت مرتسم تھی۔ میں پہلے شرم سے سرخ ہو گیا۔ اور پھر زرد پڑ گیا۔ چکا چوند پیدا کر دینے والی روشنی کے دھبے میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ ایک دوست نے میری اس حالت پر رحم کھایا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا۔ میں کسی کی مدد کے بغیر اپنے حجرے میں جانے کے ناقابل تھا۔ جب ہم سڑک کی نکڑ پر پہنچے تو نوجوان پادری جو میرے ساتھ تھا اتفاقاً دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت ایک حبشن لونڈی جو نہایت خوبصورت اور قیمتی لباس میں ملبوس تھی۔ میرے قریب آئی اس نے ایک چھوٹی سی کاپی جس پر سنہرے رنگ کا حاشیہ بنا ہوا تھا میرے ہاتھ میں دیدی اور اشارے سے اُسے چھپا لینے کو کہا۔ میں نے اُس کاپی کو اپنی آستین میں چھپا لیا۔ حجرے کے تخلیے میں میں نے اُس کاپی کو کھولا۔ اس میں صرف دو ورق تھے۔ جن میں لکھا تھا۔

"کلیریمونڈے۔ کولیسنی پیلیس"

اُس وقت میں بیرونی دنیا سے اتنا ناواقف تھا کہ کلیریمونڈے کی بے پایاں شہرت کے باوجود اس کا نام نہ جانتا تھا۔ اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ کولیسنی پیلیس کہاں واقع ہے۔ میں نے بہت سی خیال آرائیاں کیں اور جیسا کہ ظاہر ہے یہ خیال پہلے خیال سے زیادہ بے معنی اور مہمل تھا۔ خدا لگتی یہ ہے کہ مجھے اس کے درباری ہونے یا اعلیٰ عہدے سے کوئی سروکار نہ تھا میں اُسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔

میری محبت اگرچہ چند گھنٹوں ہی میں پروان چڑھی تھی لیکن یہ اتنی قوی ہو گئی تھی کہ اگر زمانہ ہزاروں سال سرپٹختا رہے پھر بھی اسے کمزور نہ کر سکے۔ مجھے اس کی استقامت پر اتنا پختہ یقین تھا۔ کہ میں کلیریمونڈے کو بھولنے کا وہم بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا۔ وہ عورت میرے دل و دماغ کے ہر ذرّے پر محیط ہو چکی تھی۔ اس کی ایک نگاہ نے میری فطرت تک کو بدل ڈالا تھا۔ میری انفرادیت اس کی ہمہ گیر شگفتگی میں تحلیل ہوئی جاتی تھی۔ میں محض اس کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس طوفان خیز محبت نے مجھے بہت سی بداعتدالیاں کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں اپنی کلائی کے اس حصے پر جس پر اس نے اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑے تھے۔ بوسوں کی بارش کرتا۔ اور

گھنٹوں ۔۔ اس کے نام کی مالا جپا کرتا۔ میں آنکھیں بند کر کے اُسے صاف دیکھ سکتا تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ وہ ہر وقت اور ہر جگہ میری میرے قریب موجود رہتی ہے۔ وہ الفاظ جو اُس نے گرجے میں کہے تھے بار بار میرے کانوں میں گونج اُٹھتے "بدقسمت دوست یہ تم نے کیا کیا؟" ہوا کی ہر حرکت مجھے یہی کہتی ہوئی معلوم ہوتی۔ آخر میں سمجھ گیا کہ میری موجودہ زندگی محبت کے لئے زہر قاتل ہے . . . ایک ایسی رکاوٹ ہے جس کو دور کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ پادری بننے کے یہ معنی تھے کہ میں مجبور رہوں جنسی تعلق کو بھول جاؤں حسن سے خواہ وہ کسی چیز میں ہو نفرت کروں۔ اپنی آنکھیں اپنے ہاتھوں سے پھوڑ لوں۔ دنیا کی نظروں سے پرے کسی گرجے کے تہ خانے کی مغلوج کن سردی میں زندگی بسر کر دوں۔ مردوں کے سوا کسی کو ملنے نہ جاؤں غیر مانوس لاشوں کی حفاظت کروں۔ اور تمام عمر کے لئے سیاہ رنگ کا ماتمی جبہ پہنے رہوں تاکہ میرا لباس ہی میرا کفن بن جائے۔

زندگی کی شادابیاں زمین کے نیچے بہنے والی جھیل کی طرح پھیلنے اور چھلکنے لگیں۔ تازہ خون میری رگ رگ میں موجیں مارنے لگا۔ جوانی کے جذبات جو مدت سے تجرد و زہد کے سنگِ گراں تلے دبے پڑے تھے۔ دفعتہً تمام رکاوٹوں کو توڑ کر میرے جسم کے روئیں روئیں پر چھا گئے۔

میں کلیر مونڈے کو ایک دفعہ اور دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کس طرح؟ میں کسی کو شہر میں جانتا تک نہ تھا۔ اس لئے حجرے سے باہر جانے کا بہانہ بھی کوئی نہ تھا۔ صرف یہی ایک رکاوٹ نہ تھی۔ بلکہ میں بہت جلد پادری بن کر کسی دوسرے گاؤں میں جانے کو تھا۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا۔ کہ حجرے کی دیوار کا روزن نظر آیا۔ اگر اس کی سلاخیں موڑ دی جائیں تو میں اس میں سے نکل سکتا تھا۔ لیکن یہ کام بہت ہی مشکل تھا۔ یہ روزن اس قدر بلندی پر واقع ہوا تھا کہ سیڑھی کے بغیر وہاں تک پہنچنا ناممکن تھا۔ اس سے بڑھکر اس عمل کے لئے موزوں ترین وقت رات ہی ہو سکتا تھا۔ اور اگر بفرضِ محال میں کھڑکی میں سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو بھی شہر کی پیچ در پیچ گلیوں کی بھول بھلیاں میں سے گذر کر اُس جگہ کو ڈھونڈ لینا مشکل تھا۔ یہ تمام مشکلات ایک تجربہ کار انسان کے لئے حقیقتاً بالکل معمولی تھیں لیکن ایک تارک الدنیا شخص جس کی محبت چند گھنٹوں ہی کی ہو اور جس کے پاس نہ روپیہ ہو نہ عمدہ لباس۔ اس پہاڑ کو کیسے کاٹ سکتا تھا۔

"آہ!" میں نے اپنی بیچارگی کے احساس سے پریشان ہو کر چلا کر کہا "اگر میں پادری نہ ہوتا تو میں اُسے ہر روز دیکھ سکتا تھا میں اس کا عاشق کہلاتا۔ اس قابلِ نفرت جبہ کی جگہ ریشم اور مخمل کے کپڑے پہنتا۔ دوسرے جوانوں کی طرح سونے کے باریک باریک تار چمکتی ہوئی تلوار اور ٹوپی میں لگانے والے حسین پروں سے اپنے جسم کو سجاتا۔ میرے بال اس ذلت آمیز گول ٹوپی کے نیچے دبے رہنے کی بجائے گھنگریالے پٹے بنکر میرے کندھوں پر بکھرے ہوتے۔ میری مونچھیں تنی ہوتیں اور میں نواب کہلاتا" لیکن قربانگاہ کے سامنے گذرا ہوا ایک گھنٹہ اور سرعت سے گنگناتے ہوئے چند لفظ میری دنیا کو تباہ کر دینے کے لئے کافی تھے۔ میں نے اپنے جذبات کی قبر تیار کر لی تھی۔ میں نے خود اپنے لئے قید خانہ بنا لیا تھا۔

میں کھڑکی کی طرف گیا۔ آسمان کا شفاف نیلا رنگ کس قدر دلکش تھا۔ درخت بہار کے سرسبز چغوں میں ملبوس تھے۔ قدرت کا ذرہ ذرہ طنز آمیز مسرت میں ناچتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ دنیا لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ کوئی جا رہا تھا اور کوئی آ رہا تھا۔ نوجوان اپنے حسین معشوقوں کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے باغوں کی روشوں اور درختوں کے جھنڈوں میں کلیلیں کرتے پھر رہے تھے۔ مسرور جوان شراب کی کلفت زدہ آواز میں عشقیہ شعر گا رہے تھے . . . یہ تصویر تھی انتہائی مسرت چھلکتی ہوئی زندگی اور مچلتی ہوئی خوشیوں کی!

یہ تصویر میری دلشکن تنہائی اور یاس انگیز مجبوری کا کس قدر

بھیانک مجموعہ تھی اور دروازے کی سیڑھیوں پر نوعمر ماں اپنے حسین بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ وہ اس کے چھوٹے سے گلابی گال کو چومتی ہے اور اُسے بہلانے کے لئے ایسی عجیب و غریب حرکتیں کرتی ہے جو ایک ماں کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ باپ وہ کھڑا اس جنت کا نظارہ کر رہا ہے اور اپنے بازوؤں کو اپنے سینے سے اس طرح بھینچ رہا ہے گویا وہ اس مسرت کو سینے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لینا چاہتا ہے۔ میرا حاسد دل اس نظارے کی تاب نہ لا سکا خوفناک حسد و عناد کی آگ دل کی گہرائیوں میں بھڑک اٹھی۔ میں نے بستر کی چادر کو اپنی انگلیوں میں بھینچ لیا۔ اور کئی دنوں سے بھوکے چیتے کی طرح اُسے ملنے لگا۔

میں نہیں جانتا کہ کتنی دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ البتہ کی چادر ابھی میری انگلیوں ہی میں تھی کہ میری نگاہیں دفعتہً سامنے کے اسقف کی طرف کھنچ گئیں۔ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"میرے دوست رونالڈ! کوئی شیطانی قوت تمہاری روح کو پچھاڑے دیتی ہے۔" اسقف نے چند منٹ کی خموشی کے بعد کہا۔ "تمہارا طرزِ عمل کچھ نرالا سا ہوتا جا رہا ہے۔ تم . . . . . جو ہمیشہ اس قدر خاموش، پاکیزہ اور متین رہتے تھے . . . اپنے حجرے میں ایک وحشی درندے کی طرح پیچ و تاب کھا رہے ہو۔ دیکھتا ہوں شیطان کی انگلیوں پر ست ناچتا شیطان یہ دیکھ کر کہ تم نے اپنی زندگی کو خدمتِ خدا کے لئے وقف کر دیا ہے۔ مارے غصے کے دیوانہ ہوا جاتا ہے۔ وہ ایک خونخوار بھیڑیئے کی طرح تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے اور اس تاک میں ہے کہ جب بھی موقع آئے تمہیں گمراہ کر دے۔ اس کے پنجے میں پھنس کر برباد ہو جانے کی بجائے تمہیں چاہیئے کہ عبادت اور روزوں کی مدد سے اس کا مقابلہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس پر فتح پانے میں کامیاب ہو جاؤ گے نیک صفات کی اصل حقیقت بدیوں کے مقابلے ہی میں ظاہر ہوا کرتی ہے۔ سونا کٹھالی کی سختیوں کو برداشت کر کے ہی کندن ہوتا ہے۔ ڈر و نہیں! کبھی مت گھبراؤ! غرور اور خودی کی زنجیروں سے آزاد لوگ بھی اس پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ عبادت کرو۔ روزے رکھو۔ شیطان کا جادو تم پر نہ چل سکیگا۔"

ان الفاظ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میں کن الجھنوں میں گرفتار ہوں۔ اس علم سے قدرے سکون بھی حاصل ہوا۔ "میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں۔" اسقف نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کہ تمہیں حلقہ . . . . . کا پادری مقرر کیا گیا ہے اس حلقے کا پہلا پادری مر گیا تھا۔ اور اسقفِ اعظم کا ارشاد ہے کہ تمہیں جلد سے جلد اس حلقے میں پہنچا دیا جائے۔ لہٰذا تیاری کر و تمہیں کل کوچ کرنا ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور اسقف چلا گیا۔ میں نے کتاب مقدس کھولی اور دعائیں پڑھنے لگا۔ لیکن الفاظ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر بے معنی گچھوں کی صورت میں میری آنکھوں تلے ناچنے لگے۔ کتاب کے خیالات مہمل معلوم ہوتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ کتاب مقدس میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔

اسے ایک دفعہ دیکھے بغیر چلے جانا۔ ہزاروں رکاوٹوں میں ایک اور کا اضافہ کر لینا اور اس سے ملنے کی امید کو ہمیشہ کے لئے کھو دینا بے حد آزار دہ تھا کسی معجز اثر قوت کی مدد کے بغیر اس سے ملنا ناممکن تھا۔ اس کو خط لکھنا بھی تو ناممکن تھا۔ میں اپنے مکتوبات کس کے ہاتھ اس کے پاس پہنچاتا۔ مقدس پادری ہونے کی حیثیت سے میں کس کے سامنے اپنے دل کا راز کھول سکتا تھا؟ کس کو ہمراز بنا سکتا تھا؟ یہی پریشان افکار تھے۔ جن سے میرا دل کٹا جاتا تھا۔

پھر دفعتہً اسقف کے الفاظ میرے کانوں میں گونج اٹھے "شیطان طرح طرح کے بھیس بدلکر انسانوں کو اپنے دام فریب میں پھنسا لیتا ہے" کلیرمونڈے کا فقید المثال حسن۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں۔ اس کی نازک انگلیوں کی آتشیں گرفت۔ دل میں اچانک پیدا ہونیوالا ناقابل برداشت درد۔ اور وہ فوری تبدیلی جسنے آن کی آن میں میری تمام

معصومیت کو فنا کر دیا تھا . . . یہ اور دوسری چیزیں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ یہ سب شیطانی کام ہیں - اور شاید اس کے خون آشام پنجے اُن نرم و نازک خوبصورت ہاتھوں میں چھپے ہوئے ہیں ان خیالات نے میرے دل میں خوف و ہراس کا طوفان برپا کر دیا - اور میں پھر کتابِ مقدس اٹھا کر عبادت میں مشغول ہو گیا۔

دوسرے دن صبح کاذب کے وقت اسقف مجھے لینے کو آیا۔ دو خچریں جو ہمارے سیاہ لبادوں کو دیکھ کر سہم گئی تھیں اور کنوتیاں اٹھائے کھڑی تھیں - اسقف ایک خچر پر سوار ہو گیا اور میں دوسری پر -

بازار سے گذرتے وقت میں کھڑکیوں اور روشندانوں کو اس امید سے دیکھتا رہا کہ شاید کلیر یمونڈے کہیں کھڑی ہو اور میں اسے ایک نظر دیکھ سکوں - میری نگاہیں اُن محلوں کے روشندانوں اور کھڑکیوں پر کھچے ہوئے پردوں کو چیر کر ان کے اندر چھپے ہوئے حسن کو دیکھنے کی بے سود کوشش کر رہی تھیں - اسقف نے خچروں کی رفتار کو دھیما کر دیا شاید وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ میں عمارات کو فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھ کر ان کی تعریف کر رہا ہوں - آخر ہم شہر کے دروازے میں سے گذر گئے - اور پہاڑی پر چڑھنے لگے - جب ہم اس کی چوٹی پر پہنچ گئے تو میں نے مڑ کر اُس شہر کی طرف پھر دیکھا جس کی آغوش میں میری کلیر یمونڈے زندگی کی شاداب گھڑیاں گذار رہی تھی - سارے شہر پر گہرا بادل چھایا تھا مکانوں کی چھتوں کے متضاد نیلے اور سرخ رنگ ایک دوسرے میں مخلوط ہو کر دھندلے سے رنگ میں تبدیل ہو گئے - اس دھندلکے کے درمیان ابھی ابھی جلی ہوئی آگ کا دھواں ادھر اُدھر اُڑتا پھرتا تھا - ان مکانوں میں سے ایک پُرتکلف حویلی جو دوسرے مکانوں اور محلوں سے کہیں زیادہ بلند اور پُرشکوہ معلوم ہوتی تھی - سورج کی پہلی کرن میں نہائی ہوئی تھی اور شہر کی دیگر عمارات سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی - اسے بصارت کی کرشمہ سازیاں کہئے کہ یہ حویلی مجھ سے ایک فرسخ دور ہونے کے باوجود اتنی قریب نظر آ رہی تھی کہ اس کا ہر پہلو صاف دکھائی دے رہا تھا . . . چھوٹے چھوٹے گنبد متعدد برجوں کی چھوٹی بڑی چھتیں صاف نظر آ رہی تھیں - صرف یہی نہیں بلکہ مرغِ بادنما کی خفیف سے خفیف حرکت صاف دکھائی دے رہی تھی -

" وہ کس کا محل ہے - وہ جس پر دھوپ پڑ رہی ہے " میں نے اسقف سے پوچھا - اسقف نے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں پر سایہ کر کے اور اس جگہ کو دیکھ کر کہا " وہ ؟ ہاں وہ پرانا محل ہے جو شہزادہ کونسینو نے امیر کلیر یمونڈے کو بخشا تھا - عجیب عجیب خوفناک باتیں ہوتی ہیں - وہاں " اُس وقت میں نے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے مرمریں جسم کو گذرتے دیکھا جو ایک لمحے کے لئے ظاہر ہوا اور پھر فوراً ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا - میں نہیں جانتا کہ یہ حقیقت تھی یا میرے وہم کی پیدائش ! لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ کلیر یمونڈے ہی تھی -

آہ ! کیا وہ جانتی تھی کہ میں اسی وقت ایک مضطرب اور بیقرار دل کو پہلو میں دبائے اُس منحوس سڑک کی بلندیوں پر کھڑا . . . جو مجھے اس سے جدا کر رہی تھی - اور آہ ! جس سے اتر جانے کے بعد واپس آنا میرے لئے ناممکن تھا . . . . اس عظیم الشان محل کو دیکھ رہا ہوں جس میں وہ رہتی ہے - اور جسے ایک طنز آمیز کرن نے مجھ سے اتنا قریب کر دیا تھا گویا وہ مجھے اس محل کے مالک کی حیثیت سے اس کے پُرشکوہ دروازوں میں داخل ہونے کی دعوت دے رہی ہے ! وہ یقیناً اس سے واقف تھی - اس کی محبت اُس سطح پر آ چکی تھی - جس پر ایک محبت کرنے والا دل دوسرے دل کے جذبات کی لطیف سے لطیف سنسنی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا مجھے یقین ہی نہیں بلکہ میرا ایمان ہے کہ اسی جذبے نے اسے اس شدت کی سردی میں نائٹ گاون پہنے اس بلند چھت پر لا کھڑا کیا تھا۔

اس محل پر بھی ابر کا سایہ چھا گیا اور منظر چھتوں اور چمنیوں کے ایک ساکت و جامد سمندر میں تبدیل ہو گیا جس کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی کی مغرور چوٹی صاف نظر آ رہی تھی ٭

(باقی آئندہ)

محترمہ گوہر اقبال تور میرٹھی

فسانۂ زندگی کا ایک المناک باب (۱)

تم آکے قبر پہ میری بہاؤ گے آنسو
بجائے غنچہ و گل کے چڑھاؤ گے آنسو

یہ جذبِ عشق پسِ مرگ رنگ لائے گا
تمہارے دل کو نہ ہونا مرا ستائیگا

نویدِ الفتِ دیرینہ تم کو چھیڑے گی
امیدِ عشرتِ دوشینہ تم کو چھیڑے گی

مری جوان محبت کے غم کا افسانہ
تمہیں سنائے گا رو رو کے دل کا ویرانہ

وہ بے رخی، وہ تغافل وہ عربدہ کوشی
ستائیگی تمہیں یاد آکے اپنی بے مہری

مگر یہ قلب جو خاموش ہو چکا ہو گا
کبھی نہ جاگ سکے ایسا سو چکا ہو گا

نہ پھر صدائے محبت ہی کارگر ہو گی
نہ میری شام کی پیدا کبھی سحر ہو گی

اگر ہو موت کا میری ملال کیا حاصل؟
جفاؤں پر ہو تمہیں انفعال کیا حاصل؟

تمہارے اشک بہانے سے جی اٹھونگی کیا؟
تمہارے پھول چڑھانے سے جی اٹھونگی کیا؟

یہ مانا قبر پہ تم شمع بھی جلا دو گے
تو اس سے کیا مرے دل کو بھی جگمگا دو گے؟

وہ دل جو ٹوٹ کر اب غم سے پارہ پارہ ہے
وہ دل جو یاس سے تاریک تار رہتا ہے

وہ دل کہ جس میں تھیں شمعیں امید کی روشن
وہی یہ دل ہے کہ ہے حسرتوں کا اک مدفن

نہ اس مزار پہ کوئی چراغ جلتا ہے!
نہ اس تباہی پہ شبنم کا دل پگھلتا ہے!

قرار کی تھی دعا، قلبِ بے قرار ملا　　سکونِ دل کی تمنا تھی انتشار ملا

. . . .

اگر ہے مجھ سے محبت تو جیتے جی آؤ　　بھڑک رہے ہیں جو شعلے انہیں بجھا جاؤ
پس وفات ہوا بھی تمہیں ملال تو کیا　　ہوا جو میری محبت کا پھر خیال تو کیا؟
پھر اس سے روح کو حاصل نہ ہوگا کوئی قرار　　حجابِ خاک میں واپس نہ آئیگا یہ شرار
ہے آدمی کی یہ ہستی مثالِ موجِ صبا　　گذر گیا ہے جو جھونکا وہ بس گذر ہی گیا
ہوا کا جھونکا گذر جائے پھر کب آتا ہے　　فنا کدے ہیں جو مر جائے پھر کب آتا ہے
حصولِ عشق کی حسرت مجھے مٹائیگی　　تڑپ تڑپ کے مری جانِ زار جائیگی
بس ایک موت مٹا دیگی کشمکش ساری　　کچھ ایسی نیند کا نشہ رہیگا پھر طاری
نہ پھر میں جاگ سکونگی کبھی جگانے سے　　اٹھا سکو گے نہ مجھکو کسی بہانے سے
نہ سن سکوں گی تمہاری نہ کچھ سناؤنگی　　نہ پھر زباں پہ کوئی حرفِ شکوہ لاؤنگی
مگر ہے دل میں فقط ایک آرزو باقی　　کہ اس سے قبل، رہے جب کوئی چارہ گری
بس ایک بار میں تم سے کسی طرح مل لوں　　بس ایک بار میں قدموں پہ اپنا سر رکھدوں

امید و بیم میں ہو جائے بے خودی مجھ کو
سرِ نیاز کو تم مسکرا کے ٹھکرا دو

محترمہ رضیہ رعنا

اجتناب

تیرہ اپریل کی ایک خوشگوار صبح تھی میں اور شاہینہ چچا جان کے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ اتنے میں چچا جان کی بھاری اور محبت آمیز آواز آئی لڑکیاں کہاں ہیں؟ انہیں بھیجدے سلیم! (سلیم نوکر تھا)

ہم دونوں بہت جلد تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چچا جان تک پہنچ گئے۔ اُف۔ اپنی مایوسی کا اندازہ اس وقت مشکل تھا۔ ڈاک آچکی تھی۔ چند اخبارات میز پر بکھرے پڑے تھے۔ ایک کارڈ چچا جان کے ہاتھ میں تھا لیکن۔ افسوس۔ کہیں پتہ نہ تھا میں نے ترش نگاہوں سے شاہینہ کو دیکھتے ہوئے بھاگ چلنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ شریر لڑکی اپنی جگہ کھڑی رہی۔ لاچار میں بھی خاموش ہو رہی!

"سنتی ہو شاہینہ! تمہارے بھائی جان ابھی ٹرین سے آرہے ہیں" یکایک چچا جان نے عینک آنکھ سے اتارتے ہوئے کہا "اور دیکھو سلیم! عظیم کو بلالاؤ!" قدرے تحکمانہ لہجے میں چچا جان بولے عظیم آگئے۔ پہلے تو انہوں نے ایک معنی خیز نگاہ چچا جان پر ڈالی پھر کہنے لگے "جی ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ کیا حکم دینے والے ہیں۔ کل ہی ایک آدمی کلکتہ سے آیا ہے۔ اسی نے کہا تھا کہ آج جمالی بابو آرہے ہیں!"

یہ سنکر چچا جان مسکرا پڑے اور عظیم ہنستے ہوئے گیرج کی جانب چلدیئے!

جس وقت ہم دونوں چچی جان کے پاس پہنچے وہ اس وقت باورچن پر سخت ناراض ہو رہی تھیں لیکن شاہینہ کو اس قدر خوش دیکھ کر انہوں نے بھی مسکرادیا "کیا بات ہے شنو؟"

چچی جان نے بڑی پیار کی نظروں سے شاہینہ کو دیکھتے ہوئے کہا "چچی جان اس وقت جمالی بھائی آرہے ہیں" میں بولی!

"تجھے کس نے کہا ثریا کہ جمالی آرہا ہے۔ بھلا اسے کلکتہ کے کھیل تماشے سے اتنی فرصت کہاں؟"

"نہیں چچی جان یہ بالکل سچ ہے یہ دیکھیے بھائی جان کا خط"

چچی جان تو خط پڑھنے لگیں اور ہم دونوں دوڑتے ہوئے پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔ گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن اس دفعہ شاہینہ بار بار موٹر کی راہ دیکھنے لگتی۔ مجھے اس کی وجہ سے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔!

دفعتہً عظیم مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں اس طرح دیکھ کر ہم دونوں کو یقین ہو گیا کہ جمالی بھائی آگئے ہیں شاہینہ تو موٹر کی طرف دوڑ گئی اور میں جمالی بھائی کی نظروں سے بہت دور ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ کئی بار خواہش پیدا ہوئی کہ چلکر انہیں دیکھنا چاہیے چچی جان سے اُن کے متعلق بہت تعریفیں سنی تھیں۔ ہاں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جمالی بڑا رنگین مزاج اور با مذاق ہے تمہاری نظمیں اور افسانے دیکھ کر اسے بڑی مسرت ہوگی۔ لیکن جاؤں کیونکر؟ یہ بات سمجھ میں نہ آئی!

دوسرے کمرے سے چچا جان چچی جان اور شاہینہ کی آواز برابر آرہی تھی۔ یک لخت چچا جان نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور مجھے اس طرح دبکی ہوئی دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"اپنے بھائی سے اتنی شرم بیٹی؟" انہوں نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں شاہینہ آچکی تھی۔ ساتھ اس کے جمالی بھائی بھی

تھے۔ میں شرم سے کانپ رہی تھی۔

"خوب! تو گویا میرے بھائی جان سے پردہ کرنیکا ارادہ ہے" شاہینہ نے میرے چہرے سے آنچل ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس شرارت کا مجھ پر کیا اثر ہوا۔ میں نہیں بتا سکتی!

آخر بڑی مشکل سے ہوش و حواس درست کئے۔ اور جمالی بھائی پر ایک سرسری نگاہ ڈالکر گردن جھکالی۔

وہ خود مجھ سے شرما رہے تھے "ثریا بہن ایک شاعرہ ہیں اور حال ہی میں انہوں نے افسانہ نگاری بھی شروع کی ہے۔ کس قدر مسرت کی بات ہے۔ بھائی جان!" شاہینہ نے مسکراتے ہوئے کہا

میں اور زیادہ شرما گئی۔ جمالی بھائی متبسم نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ جمالی بھائی کے آنے کے بعد ہم لوگوں کے روزانہ حالات میں بہت کچھ تبدیلی ہوتی گئی۔ میری پہلی سی آزادی بالکل نہ رہی۔ ہر وقت اُن کی وجہ سے گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی۔

جمالی بھائی سے میں ہر وقت کھنچی سی رہتی تھی۔ یقیناً اسکا باعث میری آزادی میں دخل اندازی تھی۔ وہ میرے کمرے میں گھنٹوں یونہی پڑے رہتے۔ اور مجھے اس وجہ سے سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ نجانے کیوں انہیں میرا کمرہ اس قدر پسند تھا

ایک دن میں باغ میں اداس سی بیٹھی ہوئی مکان کو جانے کے متعلق سوچ رہی تھی چونکہ مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً تین ماہ ہو چکے تھے والدین سے ملنے کو بے انتہا دل چاہ رہا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میں رانچی سے اکتا سی گئی تھی۔

یکایک کمرے سے آفس بکس کھولنے کی آواز آئی۔ پہلے تو میں نے جانا کہ شاہینہ ہوگی لیکن پھر خیال ہوا کہیں جمالی بھائی تو نہیں ہیں۔ اٹھکر دیکھا تو واقعی وہی تھے۔ آفس بکس کی ہر ایک چیز کا انتہائی دلچسپی سے جائزہ لے رہے تھے۔

قدرے توقف کے بعد انہوں نے آفس بکس تو بند کر دیا لیکن میری نظموں کی کاپی بڑے اطمینان سے جیب میں رکھ کر کمرے سے باہر نکل گئے!

اف! نظموں کی کاپی! میرا چہرہ فق ہو گیا۔ دن کے ڈھائی بجے تھے۔ سب لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ اب اپنی نظموں کی کاپی مجھے حاصل کرنے میں کیا حرج تھا۔ فوراً جمالی بھائی کے کمرے کی طرف چلدی۔ دیکھا تو وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے سگریٹ کا کش لے رہے ہیں! چہرے پر ایک غیر معمولی مسرت کھیل رہی تھی۔ آخر کار میں آہستہ آہستہ جمالی بھائی کے بالکل قریب ہو گئی۔ بار بار دل چاہا کہ الٹے پاؤں بھاگ چلوں۔ لیکن اپنی نظمیں یاد آتیں تو بے اختیار یہی خواہش ہوتی کہ ان سے کسی طرح کاپی چھین لوں اف یہ سب پڑھ لیں گے۔

آخر میں نے ہمت و استقلال سے کام لیکر پوچھ ہی ڈالا۔

"جمالی بھائی آپ کے پاس نظموں کی کاپی ہے؟"

"ہاں!"

اتنا کہہ کر وہ کرسی سے اُٹھے اور مسکراتے ہوئے بولے "بیٹھو ثریا"

"جی نہیں۔ مجھے صرف وہ کاپی دیدیں میں جاتی ہوں"

اس جواب سے وہ مغموم ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے تو مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ خواہ کاپی ملے یا نہ ملے زیادہ دیر تک ہرگز ان کے کمرے میں نہیں ٹھہروں گی۔

"ثریا!" وہ پھر گویا ہوئے۔ معاً مجھے اپنی اخلاقی کمزوری کا احساس ہوا اور چپ چاپ ان کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ جمالی بھائی کی مایوسی مسرت و انبساط سے بدل گئی۔ وہ مسکرانے لگے! پھر کاپی جیب سے نکالکر ایک نظم "اے کاش چلے آتے" تحت اللفظ پڑھنے لگے اور ساتھ ساتھ میری تعریف بھی کرنے لگے لیکن بھلا مجھے خاک مسرت ہوتی یہاں تو میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اف انکی گفتگو کا تسلسل کتنی مصیبت تھی!

نجانے کیوں شاہینہ بھی اس طرف بالکل نہ بھٹکی۔ شا

میرے کسی جرم کی اسی وقت اسے سزا دینی تھی!

"اچھا تو لیلو کاپی میں پھر کسی دن تم سے مانگ لونگا۔ تمہاری ہی خواہش ہے تو میں بھی مجبور ہوں" جمالی بھائی نے کاپی دیتے ہوئے کہا۔ میں دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کرتی کمرے سے نہایت تیزی کے ساتھ باہر نکل گئی۔ دل اپنی پوری طاقت سے دھڑک رہا تھا!

دو تین روز تک پھر جمالی بھائی سے ملاقات نہ ہوسکی۔ کیونکہ وہ دن رات اپنے کمرے ہی میں رہنے لگے۔ ہاں اسی اثنا میں شاہینہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کو شدید بخار ہوگیا ہے۔ چچی جان چچا جان اور شاہینہ ان کی علالت کی وجہ سے بہت زیادہ افسردہ رہنے لگے۔ ایک دو دفعہ میں نے چاہا کہ چلکر ذرا جمالی بھائی کو دیکھ لوں آخر میری اس بداخلاقی کا لوگوں پر کیا اثر پڑے گا لیکن اس ارادے کی تکمیل کس قدر مشکل تھی! بہرحال میں ان کے کمرے کے دروازے تک تو پہنچ گئی۔ لیکن اندر جانے کی جرأت نہ ہوتی۔ جمالی بھائی پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔

کمرے کے ایک کونے میں شاہینہ فرش پر بالکل بے خبر سو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے قدم خود بخود جمالی بھائی کی جانب اٹھنے لگے سرہانے پہنچکر خوفزدہ نظروں سے جمالی بھائی کو تکنے لگی۔ انہیں میری موجودگی کی بالکل خبر نہ تھی۔ اب مجھے خاموش رہنا سخت دشوار تھا۔

"جمالی بھائی"... میں نے دبی زبان سے پکارا۔ "کیونکر اتنی زحمت گوارا ہوئی ثریا؟" جمالی بھائی نے کہا۔

جواب میں میرے پاس ایک طویل خاموشی تھی۔ انہوں نے متعدد بار یہی سوال کیا میں کیونکر چپ رہتی۔ جمالی بھائی تو جواب کے سخت منتظر تھے بمشکل تمام میں دوسری طرف نظریں پھیر کر کہنے لگی۔ "چونکہ مجھے آپ کی خیریت شاہینہ سے برابر معلوم ہوجایا کرتی تھی اس لئے میں نے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔"

"ضرورت.... ضرورت آہ... ثریا!!" جمالی بھائی کی آواز دھیمی ہوتی گئی۔ "اس عنایت کا شکریہ" انہوں نے پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا!

جمالی بھائی رونے لگے میں مجسمہ حیرت بنی انہیں تک رہی تھی۔ سمجھانے کی صلاحیت مجھ میں بالکل نہ تھی میں خود ہمدردی کی محتاج تھی!

"ثریا! آج میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"! آنسو رومال سے پونچھتے ہوئے وہ بولے۔!

میں تھر تھر کانپ رہی تھی خدا کی پناہ آخر جمالی بھائی مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟

جمالی بھائی کے پاس ٹھہرنا اب میرے اختیار سے باہر تھا۔ کسی نامعلوم طاقت کے زیر اثر میں دروازے کی جانب کھنچنے لگی۔ کہاں سے کہاں جا رہی ہوں۔ یہ بتانا میرے امکان سے باہر تھا۔

بہرکیف میں جمالی بھائی سے دور ہوتی گئی اور وہ حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے رہے۔

اس دن کے بعد میں کچھ کھوئی سی رہنے لگی۔ جمالی بھائی مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ رہ رہ کے یہ خیال دل و دماغ میں چکر لگانے لگا۔ جمالی بھائی کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ معمولی مرض بخار کی صورت اختیار کرتا گیا سب لوگوں کا غم سے برا حال تھا۔ غریب شاہینہ تو ہر وقت روتی رہتی تھی!

چونکہ ڈاکٹروں کی سخت ہدایت تھی کہ مریض کے پاس رات بھر کوئی نہ کوئی جاگتا رہے۔ اس لئے نو بجے سے لیکر بارہ بجے تک چچا جان جاگتے اور بارہ سے تین تک چچی جان جاگتیں۔ اور پھر تین کے بعد شاہینہ اُن کے پاس بیٹھتی۔ میں نے اپنی مصروفیت کے لئے سارے کام اپنے ذمے لے لئے تھے۔ تاکہ جمالی بھائی کے پاس بیٹھنے سے جان تو بچے گی شکر ہے کہ میری کوششیں رائیگاں نہ گئیں۔ اور سب لوگ مجھے اس قدر عدیم الفرصت دیکھ کر جمالی بھائی کی تیمارداری

کو بالکل نہ کہتے۔ رات کو بھی اس خیال سے چھوڑ دیا جاتا۔ کہ دن بھر بہت تھکی رہتی ہے۔ ایک رات نہ جانے کیوں مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔ سو جانے کی لاکھ تدبیریں کیں لیکن سب لاحاصل۔ یکایک خواہش ہوئی کہ کچھ پڑھنا چاہیے شاید اس صورت میں نیند آ جائے۔ لیکن رسالہ تو جمالی بھائی کے کمرے میں ہے۔ اس خیال سے پھر پلنگ پر لیٹ گئی!

آخر دل نہ مانا۔ جمالی بھائی کے کمرے میں پہنچی شاہینہ آرام کرسی پر بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے جیسے ہی رسالہ لیکر واپس جانا چاہا۔ کہ جمالی بھائی نے کروٹ لیتے ہوئے آہستہ سے پانی مانگا۔ پانی وہیں پر موجود تھا۔ میں نے گلاس اُن کے منہ سے لگا دیا۔

دو گھونٹ پی کر انہوں نے بڑے غور سے مجھے دیکھا۔ "کون؟ ثریا؟" متعجبانہ لہجے میں جمالی بھائی پوچھنے لگے۔ "جی ہاں! آپ پانی تو پی لیں۔" دوبارہ گلاس میں نے منہ سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"ثریا تم یہیں ہو" یہ کہکر انہوں نے پھر میری طرف کروٹ لی۔ جمالی بھائی کے پلنگ کے قریب ہی ایک کرسی پڑی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گئی۔ جمالی بھائی میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ "خدا کے لئے آپ سو رہیں جمالی بھائی"! ایک لمبے وقفے کے بعد میں نے چڑ کر کہا۔ "سو رہوں۔ ثریا؟ لیکن آہ یہ زندگی بخش موقع مدت کے بعد ملا ہے۔"

"زندگی بخش موقع" میں زیرِ لب بڑبڑائی۔ میں نیند سے پریشان ہو رہی تھی۔ جماہیاں پہ جماہیاں آنے لگیں لیکن سوؤں کیونکر جمالی بھائی تو جاگ رہے ہیں۔ یہ مسئلہ زیرِ غور تھا۔ شاید میرے جانے کے بعد جمالی بھائی بھی سو جائیں۔ اس امید پر میں چپکے سے اٹھی اور شاہینہ کو جگا دیا۔

شاہینہ میرے پاس اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں شاہینہ سے کہکر اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ جمالی بھائی کی باتیں یاد آ رہی تھیں! صبح جو آنکھ کھلی تو سبھوں کے چہروں پر فرطِ شادمانی کے آثار پائے مجھے یقین ہو گیا کہ آج خلافِ توقع جمالی بھائی کی طبیعت اچھی ہو گی۔ شاہینہ کی تلاش میں میں بھی اُن کے کمرے تک پہنچ گئی سب لوگ وہیں تھے۔ چچی جان سرہانے بیٹھی ہوئی محبت بھری نظروں سے جمالی بھائی کو تک رہی تھیں۔

میں نے چاہا کہ صرف جھانک کر بھاگ جاؤں لیکن بھابی شاہینہ کو کب منظور تھا؟ وہ زبردستی مجھے کھینچکر لے آئی "بیٹھو ثریا جب تک میں باورچی خانہ سے ہو آؤں۔" چچی جان اٹھتی ہوئی بولیں مجبوراً مجھے ان کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

چند دن کے بعد جمالی بھائی کی طبیعت سنبھلنی شروع ہوئی اور دو ہفتے کے اندر اندر وہ بالکل اچھے ہو گئے۔ صرف کمزوری باقی تھی۔!

دن کا تھوڑا حصہ وہ برآمدے میں گذارتے تھے۔ اور باقی اپنے کمرے میں! کبھی کبھی جمالی بھائی سے برآمدے ہی میں ملاقات ہو جاتی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ وہ گھنٹوں سراپا سوال رہتے اور میں مجسمۂ خاموشی! اف جمالی بھائی میرے لئے ایک مستقل مصیبت تھے!

ایک روز میں ڈاکیہ کے انتظار میں چشم براہ اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ پاس ہی جمالی بھائی کرسی پر خاموش بیٹھے تھے۔ یک بیک سامنے سڑک پر ڈاکیہ کی صورت نظر آئی وہ جمالی بھائی کی طرف جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا آ رہا تھا۔ خطوں کے لئے دوڑ جانا۔ جمالی بھائی کی موجودگی میں میرے بس کی بات نہ تھی۔ تھوڑے فاصلہ پر امید وار کھڑی ہو گئی۔

جمالی بھائی ایک ایک چیز بڑے اطمینان سے دیکھ رہے تھے دو رسالے اور چند اخبارات انہوں نے ایک طرف رکھ دیئے۔ اور ایک لفافے پر سرسری نظر ڈالکر ایک کارڈ اٹھا لیا۔ دیر تک اسے پڑھتے رہے۔ چہرے پر رنج و غم کے اثرات کافی نمایاں ہو گئے اب مجھ سے ضبط کرنا دشوار تھا۔ میں جلد سے جلد ان کے پاس

پہنچکر اپنے والدین کے خطوں کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی۔

"خدا کرے میرا خط آیا ہو" میں دل ہی دل میں یہ دعا کرتی ہوئی جمالی بھائی کے پاس پہنچی۔ دل امید و یاس کی آمیزش سے کانپ رہا تھا۔ "جمالی بھائی۔ کیا میری بھی کوئی چیز ہے" میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے یہ سوال کیا

جمالی بھائی نے ایک گھبرائی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی، اور وہی کارڈ بڑی تیزی کے ساتھ جیب میں رکھ لیا: "ہاں۔ یہ۔۔۔۔ رسالے۔۔۔ یہ لفافہ! اور۔۔۔ اور تو کچھ نہیں! ہاں۔۔۔ نہیں" ان کی آواز رک رک کر نکل رہی تھی۔ یہ بات تازگی تھی یقیناً میرا ہی وہ کارڈ ہے

خیر لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنا شروع کیا۔ جمالی بھائی اس کی طرف دیکھ کر بولے "معلوم ہوتا ہے کہ کسی اڈیٹر کا ہے"

"جی ہاں!" میں نے آہستہ سے ان کے سوال کا جواب دیا۔ "کیا میں بھی اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"بڑے شوق سے!"

یہ کہکر میں نے دونوں رسالے سنبھال لئے جن میں ایک تو "ادب لطیف" تھا اور دوسرا "رومان"۔ جمالی بھائی تو خط پڑھنے لگے اور میں رسالوں کو دیکھنے لگی۔ معاً پیچھے سے کسی نے میری آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ سوائے شاہینہ کے اور کون ہوگا۔ اس خیال کے ماتحت "شاہینہ!" میری زبان سے نکل گیا۔

شاہینہ ہنستی ہوئی سامنے آگئی۔ اس کی بے ساختہ ہنسی پر میں بھی مسکرادی لیکن خلاف امید جمالی بھائی مغمومانہ کسی گہری سوچ میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔!

شام ہوئی۔ اس وقت جمالی بھائی ٹہلنے کی تیاری میں مشغول نظر آئے عظیم سامنے موٹر لگائے کھڑے تھے۔ جمالی بھائی کے جانے کی میں سخت منتظر تھی۔ کیونکہ یہی ایک موقع تھا خط تلاش کرنے کا شکر ہے کہ وہ قمیض جس کی جیب میں جمالی بھائی نے خط چھپایا تھا۔ کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی۔

جمالی بھائی چلے گئے۔ شاہینہ چائے بنا رہی تھی۔ اب کیا حرج تھا مجھے خط تلاش کرنے میں؟ جمالی بھائی کے جانے کے بعد میں نے بہت بڑے بار سے خود کو سبکدوش پایا۔

کمرے میں پہنچکر کس قدر مسرت ہوئی۔ یہ امر ایک راز تھا۔ کہ یہی جمالی بھائی کا کمرہ جو میرے لئے ایک قفس سے کسی قدر کم نہ تھا اسقدر کیوں مجھے اتنا عزیز نظر آرہا تھا میں یہ سمجھنے سے یکسر قاصر تھی۔ سنٹ کی جان نواز خوشبو کمرے میں سرور بنکر چھائی تھی۔ میں نے بے خودی کی حالت میں خود کو ایک کرسی پر ڈالدیا۔ اور اختر شیرانی کی نظم کا ایک پسندیدہ ٹکڑہ گنگنانے لگی۔ سامنے باغ میں مالی کام کر رہا تھا۔ دفعتہً میری نگاہیں اپنے لگائے ہوئے ایک پودے پر پڑیں مسرتوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ کلیاں کھل کر پھول بن چکی تھی۔

نہیں معلوم کب تک اسی طرح خود فراموشی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ دفعتہً میرے دل میں کارڈ کی جستجو کا احساس اور ساتھ ہی جمالی بھائی کی واپسی کا وحشت انگیز خیال پیدا ہوا۔ میں اٹھی اور جمالی بھائی کی قمیض کی دونوں جیبوں میں باہر ہاتھ ڈالے لیکن خط نہ ملا۔ پریشان ہوکر سرہانے میز دراز میں اور دوسرے کپڑوں کی جیبیں چھان ماریں۔

لیکن آخر میں وہی نتیجہ نکلا جسکا مجھے مطلق خیال نہ تھا۔ شائد اس اٹیچی میں ہو۔ امید کی ہلکی سی روشنی دکھائی دی اور میں نے اُسے کھولنا شروع کر دیا۔ وہی کارڈ اوپر پڑا تھا۔ ابا جان کی تحریر تھی۔ میں اپنی اس کامیابی پر اچھل پڑی اور دریچہ کے پاس آکر روشنی میں خط پڑھا۔ ابا جان نے بہت جلد مجھے بلایا تھا۔ میری مسرت کی اس وقت انتہا نہ تھی۔ یکے بعد دیگرے اماں جان، ابا جان اور چھوٹے چھوٹے بھائی بہن نظروں کے سامنے پھرنے لگے۔ میں غرق مسرت کب تک رہی نہیں معلوم۔ اچانک کسی کے قدموں کی چاپ دور سے سنائی دی۔ "جمالی بھائی" میری زبان سے خود بخود نکل گیا اُٹھکر بھاگنا چاہا۔ لیکن دو چار قدم چلکر بری طرح ڈگمگائی۔ لاچار میز

کا سہارا لیکر ایک طرف کھڑی ہوگئی خوشبو کی مہک کمرے میں اور تیز ہوگئی۔ دریچے پر جمالی بھائی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ "خوب آج چوری پکڑی گئی۔" انہوں نے مجھ سے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ اف جمالی بھائی اور میں! میرا دم گھٹنے لگا۔ دل کی رفتار تیز ہوگئی "میرے حال زار پر اور اتنی عنایت" وہ پھر گویا ہوئے میں خاموش تھی۔ اور بالکل بے حس و حرکت۔ "اگر تکلیف نہ ہو تو تم پھر اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ" یہ انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ میں غیر ارادی طور پر اسی کرسی پر بیٹھ گئی اور جمالی بھائی دریچے پر بیٹھ گئے۔ "ثریا!" جمالی بھائی کی آواز گلوگیر تھی۔ "خدا کے لئے اجازت دو!"

اس غیر معمولی سوال پر میں گھبرا گئی۔ لیکن ساری باتیں تو اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ میں نے دل میں کہا۔ "مجھے تم سے چنداں شکایت نہیں۔ میں نے اپنی زندگی پر اسی وقت آنسو بہائے تھے۔ جب سب سے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ ثریا! بخدا میں نہیں چاہتا کہ میری محبت کا جواب محبت ہو، میری وفاؤں کا صلہ جفا نہ رہے، میری آرزوئیں پامال نہ کی جائیں۔ میری تمناؤں کا خون ہو۔ ثریا! ہاں تم اسی طرح مجھ سے بھاگو اور میرے کمرے سے کتراؤ مجھے سب منظور ہے، سب۔ تمہیں کس طرح بتاؤں ثریا کہ تمہاری ہر ادائے ستمگاری مجھے کتنی عزیز ہے ثریا ؎

زندگی نام ہے درد کی بیتابی کا
خلش و درد کا محرومی و ناکامی کا

خدا کے لئے مجھے معاف کر دو! اے کاش میں کلکتہ ہی سے نہ آتا۔ ثریا! یہ کہنے دو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

یہ تھیں وہ باتیں جو میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سنیں جمالی بھائی اتنا کہکر خاموش ہو گئے۔ میں سراپا لرز رہی تھی "میں تم سے محبت کرتا ہوں ثریا" ان الفاظ سے کمرہ گونج رہا تھا۔

"کہاں ہے جمالی عظیم؟" چچا جان کی آواز دفعتاً برآمدے میں سے آئی۔ "ابا جان!" اتنا کہکر جمالی بھائی دریچے سے باغ میں کود گئے اور میں سرنگوں متحیر اور پریشان اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ "شاید باغ میں ہوں" عظیم یہ کہکر باغ کی جانب چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جمالی بھائی اور عظیم دونوں چچا جان کے کمرے کے منتظر آکر کھڑے ہو گئے۔ "بہت بے وقوف ہو شبنم گرنے لگی اور تم وہاں بیٹھے تھے۔ جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔" چچا جان نے ترش لہجہ میں جمالی بھائی سے کہا۔ وہ چپ چاپ اپنے پلنگ پر آکر لیٹ گئے میں بدستور بیٹھی تھی۔ جمالی بھائی اور میرے درمیان ایک طویل خاموشی تھی۔ اور بس۔

دوسرے دن میں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ آج مکان ضرور چلی جاؤنگی۔ رات کا واقعہ تو اس ارادہ کی استواری کے لئے کافی ہی تھا چچا جان کی رضامندی کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں سوچکر انکے پاس پہنچی۔ سب لوگ قبل ہی ... دسترخوان پر میرے منتظر تھے ایک ایک طرف رونی صورت بنائے میں بیٹھ گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ مگر میں بالکل خاموش تھی۔ آخر میں جب سب لوگ ناشتہ کرکے چائے پینے لگے تو میں نے چچا جان سے مکان جانے کی اجازت مانگی۔ پہلے تو وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئے۔ مگر جب میں نے اِدھر اُدھر دیکھکر کہ کہیں جمالی بھائی تو نہیں ہیں۔ وہ کارڈ پیش کیا۔ تو چچا جان نے اجازت دیدی۔ شاہینہ میرے جانے کی خبر سے غمگین ہوگئی چچی جان نے بھی اظہار تاسف کیا۔ میں خوش خوش ان لوگوں کے پاس سے اٹھکر سامان سفر درست کرنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی کہ یکایک میری نگاہیں دنگ رہ گئیں۔ جمالی بھائی شاہینہ کے کمرہ میں چھپکر ساری باتیں سن رہے تھے۔ وہ بالکل غمگین کھڑے تھے...

جمالی بھائی کو دیکھ کر میں ٹھٹھک سی گئی۔ خدا رحم کرے، اس وقت سب سے پہلی بار مجھے ان کی محبت کا احساس ہوا۔ آنکھیں آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ "جمالی بھائی" ان کے قریب جا کر آہستہ میں نے کہا۔ "ثریا!" وہ اتنا کہکر کانپنے لگے۔ آنکھوں سے افسوس

کا سرچشمہ پھوٹ پڑا۔ واقعی اس وقت جمالی بھائی سے مجھے دلی ہمدردی تھی۔ اے کاش میں ان کی کچھ مدد کر سکتی، لیکن افسوس جمالی بھائی کی محبت کا جواب محبت سے دینا میرے لئے صرف دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔ "جمالی بھائی! آپ روتے کیوں ہیں؟" میں نے قدرے عاجزانہ انداز میں کہا "اس لئے کہ تم مجھے بھول جاؤگی۔" میں کس طرح اس بات کی تردید کر سکتی۔ مجھے تو خود بھی معلوم تھا کہ رانچی سے جا کر ان کی ساری باتیں ان کی بے پناہ محبت فراموش ہو جائیگی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں چچا جان کے احاطے سے موٹر پر گذر رہی تھی۔ سیڑھی پر چچا جان، چچی جان، اور شاہینہ افسردہ کھڑے تھے۔ جمالی بھائی اپنے کمرے کی جانب آہستہ آہستہ رومال سے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں جمالی بھائی کو اس طرح کچھ دیر اور دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن عظیم کو بھی اس کی خبر تھی۔ جو موٹر کی رفتار دھیمی کر دیتے؟

جمالی بھائی کو فراموش نہ کرنا میری فطرت کے خلاف تھا۔ ان کے خطوط برابر آتے ہیں لیکن بہت زیادہ مختصر، چند ہی سطور میں اپنی ساری داستان مرکوز کر دینے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ میں نے بھی ایک دو بار ان کے محبت ناموں کے جواب دیدیئے ہیں لیکن کس طرح صرف سفید کاغذوں کی شکل میں۔ آج ان کا تار آیا ہے۔ دسہرہ کی تعطیل میرے ہی غریب خانہ پر گذارنے کا قصد ہے بہرکیف اس سے مجھے کیا تعلق؟ وہ شوق سے آئیں اور جب تک خواہش ہو رہیں۔ میں تو آج شام ہی کی ٹرین سے اپنی عزیز دوست یاسمین کی شادی میں پٹنہ جا رہی ہوں۔ خدا کرے اب بھی وہ ترک محبت کو راہ دیں۔

امجد حیدرآبادی

غزل

اس چمن میں سدا بہار نہیں — رنگِ دنیا کا اعتبار نہیں
بلبلے کو سکون ہو کیونکر — جب سمندر ہی کو قرار نہیں
دل میں ہر دم کشمکش ہو کیونکر — کونسا گل ہے جسمیں خار نہیں
"ہاں" کا بھی وقت اک دن آئیگا — کب تک آخر یہ بار بار "نہیں"
میرے شکووں پہ ہنسکے کہتے ہیں — عاشقوں کا تو یہ شعار نہیں
ہائے وہ وعدہ کر کے فرمانا — کیا مراتم کو اعتبار نہیں

کس قدر صاف دل رہا امجد
اس کی مٹی میں بھی غبار نہیں

جناب اختر انصاری بی اے (آنرز)

غزل

محبت ہے اذیت ہے ہجوم یاس و حسرت ہے
جوانی اس قدر غمگین ہو کیسی قیامت ہے

کہاں کی آرزوئیں ولولے کیسے امنگیں کیا
مری کل کائنات اب ایک افسردہ طبیعت ہے

جو ماضی ایک مجموعہ ہے اشکوں اور آہوں کا
نہ جانے مجھکو اس ماضی سے کیوں اتنی محبت ہے

لب دریا مجھے لہروں سے یونہی کھیل کرنے دو
کہ اب دل کو اسی اک شغل بے معنی میں راحت ہے

ترا افسانہ اے افسانہ خواں رنگیں سہی لیکن
مجھے رودادِ عشرت سُن کے رو دینے کی عادت ہے

ستم دیکھو ہمیں لطفِ نظارہ بھی نہیں حاصل
کہ جو آنکھوں کی راحت ہے وہی دل کی اذیت ہے

کوئی روئے تو میں بے وجہ خود بھی رونے لگتا ہوں
اب اختر چاہے تم کچھ بھی کہو یہ میری فطرت ہے

جناب ماہر القادری

غالب اور نغمہ

جدید زاویۂ نگاہ

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے یہ الفاظ سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہیں کہ:۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: وید مقدس

اور دیوانِ غالب"

حقیقت بھی یہ ہے کہ غالب کے اشعار کو پڑھکر وجدان کو اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ غالب روح القدس کی زبان سے بول رہا ہے۔ غالب کے کلام نے اُردو ادب کے دامن کو بیش بہا زر و جواہر سے بھر دیا ہے۔ اور ہم ورجل، ہومر، امرالقیس، لبید، حافظ، نظیری، کالیداس، گوئٹے اور نطشہ المانوی کے مقابل تنہا غالب کو سر افتخار بلند کر کے پیش کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی شاعرانہ تعلی یا افسانوی رنگ آرائی نہیں ہے۔ بلکہ حقائق ہیں۔ ایسے حقائق جن کو کوئی جھٹلانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ میں جو کچھ اپنے مکان کے کمرے میں بیٹھا ہوا کہہ رہا ہوں، اس بات کو گلگشتِ مصلا اور آبِ رکنا باد کے سامنے کھڑا ہو کر بھی کہہ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے دعوے کی سچائی کا پھیلی ہوئی دھوپ کی طرح یقین ہے۔

غالب کا اصلی رنگ فارسی میں جاکر کھلتا ہے۔ اردو کو تو وہ "بے رنگی" بتاتا ہے۔ مگر اس "بے رنگی" میں غالب نے جو پھول کھلائے ہیں، اُس کا جواب فردوس کے پھولوں کی رنگینی بھی پیش نہیں کر سکتی آج کل لٹریچر میں زیادہ زور "نفسیات" پر دیا جارہا ہے۔ غزل، نظم مضامین اور افسانوں میں بھی نفسیات ہی کو پیش کرنیکی کوشش کی جارہی ہے۔ آج جس ضرورت کو اس قدر شدومد کیساتھ محسوس کیا جارہا ہے، غالب نے بہت پہلے اس گتھی کو سلجھا دیا ہے۔ غزل میں وہ نفسیات کا امام تھا۔ اُس کے اشعار فطرت انسانی کے آئینے ہیں۔ اُس کے کلام کو پڑھکر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچ مچ ہماری بیتی ہوئی کہانی دہرائی جارہی ہے۔ غالب نے شاید یہ شعر اپنے ہی لئے کہا تھا ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تمہید قدرے طویل ہوگئی۔ مگر میں کیا کروں، کہ جب کبھی غالب پر میں کچھ لکھنے کے لئے بیٹھتا ہوں تو میرا قلم شوخیاں دکھاتا ہے۔ اور میری انگلیاں اس قدر مست ہوجاتی ہیں کہ میرے روکے نہیں رکتیں۔

میں سردست غالب کے دوسرے محاسن سے بحث نہیں کرتا میں یہاں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ غالب کے اشعار میں ترنم اور موسیقی کو کس قدر دخل ہے۔ چونکہ مضمون کو زیادہ پھیلانا نہیں چاہتا۔ اسلئے نہایت اختصار کے ساتھ اپنا مفہوم پیش کرونگا، ناظرین کا وجدان اس اجمال سے خود تفصیل مرتب کریگا۔

پہلے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ ترنم کا شعر سے اس قدر قریبی ربط ہے کہ دونوں ملے جلے بلکہ ایک معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ترنم "شعر کی صوتی ترجمانی" کا دوسرا نام ہے۔ جب آپ کوئی چیز گاتے ہوتے ہیں۔ تو آپ شعر کی اپنی آواز کے ذریعہ ترجمانی

فرماتے ہیں۔ دنیا کی تمام راگنیاں درحقیقت شعر کے اوزان ہیں۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ شعر نغمہ کی تخلیق کرتا ہے اور اسی لئے شاعر کا درجہ مغنّی سے بہت زیادہ بلند ہے۔ یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ہم الفاظ کے بغیر بھی گنگنا سکتے ہیں میں بھی اس کو مانتا ہوں مگر گنگناتے وقت کسی شعر کا کوئی ٹکڑا ضرور ذہن میں ہوتا ہے اس کے بغیر آپ گنگنا ہی نہیں سکتے (شعر سے میری مراد اُردو فارسی اور عربی کے اشعار نہیں بلکہ نفس شعر ہے)

شعر کی قبولیت اور اُس کی اثر انگیزی کا راز "ترنم اور موسیقیت" میں پنہاں ہے جس شعر میں جس قدر زیادہ موسیقیت پائی جائیگی۔ اُسی قدر وہ زیادہ اثر انگیز ہوگا۔ ترنم شعر کی جان ہے جس شعر میں جتنا کم ترنم ہوگا اتنا ہی وہ بدمزہ اور پھیکا ہوگا' غالب کے اشعار میں ہم کو ترنم اور موسیقیت بدرجہ اتم ملتی ہے اُس کے بہت سے اشعار "موسیقی تام" اور "ترنم مکمل" کا درجہ رکھتے ہیں۔ غالب حضرت امیر خسرو کی طرح فن موسیقی سے واقف نہ تھا لیکن اُس کے اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر شعر کہتے وقت عود و بربط کو چھیڑ رہا ہے غالب کا یہی ایک وصف دوسرے اُردو شعراء سے اُس کو ممتاز کر دیتا ہے

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

اس شعر کا ایک ایک لفظ ہارمونیم کا پردہ ہے کہ وجدان نے ذرا چھیڑا اور نغموں کا طوفان اُبلنے لگا۔ ایک ایک لفظ میں نغمہ کا زیر و بم موجود ہے۔ جس نے پورے شعر کو "راگنی" بنا دیا ہے۔ جو لوگ موسیقی کے اثرات کو صحیح طور پر محسوس کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ وہ شعر پڑھتے وقت یقیناً نغمہ کی ایک کیفیت محسوس کریں گے ؎

ذکر اُس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

پریوش کا تنہا "ش" اپنی جگہ مترنم بربط کی حیثیت رکھتا ہے جب زبان "پریوش" ادا کرتی ہے تو وہ خود نغمہ کے کیف میں ڈوب جاتی ہے

اس شعر کو پڑھکر اس حقیقت کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ شعر نغمہ کی تخلیق کرتا ہے ؎

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

"سے ہے" کے بعد زبان جب "شبنم" پہنچی ہے تو نغمہ پھوٹنے لگتا ہے۔ دوسرے مصرع میں تو شاعر نے "جلترنگ" کی روح کو بھر دیا ہے۔ کر پڑھئے اور وجد کیجئے ؎

نہ اٹھا برش تیغ ادا پہ ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

"ناز فرماؤ" پر پہنچکر بانسری سی بجنے لگتی ہے اور "موج خوں" پر پہنچکر "ارغنوں" چھڑ جاتا ہے۔ "وہ بھی" کا ترنم موجوں کے نرم ہلکوروں کی آواز سے ملتا جلتا ہے۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

خیاباں کی تکرار نے جو نغمہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے وہ نہ صرف "بے پناہ" ہے بلکہ نفسیات کو اپیل بھی کرتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی "خیاباں" کی مضراب سے دل کے تار کو چھیڑ رہا ہے۔

تماشا کر او محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

پہلے مصرعہ کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی آئینہ میں دیکھکر مسکرا رہا ہے۔ اور اس کی مسکراہٹ ذرا قہقہہ سے ملتی جلتی ہے جس میں "نغمہ" بھی شامل ہے۔ شاعر نے الفاظ کے ساتھ خندہ کو نغموں کی دنیا میں پہنچا دیا ہے۔ ؎

نیند اُس کی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پہ تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

جیسے کسی حسین و نوخیز عورت کی ساری کی سرسراہٹ ایک نغمہ پیدا کرتی ہے۔ اس شعر میں بھی نغمہ کا وہی لطف پایا جاتا ہے

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

"ک" کے متصل "ق" خاص ترنم پیدا کرتا ہے۔ مصرعۂ ثانی میں تو نغمہ کی گنگا موجیں لے رہی ہے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پہلا مصرعہ انتہائی "مدہم سُر" ہے۔ اور دوسرا مصرعہ "بیچ کا سُر" مگر "تشنہ" کا "ش" تو باجے کے بہت سے پردوں پر ایک ساتھ انگلیاں رکھ دیتا ہے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

قافیہ کی "۔" "ردیف "گئی" کے ساتھ مل کر "سوہنی" کو اپنے قدموں پر جھکا رہی ہے ؎

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

"ابرِ شفق آلو" کا ترنم "مینہ کی" "رم جھم" سے ملتا جلتا ہے۔ دوسرے مصرعہ کی موسیقی پہلے مصرعہ کے ترنم سے زیادہ تیز ہے۔

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

غزل کی راگنی اس شعر میں جذب ہو کر رہ گئی ہے دوسرا مصرعہ "ترنم" کی چٹکی ہے۔

ہر چند فلک نخواستہ است ہیچکس از فلک خواست
ظرفِ فقیہہ مے نجست بادۂ ما گزک نخواست

اس شعر میں شراب اور نغمہ کا اجتماع ہو گیا ہے۔ اور یوں کہا گیا ہے بلکہ شاعر نے شراب اور نغمہ کی روح کو بالا رادہ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں تو عود و بربط کے نغموں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جب تک دنیا میں "آواز" باقی ہے غالب کے اشعار زندہ رہیں گے !

جناب ادیب مالیگانوی

فراق

دیکھتے دیکھتے کٹ جائیں گے ایامِ فراق ‏— لائے گی صبح کا پیغام کبھی شامِ فراق
ساغرِ عیشِ محبت نہیں قسمت اُس کی ‏— جب تلک کوئی نہ ہو جرعہ کشِ جامِ فراق
مجھ سے پوچھے کوئی بیتابیٔ حسرت کے مزے ‏— دل میں اک شوق ہے اور لذتِ آلامِ فراق
زندگی شوق و تمنا کو نئے سر سے ملی ‏— کس کی تقدیر میں ہے دولتِ انعامِ فراق
پھر وہی ہم وہی آپس کی محبت ہوگی ‏— توڑ ہی ڈالیگی امید کبھی دامِ فراق
تو بظاہر تو نگاہوں سے نہاں ہے لیکن ‏— تیرے جلووں سے منور ہے مری شامِ فراق

دل کو یہ کہہ کے دیا کرتا ہوں تسکین ادیب
"لذتِ عشرتِ جاوید" ہے انجامِ فراق

مصنفہ ۔ ہندی زبان کے مشہور ادیب
بابو جے شنکر پرشاد

مترجمہ جناب ابو محمدؐ امام الدین صاحب

نورِی

"میں ! تم کون ہو ؟"

"........"

"بولتے نہیں"

"........"

"تو میں بلاؤں کسی کو ؟" کہتے کہتے اس نے نازک سا منہ کھولا ہی تھا کہ نوجوان نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اُسے دبا لیا۔ اور وہ بے بس ہو کر خاموش ہو گئی۔ آج یہ پہلا ہی اتفاق تھا جب اُسے زعفران اور مشک و عنبر سے بسی ہوئی پر شوق آغوش نصیب ہوئی، دوسرے ہی لمحے میں اس کنج کے اندر چھن کر آئی ہوئی چاندنی میں آبدار کٹ رچمک اٹھی۔ ادھر چاند کی شعاعیں بھی ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ٹہنیوں کو ہٹا کر گھس پڑیں۔ ہرن کی طرح بڑی بڑی سہمی ہوئی آنکھیں اپنی خاموش زبان میں رحم اور زندگی کی بھیک مانگ رہی تھیں۔

نوجوان کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے جذبات لطیف آنکھ کے حلقے میں مچل رہے تھے۔ اس نے سمجھا کوئی میرا حوصلہ مند عاشق ہے جو اکبر اعظم کی آنکھ مچولی کے کھیل کے وقت پروانے کی طرح داد جانبازی دینے آیا ہے۔ اس خیال نے اسے کیف و سرور کے ایک عجیب عالم میں پہنچا دیا۔ اس نے اپنے کو بہت خوش نصیب سمجھ کر اور خاموش رہنے کا اشارہ پا کر نوجوان کے لبوں پر اپنے لب رکھ دیئے۔ نوجوان بھی بے خود ہو کر ایک لمحے کے لئے اس کیف و نشاط میں گم ہو گیا۔

نوری نے آہستہ سے کہا "یہاں سے فوراً چلے جاؤ، کل باندھ کے اوپر پہلے پہر کی نوبت بجنے کے وقت مولسری کے نیچے ملوں گی"۔

نوجوان آہستہ آہستہ وہاں سے چلا گیا۔ نوری مضمحل پیروں سے لڑکھڑاتی ہوئی دوسری کنج کی طرف چلی۔

آسمان پر نکلا ہوا ماہِ کامل اس کھیل کو دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ نوری اب کسی کنج میں گھسنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی تھی، نرگس دوسری کنج سے نکل کر آ رہی تھی۔ اس نے نوری سے پوچھا۔

"کیوں ادھر دیکھ آئی ؟"

"نہیں مجھے تو نہیں ملے۔"

"تو چل ادھر کامنی کی جھاڑیوں میں دیکھیں۔"

"تو ہی جا میں تھک گئی ہوں۔"

نرگس چلی گئی مالتی کی جھکی ہوئی ڈال کے تاریک سائے میں دھڑکتے ہوئے دل کو ہاتھوں سے دبائے نوری کھڑی تھی پیچھے سے کسی نے اس کی آنکھوں کو بند کر لیا۔ نوری کے دل کی دھڑکن اور بڑھ گئی۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔

"میں پہچان گئی"

"......"

"جہاں پناہ ۔ ۔ ۔" اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ اکبر نے اس کا منہ بند کر لیا۔ اور آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔

"مریم کو بتا دینا، سلطانہ کو نہیں، سمجھی نا، میں اس کنج میں جاتا ہوں۔"

اکبر کے جانے کے بعد ہی سلطانہ آ گئی۔ نوری بھی کے ظل عاطفت میں رہتی تھی۔ مگر اکبر کا حکم تھا۔ اس نے سلطانہ کو دوسری طرف بھیج دیا۔ مریم آہستہ آہستہ وہاں آئی۔ وہ عیسائی بیگم اس کھیل سے واقف

نہ تھی: تاہم یہ کھیل اسے دلچسپ معلوم ہوا۔ نوری نے اسے اکبروالا کھیل بتا دیا۔

کئی گھنٹوں کے بعد جب تمام نازنینیں تھک گئیں تو اکبر مریم کا ہاتھ تھامے باہر آیا۔ اس وقت نوبت خانہ میں میٹھی میٹھی سوہنی بج رہا تھا۔ اکبر نے ایک دفعہ نوری کو اچھی طرح دیکھا اس کے گالوں کو تھپتھپا کر اس کو انعام دیا اور کھیل پوری ختم ہو گئی۔

جس طرح پاس کی جھیل میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اسی طرح نوری کے دل میں بھی جذبات موجزن تھے۔ بسنت کی چاندنی میں اُسے گمان ہوا کہ اس کا نوجوان عاشق آیا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ مولسری کے نیچے بیٹھے ہوئے اسے ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ زندگی میں اس کے لئے معاشقہ کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔ اس کا دل خوف سے کانپ رہا تھا لیکن وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ شوقِ انتظار کی کشمکش میں پڑی تھی۔

یکایک کسی نے پیچھے سے آکر کہا "میں آگیا!"

نوری نے گھوم کر دیکھا لمبے قد کا گورا سا نوجوان اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ وہ چاندنی رات میں اسے پہچان گئی، اس نے کہا۔

"شہزادہ یعقوب خاں؟"

"ہاں میں ہی ہوں۔ کہو تم نے کیوں بلایا ہے؟"

نوری سناٹے میں آگئی۔ اس سوال میں محبت کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے پوچھا۔

"آپ وہاں کیوں گئے تھے؟"

"میں اس کا جواب نہ دوں تو؟"

نوری خاموش رہ گئی۔ یعقوب خاں نے کہا۔ "تم جاننا چاہتی ہو؟"

"نہ بتایئے"

"بتاؤں تو مجھے . . . ."

"آپ ڈرتے ہیں تو نہ بتایئے"

"اچھا تو تم سچ بتاؤ کہ کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"میں کشمیر میں پیدا ہوئی تھی"

اب یعقوب خاں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"کہاں؟"

"سری نگر کے پاس ہی میرا مکان ہے"

"یہاں کیا کرتی ہو؟"

"ناچتی ہوں میرا نام نوری ہے"

"کشمیر جانے کو دل نہیں چاہتا؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"وہاں جا کر کیا کروں گی۔ سلطان یوسف خاں نے یہ مکان چھین لیا۔ میری ماں بیڑیوں میں جکڑی ہوئی مر گئی ہو گی"

"میں کہہ کر اُسے چھڑوا دوں گا تم یہاں سے چلو!"

"نہیں میں یہاں سے نہیں جا سکتی۔ مگر شہزادہ صاحب آپ جس غرض سے گئے تھے وہ میں جان گئی۔"

"تم جان گئیں تو بہتر ہے میں بھی قید میں پڑا ہوں۔ اور اکبر کے خوفناک پنجے میں پھنسا تڑپ رہا ہوں میں کل رات کو اس کے کلیجے میں کٹار بھونکنے گیا تھا۔"

"شہنشاہ کو مارنے کے لئے؟" نوری نے خوف سے چونک کے کہا۔

"ہاں نوری، تم وہاں نہ آجاتیں تو میرا کام نہ بگڑتا۔ اس کی کشمیر کو ہضم کرنے کی . . . ." یعقوب رُک کر پیچھے دیکھنے لگا۔ دور کوئی چلا یار رہا تھا۔ نوری بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں۔ نیچے جھیل کی طرف اتر گئے۔

پانی کے کنارے بیٹھ کر نوری نے کہا "اب ایسا نہ کرنا۔"

"کیوں نہ کروں گا؟ مجھے کشمیر سے زیادہ کونسی چیز عزیز ہو سکتی ہے۔ میں اس کے لئے کیا نہیں کر سکتا؟"

یہ کہکر یعقوب نے بھی سانس لی۔ اس کا حسین چہرہ اندوہ و غم سے مکدر ہوگیا۔ نوری نے جو دیکھا کہ وہ محبت کا مجسمہ ہے تو اس کے دل میں کیف و نشاط کے جذبات مشتعل ہوگئے ـــ پھر یہ تنہائی اور بسنت کی نشیلی رات' اس نے کہا۔ آپ کشمیر کو پیار کرتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو آپ کو پیار کرتے ہیں۔"

'دیوانی' میرے سامنے ایک ہی صورت ہے۔ پھولوں سے بھری ہوئی بیلوں سے لدی ہوئی سندر اور جہلم کی گھاٹیوں کی ہریالی میں اس عشق کو چھوڑ کر دوسری طرف۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

خاموش رہئے شاہزادہ صاحب آپ آہستہ نہیں بول سکتے ـــ تو خاموش رہئے"

یہ کہہ کر ایک دفعہ پھر نوری نے پیچھے دیکھا۔ وہ بے اختیار ہو رہی تھی گویا اس کے پر بہار شباب کی مرادمندی کا دن آج ہی ہے۔ اور وہ باغی نوجوان شہنشاہ اکبر کی جان لینے اور اپنی جان دینے پر تلا ہوا ہے۔

کہتے ہیں زاہد نفس کش کو متزلزل کرنے کے لئے آسمانی پریاں آتی ہیں۔ آج نوری بھی پری بن رہی تھی۔ اس نے کہا۔ تو مجھے کشمیر لے چلئے گا؟"

پھر یعقوب خاں سے اور قریب ہو کر سہمی ہوئی حالت میں اس نے پوچھا۔ بولئے مجھے لے چلئے گا؟ میں بھی سنہری بیڑیوں کو توڑنا چاہتی ہوں"

"تم مجھ سے محبت کرتی ہو نوری؟"

"دونوں جہاں سے زیادہ"۔ ۔ ۔ نوری بے خود ہو رہی تھی۔

"لیکن مجھے ذرا ایکبار پھر وہی کرنا ہے جس سے تم مجھ کو روکتی ہو۔ بچ گیا تو دیکھا جائیگا"۔ ۔ ۔ یہ کہہ کر یعقوب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نوری کانپنے لگی، اس نے اپنا حسین چہرہ یعقوب خاں کے شانے پر رکھ کر کہا

"نہیں۔ اب ایسا نہ کرو تمہیں میری قسم"

نوجوان یکایک چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جب تک نوری سنبھلے وہ اس جگہ سے غائب تھا۔ ابھی نوری دو قدم بھی چلنے نہ پائی تھی کہ ماہم تاتاری کا سخت ہاتھ اس کے کندھوں پر آ پہنچا۔ تاتاری نے کہا۔ "تمہیں سلطانہ کب سے تلاش کر رہی ہے۔

(۳)

سلطانہ بیگم اور شہنشاہ چوسر کھیل رہے تھے۔ نوبت خانے سے پہلے پہر کی سریلی شہنائی بج رہی تھی۔ نقارے پر اکبر کی تعین کی ہوئی حرکت پر چوب متحرک رہی تھی جس کی دھن میں اکبر چال بھول گیا اور گوٹ پٹ گئی۔

پٹی ہوئی گوٹ یہی نوری تھی۔ اس روز کی تھپکیوں نے اسے دلیر بنا دیا تھا۔ پانسے ہاتھ میں لئے اکبر اسے دیکھنے لگا۔ نوری نے لہجے سے کہا۔ تو میں مر گئی؟

"تو جیتی رہ مرے گی کیوں؟" پھر اکبر نے اس کا دل بہلانے کیلئے بیگم کو دیکھ کر کہا۔ "اس کا نام کیا ہے؟"

"یہ کشمیر کی رہنے والی ہے۔ اس کا نام نوری ہے، خوب ناچتی ہے" سلطانہ نے کہا

"میں نے تو اس کا ناچ کبھی نہیں دیکھا۔"

"تو دیکھئے نا"

"نوری تو اس شہنائی کی گت پر ناچ سکے گی؟"

"کیوں نہیں جہاں پناہ؟"

گویا اپنے اپنے گھر وہیں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھی ہیں، نوری کا جذبات خیز اور نشاط انگیز رقص شروع ہوگیا۔

جب کبھی وہ ایک دو گھنگرو بجا دیتی تو اکبر بے ساختہ واہ واکہہ اٹھتا۔ گھڑی بھر کے بعد شہنائی بند ہوئی تو اکبر نے اسے بلا کر کہا۔

"نوری تو کچھ چاہتی ہے؟"

"نہیں جہاں پناہ!"

"آخر کچھ"

"میں اپنی ماں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر اجازت ملے" سر نیچا کئے ہوئے نوری نے کہا

"اور کچھ نہیں؟"

"نہیں"

"اچھا میں کابل جانے لگوں تو تو بھی ساتھ چل سکتی ہے"

پھر کھیل شروع ہو گیا۔ سلطانہ اور شہنشاہ دونوں اس کوشش میں سے تھے کہ دوسرے کو شکست دیں۔ یہی تو بات ہے۔ زمانہ یہی تو چاہتا ہے کہ تم کھیلو۔ مگر ہمیشہ ہارتے رہو۔ نوری پھر گوٹ بن گئی تھی۔ اب کے پھر وہی پٹی۔ اس نے کہا: "میں مر گئی"

اکبر نے کہا "جا تو الگ بیٹھ"

تھکی ہوئی نوری پچیسی کے پاس امرائی میں گھس گئی۔ ابھی رقص کی تھکن سے انگڑائی ہی لے رہی تھی کہ ناگہاں یعقوب نے آکر اسے پکڑ لیا اور اسکے تھکے ہوئے نازنین جسم کو دبا کر کہا۔ "نوری میں تمہاری محبت واپس کرنے آیا ہوں"

نوری نے گھبرا کر کہا "نہیں نہیں! ایسا نہ کرو"

"میں آج مرنے مارنے پر تلا ہوا ہوں"

"تو کیا آج تم پھر اسی کام کے لئے۔ ۔ ۔"؟

"ہاں نوری"

"نہیں شہزادہ یعقوب! ایسا نہ کرو" آج شہنشاہ نے مجھے کشمیر جانے کی اجازت دیدی ہے۔ میں تمہارے ساتھ بھی چل سکتی ہوں"

"مگر میں وہاں نہ جاؤں گا نوری' مجھے بھول جاؤ"

نوری اسے اپنے بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھی۔ مگر یعقوب کی حب الوطنی یہ تو جب تکمیل عہد کا مطالبہ کر رہی تھی' یعقوب نے کہا "نوری! اکبر ایسا نہیں جو سر جھکانے سے مان جائے۔ وہ تو جھکے ہوئے سر پر بھی چڑھ بیٹھنا چاہتا ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں یہ خیال کر کے اطمینان و سکون سے مر سکوں گا کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے"

نوری سسک سسک کر رونے لگی اور یعقوب خاں کا شانہ اس کے آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ اپنے عزم مصمم سے بےخود ہو کر نوجوان شہزادے نے ابھی خود کو پرزور حسینہ کے بازوؤں کی گرفت سے چھڑایا ہی تھا کہ چار تاتاری لونڈیوں نے امرائی کے اندھیرے سے نکل کر دونوں کو پکڑ لیا ابھی تک اکبر کی بساط بچھی ہوئی تھی پانسے اکبر کے ہاتھ میں تھے

دونوں مجرم پیش کئے گئے۔

اکبر نے تعجب سے پوچھا: "یعقوب خاں؟"

یعقوب کی پیشانی کی رگیں کھنچی جا رہی تھیں۔ وہ خاموش تھا۔ پھر نوری کی طرف دیکھ کر شہنشاہ نے کہا۔ "تو اسی لئے تو کشمیر جانے کی اجازت مانگ رہی تھی!"

وہ بھی خاموش تھی

"یعقوب! تمہاری اس طفلانہ حرکت کو یوسف خاں بھی برداشت نہ کریگا۔ لیکن میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ جانے کی تیاری کرو۔ میں کابل سے واپس ہوتے ہوئے کشمیر آؤں گا"

لونڈیاں اشارہ پاتے ہی یعقوب کو لے چلیں' نوری کھڑی تھی' اکبر نے اس کی جانب دیکھ کر کہا "اسے برج میں لے جاؤ"

نوری برج کے قید خانے میں بند کر دی گئی۔

(۴)

اٹھارہ برس کے بعد جب اکبر کی نور تن سبھا اجڑ چکی تھی' اسکے اقبال کا آفتاب تپنے والے آخری دن کی اداس اور دھندلی چھاؤں میں گم ہو رہا تھا' ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں افسردگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس وقت اکبر کو اپنے بیٹے سلیم سے بھی خوف دامنگیر ہو رہا تھا۔ سلیم نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس لئے باپ بیٹے میں محبت ہوتے ہوئے بھی سلیم کے لئے آگرے میں رہنے کو جگہ نہ تھی۔ اس نے مجبور ہو کر اپنے مقام ولادت میں رہنے کی اجازت طلب کی۔

سلیم فتح پور سیکری آیا۔ مغل شہنشاہیت کا وہ طلسم کدہ۔ اکبر کی جوانی کا وہ زریں خواب۔ سیکری کا محل پتھر کی چٹانوں پر بکھرا پڑا تھا۔ اف اس قدر زبردست عروج و زوال۔ جہاں سے ایک عالمگیر مذہب کی منادی ہوئی۔ جہاں تعصب اور اندھی عقیدتمندی کے زمانے میں ایک چھت کے نیچے' عیسائی' پارسی' جین اور ہندو و حرم وغیرہ مذاہب پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ جہاں حضرت شیخ سلیم کا مقبرہ تھا جہاں بادشاہ سلیم پیدا ہوا تھا وہاں کھنڈروں میں درہم برہم سیکری

کا محل اکبر کی زندگی ہی میں بنا دلہن جیسے کی طرح عبرتناک حالت میں بے رونق
اور غیر آباد پڑا تھا۔ ابھی تک اکبر کی پرسکون خوابگاہ میں بکر منوت کے
نورتنوں کا ڈیرا جاری تھا۔ ابھی حضرت سلیم کے مزار کی زیارت کے لئے
ایک نہ ایک مسافر سرائے میں آتا ہی رہتا تھا۔ ابھی تک برج کے
تہ خانوں میں قیدیوں کا فقدان نہ تھا۔

سیکری کی حالت دیکھ کر سلیم کا دل تڑپ اٹھا۔ نامکمل صناعی
گریہ و بکا کر رہی تھی افتادہ کنگرے قدموں میں لوٹ رہے تھے۔ سلیم
رتی ملی کے محل میں جا کر زار و قطار رویا۔ وہاں جو چند لونڈی غلام اور
ان کے وارث باقی رہ گئے تھے۔ وہ محتاجوں کی طرح پھٹے پرانے
چیتھڑوں میں اس کے سامنے آئے سب حضرت سلیم کے مقبرے کے لنگر
خانے سے کھانا پاتے تھے۔ شہزادہ سلیم نے حضرت شیخ سلیم کے مزار کی
زیارت کے بعد سب سے پہلا حکم یہ نافذ کیا کہ تہ خانوں میں جتنے قیدی
ہیں سب رہا کر دیئے جائیں۔ سلیم کو معلوم تھا کہ یہاں کوئی سیاسی قیدی
نہیں ہے۔ گندگی سے اٹے ہوئے کتنے انسانی ڈھانچے حضرت شیخ
سلیم کے مزار پر سر رکھ کر خوشی سے ہچکیاں لینے لگے۔ اور نوجوان سلیم کے
قدم چومنے لگے۔

انہیں میں نوری بھی تھی۔ اس کا شباب قید کے مصائب کی نذر
ہو چکا تھا۔ حسن اپنے دو چار آثار چھوڑ کر وقت کے پروں پر بیٹھ کر
اڑ گیا تھا۔

سب کو کھانا ملنے لگا۔ لنگر خانے کا نیا انتظام ہوا۔ اس سرائے
میں آئے ہوئے مسافروں کو کھانا تقسیم کرنے کا کام نوری کے سپرد ہوا۔

بیساکھ کی چاندنی رات تھی جھیل کے کنارے مولسری کے
نیچے قوالوں کا جمگھٹ تھا۔ وہ مستی میں جھوم جھوم کر گا رہے تھے۔

میں نے اپنے محبوب کو دیکھا تھا۔

اسکا حسن شراب کی طرح مست کن چاندنی کی طرح روشن موجوں
کی طرح پر شباب اور ہنس کی طرح پاکیزہ تھا۔

"موت اور زندگی کا راز ان اشاروں میں مضمر تھا۔"

"آج بھی نہ جانے کیوں بھولنے سے مجبور ہوں۔

"کنجوں میں پھولوں کے جھرمٹ میں تم چھپ سکتے تھے مگر تمہارا
وہ روز افزوں حسن۔ تمہارا وہ جمال جہاں آرا تمہیں چھپنے دیگا:
"میری بے قراری کے تماشے سے مسرور ہونے والے! میں
تیرے قربان۔"

نوری وہیں کھڑی سن رہی تھی۔ وہ قوالوں کا کھانا لے کر گئی
تھی۔ اس کے بدن پر گاڑھے کا پاجامہ تھا۔ گاڑھے کی کرتی تھی
اور گاڑھے ہی کی اوڑھنی تھی۔ افسردہ اور مایوس چہرے پر عجیب
طرح کا سکون تھا۔ اس میں زبردست تبدیلی ہوگئی تھی جب وہ
استبداد کے مصائب برداشت کرتے کرتے اس کا دل سرد ہو چکا
تھا۔ وہ حضرت شیخ سلیم کے مزار پر بیٹھ کر خدا کی یاد کرنے لگتی۔ تو
اس کے دل میں دنیاوی حرص و ہوا کا شائبہ تک نہ ہوتا۔

لیکن آج اس قوالی نے نہ جانے کیوں اس کے جذبات
خوابیدہ کو بیدار کر دیا۔ وہی مولسری کا درخت تھا قوالی کا حقیقی
مفہوم خواہ کسی لامعلوم عالم کی آخری حدود تک پہنچاتا ہو۔ لیکن
نوری تو آج اس سے اپنا ہی واقعہ مراد لے رہی تھی۔

"وہ کشمیر کا شہزادہ آج کہاں ہوگا؟" نوری نے بیتاب ہو کر کھانے
کے خوانوں کو وہیں رکھوا دیا۔ اور خود اپنے بیقرار دل کو دباتے حضرت
شیخ سلیم کے مزار کی طرف چل پڑی۔

نوری سنگ مرمر کی جالیوں کے سہارے بیٹھ گئی۔ سامنے
ماہتاب نور کی بارش کر رہا تھا۔ وہ اپنے تصور میں غرق تھی۔ اس
کی پرسکون محویت کو شکست کرتے ہوئے کسی نے کہا "نوری! کیا
ابھی سرائے میں کھانا نہ جائیگا؟"

وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لنگر خانے سے روٹیوں کا خوان لیکر
سرائے کی طرف چل پڑی۔ اور سرائے کے پھاٹک پر پہنچکر بیکس اور مجبور
بھوکوں کو تلاش کر کر کے روٹیاں دینے لگی۔

ایک کوٹھڑی کے پاس پہنچکر اس نے دیکھا ایک جوان ٹوٹی

ہوئی چارپائی پر پڑا کراہ رہا ہے۔ اس نے پوچھا۔ کیا ہے۔ تم بیمار ہو کیا؟ میں تمہارے لئے کچھ کرسکتی ہوں تو بتاؤ۔"

"بہت کچھ۔" .. ٹوٹی ہوئی آواز میں بیمار نے کہا۔

نوری اندر چلی گئی۔ اس نے پوچھا۔ کیا ہے کہئے۔"

میرے پاس پیسے نہیں ہیں اس لئے یہاں کے لوگ میری خبر گیری نہیں کرتے ہیں نے آج صبح سے پانی نہیں پیا اور پاؤں اس قدر دکھ رہے ہیں کہ میں اٹھ نہیں سکتا۔"

"کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا؟"

"کل رات کو جب یہاں پہنچا تھا کچھ کھا لیا تھا پیدل چلنے سے پاؤں ورم کر آئے ہیں۔ اس وقت سے اسی طرح پڑا ہوں۔"

نوری باہر جا کر پانی لائی اور بولی ... "لو! تھوڑی روٹی کھا کر پانی پی لو" جوان اٹھ بیٹھا۔ کچھ کھانے پینے کے بعد جیسے اسے ہوش سا آگیا۔ اس نے پوچھا ..."تم کون ہو؟"

"میں لنگر خانے کی روٹیاں بانٹتی ہوں۔ میرا نام نوری ہے۔ جب تک تمہاری تکلیف دور نہ ہوگی میں تمہاری خدمت کروں گی۔ روٹیاں پہنچاؤں گی۔ پانی رکھ جاؤں گی۔ گھبراؤ نہیں۔ خدا سب کا نگہبان اور کارساز ہے۔"

جوان کی پھیلی ہوئی آنکھیں جذبۂ تشکر کے ساتھ اوپر کو اٹھ گئیں پھر ایک لمبی سانس لے کر اس نے پوچھا۔ کیا نام بتایا: نوری نا؟"

"ہاں۔ وہی تو"

"اچھا تم یہاں محلوں میں بھی ضرور جاتی ہوں گی؟"

"محل! ہاں محلوں کی دیواریں تو کھڑی ہیں"

"تو تم اسے جانتی ہو گی۔ اس کا نام بھی نوری تھا۔ وہ کشمیر کی رہنے والی تھی۔"

"اس سے آپ کو کیا کام ہے؟" دل ہی دل میں لرز کر نوری نے پوچھا۔

"ملے تو کہہ دینا کہ ایک بدنصیب نے تمہاری محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ کشمیر کا شہزادہ تھا۔ مگر اب تو گداگر سے بھی . . . . کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

نوری نے اس کے آنسو پونچھ کر پوچھا۔ "کیا اب بھی اس سے ملنے کو دل چاہتا ہے؟"

وہ سسک کر کہنے لگا۔ "میرا نام یعقوب خاں ہے۔ میں نے اکبر کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ لڑا بھی غرض کشمیر کے لئے مجھ سے جو کچھ ہوسکا کیا۔ اس کے بعد بہار کے ہولناک تہ خانے میں بیڑیوں میں جکڑا ہوا مدتوں پڑا رہا۔ سنا ہے وہاں کے بدنصیبوں کو سلطان سلیم نے پھر سے سورج کی روشنی دیکھنے کے لئے رہا کر دیا ہے۔ میں وہیں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا چلا آرہا ہوں۔ ہتھکڑیوں سے نجات پانے کے بعد کسی اپنے محبت کرنے والے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی لئے سیکری چلا آیا۔ لیکن دیکھتا ہوں وہ بھی نصیب میں نہیں ہے۔"

ادھر یعقوب اپنی اکھڑی ہوئی سانس کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ادھر نوری کے دل میں گذرے ہوئے زمانے کی یاد یعنی اپنی محبت کی پرجوش پیش کش اور جوان کی بے اعتنائی اور اس طرح کی ایک ایک کرکے ساری باتیں تازہ ہوگئیں۔

آج زندگی کا کیا نقشہ ہوتا؟ امید بھری دنیا کا سفر کس پرکیف اور پرسکون منزل تک پہنچ چکا ہوتا۔ اب تک دنیا کے کتنے دلفریب اسرار سربستہ غنچوں کی طرح اپنی پتیاں پھیلا چکے ہوتے۔ اب محبت کرنے کا زمانہ تو نہیں؟ دل میں پیار کا آبشار کہاں رہا جس سے یہ خشک درخت سرسبز ہو؟؟ نہیں نوری نے حرص و ہوا کے جال کو توڑ ڈالا ہے اب وہ اس میں نہ پھنسے گی۔ پھر بھی اس قابل رحم انسان کی خدمت تو ضروری ہے لیکن یہ کیا! یعقوب خاں ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس کی پکار کا تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ سنگدل نوری نے تاخیر کردی۔ وہ غور کرنے لگی اور یعقوب کو اتنا موقع نہیں تھا۔ نوری اس کا سر ہاتھوں پر لیکر اسے بٹھانے لگی۔ ساتھ ہی بدنصیب یعقوب کے کھلے ہوئے منہ میں نوری کی آنکھوں کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

جنابِ احمد ندیم قاسمی بی، اے

تلقین!

خون بنکر نبضِ ہستی میں رواں ہو جائیے — توڑ کر پیری کی زنجیریں جواں ہو جائیے
ہمتِ عالی کے آگے کچھ بھی ناممکن نہیں — ذرہ ذرہ چنتے چنتے آسماں ہو جائیے
کیوں فنا سے ڈر رہی ہے آپ کی "طبعِ سلیم" — عشق میں برباد ہو کر جاوداں ہو جائیے
دُور کے جلووں سے بڑھ جاتی ہے وحشت شوق کی — زندگی بنکر رگ و پے میں نہاں ہو جائیے
منجمد احساس سی مٹتی ہیں زنجیریں کہیں — آگ دیکر دل کو، میرِ کارواں ہو جائیے
یہ بھی کوئی زندگی ہے، ہو کے نومیدِ نشاط — بے بسی کے پیچ و خم میں رائگاں ہو جائیے
امن کی تلقین ہے اہلِ سیاست کا فریب — اس کشاکش میں خود اپنا امتحاں ہو جائیے
کب تک اس محدود دنیا میں غمِ سود و زیاں — توڑ کر ساحل کو بحرِ بیکراں ہو جائیے
طور پیدا کیجئے ہر گام پر مثلِ کلیمؑ — بے نیازِ آب و تابِ لامکاں ہو جائیے
تشنہ کامی میں ہزاروں مستیاں پوشیدہ ہیں — بے نیازِ منتِ پیرِ مغاں ہو جائیے
خرخشے عالم کے کھا جاتے ہیں کمزور و نکے دل — تان لیجے اپنا سینہ سخت جاں ہو جائیے

قاسمی کے زندگی افروز نغمے — رات دن
گائیے — اور شاعرِ جادوبیاں ہو جائیے

جناب عطاء اللہ پالوی

ادب لطیف کا افسانہ نمبر ۱۹۳۸ء میری نظر میں

جس طرح اساڑھ کے شروع ہوتے ہی سفید موتیوں سے بھرے ہوئے بادلوں کے منتشر ٹکڑے فضائے آسمان میں تیرنے لگتے ہیں اور موقع پا کر اپنی گہر باریوں سے تمام شجر و حجر کو سیمیں بنا ڈالتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہر سال جولائی کے شروع ہوتے ہی افسانوی فضا میں ایک خاص طرح کی رنگین تبدیلی ہو جاتی ہے اور قوس قزح کی طرح متعدد رنگوں کے حسین و جمیل افسانہ نمبر وجود میں آکر سینۂ ادب اور دامن اردو کو مالا مال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وسط جون[1] میں جناب ادیب نے ادب کا جو لطیف نمونہ پیش کیا ہے اسے بھی اسی سلسلے کی ایک سنہری کڑی اور مطلا زنجیر تصور فرمایئے۔

پیش نظر "افسانہ نمبر ۱۹۳۸ء" (۲۰۰) صفحات کا ایک قابل احترام صحیفۂ ادب اور (۳۲) منظوم و منثور افسانوی ادب کا ایک لائق قدر مجموعہ ہے۔ "افسانہ نمبر" میں افسانہ نگاری سے متعلق متعدد مضامین کی اشاعت صرف ادب لطیف کی جدت ہے جو بہر حال مستحسن ہے اس مرتبہ بھی چار مقالے اس سلسلے میں شائع کئے گئے ہیں۔ پانچواں مضمون "اردو افسانہ اور خواتین" قطعی اس سلسلے کی چیز نہیں۔ نیز اس قدر تشنہ ہے کہ اس کی اشاعت بجز ہمت افزائی کے اور کچھ نہیں سمجھی جا سکتی۔ متذکرہ مقالوں کے علاوہ (۲۷) افسانے ہیں جن میں (۲۱) منثور ہیں اور چھ منظوم۔ منظوم افسانوں میں شاکر صاحب کا افسانہ ترجمہ ہے۔ مسز ہیمنس (انگریزی شاعرہ) کی نظم "کسبیانکا" کا ترجمے میں شاکر صاحب کے قلم کا زور اور اردو زبان کے موثر اور پرشکوہ الفاظ دونوں ہیں۔

جناب احسان دانش کی کہانی "نکاح ثانی" ہماری معاشرت کی ایک نمایاں اور مصور کمزوری ہے، ساتھ ہی ساتھ حد درجہ پُردرد اور پُراثر بھی۔

حضرت الطاف مشہدی کی بلند مذاق اور انقلاب پسند طبیعت کی روانی کے کیا کہنے ہیں "خدائے بغاوت" اگرچہ سخن گستر انہ پہلو لئے ہوئے ہے لیکن اس قدر دلخراش اور صبر شکن نظم ہے۔ کہ خدا کی پناہ۔

حضرت ظفر مدیر طرح نو نے خلاف رجحان طبع اب کے ایک رومانی کہانی لکھی ہے، اور اگرچہ راوی کی روایت روایتی اعتبار سے بالکل معمولی تھی لیکن ان کی کہنہ مشقی اس میں جان ڈالے بغیر کب اس کی جان چھوڑ سکتی تھی؟

منثور افسانوں کی جامعیت بہ نسبت نظم کے زیادہ بہتر اور قابل قدر ہے۔ اکیس منثور افسانوں میں سترہ طبعزاد ہیں اور چار ترجمے ترجموں میں غالباً منجانب مرتب انتہ یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ . . . . . ہر زبان کا ترجمہ شائع کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلا ترجمہ فرانسیسی دوسرا تیسرا روسی اور چوتھا انگریزی ہے۔ اور ان میں سے باوجود اس کے کہ ہر ترجمہ . . . . ترجمہ در ترجمہ ہے۔ اپنی اپنی جگہ بہتر ہے جناب علی احمد صاحب کا ترجمہ اس لئے بہت زیادہ پسندیدہ ہے کہ انہوں نے ترجمہ کے لئے ایک ایسا لاجواب رومانی افسانہ چنا جس سے عربوں کی مروت، بہادری اور اخلاقی عظمت و جرأت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ نیز رومانیت کا جتنا عظیم و بلیغ عنصر

[1] وسط جون ہی سے امسال اساڑھ شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۱۲ر جون مطابق یکم اساڑھ تھی۔ عطاء اللہ

اس افسانہ میں پنہاں ہے یا محبت کے ادب و احترام کی جو حشمت و شوکت اس رومان میں جلوہ گر ہے مشکل ہی سے کسی دوسرے افسانہ میں ملے گی۔

راجہ مہدی اور سید احسان کے ترجموں کو اس لئے سراہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ترجمے میں دلچسپی و دلستانی کی وہی دنیا آباد کر دی ہے جو خود نگارشن اور حیوت نے اصل میں آباد کی تھی۔

"پریم کا سپنا" اس لئے اچھا کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس میں ایک خاص صنف کے کمالات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ان سب ہوں کے بعد نمبر آتا ہے ان افکار کا جو خاص ہمارے ہیں۔ ان کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ یا رائے کا اظہار بڑا ہی کٹھن کام ہے یہ اس لئے نہیں کہ ان میں کسی صاحب مضمون کے افسانہ کو بُرا کہنا فسانہ نگار اور اوڈیٹر رسالہ کے ذوق اور حسیات کو ٹھیس لگاتا ہے بلکہ جس طرح شعر و شاعری قطعی ذوقی چیز ہے۔ اسی طرح "افسانہ" کی پسندیدگی کا انحصار بھی اپنے اپنے رجحان طبع پر ہے۔

میرزا ادیب صاحب مدیر "ادب لطیف" نے "نذر اولیں" میں باوجود اس اعتراف (نذر اولیں سالنامہ ادب لطیف ۱۹۳۸ء) کے کہ۔

"یہ قارئین کی تنقیدی صلاحیت کے باب میں ایک قسم کا سوءِ ظن ہے":

"افسانہ نمبر کے تمام مضامین پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ اگرچہ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ "افسانہ نمبر" کی جامعیت پر ایک فیصلہ کن رائے دینے میں ہر قاری کو کافی مدد ملجاتی یا مل سکتی ہے۔ اور بلاشبہ میرزا صاحب نے اکثر موقعوں پر بڑی خوبصورتی سے اپنی رائے کا اظہار کیا بھی ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ اور میں اس چیز کا اڈیٹر کے قلم سے ہونا کچھ زیادہ اچھا یا مفید نہیں سمجھتا۔ کیونکہ کسی مضمون یا افسانہ کی اشاعت ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اڈیٹر نے اسے پسند کیا پھر اس پر اڈیٹر کو کچھ لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ سب سے قارئین تو وہ گویا اس صورت سے مجبور کئے جاتے ہیں کہ چاہے کوئی فسانہ اُن کے رجحان طبع کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناپسند ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ اُسے اچھا کہیں۔

جناب حکیم احمد شجاع کا افسانہ ہندی نہیں بلکہ ہندوستانی معاشرت اور سماج کے ناقابل برداشت قید و بند کے خلاف ایک نہایت بہترین احتجاج ہے۔ بلاشبہ صاحب موصوف نے انسانی زندگی کی اس دردناک ٹریجیڈی کو بہت آب و تاب سے پیش کیا ہے۔

"دریا کے اس پار" ایک دلآویز ٹریجیڈی تھی۔ جس کے بعد حاجی لق لق د جو تصویر میں ماشاءاللہ لمبے ہی لق لق نظر آتے ہیں۔ جیسے کسی منچلے شاعر نے کہا تھا کہ "تیرے فراق میں گھل گھل کے ہو گئے الف) کا "دیسی" یا "سودیشی" لاش صاحب ایسٹرن آگیں "مضمونچہ" یا "افسانچہ" درج کیا گیا ہے۔ نفسیاتی احترام کی یہ کیسی عمدہ مثال ہے؟ پھر فوراً ہی "مجرم کون؟" ایک دل ہلا دینے والی کہانی درج ہے۔

"مجرم کون؟" لاریب ایک لاجواب افسانہ ہے اور میرزا ادیب صاحب نے "نذر اولیں" میں جس عالمانہ انداز سے اس افسانہ کے محاسن کو چند سطروں میں بیان کر کے دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے وہ اور بھی قابل قدر ہے۔

"نرگس" اور "بہرام" والے سلسلے کی کہانیوں میں جس جدت و خوش بیانی کو حضرت اسلم نے راہ دی ہے اس کا اندازہ کچھ اس سلسلے کی مقبولیت ہی سے بہتر ہو سکتا ہے۔ اُن کے اس افسانے کے متعلق میرزا ادیب صاحب "نذر اولیں" میں فرماتے ہیں:-

"انسانی ہوس عروج پر پہنچ کر کیا کچھ کرتی ہے . . .
ہوس کامیابی حاصل کرنے کے لئے خوفناک نتائج کا
ہلکا سا تصور کئے بغیر خوفناک سے خوفناک جرم کا
ارتکاب بھی بآسانی کر دیتی ہے"

مجھے اس زریں قول سے قطعی اتفاق ہے۔ لیکن میں اس حقد

کے خلاف فی زمانہ یہ دیکھ رہا ہوں کہ اسی جذبہ کو جس کے زیر اثر چترلیکھا نے اتنی جانیں تلف کر دیں۔ اور جس کو مرزا صاحب نے "ہوس" سے تعبیر کیا ہے۔ افسانوں اور شعر و شاعری کی دنیا میں "محبت" کہا جاتا ہے۔ اگر واقعی عورت کی "محبت" میں جذبۂ نفس پرستی کا شائبہ نہ ہو . . . . تو عورت کی محبت "محبت" کہی جائے گی۔ اور ہم اسکو "ہوس" نہیں کہہ سکیں گے (اگرچہ ایسا ہونا قطعی ناممکن ہے) اور اگر عورت سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ محب کے دل میں یہ تمنا بھی ہو کہ اس کے محبوب کا وصال بھی حاصل ہو جائے (وہ مس یا لمس ہی کے کسی دائرہ تک محدود کیوں نہ ہو) تو ایسے بلاشبہ "ہوس" ہی کہیں گے۔ اگرچہ واقعتاً اس میں محبت کا عنصر غالب موجود کیوں نہ ہو۔ میری رائے میں عورت کی محبت نفسانی خواہشات سے منزا اور پاک نہیں ہوتی اور نہیں ہو سکتی پھر ایسی صورت میں شاعروں اور افسانہ نویسوں کی یہ رٹ کہ :-

"محبت ایک پاک جذبہ ہے۔ جو "ہوس" اور "نفس پرستی" سے بہت بلند ارفع اور اعلٰے ہے"

بلکہ اس سے بھی آگے یہ دعوے کہ :-

"محبت کی حدود اس قدر ارفع ہیں کہ تخیل کی پرواز ان کی چھو بھی نہیں سکتی"

محض لغو نہیں تو اور کیا ہے؟ اردو زبان کے مشہور رومان نویس "پریم پجاری" نے بالکل درست فرمایا ہے کہ :-

"عورت کی محبت صرف نفس کی آگ بجھانے کے لئے ہوتی ہے"

یا بقول بنگالی . . . افسانہ نگار بابو پشوتی بھٹاچاریہ :-

"محبت ہمیشہ سے ایک ہی قسم کی چیز رہی ہے یعنی بہت اچھا لگنا وقت بے وقت ظلم ہو یا کرم ایک کا دوسرے کو بہت زیادہ چاہنا بس یہی ہے محبت۔ آدمی کی اس دلی خواہش کو ہمیشہ ہی سے عشق کہا گیا ہے۔ اور ساری دنیا اس سے واقف ہے . . . کسی چیز کی خواہش اُس کے نہ ملنے تک ہوتی ہے حصولِ مراد کے بعد خواہش فنا ہو جاتی ہے شائد اسی جذبہ کا نام عشق ہے . . . . دیکھا گیا ہے کہ صرف خدا کی محبت ہی لازوال ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کوئی حاصل ہونے والی چیز نہیں ہے"

چونکہ اس عنوان پر بات نکل آئی۔ اس لئے کچھ کہدیا ورنہ میں اپنے خیالات ساقی فروری نمبر ۴۳ء میں ظاہر کر چکا ہوں۔ اور یہاں تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔ بہرکیف اسلم صاحب کا افسانہ "رشک اور محبت" کے اظہار کا بہترین نمونہ ہے۔ اور لائق صد ستائش۔

محترمہ حجاب امتیاز علی کے سحر نگار قلم کی جنبشوں سے افسانہ نگاری کی دنیا جس طرح گونج اٹھی ہے وہ اس بات کی مظہر ہے کہ یہ گونج اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اردو زبان کی حیثیت سے رائج ہے۔ پھر ایسی صورت میں یہ کیسے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے اس "انار" کی بھی لذت اس وقت تک قابل فراموش نہ ہو سکے گی۔ جس وقت تک کہ وہ قائم و دائم یا اس میں حس و حرکت کی طاقت موجود ہے؟

محترمہ حور کے افسانہ "وقت، اور محبت" میں رجعتی، حور کی پوری صفتیں موجود ہیں یعنی "دلچسپ" اور "انتہائی کہنگی و سن رسیدگی" اس کا پلاٹ اس قدر پامال ہے کہ اگر اس میں محترمہ موصوفہ دلچسپی کی کرنیں نہ لگا دیتیں تو وہ اس قابل بھی نہ ہوتا کہ پڑھا جائے۔

کوثر صاحب نے بھی "فرض اور محبت" کے انتہائی کہنہ عنوان پہ افسانہ تحریر فرمایا ہے۔ اور کیوں نہ ہو آخر "کوثر" کونسی نئی چیز ہے؟ لیکن جو چیز سے قابل قدر بناتی ہے وہ اس افسانہ کا آخری حصہ ہے "فرض" کے سلسلے میں "وطنیت" اور "محبت" کے سے اندھے جذبے کے ساتھ ساتھ "خدمت وطن" اور "آزادی" کے احترام کو پیش کرنا دور حاضر کے لئے بڑا مفید ہے اور اسی لحاظ سے کوثر صاحب

کا اف نہ قابلِ پذیرائی۔

"ماں" کے عنوان سے دو افسانے شائع ہوئے ہیں۔ جن کے مصنف دو کبیر و صغیر افسانہ نگار ہیں۔ ان دونوں ہی نے اس عنوان کے ماتحت جو پیش کرنا چاہیے تھا کیا ہے۔

"مزدور کا بیٹا" کہانی نہیں بلکہ ہندوستان کی بیچارگی، بے مائیگی اور مفلسی و کس مپرسی کا ایک آئینہ ہے۔

"آلامِ حیات" مشہور حزنیہ نویس صادق الخیری صاحب کے منثور افسانے اور "نکاحِ ثانی" احسان صاحب کی منظوم کہانی کو معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں ہم مفہوم قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرق صرف نظم و نثر اور اسلوبِ نگارش کا ہے۔ صادق صاحب نے اپنے افسانے میں صبیحہ کی جو طول و محزون زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ حد درجہ دردناک اور پُر از صداقت ہی نہیں بلکہ عبرت آموز بھی ہے۔

"اندوہِ دیوانہ" نگارش کی دلآویزی کا نمونہ ہے یا سماج کی ستم پسندیوں کی ایک حقیقی داستان۔ یہ مجھے نہیں معلوم لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں اس تلخ حقیقت کا مزہ کچھ ان ہی لوگوں کو زیادہ مل سکتا ہے اور ملے گا۔ جو اس قسم کی سماجی چیرہ دستیوں سے کسی نہ کسی نوع دوچار ہوئے ہیں یا پھر ان کی حیثیت ایک "مجبور باپ" کی ہے۔

"صحرا نورد کا چھٹا خط" کے عنوان و نمبر کے ساتھ حضرت ادیب کا طویل افسانہ "سیلِ حوادث" بھی شریکِ اشاعت ہے۔ اس سے قبل ادبِ لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۳ء میں میرزا صاحب کا جو افسانہ "نیچاوبابل" (ہاروت ماروت کا قصہ) شائع ہوا تھا۔ اس کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ بلحاظ ادب و انشا ایک ایسا لاجواب مرقع ادب ہے جس کی نظیر کو میرزا صاحب شاید ہی کوئی اور افسانہ لکھ سکیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر ششدر اور حیران رہ گیا کہ "سیلِ حوادث" (موجودہ افسانہ) موضوع، افسانویت، جذبہ اور طرز کے لحاظ سے نہ صرف اس سے بہتر ہی ہے بلکہ اپنے تمام متقدمین سے برتر اور بڑھ چڑھ کر ہے۔ ممکن ہے یہ واقعہ نہ ہو لیکن میں اپنے رجحانِ طبع کی وجہ سے اسے ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

ہندوستان اس وقت جس دماغی، ذہنی اور سیاسی کشمکش میں ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت ایسے افسانے لکھے جائیں جو ہندوستانیوں کے دماغ کی کایا پلٹنے میں مدد دیں۔ اس لحاظ سے یہ افسانہ لاجواب ہے۔ پھر اس خصوصیت اور خوبی کے ساتھ کہ "رومان" بھی مفقود نہیں ہونے پایا۔ حضرت ادیب نے (Romance) سے بیک گراؤنڈ (Background) کا کام لے کر جس خوبصورتی سے یہ افسانہ مرتب کیا ہے اس کی داد میں نہیں دے سکتا۔

"تصنیف را مصنف نیکو کند بیان" کی صحت سے کس کو جرأت انکار ہو سکتی ہے۔ حضرت اختر انصاری اپنی "خلش" کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ:-

"میرا مقصد یہ دکھانا اور ظاہر کرنا ہے کہ اوسط طبقے کے کھاتے پیتے لوگ بھوک، افلاس اور اس قسم کے دوسرے مسائل کی طرف اگر متوجہ ہوتے بھی ہیں۔ تو ان کا نقطۂ نظر کیا ہوتا ہے"

پھر اس کے بعد اور کسی کے کچھ کہنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

نسوانی دنیا کی مشہور شاعرہ حیا یا سپہرِ صحافت کی مشہور ادیبہ محترمہ خورشید نے "کسم" کی داستانِ محبت کو انصاف کے ترازو میں تولنے کی کوشش کی ہے، اور نا انصافی ہوگی اگر یہ نہ کہا جائے کہ انہوں نے افسانہ کو عنوان سے ہم آہنگ بنانے میں جو محنت کی ہے۔ جو مستحسن بھی ہے اور کامیاب بھی۔

"بیتی برت" اگرچہ (شاید) سب سے چھوٹا افسانہ ہے مگر اسکے بلحاظ قیمت بہتر ہونے کا مجھے اعتراف ہے۔

غرض تمام افسانے کسی نہ کسی خصوصیت کی بنا پر اس قابل ضرور ہیں کہ انہیں سراہا جائے۔ اور بعض تو ان میں سے ایسے

ہیں جنہیں انتہائی پسندیدگی ہی کی نہیں ۔ بلکہ مثالی نظر سے دیکھنا چاہیئے ۔

تصاویر کے سلسلے میں میرزا ادیب صاحب کو قطعی شکست ہوئی ۔ افسانہ نگاروں کی تصویروں کی اشاعت چنداں ضروری نہ تھی ۔ کیونکہ تمام ایسے مضمون نگاروں کی تصویریں جنکے مضامین شریک اشاعت ہوں حاصل کرلینا ناممکن ہے اور ایسی صورت میں زیادہ بہتر تھا کہ فنی تصویریں وہ ایک ہی حاصل کی جاتیں ۔ فقط ۔

محترمہ حبا میرٹھی لکھتی ہیں !

آج کل یہ امر مشکل ہے کہ کوئی رسالہ بیک وقت صوری و معنوی خوبیوں سے مزین ہو ۔ لیکن اس خصوص میں آپ کا افسانہ نمبر دوسروں سے بعد کافی ممتاز نظر آتا ہے ۔

افسانہ نگاری سے متعلق جتنے بھی مضامین ہیں جامع اور مکمل کہے جا سکتے ہیں ایسے مضامین کی ملک کو اشد ضرورت ہے ۔ کیونکہ یہی غلط افسانہ نگاری کی بڑھتی ہوئی رَو کو کم کرسکتے ہیں ۔ محترمہ حجاب امتیاز علی کا اور آپکا افسانہ میں نے سب سے پہلے پڑھ لیا اور یوں پر ابھی سرسری نظر ہی ڈالی ہے ..... بہن حجاب صاحبہ کا افسانہ اپنے رنگ میں بہت کامیاب اور موثر ہے ۔

آپ کے افسانے کی تعریف کرنا "چھوٹا منہ بڑی بات" نہ سمجھی جائے تو عرض کروں کہ آپ کا رومان دلچسپ و دلآویز ہونے کیساتھ ہی ایک اشتیں اور دلسوز بجذبی بھی ہے پھر وحشتناک اور دردناک جسے کم از کم میں تو ہر حیثیت سے کامیاب کہونگی تعریف سے بالاتر چیز ہے !!

"گل لالہ" اگرچہ اچھا ترجمہ ہے لیکن یہ اس سے قبل اور کہیں شائع ہوچکا ہے اسی طرح "مجرم کون" بھی میں نے کہیں پڑھا تھا ۔

بہرکیف بحیثیت مجموعی افسانہ نمبر آپ کی عرش بوس تخیل کی درخشاں تشکیل ہے اللھم زد فزد !

جناب سید الطاف مشہدی

واسطہ

نوجوانو! تم کو اپنی زندگی کا واسطہ　　مادرِ ہندوستاں کی بے بسی کا واسطہ
واسطہ ناکتخدائی کے پھٹے ملبوس کا　　واسطہ افلاس کے روندے ہوئے ناموس کا
واسطہ اُن آنسوؤں کا دیکھ کر جن کو جواں　　کود پڑتے ہیں کڑکتی بجلیوں کے درمیاں
واسطہ اُن پھول سے گالوں کا ترستے ہیں جو　　واسطہ ہونٹوں کا آہوں کی تپش سہتے ہیں جو
واسطہ بیواؤں کے سینوں سے اٹھتی ہوک کا　　واسطہ زہرہ جبینانِ وطن کی بھوک کا
واسطہ اُن کا کہ جن کی عزتیں خطرے میں ہیں　　پیٹ کے ناپاک ہاتھوں عصمتیں خطرے میں ہیں
واسطہ اُن کا کہ فاقوں کی بدولت جو غریب　　ہو رہے ہیں موت کے خونخوار جبڑوں سے قریب
واسطہ بچوں کا روتے روتے سو جاتے ہیں جو　　روٹیوں کے بدلے ماں سے جھڑکیاں کھاتے ہیں جو
واسطہ اُن نرم ہونٹوں کا کہ جن پر وقتِ شام　　گھومنے آتا ہے ٹھنڈی سسکیوں کا اژدہام

برچھیوں سے قیصریت کے جگر کو چیر کر
مادرِ ہندوستاں کی آبرو کی لو خبر

میرزا ادیب

بغاوت

کتنا دہشتناک اعلان!

شہر کی تمام آبادی خوف سے لرز رہی تھی۔ ہر ایک کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور شاہی محل کے مزدوروں کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں مسلسل چھ ماہ سے حاکم شہر کے نئے عظیم الشان محل کی تعمیر جاری تھی اور مزدور جانکاہ محنت کے ساتھ اپنے ہمت شکن و حوصلہ فرسا کام میں مشغول تھے کونسی سختی تھی جو اس مقہور و مظلوم مخلوقِ خدا پر نہیں ہوئی تھی! اور کونسا ظلم تھا جو اس بے کس و بدبخت گروہ پر نہیں کیا گیا تھا؟ طلوع آفتاب سے لیکر غروب آفتاب تک بڑے بڑے پتھروں کو زخمی شانوں پر اٹھا کر کئی کئی منٹ کا راستہ طے کرنا، انتہائی تھکاوٹ کے باوجود ایک لمحہ سستائے بغیر محل کی بلندیوں تک پہنچنا، خون پسینہ ایک کر کے بھی ارباب بست و کشاد کی گالیاں اپنے زخموں سے چور بدن پر کھانا، یہ تھا بدنصیب مزدوروں کا پروگرام اور اسی پروگرام پر وہ عمل کر رہے تھے۔ ان کے ذہن سے دن رات کا امتیاز مٹ چکا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ رات آرام کے لئے ہے مگر اُن قسمت کے ماروں کو رات کے وقت بھی آرام کہاں؟ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں صرف چار پانچ گھنٹے انہیں آرام کرنے کی اجازت تھی مگر وقت کا یہ قلیل ترین حصہ بھی نذرِ افکار ہو جاتا تھا۔

مسلسل فاقوں کے اژدہا نے اُن کا خونِ حیات چوس چوس کر انہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ اُن کے جسموں میں اب کیا تھا؟ محنت کی آگ سے برف کی طرح گھلتی ہوئی ہڈیاں، جلے ہوئے درخت کی مانند سیاہ گوشت اور اُن ہڈیوں اور گوشت کے درمیان لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی ٹمٹماتی روح! ان کی زندگی کیا تھی؟ زندگی کا خواب پریشان! اور اس زندگی کا مقصد؟ جابر حاکم شہر کے ہر اشارہ چشم و ابرو کو حکم ربانی سمجھنا اور اسکی تعمیل میں اپنی جان تک دیدینا۔

نصف سال سے وہ شبانہ روز محنت میں غرق تھے۔ حاکم کے نمک حلال ملازم ان کو وحشیانہ زد و کوب کرتے، ہر قسم کی سختی روا رکھتے یہاں تک کہ ان کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی بھی نہ دیتے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ مزدور جلد کام ختم کر دیں مگر یہ کام مزدوروں کے غم کی طرح بڑھتا ہی جا رہا تھا!

دن پر دن گذرتے جا رہے تھے۔ ہر آنیوالا لمحہ مزدوروں کے لئے نئی مصیبت لا رہا تھا۔ اور آج تو مصیبت کی انتہا ہو چکی تھی۔ شہر کی فضاؤں میں ایک انتہائی وحشتناک اعلان گونج رہا تھا! یہ اعلان کیا تھا؟

"حاکم شہر آج اپنے نئے محل میں تشریف لا رہے ہیں!"

محل کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی اور حاکم شہر پرانے محل کو چھوڑ رہا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شہر کے باشندے جانتے تھے کہ حاکم نئے محل میں منتقل ہوگا۔ مگر یہ بات اُن کے ذہن میں کبھی بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ ظالم اتنی جلد نئے محل میں آنے کا اعلان کر دے گا! وہ اتنی جلد شہر کی آرائش و زیبائش کیونکر کریں؟ حاکم کی خدمت میں نذر پیش کرنے کے لئے چمکتے ہوئے سکے کہاں سے لائیں؟ مزدوروں کو معلوم تھا کہ جب محل تعمیر ہو جائیگا تو حاکم پرانا محل چھوڑ دیگا۔ لیکن انکے دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ان کا ظالم آقا اس قسم کا وحشتناک اعلان کر دے گا! آخر ایک دن میں وہ محل کا بقیہ حصہ کیونکر تعمیر کر دیں!

والئے شہر کا ارادہ موت کی طرح اٹل اور پہاڑ کی طرح مضبوط تھا رعیت کا عذر اس کے سامنے کیا وقعت و اہمیت رکھتا تھا؟ کسمیں اتنی ہمت تھی کہ حاکم کو مشورہ دے۔ کون اتنی طاقت رکھتا تھا کہ اس کے ارادے کو بدلنے کی کوشش کرے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ فاقہ کش

رعایا کے روپے سے شہر کی آرائش و زیبائش ہونے لگی۔ بیکس مظلوم ہستیوں کی آخری پونجی سامان آرائش پر خرچ ہونے لگی۔ اور مزدوروں کا کیا حال ہوا! یہاں کا نوحہ علم ہی نہ رہا۔ نحیف و نزار مزدور ان کی عورتیں ان کے بچے محل کی تعمیر میں مصروف تھے۔ منتظمانِ محل کی خون آلود اور وحشت انگیز نگاہیں عجب سا ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں بید سانپوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ اور مزدوروں کا چمڑا ادھیڑا جا رہا تھا۔ بیکس مزدور زخموں سے چور تھے۔ ان کی کمزور اور لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا ان کے ہاتھوں سے خون نکل رہا تھا۔ مگر اس پر بھی بڑے بڑے پتھر اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ کیا مجال کہ ایک لمحے کے لئے بھی ان کے قدم رکیں۔ عورتیں موقعہ پا کر اپنے شیر خوار بچوں کو چھاتی سے لگا کر جلدی جلدی دودھ پلاتیں اور ابھی بچوں کے حلق سے دو چار قطرے ہی نیچے اترتے کہ ان مظلوم ہستیوں کی پیٹھ پر دھڑا دھڑ بید پڑنے لگتے۔ وہ روتے ہوئے چیختے ہوئے بچوں کو وہیں چھوڑ کر پھر کام میں مشغول ہو جاتیں۔ اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا؟

سردی اس بلا کی تھی کہ الامان والحفیظ! مگر مزدوروں کو اس سردی سے کیا؟ حاکم شہر اور اس کے نمک حلال ملازموں کی نگاہوں میں مزدور کے جسم انسانی جسم نہیں تھے! مزدوروں کی زندگی کا مقصد تو موسم کے تمام اثرات سے بالکل بے نیاز ہو کر مشین کی طرح کام کرنا ہے۔ اگر وہ سردی و گرمی سے متاثر ہونے لگیں تو پھر ان کے اور دوسرے لوگوں کے جسموں میں کیا فرق رہ جائے؟

مزدور برابر کام میں منہمک تھے محل اور شہر کی آرائش کا منتظم اعلیٰ "جابر خان" ہاتھ میں مضبوط بید پکڑے مزدوروں میں پھر رہا تھا۔ زخمی بازو اور زخمی ہو رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی کام کی رفتار میں اور تیزی پیدا ہو رہی تھی۔ شہر کی رپورٹ برابر جابر کے کانوں تک پہنچائی جا رہی تھی۔ وہ بے حد مسرور تھا کہ اس کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔ شہر دلہن کی طرح سجایا جا رہا ہے۔ لوگ اپنی آخری پونجی بھی آرائش کی نذر کر رہے ہیں!

جابر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دے دیا کہ لوگوں پر ہر قسم کا ظلم کریں جو آرائش میں حصہ نہ لے اس کی کھال ادھیڑ دیں! اور یہ سکیم پوری طرح کامیاب ہو رہی تھی!

مزدور رات سے کام کر رہے تھے۔ وہ پہلے ہی فاقوں سے نڈھال تھے۔ اور اب تو محنت شاقہ کی بدولت ان میں مزید محنت کی طاقت نہیں تھی! جب پیٹ میں روٹی نہ ہو تو ہاتھ کیونکر کام کریں؟ جابر کے پاس بار بار شکایت جا رہی تھی۔ کہ مزدور بھوکے ہیں مگر اسکے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی! جو بھی شکایت کرتا اسکا جسم ادھیڑ دیا جاتا! نصف دن گذر گیا تھا اور اس دوران میں کام کرنے والوں کے پیٹ میں ایک دانہ تک نہ گیا۔ معصوم بچے بھوک سے تڑپ رہے تھے ماؤں کی چھاتیاں قریباً سوکھ گئی تھیں اور ظلم پر ظلم یہ کہ وہ سوکھی ہوئی چھاتیوں سے بھی اپنے بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کو نہیں لگا سکتی تھیں۔ جابر گرجتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"آج بادشاہ سلامت محل میں آ رہے ہیں۔ اگر محل تیار نہ ہوا تو تمام مزدوروں کو ان پتھروں کے نیچے کچل دیا جائیگا۔ کام کرو پھر آرام ہی آرام ہے"۔

مگر بھوکے انسان کام کیونکر کریں! ان کے بازوؤں میں سکت کہاں؟ ان کے بازوؤں میں طاقت کہاں؟؟ بید مار مار کر جابر کے بازو تھک گئے تھے لیکن ابھی تک اس کے ظلم و ستم میں کمی نہیں آئی تھی اس نے اپنے ماتحتوں کو اجازت دے دی تھی کہ مزدوروں کو بغیر کسی اندیشے کے زد و کوب کریں! کئی مظلوم مزدور بیہوش پڑے تھے۔ مگر اب بھی ان کے جسموں پر بید پڑ رہے تھے۔

"صمدو" بھی مزدور تھا مگر پڑھا لکھا۔ مزدوروں میں اسکی ذات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور وہ اسی کی وساطت سے اپنے مطالبے آقاؤں کے کانوں تک پہنچاتے تھے۔ سب مزدور بار بار ملتجیانہ نگاہوں سے صمدو کو دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ اپنے کام میں مشغول تھا۔ سب حیران تھے کہ ان کا پُرجوش راہنما آج کیوں خاموش ہے؟ کیوں

ان کی ترجمانی نہیں کرتا! صمدو کی بیوی بھی اپنے شوہر کی اس روش پر متعجب تھی!

"ہم بھوکے مر جائیں"! ایک مزدور نے صمدو کے قریب آکر کہا یکایک فضا میں کرخت آواز گونجی اور اس بے چارے کی پشت پر بید پڑنے لگے: "تم بھوکے نہیں مروگے مگر اس طرح ضرور مروگے!" جابر بید مار مار کر کہنے لگا۔ صمدو اب بھی خاموشی سے کام کر رہا تھا۔ مزدوروں کو یقین ہوگیا کہ صمدو جابر کے ساتھ ملگیا ہے ورنہ اسکی خاموشی و اطمینان کی وجہ کیا ہے؟ یہ خبر صمدو کے کان میں پہنچی! اس نے زور سے پاؤں زمین مارے اور ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ جابر محل کے اوپر جاکر کام کرنے والوں کے کام کا معائنہ کر رہا تھا۔ تمام مزدور صمدو کی طرف دیکھنے لگے۔

"کام کیوں نہیں کرتے؟" صمدو نے بلند آواز سے مزدوروں سے پوچھا۔

"مر جائیں گے!" تین چار مزدوروں نے بیک آواز کہا۔

"تو مر جاؤ۔ کون کہتا ہے تم زندہ رہو!" صمدو نے کہا اور ایک طرف چلا۔ یکایک اس کے کان میں آواز آئی "ابا"! اس نے مڑکر دیکھا۔ اسکا ننھا لڑکا درخت کے نیچے ہاتھ میں درخت کے پتے پکڑے کھڑا تھا صمدو ٹھہر گیا۔ ننھا لڑکا بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔

"ابا بھوک" بچے نے کہا۔

"تو میں کیا کر دوں؟" صمدو نے غصے سے کہا۔ بچہ سہمکر باپ کو دیکھنے لگا۔ نہ معلوم صمدو کے دل میں کیا آئی۔ کہ اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔

"منو! تم ہاتھ میں کیا پکڑے ہو؟"

"پتے ہیں ابا!" بچے نے جواب دیا۔

"کیوں پکڑ رکھا ہے انہیں!"

"ابا یہ درخت سے گر پڑے اور میں نے انہیں اٹھالیا۔ ابھی یہ گر رہے ہیں۔۔۔ بہت سے گر رہے ہیں۔۔۔۔ ابا یہ کیوں گرتے ہیں؟"

"ہوا انہیں گرا دیتی ہے؟" باپ نے کہا۔

"ابا! ہوا پتوں کو گرا دیتی ہے۔ مگر درخت کو کیوں نہیں گراتی؟" بچے نے سوال کیا۔

"آندھی درخت کو بھی گرا دیتی ہے!"

"آندھی سے پہاڑ بھی گر پڑتے ہیں ابا!"

"نہیں منو! آندھی پہاڑوں کو نہیں ہلا سکتی"

"کیوں؟"

"کیونکہ۔۔۔۔ ابھی صمدو کے منہ سے ایک لفظ ہی نکلا تھا۔ کہ "سٹاک" کی آواز آئی۔ صمدو جلدی سے بچے کو اتار کر اپنی پیٹھ ملنے لگا۔ قہر و غضب کا طوفانی جذبہ اُس کے دل و دماغ سے ٹکرایا۔ ٹکرایا اور پھر مردہ! اس بے کسی کے احساس میں تحلیل ہوگیا۔

"اسی طرح کام کیا جاتا ہے بدبخت؟" جابر نے اُس کی ٹانگوں پر بید مارتے ہوئے کہا۔

"حضور! میں تو کام کرتا رہا تھا اور۔۔۔"

"یہ کام کر رہے ہو یا لونڈے کو گود میں اٹھائے سیر کر رہے ہو"

"حضور!" صمدو آگے کچھ نہ کہہ سکا!

"کیوں فیروز! یہ کب سے یہاں ہے؟" جابر نے ایک مزدور سے مخاطب ہوکر کہا۔

"حضور! یہ ہم سب سے زیادہ کام کرتا ہے۔۔۔ حضور!" فیروز نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"بکواس! جھوٹ۔ تم لوگوں نے مجھے بہت ستا رکھا ہے جی چاہتا ہے تم سب کو پھانسی لگا دوں، اتنا دن بیت گیا اور ابھی کام کا وہی حال ہے۔ ذرا شہر میں جاکر دیکھو۔ بڑوں کا تو کیا ذکر، بچوں کو بھی کھانے پینے کا دھیان نہیں ہے۔ لوگ مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں! مگر تم۔۔۔۔ ذلیل انسان!" یہ کہتے ہوئے جابر نے دو تین بید صمدو کے جسم پر لگا دیئے!

"مگر ہم بھوکے ہیں" صمدو نے کہا۔

"بھوکے" جابر نے گرج کر کہا "جب تک کام ختم نہیں ہوگا تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی چھٹی نہیں مل سکتی!"

"ہم بھوکے مر جائیں گے!" صمدو بولا۔

"مرو یا زندہ رہو مجھے کیا ہیں بادشاہ سلامت کے آنے سے پیشتر مکمل محل دیکھنا چاہتا ہوں"

"تو پھر محل جادو کے ذریعے سے مکمل ہوگا!" صمدو نے کہا۔

"اتنی جرأت!" جابر گرج کر بولا۔ صمدو خاموش رہا۔

"گویا تم کام کرنا نہیں چاہتے؟" جابر کی گرجتی ہوئی آواز نے کہا۔

"بھوکے رہ کر کام نہیں ہو سکتا!"

جیسے ہی صمدو کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ جابر کی آنکھیں غصے سے خون آلود ہو گئیں۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا اور مزدور کو خونخوارانہ دیکھنے لگا۔

"صمدو! آج تمہاری موت آئی ہے شاید!"

"موت آ جائے تو ان دکھوں سے نجات نہ ملے۔"

ایک حقیر مزدور کی اتنی جرأت جابر غصے سے آگ بھبوکا ہو گیا اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ دس بارہ سپاہی بید ہاتھوں میں پکڑے وہاں پہنچ گئے۔

"اس بدبخت کو رسّوں سے باندھ کر سزا دو" جابر نے صمدو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تمام مزدور کام چھوڑ کر اس منظر کو دیکھ رہے تھے جیسے ہی جابر نے ان کی یہ حالت دیکھی وہ بے رحمانہ انہیں پیٹنے لگا۔ مزدور کام میں مصروف ہو گئے۔ سپاہی صمدو کو پکڑ کر ایک آہنی ستون کے پاس لے گئے۔ اسے ستون کے ساتھ رسّوں سے کس کر باندھ دیا اس کے سر پر بڑا سا پتھر رکھ دیا اور بیدوں سے اس بدنصیب کی کھال ادھیڑنے لگے۔ صمدو کی بیوی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہاں پہنچی اور سپاہیوں کی منت سماجت کرنے لگی۔ اس کے جواب میں ایک بید اس کے سینے پر لگا۔ اس نے لمبا سانس لیا اور اپنے شوہر سے چمٹ گئی۔ سپاہیوں نے جابر کی طرف دیکھا۔ جابر نے بے پروائی سے اپنا سر ہلا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ظالم بید دو نحیف و نزار جسموں پر برسنے لگے مظلوم عورت نے مزدوروں کی جانب اس انداز سے دیکھا کہ ان کی رگوں میں غیرت جوش مارنے لگی۔ انہوں نے کام چھوڑ دیا اور تمام کے تمام ستون کی طرف چلے۔ سپاہیوں کے ہاتھ رک گئے۔ دو تین مزدوروں نے آگے بڑھ کر صمدو کو رسّوں سے آزاد کر دیا۔ آزاد ہوتے ہی وہ دھم سے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ صمدو کا معصوم بچہ ابھی تک درخت کے نیچے سہمی ہوئی نظروں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہ بھی بھاگتا ہوا مجمع میں پہنچا اور ماں کو آوازیں دینے لگا

جابر نے سب کچھ دیکھا اس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ عجلت کے ساتھ وہاں پہنچ کر اس نے مزدوروں کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ مگر مزدور ٹس سے مس نہ ہوئے زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ جابر کے دل میں مزدوروں کی طرف سے قدرے خوف پیدا ہوا۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا اور سپاہیوں کو خاص اشارہ کر کے مزدوروں سے مخاطب ہوا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟"

"ہم بھوکے ... روٹی ... ظلم ... بھوک ... چھٹی!" اس قسم کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔

"مگر کام تو ابھی ختم نہیں ہوا۔ بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں ... دیکھو معاملہ کتنا نازک ہے۔ انعام ..." جابر کی بقیہ آواز مزدوروں کے شور و غوغا میں ڈوب گئی۔

"کام کرو ... تمہیں انعام دیا جائیگا!"

"بھوک ... چھٹی"

یکایک ایک طرف سے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے ظاہر ہوئے جابر کی آنکھیں خونخوار ہو گئیں سامنے بید اوپر اٹھایا اور گرجتی ہوئی آواز میں کہا "کام کرو ورنہ تمہاری تکا بوٹی کر دی جائیگی"

مزدوروں کے دل میں جوش کا سمندر لہرانے لگا۔ مگر اس سے پیشتر کہ اس سمندر کی لہریں ظلم کی طرف بڑھیں بے شمار اسپ سوا

سپاہی ہاتھوں میں بید پکڑے وہاں پہنچ گئے۔ مزدوروں پر سراسیمگی کا عالم طاری ہوگیا۔ جابر بید برسانے لگا۔ سپاہیوں نے بھی اس کی تقلید شروع کر دی۔

صمدو کی مظلوم بیوی خون میں شرابور شوہر کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اچانک اس کے کان میں اپنے معصوم بچے کی آواز آئی۔ وہ بےتاب ہو کر اٹھی اور اپنے لخت جگر کو ڈھونڈنے لگی۔ گھوڑے مزدوروں میں سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ بیکس ہستیوں پر بید برس رہے تھے۔ زخمی مزدور فرش پر گر رہے تھے۔ دھڑم دھڑم کی آوازیں ہائے ہائے کی آوازوں میں ڈوب رہی تھیں۔ خون کے چشمے ابل رہے تھے ہر طرف بھاگڑ مچ گئی تھی۔ ماں کو ابھی تک اپنا بچہ نہیں ملا تھا۔ وہ گرتی پڑتی لہولہان جسم، بید کھاتی، بار بار پیشانی خون پونچھتی اپنے لخت جگر کو تلاش کر رہی تھی۔ اسی اثنا میں اس کو بچہ نظر آیا۔ وہ برق رفتاری سے بچے کے پاس پہنچی اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ یکایک چار پانچ مزدور اس پر گرے۔ وہ سنبھل نہ سکی اور بچے کو گود میں لئے گر پڑی مزدور جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ بید برس رہے تھے۔ ماں نے بچے کو چھاتی سے چمٹایا ہوا تھا۔ مزدور اس پر سے گزر رہے تھے۔ ایک طرف سے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے آئے اور ان دو مظلوم ہستیوں کو کچلتے ہوئے گزر گئے۔ ماں کے منہ سے خون کا فوارہ چھوٹ نکلا۔ بچے کا سر کچل گیا۔ ماں نے بچے کے کچلے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا اور دم توڑ دیا۔ بچے نے جلدی دو تین سانس لئے اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد ہنگامہ ختم ہوگیا مزدور پھر کام میں مشغول ہوگئے۔ محل کی عمارت بیکسوں کا خون حیات چوس چوس کر مکمل ہونے لگی۔ جابر کے انتہائی ظلم و تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مزدور روٹی کا لفظ بھی زبان سے نکالنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ تمام کے تمام جانکاہ محنت میں مصروف تھے۔

آخر محل مکمل ہوگیا۔ جابر کی باچھیں کھل گئیں۔ روٹیاں مزدوروں میں تقسیم ہونے لگیں۔ بھوکے مزدور بے تحاشا روٹیوں پر گرے۔ اور پیٹ کی آگ بجھانے لگے۔ متعدد زخمی مزدور خون میں تڑپ رہے تھے۔ مگر ان کی طرف کون توجہ کرتا۔ ہر ایک کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی!

مزدور پھر کام میں منہمک ہوگئے۔ محل کے دروازوں اور راستوں کو سجایا جانے لگا۔

ہوا کے تند جھونکے درختوں کے پتوں کو گرا رہے تھے۔ فضاؤں میں سیاہ بادل لہرا رہے تھے۔ سورج کبھی ظاہر ہو جاتا تھا۔ اور کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔

جابر، سپاہی اور مزدور شاہی جلوس کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔ چند تھکے ماندے مزدور گھروں کو روانہ ہوگئے اور باقی جابر کے ساتھ رہے۔ زخمی مزدور اٹھنے لگے۔ صمدو بھی اٹھا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جیسے اس کی نگاہیں اپنی بیوی اور بچے کی لاشوں پر پڑیں اس کے سامنے تاریکی کے بادل لہرانے لگے۔ وہ بے اختیاری کے عالم میں لاشوں پر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ مگر چند ہی لمحوں میں اس کی آنکھیں خشک ہوگئیں۔ اس نے سر اٹھا کر محل کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ وہ ناخنوں سے فرش کو کریدنے لگا۔ اس کی رگ رگ میں اضطراب کی لہریں تڑپنے لگیں اور دل کی گہرائیوں میں غصہ و غضب کا تلاطم برپا! اتنے میں ایک گرم ہاتھ اس کے پہلو سے لگا۔ صمدو نے مڑ کر دیکھا۔ فیروز اس کے پہلو میں خون میں شرابور پڑا تھا۔ صمدو نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔

"فیروز!" صمدو نے کہا۔

فیروز کے لبوں کو جنبش ہوئی اور ایک ہلکی سی آواز پانی کہتی ہوئی تھرتھرائی۔ صمدو اٹھا اور ندی کی طرف تیزی کے ساتھ چلنے لگا اور چند لمحوں کے بعد اس کے ہاتھ زخمی مزدور کے منہ پر پانی کی بوندیں ٹپکا رہے تھے۔ فیروز کو کچھ دیر کے بعد ہوش آ گئی وہ اٹھا اور اٹھتے ہی لاشوں کو دیکھا۔

"ظلم کی انتہا ہو چکی فیروز!" صمد نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا
"ہاں" فیروز کے منہ سے نکلا اور وہ پنکھے کے نخے سے ہاتھ کو اٹھانے لگا۔ بچے کی مٹھی میں دو تین چنے نظر آرہے تھے۔ صمد کی آنکھیں اور سُرخ ہو گئیں "ظلم کی آندھی ہمیں درخت کے حقیر پتوں کی طرح اُڑاتی رہی۔ اور ہم بزدل اس آندھی کا مقابلہ نہ کر سکے!"

"لیکن آندھی اور پتوں کا مقابلہ؟" فیروز نے کہا۔

"قصور ہمارا ہے۔ ہم درخت کے پتے کیوں بنے۔ پہاڑ کیوں نہ بنے؟"

"ہماری قسمت!"

"قسمت۔۔ قسمت کیا؟ یہ ہمارا قصور ہے۔۔ ہم نے سب کچھ کھو دیا۔ مگر اب۔۔ اب" فرطِ غم و غصہ سے صمد آگے نہ بول سکا۔

فیروز اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ صمد بھی کھڑا ہو گیا دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں۔ چند لمحے گذر گئے۔

"موت سے پہلے انتقام" صمد نے اپنے ساتھی کے ہاتھ کو زور سے دباتے ہوئے کہا۔ فیروز نے زور سے سانس کھینچا اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

شاہی جلوس کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں مگر محل سے دور صمد اور فیروز زخمی مزدوروں کو پانی پلانے اور ان کے زخموں پر پٹیاں باندھنے میں مصروف تھے۔!

حاکمِ شہر کا جلوس شاہانہ کر و فر، خدم و حشم کے ساتھ آراستہ و پیراستہ بازاروں میں سے گذر رہا تھا۔ والئے شہر کی گاڑی میں آٹھ اسپانِ تازی جتے ہوئے تھے۔ اور وہ امرا کے درمیان حاکمانہ غرور و تمکنت کے ساتھ سونے کے تخت پر جلوہ فگن تھا۔ شاہی گاڑی کے ارد گرد حکامِ شاہی کی گاڑیاں چلی جا رہی تھیں' ہر ایک افسر کا چہرہ اس جاہ و جلال' اس عظمت و برتری کے احساس سے سُرخ تھا۔ اور حاکم کی نگاہیں اِدھر اُدھر اس تحکمانہ انداز سے دیکھ رہی تھیں۔ گویا زمین کے ذرّں سے لیکر آسمان کے ستاروں تک جو کچھ ہے اسی کی حکومت میں ہے۔ رعیت کے بدنصیب افراد جھک جھک کر اپنے والئے نعمت کو سلام کر رہے تھے۔ بگل کی خوش آئند آواز فضا میں گونج رہی تھی۔

حاکم کا جلوس بڑھا چلا جا رہا تھا۔ ایک تو حاکم کا شخصی دبدبہ طنطنہ اور پھر جلوس کی یہ شان' رعایا کوئی شخص ایسا نظر نہ آتا تھا جس کی نگاہیں مبہوت و ششدر' متاثر و مرعوب نہ ہوں۔ جس کے دل میں اپنے آقا کی عظمت و حشمت' جبروت سطوت کا خیال قوی نہ ہو گیا ہو۔

اب جلوس اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے نئے عظیم الشان محل کے کنگرے صاف نظر آرہے تھے۔ حاکم کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ افسروں کی نگاہیں فرطِ مسرت سے چمکنے لگیں۔ رعایا کے لبوں پر بھی تبسم ظاہر ہوا۔ مگر یہ تبسم روکھا پھیکا اور افسردہ تھا۔

بگل پر بگل بجائے جا رہے تھے۔ فوجی ترانے گونج رہے تھے مسرت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ یکایک گاڑی کے پہیے خود بخود رک گئے۔ لوگوں کی متحیر نگاہوں نے دیکھا کہ پہیوں سے انسانی پیکر چمٹے ہوئے ہیں' ایک ہنگامہ پیدا ہوا۔ اچانک سیاہ بادل کی طرح انسانوں کا ہجوم اٹھا۔ اور شاہی گاڑی پر حملہ آور ہو گیا۔ خدام کی تلواریں میانوں سے نکل آئیں۔ یکایک حاکمِ شہر کے پاس صمد کے ہاتھ میں تیغہ چمکا اور دوسرے لمحے میں حاکم کی گردن نصف سے زیادہ کٹ گئی "صمد" کہتی ہوئی آواز فضا میں گونجی۔ صمد نے دوسرا وار کیا اور حاکم کی گردن کٹ کر گر پڑی۔ خدام کی تلواریں صمد اور دوسرے مزدوروں کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگیں۔ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ سپاہیوں کی عریاں تلواریں بے رحمانہ لوگوں کا خون چوسنے لگیں۔ ہر طرف محشر برپا ہو گیا۔

بغاوت کی وہ چنگاریاں جو مدت سے رعایا کے دل کی گہرائیوں میں سلگ رہی تھیں' اب ظالم حاکم کے اس انجام کو دیکھ کر آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ حاکم کے مرصع تاج کے جواہرات اور

موتی بھو کی رعایا کے پاؤں کے نیچے خاک میں ملنے لگے۔ آرائش و زیبائش کا سامان ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ افسروں نے ہر حربہ کر چال چلی۔ مگر اب انسانی غیض و غضب کے سمندر میں تلاطم آگیا تھا، کمزور بازوؤں میں بجلیوں کا سیلاب موجزن تھا۔

باغی انسانوں کا آتشیں طوفان محلوں سے افسرانِ حکومت کی شاندار عمارتوں سے شاہی قلعوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ٹکرا ٹکرا کر سب کو خاکستر بنا رہا تھا۔

آناً فاناً فضا کی وسعتوں میں ایک سیاہ بادل نے افسردہ سورج کو نگل لیا۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی اور اس بھیانک تاریکی میں صرف بغاوت کے آتش ناخوش شعلے ظالم حکومت کو خس و خاشاک کی طرح جلا رہے تھے۔

جناب احسان دانش

غزل

انداز حشر میں یہ شہیدِ وطن کے ہیں
فریاد لب پہ ہاتھ میں ٹکڑے کفن کے ہیں

مجھ تک پہنچ کے گردشِ ساغر ہی رک گئی
یہ شعبدے بھی گردشِ چرخِ کہن کے ہیں

خورشید و ماہتاب ہوں یا پھول یا گہر!
دھندلے سے کچھ چراغ تری انجمن کے ہیں

ہاں ہاں بجا کہ گل نہیں کانٹوں سے آشنا
کانٹے تو رازدارِ بہارِ چمن کے ہیں

کرتے نہیں شکستِ خودی کو کبھی پسند
قائل جو لوگ عظمتِ دار و رسن کے ہیں

احسانؔ تیرے شعر پہ ہوتا ہے یہ گماں
یہ نالہ ہائے درد کسی بے وطن کے ہیں

جناب قیسی رامپوری

تاوان

کچھ عرصہ سے ماشاءاللہ میری تجارت بڑے فروغ پر تھی پیسہ روز بروز برس رہا تھا۔ ان دونوں چیزوں کا اتصال ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے . . . جوانی اور دولت۔ اس باب میں قدرت نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ دونوں کی حفاظت ہوتی رہے۔ جوانی کی کمی دولت سے اور دولت کی انحطاط جوانی سے۔ اگر اتفاق سے یہ دونوں یکجا جمع ہو جاتی ہیں تو دونوں کو خطرہ لاحق ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دولت سمجھدار ہے اور جوانی دیوانی۔ لیکن یہ سمجھدار چیز بھی جب کسی دیوانہ کے پلے پڑ جاتی ہے تو وہ بھی بے وقوف بنے بغیر نہیں رہتی۔ چنانچہ میں نے ان دونوں خوب زر کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس سے زر وہ خدمتیں لے رہا تھا کہ اسکا ناک میں دم آ گیا تھا۔ دجنوں نوکر، کئی کئی کار، ہم تو جب جانیں کہ کسی اشتراکی صاحب کو بھی یہ نصیب ہو جاتے اور وہ پھر بھی اشتراکیت کا کلمہ پڑھتے رہیں: ناممکن۔

اب سوائے اس کے کوئی مشغلہ نہ رہا تھا کہ پڑے پڑے سوئے ہوں اور توند بڑھائیں۔ مجھ کو موٹاپا عطا کرنے میں قدرت نے ہمیشہ بے اعتنائی برتی ہے لیکن اس بار اس کی توجہ خاص تھی میں بھی حیران رہ گیا جب میں نے دیکھا کہ ایک مہینے میں دس سیر کے قریب میرا وزن بڑھ گیا ہے اور یہ رفتار بہت تیز ہے۔ اسکے یہ معنی کہ سال بھر میں ہم پورے تین من گوشت چڑھا لیں گے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ہم کو اپنا سلسلہ نسب خاندانِ فیل سے ملا لینا پڑے گا۔ خیر دیکھا جائیگا۔

جب فربہی حد سے زیادہ متجاوز ہونے لگی تو مجھے بڑا تردد ہوا ابھی مجھے اپنی شادی کرنی تھی۔ کوئی نازنین مجھ دیو کو کیوں پسند کرنے لگی یہ ہو سکتا تھا کہ اس کی نازنینی بھی میرے پاس آ کر عیش کے سانچے میں ڈھل کر "اختیار" کر لیتی مگر مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے سمجھوتے کے بعد بھی کسی نازنین کا راضی ہونا دشوار تھا۔ اب ذرا دبلا ہونا چاہیئے۔ میں نے سوچا۔

اور تو کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ شکار کی ٹھانی۔ کچھ ملے یا نہ ملے لیکن ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے سے امید تھی کہ گوشت کم ضرور ہو گا۔ دوسرے روز ہم نے بندوق اٹھائی اور دور دور کا سفر شروع کر دیا۔ ابتدا میں تو بہت تکلیف ہوئی لیکن بتدریج طبیعت اس صعوبت کی عادی ہونے لگی۔ کچھ عرصہ کے بعد تو اس میں خاصہ لطف آنے لگا۔

ایک روز میں اپنے ازدواجی مستقبل پر سوچتا چلا جا رہا تھا — برنارڈ شا کتنا سمجھدار آدمی ہے کہ وہ شروع سے محبت زوجین کا قائل ہی نہیں ہے۔ لیکن حیرت اس پر ہے کہ اس کے باوجود وہ اپنی بیوی کا شیدائی ہے۔ یہ متضاد بات کیسی؟ ہوگی مجھے اس سے کیا۔ اگر میں کبھی کسی لڑکی سے محبت کرنے کی حماقت کر بیٹھا تو قدرت کو اپنے نوامیس میں تبدیلی پیدا کرنی پڑے گی۔

شام ہوتی جا رہی تھی اور شکار کا پتہ نہ تھا۔ آخر میں نے جھاڑی میں اونگھتی ہوئی ایک فاختہ سے اپنی دن بھر کی ناکامی کا انتقام لینا چاہا۔ نشانہ لگایا اور فیر کر دیا۔ ایک کرب کی چیخ بلند ہوئی۔ اسکے بعد سناٹا۔ میں دوڑ کر جھاڑی کے اُس طرف گیا۔ اور حیرت و تاسف میں ڈوب گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھا گھسیارا خاک و خون میں تتھڑا ہوا پڑا دم توڑ رہا ہے۔ اور اس کے پاس ایک

لڑکی بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ یہ کیا غضب ہوا۔ افسوس میں نے اس غریب بوڑھے کو مار دیا۔

گھبراہٹ میں میں نے بندوق ایک جھاڑی میں پھینکی اور لپک کر لڑکی کے قریب گیا۔ بوڑھا سرد ہو چکا تھا۔ اسکا مصائب پرورده نحیف جسم اینٹھ اینٹھ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا اور اس کے خشک جسم میں سے میری کمبخت گولی نے اسکا خون حیات نچوڑ کر خاک میں جذب کر دیا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ جنگلی لڑکی شیرنی کی طرح اٹھی اور گریہ کے درمیان سیاہ ترین بد دعائیں میرے اوپر صرف کرنے لگی میں نے اس کو تسکین دی اور دروغ کی بابرکت قوت سے کام لیتے ہوئے کہا "تم مجھے کیوں کوستی ہو میں نے اس بڈھے کو نہیں مارا ہے بلکہ ایک سوار ادھر سے گذر رہا تھا اس نے ایک فاختہ پر اپنی بندوق خالی کی تھی۔ اتفاق سے گولی تمہارے باپ کے جا لگی۔ بندوق کی آواز اور تمہاری گریہ زاری سن کر میں ادھر آنکلا ہوں۔ . . ."

"وہ کہاں ہے سوار؟ میں اس کی بوٹیاں نوچ ڈالوں گی۔ ہائے میرے بوڑھے باپ نے اس کا کیا بگاڑا تھا کہ پاپی اس کو مار گیا تم قصبے کے رہنے والے سب کے سب مردم خور ہو۔ ہم غریبوں کا گوشت کھا کھا کر موٹے ہوتے ہو۔" یہ تھا جو کچھ اس نے اپنی زبان سے کہا اسکا مفہوم۔ اچھا تو میرے موٹاپے کا احساس اس دیہاتی دوشیزہ کو بھی تھا لیجئے۔ اب ایک شہری لڑکی کی نظر میں ہم کیا رہے

"تمہارے اور کوئی رشتہ دار ہیں؟"

"میں دنیا میں اب بالکل تنہا رہ گئی۔ ایک باپ کا سہارا تھا اُس کو بھی تم پاپیوں نے مار ڈالا۔"

"لڑکی تو دیوانی تو نہیں ہو گئی ہے۔ بار بار لئے جاتی ہے میرا نام۔ کہہ تو دیا کہ میں نے نہیں مارا اسے"۔

"ہائے میں اب کہاں جاؤں کیا کروں؟ بابا جی تم مجھے اکیلے چھوڑ کر چلدیئے۔ میں تنہا کیسے اپنے باپ کا کریا کرم کروں گی"۔

یہ ٹیڑھا سوال تھا۔ بہر نوع ہم نے بمشکل گھاس پھوس اور لکڑیاں جمع کر کے بڈھے کی چتا تیار کی اور اس خاموش و تاریک جنگل کو اس انسان نے روشن کر دیا جس کو کبھی عمر بھر میں ایک بار بھی دئے سے اپنا گھر روشن کرنا نصیب نہ ہوا ہوگا۔

چتا کے بلند شعلوں میں میں نے اس پروردۂ آلام لڑکی کو دیکھا ایک جوان مگر مضمحل سی سیاہ فام لڑکی تھی جس کا مستقبل دفعتہً اس طرح ختم ہو گیا تھا جس طرح دریا کے پاس پگڈنڈی غائب ہو جاتی ہے۔ دنیا میں وہ بالکل بے یار و مددگار تھی۔ حتےٰ کہ رین بسیرے کے طور پر بھی اس کی کوئی کٹیا وغیرہ نہیں تھی۔ اس کے جسم پر پر بوسیدہ و کثیف کپڑے تھے۔ جو اچھی طرح ستر کے لئے بھی کافی نہ تھے۔ اس کے تن زار میں فاقوں اور غربت نے احساس جوانی تو کجا حس زندگی کو بھی بجھا دیا تھا۔ ادھر میرے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ کپڑوں کے انبار تھے جسم تودۂ لحم تھا رگیں خون سے پھٹی جاتی تھیں، قوت اقتدار و اختیار سب کچھ حاصل تھا۔ یہ دو جیسے انسانوں کا اجتماع تھا جو (نعوذ باللہ) دو مختلف خداؤں کے بنائے ہوئے معلوم ہوتے تھے: ایسے افتادہ اور دور پھینکے ہوئے انسانوں تک پہنچنے میں اشتراکیت کی لنگ گامی کو بھی بہت دیر لگتی ہے۔ بہت سے بندگان خدا کا اعراق سے تریاق آنے تک خاتمہ ہو چکتا ہے۔

میں لڑکی کو اپنے ساتھ لے آیا اور چند روز کے بعد اس سے عقد کر لیا۔ کسی نازنین کو میرے گھر نہ آنا تھا نہ آئی۔ اگر وہ آتی بھی تو بے چارگی سے آنا پسند نہ کرتی بلکہ مجھے عمر بھر کے لئے اپنا حلقہ بگوش بنا کر آتی۔ اس کے علاوہ نہ وہ مجھے زندگی کے مدوجزر کا کوئی سبق دے سکتی تھی۔ اس کے ساتھ تو اور شب و روز کے پریشان کن عیش میں اضافہ ہو جاتا۔ عیش حقیقی یہی ہے کہ ہم اپنی نشاطِ بے بہا کی قیمت پر حیات کے نشیب و فراز کو آخر ہموار کریں۔

اپنی گنوار بیوی سے میں نے آج تک یہ نہیں کہا ہے کہ اس کے باپ کا قاتل میں ہی ہوں۔ مجھے اس سے بھی خطرہ ہے کہ وہ بھی اپنی اس موجودہ عیش حیات پر لات مار کر مجھ سے نفرت کرنے لگ جائے گی۔

طلب عیش کیلئے انسان مرتا ہے مگر چند ایسی ناقابل فہم باتیں بھی ہیں جن کی بنا پر انسان نشاط مسلسل کو ٹھکرا کر اپنی .... سابقہ حیات تاریک کے گوشوں میں گم ہو جانا پسند کرتا ہے! زندگی بھی ایک عجیب راز ہے!!

امریکن افسانہ نگار او ہنری

مترجمہ از اثر چکوالی بی۔ اے

تاخیر

ایک گاؤں میں ایک شریف گھرانا اقامت پذیر تھا، جو تین افراد.. میاں بیوی اور ایک پانچ سالہ بچی پر مشتمل تھا۔

ایک رات کا ذکر ہے، کہ بچی یکایک بیمار ہو گئی، اور اُس کی حالت لمحہ بہ لمحہ دگرگوں ہونے لگی! باپ سے بیٹی کی یہ حالت نہ دیکھی گئی، اور وہ دوا لانے کے لئے شہر کی جانب روانہ ہوا .... ایسا روانہ ہوا کہ پھر کبھی واپس نہ آیا۔

بچی رو بصحت ہو چکی تھی، اُس کی ماں اپنے شوہر کے واپس نہ آنے سے سخت غمگین و متفکر تھی۔

اس واقعہ کو بہت عرصہ گذر گیا! ننھی کی ماں کو اپنے شوہر کا ابھی تک انتظار تھا۔ مگر اُس کو نہ آنا تھا... نہ آیا، لڑکی اب جوان ہو چکی تھی، اس لئے اُس کی ماں نے مجبوراً خاوند کی غیر موجودگی میں اس کی شادی ایک نوجوان سے کر دی۔

ایک سال کے بعد اس کے ہاں بھی ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ جب وہ پانچ سال کی ہوئی، تو وہ بھی یکایک بیمار ہو گئی، اور اُس کی حالت نازک سے نازک تر ہونے لگی۔

ننھی کے باپ نے دوا لانے کے لئے بازار جانا چاہا۔ مگر بیوی نے یہ کہہ کر کہ "تم بھی واپس نہ آؤ گے" اُس کو جانے سے روک دیا! لیکن ننھی کی حالت خطرناک ہوتی جا رہی تھی، ننھی کا باپ دوا لانے کے لئے پھر آمادہ ہوا، لیکن اُس کی بیوی نے پہلے کی طرح اُس کو جانے سے روک دیا!

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا، اور ایک بوڑھا آدمی اندر داخل ہوا جس کی داڑھی سفید ہو چکی تھی، اور جس کے چہرے پر جھریاں ہی جھریاں نظر آتی تھیں، اُس کے ہاتھ میں دوا کی ایک شیشی تھی،

پیشتر اس کے کہ اُس کو کوئی پہچانے، ننھی نے یکایک اپنی آنکھیں کھولدیں، اور بے اختیارانہ پکار اٹھی،

"نانا جان آ گئے"

بوڑھے نے ننھی کے منہ میں دوائی ڈالتے ہوئے کہا، "افسوس ہے کہ راستے میں موٹر نہ ملنے کی وجہ سے تاخیر ہو گئی"۔

نقد و نظر!

ہندوستانی کشیدہ کاری

(مرتبہ محترمہ آنسہ امتہ اللہ صاحبہ ہیڈ مسٹریس سکندر گرلز انڈسٹریل سکول سائز کلاں قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ :- دی انڈین نیڈل آرٹ اینڈ انڈسٹری ہاؤس الیار سٹریٹ ۔ برانڈرتھ روڈ ۔ لاہور)

فن کشیدہ کاری ان خوشگوار خانگی مصروفیات میں سے ہے ۔ جنہوں نے صنف نازک کی "گھریلو زندگی" کو خوشگوار بنانے میں اہم حصہ لیا ہے! عورت فطرتاً نفاست پسند ہوتی ہے اور اسی نفاست پسندی کا اقتضا ہے کہ وہ "خانگی زندگی" کو ہر پہلو اور ہر لحاظ سے خوشنما و خوشگوار بنانے کی مساعی جلیلہ میں خود کو مصروف رکھتی ہے! کشیدہ کاری بھی چونکہ "خانگی نفاست" کا خاص حصہ ہے۔ اس لئے وہ اس فن کی طرف طبعاً مائل ہے!

میری محترم بہن نے فن کشیدہ کاری پر ایسی جامع و مکمل مستند و مفید کتاب لکھ کر طبقہ نسواں پر بہت بڑا احسان کیا ہے محترمہ امتہ اللہ صاحبہ خود کشیدہ کاری کے ایک مشہور ادارے سے متعلق ہیں ۔ نہ صرف متعلق بلکہ ممتاز حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کی کشیدہ کارانہ کاوشوں کا یہ مجموعہ افادی نقطہ نظر سے خاص طور پر کامیاب ہے! کتاب کے شروع میں محترمہ بیگم احمد یار خاں کا تعارف ہے جس میں انہوں نے کشیدہ کاری پر روشنی ڈالتے ہوئے اس فن کی اہمیت کو واضح کیا ہے اس کے بعد التماس کے عنوان سے بہن امتہ اللہ نے بھی کشیدہ کاری کی وضاحت فرمائی ہے! "ہدایات" کے عنوان کے تحت میں جو کچھ لکھا ہے وہ کتاب کی اہمیت میں خاص اضافہ کرتا ہے!

کتاب میں کشیدہ کاری کے ایسے ایسے ڈیزائن ہیں۔ جن کی جدت دلفریبی موجودہ مذاق کے عین مطابق ہے قسم قسم کے پھول، بیلیں، مرکز، کونے، دائرے، باسکٹ، قمیصوں کے دامن اور گریبان وغیرہ نہایت خوبصورتی سے دئیے گئے ہیں۔ نمونوں کے ساتھ، نمونوں سے متعلق جو توضیحات دی گئی ہیں، وہ بے حد مفید ہیں! اور ان کی روشنی میں فن کی کئی پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ چھ بڑے بڑے صفحات پر بھی بڑے بڑے نمونے دئے گئے ہیں۔ غرضیکہ کتاب کو مفید بنانے میں بہن امتہ اللہ نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

مجھے امید واثق ہے کہ ہندوستانی کشیدہ کاری کے ہوتے ہوئے میری کوئی بہن اس فن پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت کو محسوس نہیں کرے گی! اس کے علاوہ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ طبقہ نسواں محترمہ آنسہ امتہ اللہ صاحبہ کی محنت و کاوش کی داد دے گا۔

معلمہ زہرہ بیگم

نورِ مشرق

(از ضیا فتح آبادی ایم اے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ صفحات ۱۳۶ ۔ قیمت ایک روپیہ ۔ ملنے کا پتہ گنجندر لال سونی ۔ موہن بلڈنگ ، دلائیڈ زبنک ، دہلی)

جناب ضیا ایم اے اردو کے ایک خوشگوار اور بلند پایہ شاعر ہیں، آپکی متعدد کامیاب و دلاویز نظمیں شائع ہو کر قبول خاص و عام ہو چکی ہیں۔ نورِ مشرق آپکے کلام کا مجموعہ ہے جسمیں تین دیباچے ہیں ایک تو حضرت جوش کے قلم سے ۔ دوسرا حکیم آزاد کے قلم سے اور تیسرا جناب منظر صدیقی کا مرہون منت ہے! مجموعے میں سب سے پہلی نظم "شاعر سجدے میں" کے عنوان سے درج ہے۔ اس حسین و رنگین نظم میں شاعر نے احول کی حقیر سے حقیر چیز سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس نظرئیے کی تصدیق کی ہے ۔ کہ

شاعری کی تکمیل صرف اسی وقت ہی ممکن ہے جب شاعر اپنے ماحول کی حقیر سے حقیر چیزوں کی بھی پرستش کرنے لگے۔"

ضیا صاحب کے کلام میں وہ تمام "شاعرانہ محاسن" موجود ہیں جن کی موجودگی ایک حقیقی شاعر کو نقال شاعروں کے ہجوم سے ممتاز کرتی ہے۔ ضیا صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ "فرسودہ ماحول" میں رہتے ہوئے بھی اس بلند سطح پر نظر آتے ہیں۔ جس پر ہم عصر حاضر کے نمائندہ شعراء کو دیکھتے ہیں۔

بوندوں کا ساز، دعوت سیر، دعوت نظر، نہ جاؤ ابھی، محویت محبت نہایت دلآویز و جد پرور نظمیں ہیں۔

نظموں کے بعد "گیت" درج ہیں۔ لیکن گیتوں میں کوئی خاص بات نہیں سانیٹ کے تحت میں جو نظمیں درج ہیں ان میں اپنی طرز سے بہت دلچسپ سانٹ ہے۔

دو شعر ملاحظہ فرمائیے

نہ دنیا کی خبر مجھ کو، نہ اپنا ہوش ہے مجھ کو
بس اتنا جانتا ہوں تو ہے تیری یاد ہے میرا
نہ فکر عالم فردا، نہ رنج دوش ہے مجھ کو
محبت وا قعی ہر قید سے آزاد ہے میرا

م-و

دیکھئے شاعر کس دلآویز انداز میں اپنے "جذبات" کا اظہار کیا ہے

(مجموعہ رباعیات حکیم ماہر اکبر آبادی، کتابت و طباعت

اربعہ عناصر خوشگوار سائز پاکٹ صفحات ۲۰۰ قیمت ۲/

ملنے کا پتہ: حکیم ماہر اکبر آبادی، فراش خانہ، دہلی)

حکیم ماہر اکبر آبادی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں، اور آپ کا کلام اکثر ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ اربعہ عناصر آپکی رباعیات کا مجموعہ ہے، کتاب کا نام "اربعہ عناصر" ایک ثقیل اور بہت حد تک غیر شاعرانہ نام ہے لیکن چونکہ کتاب کا مصنف ایک "حکیم" واقع ہوا ہے اس لئے نام کے انتخاب میں فطرتاً "حکیمانہ ذوق" کو بروئے کار آنا چاہئے تھا۔ اور آیا ہے!

آج کل اکثر کتابیں کئی کئی دیباچے لئے ہوئے نظر آتی ہیں سمجھ میں نہیں آتا کتاب میں زیادہ دیباچے شائع کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی ہے۔ بظاہر وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح کتاب کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے، مگر یہ خیال ہی خیال ہے۔ وقیقہ رس طبیعتیں اس انداز خاص سے مرعوب نہیں ہوتیں! اربعہ عناصر مختصر سا مجموعہ ہے مگر اس میں چار دیباچے ہیں، پہلا دیباچہ مولانا سیاب اکبر آبادی کے قلم سے ہے! اس میں مولانا نے رباعی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا حکیم آزاد انصاری کے قلم سے ہے! اور تیسرا حضرت جوش ملیح آبادی کی تراوش فکر کا نتیجہ ہے! ان دیباچوں کے ہجوم کے بعد رباعیات شروع ہوتی ہیں!

رباعی ایک شیریں اور دشوار صنف ادب ہے جس میں کمال حاصل کرنا خداداد صلاحیت اور فطری استعداد کے سوا قطعاً ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں بہت ہی کم شعراء کامیاب رباعی گو نظر آتے ہیں، جناب ماہر کے ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس مشکل صنف ادب میں کافی اضافہ کیا، آپکی رباعیات پند و نصائح عبرت و موعظت حقائق کائنات و معارف حیات پر مشتمل ہیں، عامیانہ شاعری سے آپنے حتی الوسع اپنا دامن بچایا ہے! اس مجموعے کو ترتیب اس طرح دیا گیا ہے کہ کئی موضوعات مقرر کئے گئے ہیں۔ اور ہر موضوع کے تحت میں اس موضوع سے متعلق رباعیات دی گئی ہیں، یہ ترتیب بہت حد تک قابل تحسین ہے!

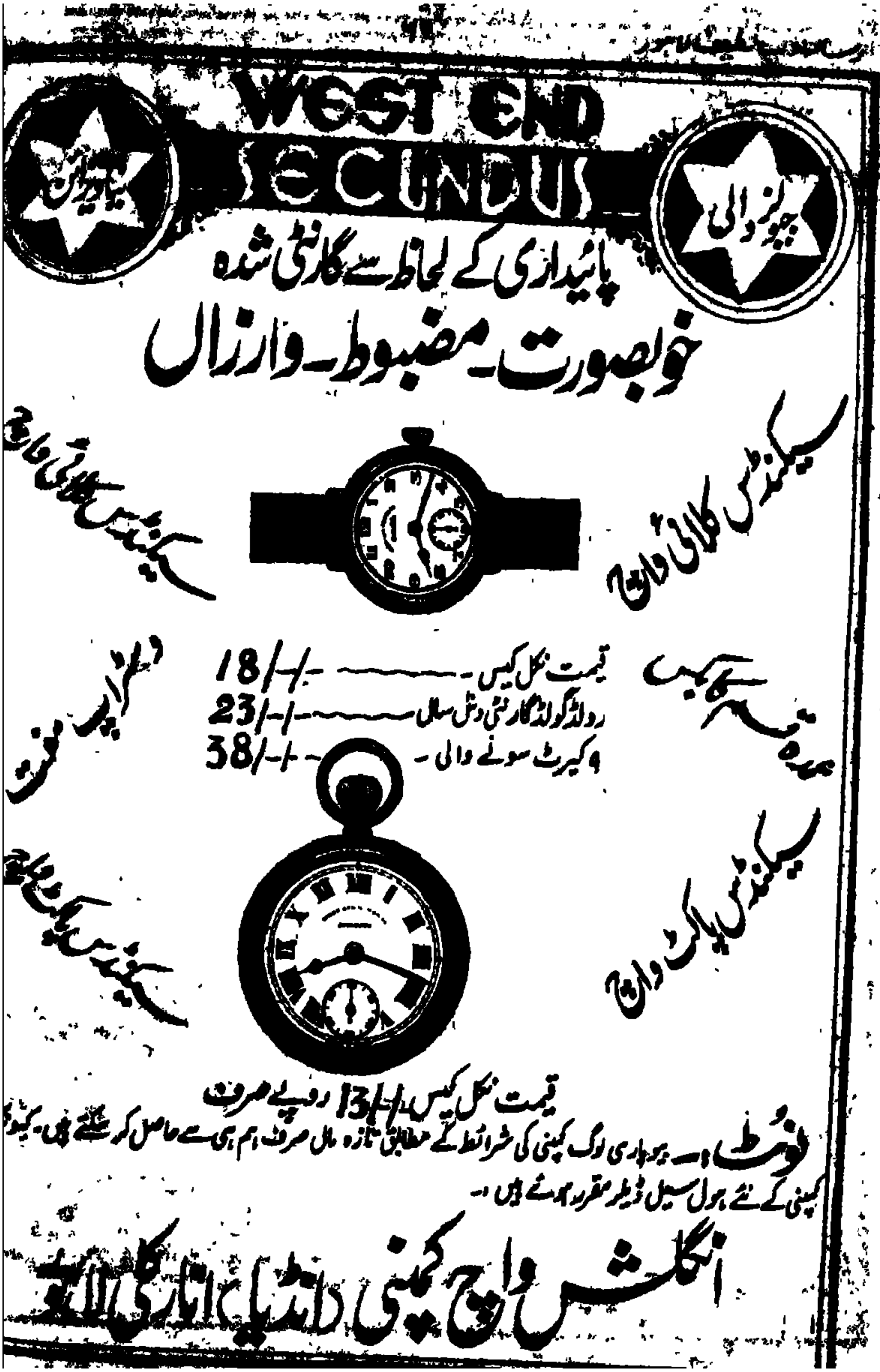
دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیے

خضر اپنی مجھے حیات بھی دے تو نہ لوں   فطرت سند نجات بھی دے تو نہ لوں
اک درد محبت کے عوض میں ماہر   کوئی مجھے کائنات بھی دے تو نہ لوں

بچپن اک دن شباب ہو جاتا ہے   قطرہ بڑھکر سیماب ہو جاتا ہے
اس عالم ہست و بود میں اے ماہر   ہر لمحہ اک انقلاب ہو جاتا ہے

امید ہے اردو دان پبلک مصنف کی محنت کی داد دے گی۔

م-و


WEST END
SECUNDUS
پائیداری کے لحاظ سے گارنٹی شدہ
خوبصورت۔ مضبوط۔ ارزاں
سیکنڈس کلائی واچ
قیمت نکل کیس۔ ۔ ۔ ۔ 18/-/-
رولڈ گولڈ گارنٹی دس سال ۔ ۔ ۔ 23/-/-
9 کیرٹ سونے والی۔ ۔ ۔ 38/-/-
سیکنڈس پاکٹ واچ
قیمت نکل کیس 13/-/- روپے صرف
نوٹ:۔ چونکہ ہماری لوگ کمپنی کی شرائط کے مطابق تازہ مال صرف ہم ہی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کمپنی کے نئے ہول سیل ڈیلر مقرر ہوئے ہیں۔
انگلش واچ کمپنی (انڈیا) انار کلی لاہور

صحت مسرت صفائی خون

کے بغیر ممکن نہیں

اگر آپ کے گردوں میں کمزوریاں ہوں تو آپ دیکھئے کہ گردہ۔ جگر۔ مثانہ۔ وجع مفاصل اور معدہ کی جملہ امراض ۔ نقرس۔ شدید نزلہ۔ ریڑھ کی درد۔ ضعف جسم یا اختناق الرحم۔ عرق النسا۔ آتشک۔ ذیابیطس۔ سوزاک وغیرہ سب کے سب تیزاب کے اثر اور خون کے فساد کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ایک مشہور ڈاکٹر کا قول ہے خون صاف کئے بغیر امراض کا علاج محض تضیع اوقات ہے۔ یہ مسلمہ شدہ ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی باسانی فراہم کیا جا سکتا ہے کہ مختلف عضویاتی امراض اور تمام شکایات جسمانی براہ راست تیزاب زہر آلود مادہ اور فساد خون کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں۔ مثلاً یورک ایسڈ کے اثرات سے گنٹھیا اور اعصابی امراض اور معدہ کے تیزابوں کے اثر سے بدہضمی وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے د) اور معمولی زکام کے درمیان تمام امراض فساد خون اور تیزاب کے اثر سے وجود میں آتے ہیں۔ اور جب یہ مہلک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تب طبیبوں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ کسی طرح زہر کا دفعیہ کیا جائے لیکن احتیاط کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ قبل از قبل خون کی صفائی کا خیال رکھا جائے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وقتاً فوقتاً جگر کو تقویت پہنچا کر معدہ اور گردوں کا تنقیہ کر کے خون صاف کرتا رہے۔ تاکہ تولید جراثیم کا کوئی مرکز ہی نہ رہے۔ خون اور نظام عضوی کو جراثیم دور دیگر فسادی مادہ سے صاف کئے بغیر ازالہ مرض کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہے جیسا کہ تیز آگ بجھائے بغیر دھوئیں کو دور کرنے کی کوشش کرنا۔ آپ اس کا ثبوت خود فراہم کر سکتے ہیں۔ کہ ایک کم قیمت دوائی جس کا نام مصفی ہے۔ منگوا کر استعمال کریں۔ صرف تین یوم کے استعمال کے بعد آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ آپ کی امراض رفتہ رفتہ رخصت ہو رہی ہیں۔ اور آپ کی صحت و قوت میں اضافہ کے ساتھ آپ کی رنگت میں خوشنما سرخی و سفیدی بڑھ رہی ہے۔ یقیناً آپ اپنے جسم و رگوں میں نئی قوت و توانائی کے ساتھ زندگی کی تمام مسرتیں حاصل کریں۔

قیمت فی شیشی ۲۵ خوراک پانچ روپیہ دو آنہ محصول ڈاک و پیکنگ ایک شیشی سے تین شیشی تک ۸ / ر

ہندوستان کے سول ایجنٹ

میسرز بی۔ ایم کے بخشی اینڈ کمپنی لاہور

طلسمِ خیال

یعنی

اردو کے جلیل القدر افسانہ نگار جناب کرشن چندر ایم اے کے افسانوں کا مجموعہ

طلسمِ خیال

نگارخانۂ حیات کی وہ حقیقی تصویر ہے جس میں زندگی کے حقیر سے حقیر نقش کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

طلسمِ خیال

میخانۂ حسن و عشق کا وہ لبریز ساغر ہے۔ جسکے قطرے قطرے میں محبت کے اسرار کی دنیا لہرا رہی ہے

طلسمِ خیال

طلسم کدۂ کائنات کا وہ مرقع ہے۔ جس میں دنیا کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے

طلسمِ خیال میں

مصنف کے طلسم کار قلم نے حیاتِ انسانی کے دکھوں اور سکھوں کی اس طرح تصویر کھینچی ہے۔ کہ آپ رو دیں گے بے اختیار ہو کر ہنسیں گے متاثر ہو کر اور یہ اثرات ہمیشہ آپ کے دل پر مرتسم رہیں گے۔

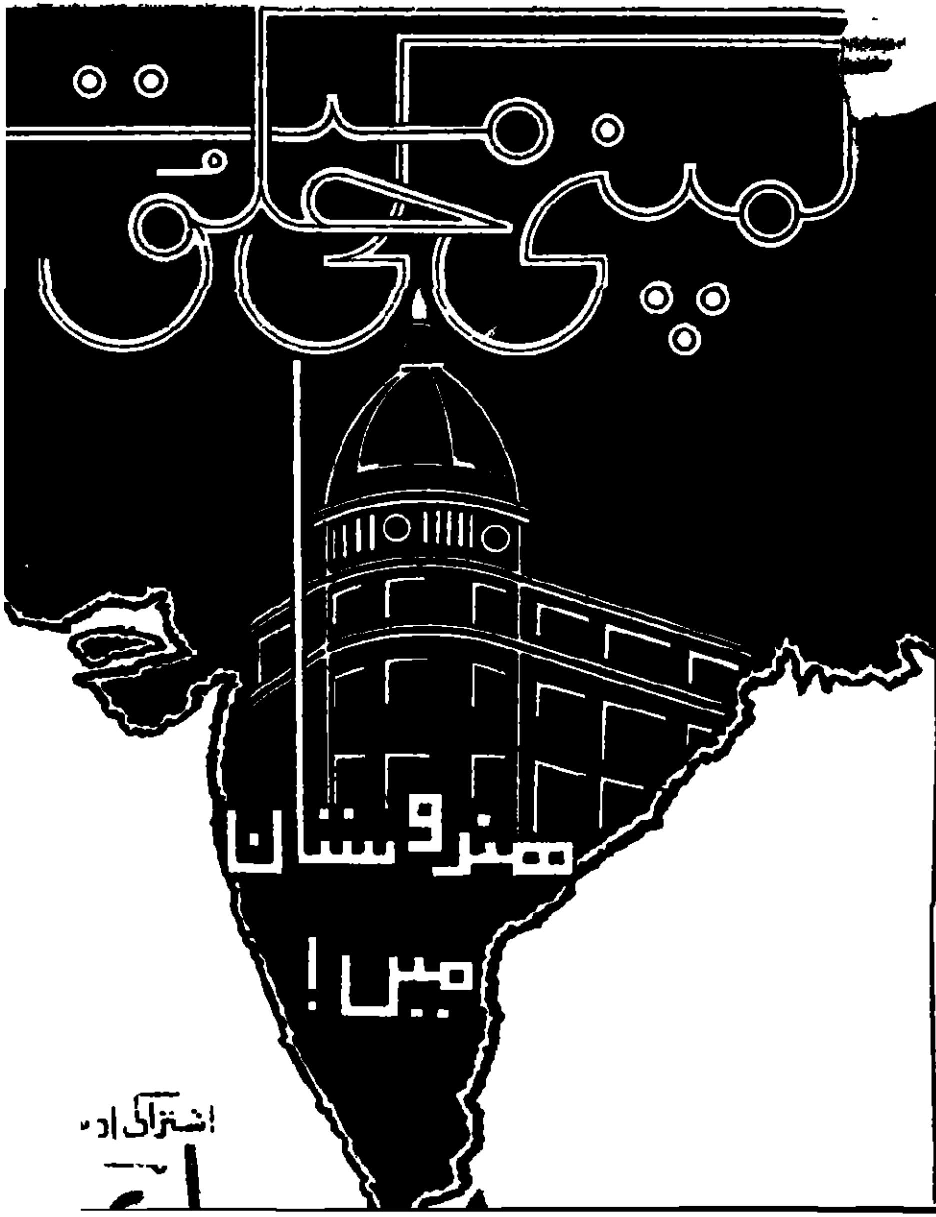
طلسمِ خیال کا مصنف اردو کے صاحبِ طرز افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی افسانہ نگاری و طرزِ انشا کے متعلق ملک کے جلیل القدر رسائل و جرائد کی رائیں شائع ہو چکی ہیں ملاحظہ فرمایئے:

(۱) مسٹر کرشن چندر صاحب نے حیاتِ انسانی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا طرزِ انشا انوکھا اور البیلا ہے — "ٹریبیون" لاہور

(۲) ... اس نوجوان ادیب کی نفس اور سندور دار زبان اسیرِ جاحبل اور رنگین تخیل اور گہرا نفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا ایک زبردست ادیب ثابت ہوگا۔ — "ہمایوں" ستمبر ۱۹۳۶ء

(۳) مسٹر کرشن چندر ایم اے کا افسانوی کمال اب اس قدر مسلم ہے کہ اس کے متعلق مزید لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ آپ ترقی پسند ادب کے علمبرداروں میں سے ہیں یہی سبب ہے کہ آپ کے افسانے اصلیت نگاری کے حامل ہوتے ہیں۔ موجودہ سوسائٹی پر آپ اسقدر دلچسپ اور لطیف پیرایے میں طنز کر جاتے ہیں کہ جابجا پڑھنے والوں کا ضمیر خود بخود ان کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہاں اسکا دل لطف لئے بغیر نہیں رہتا۔ آپ کا طرزِ بیان دلکش ہے۔ اسکے ساتھ بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ کاغذ نہایت اعلیٰ۔ قیمت ایک روپیہ — "شاہکار" لاہور

ملنے کا پتہ: مکتبۂ اردو ۔ ۱۵ ۔ اسٹریٹ روڈ لاہور





مکتبۂ اردو کی ہر دلعزیز مطبوعات

…صحرا مشہور نومسلم بیرسٹر علامہ شیخ خالد لطیف نے پیغمبرِ کائنات کے حالات نہایت دلنشیں اور
…ببر سلجھے ہوئے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ہر لفظ سے عشقِ رسالت کی خوشبو آتی ہے۔ اردو ترجمہ
…ٹ آف دی ڈیزرٹ" علامہ خالد لطیف گابا مجلد و مطلا دو روپے

…نی کی حکومت داستان ہے اُس صد سالہ دورِ آشوب کی جب ہندوستان کو سیاسی طور پر محکوم اور اقتصادی لحاظ سے غلام بنایا جا رہا تھا۔
اشتراکی ادیب باری مجلد ڈیڑھ روپیہ

…ر کا گناہ اس مجموعہ میں دنیا بھر کے نقادانِ ادب کے بہترین تسلیم شدہ افسانے شامل
…دیگر افسانے ہیں۔ جو اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔
راجہ مہدی علی خان مجلد مطلا دو روپے

…ن پیسے کی چھوکری افسانہ نگاری کے شائق اور افسانوں میں حقیقی روح دیکھنے والوں کے لئے اِن افسانوں کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔
…ور دیگر افسانے) قاضی عبد الغفار خان (مصنف لیلےٰ کے خطوط) مجلد ڈیڑھ روپیہ

…ک رزم ہندوستانی زبان میں جنگی ترانوں کا پہلا مجموعہ۔ شجاعت اور غیرت کے جذبات ابھارنے والی کتاب۔ دوسرا ایڈیشن۔ دو نئی نظمیں بھی شامل ہیں۔
وقار انبالوی مجلد آٹھ آنے

…یا کی حور یہ کتاب خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ
…دیگر افسانے بالکل ہماری معاشرت و تمدن کے مطابق ہے۔ طبیعت بغیر کسی دقت کے اثر قبول کرتی ہے۔
کوثر چاندپوری مجلد ایک روپیہ

مکمل فہرست کتب طلب فرمائیں

منظور کردہ محکمۂ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد و ریاست حیدرآباد دکن

مکتبۂ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ ادبِ لطیف لاہور

ستمبر ۱۹۳۸ء

ادارہ تحریر

چودھری برکت علی بی اے

میرزا ادیب بی اے

مقامِ اشاعت

مکتبۂ اردو لاہور

(محمد شریف عباسی خوش نویس لاہور)

پرنٹر پبلشر چودھری نذیر احمد

قیمت فی پرچہ چار آنے

سالانہ چندہ بمعہ ضخیم سالنامہ وافسانہ نمبر سے۔ علاوہ محصولڈاک

چندہ ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

فہرست مضامین

جلد (۸) | بابت ماہ ستمبر ۳۸ء ۱۹۳۸ء | نمبر (۱)

... لاہور سے چھپا کر دفتر ادب لطیف سرکلر روڈ سے شائع کیا۔

ادارہ

نذرِ اولین

گزشتہ دو اشاعتوں سے ہندوستان کی فلم ساز کمپنیوں کے ارباب حل وعقد کی "اردو دشمنی" کے بارے میں لکھا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس اس سلسلے میں کئی تائیدی خطوط پہنچ چکے ہیں، اور کئی حضرات سے ہمارے "شذرے" کو پڑھکر مختلف رسائل و جرائد میں اس اہم موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہماری فلم ساز کمپنیوں کی "اردو دشمنی" کا رویہ ملک کے گوشے گوشے میں آئینہ ہو چکا ہے، فلم ساز کمپنیوں کے مالکان محترم نے سنسکرت آمیز ہندی کی اشاعت کو اپنا نصب العین بنالیا ہے، ان حضرات کے پاس دولت ہے اور دولت کیا کچھ نہیں کر سکتی؟ تاہم ہمارے موقعہ ناشناس مہربانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اردو نے اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر وہ مقبولیت حاصل کرلی ہے کہ اب اس سے دشمنی اپنے مفاد کے ساتھ دشمنی کے مترادف ہے۔ یہ تو ہے فلم ساز کمپنیوں کی متعصبانہ روش، اب دیکھئے ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت یعنی کانگرس کی اس باب میں رائے معلوم کریں اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگرس اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی انجمن ہے اور ہماری بہت سی امیدیں اس کی سیاسی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں کیونکہ کانگرس کو بحیثیت آل انڈیا نیشنل کانگرس کے ہندوستان کی تمام قوموں کے سیاسی حقوق کی محافظ ہونا چاہیئے، اور اسے ہر وہ اقدام کرنا چاہیئے۔ جس سے ہمارا غلام ملک آزادی کے قریب پہنچ جائے مگر یہ کیا قیامت ہے کہ یہی کانگرس، ملک کی یہی سب سے بڑی انجمن اردو کے ساتھ سخت بیرحمی کا سلوک کر رہی ہے، لازم تو یہ تھا کہ کانگرس پر چھائی ہوئی قوتیں اردو ہندی کے تنازع کے سلسلے میں نہایت منصفانہ فیصلہ کرتیں تاکہ یہ اہم مسئلہ جو وقت کے ساتھ ساتھ "وطن دشمن طاقتوں" کی ریشہ دوانیوں کے زیر اثر خطرناک سے خطرناک ہوتا جا رہا ہے ایک خوشگوار و قابل قبول صورت اختیار کر لیتا۔ ہر وہ شخص جو خرد سے بہرہ ور ہے، اس چیز کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیگا، کہ سیاسی اتحاد کے لیئے لسانی اتحاد کی اشد ضرورت ہے۔ جب زبان ہی مشترکہ نہیں تو سیاسی حقوق کیونکر ہم آہنگ ہو سکتے ہیں؟؟

حقیقتاً یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خود کانگرسی حکومتوں ہی کے دور میں اردو کو کچلنے کی ہر ممکن سعی کی جارہی ہے آئے دن جو خبریں یا بیانات اخبارات کے صفحات پر ظاہر ہوتے ہیں وہ صریحاً کانگرس کی "اردو دشمنی" پر دال ہیں۔ فرض کیا کہ کانگرسی حکومتوں میں بعض ایسے عناصر موجود ہیں جنہیں فطرتاً اردو سے دشمنی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کانگرس "ہائی کمانڈ" پر کیوں سکوت و جمود طاری ہے کیا ہائی کمانڈ کو اسکی خبر نہیں یا وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ غضب یہ ہے کہ کانگرسی حکومتوں کے اس رویے کے خلاف ملک کی فضاؤں میں صدائے احتجاج بلند ہے، اخبارات اس کے خلاف تسلسل کے ساتھ لکھ رہے ہیں، لیکن کانگرسی وزارتیں تمام شکایتوں سے بے پروا ہو کر من مانی کارروائی کر رہی ہیں، اچنانچہ اخبار "مدینہ" بجنور کے تازہ نمبر میں مدیر محترم نے "اردو اور ہندی" کے عنوان کے ماتحت ایک مقالہ لکھا ہے جس میں کانگرسی حکومتوں کی "اردو دشمنی" کا شکوہ کرتے ہوئے ایک ایسی مثال دی ہے جسے پڑھکر سخت حیرت ہوتی ہے۔ قارئین کی معلومات کے لیئے وہ مثال درج ذیل کی جاتی ہے۔

گزشتہ ماہ مئی میں موہن لال سکسینہ صدر پراونشل کانگرس کمیٹی پیلی بھیت تشریف لے گئے تھے اس موقع پر ضلع کانگرس کمیٹی پیلی بھیت کی طرف سے جنتا کی آگاہی کے لئے صدر اور سیکرٹری دونوں کے دستخطوں سے حسب ذیل اعلان ہندی میں شائع ہوا تھا۔

ساودھان (پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی)

ہمارے صوبے کے پرسد نیتا شری یت موہن لال جی سکسینہ ایم ایل اے (سینٹرل) جو پرانتی کانگرس کمیٹی کے پردھان ہیں، ۲۷ مئی ۳۸ء کو پرات کال ۵ بجے کی گاڑی سے پدھار رہے ہیں، جنتا کو چاہیئے کہ اس سنہرے اوسر سے لابھ اٹھانے کے لئے یو ب دیش کے پت اپنے بچے کرتو کو جاننے کے لئے ۲۷ تاریخ کی شام کو اکھاڑ ھک سبھا میں راشٹر سا کاؤں کے ساتھ میں آنا چاہیئے اور ۲۷ مئی ۳۸ء کی صبح کو ۵ بجے ان کے سواگت کے جلوس کی رونق بڑھایئے۔

پروگرام ۲۷ مئی کا۔ پرت کال ۵ بجے سے پانچ بجے تک جلوس۔ ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک جل پان۔

مدھنان ۔ ۹ بجے سے ۲ بجے تک بھوجن وشرام ۔ ۲ بجے سے ۵ بجے تک کاریہ کارتاؤں کی بیٹھک
نویدک

دستخط ادپ منستری | دستخط پریذیڈنٹ | دستخط

کون شخص ہے جو اس عجیب و غریب تحریر کو پڑھکر کانگرسی حکومتوں کی اردو دشمنی کا "قائل" نہیں ہو جائیگا؟!

مکتبہ اردو کی ادبی سرگرمیاں کارپردازان مکتبہ اردو اپنے اشاعتی لائحہ عمل کو برابر ترقی دے رہے ہیں، اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا میدان وسیع سے وسیع ہوتا جارہا ہے ۔ گذشتہ ماہ میں کئی کتابیں (جنکا اشتہار ادب لطیف کے آخر میں دیا جارہا ہے) شائع ہوکر مارکیٹ میں آچکی ہیں، اب متعدد کتابیں زیر ترتیب ہیں اور امید ہے، زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک باقی کتابیں بھی چھپ جائیں گی ۔ ڈراما شہنشاہ حبشہ چھپ چکا ہے ۔ کوثر چاندپوری کی دو کتابیں عورتوں کے افسانے اور دنیا کی حور بھی مارکیٹ میں آچکی ہیں، دو اور کتابیں کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ "طلسم خیال" اور قیسی رام پوری کا ناول "آخری فیصلہ" طباعت کی آخری منزل طے کر رہی ہیں ۔ اختر شیرانی کا مجموعہ کلام "نغمۂ حرم"، پروفیسر علی عباس حسینی ایم اے کے افسانوں کا مجموعہ "باسی پھول" اور ان کے علاوہ صحرانورد کے سات خطوط کی کتابت بھی ہو رہی ہے ۔ امید ہے یہ تینوں کتابیں ڈیڑھ دو ماہ تک شائع ہو جائیں گی !!

اس شمارے کے بعض مضامین اس شمارے کا سب سے پہلا مضمون جناب رشید طارق ایم اے کا "داغ کے تغزل" پر ایک عالمانہ محققانہ مقالہ ہے ۔ داغ کے کلام پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، اور کئی اہل قلم نے انکی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے چنانچہ طارق صاحب کا مضمون بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔

اسی شمارے میں اردو کے نامور اور ہردلعزیز افسانہ نگار جناب کرشن چندر ایم اے کا افسانہ "قبر" بھی شائع ہو رہا ہے، صاحب افسانہ جدید فن افسانہ نگاری کے بدرجہ اتم ماہر ہیں، اور آپ کے قریباً قریباً ہر افسانے میں نفسیاتی کیفیات کے تجزیے میں رومانیت اس طرح ممتزج ہوتی ہے کہ ایک طرف قاری کے ذہن پر زندگی کے تلخ و ناگوار حقائق اثر ڈالتے چلے جاتے ہیں، اور دوسری طرف اس کا دل لطف و لذت سے بہرہ اندوز ہوتا جاتا ہے یہ خصوصیت اردو کے بہت ہی کم افسانہ نگاروں میں پائی جاتی ہے ۔ جناب بہزاد لکھنوی کی بلند پایہ غزل شائع کرتے ہوئے ہم بہت مسرت محسوس کرتے ہیں بہزاد صاحب موجودہ بہترین غزلگو شعرا میں شمار ہوتے ہیں ۔ اور آپ کی کئی غزلیں تو بچے بچے کی زبان پر ہیں بعید نہیں جب صاحب موصوف کو معانی سے کام لینے رہینگے

ادب لطیف کا سالنامہ اس دفعہ بھی دسمبر کے وسط میں ادب لطیف کا سالنامہ شائع ہو رہا ہے ہماری انتہائی کوشش ہے کہ یہ خاص نمبر ہر لحاظ سے سابق خاص نمبروں سے سبقت لے جائے ۔ چونکہ ادارے کو اس خاص نمبر کے لئے بہت سا اہتمام کرنا ہوتا ہے اس لئے مضمون نگار حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنے مضامین جلد بھیج کر ادارے کا ہاتھ بٹائیں ۔

انگلش واچ کمپنی

قارئین کی نگاہوں سے انگلش واچ کمپنی لاہور کا اشتہار گذرا ہوگا ۔ انگلش واچ کمپنی پنجاب کی واچ کمپنیوں میں تجارتی امور کی عمدگی کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتی ہے! اس کمپنی کے ارباب بست و کشاد گاہکوں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک روا رکھتے ہیں ۔ ہم خود متعدد بار کمپنی میں جا چکے ہیں . . . . . . اور ہر بار منتظمین کمپنی کے حسن سلوک سے متاثر ہوئے ہیں !

اس کمپنی کی شہرت پنجاب کے گوشے گوشے میں پھیل چکی ہے ۔ اور ہم امید کرتے ہیں ۔ کہ جلد ہی یہ کمپنی تمام ہندوستان میں اپنا نام پیدا کرے گی ۔

ہم خاص طور پر سفارش کرتے ہیں کہ قارئین انگلش واچ کمپنی دانڈیا انارکلی لاہور سے فائدہ اٹھائیں ۔

جن حضرات کا چندہ اس ماہ ختم ہوگیا ہے ۔ وہ براہ کرم آئندہ سال کا چندہ ارسال فرمائیں ۔ مینجر

جناب رشید طارق ایم اے

داغ کا تغزّل

داغ کے تغزل کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے تغزل کے صحیح مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت کر دی جائے۔ یوں تو ہر نوع کی شاعری کیلئے کسی محرک اور سلجھانے والی چیز کی ضرورت ہوتی ہے، اور اگر حالات اس بات کے مقتضی نہ ہوتے تو میرے خیال میں ہمیں "مدوجزر اسلام" جیسی بے بہا تصنیف نصیب نہ ہوتی اور غالباً اقبال کی شاعری کا رنگ بھی کچھ اور ہی ہوتا۔ ایسی ہی شاعری سے ہم شاعر کی خارجی زندگی اور اس کے ماحول کو ترتیب دے سکتے ہیں لیکن شاعری کی وہ صنف جسے تغزل کہتے ہیں، سب سے بڑھکر محرکات کی تابع ہوتی ہے۔ ایسے محرکات کی جو زیادہ تر جنسی تعلقات سے وابستہ ہوں حقیقی شاعر کی فطرت اس فلمی پلیٹ کی مانند ہوتی ہے جو جاذب نقوش ہونے کی وجہ سے معمولی سے معمولی اور باریک سے باریک نقش کی دوبارہ تخلیق کر دیتی ہے۔ اس کا دل اُس ساز کے تار کی طرح ہے جسے ہلکا سا چھو دینے سے بھی لطیف، خوش آئند اور پُر سرور نغمات اُٹھکر فضا سے بسیط میں پھیل جاتے ہیں۔ کسی حسین چہرے کے دیکھ لینے سے بس اس پر قیامت گذر جاتی ہے اور وہ بے قابو اور وارفتہ ہو کر ایسے الفاظ کہتا ہے جو خود بخود کسی غزل کے رشتے میں منسلک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی شاعری اسکی خارجی زندگی سے بڑھکر اُس کی اندرونی حیات کا پرتو اور اُس کی قلبی واردات کا مظہر ہوتی ہے

جس شاعر کو حقیقی ہیجان متاثر نہیں کر سکتے وہ عوضی ہیجانات سے کام لیکر وہی کیفیات پیدا کر کے شعر کہتا ہے، لیکن اس صورت میں وہ محض شعر لکھتا ہے اس میں آمد عموماً مفقود ہوتی ہے۔ اصلی غزل ایک برقی ہنگامی اور شدید جذبے کا نتیجہ ہوتی ہے، جس کا محرک زیادہ تر کوئی خارجی سبب ہوتا ہے اور جو شاعر کو گویا اس کے خواب سے بیدار کر کے ایک درخشندہ عالم میں پہنچا دیتا ہے۔ ایسا جذبہ اس کے دل و دماغ کو جکڑ لیتا ہے اور اپنی زبردست گرفت سے اس میں ایک آگ سی لگا دیتا ہے (وہی آگ جو بقول غالب لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے) یہاں تک کہ شاعر کی اپنی زندگی گویا اس جذبہ کی زندگی ہو جاتی ہے، وہ جذبہ اس پر اس وقت مسلط ہو جاتا ہے یا یوں کہئے کہ وہ شاعر اُس جذبہ میں اس وقت جذب ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شاعر کو شعوری طور پر پتہ بھی نہیں ہوتا لیکن غیر شعوری طور پر ایک ایسی آتشیں غزل تیار ہو جاتی ہے کہ وہ خود صورت تصویر بن جاتا ہے، غزل کا جسم ایسی آگ ہی میں ہوتا ہے، لیکن ہر شاعر کی طبیعت اس آگ کے اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگرچہ اس آگ کی حیات قلیل بہت ہی قلیل ہوتی ہے۔ پھر بھی کئی شاعروں میں وہ دھیرے دھیرے اور خاموشی سے سلگتی رہتی ہے۔ جیسے کہ میر تقی اور حسرت موہانی ہیں، دوسروں میں زیادہ شدت اور گرمی سے، جیسے کہ غالب، درد اور داغ ہیں . . . . . .

یہ آگ شاعر کی قلبی زندگی کو آشکار کر دیتی ہے۔ لہذا غزل ہی اُس کے احساسات اور اُس کے خالص عشقیہ جذبات کی

صحیح آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس میں تخاطب بہ محبوب بھی شامل ہوتا ہے، وصل و ہجر کی داستانیں، شکوے شکایات بھی آجاتی ہیں۔ لیکن وہ جو خلوص پر مبنی ہوں۔ اگر کوئی چیز غزل کو اس کے درجے سے ہٹا کر خاک میں ملا سکتی ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ کا عنصر ہے، تصنع میں وہی ناکام خوضی محرک کارفرما ہوتا ہے۔ ایک شخص شعر کہنے کا سلیقہ رکھنے کے باوجود غزل نہیں لکھ سکتا مگر چونکہ مقبولیت اس کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی، لہذا استادوں کی غزلیات سامنے رکھ کر انہی کی تراکیب بندشوں اور خیالات کو لیکر بدزیب جامہ پہنا کر "اپنا" لیتا ہے۔ غزل کی رسوم اور روایات اور علیحدہ مخصوص لغت ایسے ہی بزرگوں کی بدولت ایسی اٹل ہوگئی ہیں کہ ان سے سرِ مو تجاوز بھی ناجائز سمجھا جاتا ہے۔

غزل چونکہ احساسات کی حامل ہوتی ہے اس لئے تغزل کا اگر کوئی صحیح اور بہترین معیار ہو سکتا ہے تو وہ احساسات کے معیار کے مطابق ہوگا اور احساسات کا معیار لازمی نہیں کہ اخلاقیات کے معیار کے مطابق ہو، اگر احساسات تیز، پاکیزہ نغز اور خالص ہوں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ غزل جو ان کی حقیقت میں ترجمان اور ظاہری لباس ہے کیوں انہی اوصاف کی حامل نہ ہو اور یہ ہے بھی حقیقت الامر کہ اگر ایک چیز موجود ہو تو دوسری کا ہونا از بس ناگزیر ہے۔ خلوص احساسات اور خلوص غزل لازم و ملزم ہیں ایک دوسرے کا راہ نما ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم خلوص بیان سے ہی شاعر کے خلوص جذبات کا جائزہ لیتے ہیں اور وہ غزل کے مندرجہ ذیل تین عناصر سے۔

(۱) مشاہدات کی وسعت۔ شعر کہنے سے قبل ضروری ہے۔ کہ شاعر کے پاس کچھ کہنے کے لئے مواد بھی موجود ہو جسے کچھ کہنا ہی نہیں اس کے لئے نظم کیا نثر بھی فضول ہے۔ یہ کہنے کی باتیں یہ مواد شاعر اپنے ساتھ لیکر نہیں آتے بلکہ اس کے پیدا کرنے کی صلاحیت اور قوت خود اپنے اندر پیدا کرتے ہیں، اور یہ قوت مشاہدہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ آنکھیں ہم بھی رکھتے ہیں ان سے کام بھی لیتے ہیں خوبصورت اشکال کو بھی دیکھتے ہیں۔ حسین پھولوں کو توڑ کر زیب و ستار بھی کرتے ہیں، مگر ہمارے مشاہدے یہاں آکر رک جاتے ہیں۔ کیونکہ ہماری نظر سطحی ہے۔ اس کے برعکس شاعر کی حساس بصارت کے ساتھ اس کی بصیرت بھی حساس ہوتی ہے، وہ خوبصورت شکل اور حسین پھول میں اک مناسبت دیکھتا ہے اور ان دونوں کی مناسبت کسی اور شے سے۔ اسکا خاصہ غائر بینی اور ژرف نگاہی ہے۔ وہ ہر مشاہدے پر غور و فکر کر کے کئی ایک باریکیاں پیدا کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جس کا مشاہدہ جتنا ہی وسیع، بلیغ اور عمیق ہوگا وہ اتنا ہی بڑا شاعر ہوگا اور غزل میں تو کام ہی سراسر مشاہدہ کا ہے نفسیاتی کیفیات کا مطالعہ ہی یہاں کارگر ہوتا ہے۔

(۲) غزل کا دوسرا عنصر احساسات کا عمق ہے، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ شاعر میں ہر لطیف اور ہر ایک نقش کو جذب کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم ہونی چاہئے تاکہ اس کے بیان محبت اور حسن و عشق کی داستان یعنی غزل میں کسی قسم کی خامی یا ابہام نہ رہ جائے۔ اس سے مصنوعی اور سطحی جذبات پر پہلے ہی سے خط تنسیخ کھنچ جاتا ہے۔

(۳) تیسرا زبردست عنصر بیانات کا حسن ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی بقدر ہمت مشاہدہ بھی کرتا ہے اور احساسات بھی کم و بیش رکھتا ہے لیکن ہم میں کتنے ہیں جو ان کی ترتیب یا ان کے اظہار کی قدرت بھی رکھتے ہیں ہمارے پاس الفاظ کی بھی فراوانی ہوتی ہے لیکن ان کی موزونی کے متعلق عموماً شک ہی رہتا ہے اور اگر پیوند اور قطع و برید کر کے چند اشعار موزوں بھی کر لیں تو ان میں وہ حسن اور دلکشی مفقود ہوتی ہے جو ایسے بیانات میں ہونی چاہئے۔ اس عنصر میں زبان کی

سادگی کو سب سے بڑا دخل حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ ان تینوں عناصر کا امتزاج مومنؔ اور حسرتؔ موہانی کی شاعری میں آشکار ہے۔

دونوں کے کلام کے نمونے سے میرا مطلب واضح ہو جائیگا

مومنؔ :۔ رعایت لفظی۔

بوسہ ہائے لبِ شیریں کے مضامیں نہ لکھوں
لفظ سے لفظ میرے شعر کا چسپاں ہوگا
بات کرنے سے رقیبوں کے ابھی ٹوٹ گیا
دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیماں ہوگا

حقیقی جذبات اور سادگیِ بیان :۔

کوئی کھینچے ہے دل کو پہلو میں — کس نے کی اس سے ہمکناری آج
اے شبِ وصل غیر بھی کاٹی — تو مجھے آزمائے گا کب تک!

سادگی :۔

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورتِ ہم — تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

اس شعر میں لفظی تکرار اور "ک" کی اصوات اس کے خارجی حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔

آتا ہے خواب میں بھی تری زلف کا خیال — بے طور گھر گئے ہیں پریشانیوں میں ہم
خنجر نہ توڑ سخت جانی — پھر کس کو گلے لگائینگے ہم

(اس لئے کہ معشوق کو گلے لگانا محال ہے)

ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے — مت جاؤ کہ جی سے جائینگے ہم

سو شعر کا ایک شعر یہ ہے :۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حسرتؔ

نہ ہوگی شفا چارہ گر دیکھ لینا — نہ جائے گا دردِ جگر دیکھ لینا
وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے — غضب ہوگیا اک نظر دیکھ لینا
نہ بھولیگا وہ وقت رخصت کسی کا — مجھے مڑکے پھر اک نظر دیکھ لینا
وہ شرمائی صورت وہ نیچی نگاہیں — وہ بھولے سے انکا ادھر دیکھ لینا
کہاں ہم کہاں وصلِ جاناں کی حسرت — بہت ہے انہیں اک نظر دیکھ لینا

جیسے روزمرہ کے واقعات کا بیان کیا ہے اور اس پر جذبات کی سادہ بیانی۔ تیسرے شعر کا یہ مصرعہ "مجھے مڑکے پھر اک نظر دیکھ لینا" کس قدر مصور ہے۔

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن — آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

غالبؔ کا بھی "آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے" والا شعر مشہور ہے، لیکن حسرتؔ کے شعر میں معاملہ بندی بہت بلیغ ہے وہ یہ نہیں کہتے کہ "محبوب خود اپنے اوپر عاشق ہوگیا ہے، بلکہ وہ اس لئے شرما کے رہ گیا ہے کہ آئینے میں اپنے حسن کو دیکھ کر انہیں اپنے بہترین چاہنے والے کی یاد آگئی ہے۔

مجھ سے وہ کھلیں کیا کہ نظر اٹھ نہیں سکتی
محجوب ہیں پیمائشِ داماں میں لگے ہیں
اس حیلہ جو نے وصل کی شب ہم سے روٹھ کر
نیرنگِ روزگار کا عالم دکھا دیا
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

"سوتے" اور "بیداری" کی ضد غور طلب ہے۔

ان کے علاوہ "لایا ہے دل پر کیسی خرابی۔ اے یار ترا حسنِ شرابی" والی ساری غزل بھی انہی خصوصیات کی حامل ہے، اس میں آپ کو موسیقی بدرجہ اتم ملے گی۔

داغؔ کے تغزل میں سب سے نمایاں پہلو حسنِ بیان کا ہے سارے دیوان اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو بصد مشکل چند ہی ایسے اشعار ملیں گے جن میں غالبؔ کی سی دقت طرازی، فارسی کی تراکیب یا اضافتوں کی بھرمار ہو، دہلی کی نکھری ہوئی زبان پر میر تقیؔ اور مومنؔ کی سادگی، لکھنؤ کے تکلفات سے بعد ایسی خصوصیات ہیں جن پر داغؔ کے کلام کو بجا طور پر ناز ہے انکی قدرتِ بیان، انکے الفاظ کی نشست، انکی محاورہ بندی، شوخیِ ادا

اور روزمرہ کو چند لوگ ہی پہنچنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں یہی وجہ تھی کہ کہنہ مشق اور پختہ کار شعراء بھی داغ کے تلامذہ کی فہرست میں سینکڑوں کی تعداد میں درج ہونے تھے۔ اور امیر مینائی ایسا بلند پایہ شاعر اُن پر سو جان سے فدا تھا۔ اُن کی سلاست و فصاحت بیان میں تازگی اور ادائے مطلب میں شگفتگی کی چند ایک مثالیں دیتا ہوں:۔ تعریض ؎ اس میں "واؤ" انکاری ہے۔

رقیب شیوۂ الفت خدا کی قدرت ہے وہ اور عشق؟ بھلا تم نے اعتبار کیا؟

روزمرہ اور محاورہ۔

ناصحوں سے کلام کون کرے اپنی ایسوں سے گفتگو ہی نہیں

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت اِدھر کہاں

ہوئی جاتی ہیں کیوں نیچی نگاہیں کہو تو کیا ہے قرباں اس حیا کے

خوف ہے اُن کو یہاں تک تو ہم آغوشی کا
میری تصویر کے بھی ہاتھ قلم کرتے ہیں

حسن بندش و ندرت۔

وہاں جھوٹے وعدے پہ لب ہل گیا توقع یہاں کس قدر ہو گئی
تیری آنکھیں تو بہت اچھی ہیں لوگ انہیں کہتے ہیں بیمار یہ کیا؟

نہ پوچھئے مرے روزِ سیاہ کی ظلمت
چراغ لے کے بھی ڈھونڈا تو آفتاب نہ تھا

شاعر ہمیشہ یہی خیال باندھتے چلے آئے ہیں کہ اس سرو قد کے اٹھنے سے ایک حشر برپا ہو گیا لیکن داغ کہتے ہیں کہ اس کا حسن اس قدر ہمہ گیر ہے کہ خود قیامت اس کے سامنے پابہ زنجیر ہے ؎

فتنۂ حشر کب اٹھا اُس کے خرام ناز سے
وہ بھی پڑا ہے مری طرح راہ میں پائمال سا

دلربائی کے ساتھ جب معشوق کو باتیں کرنے کا سلیقہ بھی آگیا تو بڑی حیرت سے اس سے پوچھتے ہیں کہ ؎

بات تک کرنی نہ آتی تھی تمہیں یہ ہمارے دیکھنے کی بات ہے

(ت کی تکرار ملاحظہ ہو)

پروفیسر تبسم نے اسی خیال کو نہایت عمدگی سے یوں نبھایا ہے ؎

نظر آتے تھے تم تو بے زباں سے یہ باتیں آ گئیں تم کو کہاں سے

لفظی رعایت اور مناسبت کو دیکھئے کس خوش اسلوبی سے برقرار رکھا ہے۔

کس خوشی کی خبر سنا کے مجھے غم کا پتلا بنا دیا تم نے

بڑھا رہتا ہے کیا کیا طالب دیدار ہو ہو کر
میرے پائے نگہ پر بھی گمانِ دستِ سائل ہے

افتادگی پہ بھی نہ گئی دل کی آرزو
گویا زمیں پہ سایۂ مرغ پریدہ ہوں

(اس شعر میں یہ تشبیہ پرآں ہے:

چوٹ کھانے سے جو دل ٹوٹ گیا ہے اپنا
لوگ اس کو بھی ترا عہدِ وفا کہتے ہیں

داغ نے مومن کے خیال پر کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ مومن کے شعر میں "شاید" نے جو خوبی اور غیر قطعیت پیدا کی ہے۔ اس کے یہاں مفقود ہے۔

سادگی بیان کے ساتھ حقیقی جذبات کا امتزاج لیکن مومن سے گھٹ کر ہے۔

ضعف سے قلب تھرتھراتا ہے درد بھی اُٹھ کے بیٹھ جاتا ہے

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

لاکھ آفتیں آئیں، لاکھ حسرتیں چھائیں
اک ترے نہ ہونے سے بھر گیا مکاں اپنا

داغ کے دل کا تو کچھ حال نہ پایا ہم نے
ایک حسرت سی برستی ہے مگر آنکھوں پر

شعریت اور موسیقیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سراپا تغزل سراپا موسیقی ہوتا ہے، لفظی تکرار اور اصوات کو ا

غزل کی جان ہوتی ہیں، یہ بربط دل سے نکلے ہوئے نغمات ایک خوش خرام دریا کے مانند ہوتے ہیں، جن کی نرم اور ہموار سطح کے نیچے جذبات اور احساسات کا تلاطم برپا ہوتا ہے۔ غالب کی غزل ہے "نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز۔" سودا کی غزل "باتیں کدھر گئیں وہ تیری بھولی بھالیاں" حفیظ جالندھری کی "تن نے سیکھیں غریب آزاریاں" حسرت کی "اب نہ ہم ہیں نہ دل نہ سوز نہ ساز" گانے ہوئے الفاظ سے لبریز ہیں۔ میر تقی کا یہ شعر دیکھئے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

کس قدر سادہ ہے۔ شاعر نے اس میں کئی ایک رعایات کو غیر شعوری طور پر ملحوظ رکھا ہوگا۔ غم و یاس کی کیفیت، پھر تیمار دار کا کسی دوسرے شخص کو یہ ہدایت کرنا ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اسے خود بڑی نرمی اور آہستگی سے بولنا ہوگا۔ تمام الفاظ کی انفرادی ساخت ملاحظہ ہو۔ ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو دبی زبان سے رواں ہو سکے۔ قریباً سب کے سب د [illegible] یعنی یک ہجائی ہیں۔ اس پر "روتے روتے" کی تکرار نے شعر کے محاسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

داغ کے ہاں بھی فقروں کا موسیقیت آمیز توازن ملتا ہے

تری الفت کی چنگاری نے ظالم اک جہاں پھونکا
اِدھر چمکی، اُدھر سلگی، یہاں پھونکا، وہاں پھونکا
کسی کی شرم آلودہ نگاہوں میں یہ شوخی ہے
اِسے دیکھا، اُسے دیکھا، اِدھر تاکا، اُدھر تاکا
رہی ہے رات بھر "ستم ستم" کہنے رہ رہ کر جھجک دل میں
جگایا ایسے چٹکی درد نے جب بے خبر پایا

شوخیٔ معشوق کی بڑی حسین مثال مرزا غالب نے دی ہے، فرماتے ہیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

داغ کے شعر میں معشوق کی شوخی اس شائستہ اور بلیغ ستم ظریفی کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس میں تو ہرجائی ہی کی جھلک ہے۔ ہر چیز میں داد لینے کا عادی یہاں بھی داد مانگے بغیر نہیں رہتا

پہلے گالی دی سوال وصل پہ پھر ہوا ارشاد کیوں کیسی کہی
دل جو اپنا ہم نے مانگا تو کہا کیا چرا لائے تمہارے گھر سے ہم
جب کہا میں نے کہ لو مرتا ہوں میں بولے بسم اللہ اچھی بات ہے

ہنسا ہنسا کے شب وصل اشکبار کیا
تسلیاں مجھے دے دے کے بیقرار کیا

مومن کا ایک اور شعر ہے ؎

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں مجھ کو فکر جواب نے مارا

غالب کا شعر یہاں بھی شائستہ ستم ظریفی اور نشتر زن بے خبری کا آئینہ دار ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لیکن میرے خیال میں میر کی انتہائی سادہ بیانی شائستگی اور سہل ممتنع کی بہترین مثال اس شعر سے ملتی ہے ؎

حال کہہ چپ رہا جو میں بولا کس کا قصہ تھا؟ ہاں کہے جا میر

"ہاں کہے جا میر" نے بس اس شعر میں جان ڈال دی ہے، اس میں کس قدر شیرینی اور لطافت ملتی ہے۔

یہ تو تھا معشوق کی چیرہ دستی اور شوخ مزاجی کا حال، اب ذرا حضرت عاشق کی حاضر جوابی، جلی کٹی اور طعن آمیز باتوں کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو۔ داغ کا عشق اس کے حسن اور دلفریبی سے مرعوب ہو کر ایک کونے میں دبک کر بیٹھ نہیں جاتا، بلکہ اس کے دوبدو ہو کر اسے کھری کھری باتیں سنا دیتا ہے (اس کی وجہ آگے چل کر بیان ہوگی)، سنئے فرماتے ہیں ؎

تمہیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع، یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

ذرا رشک و بدگمانی کا عالم دیکھئے ؎

سرِ محفل مجھی سے پردہ کرنا تھا تجھے ظالم

یہاں تک تو کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن ذرا دوسرا مصرعہ ملا کر پڑھئے، سینہ پہ سانپ لوٹ ہی تو گیا ہوگا۔ ؎

سرِ محفل مجھی سے پردہ کرنا تھا تجھے ظالم ۔ پھر اس پر یہ قیامت غیر کے دامن سے ڈھانپا

مگر ذیل کا شعر سب پر سبقت لے گیا ہے، ایسا شعر صرف داغ لکھ سکتا تھا، اس لئے کہ اسکا معشوق ہی ایسا تھا، طعن و تشنیع اور لاگ ڈانٹ معراجِ کمال تک پہنچ گئے ہیں

تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار　　اور جو ہم نے آ کے دیکھ لیا

رشک کا ایک اور شعر ہے ؎

ذکرِ مجنوں سے مجھے آگ لگی جاتی ہے

گرچہ ظاہر ہے تمہارا وہ طلب گار نہ تھا

اسی مضمون کو اکبر الہ آبادی نے نہایت عاشقانہ انداز میں ادا کیا ہے ؎

قیس کا ذکر مری شانِ جنوں کے آگے

اگلوں وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

مومن کا یہ شعر خیال آفرینی کے لحاظ سے نہایت دلکش ہے ؎

وہ　ہے بغل میں تو بھی تو یاں نیند اڑ گئی

یہ سوچ ہے کہ بیا نہ ہو اعدا کے خواب میں

کتنا زبردست رشک ہے، لیکن استغراق کا پہلو بہت ہی نمایاں ہے، اور اسکے غیر فطری ہونے پر دلالت کرتا ہے، اسلئے کہ نیند تو اسکے بغل میں ہونے سے ہی اڑ گئی ہوگی، اس وقت معشوق کے علاوہ کسی اور خیال کو دماغ میں جگہ دینا پرلے درجہ کی ناانصافی اور سوءِ ادب ہے، اس کے برعکس غالب کے اس شعر میں بعد از قیاس یا غیر فطری ہونے کا شمہ بھر بھی احتمال نہیں ہوتا ہے ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

داغ کے چند منتخب اشعار یہاں درج کرتا ہوں:۔

وفادوست عاشق کی سادگی ملاحظہ ہو:۔

پھر سہو ہو گئیں تری وعدہ خلافیاں

پھر اعتبار ہے مجھے عہدِ جدید کا

انتہائی لاغری کا بیان کتنا پُر زور اور تصویر کش ہے۔

جھونک سے کملانے کے بھی یہ ناتواں لاغر گرا

جس جگہ سایہ گرا میرا مجھے لیکر گرا

محبوب کی تلون کیشی اور دغا پروری کیا لطیف پیرایہ میں بیان کی ہے۔

یقین اے دل نہ کر تو اسکے مژگاں کے اشارے کا

بھروسا کیا اسے نادان تنکے کے سہارے کا

یہ شعر دیکھئے کس قدر دقیق اور لطیف نفسیاتی مشاہد ہے، عاشق عرضِ وفا کر رہا ہے، معشوق کی ذہنی کیفیات کے دو مناظر نمایاں ہیں، اُسے یقین سا ہے کہ میرا چاہنے والا حقیقی چاہنے والا ہے مگر وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے اپنی آنکھوں سے ملال کو ظاہر کرنا چاہتا ہے، چونکہ دونوں کیفیات میں اتحاد نہیں اس لئے اس کی دلکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے

عرضِ وفا پہ دیکھنا اس کی ادائے دلفریب

دل میں کچھ اعتبار سا، آنکھ میں کچھ ملال سا

محبوب کی فطرت اور اسکی خود پرستی کا نقشہ کھینچا ہے

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

جھکی ذرا چشمِ جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

خودی بیخودی میں بھی کارگر ہوتی ہے۔

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا
بے ہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

ایسی حسنِ طلب کی مثال حسرت کے یہاں بھی ملتی ہے

گرایا پائے ساقی پر نشے میں ترا اے لغزشِ پا پوچھنا کیا

تغزل میں نفسیات کا دخل

جب غزل احساسات اور جذبات کی آئینہ دار ٹھہری تو اس کا تعلق نفسیات سے خود بخود واضح ہو گیا لیکن جو چیز میں اس جگہ واضح کرنا چاہتا ہوں وہ نفسیاتِ انسانی کا ایک نہیں بلکہ دو ایسے پہلو ہیں جنہیں بیسویں صدی کے فلسفہ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کی اصطلاحات بھی دو فرانسیسی نفسیاتی اصناف سے مشتق ہیں میرا اشارہ (Sadism) اور (Masochism) کی طرف ہے یعنی جفا طلبی اور جفا کوشی کئی لوگ گالیاں کھا کر اور دوسرے کو گالیاں دیکر بے حد محظوظ ہوتے ہیں اور اس طرح اُن کے جنسی احساسات کی بہت حد تک تشفی و تسکین اور پرورش ہو جاتی ہے۔ مجھے تو ایسے اصحاب سے کئی مرتبہ سابقہ پڑا ہے اور غالباً آپ نے بھی اپنے دوستوں میں سے کئی ایک کو ان دو اقسام میں منقسم کر دیا ہوگا، شاعری میں بھی یہ دونوں پہلو دیکھنے میں آتے ہیں، فارسی عاشق ہمیشہ خود کو سگِ کوئے جاناں ہی سے استعارہ کریں گے، اگر اس سے بوسہ کی التجا کریں گے تو ساتھ ہی اس کی شیرینی کو بدلنے کے لئے اس سے یہ فرمائش بھی کر دیں گے کہ "بیامیز بہ دشنام چند" یا بوسہ چھین کر اس کے ہاتھیں دُرّہ پکڑا دیں گے کہ لو اب ہمیں اس گستاخی کی سزا دو۔ اردو شاعری میں بھی اب تک یہی حال ہے چنانچہ اگر عاشق جفا طلب ہے تو معشوق جفا پیشہ۔ اسے مار کھانے میں مزہ آتا ہے تو دوسرے کو پولیس کی طرح لاٹھیاں برسانے میں لطف۔ نفسیاتی اصطلاح میں اگر ایک (Sadistic) ہے تو دوسرا (Masochistic) ہے۔ لیکن بعض اوقات عاشق میں اسکا ردِ عمل بھی وقوع میں آجاتا ہے اگر میر تقی ایک جگہ یہ فرماتے ہیں کہ ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

(پامال مضمون کو دیکھئے کس بلندیِ خیال اور جدت سے باندھا ہے)

تو دوسری جگہ بڑی ڈانٹ ڈپٹ کہتے ہیں ؎

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

غالب بھی شمشیر کے عریاں ہونے کو عیدِ نظارہ کہتے ہیں اور ستم کشی پر اس قدر مصر ہیں کہ تیغ و کفن باندھ کر یار کی بزم میں آتے ہیں کہ اب تو انہیں میرے قتل کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا، جلاد سے محض اس لئے پٹنے کو تیار ہیں کہ معشوق پاس کھڑا اس کو اکسا رہا ہے ؎

جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

مومن میں بھی یہ دونوں کیفیتیں دیکھنے میں آئیں گی۔ اگر ایک مقام پر وہ یہ کہتے ہیں کہ ؎

وہ نمک پاش بھی نہیں ہوتے یونہی دل کو فگار ہونا تھا
دیا

موئے عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جان ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

تو اور مقامات پر بالواسطہ اسے تہدید بھی کر دیتے ہیں۔ کہ دیکھو اگر تم نے ہماری پروا نہ کی تو ہم بھی کسی اور کی چاہت کا دم بھر لیں گے۔

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

اب اور سے لُو لگائیں گے ہم   جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

یہ ساری غزل دھمکیوں سے لبریز ہے

داغ میں بھی عموماً جفا طلبی پر ہی زور ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو

کیوں مرے قتل سے انکار یہ کیوں
اس قدر ہے تمہیں دشوار یہ کیوں

بھرتا نہیں جب زخم کسی شکل سے قاتل
بھرتا ہوں تری تیغ کا دم اور زیادہ

انکار بیکشی نے مجھے کیا مزہ دیا   سینے پہ چڑھکے اسنے خم مے پلا دیا

قاتل خدا کے واسطے اک زخم اور بھی
تلوار پھر سنبھال نمکداں کو چھوڑ کر

کتنی زبردست خواہش ہے

تہدیدیہ اشعار بہت کم ملتے ہیں، لیکن ہیں داغ ہی کی زبان سے نکلے ہوئے۔

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

دیگر   دنیا میں وضعدار حسین اور بھی تو ہیں
معشوق ایک تم ہی نہیں اور بھی تو ہیں

لیکن یہ شعر میر تقی کے "ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا" سے بھی زیادہ زوردار ہے۔

اب کے کچھ منہ سے جو نکلا تو نہیں جانوگے
داغ پھر مجھ کو نہ کہنا جو برابر نہ کہوں

موجودہ تغزل میں بھی یہ دونوں پہلو موجود ہیں۔ حسرت کے ایک ہی شعر سے دونوں کیفیات واضح ہیں' پہلے مصرعہ میں اپنے Sadiste ہونے کو تسلیم کیا ہے اور دوسرے میں نہایت لطیف پیرائے میں محبوب کو بڑی زبردست تہدید کی ہے

ہم جور پرستوں پہ گماں ترک وفا کا
یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کردے

اس بارے میں مجھے اس وقت دو بہترین مثالیں یاد آگئی ہیں پہلی مثال میرے محترم استاد پروفیسر تاثیر کی ہے انہوں نے واسوخت کی طرز پر بہت سی غزلیات کہی ہیں۔ ان میں عاشق ایک نحیف' لاغر' صبر باختہ اور خوشامدی نہیں ہے بلکہ عموماً اُن کی طرح جسیم و لحیم اور تنا قتور ہے' اس لئے اپنی باتوں کو منوانے کی قدرت رکھتا ہے اور اپنی دھمکیاں عمل میں ظاہر کر دیتا ہے' اس کے سامنے کھڑے ہو کر آزادی سے سوال جواب کر سکتا ہے' معشوق جب اُسے نقش پا پر جبہ سائی کرنے سے روکتا ہے تو داغ کی طرح یہ نہیں کہتا کہ میں اپنی تقدیر کے لکھے کو مٹاتا ہوں' بلکہ بڑی سختی سے اُسے ڈانٹ کر کہتا ہے ع

یہ تو میری سجدہ گاہ ہے ترا نقش پا نہیں ہے

اُن کے اس شعر میں تمام غزلیات کا نچوڑ ہے

کہیں ہو جائے مجھ کو دسترس گر تیرے داماں تک
تو یکسر ایک کر دوں چاک دامن سے گریباں تک

اس کے برعکس میرے عزیز دوست حفیظ ہوشیار پوری کو دیکھئے' اس زرد و زرد چہرے اور بدن میں لاغری کے باوجود جور پرستی اور جفا طلبی میں سب شعرا کو پیچھے ڈال گئے ہیں۔ فرماتے ہیں

لطف آنے لگا جفاؤں میں   اب کہیں مہرباں نہ ہو جائے

دیگر۔   یہ آرزو ہے کہ مجھ پر جفا کرے کوئی
غم وفا سے مجھے آشنا کرے کوئی

داغ میں یہ سب کچھ موجود ہے' اس کے علاوہ ان کے کلام میں رندی' بادہ نوشی اور محتسب وغیرہ کے متعلق بہت اچھے اشعار ملتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ انہوں نے عمر بھر شراب خوری سے اجتناب کیا' دیکھئے کتنے ٹھاٹ کا شعر ہے

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد   ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

ایک زندِ خراب حال کی انتہائی تمنا کا اظہار کیا ہے سے

خم سے آسمان ہو جائے میکدہ ہر مکان ہو جائے

لیکن ان تمام محاسن کے ہوتے ہوئے داغ کے عشق کا معیار بلند نہیں' ان کے دواوین میں سوائے ایک دو مقامات کے معشوق کا تخیل کہیں بھی پاکیزہ اور لطیف نہیں ہے' اس سے ایسی ایسی باتیں منسوب کی ہیں' یا اس انداز سے مخاطب کیا گیا ہے جن سے طبع نازک کو منہ چھپاتے ہی بن آتی ہے' اُن سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے کہ اُن کا ایسا معشوق ہے جو بازاری پن کی بدترین صفات کا جامع ہے جس کی ہر ادا میں بانکپن جس کی ہر حرکت میں تصنع ہے جسکا شیوہ ہی چاہنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے' جس کی شوخ اور بے باک نگاہوں سے حیا پرواز کر چکی ہے' جس کی خواہش عصیاں اُسے ستم ظریفی کے تمام داؤ پیچوں سے واقف کر چکی ہے' داغ کا محبوب ایک شاہد بازاری کی تمام خصوصیات کا حامل ہے' اسے جلانے اور تنگ کرنے کے سب ڈھنگ ازبر ہیں' جس کی کافر جوانی اس قدر جوش پر آئی ہوئی ہے کہ ہر راہگیر سے الجھتی ہے' یہی وجہ ہے کہ وہ عشق و محبت کے آداب کو بالائے طاق رکھ کر اس پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کرتے ہیں ——— اس میں شک نہیں کہ یہ اوصاف کم و بیش ہر شاعر کے معشوق میں ملتے ہیں' میر تقی بھی جس کی بدولت بیمار ہوئے اسی عطار کے لڑکے سے دوا خریدیں گے' مرزا غالب بھی جب معشوق کو خواب میں دیکھتے ہیں تو یہی اندازہ لگاتے ہیں کہ رقیب کی بغل سے ہی اُٹھ کر آیا ہے' مومن بھی صاف گوئی سے کام لیکر فرماتے ہیں۔

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

لیکن ان کا تصور مبتذل اور سوقیانہ نہیں ہے' یہی حال حسرت موہانی کا ہے' اُن کے اشعار میں حقیقی عاشق کی جھلک نظر آتی ہے' ایسا عاشق جو اپنے معشوق کی رسوائی کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا' جو پیمان محبت کی تکمیل کے لیے نگاہِ بے محابا منتظر رہ' دیدۂ بااشک تابندہ کا متمنی رہتا ہے' اسکا عشق بڑا پاکیزہ' اس کی محبت بڑی بے لوث' اُس کے جذبات متین اور سنجیدہ ہیں لیکن حسرت بھی تغزل کے اس ارفع تخیل کو برقرار نہ رکھ سکے اور دو ایک مقامات پر اس قدر بے قابو ہوگئے کہ داغ کی یاد اور بعض مثنویوں کے خاصے پھر سے تازہ ہو گئے چنانچہ لکھتے ہیں۔

سامنے سب کے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب

کہیں ڈھل جائے نہ غصے میں دوپٹہ دیکھو

اب ذرا داغ کو بھی ملاحظہ فرمایئے سے

بولے وہ شکوۂ تغافل پر ملے کس کس بیدار سے آنکھ

کیا مرے ہاتھ سے کھنچ کر ترا داماں نکلا

تو بھی آغوش سے یوں تو نری جاں نکلا

زلف برہم' عرق آلود جبیں' دامن چاک

کس کی آغوش سے تو جان چھڑا کر نکلا

آخر اس ابتذال اور بازاری پنے کا سبب؟ متقدمین میں یہ رنگ کیوں عنقا ہے' اور داغ اس میں کیونکر رنگے گئے۔ کیا ابتذال . . . . کا اظہار مخرب اخلاق ہونے کی بجائے اخلاقیات کی تہذیب کر سکتا ہے' میں نہیں کہہ سکتا کہ داغ' ڈی ایچ لارنس بالزک اور طالسطائی کی طرح کہاں تک بانجہ "Compoeimp"، ادیب تھا' میرے خیال میں اس کی وجہ قوم کی پستی' اخلاقی حالت کا تنزل' ماحول' بالفاظ دیگر لکھنؤ اسکول کا اثر تھا' گو لکھنؤ کے بادشاہ مغل شاہزادوں کی جاہ و حشمت اور عظمت کو اپنے دربار میں برقرار رکھے ہوئے تھے' مگر مغلوں کا ذوق سلیم اُنکی ادب پروری' اُن کی روح سرے سے مفقود تھی' وہاں فوراً ہی ہوس پرستی' سہل انگاری اور تعیش کا دور دورہ ہو گیا' وہاں شاعری موجود تھی لیکن شعر کے مشترک عیوب بقول حسرت[1] یہ تھے ۱ ضلع جگت کی کثرت

---

[1] اردوئے معلےٰ بابت ماہ ستمبر

(۲) بدمذاقی (۳) اور بدمذاقی کی بنا پر عامیانہ قوافی کا انتخاب (۴) بے اثری۔

البتہ سخن سنجان لکھنؤ نے لطف زبان اور خوبی محاورہ کو مضمون اور بیان پر ہمیشہ ترجیح دی ہے مثلاً ناسخ ہی کو لیجئے ... "تاثیر کلام کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ شاعر کا دل عشق حقیقی یا مجازی کی کیفیت سے آشنا ہو، لیکن چونکہ لکھنؤ کے عہد شاہی میں ہوس پرستی کے سوا ان دو میں سے کسی کا وجود نہ تھا، اس لئے اس زمانے کے تقریباً کل شاعروں کی غزلیں اثر سے بیگانہ نظر آتی ہیں ...."

داغ کی غزلیات بھی اس اثر سے بیگانہ ہیں، شاید اسی اثر کی تخلیق کے لئے انہوں نے سوقیانہ خیالات سے کام لیا۔ اثر سے بیگانگی کی ایک دوسری وجہ ان کی عشق میں کامیابی ہے ان کے اشعار کا بیشتر حصہ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ ایک کامیاب عاشق تو تھے لیکن محض سطحی لذائذ کے پرستار، اس لئے انکے مشاہدات دوررس نہیں ہیں، وہ ہجر کی کلفتوں، وصل کی بیتابیوں احساسات کی باریکیوں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اُن کی آتش رقابت جلد ہی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اس قسم کے مضامین انہوں نے اس لئے باندھے ہیں کہ یہ غزل گوئی کے لوازمات اور اس کی روایات بن چکے ہیں۔

چونکہ کامیاب ہیں اس لئے حزن و یاس کا عنصر غائب ہے، نہ اپنے مسرور جذبات کا تجزیہ کر سکتے ہیں نہ ہی دل کی کیفیتوں کو آشکار کر سکتے ہیں یاس کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے غور و فکر کی قوتیں معطل ہیں وہ اپنے سرور میں اس قدر مگن ہیں کہ انہیں دروں بینی کا موقع نہیں ملتا چنانچہ شعر کہنے کے لئے انہی جذبات کا اظہار کرتے ہیں جن سے وہ ناآشنا ہیں، جنکے اظہار میں انہوں نے اصلیت سے بہت کم کام لیا ہے، اس لئے تاثرات میں عمق نہیں ہے انکے پڑھنے سے دل پر گہرا اثر نہیں ہوتا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو ان میں روح سرے سے ہی مفقود ہے یا ہے تو نیم مردہ، دل اُن میں لچک اور کیف کا متلاشی رہتا ہے، دماغ کو کچھ ایسے حسن اور ایسی جاذبیت کی جستجو رہتی ہے کہ ایک بار پڑھنے سے پھر کبھی حافظہ سے محو نہ ہو۔ لیکن۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تمنا اکثر اشعار کے دروازے سے حزیں ہو کر پھر جاتی ہے، اسکے برعکس غالب، میر درد اور مومن کو دیکھئے کہ ایک ناکام عاشق کا کلام کس خوبی کا مالک ہوتا ہے، مومن کے علاوہ ان تینوں شاعروں میں حزن و یاس بدرجۂ اتم ملتا ہے، لیکن اس سے جو چاشنی، جذب کشش اور لطافت، کیف اور عمق جذبات ان کی غزلوں کو نصیب ہے اس کی مثال اور کہیں ملنی دشوار ہے، داغ کے اشعار میں میر تقی کا "قیامت کا سا ہنگامہ" اور اُن کی سادگی مومن اور میر درد کا سا خلوص اور روحانیت، غالب کی عظمت و شوکت، اسکا ادراکی اور جذباتی امتزاج حسرت کی سی پاکیزگی اور اقبال کا اتحادِ الفاظ و معنی بہت کم دیکھنے میں آتا ہے لیکن اس سے اُن کی مقبولیت میں فرق نہیں پڑتا، جس کی وجہ یہی ہے کہ وہ عام پسند باتیں کہتے ہیں اُن کے احساسات میں کوئی ایسی دقت یا پیچیدگی نہیں جو اُن کے بآسانی قبول کر لینے میں مانع ہو۔ اُن میں باریکیوں، موشگافیوں اور لطافتوں کو دخل نہیں ہے، وہ عام سطح سے زیادہ بلند نہیں اس کے علاوہ ان احساسات کے اظہار کرنے کے لئے جس زبان کا انتخاب اور استعمال کیا، وہ ٹکسالی ہے، جو خالص اور سادہ ہونے کے سبب بے حد دلپذیر ہے۔

محترمہ زیب عثمانیہ گولڈ میڈلسٹ

تُو — اور — میں

اگر ہے سخت کوشی پر بنائے آشیاں میری
محافظ میرے طوفاں اور بجلی پاسباں میری

وہی صدیوں سے تجھ کو انتظارِ عیسیٔ دوراں
وہی مرگِ تمنا اور جانِ ناتواں میری

ترا شیوہ تن آسانی مرا شیوہ تن آسانی
وہی دشواریاں تیری وہی دشواریاں میری

نہیں قیدِ مکاں سدِ رہِ جذب فلک پیما
کہ ہے تا لامکاں پروازِ فکرِ نکتہ داں میری

نزاکت برگ و گل کی سنگ و آہن سے بدلنا ہے
نہیں بے وجہ اتنی تند گلشن میں فغاں میری

ترے نالوں سے ظاہر بے ثباتی تیری دنیا کی
مرے نغموں میں پوشیدہ حیاتِ جاوداں میری

جہاں میں فتح کیا ہے زیبؔ! ذوقِ رزم آرائی
مگر اس جیت سے مجھ وہ ہی بزمِ مغاں میری

جناب کرشن چندر ایم اے

قبر

وہ کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ پہلے شاید موگہ کالج میں تعلیم پاتا تھا، پھر جب اس کا بڑا بھائی لاہور کے ایک بنک میں ملازم ہوگیا، تو وہ بھی لاہور آگیا۔ وہ بے حد شرمیلا تھا۔ چھ برس کے بدن کا خوبرو جوان، فراخ پیشانی، کھلتا ہوا رنگ، متبسم ہونٹ، جو ایک شرمیلی مسکراہٹ کے باوجود بھی ہر وقت کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر تھرتھراتے رہتے تھے۔ جماعت میں عموماً وہ پچھلے بنچوں پر بیٹھا کرتا، اور ہمیشہ ایک کونے میں۔ اُسے کسی نے کبھی جماعت میں شرارت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ تو وہ لڑکیوں پر چاک پھینکتا تھا، اور نہ ہی کاغذ کے ہوائی جہاز، اور نہ اُس نے کبھی فاضل پروفیسر کی عمدہ تقریر کے دوران میں ایک پیسہ تک بھی بطور تحسین پروفیسر کی میز پر نہ پھینکا تھا۔

اور پھر ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ شاعر بھی ہے۔

کالج ہوسٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے، اسلئے ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت جلد مانوس ہو گئے تھے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ لائلپور کا رہنے والا ہے، موضع کا نجن ماموں۔ وہ سات بھائی ہیں۔ ایک منیم، ایک وکیل، ایک سکول ماسٹر، ایک آڑھتی، ایک بزاز، ایک افیون کا سرکاری ٹھیکیدار، اور ساتواں اور سب سے چھوٹا وہ ایک طالب علم۔ چھ بھائی تو بیاہے جاچکے تھے، اور اُن کی بیویاں اگرچہ کافی بدصورت تھیں، مگر "جہیز" کے معاملے میں بہت "حسین" واقع ہوئی تھیں، اور اب اُس کی باری تھی، بی اے پاس کرنے کے بعد ــــــ

شاید اسی امر نے اُسے شاعر بنا دیا تھا۔

موسم سرما کی چاندنی راتوں میں جب بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے پریزادوں کی طرح آسمان پر اڑ رہے تھے اور ہلکی نرم سپید چاندنی کے پرتو نے ہوسٹل کے کنگروں کو کسی پرستانی قلعے کے میناروں کی طرح پراسرار او حسین بنا دیا تھا، ہم دونوں ہوسٹل کی چھت پر جا بیٹھے۔ میں نے اُس سے پوچھا

"سچ کہنا۔ کیا تم نے کانن سے زیادہ خوبصورت اور باحیا لڑکی کہیں دیکھی ہے، خصوصاً جس دن وہ سپید ساری اور نقرئی آویزے پہنکر جماعت میں آتی ہے تو کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے، ایمان سے کہنا کیا اس وقت تمہارا دل یہ نہیں چاہتا کہ ایک ہلکا سا چاک کا ٹکڑا اس طرح پھینکا جائے کہ اس کے کانوں کے قریب اُس کی سفید ساری کے دلفریب دھاریوں سے چھوتا ہوا گویا اُسے چومتا ہوا گزر جائے اور ایک چنبیلی کے پھول کی طرح اُس کے قدموں میں جا گرے۔ . . . . ایمان سے، کلاس روم میں بیٹھے بٹھائے خراج حسن ادا کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے، کیوں کنہیا لال . . . . اور پرنسپل اور پروفیسروں کی بدذوقی دیکھو، کہ ہمیں اس قسم کی باتوں پر بھی جرمانہ کرنے سے نہیں چوکتے، اور "بدمعاش" اور "بدتہذیب" اور "لفنگا" کے خطاب الگ بخشے جاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے . . . . "

کنہیا لال ایک شعر گنگنانے لگا، اور پھر اُس نے آہستہ آہستہ مدھم لہجوں میں اپنی داستان محبت کہہ ڈالی۔ شرمیلی پہلی محبت، جو ایک نوزائیدہ گل کی طرح پتوں میں چھپی رہی ہو

اس نے یہ داستان رک رک کر بیان کی، اُس کے ہلکے مدہم لہجہ میں وہ مٹھاس اور حلاوت تھی، جو اُس پہاڑی گیت میں ہوتی ہے جسے جنگل کی ہواؤں نے کسی کمسن چرواہی کے نازک لبوں سے پہلی مرتبہ سنا ہو، اُس کی آنکھوں میں وہ شرم اور حلیمی تھی، جو محبوب کی پہلی نگاہوں میں ہوتی ہے، داستان شروع کرنے سے پیشتر اُس نے ایکبار سوئے شرق دیکھا، اور میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"ہمارے گھر میں پانی بھرنے کا کام ایک بیوہ براہمنی کے سپرد ہے، اُس کی ایک لڑکی ہے، رکمن"! کنہیا لال نے رک کر کہا" رکمن کو تم نے نہیں دیکھا، اسی لئے تم کا ان کی دن رات تعریف کیا کرتے ہو۔ رکمن کا ایک چچا ہے۔ جس نے اس کے باپ کے مرنے کے بعد اُس کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا ہے، اور لڑکی اور بیوہ براہمنی کو اس سے محروم رکھا ہے، اُس نے اپنے مرحوم بھائی کے مکان پر بھی قبضہ کر لیا ہے، اور رکمن اور اُس کی ماں کے لئے دو کوٹھڑیاں ہی رہنے کے لئے دیدی ہیں، ماں بیٹی دونوں بڑی مشکل سے دن کاٹ رہی ہیں، اور دو تین گھروں میں برتن مانجھتی ہیں اور پانی وغیرہ بھرتی ہیں، ہمارے ہاں اُن کا آنا جانا بہت ہے، وہ بے چاریاں جب ہمارے گھر آکر میری بدصورت بھابیوں کو اپنے دکھڑے سناتی ہیں تو انہیں بہت رحم آتا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح یا شام کے وقت رکمن کی ماں رکمن کے چچا کی ایذا پرستی کی ایک نئی داستان سنا رہی ہے، میرے چھ بڑے بھائی بھی ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں، اور رکمن کی شبنم فشاں آنکھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہمدردی جتا رہے ہیں، اُنکا روئے سخن ہمیشہ رکمن کی طرف ہے، نہ کہ رکمن کی ماں کی طرف مثلاً بات تو کر رہی ہے رکمن کی ماں، لیکن میرے بڑے بھائی جو سیٹھ رنچھوڑ لال جی کے ہاں منیم ہیں، رکمن سے کہہ رہے ہیں۔ "اچھا، رکمن تو ہمارے ہاں چلی آ، ہم یہاں تجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دینگے، ہے نا!

اور پھر باقی پانچوں بھائی سر ہلا کر کہتے ہیں ہاں، ہاں، ہاں، بھلا رکمن کی ماں، اور رکمن تمہیں اپنے چچا کے ہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے، ہمارے ہاں آجاؤ نا رکمن!

انسانی ہمدردی کے اس شدید مظاہرے کے وقت میری بھابیوں کی صورتیں دیکھنے کے لائق ہوتی تھیں، یا پھر کبھی یوں ہوتا کہ رکمن ہمارے گھر اداس اور غمگین صورت بنائے آتی، اور ——

پہلا بھائی، کیا بات ہے رکمن؟
دوسرا بھائی۔ رکمن، کیوں کیا بات ہے؟
تیسرا بھائی۔ رکمن، اداس کیوں ہو، رکمن؟
چوتھا بھائی۔ کیا کسی نے تجھے کچھ کہا ہے؟

پانچویں بھائی کی باری آنے سے پہلے ہی رکمن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی، اور سسکیوں کے درمیان کہتی جاتی "چچا نے ماں کو آج پھر پیٹ ڈالا . . . چچا نے . . . چچا نے . . . ہوں . . . ہوں . . . "

پانچویں بھائی نے گرج کر کہا، چچا نے مارا . . . . کیوں اُسے کیا حق ہے، تمہاری ماں کو پیٹنے کا۔ وہ کہاں ہے سالا حرامزادہ، شہدا۔ کیوں جی؟ میں پوچھتا ہوں اُسے تمہاری ماں کو پیٹنے کا کیا حق ہے؟

اور چھٹے بھائی ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر کہتے، "کمبخت آج ملا رستے میں کہیں تو اس سے پوچھ لوں گا، کہ ایک غریب بیوہ کو کس طرح ستایا جاتا ہے؟"

چھٹے بھائی کی لال لال آنکھیں دیکھ کر رکمن ڈر جاتی اور آہستہ سے کہتی "نہ، نہ، بھیا تم کہیں انہیں نہ مار بیٹھنا . . . ہم پر تو آفت ہی آجائے گی۔

اور چھٹے بھائی اسی "آفت" کے آجانے کے خیال سے چپ

ہو رہتے، یوں بھی تو ہم میں سے کون اتنا دلیر تھا، جو رکمن کے چچا سے جاکر لڑتا، وہ تو ایک بڑا ہی بدمعاش چھٹا ہوا، پرلے درجے کا بدطینت آدمی تھا، اس سے لڑائی مول لینے کو کون تیار تھا، یہ ہمدردی کا شدید جذبہ تو میرے بھائیوں کے دل میں محض اسی لئے بار بار طوفانی صورت اختیار کرلیتا تھا، کہ رکمن ایک نہایت ہی انجان، بھولی بھالی، معصوم اور بے حد خوبصورت دوشیزہ تھی، اور میرے بھائیوں کی بیویاں بہت ہی چالاک فربہ اندام اور بدصورت تھیں، اور پھر انہیں آج تک اپنی متوسط طبقے کی معاشرت میں کسی حسین لڑکی سے باتیں کرنے اور اس کے ساتھ ہمدردی جتانے کا موقع نہ ملا تھا، جب وہ بے چارے دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد تھکے ماندے گھر واپس آتے تو اکثر اپنی جاہل اور پھوہڑ بیویوں کو یونہی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر لڑتے جھگڑتے دیکھتے، اس امر کا نفسیاتی ردعمل تم جانتے ہو ایک ہی صورت اختیار کرسکتا تھا۔

عشق یا ہوس؟ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کچھ سمجھ لو" کنہیا لال نے متین لہجہ میں جواب دیا، "یہ ایک ہی جذبہ کے دو مختلف مدارج ہیں، میرے بھائیوں کو رکمن سے باتیں کرنے میں جو مزہ آتا تھا اُسے حاصل کرنے کیلئے اور اُس کی لذت سے بہرہ ور ہونے کے لئے وہ مختلف طریق استعمال کرتے تھے، لیکن اگر ان تمام طریقوں کو اکٹھا کرکے انہیں جزیاتی صورت میں دیکھنے سے احتراز کیا جائے، اور بحیثیت مجموعی ان پر نظر ڈالی جائے تو وہ تمام طریقے ایک تسلسل (Pattern) کی صورت اختیار کرلیتے تھے۔

مثلاً تمام بھائیوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنے جذبۂ ہوس کو ایک دوسرے سے چھپائے رکھیں۔

جہاں تک ہوسکے رکمن سے اسی وقت بات کی جائے جب [illegible]

رکمن پر اپنی ذاتی ہمدردی، خاندان کے دیگر اراکین سے الگ تھلگ ہوکر جتائی جائے۔

یہ ثابت کیا جائے، کہ سچی ہمدردی صرف اُسے ہو سکتی ہے، اور باقی سب بھائی یونہی دکھاوے کے لئے باتیں بناتے ہیں۔

وغیرہ . . . وغیرہ . . . . .

اور تم؟ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "تم ساتویں بھائی تھے، اور غالباً بہت شریف . . ."

کنہیا لال شرما سا گیا، کہنے لگا "میں؟ میں تو اُسے دیکھتا ہی رہتا، حتےٰ کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی، اُسکی باتیں سنتا ہی رہتا، یہاں تک کہ وہ خاموش ہوجاتی اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگتی، میں تمہیں کیا . . . . بتاؤں میں اُسے کس قدر چاہتا تھا، چاہتا ہوں، رکمن کے آتے ہی میری حالت متغیر ہونے لگتی، خون کی روانی تیز ہونے لگتی، طاقت گویائی سلب ہوجاتی، میں اس سے بات کرنا چاہتا، نہ کرسکتا، بس ٹکٹکی لگاکر اُس کی طرف دیکھتا رہتا، تمہیں کیا بتاؤں وہ کس قدر حسین ہے، اور جب وہ مسکراتی ہے تو اسکے لبوں کی داہنی طرف ایک نہایت دلفریب سا خم پڑتا ہے، جسے دیکھ کر میں اکثر دیوانہ ہوگیا ہوں"

کنہیا لال رک گیا، پھر ذرا ٹھہر کر بولا

"گذشتہ تعطیلات گرما میں میں نے کئی بار سوچا، کہ اگر اُسے رکمن! رکمن! میری اپنی رکمن! کہہ کر بلاؤں تو پھر کیا ہوگا کیا وہ مجھے گالیاں تو نہ دے گی، کیا وہ اپنی ماں سے جاکر تو نہ کہے گی، اپنے بھائیوں اور بدصورت بھابیوں سے تو مجھے مطلق خوف نہ تھا، آخر میں نے تہیہ کرلیا، کہ رکمن سے بات کردوں گا میں نے دل میں سوچا کہ اس طرح خاموش محبت کرتے . . . تو مرجانا ہی بہتر ہے، آخر ہوگا کیا، یہی نا کہ وہ میری محبت

ٹھکرا دیگی، میں اُس سے یہ کہونگا اور وہ مجھے یوں جواب دے گی جس کے جواب میں میں اُسے یہ کہوں گا، اور وہ کہے گی کہ تجھے تو ڈر لگتا ہے؟ اور میں کہونگا، کہ ڈر کیسا؟ رکمن جب دو دل محبت کرنے پر تل جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی، اور پھر وہ اک شرمیلی ادا سے اپنے بازو میرے گلے میں حمائل کر دے گی، اور میں پیار بھری نگاہوں سے . . . . .

یکایک ایک کھڑ کا سا ہوا، میں چونک پڑا، سامنے دیکھا تو رکمن کھڑی تھی، سر پر پانی کی گاگر اٹھائے ہوئے اُس کے ماتھے پر زلفیں بل کھاتے ہوئے بھیگی پڑی تھیں، اور اس کی لانبی لانبی پلکوں پر بھی پانی کے قطروں سے جھکی پڑی تھیں، اُس نے بڑی مشکل سے اُنہیں اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھ کر کہا، کاہن! ذرا گاگر تو اتروا دو۔

میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا، آج کتنا اچھا موقع تھا، گھر میں کوئی بھی نہ تھا، نہ بھائی نہ بھابیاں، کتنے بلیاں، سب غائب تھے کیسا عجیب اتفاق تھا، میں ایک گھبرائے ہوئے بطخ کے بچے کی طرح رکمن کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ کاہن! وہ مجھے کاہن کہا کرتی ہے، ذرا گاگر اتروا دو، کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔"

میں نے گاگر اتروا دی

رکمن دالان کے ایک ستون کا سہارا لیکر کھڑی ہوگئی، وہ ہانپ رہی تھی، چہرہ لال تھا، زلفیں لہراتی ہوئیں۔

"کیا کر رہے ہو"؟ رکمن نے یونہی پوچھا۔

"کچھ نہیں . . . کچھ نہیں!" . . . میں نے ایک مجرم کی طرح جواب دیا۔

وہ، ہنسی، یونہی ایک دلکش ہنسی، جیسے کسی مست رقاصہ کے گھنگھرو ایک دم بج اٹھیں

پھر وہ چپ ہوگئی، اور چند لمحوں تک کامل خاموشی رہی

بھابیاں کہاں ہیں؟ اب پھر رکمن نے پوچھا، اور جبین پر سے بال درست کرنے لگی،

پنڈت جھنگا رام کے ہاں کتھا ہے، وہاں گئی ہیں؟

اچھا: اُس نے اچھا!" کچھ اس طرح مدہم اور پُر اسرار لہجہ میں کہا کہ میں نے سمجھا کہ ہوا کا کوئی لطیف جھونکا چیڑھ کے نکیلے جھومروں میں نغمۂ حیات پیدا کرتے ہوئے گزر گیا ہے

پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی کمر کو جھٹک دیا، اپنے شانوں کو جھٹک دیا، اپنی گردن کو جھٹک دیا، اور یہ سب کچھ بالکل غیر شعوری طریق پر ہوا، اس کے بعد اُس نے لا اُبالیانہ انداز میں کہا۔ "اچھا کاہن میں جاتی ہوں"

وہ چلی گئی۔

اے، اے، رکمن! میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ ڈیوڑھی سے لوٹ آئی، "کیا کہتے ہو؟" اس کا چہرہ بالکل بھولا بھالا، اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

میری آنکھیں نیچی ہوگئیں "کچھ نہیں، کچھ نہیں رکمن!" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑی رہی اور میں اُس سے نگاہیں نہ ملا سکا، پھر میں نے دیکھا کہ اُس کے قدم آہستہ سے ڈیوڑھی کیطرف مڑ گئے۔

وہ جا رہی تھی۔

ارے بیوقوف، گدھے، وہ جا رہی ہے!

میں بھاگ کر ڈیوڑھی کی طرف گیا، وہ اس تنگ و تاریک ڈیوڑھی میں سے گذر رہی تھی، میں نے دوڑتے دوڑتے رک جانا چاہا، لیکن میرے قدم مجھے اس کے پاس لے ہی گئے، میں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ لیا، اور کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا، رکمن! رکمن! میری بات سنو اور پیشتر اس کے کہ وہ میری بات سن سکتی۔ میں نے اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیئے۔

رکمن کے بدن میں سر سے پاؤں تک ایک جھرجھری سی آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو مجھ سے جدا کیا، اور پھر ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا، اور ایک زقند لگا کر ڈیوڑھی سے باہر نکل گئی۔

میں رکمن کے پیچھے بھاگتا ہوا گیا، بیوقوفوں کی طرح ایک لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور ڈرتا تھا کہ اُس نے کسی سے کہدیا، تو پھر . . . "رکمن ذرا ٹھہر تو سہی، تجھے پرماتما کی سوگند رکمن!" لیکن رکمن روتی ہوئی آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی آگے آگے بھاگی جا رہی تھی، اور زور زور سے کہہ رہی تھی "ابھی ماں جی سے کہوں گی۔ ابھی چچا سے کہوں گی . . . ابھی تمہارے بڑے بھائیوں سے کہوں گی!"

"کیا ہوا رکمن، تو میری بات تو سن لے۔ تجھے دیوی کی سوگند اگر تو کسی سے کچھ کہے، تجھے اپنی ماتا کی قسم" رکمن ٹھہر گئی، اور تُند نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی "ایسی سخت قسمیں دیتے ہوئے تمہیں شرم تو نہیں آتی!"

اب ہم دوڑتے بھاگتے گھر سے دور نکل آئے تھے، یہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے اور ایک ریتلا میدان جس میں کہیں کہیں آک کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، پرے ایک درختوں کا جھنڈ تھا۔ اور اس کے پیچھے رکمن کے چچا کا گھر، اس جھنڈ کی اوٹ میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور کوے کائیں کائیں کرتے ہوئے مغرب کو بھاگ رہے تھے، سورج کی شعاعوں میں اُن کے پر سونے کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میرے سامنے رکمن کمر پر ہاتھ رکھے ایک عجیب شانِ دلربائی سے کھڑی تھی، اور آنچل کی تاروں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آ رہی تھیں۔

"اب کبھی چھیڑو گے؟" رکمن نے ملائم لہجے میں کہا۔

میں نے سر ہلا دیا "ہرگز نہیں"

وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی، اور پاؤں سے ریت کرید کرید کر ایک محراب سی بنانے لگی، جب محراب بن گئی تو اُس نے آہستہ سے اپنا پاؤں محراب کے نیچے سے نکال لیا، اب ریت کی محراب تیار ہو چکی تھی۔

رکمن نے فتحمندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا،

"یہ کیا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"یہ تمہاری قبر ہے!" رکمن نے شوخی سے کہا، اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

شریر لڑکی چیخ چیخ کر ہنس رہی تھی۔

"لاؤ ذرا دیکھیں تو" میں نے اُسے پرے دھکیل کر کہا، اور پھر لات مار کر ریت کی محراب کو مسمار کر دیا۔

"اُف . . ." اُس کی ہنسی فوراً بند ہو گئی "تم نے کیا کیا؟"

"ہاتھ بڑھا کر، لگاؤں ایک طمانچہ اور . . ."

میں نے سر جھکا کر کہا "ضرور، اب ایک نہیں ایک سو طمانچے لگا دو، اگر اُف کر جاؤں تو کہنا"

وہ گھر جانے کے لئے آہستہ سے مڑی، اور ڈوبتے ہوئے سورج کے تپتے ہوئے سنہری سیال نے یکایک اُس کے رُخ کو روشن کر دیا، اُس کی نگاہوں میں ایک عجیب چمک آ گئی تھی، جاتے جاتے اُس نے مدہم لہجہ میں کہا۔

"ہم گھر جا کر کہیں گے کہ کاہن بڑا بدمعاش ہے!"

اتنا کہہ کر کنہیا لال رُک گیا۔

"پھر؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"پھر؟ . . ." کنہیا لال نے آہستہ سے کہا . . . "پھر گرمی کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور میں یہاں چلا آیا۔"

ہم دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے، ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آ رہے تھے، اور پرے پیپل کے درخت کی ایک ٹہنی میں چاند ایک ٹوٹے ہوئے کنگن کی طرح اٹک گیا تھا، نیچے سڑک پر ایک پوربیا گاڑیبان "پیتم کیوں بھیو اداس" "پیتم کیوں

بھیو اداس" گاتے ہوئے بیل گاڑی چلاتا ہوا گزر رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد میں نے کنہیا لال سے پوچھا "اور رکمن"

کنہیا لال مسکرا کر کہنے لگا "میرے بھائی اپنی غلطیوں کی سزا مجھے بھگتنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ انہوں نے روپیہ چاہا، انہیں روپیہ مل گیا۔ اب وہ اپنی بدصورت بیویاں دیکھ دیکھ کر کڑھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ میری شادی بھی کسی موٹی سانولی اجڈ گنوارن سے کر دی جائے۔ لیکن میں روپیہ نہیں مسرت چاہتا ہوں اور مسرت کا نام رکمن ہے اور یہ بات رکمن بھی اچھی طرح سے جانتی ہے"۔

"یہ بات ہے!" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"ہاں!"

بات ختم ہو گئی اور ہم دونوں برج پر سے اٹھ بیٹھے۔ لیکن نیچے سڑک پر گزرنے والے گاڑی بان کے لئے بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک گاتا ہوا چلا جا رہا تھا "پیتم کیوں بھیو اداس، پیتم کیوں بھیو اداس"۔

میرے لئے کالج کی زندگی بہت جلد ختم ہو گئی۔ بہت سالوں کے بعد مجھے ایک دن پھر کنہیا لال ملا۔ میں لاہور بسلسلۂ سیاحت آیا تھا۔ کرسمس کے دن تھے اور انارکلی میں بہت رونق تھی۔ یونہی گھومتے گھومتے کنہیا لال مل گیا۔

ارے!

میں نے اسے بہت مشکل سے پہچانا۔ اس کا کھلتا ہوا رنگ اب دھوئیں کی طرح میلا ہو گیا تھا۔ جبیں شکن آلود تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، ہونٹ خشک اور چہرے پر چھائیاں، جسم سوکھے ہوئے بانس کی طرح نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایم اے انگریزی میں اول رہا تھا اور اب یہیں لاہور میں کسی کالج میں پروفیسر تھا۔

"مگر تمہیں ہوا کیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میرا سوال سنکر وہ آہستہ لیکن بے حد تلخ لہجہ میں بولا۔ "میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ معاشرت میں عورت کو باعزت طریق پر حاصل کرنا ناممکن ہے۔ یہاں شادیاں ہوتی ہیں لیکن محبت نہیں ہوتی۔ ہمارے ماں باپ ہمیں سب کچھ معاف کر سکتے ہیں۔ ہمارے سب عیوب چھپا سکتے ہیں۔ قتل، چوری، ڈاکہ، بددیانتی، لیکن وہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی ان کی مرضی کے خلاف کسی لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کرے۔ نتیجہ؟ نتیجہ؟ تم پوچھو گے، نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ رکمن برہمنی تھی۔ اسے ایک پچاس سال کا بوڑھا لیکن امیر برہمن بیاہ کر لے گیا۔ میں بنیا تھا۔ میرے پیچھے ایک گنگھو یا گھگھیا کر باتیں کرنے والی بنیائن باندھ دی گئی۔ بوڑھا برہمن چند مہینے ہوئے رام رام کرتا ہوا اس دنیا سے چل بسا اور اب کمسن اور حسین رکمن بیوہ ہے۔ ماں بھی بیوہ اور بیٹی بھی بیوہ۔ وہ اب میلے کپڑے پہنتی ہے اور سر جھکا کر چلتی ہے، جیسے اپنے بوڑھے خاوند کی موت کی وہی ذمہ دار ہے"۔

میں نے بات کا رخ پلٹنا چاہا۔ چنانچہ میں نے آہستہ سے کہا "سناؤ تمہارے بال بچے تو ہوں گے۔ راضی خوشی ہیں!"

جیسے اس نے میری بات کا غلط مطلب لے لیا ہو وہ ملامت بار نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولا "بچے پیدا کرنے کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ شادی ایک سودا ہے۔ دیگر اشیاء کی طرح لڑکے لڑکیاں بھی سیم و زر کے عوض بیچے جاتے ہیں۔ اور یہ طریق موجودہ نظام زندگی کے عین مطابق ہے۔ اور بچے"، وہ ایک تلخ ہنسی ہنسکر کہنے لگا۔ "بچے تو ایک کامیاب شادی کا جزو لاینفک ہیں، اور پرماتما کا شکر ہے کہ ہندوستان میں ننانوے فیصدی شادیاں اس لحاظ سے کامیاب ہوتی ہیں۔ تمہیں میرے بچوں کا حال سنکر حیرت ہو گی۔ میں چھ بچوں کا باپ ہوں۔ رینگتے ہوئے بچے، چیختے

ہوتے نیچے" اور میری طرف غصہ بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے، پچیس چھبیس سال کی جنسی فاقہ پرستی کے بعد اگر ہندی نوجوان کی زندگی میں ایک عورت آجائے تو وہ کیوں نہ اُسے چوم چوم کر اُس کا حلیہ بگاڑ دے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ عورت، کوئی عورت، ایک کانی عورت، انجی عورت، ایک عورت جس کی شکل تمہارے کوٹھے کے پرنالے سے بھی زیادہ حسین ہو، مگر وہ عورت ضرور ہو۔

اسکا سانس پھول گیا اور وہ کھانسنے لگا! کچھ مضائقہ نہیں، اب کتنے دن رہ گئے ہیں، اب رات کو مجھے بخار بھی ہوتا ہے کبھی کبھی کھانسی کے ساتھ خون کے قطرے بھی آجاتے ہیں، اب جلد ہی اس قید سے چھوٹ جاؤں گا، لیکن مجھے اپنی فکر نہیں، مجھے فکر ہے تو صرف یہ کہ میں جتنا روز بروز دبلا ہو رہا ہوں، میری بیوی اتنی ہی موٹی ہوتی جا رہی ہے۔

میں ہنسا "بھائی کنہیالال، معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغی توازن برقرار نہیں رہا، ذرا کسی پہاڑ پر چلے جاؤ، جو ہونا تھا وہ ہو چکا خوش رہا کرو، دیکھو یہاں کتنی چہل پہل ہے، یہ دلفریب ساریاں بے فکروں کے قہقہے، رومان اور خوشی!"

"رومان اور خوشی؟" کنہیالال نے جھنجھلا کر کہا، اُس کی آنکھیں بے نور سی ہو گئیں اور وہ پہلے سے بھی بدصورت نظر آنے لگا۔ "تم ان لوگوں کی خوشی کا غلط اندازہ کر رہے ہو، یہ لوگ پیدا ہونے سے پہلے مر چکے ہیں، ان کا گلا ان کے ماں باپ نے خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا ہے، یہاں نہ رومان ہے نہ خوشی، یہ تو چلتی پھرتی لاشیں ہیں، لاشیں!"

وہ رک گیا، اور پھر میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ کر بولا "تم جانتے ہو جہاں رومان اور خوشی نہیں ہوتے وہاں کیا ہوتا ہے؟ . . . . . وہاں ہوتا ہے! . . . مذہب۔ مذہب اور صرف مذہب اب رکمن مجھ سے بات تک نہیں کرتی، وہ دن رات مالا جپتی ہے اور اپنے آپکو اور مجھے دونوں کو پاپی سمجھتی ہے! ہا ہا ہا!"

کنہیالال زور زور سے ہنسنے لگا۔

کنہیالال کی ہنسی نے بے اختیار میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیئے میرے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی اور میرے جسم کے رُؤیں رُؤیں کو کانپتا ہوا چھوڑ گئی، پتہ نہیں کیوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کنہیالال کے پچکے ہوئے گالوں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار وہ ریت کی قبر یاد آگئی جو ایک شام غروب آفتاب کے وقت کالج کے ایک تپتے میدان میں ایک پنجابی دوشیزہ نے اُس کے لئے تیار کی تھی۔

جناب بہزاد لکھنوی

نقشِ بہزاد

اُس کو بت سمجھا تھا یا اپنا خدا سمجھا تھا میں
ہاں بتا دے اے جبینِ شوق کیا سمجھا تھا میں

اللہ اللہ کیا عنایت کر گئی مضرابِ عشق
ورنہ سازِ زندگی کو بے صدا سمجھا تھا میں

اُن سے شکوہ کیوں کروں اُن سے شکایت کیوں کروں
خود بڑی مشکل سے اپنا مدعا سمجھا تھا میں

میری حالت دیکھئے، میرا اثر بپا دیکھئے
آپکو اس سے غرض کیا ہے کہ کیا سمجھا تھا میں

اُس نگاہِ لطف نے بہزاد مجھکو کھو دیا
جس نگاہِ لطف کو اپنی دوا سمجھا تھا میں

نوشتہ "موپاساں" فرانسیسی افسانہ نگار

مترجمہ جناب علی احمد صاحب

زیتون کا باغ

خلیج لسکا کی بندرگاہ گرانا۔ کے آوارہ گرد لوگ جب یہ دیکھتے کہ بوڑھے ابی کی کشتی ساحل سے آلگی ہے تو اسے مدد دینے کے لئے وہ اس کے پاس پہنچ جاتے، آج بھی ابی تنہا تھا، وہ ایک قوی ملاح کی طرح کشتی کو پتواروں سے کھینچتا ہوا ساحل کی طرف بڑھتا آرہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھاون سال سے تجاوز کرچکی تھی، گھنی دا ڑھی سفید لباس اور وضع قطع سے بالکل پادری معلوم ہوتا تھا، کشتی پانی کی اسی تیزی سے بہتی ہوئی آئی اور ساحل کے سامنے پھیلی ہوئی ریت میں دھنس کر رک گئی کنارے پر چار پانچ شخص جو کھڑے اسکا انتظار کر رہے تھے، اس کے پاس پہنچے "مانسیر لی کیوری" ان میں سے ایک نے کہا: "خوب آج تو قسمت اچھی رہی"

ابی نے پتواروں کو کشتی میں ڈالدیا، چڑھی آستینیں اتارلیں لبادے کے بٹن تارلئے اور بولا۔

"ہاں۔ یقیناً بہت اچھی۔ آج بہت سی مچھلیاں ہاتھ آئیں"

بڑے تجربہ کاروں کے مانند وہ سب مچھلیوں کا معائنہ اور اس پر تنقیدیں کرتے رہے، پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"میں ان کو آپ کے گھر پہنچا دونگا"

"میرے دوست! میں تمہارا شکرگزار ہونگا"

پادری نے لوگوں سے ہاتھ ملایا اور اس آدمی کو . . . . . ساتھ لیکر روانہ ہوگیا، گردن جھکائے سنجیدگی کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا لیکن اس کے قدم بہت مضبوط تھے، جسم کی گرمی کو دور کرنے اور شام کی ہوا سے اپنے دماغ کو تازہ کرنے کیلئے اس نے زیتون کے باغ کے قریب اپنی ٹوپی اتارلی، یہ گاؤں ایک کشادہ وادی کے دامن میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا جس کا سلسلہ سمندر تک چلا گیا تھا۔

یہ جولائی کی ایک شام تھی۔ دور ــــــ بہت دور پہاڑوں کی چوٹیوں سے غروب ہونے والے سورج کی دراز کرنیں پادری کے سایہ کو دراز تر کرتی جارہی تھیں، جو کبھی زیتون کے درختوں اور کبھی زمین پر رینگتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کی خنک ہوا چلنے لگی تھی اور ابی اپنے دونوں ہاتھوں کو جیبوں میں رکھے ہوئے اسی طرح مضبوط قدموں سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی نظریں گاؤں کی طرف اٹھائیں وہ گاؤں جس میں وہ بحیثیت پادری کے تیس سال سے زندگی بسر کر رہا تھا اور جس زمین پر وہ اپنی حیات کی آخری سانسیں بھی لینا چاہتا تھا۔ بھورے پتھروں سے بنا ہوا گرجا مکانوں کے درمیان اونچے اونچے میناروں کے ساتھ اپنی عظمت کی داستان کہہ رہا تھا، ابی بہت خوش تھا اس لئے کہ آج اسے بہت سا شکار ہاتھ آیا تھا، گاؤں کے تمام باشندے صرف اسی لئے اس کی عزت نہ کرتے تھے کہ وہ پادری تھا، بلکہ اس لئے بھی کہ وہ بوڑھا ہونے کے باوجود سب سے زیادہ قوی اور بہادر تھا،

آج سے چالیس سال پہلے ابی بھی عام شہریوں کے ملک کا ایک مشہور شخص تھا، اور ناکامی محبت کے سلسلے میں اسے دنیا کو ترک کرکے پادری بننا پڑا، پکارڈی کا قدیم معزز خاندان بادشاہ اور ملک سے اپنی وفاداری کے لئے ضرب المثل تھا، ابی اسی

خاندان کا ایک فرد تھا، اس کی ماں کا خیال تھا کہ ایّی پادری بن جائے اور باپ چاہتا تھا کہ قانون کی تعلیم حاصل کرے لیکن ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی پوری نہ ہوئی۔ ایّی نے کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا بلکہ ملازمت کر کے گذر اوقات کرنے لگا۔ وہ خوبصورت، ذہین اور خوش طبع تھا یہی وجہ تھی کہ سوسائٹی میں اس کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، یاروں اور دوستوں کی صحبتوں میں ایّی کو ایک خوبصورت ایکٹرس سے محبت ہو گئی۔ وہ دیوانہ وار اُس سے محبت کرنے لگا۔ ایکٹرس حسین تھی۔ میانہ قد، گداز جسم، متناسب اعضا بڑی بڑی سیاہ مست آنکھیں غرض حسن و رعنائی کی تمام خوبیاں اُس میں مجتمع تھیں، یہی وجہ تھی کہ اُس نے چالاکی سے جیسا کہ چالاک عورتیں اپنے ضمیر کی خوشنودی کے لئے کیا کرتی ہیں جیسے ایّی کے دل پر اچھی طرح قبضہ کر لیا۔ بعد ازیں رفتہ رفتہ تعلقات اتنے بڑھے کہ اسٹیج کو چھوڑ کر وہ ایّی کے ساتھ رہنے لگی، اس طرح چار سال کا عرصہ گذر گیا اور اس طویل مدت میں ایّی نے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اُس سے شادی کیسی ہوتی؟ اگر اُسے اس بات کا شبہ نہ ہوا ہوتا کہ اُس کی محبوبہ کے تعلقات اُس کے ایک اور دوست سے بھی ہیں، وہ حاملہ تھی اور ایّی یہ جاننا چاہتا تھا کہ حقیقت میں وہ بچہ کس کا ہے ایک دن اُس نے میز کے خانے سے چند خطوط برآمد کئے جو اُس کے دوست نے اُس عورت کو لکھے تھے، ایّی سمجھ گیا کہ وہ دغاباز بیوفا اور بدکردار ہے لیکن وہ خود اُس عورت کے منہ سے اصل حقیقت سننا چاہتا تھا۔ ایکٹرس اب ایّی سے گھبرا گئی تھی، اور اس سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی تھی، وہ کوئی مناسب موقع کی منتظر تھی، ایّی بھی اُس سے متنفر تھا ایک دن اُس نے پوچھا۔

"روزیتی! سچ کہنا یہ بچہ کس کا ہے؟"

"مجھے معاف کرو ایّی" عورت نے گھبرائی ہوئی آواز میں اُس سے کہا "یہ بچہ تمہارا نہیں"

ایّی کے پاؤں تلے زمین نکل گئی، وہ حیران رہ گیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" اُس نے غصے سے کہا

"یہ تمہارا نہیں یہ اُس کا ہے"

"یہ بچہ؟"

"ہاں"

"تم جھوٹ کہتی ہو"

"میں کہتی ہوں کہ یہ اسکا ہے اگر یہ تمہارا ہوتا تو میں نے تم سے پہلے ہی سب کچھ کہہ دیا ہوتا"

ایّی کچھ مطمئن سا ہو گیا اس لئے کہ وہ حقیقت جاننا چاہتا تھا اب وہ ایک قسم کی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ وہ ایک وجود میں آنے والے ناپاک بچے کا باپ نہ تھا۔

اس نے نرمی اور سنجیدگی سے کہا میرے مکان سے چلی جاؤ، آئندہ کبھی اپنی منحوس صورت مجھے نہ دکھانا"

وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

پھر ایّی نے اُس کو نہیں دیکھا، وہ خود اپنا گھر چھوڑ کر جنوب کی طرف چلا گیا، اور بحر اوقیانوس کے ساحل پر سبز وادی کے درمیان الکسکاوس میں سکونت اختیار کر لی، یہاں مصیبت اور گمنامی کے اٹھارہ سال گذارے، گذرا ہوا عیش کا زمانہ پھر عورت کی بیوفائی۔ آرزوؤں کی پامالی اور وطن کی یاد آ آ کر اُسے مدت مدید تک بے چین اور بیقرار کرتی رہی۔

پیرانس کی وادیوں میں وہ گھومتا اور جب سورج کی کرنیں کرۂ ارض پر سیدھی پڑتیں تو وہ زیتون کے باغ میں درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر اپنے غم کو بھلانے کی کوشش کرتا۔ باقی وقت وہ عبادت میں گذارتا، زمانے کی گردشوں کے ساتھ رفتہ رفتہ گذشتہ ناکامیوں کے تمام نقوش اُس کے دل سے مٹ گئے اور خدا کی یاد نے اس کی جگہ لے لی، بہت جلد وہ وہاں کے باشندوں میں مقبول ہو گیا۔ اور بالآخر اس کی خدمتیں گرجا کے پادری کے طور

پر قبول کرتی گئیں اب وہ اپنے گاؤں کا معزز پادری تھا۔

(۲)

ملاح جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا چاہتا تھا کہ راہ کاٹنے کے لئے پادری سے کچھ گفتگو کرے، لیکن اس کی ہمت نہ پڑتی تھی، اس لئے کہ ابی اس وقت بہت سنجیدہ تھا، آخر ہمت کر کے اس نے کہا۔

آپ اپنے گھر میں آرام سے تو ہیں مانسیر لی کیوری؟

ابی کا چھوٹا سا مکان زیتون کے باغ کے درمیان گرجا کے قریب واقع تھا ساحل سے دس پندرہ منٹ کی راہ تھی سایہ دار درختوں نے اُسے اور بھی خوش منظر بنا رکھا تھا۔

"ہاں میرے دوست" پادری نے جواب دیا "میں یہاں بہت خوش ہوں"

اب دونوں مکان کے سامنے پہنچ گئے تھے، ایک لانبی عورت اِدھر اُدھر پھرتی نظر آ رہی تھی، وہ کھانے کی میز ترتیب دے رہی تھی، ایک چھری ایک چمچی ایک پلیٹ ایک رومال اور ایک گلاس یہ سب میز پر سلیقہ سے رکھے ہوئے تھے۔

قریب پہنچکر ابی نے آواز دی۔

"مارگریٹی!"

وہ ٹھہر گئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، پھر اپنے مالک کو پہچان کر کہا۔

"اوہ مانسیر لی کیوری آپ ہیں!"

"ہاں میں تمہارے لئے آج بہت سا شکار لا رہا ہوں۔ اچھی طرح بھوننا سمجھیں تم؟"

"لیکن سرکار" خادمہ نے مچھلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "آج کا کھانا تو تیار ہو چکا ہے"

"کوئی ہرج نہیں یہ بھی سہی، کل تک یہ تازہ مچھلیاں خراب ہو جائیں گی، آج میں زیادہ کھانا چاہتا ہوں" ابی نے کہا "یہ کوئی بڑا جرم تو نہیں؟"

مچھلیوں کو لیجاتے لیجاتے وہ مڑی، اور کہا۔

"ہاں ایک شخص آپ سے ملنے کے لئے صبح سے تین بار آ چکا ہے"

"ایک آدمی، کس قسم کا آدمی؟" ابی نے بے پروائی سے پوچھا۔

"اس قسم کا آدمی جس کو کوئی دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا"

"کیا کوئی بھکاری ہے؟"

"شاید اور شاید نہیں بھی، مجھے تو وہ کوئی بدمعاش معلوم ہوتا ہے"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی، ابی ہاتھ منہ دھونے کی تیاری کرنے لگا

"وہ وہاں کھڑا ہے" مارگریٹی نے باورچی خانے سے آواز دی۔

ابی نے سڑک کی طرف نظر اٹھائی، اُسے کچھ فاصلہ پر ایک شخص نظر آیا، اُس کے جسم پر بہت خراب اور پھٹے کپڑے تھے وہ آہستہ آہستہ مکان کی طرف آ رہا تھا، پادری انتظار کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خادمہ ٹھیک کہتی تھی، یقیناً یہ کوئی اوباش معلوم ہوتا ہے۔

جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے آنکھیں پادری کے چہرے پر جمائے وہ نامعلوم شخص قریب اور قریب آتا گیا، وہ جوان تھا ڈاڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے، سر کے لانبے لانبے پریشان بال ٹوپی سے باہر نکل کر پیشانی پر آ گئے تھے، پادری سے جب چند قدموں کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے پھٹی ہوئی ٹوپی اتار لی۔

ابی نے بھی اپنی ٹوپی ہاتھ میں لے لی وہ دیکھ رہا تھا کہ آنیوالا اجنبی کوئی معمولی بدمعاش نہیں، بلکہ کوئی قاتل یا کوئی بڑا مجرم معلوم ہوتا ہے،

دونوں دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، ابی کا دل

بیٹھا جارہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی نامعلوم طاقت اُس سے اطمینان چین سب کچھ چھین رہی ہے۔

آخرکار بدمعاش نے کہا "کیا تم نے مجھے پہچانا؟"

متعجب ہوکر پادری نے جواب دیا "نہیں بالکل نہیں۔ میں تمہیں نہیں جانتا!"

"اوہ تم مجھے نہیں جانتے۔ پھر میری طرف دیکھو۔"

"اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔ آج سے پہلے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"خوب" اس نے طنز سے کہا "لیکن میں اب ایسی ہستی کا تعارف کروانے لگا ہوں جسے تم اچھی طرح جانتے ہو"

اس نے کوٹ کے بٹن کھولے اور ایک لفافہ نکالا، بوسیدہ ہونے کی وجہ سے اُس کا رنگ اڑچکا تھا، اور جا بجا دھبے پڑے تھے اس لفافہ میں سے اُس نے ایک میلی اور زرد تصویر نکالی اور اسے اپنی کی آنکھوں کے مقابل لاکر پوچھا۔

"تم اس کو تو ضرور پہچانتے ہوگے"

"ہاں" پادری نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"یہ کس کی تصویر ہے؟"

"میری"

"کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو؟"

"ہاں"

"اچھا تو اب اپنی تصویر اور میری صورت کو غور سے دیکھو"

بوڑھے پادری نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا، دونوں کی شکلوں میں ایک حد تک بڑی مشابہت تھی، لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ سمجھا اور چلایا۔

"آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟"

"میں کیا چاہتا ہوں" بدمعاش نے کریہہ آواز میں کہا "میں چاہتا ہوں کہ پہلے تم مجھے پہچانو۔"

"تم کون ہو؟"

"میں کون ہوں! سمجھا تم مجھے پہچاننا نہیں چاہتے تم اپنے منہ سے یہ کہنا نہیں چاہتے کہ میں تمہارا باپ ہوں۔"

بوڑھے آدمی نے شانوں کو سکیڑتے ہوئے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا "یہ درست نہیں"

نوجوان اُس کے اور قریب آگیا۔

"یہ درست نہیں" اس نے دہرایا "تم کو جھوٹ نہیں کہنا چاہئے سنا تم نے"

"میرا کبھی کوئی لڑکا نہیں تھا" پادری نے کہا۔

دوسرے نے سر کو جنبش دیتے ہوئے طنز سے کہا "اور شاید تمہاری کوئی عورت بھی نہ تھی۔"

بوڑھے نے مغرورانہ لہجہ میں صرف ایک لفظ کہا "ہاں"

"اور کیا وہ عورت حاملہ نہ تھی جب تم نے اُسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا"

"ہاں میں نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا، اس لئے کہ وہ بدچلن تھی، اور اس لئے کہ اس کے پیٹ میں جو بچہ تھا وہ کسی اور کا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ وہ بچہ کسی اور کا تھا۔"

"خود اُس نے کہا، اُسے اسکا اقرار تھا۔"

"میں زیادہ بحث میں پڑنا نہیں چاہتا" بدمعاش نے بے پروائی سے کہا "میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میری ماں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔"

پادری نے حیران ہوکر پوچھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ تم میرے لڑکے ہو؟"

"میری ماں نے کہا اپنے بستر مرگ پر جبکہ وہ مر رہی تھی، اور اسی نے یہ" تصویر کو پادری کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

اپی نے تصویر لے لی اُسکا دل غم سے لرز رہا تھا اور اسے

اب کوئی شبہ نہ تھا کہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر باتیں کرنے والا بدمعاش اسی کا لڑکا ہے، اُسے یکے بعد دیگرے تمام گذشتہ واقعات یاد آنے لگے، اور اُس کو اپنے گناہ کا احساس ہونے لگا۔

"آؤ میں تم سے اس معاملہ میں مزید گفتگو کرنا چاہتا ہوں" باپ نے کہا۔

"ہاں میں بھی اسی لئے یہاں آیا ہوں" بیٹے نے جواب دیا۔

کمرے میں داخل ہو کر کھانے کی میز پر دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔ بوڑھا اپی بہت دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

"تو تمہاری ماں مرگئی؟"

"ہاں مانسیر لی کیوری" نوجوان نے کہا "وہ مرگئی"

"بہت دن ہوگئے؟"

"ہاں تین سال"

پادری کے دل میں ایک نیا شبہ پیدا ہوا۔

"تو پھر تم میرے پاس اسی وقت کیوں نہ آئے؟"

"میں نہ آسکا" دوسرے نے تامل کے ساتھ جواب دیا "اور کیوں یہ ایک طویل داستان ہے، میں پھر بیان کروں گا۔ ابھی نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ اور اس وقت مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے"

"اچھا تو ہمیں کھانے سے فارغ ہو جانا چاہیئے" بوڑھے نے کہا۔

"مارگریٹ! مارگریٹ!" وہ چلایا "کھانا تیار ہو تو جلد لاؤ"

خادمہ خاموش کھڑی تھی وہ حیران تھی کہ اس کا مالک کیوں ایک بدمعاش کے ساتھ کھانا کھانے جا رہا ہے۔

(۳)

جب رکابیاں بھردی گئیں تو بھوکا اوباش وحشیوں اور نادیدوں کی طرح جلد جلد کھانے لگا، اپی کی تو بھوک مرچکی تھی، وہ تھوڑا تھوڑا ٹونگ رہا تھا۔ کھاتے کھاتے اس نے دفعتاً پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

بدمعاش ہنس پڑا شاید کھانا اسے بہت لذیذ معلوم ہو رہا تھا، اس نے جواب دیا۔

"میرے دو کرسچین نام ہیں، لیکن اُن میں سے مجھے کوئی بھی پسند نہیں ایک تو فلپ آگستی ......"

"انہوں نے تمہارا یہ نام کیوں رکھا؟" اپی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

بدمعاش نے اپنے شانوں کو جنبش دی اور کہا۔

"تم کو یہ سمجھ جانا چاہیئے کہ میری ماں نے تم کو چھوڑنے کے بعد اپنے دوست کو یقین دلا دیا کہ ہونے والا لڑکا اسی کا ہے اور وہ یقین کرتا رہا یہاں تک کہ میری عمر پندرہ سال کی ہوگئی میری وضع قطع شکل وشباہت سے یہ صاف ظاہر ہونے لگا کہ میں اس کا بیٹا نہیں ہوں، اس وقت سے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا، اور پھر وہ لوگ مجھے بجائے فلپ آگستی کے وسکونٹ فلپ پکارنے لگے۔"

"یہ سب باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

"اس لئے کہ میں اپنی آنکھوں سے گھر کے تمام مناظر دیکھتا اور اپنے کانوں سے تمام باتیں سنتا رہا۔"

پادری پر رنج وغم کی ایسی حالت طاری ہوگئی کہ جس میں مبتلا ہو کر انسان کو سوائے موت کے اور کوئی خواہش نہیں ہوتی، وہ مرجانا چاہتا ہے کسی طرح۔ خودکشی کرکے یا کسی اور طرح ... لیکن پادری ابھی اور بہت سی باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا

فلپ آگستی سب کچھ کھا چکا تھا، اور اب میز پر کوئی چیز نہ تھی، اس لئے اس نے پوچھا۔

"کیا اور کچھ کھانے کے لئے نہیں ہے؟"

پادری نے دھاتی قرص پر جو اُس کی کرسی کے قریب اسی غرض سے آویزاں تھا ہلکی سی ایک ضرب لگائی، خادمہ اندر آئی بھونی ہوئی مچھلیوں کی پلیٹ اُس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ غصہ سے اپنے مالک کے سامنے بیٹھے ہوئے بھکاری کو گھور رہی تھی، وہ سمجھ رہی تھی کہ پادری اس کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔

ایَی نے پیچھے سے اس کی پلیٹ میں بھونی ہوئی مچھلی کا ایک بڑا ٹکڑا ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں نے آج ہی ان مچھلیوں کا شکار کیا ہے۔"

مارگریٹی کمرے کے ایک گوشہ میں کھڑی تھی۔

پادری اُس کی طرف پلٹا

"کچھ شراب لاؤ۔ اچھی شراب ہاں کارسیکا کی"

اُس نے ایسی نظروں سے ایَی کو دیکھا۔ گویا وہ اس کے حکم کی تعمیل نہیں کرنا چاہتی، لیکن ایَی نے پھر کہا "لاؤ دو شیشے" اس لئے کہ جب کبھی وہ اپنے کسی دوست کو شام کے کھانے پر مدعو کرتا تو شراب کے دو شیشے ضرور منگواتا۔

فلپ آگستی بہت خوش تھا وہ اپنے دل میں بڑبڑایا۔

"بہت دنوں سے میں نے ایسا عمدہ کھانا نہیں کھایا"۔

خادمہ جلدی شراب کی بوتلیں لئے ہوئے داخل ہوئی۔

بوتلوں کو کھولکر ایَی ساغروں کو شراب سے بھرنے لگا۔

خادمہ کھڑی رہی وہ نوجوان کی وحشیانہ حرکتوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"یہاں سے چلی جاؤ" بوڑھے نے کہا۔

نہ سننے کا بہانہ کرتے ہوتے ہوئے وہ بدستور کھڑی رہی۔

ایَی نے ایکی مرتبہ تیز آواز میں کہا "میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ ہم کو یہاں تنہا چھوڑ دو"

وہ کمرے سے چلی گئی۔

فلپ آگستی جلدی جلدی کھا رہا تھا، اُس کا باپ اُسے گھور رہا تھا، آخر کار اس نے پوچھا۔

"وہ کس طرح مری؟"

"دق سے"

"کیا وہ بہت دنوں سے بیمار تھی؟"

"ہاں قریب قریب اٹھارہ ماہ سے"

"یہ مرض کیسے شروع ہوا؟"

"کوئی نہیں جانتا"

وہ خاموش ہو گئے، ایَی پھر سوچنے لگا اُسے فلپ کی ماں کے متعلق ابھی اور بہت سی باتیں دریافت کرنی تھیں۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا "کیا وہ تنہا تھی؟"

"نہیں وہ ہمیشہ اسی کے ساتھ رہی"

بوڑھا پادری سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

"کیا وہ آپس میں خوش تھے؟" اُس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"یقیناً اُن دونوں کے تعلقات بہت خوشگوار تھے" نوجوان نے بے پروائی سے کہا "لیکن اکثر میں ان کے درمیان لڑائی اور جھگڑوں کا باعث بن جاتا"

"کیوں" پادری نے پوچھا۔

"میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں، جب تک میری عمر ۱۵ سال کی نہیں ہوئی وہ مجھے اپنا لڑکا تصور کرتا رہا، لیکن اُسکے بعد وہ بے وقوف نہ تھا جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ گیا۔ ایک دن میں نے دوسرے کمرے سے سنا وہ میری ماں پر برہم ہو رہا تھا۔

"ماں نے کہا، یہ میری غلطی نہیں تم اچھی طرح جانتے تھے جس وقت میں تمہارے پاس آئی اُس وقت میں کسی اور کی تھی"۔

"یعنی وہ کبھی کبھی میرے متعلق گفتگو بھی کرتے تھے" پادری

بول اٹھا۔

"ہاں لیکن میرے سامنے نہیں، یہاں تک کہ میری ماں سمجھنے لگی کہ اب وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے گی، وہ مجھ پر اعتماد نہ رکھتے تھے۔"

"اور تم . . . کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ تمہاری ماں ایک اچھی عورت نہیں ہے؟"

"میں اچھی طرح سمجھتا تھا، میں اتنا بے وقوف نہ تھا۔"

فلپ اگسٹی متاثر ہوتا جا رہا تھا، نشہ تیزی سے اسکی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا، پادری نے پینے سے اُسے روک دیا ہوتا۔ لیکن وہ ابھی اور اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ پینے سے انسان میں بات کرنے کی زیادہ صلاحیت آجاتی ہے اس لئے اس نے دوسرا شیشہ بھی اس کے سامنے رکھدیا۔

مارگریٹ چاول کی پلیٹ لیکر اندر آئی اور جب وہ اُن کے پاس سے گذری تو اس نے کہا۔

"دیکھو اس نے کتنی چڑھالی ہے ماں سیر لی کیوری"

"ہم کو تنہا چھوڑ دو اور چلی جاؤ" پادری نے جواب میں کہا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے وہ باہر چلی گئی۔

اس نے پھر پوچھا "تمہاری ماں میرے متعلق کیا کہا کرتی تھی؟"

"کیوں۔ وہی باتیں جو ایک عورت اپنے چھوڑے ہوئے شخص کے بارے میں کہتی ہے، وہ تمہارے ساتھ قیدیوں کی طرح زندگی بسر کرتے کرتے تھک گئی تھی، اور تمہارے اعلےٰ خیالات کے مفید نصائح تو اور بھی اُسے پریشان کیا کرتے تھے۔"

"کیا وہ یہ ہمیشہ کہا کرتی تھی؟"

"ہاں اکثر لیکن صاف صاف نہیں" تاہم میں اس مطلب سمجھ جاتا تھا اچھی طرح۔"

"اور وہ گھر میں تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے تھے؟"

"پہلے پہلے تو بہت اچھا لیکن بعد میں بُرا۔"

وہائی قرص کو بجا کر پادری نے خادمہ کو بلایا اور تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"لمپ روشن کرو اور جو کچھ کھانے کے لئے باقی ہو لیتی آؤ اور سنو اس کے بعد جب تک میں پھر نہ بلاؤں اندر نہ آنا۔"

وہ چلی گئی، اور پھر ایک لمپ اور بہت سے میوے لا کر میز پر رکھدیئے، اور پادری کے خوف سے جلد کمرے سے نکل گئی۔

"ہاں" باپ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا "کہے جاؤ میں سن رہا ہوں۔"

"اب میں اپنی زندگی کا سب سے اہم واقعہ کہنے لگا ہوں۔" دوسرے نے شراب کا ایک بڑا گھونٹ پیتے ہوئے کہا "یہ میری بیرحمی کی ایک داستان ہے، ان لوگوں کی جھڑکیاں اور نفرت کے باوجود میں گھر میں رہتا تھا، وہ دونوں مجھ سے خوفزدہ تھے اور اپنی آنکھوں سے دور رکھنا چاہتے تھے لیکن میری راہ میں جو حائل ہوتا ہے اس کو میں بآسانی دور کر دینا جانتا ہوں میں ایسے موقع پر سب کچھ کر بیٹھتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ اکثر وہ دونوں ملکر ہی رہتے تھے، ماں خوش باش، چالاک اور ایک مضبوط دل کی عورت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مرد کو کیسے قابو میں رکھا جاتا ہے۔ وہ اس کے دماغ اور روح پر چھائی ہوئی تھی۔ اور آخر دم تک رہی۔ مرد کتنے بے وقوف ہوتے ہیں آخر ماں بیمار پڑ گئی، اور میولاآن کے ایک خوبصورت گھر میں ہم منتقل ہو گئے وہ روز پیرس جاتا۔ بیماری نے طول کھینچا اور ایک روز میری ماں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا "میں مر رہی ہوں اور چاہتی ہوں کہ مرنے سے پہلے چند باتیں جنہیں میں نے اب تک تم سے چھپائے رکھا ہے تم سے کہہ دوں، تمہارا باپ اب تک زندہ ہے میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا کہ وہ مر گیا

وہ زندہ ہے ہاں اب تک میں تمہیں اس کا نام بتاتی ہوں۔"

وہ بھی پلنگ کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا یہ سنکر وہ بول اٹھا "تم غلطی کر رہی ہو روز بیٹی، تم غلطی کر رہی ہو" ماں باوجود ضعف کے پلنگ پر اٹھ بیٹھی مجھے اب تک وہ منظر یاد ہے۔ وہ اس کے سرخ گال، چمکتی ہوئی آنکھیں چڑھے ہوئے تیور ——— میری تمام بدایتوں کے باوجود وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، وہ غصہ میں اس سے بولی "اس کے لئے تمہیں کچھ دینا ہوگا"

"وہ دیوانوں کی طرح چلا اٹھا اور میری طرف اشارہ کرکے بولا" اس بدمعاش کمینے کے لئے، اسکو میں ایک پائی نہیں دے سکتا۔"

"میری ماں نے کہا۔ پھر تم چاہتے ہو کہ یہ فاقوں سے مر جائے۔"

"اس نے برافروختہ ہوکر کہا۔ روز بیٹی تیس سال سے میں تمہیں پینتیس فرانک ہر سال دیتا رہا۔ میری شکر گذار ہو۔ تم اب تک ایک مالدار عورت کی طرح محبت اور عیش کی زندگی بسر کرتی رہی ہو۔ میں اس ذلیل شخص کو جس نے ان آخری ایام میں ہمیں تنگ کیا اپنی جائداد سے کچھ بھی نہیں دیسکتا۔

"ہاں تم اسے اس شخص کا نام بتا سکتی ہو۔!"

"ماں میری طرف مڑی میں نے دل میں خیال کیا کہ میں اپنے گمشدہ باپ کو پا رہا ہوں اور اگر اس نے کچھ رقم جمع کی ہے، تو وہ اب میرے تصرف میں آئے گی۔ ماں نے کہا: تمہارے باپ کا اصلی نام تو ——— بیرون دی ولیس ہے لیکن لوگ اسے ابی کہتے ہیں اس وقت وہ ٹولوں کے گرجا کا پادری ہے، یہاں آنے سے پہلے مجھ سے اور اس سے شناسائی تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے اور بہت سی باتیں کہیں، اب مجھے وہ یاد بھی نہیں۔"

بدمعاش ہنسا پھر شراب کے دو تین گھونٹ پی کر کہنے لگا۔

"ماں مر گئی اس کے دوسرے روز جب ہم اس کی قبر سے لوٹے تو اس وقت میری جیب میں صرف دو فرانک تھے، گھر پہنچکر آگسٹن نے کہا میری ماں اور میں اسے آگسٹی کہا کرتے تھے میں تم سے کچھ ضروری گفتگو کرنا چاہتا ہوں، ہم دونوں کمرے میں ایک میز کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے وہ رو رہا تھا، ہاں آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ برا برتاؤ نہیں کرے گا جیسا کہ اس نے ایک دن میری ماں سے غصے کی حالت میں کہا تھا۔ اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں تمہارے پاس نہ جاؤں اور تمہیں تکلیف نہ پہنچاؤں۔ یہ کہکر اس نے مجھے ایک ہزار فرانک کے نوٹ دیئے لیکن مجھ جیسے آوارہ گرد اور اوباش شخص کے لئے اتنی رقم کیا کافی ہو سکتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے خانے میں اور نوٹ کی بہت سی گڈیاں رکھی ہیں۔ میری نیت بدل گئی اور بجائے اس کے کہ میں ہاتھ بڑھا کر اس سے ایک ہزار فرانک کے نوٹ لے لیتا میں اس کے اوپر کودا اور اسے نیچے گرا کر اسکا گلا گھونٹنا شروع کیا یہانتک کہ اس کی آنکھیں نکل آئیں جب میں نے دیکھا کہ تقریباً وہ بیدم ہوگیا ہے تو پہلے اسکے کپڑے اتارے اور ایک کرسی کے ساتھ کس کر باندھ دیا۔ ہا ہا ہا، میں نے خوب بدلہ لیا۔"

وہ دیر تک ہنستا رہا۔

"تب" اس نے کہا "ایک لوہے کی سلاخ کو گرم کیا اور جب وہ سرخ ہوگئی تو اس سے اس کے جسم پر متعدد داغ دیئے وہ تڑپتا رہا، لیکن مجھے رحم نہ آیا پھر میں نے میز کے خانے سے نوٹ کی گڈیاں لے لیں، غالباً وہ تعداد میں بارہ یا تیرہ تھیں لیکن یہ رقم مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی، میرا خیال تھا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد اپنی بدنامی کا خیال کرتے ہوئے خاموش ہوجائیگا اور مجھکو تلاش کرنے کی فکر نہ کریگا، لیکن میرا خیال غلط نکلا، ایک دن جب میں پیرس کے ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا تو پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا

میں تین سال تک جیل میں۔ یا اسی لئے تمہارے پاس جلد نہ آسکا۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ نشہ کی زیادتی کی وجہ سے اب وہ مشکل سے بات کرسکتا تھا۔

"میں خیال کرتا ہوں" اس نے پھر کہنا شروع کیا، "کہ باپ اپنے بیٹے پر بہت مہربان رہیگا کیونکہ اس کا بیٹا کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔"

ابّی سنتا رہا اور سنتا گیا، اور اب وہ اس سے زیادہ کچھ سننا بھی نہیں چاہتا تھا غصہ اور نفرت سے اس کے جسم کا بال بال کانپ رہا تھا اس نے کہا۔

"اب جبکہ تم نے مجھ سے اپنی ساری داستان بیان کردی ہے سنو میں کیا کہتا ہوں غور سے سنو اس پر تم کو عمل کرنا ہوگا۔ تمکو کل صبح یہاں سے چلے جانا ہوگا تم ایک قصبہ میں رہو گے، اس کا نام میں تمہیں بتاؤں گا اور جس کو تم بغیر میری اجازت کے نہیں چھوڑ سکتے، میں تم کو یہاں سے روپیہ بھیجتا رہوں گا، اتنا جتنا کہ تمہاری زندگی کے لئے کافی ہو لیکن یہ رقم بہت زیادہ نہ ہوگی۔ اس لئے کہ میرے پاس کوئی اندوختہ نہیں اگر تم نے میری نافرمانی کی تو یہ رقم بھی بند کردی جائے گی، اور تم کو بھوکا مرنا ہوگا۔"

نشہ میں چور ہونے کے باوجود فلپ آگسٹی باپ کے خفگی آمیز فقروں کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا۔ کچھ دیر تو وہ خاموش رہا پھر بگڑے ہوئے شیر کی طرح غرّایا۔

"اوہ سمجھا تم مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہو، تم میرے باپ ہو اور میں نے تمہیں ڈھونڈھ نکالا ہے، تم مجھ سے زیادہ باتیں نہیں بنا سکتے۔"

پادری کے جسم میں حرکت ہوئی وہ چاہتا تھا کہ اس بدمعاش کو اپنے مضبوط بازوؤں میں لیکر بید کی لکڑی کی طرح موڑ دے۔

"دیکھو۔ دیکھو میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

شرابی چلّایا، اس نے میز پر سے چاقو اٹھا لیا وہ اپنے بچاؤ کے لئے پادری کا خون بھی کرسکتا تھا۔

ابّی نے یہ دیکھا تو میز کو ایک دھکا دیا وہ الٹ گئی شرابی لڑھکتا ہوا کرسی سے نیچے آگرا۔ لمپ زمین پر گرکر گل ہوگیا، کچھ سیکنڈ تک تو چینی کے برتنوں کے ٹوٹنے اور میز کے گرنے کی آواز سے کمرہ گونجتا رہا پھر خاموشی اور تاریکی . . . .

لمپ کے ٹوٹ کر خاموش ہوجانیکی وجہ سے کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔

شرابی نے کرسی سے نیچے گرنے کے بعد پھر حرکت نہ کی پادری کرسی پر بیٹھا رہا تاریکی میں اس کا غصہ کم ہوگیا تھا کمرے میں مکمل خاموشی تھی ایسی خاموشی جیسی قبر کی تاریکی میں ہوتی ہے، ذرہ ذرہ کانپ رہا تھا اور کوئی چیز سانس لیتی ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی باہر سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی، دور کہیں کسی گاڑی کے چلنے کی آواز اور کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی، یا کبھی کبھی تیز ہوا کے جھونکوں سے زیتون کے پتوں کے کھڑکنے کی آواز خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔

خاموشی دیر تک رہی بہت دیر تک شاید ایک گھنٹہ تک پھر یکایک پیتل کا قرص خاموشی میں بجا۔ اس کے ساتھ کرسی کے الٹنے اور کسی کے گرنے کی آواز فضا میں پھیل گئی۔

مارگریٹ آواز پر دوڑی لیکن جونہی دروازہ کھولا کمرے کی بھیانک تاریکی دیکھ کر گھبرا گئی وہ سر سے پاؤں تک لرز اٹھی اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اور سانس رکنے لگی پھر بھی وہ چلائی۔

"مانسیرلی کیوری! مانسیرلی کیوری!"

"میرے خدا! میرے خدا!" اس نے خود سے کہا "انہوں نے یہ کیا کیا۔ کیا واقعہ پیش آیا۔"

کمرے کے اندر داخل ہونے کی اس میں ہمت نہ تھی اور نہ ہی اتنی طاقت کہ جاکر روشنی لے آئے، دیوانوں کی سی کیفیت اس

پر طاری تھی، وہ چاہتی تھی کہ چیختی چلاتی باہر نکل جائے، لیکن ایک بار پھر اس نے پکارا۔

"مانسیرلی کیوری! میں ہوں مانسیلی کیوری!"

کوئی جواب نہ ملا۔ دفعتًہ اس میں ایک فطرتی جذبہ اپنے مالک کی مدد کرنیکا پیدا ہوا ایسا جذبہ جو بعض موقعوں پر کمزور دل کی عورت کو بھی نڈر اور بے خوف کر دیتا ہے، وہ دوڑی اور فوراً باورچیخانے سے قندیل لیکر واپس ہوئی۔

وہ دروازے پر ہی ٹھٹک گئی سب سے پہلے اس نے دیکھا۔ کہ بدمعاش دیوار کے قریب زمین پر بے حس پڑا تھا جیسے گہری نیند میں غرق ہے، لمپ ٹوٹا پڑا تھا، میز کے نیچے دبے دو پاؤں نظر آرہے تھے، غالباً یہ پادری کے تھے، سر اسکا پیتل فرش کی طرف تھا، شاید جب وہ گرا تو اس کے سر نے پیتلی فرش سے ٹکرا کر آواز پیدا کی تھی

"اے خدا! اے خدا! یہ کیا ہوا" وہ بڑبڑائی۔

آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے وہ آگے بڑھی پاؤں کے نیچے کسی رقیق چکنی چیز کے آنے سے وہ پھسل گئی اور گرتے گرتے بچی، وہ جھکی اُس نے دیکھا کہ کمرے کا فرش سرخ ہو رہا ہے وہ پہچان گئی یہ خون ہے۔

خوف سے دیوانی ہو کر وہ دروازے سے باہر کی طرف چلاتی ہوئی دوڑی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔

"خون، خون، خون۔"

لوگ گھر سے باہر نکل آئے اور کثیر تعداد میں اُس کے گرد جمع ہو گئے، پھر سب ان کے مکان کی طرف دوڑے زیتون کے باغ کے درمیان کا چھوٹا سا خوشنما مکان تاریکی کی وجہ سے نظر نہ آتا تھا، جس وقت وہ قندیلیں لئے تیزی سے گذر رہے تھے زیتون کے درختوں کے تنے کالے دیوؤں کی طرح نظر آرہے تھے۔

دروازے کے سامنے وہ رک گئے پہلے ایک شخص قندیل ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا، اس کے پیچھے پیچھے سب چلے۔

خادمہ نے جھوٹ نہیں کہا تھا، زمین کے فرش پر پھیلا ہوا خون اس وقت تک جم گیا تھا، باپ اور بیٹے دونوں گہری نیند سو رہے تھے، ایک کا تو گلا کٹا ہوا تھا، وہ ابدی نیند لے رہا تھا، دوسرا نشے میں سو رہا تھا، اس کو پکڑ کر لوگوں نے جھنجوڑا تو وہ بیدار ہوا، آنکھیں شراب کی وجہ سے سُرخ تھیں، اور جب اُس کو اس کے باپ کی خون میں لتھڑی بتائی گئی تو وہ خوفزدہ سا ہو گیا، لیکن اس کا کوئی مطلب نہ سمجھ سکا۔

"یہ بولتا کیوں نہیں؟" ایک نے کہا۔

"بہت پی گیا ہے" پولیس آفیسر نے جواب دیا۔

جب لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو وہ آپس میں یہی کہہ رہے تھے کہ بے چارے پادری نے خودکشی کر لی ٭

جناب محمود عثمانی صاحب

اظہارِ حقیقت

مقدر کے اندھیرے میں میں گم گشتہ ستارہ ہوں — میں اپنی آتشِ آلام کا رقصاں شرارہ ہوں
مری سب اختیاری قوتیں مجروح و بسمل ہیں — میں وہ مجبور ہوں طغیانیاں ہی جسکا ساحل ہیں
زمانے کی نمک پاشی مرے زخموں پہ ہوتی ہے — مری امیدِ راحت یاس کے کانٹوں پہ سوتی ہے
کبھی دیکھی نہیں میں نے مسرت کس کو کہتے ہیں — میں کیا جانوں مروت اور عنایت کس کو کہتے ہیں
بہا کر لے گیا سیلِ حوادث میری امیدیں — محرم بنکے میرے واسطے آئیں مری عیدیں
کسی کو کیا خبر جیتا رہا میں کس طرح اب تک — کسی کو کیا خبر مرتا رہیگا کوئی یوں کب تک
نہیں دنیا میں میرے واسطے وسعت نہیں کوئی — مری برباد قسمت میں یہاں راحت نہیں کوئی
مجھے آزار پہنچایا ہمیشہ اہلِ دنیا نے — مری معذوریوں پر بھی ستایا اہلِ دنیا نے
ملی کب رخصتِ رنج والم دنیا کے ہاتھوں سے — نتیجہ کوئی کب نکلا مری ناکام آہوں سے
یہ دنیا — نفس کے بندوں کی دنیا کیوں ستاتی ہے — نہ جانے کیوں مری مظلوم ہستی کو مٹاتی ہے
یہ دنیا — آہ یہ ظلم و ستم کی ایک بستی ہے — یہاں کے رہنے والوں میں غرور و خود پرستی ہے
یہاں کے رہنے والے رات دن بیداد کرتے ہیں — غریبوں کا وقارِ زندگی برباد کرتے ہیں
یہاں پامال ہوتی ہیں غریبوں کی تمنائیں — یہاں مسدود رہتی ہیں غریبوں کے لئے راہیں

(۲)

مری مجروح آہوں میں اگر کچھ جان آجائے — اگر میرے ارادوں میں قضا کی شان آجائے
تو دنیا کے مکینوں کا یہ پندارِ خداوندی — یہ شوقِ ظلم یہ سفاک احساسِ فتحمندی
میں ان سب کو فنا کی ٹھوکروں سے روند ڈالونگا — میں اپنے دل سے ان تیروں کو خوں کر کے نکالونگا

اگر زندہ رہا تو انتقامِ آخری لوں گا
زمانہ ہوگا میرا غیظ ہوگا اور میں ہونگا

جناب سید احسان علی شاہ صاحب بی اے

بسلسلۂ غیر مکمل افسانہ مطبوعہ جولائی نمبر

عورت کی فطرت

. . . . سعیدہ بغلی کمرے میں جاکر دھم سے کوچ پر گر پڑی۔ یوسف اس کے نازک ترین احساسات کا واحد مرکز . . . اسکے جذبات سے اس بے دردی سے کھیلتا رہا ہے اس نے اسے دھوکے میں رکھا کیا وہ اسی قابل تھی کہ اس کے ساتھ اتنا خوفناک دغا کیا جائے؟ کیا اس کی محبت کا یہی انعام ہونا چاہئے تھا کہ اسے رشیدہ کی مسکراہٹوں پر قربان کر دیا جائے۔ ان خیالات نے سعیدہ کے دماغ میں بے پناہ ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ عورت کا محبت بھرا دل اوہام کے متلاطم سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا "کیا واقعی یوسف نے اس کی محبت کی قدر نہیں کی؟" اس کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال پیدا ہوتا۔ وہ اپنے آپکو جھٹلانا چاہتی تھی وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اسے یقین آجائے کہ یوسف رشیدہ سے محبت نہیں کرتا، بلکہ اس کی تمام تر محبت۔ اس کا تمام تر شوق اسی کے لئے وقف ہے۔ لیکن خطوط کی داستان ؟ ؟

آخر خیالات کی ناؤ نسوانی جذبات کے سمندر میں ہچکولے کھا کر نکلی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی جب آنسوؤں نے جذبات کی شدت کو قدرے کم کیا تو پھر وہی فکر دامنگیر ہونے لگا۔ کیا واقعی —— وہ یوسف جو قسمیں کھا کھا کر اپنی محبت کا یقین دلایا کرتا تھا۔ دغاباز ہوگیا، دماغ یوسف کو دغاباز بتلاتا لیکن دل ماننے کو تیار نہ تھا۔ سعیدہ قلب و دماغ کی اسی کشمکش میں پڑی مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی کہ تنویر دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے خیالات میں کچھ ایسی گم ہوگئی تھی کہ اسے تنویر کے آنے کا مطلق احساس نہ ہوا۔ تنویر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اوہو! یہ پیش از مرگ واویلا کیا معنی؟ وہ وقت تو آنے دو! سعیدہ یہ آنسو اس دن کے لئے رہنے دو، جس دن کمرہ عدالت کی دہشت خیز خاموشی کو توڑنے والی آواز یوسف کے لئے یقینی موت کا پیغام بنکر تمہاری روح کو تڑپا دے گی۔ یہ آنسو اس دن تمہاری خوبصورت آنکھوں کے دامن میں کھیلتے ہوئے کیسے اچھے معلوم ہونگے۔ جس دن تمہارا یوسف قیدیوں کے کپڑے پہنے جیل کی آہنی سلاخوں سے سر لگائے یاس وحسرت کا اندوہگیں مجسمہ بنے حسرت زا نگاہوں سے آخری دفعہ تمہیں دیکھنے کے لئے مضطرب ہوگا۔ ہاں یہ آنسو اس وقت بہت مفید ثابت ہونگے جس وقت تمہاری دہشت زدہ نگاہیں یوسف کی ابل کر باہر کو نکلی ہوئی آنکھوں، کھچی ہوئی گردن اور بے حس و حرکت جسم کو دیکھیں گی . . . . . . جس وقت یہ آنسو میرے حسرتوں اور ارمانوں کے مزار پر خون آلود پھول بنکر برسیں گے اس وقت میں کتنا خوش ہونگا۔ یہ تم نہ سمجھ سکو گی۔"

سعیدہ ان خوفناک الفاظ کو سنکر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی، اسے تنویر کی آواز میں شیطان کے خوفناک قہقہے گونجتے ہوئے سنائی دے رہے تھے۔ اس نے تڑپ کر متوحش نگاہوں سے تنویر کی طرف دیکھا، جو اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں میں استہزا کے جانسوز شعلے لئے کھڑا تھا۔

"کیا سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھ رہی ہو سعیدہ!" تنویر کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی "یوسف ابھی سچ مچ پھانسی پر نہیں چڑھ رہا، لیکن یاد رکھو یہ عبرتناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔ میری بات مانو! تمہارے نازک ہونٹوں سے نکلا ہوا اقرار کا ایک لفظ یوسف کے لئے مژدۂ حیات بن سکتا ہے!"

تنویر کا ایک ایک لفظ دہکتے ہوئے خنجر کی طرح سعیدہ کی روح میں اترا جا رہا تھا اس کے دل میں تنویر کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات بھرے تھے اور وہ ان جذبات کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن لفظ اس کی زبان پر آ کر رک جاتے تھے۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد تنویر سعیدہ کے قریب کوچ پر بیٹھ گیا۔ اور اسی شیطانی آواز میں بولا۔

"اور یوسف کو تم سے محبت نہیں۔ وہ رشیدہ سے محبت کرتا ہے۔ میں نے تم دونوں کی باتیں سن لی ہیں۔ وہ تمہیں محبت کے دام میں پھنسا کر تمہارے چچا کی دولت حاصل کرنا چاہتا ہے رشیدہ کبھی بھی تم دونوں کو ایک جگہ نہ بیٹھنے دے گی۔"

رشیدہ کا نام سنکر حسد و عناد کی وہ چنگاری جو چند منٹوں کے لئے پریشانی اور حیرت کے جذبات میں دب گئی تھی۔ یکدم بھڑک اٹھی۔

"یوسف سے انتقام لینے کا اچھا طریقہ ہے" یہ الفاظ اس کے دماغ میں گونج اٹھے لیکن اس کے ساتھ ہی یوسف کا خوبصورت مسکراتا ہوا چہرہ سعیدہ کے تصور کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ وہ بیتاب ہو گئی۔ بیقرار ہو گئی۔

"اگر یوسف نے بے وفائی کی ہے" اس نے اپنے دل میں کہا "تو کیا میں بھی بے وفا بن جاؤں، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ سچی محبت تو موت پر بھی فتح پا لیتی ہے، کیا میری محبت یوسف کو بھی میز نہ بنا سکے گی؟"

"سعیدہ!" تنویر نے اُسے خاموش پا کر کہا "کن خیالوں میں پڑی ہو، میرے پاس یوسف کو مجرم قرار دینے کیلئے ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں، مجھے اس سے کوئی دشمنی نہیں اگر میں اپنے ثبوتوں کو استعمال کر کے اسے مارنا لینے پر مجبور ہو گیا تو سن رکھو سعیدہ! اس کا خون تمہارے سر ہوگا۔"

سعیدہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، الفاظ طوفان بنکر اس کی زبان پر امڈ آئے۔ لیکن وہ دو چار ٹوٹے پھوٹے جملوں کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"موت و حیات تمہارے اختیار میں نہیں، تم یہ دھمکیاں نہ دو۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتی" اس نے کہا اور ایک دم خاموش ہو گئی۔

"سعیدہ" تنویر نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا "میرا خدا جانتا ہے، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ سعیدہ! میں تمہاری ان پیاری پیاری آنکھوں کی، جن سے تم اس وقت بجلیاں گرا رہی ہو، قسم کھا کر کہتا ہوں، میں اس وقت تمہارا دل دکھانے نہیں آیا، بھلا سوچو تو مجھے اس سے کیا کہ یوسف نے کسی کو قتل کیا ہے یا نہیں، لیکن سعیدہ مجھے تمہاری محبت مجبور کر رہی ہے، تمہیں حاصل کرنے کے لئے اگر یوسف تک کی قربانی کرنی پڑے جب بھی میرا قدم پیچھے نہیں ہٹے گا، تم ایک دفعہ مسکرا کر ہاں کہہ دو میرا دوست موت کے گہرے جبڑے سے بچ جائے گا اور اس کے جرم کا راز قبر تک میرے ساتھ جائیگا!"

ان الفاظ نے سعیدہ کے خیال پر نئی راہیں کھول دیں۔ اگر وہ کسی طرح تنویر سے خطوط حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو یوسف اس کے لئے زندہ رہ سکتا ہے۔

"تنویر" اس نے ہولے سے کہا "کبھی تمہیں بھی تو محبت تھی۔۔۔ مجھ سے"

"کبھی ؟ سعیدہ !" تنویر نے ایک آہ بھر کر کہا "میں تمہیں بھولا کب ، میں اب بھی تمہاری پرستش کرتا ہوں"۔

"سچ کہتے ہو تنویر ؟"

"تمہارے سر ہی کی قسم !"

"تو اسی محبت کا واسطہ دیکر میں تم سے یوسف کی زندگی کی بھیک مانگتی ہوں"۔

"یہ نہ مانگو سعیدہ ! میں نے اس پر بہت سوچا ہے۔ میں نے بہت دفعہ تمہیں بھول جانے کی کوشش کی مگر ایسا نہیں ہو سکا"

سعیدہ سوچ میں پڑ گئی۔ تنویر کی للچائی ہوئی نظریں سعیدہ کے رخ و کاکل پر نچھاور ہو رہی تھیں۔

"وہ خط دکھا سکتے ہو مجھے" سعیدہ نے نحیف آواز میں کہا

"میری بھولی سعیدہ !" تنویر نے زیر لب مسکرا کر کہا "تمہارا خیال ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں"

"نہیں۔ نہیں" سعیدہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ مطلب نہیں ہے میرا۔ میرا مطلب ہے . . . میرا مطلب ہے کہ اگر میں انہیں ایک نظر دیکھ لوں تو کیا حرج ہے !"

"نہیں۔ حرج کا ہے کا" تنویر نے زیر لب مسکرا کر کہا "میں سے آؤں گا انہیں پرسوں۔

(۲)

"آج ہماری شادی کا دن ہے سعیدہ ! آج تو تمہیں بے حد مسرور ہونا چاہئے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا خوبصورت چہرہ پریشان ہے" یوسف نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں !" سعیدہ نے ایک آہ بھر کر کہا "شادی کا دن ہے" اور اٹھ کر کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگی۔

"ابھی تک نہیں بھولیں" یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا "سعیدہ ! یہ اس لڑکی کی حماقت ہے۔ کہ باؤلوں کی طرح میرے پیچھے پیچھے ماری ماری پھرتی ہے۔ تمہیں بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"اچھا خیال ہے !" سعیدہ نے ایک ہلکی سی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میری سعیدہ !" یوسف نے سعیدہ کے قریب آتے ہوئے کہا "یہ سچ ہے کہ کسی زمانے میں مجھے اس سے محبت تھی۔ لیکن تمہاری پیاری صورت نے مجھے اپنا سب کچھ بھلا دینے پر مجبور کر دیا۔ تم میری کائنات پر محیط ہو گئیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم نے اور تمہارے چچا نے مجھے اس قابل سمجھا ہے کہ میں تمہیں اپنا بنا لوں۔ یقین مانو سعیدہ ! میرا تمام تر نیاز انہیں خوبصورت قدموں پر نچھاور ہونا چاہتا ہے۔ میں رشیدہ کو بالکل بھول چکا ہوں"۔

سعیدہ نے نیم وا آنکھوں سے یوسف کی طرف دیکھا۔ یوسف کی آنکھوں میں حقیقی محبت کے معصوم فرشتے رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"میرے چچا نے" سعیدہ نے مغموم لہجے میں کہا "مجھے ہمیشہ کے لئے تمہارے دامن سے وابستہ کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ انکار کا ایک لفظ بھی زبان پر لاؤں۔ ہندوستانی عورت جو ہوں لیکن ایک خلش دل میں رہ رہ کر پیدا ہو رہی ہے۔ کاش میں اپنے خاوند کی تمام تر محبت کی واحد مالک ہوتی۔ یہ عورت کی فطرت ہے، میں اس کے خلاف کیونکر کر سکتی ہوں" سعیدہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی "تم مرد ہو۔ تم کو من مانی کارروائی کرنے کا پورا اختیار ہے" سعیدہ نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم میری ملکہ ہو !" یوسف نے سعیدہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "یہ وہم دل سے نکال دو۔ میری محبت صرف تمہارے لئے ہے سعیدہ ! تمہیں میرے دل کی واحد حکمران ہو۔ یقین جانو سعیدہ !"

"تم رقابت کی خلش کو کیا جانو !" سعیدہ نے ہچکیاں لیتے

ہوئے کہا "تم کیا جانو کہ فیشن نکالنے سے نہیں نکلتی، اگر میں بھی . . . . . "

سعیدہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"یوسف کہو سعیدہ! میں یہ طعنے برداشت نہیں کرسکتا۔"

"تو پھر جاؤ یہاں سے۔"

"میری سعیدہ! میری زندگی"

"کل ملاقات ہوگی۔ اب جاؤ ـــــ جاؤ" سعیدہ نے روتے ہوئے کہا۔

"یاسنے بھلا دو سعیدہ!"

"ہاں بھلا دوں گی۔ میری طبیعت پریشان ہوگئی ہے۔"

"واہ!" یوسف نے مسکرا کر کہا۔ "جب ہم پاس ہوں تو سعیدہ کی طبیعت پریشان ہوسکتی ہے"؟

"یہ میرے بس کی بات تھوڑا ہی ہے"

"اچھا سعیدہ! اگر تم یہی چاہتی ہو تو میں جاتا ہوں!"

یوسف آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کے قریب جا کر بولا۔

"سچ مچ چلا جاؤں سعیدہ!"

سعیدہ کے ہونٹوں پر ایک نہایت ہلکی سی مسکراہٹ چھا گئی۔ اور اس نے سر جھکا لیا۔ یوسف مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ابھی یوسف نکلا ہی تھا کہ کسی کے بھاری پاؤں کی سمع خراش چاپ نے سعیدہ کو چونکا سا دیا۔ اس کے دل کی حرکت یکدم تیز ہوگئی اور کسی غیبی آواز نے اس کے کان میں کہہ دیا "تنویر!"

اس نے پلٹ کر اپنی پشت کی جانب دیکھا۔ دروازے کا ایک کواڑ آدھا کھلا تھا اور تنویر اپنی تمام شیطنت کو ایک زہر خند مسکراہٹ میں سمیٹے کھڑا تھا۔

"یوسف ابھی یہیں تھا" اس نے اندر داخل ہوکر کواڑ بند کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یوسف سے کیا" سعیدہ نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"آتے وقت میں نے اُسے یہاں سے نکلتے دیکھا تھا۔"

"دیکھ لیا اس نے تمہیں" سعیدہ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ وہ یوسف سے انتقام لینا چاہتی تھی۔

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے دیکھ لیا ہو!"

"اچھا ہُوا" سعیدہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"کیا؟ کیا اچھا ہُوا سعیدہ!"

"تمہیں معلوم ہے تنویر" سعیدہ نے مسکرا کر کہا "رقابت کا جذبہ کتنا شدید ہوتا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو سعیدہ!" تنویر نے خوفزدہ ہوکر کہا۔ "وہ خونی ہے، اس کے منہ کو خون لگا ہوا ہے اگر اس میں رقابت کا جذبہ پیدا ہوگیا تو۔"

"بس ڈر گئے" سعیدہ نے طنزاً کہا "جس کے دل میں محبت ہو وہ موت سے نہیں ڈرا کرتے!"

"نہیں نہیں! تم نے غلط اندازہ کیا" تنویر نے حقارت انگیز مسکراہٹ ظاہر کرتے ہوئے سعیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا "میرا مطلب یہ نہیں۔ یہ دیکھو میں تو اپنی حفاظت کے لئے بھرا ہُوا پستول ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں، لیکن خدشہ یہ ہے کہ وہ ملعون کہیں تمہیں کوئی گزند نہ پہنچا دے۔"

"ہمدردی کا شکریہ! کہئے وہ وعدہ بھی یاد ہے آپکو"

"کیسا وعدہ!"

"اوہو! ابھی سے بھول گئے" سعیدہ نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا وہ خطوط! سعیدہ!" تنویر نے سعیدہ کا ہاتھ اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا "تم کہو تو میں آسمان کے تارے بھی توڑ لاؤں۔!"

"تارے تو واقعی تم توڑ لاؤ گے" سعیدہ بولی "لیکن میں تو خطوں کا پوچھ رہی ہوں۔"

"سعیدہ! ایسے ناپاک خط ان خوبصورت ہاتھوں میں آنے کے قابل نہیں۔ لیکن . . . . . . شاید تمہیں اعتبار نہیں آتا میری باتوں پر"

"اگر اعتبار نہ ہوتا تو یوں پاس بیٹھ جاتی تمہارے" سعیدہ نے کہا۔

"شکریہ!" تنویر نے ہنسکر کہا۔ "تو پھر اس خلش کو بھی نکال ڈالو دل سے۔"

"خلش؟" سعیدہ نے حیران ہوکر پوچھا "کیسی خلش؟"

"بھول جاؤ ان خطوط کو! جب ہم تم دونوں ایک ہی ہو گئے تو اسکا جینا نہ جینا ایک ہی سا ہے"

"نہیں نہیں۔ یہ نہ کہو!" سعیدہ نے پریشان ہوکر کہا۔

"اچھا تو پھر تم جس دن مجھ سے شادی کر دگی، اسی دن تمام خطوط تمہاری آنکھوں کے سامنے جلاکر راکھ کر دونگا۔"

"تو گویا مجھ پر کوئی اعتبار نہیں!"

"ارے توبہ!" تنویر ہنس کر بولا "تم ہمیشہ ہی میری باتوں کے غلط معنی لیتی ہو، مجھے تم پر پورا بھروسا ہے تنویر اس میں حرج ہی کیا ہے!"

اس جواب نے سعیدہ کو پریشان کر دیا وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

تنویر کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ چھاگئی وہ اٹھا اور سعیدہ کی پیچیدہ زلفوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"میری سعیدہ ناراض تو نہیں ہوگئی۔"

سعیدہ نے پلٹ کر تنویر کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔

"دیکھ لی تمہاری محبت" اس نے تھراتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "بس اسی محبت کے دعوے تھے، اک کاغذ کے پرزے دکھا نہ سکے۔"

اچانک دروازہ کھلا اور یوسف کمرے میں داخل ہوا۔

اس کے چہرے پر وحشت مرتسم تھی اور آنکھوں سے حسد و رقابت کے شعلے نکل رہے تھے۔

"تیری موت یہاں کھینچ لائی ہے تجھے لعین!" یوسف نے دانت پیسکر کہا۔

"میری نہیں تیری موت" تنویر نے جیب سے پستول نکالتے ہوئے کہا اور اس کی نالی یوسف کے سینے کی طرف جھکادی، ساتھ ہی یوسف نے جیب سے پستول نکال لیا۔ سعیدہ بجلی کی سی تیزی سے تڑپ کر تنویر سے پستول چھیننے کے لیے جھپٹی لیکن اس کا ہاتھ تنویر تک نہیں پہنچا تھا۔ کہ پستول چلنے کی دو آوازیں ایک وقت پیدا ہوئیں۔ اور ایک دلدوز نسوانی چیخ میں ڈوب گئیں۔

سعیدہ دونوں وحشیوں کے درمیان خون میں لتھڑی دم توڑ رہی تھی۔ خون کی ایک دھار اس کے بلوریں سینے میں سے بہ رہی تھی اور دوسری اس کی پشت سے!

محترمہ امتہ اللطیف صاحبہ

بہ سلسلہ غیر مکمل افسانہ مطبوعہ جولائی نمبر

عورت کی فطرت

سعیدہ کے جانے کے بعد یوسف غمگین و متفکر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا، وہ دل میں سوچ رہا تھا "جب سعیدہ کے چچا کو تمام حالات معلوم ہونگے تو میرا کیا حشر ہوگا، سعیدہ بھی انتقام لینے کی کوشش کرے گی .... آہ! میں کتنا گنہگار ہوں۔ میں نے ایک عورت سے محبت کی بلکہ اس سے شادی کا وعدہ بھی کر لیا، پھر سعیدہ کو ملا، تو اسے بھی دام فریب میں گرفتار کر لیا ..... لیکن نہیں میرا بھی کچھ قصور نہیں واقعات ہی کچھ ایسے پیش آگئے ..... میں نے کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کیا .... دنیا میں صرف میں ہی ایسا آدمی نہیں ہوں کروڑہا آدمی مجھ سے زیادہ گناہ گار ہیں" ......

یوسف اسی طرح متفکر، افسردہ سوچتا ہوا کارخانے میں جا کر کام کرنے لگا۔ وہ اس دن کھویا کھویا سا معلوم ہوتا تھا۔

—— (۲) ——

سعیدہ یوسف کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں آئی، وہ اب جوش میں نہیں تھی، بلکہ معاملے کو اطمینان سے بیٹھ کر سوچنا چاہتی تھی، اس وقت اس کی حالت اس دریا کی طرح تھی، جو طغیانی آچکنے کے بعد معمول سے زیادہ آہستہ آہستہ بہتا ہے۔

وہ کوچ پر سرنگوں بیٹھ گئی اور سوچنے لگی "میں یوسف سے اس بات کا انتقام لوں گی، .... جب تنویر آئیگا میں اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاؤں گی، ..... قاتل کو سزا ضرور ملنی چاہیئے،

"پرسوں تنویر آئیگا، میں اسے تمام حالات بتا دوں گی"..
..... لیکن ..... نہیں ..... تنویر سے نہیں...
... تنویر ایک بدمعاش ہے، میں کیسی باتیں کر رہی ہوں، میں تمام مصیبتیں سہوں گی مگر یوسف کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گی ...... یوسف نے مجھ سے دھوکا کیا تو کیا ہوا ..... میں یوسف سے وفا کروں گی، میں اپنی تمام زندگی اس کی یاد میں .... بسر کر دوں گی "

رشیدہ نے میری زندگی تلخ کر دی، مجھ سے میری مسرت چھین لی، ... میں کیسی بھولی ہوں کہ میں نے یوسف اور "رشیدہ کے باہم سلوک اور برتاؤ سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کیا ... . میں محبت میں اندھی ہو رہی تھی، میں یوسف کو اپنا اور صرف اپنا سمجھتی تھی" یہ سوچتے سوچتے سعیدہ پر رقت طاری ہوگئی، اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی،

رو چکنے کے بعد اس کی طبیعت کو کچھ سکون حاصل ہوا۔ وہ صوفے پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں، وہ چاہتی تھی کہ سوچ بچار کا طوفان رک جائے تاکہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سکون حاصل کر سکے، لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہ تھا اس کا دماغ انہی خیالات سے بھرا پڑا تھا، پھر وہی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ شروع ہو گیا،

"یوسف مجھے تم پر ایسا گمان کبھی خواب میں بھی نہیں

ہوا تھا، تم قاتل بھی ہو اور بے وفا بھی . . . . . . اف . . . . . .
رشیدہ . . . . . رشیدہ کا کچھ قصور نہیں، میں بھی کیسی بہک جاتی ہوں، وہ بھی میری طرح یوسف کو چاہتی ہے . . . . . اسے پیار کرتی ہے، اس کا حق مجھ سے زیادہ ہے، کیونکہ اس نے اسے پہلے چاہا . . . نہیں، نہیں، رشیدہ کا کچھ قصور نہیں، میں کتنی بے وقوف تھی، کہ اُسے یوسف کو چاہتے دیکھ کر جلتی تھی۔ اور حسد کرتی تھی، وہ بھی میری طرح عورت ہے، وہ بھی دل رکھتی ہے . . . . . آہ! میں نے کتنا بڑا گناہ کیا، وہ شاید یوسف کی یاد میں اسی طرح بے قرار رہتی ہوگی۔ آہ! یوسف! یوسف کتنا پیارا نام ہے۔ لیکن . . . . میں قربانی کروں گی، رشیدہ اور اپنے پیارے یوسف کے لئے۔"

سعیدہ اٹھ کر بیٹھ گئی، اب اس کی طبیعت کچھ سکون پذیر معلوم ہوتی تھی، وہ اسی طرح بیٹھی ہوئی سوچتی رہی، یہاں تک کہ سورج کی آخری کرنیں بھی کمرے سے آہستہ آہستہ غائب ہوگئیں، سورج غروب ہوگیا، اور کمرے میں اندھیرا چھاگیا، اس وقت سعیدہ چونکی۔ وہ اٹھی بجلی کا بٹن دبا کر کمرے میں روشنی کی —— وہ اب غمگین تھی، پژمردہ تھی، افسردہ تھی، لیکن پہلے کی طرح بیقرار نہیں تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس نے ان تمام مشکلوں کا حل سوچ کر کوئی قطعی فیصلہ کرلیا ہے، وہ اب مطمئن نظر آرہی تھی۔

تیسرے دن وعدے کے موافق تنویر سعیدہ کے کمرے میں داخل ہوا، اور سعیدہ کو کسی گہری سوچ میں پایا۔

تنویر۔ سعیدہ! میرا خیال ہے کہ تم نے آخری فیصلہ کرلیا ہوگا

سعیدہ۔ (چونک کر) ہاں ہاں تشریف رکھئے۔

تنویر۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم سمجھدار نکلیں۔

سعیدہ۔ میں یوسف سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔

تنویر۔ میری پیاری مجھے تم سے یہی امید تھی، سب سے پہلے تمہیں نے مجھ سے محبت کی ہے، اور عورت عمر میں صرف ایک آدمی ہی کو چاہ سکتی ہے،

چند لمحوں کے لئے خاموشی چھاگئی۔

سعیدہ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک عورت اپنی بھلائی کے لئے جھوٹ اور دھوکے سے کام لے سکتی ہے، میں نے ایک دفعہ کہدیا کہ میں یوسف سے ہرگز ہرگز شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوں، اور میں ایک قاتل سے شادی کرنے پر رضامند بھی کیسے ہوسکتی ہوں، اگر تم کو میں اب بھی یقین نہیں آتا تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں، کہ میں یوسف سے تمام عمر شادی نہیں کروں گی۔"

تنویر۔ مجھے تم پر بالکل اعتبار ہے۔

سعیدہ۔ اعتبار ہے تو پھر وہ خطوط مجھے دیدو۔

تنویر۔ وہ خطوط —— تمہیں ان خطوط سے کیا؟

سعیدہ۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں

تنویر۔ سعیدہ! میں تم پر اعتبار نہیں کروں گا تو کس پہ کروں گا؟

سعیدہ۔ نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو —— مجھے دھوکا دے رہے ہو —— تم محبت کا دعوےٰ کیونکر کرسکتے ہو۔

تنویر نے غور سے سعیدہ کے چہرے کو دیکھا پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور چند کاغذات نکال کر سعیدہ کے ہاتھ میں دیدیئے یہی وہ خطوط تھے جن کے لئے سعیدہ بے قرار تھی۔

سعیدہ نے جلدی سے اُٹھ کر . . . . انگیٹھی میں خطوط کا پلندہ ڈال دیا، جب تک کاغذ جلتے رہے سعیدہ ان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ جب تمام خطوط جل چکے، تو اس نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔ اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

تنویر اس کی طرف بڑھا، مگر جیسے ہی سعیدہ کو اس کے ہاتھ چھوئے وہ بڑے غصے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "تنویر اب تم کیا چاہتے ہو۔ مہربانی کرکے یہاں سے چلے جاؤ۔"

تنویر یہ سنکر حیران رہ گیا۔ اور متحیر نگاہوں سے سعیدہ کو دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت انگیز لہجہ میں پوچھا۔

"میرا مطلب۔۔۔ کیا تم ابھی میرا مطلب نہیں سمجھے۔۔۔ ۔۔۔ سنو۔ میں کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتی، میں تمام عمر کنواری رہوں گی، میں نے مردوں کو آزما لیا۔۔۔۔۔۔ خاص کر جن مردوں سے مجھے واسطہ پڑا ہے وہ تو یقیناً اس لائق نہیں ہیں کہ کوئی شریف عورت ان کے ساتھ رہ سکے، میں یوسف سے محبت کرتی ہوں، لیکن اس سے شادی نہیں کر سکتی تم سے مجھے سخت نفرت ہے"

"مجھ سے سخت نفرت ہے۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ سعیدہ" تنویر نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے جو کہنا تھا، کہدیا۔ یہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔"

"ورنہ کیا۔۔ جانتی ہو اس وقت کس کے سامنے کھڑی ہو؟" تنویر غضبناک آواز میں بولا۔

"میں سب کچھ جانتی ہوں ـــــ سب کچھ جانتے ہوئے کہہ رہی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ۔"

اتنے میں باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سعیدہ دروازے کے بالکل قریب کھڑی ہوگئی، تنویر کھڑکی کے پاس پہنچا اور پھر غائب ہوگیا۔۔۔ چند لمحوں کے بعد سعیدہ کا چچا کمرے میں داخل ہوا، سعیدہ اُسے دیکھتے ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

ـــــ (۳) ـــــ

آج یوسف کی شادی ہونے والی تھی، مگر تمام گھر پریشانی میں مبتلا تھا۔ سعیدہ کا چچا فرطِ غم سے نڈھال تھا۔۔۔ اور یوسف کا حال زار تو ناقابل بیان تھا ـــــ سعیدہ کا ایک دم گھر سے غائب ہو جانا معمولی واقعہ نہیں تھا۔۔۔۔

یوسف دیوانہ وار کمروں میں پھر رہا تھا کہ اچانک سعیدہ کی میز پر اُسے ایک لفافہ نظر آیا، اس پر اسکا نام لکھا تھا۔ اس نے لفافے کو چاک کیا، کاغذ کے ایک پرزے پر مندرجہ ذیل تحریر تھی۔

یوسف!

میں آج سے رخصت ہو رہی ہوں، اس طرح رخصت ہو رہی ہوں کہ۔۔۔ تادم واپسیں یہاں نہیں آؤں گی۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔ اور محبت رہے گی، لیکن موت تک نہ تو تم میری صورت دیکھ سکو گے اور نہ میں تمہاری صورت ـــــ رشیدہ سے ضرور شادی کر لینا۔ یہ میری آخری گذارش ہے۔

بدنصیب

سعیدہ

حضرت سید ضیا جعفری۔

لمعاتِ ضیا

سخن کے پردے میں گنگناتا ہوں بربطِ دل بجا رہا ہوں
میں اپنی بے خود نوائیوں میں خودی کے نغمے سنا رہا ہوں

وہ گھر کے آئے ہیں مست بادل میں پی رہا ہوں پلا رہا ہوں
یہ عالم، عالم ہے بے خودی کا فضائے ہستی پہ چھا رہا ہوں

جوانیوں کی بہار بنکر کسی کی ہستی پہ چھا رہا ہوں
کسی کی نظروں میں بس چکا ہوں کسی کے دل میں سما رہا ہوں

وہ اٹھ رہی ہیں کسی کی نظریں وہ گر رہی ہیں تجلیاں سی
میں اپنی ہستی کے ذرّے ذرّے کو طورِ سینا بنا رہا ہوں

ہر ایک موجِ نفس کو موجِ شراب سمجھا ہوں بے خودی میں
میں خُم کے خُم پی رہا ہوں ساقی! شراب خانے لنڈھا رہا ہوں

نگاہ تاروں کی خیرہ ہوتی ہے گریۂ شب کے موتیوں سے
زمیں کے دامن کو پچھلی راتوں میں انجمستاں بنا رہا ہوں!

اٹھاؤ مینا بڑھاؤ ساغر بہار آئی بہار آئی
پلا رہے ہیں وہ' پی رہا ہوں' وہ پی رہے ہیں' پلا رہا ہوں

نگاہِ آوارہ جوشِ مستی میں ڈوب کر بہکی پھر رہی ہے
نظر اٹھا کر زمانے بھر کو شراب خانہ بنا رہا ہوں

سرک رہا ہے نقاب حُسنِ ازل کے جلوے جھلک رہے ہیں
نگاہ سے اٹھ رہے ہیں پردے حقیقتوں میں سما رہا ہوں

فضائیں مخمور، بھیگی راتیں، نشہ برستا ہے گلستاں پر!
میں زمزمہ بن کے روحِ شاعر سے جوئے نغمہ بہا رہا ہوں

نوائے فطرت کا ترجماں ہوں میں اہلِ گلشن کا راز داں ہوں
کہ اب تو جھک کر کلی کلی کو تمہاری باتیں سنا رہا ہوں!

حریمِ دل کا ہر ایک ذرہ نقاب الٹتا ہے اپنے رُخ سے
کسی کے جلوؤں کو بے نقاب آج اپنی ہستی میں پا رہا ہوں!

قسم ہے اس بے نوا صدا کی جو قلبِ مزدور سے اٹھی ہے
میں پہروں انجامِ قصرِ شاہی کو دیکھ کر تھرتھرا رہا ہوں

نگاہِ شاعر سے دیکھتا ہوں جہاں میں تخلیقِ نو کی صورت
سحر کے اجزا کو ظلمتِ شب میں دیکھ کر مسکرا رہا ہوں!

سنائی دیتے ہیں بہتے پانی کے گیت خوابوں میں جس طرح سے
ترانے آزادئ وطن کے میں سن رہا ہوں سنا رہا ہوں

وہ حسرتِ دید کا زمانہ ضیاؔ ابھی تک ہے یاد مجھ کو
زمانے بھر کی نگاہ بن کر کسی کو جب دیکھتا رہا ہوں

فرانس کے زندہ جاوید رومان نگار
تھیو فائیل گاشیر کا شاہکار

مترجمہ سید احسان بی اے

فریبِ تخیّل

(۲)

استقف نے اپنی خچر کو ایڑ لگائی اور میری خچر خود بخود اسی رفتار سے اس کے پیچھے ہولی۔ بالآخر سڑک کے موڑ نے اس شہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔ جس میں واپس آنا میری تقدیر میں نہ تھا۔ قحط زدہ گاؤں کی سوکھی ہوئی کھیتیوں میں تین دن تک پریشان کن سفر کے بعد بلند درختوں کی سبز جھومتی ہوئی ٹہنیوں میں سے نظر آنے والے اس گرجے کا کلس نظر پڑا جو میرے سپرد ہونے کو تھا۔ آخر ہم چند پیچ در پیچ سڑکوں کو جن کے کنارے کھپریل کی چھتوں والے کچے جھونپڑے بنے ہوئے تھے قطع کر کے گرجے کے سامنے جا پہنچے۔ جس کی ظاہری ہیئت کسی طرح بھی شاندار نہیں کہی جا سکتی۔ ایک بھونڈی تراش کی دہلیز، معمولی پتھر کے دو یا تین بھدے سے ستون، اینٹوں کی چھت جس میں جگہ جگہ پتھر کی سلیں لگائی گئی تھیں۔ گرجے کو مکمل کرتی تھی۔ بائیں طرف قبرستان تھا جس میں لمبی لمبی گھاس کثرت سے تھی۔ اس کے وسط میں لوہے کی ایک بڑی صلیب گڑی ہوئی تھی۔ دائیں طرف گرجے کے سائے میں ایک چھوٹا سا بہت ہی سادہ وضع کا حجرہ تھا۔ چند چوزے جو چگ رہے تھے۔ یہ انسانی شکل سے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ ہمیں دیکھ کر بالکل نہ ڈرے اور نہ ہی ہمارے راستے سے ہٹ جانے کی تکلیف گوارا کرنے پر تیار ہوئے۔ بھونکنے کی ایک کرخت اور لرزتی ہوئی آواز سنائی دی اور ایک بوڑھا کتا ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔

یہ سابق پادری کا کتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک زائل ہو چکی تھی، بال جھڑ رہے تھے اور اس کے ہر عضو سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکا ہے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے پچکارا اور وہ فوراً ہی میرا ساتھی ہو لیا۔ اس کی چال سے ایسا اطمینان ظاہر تھا جو الفاظ کی حدود میں نہیں آسکتا۔ ایک بہت ہی بوڑھی عورت جو پہلے پادری کی ملازمہ تھی، ہمیں ملنے کے لئے آئی اور مجھے ایک چھوٹے سے عقبی کمرے میں لیجا کر بولی "کیا آپ مجھے اپنی ملازمت میں رکھیں گے؟" میں نے جواب دیا کہ میں اسے۔ چوزوں کو، کتے کو اور اس تمام سامان کو جو اس کے پہلے مالک نے اس کی حفاظت میں دیا تھا، اپنے ہی پاس رکھوں گا۔ یہ سنکر وہ باغ باغ ہو گئی اور استقف نے اس کی چھوٹی بڑی چیزوں کی قیمت ادا کر کے انہیں میرے حوالے کر دیا۔

میری رہائش کا انتظام مکمل کر لینے کے بعد استقف واپس چلا گیا اب گویا میں بالکل تنہا تھا اور مشورہ کرنے کیلئے میرے دل کے سوا اور کوئی ایسا نہ تھا جس سے میں دل کی بات کر سکوں، کلیریمونڈے کا خیال پھر میری دماغی قوتوں پر مسلط ہو گیا میں جتنا اس سے اجتناب کی کوشش کرتا، اسی قدر یہ خیال زیادہ سے زیادہ تندی اور شدت سے مجھے پریشان کرنے لگتا۔

ایک دفعہ شام کے وقت میں چھوٹے سے باغ کی پگڈنڈیوں پر ادھر ادھر پھر رہا تھا کہ دفعتاً مجھے ایسا معلوم ہوا کہ درختوں کے پاس ایک عورت کھڑی ہے، سمندری رنگ کی گہری نیلی آنکھیں سبز پتوں میں سے چمکتی ہوئی دکھائی دیں لیکن یہ محض واہمہ ثابت ہوا، میں درختوں کے اس طرف گیا مگر وہاں کسی متنفس کا پتہ نہ تھا۔ البتہ ریتیلی زمین پر ایک

نقش بنا ہوا تھا۔ اور وہ بھی اتنا چھوٹا کہ بچے کے پاؤں کا نشان معلوم ہوتا تھا۔ میں نے باغ کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن وہاں تھا ہی کون جو ملتا یہ واقعہ میرے لئے ایک عقدہ لاینحل بنا ہوا ہے لیکن با ایں ہمہ یہ واقعہ ان پُراسرار اور تحیر خیز واقعات کے مقابلے میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا جو بعد ازاں ظاہر ہوئے۔

اسی طرح میری عمر کا ایک طویل سال کٹ گیا۔ میں بڑے انہماک سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہا۔ میں روزے رکھتا، عبادت کرتا اور اتنی خیرات کرتا کہ بعض اوقات اپنی ضروریاتِ زندگی تک قربان کر دیتا لیکن ایک طوفان ہمیشہ میرے دل کی گہرائیوں میں بپا رہتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ روحانی برکات حاصل کرنے کے تمام دروازے میرے لئے بند ہو چکے ہیں۔ مقدس کام سے حاصل ہونے والی خوشی سے میں ہمیشہ محروم رہا۔ میرے خیالات ہمیشہ ادھر ادھر بھٹکتے رہتے اور میرے ہونٹ غیر اختیاری طور پر کلیسیا ... کے آخری الفاظ گنگناتے رہتے۔ آہ! دوست ذرا ان واقعات پر غور تو کرو! محض ایک دفعہ آنکھ اٹھانے سے صرف ایک جرم کے ارتکاب پر جو اس قدر معمولی نظر آتا ہے میں کئی سالوں تک ناقابلِ برداشت کرب میں گرفتار رہا۔ محض ایک لغزش نے میری تمام مسرتیں، میری تمام خوشیاں مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھین لیں۔

میں اپنی حوصلہ فرسا شکست اور اس عارضی فتح جس کے بعد آنے والی شکست پہلے سے کہیں زیادہ تلخ ہوتی تھی، کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ بلکہ ان حیرت خیز واقعات کے اظہار پر اکتفا کروں گا جن کا تعلق براہ راست میری کہانی سے ہے۔ ایک رات اطلاعی گھنٹی زور زور سے بجائی گئی، بوڑھی ملازمہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور ایک آدمی جس کا رنگ برنجی سا تھا باہر ایک لالٹین کی دھندلی روشنی میں ظاہر ہوا۔ بار بر اپہلے پہل تو کچھ سہم سی گئی لیکن اجنبی نے اسے یقین دلایا کہ وہ بہت ضروری کام سے مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ باربرا اسے اوپر کی منزل میں لے آئی جہاں میں سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اجنبی نے اکھڑے اکھڑے الفاظ میں مجھے بتایا کہ اس کی مالکہ جو ایک امیر کبیر عورت ہے بستر مرگ پر پڑی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ ان آخری لمحات میں کوئی پادری اس کے پاس ہو۔ میں اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا اور ضروری سامان لیکر نیچے اترا۔ دو سیاہ فام گھوڑے دروازے پر کھڑے بے تابی سے اپنے سم زمین پر مار رہے تھے۔ ان کی بھاپ کی طرح کثیف سانس ان کے ابھرے ہوئے سینے سے ٹکرا رہی تھی۔ اجنبی نے ایک گھوڑے کی لگام تھامی اور مجھے اس پر سوار کرا دیا۔ اور خود اچک کر دوسرے گھوڑے پر جو بیٹھا۔ گھوڑا اشارہ پاتے ہی تیر کی سی سبک رفتاری کے ساتھ بھاگ نکلا۔ میرا گھوڑا بھی اسی تیزی سے اپنے ساتھی کے پہلو بہ پہلو چل دیا۔ لمبی سڑک تیزی سے قطع ہونے لگی۔ ہمارے تلے کی زمین ایک لکیر کی طرح پیچھے کی طرف بھاگتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور آس پاس کے درخت جو رات کی تاریکی میں بھوتوں کی طرح معلوم ہوتے تھے اس طرح ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے، جیسے کسی فوج میں بھگدڑ مچ گئی ہو۔ ہم ایک جنگل سے گزرے جو اس قدر تاریک اور افسردہ تھا کہ میرا دل غیر فطری خوف و دہشت محسوس کر کے کانپ اٹھا۔ آتشیں چنگاریاں جو پتھریلی سڑک اور گھوڑوں کی آہنی نعلوں کے اتصال سے اڑ رہی تھیں، ہمارا تعاقب کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اگر اس وقت کوئی ہم کو دیکھ پاتا تو یقیناً یہی خیال کرتا کہ دو بھوت خوفناک جانوروں پر سوار اڑے جا رہے ہیں۔ الوؤں کی دہشتناک آوازیں چاروں طرف سے آ رہی تھیں، اور کہیں کہیں جنگلی بلیوں کی خوف و ہراس سے کانپتی ہوئی چمکدار آنکھیں نظر پڑتیں۔ گھوڑوں کی ایال بکھر گئی، ان کی رانوں پر پسینہ بہنے لگا۔ اور ان کا سانس زور زور سے چلنے لگا، وہ کچھ سست پڑنے لگے۔ میرا ساتھی ایک کرخت اور غیر انسانی آواز میں پکارا۔ اور گھوڑے پھر اسی جناتی تیزی سے بھاگنے لگے۔ آخر بھاگ دوڑ کا یہ طوفان ختم ہوا اور ایک عظیم الشان عمارت جس کی کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے روشنی دکھائی دے رہی تھی، نظر پڑی۔ گھوڑوں کے سموں نے سیمِ خارا پر شور پیدا کیا۔ اور ہم ایک وسیع محراب کے نیچے پہنچ گئے جو دو دو بیکر میناروں کے درمیان رات کی تاریکی میں اپنا مہیب جبڑا پھیلائے

کھڑی تھی۔ تمام محل پر ایک عجیب اضطرابی کیفیت چھائی ہوئی تھی ملازم ہاتھوں میں شمعیں لئے صحن میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ اور سیڑھیوں پر بھی گہما گہمی کا عالم تھا۔ میں نے عمارت کے بعض بڑے بڑے حصوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی ستون چھوٹی بڑی محرابیں اور سیڑھیاں شاہی عظمت و شوکت کی آئینہ داری کر رہی تھیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں پرستان میں آگیا ہوں۔ ایک حبشی لونڈی۔ وہی جسنے پہلی مرتبہ مجھے کلیرپونڈے کا خط دیا تھا۔ اور جسے میں نے ایک نظر ہی میں پہچان لیا مجھے گھوڑے سے اترنے میں مدد دینے کے لیئے آگے بڑھی۔ بوڑھا مارللہام سیاہ مخمل کا لبادہ اوڑھے ہاتھی دانت کی چھڑی ٹیکتا ہوا آیا۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا جو اس کے مرجھائے ہوئے گالوں پر سفید براق داڑھی پر بہہ رہا تھا۔ "بہت دیر سے آئے آپ" اس نے افسوس میں ڈوبی ہوئی آواز میں اپنے قابلِ احترام سر کو ہلاتے ہوئے کہا "پادری صاحب! آپ بہت دیر کر کے آئے لیکن خیر اگر آپ اسے کتاب مقدس نہیں سنا سکتے تو نہ سہی اب اس کی لاش کے پاس ہی بیٹھیے"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں مردہ پڑا تھا۔ میں نے کچھ اس سے کم گریہ وزاری نہیں کی کیونکہ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ مرنے والی اس کلیرپونڈے کے سوا اور کوئی نہیں جس کی محبت نے میرے ربابِ قلب کے سوئے ہوئے تاروں میں ایک طوفان خیز ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ ہم کمرے میں جا پہنچے ایک ملازم چارپائی کی پائنتی کے قریب کھڑا تھا۔ ایک نیلا سا شعلہ برنجی شمعدان میں کانپ رہا تھا اور کمرے میں دھندلی روشنی پھیلا رہا تھا کہیں کہیں سے کمرے کا سامان تاریکی میں سے ابھرتا ہوا دکھائی دیتا۔ ایک منقش پھول دان میز پر رکھا تھا جس میں سفید گلاب کا ایک مرجھایا ہوا پھول تھا۔ اس کی سب پتیاں۔ سوائے ایک کے جو ابھی تک شاخ کے ساتھ ہی تھی ٹوٹ کر معطر آنسوؤں کی طرح پھولدان کے ارد گرد پڑی ہوئی تھیں ایک پھٹا ہوا سیاہ نقاب، ایک پنکھا اور اسی قسم کا دوسرا سامان ایک آرام کرسی پر پڑا ظاہر کر رہا تھا۔ کہ موت نے خلافِ توقع دفعتاً اس عالیشان کمرے پر حملہ کر دیا ہے۔ مجھے چارپائی کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی، اور میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بڑے خضوع و خشوع سے وہ دعا پڑھنے لگا جو ایسے موقعوں پر پڑھی جاتی ہے۔ میں خدا کا شکر گزار تھا کہ اس نے میرے اور اس عورت کے درمیان موت کی تاریکیاں حائل کر دی ہیں اور آج کے دن سے میں اس کا نام اپنی دعاؤں میں شامل کر سکوں گا گویا موت نے اسے ایک پاک و قابلِ احترام ہستی بنا دیا تھا لیکن میرے قلب کی یکسوئی میں فرق پیدا ہونے لگا۔ اور میں مدہوش سا ہوگیا۔ اس کمرے پر ماتم کدے کا گمان تک ہو سکتا تھا۔ وہ خوشبو جو میں ایسے موقعوں پر سونگھا کرتا تھا یہاں نہیں تھی، بلکہ اس کے بالکل برعکس تیز مشرقی و ملکوتی بو پر تیر رہی تھی، زرد زرد روشنی صبح کاذب کی ایسی روشنی سے ملتی جلتی تھی جو نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے مصنوعی طور پر پیدا کی گئی ہو۔ لاشوں کے قریب جلنے والی اداس موم بتیوں سے اس کا دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ مجھے اس عجیب غریب اتفاق کا خیال آگیا، جس نے مجھے عین اس وقت کلیرپونڈے کے قریب لا کھڑا کیا جس وقت وہ مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہونے والی تھی اور حزن و ملال کی ایک ہلکی سی چیخ میرے ہونٹوں سے نکل گئی بعد ازیں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی دوسرے شخص نے بھی آہ بھری ہے، میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن یہ محض صدائے بازگشت تھی، اب میری نظریں اس چارپائی کی طرف کھنچ گئیں، سرخ رنگ کے پردے جن پر بڑے بڑے پھول زریں تاروں سے کاڑھے گئے تھے دیوار پر لٹکے ہوئے تھے، اس پر سنہری نقش سے حاشیہ بنایا گیا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ پشت کے بل سیدھی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ اور وہ...... مردہ پڑی تھی۔ وہ ایک سفید چمکدار مخمل کے کفن میں لپٹی ہوئی تھی، اور سیاہی مائل گہرے سرخ پردوں کے خلاف زبردست تضاد پیدا کر رہی تھی، یہ کپڑا اس قدر باریک بُنت کا تھا کہ اس میں سے اس کے بدن کا حسین تناسب صاف نظر آرہا تھا۔ میری آنکھیں اس پیکرِ جمیل کو —— جو راج ہنس کی پرشوکت گردن کی طرح حسین تھا صاف دیکھ رہی تھیں گو

کی کلیاں بھی اس کے جمالِ تازہ کی سلوٹوں کو چھپنے میں ناکام رہی تھیں، وہ ایک چابک دست سنگتراش کا ایسا شاہکار معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی ملکہ کی آخری آرام گاہ پر نصب کرنے کے لئے بے داغ مرمر کی ایک ہی سل سے بنایا گیا ہو۔ حسن و شوکت کا ایسا سوتا ہوا اجتماع معلوم ہوتی تھی جس کے اردگرد آسمان کی بلندیوں سے گرنے والی شفاف کچی برف نے ایک ہلکا سا پردہ بن دیا ہو۔

اب میں دعا نہیں کر سکتا تھا۔ کمرے کی ہوا مجھے بیخود کئے دیتی تھی مرجھائے ہوئے پھولوں کی بھاری بھاری خوشبو میرے دماغ کی رگ رگ میں بجلی بن کر دوڑ رہی تھی۔ میں مضطربانہ کمرے میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ ہر چکر کے بعد میں اس حسین لاش کو دیکھنے کیلئے کھڑا ہو جاتا تھا جو باریک کفن میں ایک عجیب دلربایانہ انداز میں لپٹی پڑی تھی، پریشان افکار کے ہجوم میرے دماغ میں اُمڈ آئے۔ میں نے سوچا کہ وہ حقیقت میں مری نہیں، شاید اس نے مجھے اپنے محل میں بلانے اور اپنی محبت کا اظہار کرنے کیلئے یہ چال چلی ہے، ایک دفعہ تو مجھے یہاں تک احساس ہوا۔ کہ اس کا پاؤں سفید کفن کے نیچے حرکت کر رہا ہے۔

پھر میں نے اپنے آپ سے سوال کیا: "کیا یہ حقیقت میں کلیوپیٹرا مر چکی ہے؟ میرے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس حبشن لونڈی نے کسی اور کی ملازمت کر لی ہو۔ اگر میں یونہیں اپنے آپکو پریشان کرتا رہا تو یقیناً پاگل ہو جاؤں گا" لیکن میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ اور اس کی ہر حرکت میرے سوال کا جواب دیتی "یہ وہی ہے حقیقت میں وہی ہے"۔ میں چارپائی کے پاس گیا اور پہلے سے بھی زیادہ غور سے اس لاش کی طرف دیکھنے لگا جس نے میرے دل میں عجیب و غریب اوہام پیدا کر دیئے تھے۔ کیا میں اس کے متعلق بھی غور کروں؟ اس نسائی جسم کے حیرت خیز تناسب نے، جس نے موت کے تاریک سائے میں آ کر تقدس کی شان اختیار کر لی تھی، میرے نفسانی جذبات میں ہلچل ڈال دی۔ "موت پرسکون نیند سے اس قدر مشابہ تھی کہ اس میں اشتباہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی میں اس حقیقت کو بالکل بھول گیا۔ کہ میں یہاں محض

کی رسم ادا کرنے آیا ہوں، میں اپنے آپ کو دولہا تصور کرنے لگا۔ اور یہ سمجھنے لگا، کہ میں شبِ زفاف سے لطف اندوز ہونے کے لئے کمرۂ عروسی میں داخل ہوا ہوں اور میری دلہن فطری حجاب کیوجہ سے اپنے خوبصورت چہرے کو ہلکے سے نقاب میں چھپائے ہوئے ہے۔ غم و ملال سے میرا دل گھٹا جاتا تھا لیکن نہ معلوم امید کیوں رہ رہ کر میرے سیاہ خانۂ دل کو منور کر دیتی۔ خوف و مسرت کے متضاد جذبات سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ میں اس کے چہرے سے کفن ہٹانے کو جھکا میں نے سانس روک کر کفن کا ایک کونہ ہٹا دیا۔ مجھے ڈر تھا، کہ میرے سانس کی دھیمی آواز اس کے پرسکون آرام میں مخل ہو گی جذبات کی شدت سے میری نس نس کانپ رہی تھی اور پیشانی پر پسینے کے قطرات چمک رہے تھے۔ میں ایسا تھک گیا تھا۔ گویا سنگِ مرمر کی بھاری سل اٹھائی ہے۔ یہ حقیقت میں وہی کلیوپیٹرا تھی جس کو میں نے اس روز گرجے میں دیکھا تھا۔ وہ اس روز سے کسی طرح بھی کم خوبصورت نہ تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی موت کی ادا بھی ایک حسین ادا معلوم ہو رہی تھی، اس کے رخساروں کی زردی ہونٹوں کا پھیکا پن، بند آنکھیں، اس کے سفید سفید رخساروں پر لمبی لمبی پلکوں کے پرسکوت تاریک سائے اس کی ناقابلِ بیان افسردگی اور مرنے سے پہلے کے ذہنی کرب کا اعلان کر رہے تھے، اس کے کھلے ہوئے بال جن میں اب بھی نیلوفر کے دو چار پھول لگے ہوئے تھے! اس کے نازک سر کیلئے نرم اور چمکدار تکیئے کا کام دے رہے تھے۔ اور اس کے کندھوں کی عریانی اپنے ریشمی بچوں کے دامن میں چھپائے ہوئے تھے اس کے خوبصورت ہاتھ جو "پوسٹ" سے کہیں زیادہ اجلے تھے۔ تقدس کے انداز میں اس کے سینے پر بندھے تھے۔ یہ تقدس اس جاذبیت کا ردعمل ثابت ہو رہا تھا جو مدت کے بعد بھی اس کے گول گول مرمریں بازوؤں میں موجود تھی۔

میں بہت دیر تک خاموشی سے سوچتا رہا، جتنا سوچتا پریشانی اسی قدر بڑھ جاتی، اب مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ زندگی بھی اس

حسین جسم سے جدا نہیں ہو سکی ممکن ہے کہ یہ میرے واہمہ کی نادرہ کاری ہو یا لیمپ کی لرزتی ہوئی روشنی کا اثر کہ مجھے اس کے رخساروں کی زردی میں زندگی کے خون کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس کا جسم اب تک ساکت تھا میں نے نہایت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ یہ سرد تھا مگر موت کی سردی بھی اس دن کی ٹھنڈک سے نہ بڑھ سکی تھی جس دن گرجے کی ڈیوڑھی میں اس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ اس پر جھکا دیا اور آنسوؤں کی گرم گرم شبنم سے اس کے پھول سے رخسارے دھونے لگا۔ اف! یاس، بے کسی کے حوصلہ شکن جذبات نے ناقابل برداشت درد پیدا کر دیا تھا۔ میری زبردست خواہش تھی کہ میں اپنی زندگی کے تمام ان شعلوں کو جو میری رگوں میں بھڑک رہے تھے یکجا کر کے اس کے سرد جسم میں پھونک ڈالوں لیکن ہائے یہ آرزو کہ خاک شد رات تیزی سے ختم ہوتی گئی۔ اب پو پھٹنے کو تھی اور ہمیشہ کی جانگداز جدائی کا لمحہ قریب سے قریب تر ہوا جاتا تھا۔ اب اپنے آپ کو اس کے مردہ ہونٹوں پر ایک میٹھا اور پرحسرت بوسہ ثبت کرنے کی مایوس مسرت سے محروم رکھنا میرے حیطۂ اختیار سے باہر تھا۔ ایک تحیر زا معجزہ ایک گھٹا ایک بھنچا ہوا سانس میرے لرزتے ہوئے سانس کے گلے سے لپٹ گیا۔ کلیر یمونڈے کے ہونٹوں نے میرے ہونٹوں کا پرجوش استقبال کیا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں اس وقت ان میں اس پرانی چمک کی خفیف سی رمق باقی تھی۔ اس نے ایک پرجوش آہ بھری اور ایک پرجوش انبساط سے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ "آہ! تم ہو رومالڈ؟ اس نے زیر لب کہا اس کی آواز رباب کے تاروں کی آخری کپکپی کی آواز سے مشابہ تھی "تمہیں کیا ہو گیا تھا پیارے! میں تو تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے مر گئی! لیکن اب ہم مل گئے ہیں۔۔ اب میں تمہیں مل سکوں گی تم سے ملنے بھی آیا کروں گی۔ خدا حافظ رومالڈ! مجھے تم سے محبت ہے اسی لفظ کو ایکبار اپنی زبان سے کہنے کی تمنا تھی، اب میں تمہیں وہ زندگی واپس دیتی ہوں جو تمہارے ہونٹوں نے ایک لمحہ کے لئے مجھے مستعار دی تھی۔ ہم جلد ملیں گے پیارے!"

اس کا سر ڈھلک کر پڑا لیکن اس کے بازو بدستور میری گردن میں حمائل تھے۔ گویا وہ مجھے تا ابد اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتی تھی۔ ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا کھڑکی کے راستے کمرے میں آیا، سفید گلاب کی آخری پتی تیتری کے پر کی طرح ایک لمحے کے لئے کانپی اور پھر کھڑکی کی راہ سے باہر اڑ گئی۔ کلیر یمونڈے کی روح کو ساتھ لئے ہوئے لیمپ بجھ گیا، اور میں اس حسین سینے پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب مجھے پھر ہوش آیا اس وقت میں حجرے کے بالاخانے میں ایک چارپائی پر پڑا تھا، سابق پادری کا کتا میرا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ جو چادر سے باہر نکل کر چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ باربرا بڑھاپے اور پریشانیوں کی شدت کے بوجھ تلے کانپتی ہوئی کام دھندوں میں مشغول تھی، وہ کبھی الماریوں کو کھولتی کبھی بند کرتی کبھی سفوف گھولنے لگتی جب اس نے مجھے ہوش میں آتا ہوا دیکھا تو مسرت و انبساط کی ہلکی سی چیخ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکل گئی کتے نے بھونک کر اور دم ہلا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن میں اس قدر کمزور ہو چکا تھا، کہ ایک لفظ بولنا یا خفیف سی حرکت کرنا بھی حیطۂ بس میں نہ تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میں بے ہوش پڑا رہا ہوں سانس کی ہلکی آمد و شد کے سوا میری زندگی کے اور کوئی آثار نہ تھے۔ وہ تین دن میری زندگی میں شامل نہیں۔ اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ ان تین دنوں میں میری روح کہاں کہاں پھرتی رہی میرے دماغ پر ایسا کوئی نقش موجود نہیں جس سے ان تین دنوں کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔ باربرا نے مجھے بتایا، کہ وہی آدمی جو مجھے لینے کو آیا تھا دوسرے روز مجھے پالکی میں یہاں اٹھوا لایا اور پھر فوراً ہی واپس چلا گیا جب میں اپنے پریشان خیالات کو مجتمع کرنے کے قابل ہوا تو میں اس رات کے تمام واقعات پر غور کرنے لگا پہلے پہل تو میرا خیال تھا کہ میں جادو کے زیر اثر رہا ہوں لیکن دوسرے واقعات نے جو اس قدر حقیقی اور ناقابل تردید تھے اس خیال کو بے معنی قرار دیتے تھے۔ میں اسے خواب پر بھی محمول نہیں کر سکتا تھا کیونکہ باربرا نے بھی اس اجنبی کو اور اس کے گھوڑے کو دیکھا تھا۔ اور اس کی شکل و صورت اور ملبوسات کا بالکل

صحیح پتہ دے رہی تھی، بہرحال گاؤں والوں میں سے کوئی بھی اس محل کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا جس میں کلیو پونڈے کو میں نے دوبارہ دیکھا تھا۔

ایک دن میرا پاپن کا اسقف میرے کمرے میں آگیا، بار برا نے اسے میری علالت کی اطلاع دیدی تھی اس لئے وہ میری تیمارداری کو آیا تھا۔ باوجودیکہ وہ میری خیر و عافیت پوچھنے آیا تھا لیکن پھر بھی اسے اپنے قریب پاکر میں اتنا خوش نہیں ہوا جتنا کہ مجھے ہونا چاہیئے تھا۔ اسقف کی متجسس اور مخوف نظروں نے مجھے بڑا پریشان کیا اور اس کی موجودگی سے مجھے کچھ خوف محسوس ہونے لگا۔ میں اس سے علیحدہ رہنے کی مجرمانہ سعی کرنے لگا۔ وہ میرے قلبی ہیجان کو ایک ہی نظر میں پا گیا تھا اس لئے مجھے اس سے نفرت سی ہونے لگی، میری خیر و عافیت پوچھتے وقت اس نے اپنی بڑی بڑی شیر جیسی زرد زرد آنکھیں میرے چہرے پر جمائے رکھیں، اف! وہ میری آنکھیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میری روح میں اتری جاتی تھیں، اس نے پوچھا کہ میں اپنے حلقے کا انتظام کیسے کرتا ہوں، میرا دل یہاں لگا ہے یا نہیں، میں اپنے فرصت کے اوقات کس طرح گذارتا ہوں، میں نے حلقے کے لوگوں سے میل ملاپ کر لیا ہے یا نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان تمام سوالات کے جواب نہایت مختصر الفاظ میں دیئے لیکن وہ ایک سوال کا جواب سنے بغیر دوسرا سوال جڑ دیتا، یہ ظاہر تھا کہ اس گفتگو کا اس موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں، جو حقیقت میں اس کے مدنظر تھا۔ اس کے بعد گویا اسے کوئی ایسی خبر یاد آگئی جس کو وہ فوراً سنا دینا چاہتا تھا۔ ورا سے ڈر تھا کہ اگر اس نے اس کے درمیان کوئی اور بات کہدی تو اسے بھول جائے گا اس لئے اس نے بغیر کسی تمہید کے صاف لرزتی ہوئی آواز میں کہا، آواز صورِ اسرافیل کی آواز کی طرح میرے کانوں میں گونج اٹھی:-

"درباری خاتون کلیو پونڈے آٹھ دن اور دس راتیں تکلیف دہ بیماری میں مبتلا رہ کر چند دن ہوئے کہ مر گئی۔ اس کی تجہیز و تکفین جنم کی طرح پر شکوہ تھی۔ قلو پطرہ اور بیلشا نار کا قابلِ نفرت شکوہ و جلال دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔ یا اللہ ہم کس زمانے میں رہتے ہیں، سیاہ فام لونڈیاں جو کسی نامعلوم زبان میں گفتگو کرتی تھیں کھانا کھلانے پر متعین تھیں۔ یہ لونڈیاں حسین چڑیلیں معلوم ہوتی تھیں، ان کی پوشاک بڑے سے بڑے شہنشاہ کو بھی شرما رہی تھی۔ اس کلیو پونڈے کے متعلق عجیب و غریب قصے مشہور ہیں، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے لاتعداد عشاق ہمیشہ کتے کی موت مارے گئے۔ لوگوں کا خیال تھا، کہ وہ بھوت ہے یا چھلاوہ ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ بلیزیبب نے اس میں پھر حلول کیا ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا، اور گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا گویا وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اس کے الفاظ نے میرے دل پر کیا اثر کیا ہے میں اس کے منہ سے کلیو پونڈے کا نام سن کر حیرت ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی موت کی خبر اور اس عجیب و غریب ہوشربا سانحہ کی یاد نے مجھے سخت ترین روحانی اذیت دی ہیں انتہائی کوشش کے باوجود اس اذیت کے تاثرات کو چہرے پر ظاہر ہونے سے نہ روک سکا اسقف نے مجھے مضطرب نگاہوں سے دیکھا۔ اور بولا "بیٹا! میرا فرض مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں تمہیں اس عمیق اور فنا کر دینے والے گڑھے سے مطلع کر دوں جس پر کھڑے تم ڈگمگا رہے ہو۔ ہوشیار ہو ورنہ گر کر فنا ہو جاؤگے شیطان کے پنجے بڑے خوفناک ہوا کرتے ہیں۔ اور قبریں امانت کو ایمانداری سے اپنے اندر رکھنے میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوا کرتیں کلیو پونڈے کی قبر کا تعویز بڑی مضبوطی سے بند کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ اگر میرا علم غلط نہیں تو اس کی یہ موت پہلی دفعہ واقع نہیں ہوئی رد مالڈ! خدا حافظ!"

یہ الفاظ کہکر اسقف آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا میں نے پھر اسے وہاں نہیں دیکھا کیونکہ وہ اس کے فوراً بعد ہی حلقہ ـــــ کو چلا گیا تھا۔

میری صحت بالکل بحال ہو گئی اور میں پھر اسی انہماک کیساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول ہو گیا۔ کلیو پونڈے کی جاں سوز یاد اور بوڑھے اسقف کی حیات افروز نصیحت بیک وقت میرے دماغ میں موجود تھیں۔ اس کے بعد کوئی ایسا غیر فطری واقعہ رونما

نہیں ہوا، جو اسقف کی بھیانک پیشین گوئی کو صحیح ثابت کرتا، اور آہستہ آہستہ مجھے یقین ہو گیا کہ اسقف کا خوف اور میری دحشت مبالغے کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، آخر ایک رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا میں نے ابھی پلک سے پلک ہی جھپکائی تھی، کہ سونے والے کمرے کے پردوں میں جنبش پیدا ہوئی، پردے کے حلقے کرٹن راڈ پر پھسلے، اور پردہ ہٹ گیا۔ میں چونک سا پڑا، اور تکیئے پر کہنیاں ٹیک کر نیم خمیدہ حالت میں بیٹھ گیا، میرے سامنے ایک عورت کا سایہ تھا۔ میں نے فوراً ہی کلیریمونڈے کو پہچان لیا، اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چراغ تھا جو عام طور پر مقبروں پر ہی رکھا جاتا ہے، اس کی مدھم زرد روشنی نے کلیریمونڈے کی نازک انگلیوں کو شفاف بنا دیا تھا، اور ان میں خون کی باصرہ نواز سرخی جھلک رہی تھی، جو اس کے عریاں مرمریں بازوؤں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے رہی ململ کا باریک کفن پہن رکھا تھا، اور کپڑے کی سلوٹوں کو اوپر کھینچ کر اپنے سینے کی عریانی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی گویا وہ اس ناکافی لباس سے آجانے پر شرمندہ ہو رہی ہے لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھ اس کام کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ اس کا رنگ اس قدر سفید تھا کہ کفن کی سفیدی اس کے بدن کے رنگ میں گھلی جاتی تھی، اس باریک کپڑے میں جس میں سے اس کے جسم کا ہر عضو نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا وہ ایک زندہ عورت نظر آنے کی بجائے ایک نازک مرمریں مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔

لیکن خواہ وہ زندہ تھی یا مردہ مجسمہ تھی یا حقیقت میں عورت تھی سایہ تھی، یا جسم جو کچھ بھی ہو، اس کا حسن ویسا ہی جاذب نظر تھا۔ اگر اس میں کوئی فرق پیدا ہو گیا تھا تو صرف یہی کہ اس کی گہری نیلگوں آنکھوں کی وہ پہلی چمک قدرے دھیمی پڑ گئی تھی، اور اس کے ہونٹ جو آج سے پہلے یاقوت کی طرح سرخ تھے۔ اس کے گلابی رخساروں کی طرح گلابی گلابی نظر آتے تھے۔ وہ کاسنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول جو میں نے اس کے بالوں میں الجھے ہوئے دیکھے تھے مرجھا گئے تھے۔ نہیں، بلکہ ان میں اب کوئی پتی باقی نہ تھی، لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود وہ ویسی ہی حسین اور دلربا تھی۔ اس قدر دلربا کہ میں اس واقعہ کی عجیب و غریب نوعیت اور کمرے میں داخل ہونے کے حیرت خیز عمل کے باوجود ذرہ برابر خوف زدہ نہ ہوا۔

اس نے چراغ کو میز پر رکھ دیا اور میری پائنتی پر بیٹھ گئی، پھر وہ میری طرف جھکی، اور نقرئی گھنٹی جیسی صاف اور مخمل جیسی نرم آواز میں جو میں نے سوائے اس کے اور کسی کی زبان سے نہیں سنی تھی بولی:۔

"پیارے رومالڈ! میرا خیال ہے کہ تمہیں میرا بڑا انتظار کرنا پڑا اور شاید تمہارا خیال ہو کہ میں تمہیں بھول گئی ہوں، لیکن میں دور —— بہت دور ایک ایسے مقام سے آ رہی ہوں جہاں سے آج تک کوئی ذی روح واپس نہیں آیا۔ جہاں سے میں آ رہی ہوں، وہاں نہ تو چاند ہے اور نہ سورج، سوائے خلا اور سائے کے وہاں کچھ بھی نہیں وہاں نہ کوئی سڑک ہے نہ پگڈنڈی، نہ چلنے کو زمین، نہ اڑنے کو ہوا، لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود میں تمہارے پاس آ گئی ہوں کیونکہ محبت موت سے زیادہ قوی ہے اور وہ وقت ضرور آتا ہے جب محبت موت پر فتح پا لیتی ہے۔ آہ! یہاں آتے وقت راستے میں مجھے کتنے پژمردہ چہرے کتنی بھیانک چیزیں دیکھنا پڑیں، میری روح کو جو محض قوت ارادی کے بل بوتے پر واپس آئی، اپنے کالبد کو ڈھونڈنے اور اسے دوبارہ آباد کرنے میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا! اپنے اوپر جھکے ہوئے بھاری تعویز کو اٹھانے میں مجھے کتنی تکلیف ہوئی دیکھو تو! میری کمزور ہتھیلیاں چھل گئی ہیں، انہیں ذرا چوم لو، شاید تمہارے ہونٹ ان زخموں کو مندمل کر سکیں"۔ یہ کہکر اس نے یکے بعد دیگرے اپنی برف جیسی سرد ہتھیلیاں —— میرے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ میں نے انہیں چوما —— ہاں! ہاں! کئی بار چوما، اور وہ مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہی، آہ! اس کی اس مسکراہٹ میں محبت کی ہزاروں جنتیں مچل رہی تھیں۔

میں یہ اعتراف کرکے مارے شرم کے گڑا جا رہا ہوں کہ میں مقدس اسقف کی نصیحتوں اور اپنے مقدس فرائض کو بالکل بھول

چکا تھا۔ میں نے پہلے ہی حملے میں بچاؤ کی کوشش کئے بغیر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ میں نے اس کشش کا مقابلہ کرنے کی مطلقاً کوئی کوشش نہیں کی۔ کلیر یونڈے کے جسم کی سرخی میری رگ رگ میں سما گئی اور میرا خون کھولنے لگا۔ آہ! مجبور لڑکی! اس کے بعد ظاہر ہونے والے واقعات کے باوجود میں یہ نہیں مان سکتا کہ وہ شیطان تھی، شیطان اپنے خون آشام پنجوں اور بھدے سینگوں کو ایسے خوبصورت نقاب میں کسی طرح بھی نہیں چھپا سکتا۔ اس نے اپنے پاؤں کفن سے نکال لئے اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس بانکپن کے ساتھ کہ اس کی ہر حرکت اور ہر جنبش ایک دلنواز ادا معلوم ہونے لگی۔ کبھی وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے میرے بالوں کو درست کرنے لگتی، میں نے اپنے آپ کو اس کے خوبصورت ہاتھوں کے رحم پر چھوڑ دیا۔ مجھے اس میں لطف سا آتا تھا۔ اور وہ اپنے اس کھیل کو بڑے ہی دلربا انداز میں جاری رکھے ہوئے تھی۔ سب سے زیادہ حیرت خیز بات یہ ہے کہ مجھے اس کا غیر فطری تعجب ہوا ہی نہیں۔ اور جس طرح خواب میں آدمی مہمل سے مہمل باتوں کو عام حقیقت سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ اسی طرح میں بھی ان تمام واقعات کو فطری ہی سمجھتا رہا۔

"پیارے رومالڈ! میں تمہیں دیکھنے سے پہلے ہی تم پر عاشق تھی اور تمہیں دنیا کے کونے کونے میں ڈھونڈتی پھری، تمہیں میرے خوش کن خوابوں کی دلنواز تعبیر تھے۔ اور آخر میں نے تمہیں اس ہلاکت آفریں لمحے میں گرجے کی چار دیواری کے اندر دیکھا۔ میرا دل فوراً پکار اٹھا "یہ وہی ہے!" میں نے تمہیں دیکھا۔ اور اپنی آنکھوں میں وہ تمام محبت جو میرے دل میں موجود تھی، اور جو اب بھی موجود ہے اور جو ہمیشہ ہمیشہ موجود رہے گی بھر دی۔ ایسی آنکھیں جو اسقف اعظم کو بھی پاگل بنا دیں اور جو بادشاہ کو سر دربار میرے قدموں پر جھک جانے پر مجبور کر دیں لیکن تم ..... تم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، تم نے اپنے خدا کو مجھ پر ترجیح دی۔ آہ! میں اس خدا سے حسد کرنے لگی ہوں، جس کی محبت میں تم گرفتار تھے۔ اور جس کو اب بھی تم مجھ سے زیادہ چاہتے ہو۔

"لعنت ہے میری زندگی پر! لعنت ہے اس بدنصیب زندگی پر! میں تمہارے دل کو کبھی بھی نہ جیت سکی۔ میں جس کو تمہارے ایک بوسے نے زندگی کی تیز شراب سے بھر دیا تھا۔ مردہ کلیر یونڈے جس نے تمہاری خاطر قبر کا سینہ چیر ڈالا اور تمہارے پاس آ گئی، صرف اس زندگی کو تمہارے قدموں پر قربان کرنے کے لئے جس کو اس نے محض تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے واپس لے لی ہے۔"

وہ بات بات پر مجھے گلے سے لگاتی، یہاں تک کہ مجھ پر ایک بے خودی سی طاری ہو گئی۔ میں نے محض اس خیال سے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو، کفر کا ایک کلمہ کہہ ڈالا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں، جتنی اپنے خدا سے!

"کیا سچ؟ کیا سچ کہہ رہے ہو! کیا اتنی ہی جتنی خدا سے؟" اس نے پکار کر کہا، اور اپنی خوبصورت باہیں میری گردن میں حمائل کر دیں "اگر ایسا ہی ہے تو تم میرے ساتھ چلو گے، تمہیں وہیں چلنا ہوگا جہاں میں جاؤں گی۔ تمہیں اپنے اس سیاہ جبہ کو اتار کر پھینک دینا ہوگا۔ تم مغرور ترین! اور قابل رشک شہسوار ہو گے۔ اس کلیر یونڈے کا عاشق ہونا جس نے پوپ تک کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ یقیناً قابل صد فخر و مباہات ہے۔ آہ! وہ ناقابل بیان مسرور زندگی، وہ شفق کی حسین ترین رنگینیوں میں ملو زندگی جو ہم تم دونوں بسر کریں گے! اور ہم چلیں کب؟"

"کل! کل!" میں نے نیم خوابی کی حالت میں چلا کر کہا۔

"کل؟ چلو کل ہی سہی" اس نے جواب دیا۔ "اس دوران میں مجھے اپنا لباس تبدیل کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ بہت ہی باریک ہے اور کسی صورت بھی سفر کے قابل نہیں، اور ابھی مجھے ان دوستوں کو اطلاع کرنی ہے۔ جو مجھے مردہ سمجھ کر میرے غم میں سوگوار ہو رہے ہیں۔ وہ یہ ملبوسات، گاڑی وغیرہ سبھی کچھ تیار ہوگا۔ میں کل اسی وقت آؤں گی۔ خدا حافظ پیارے!"

(باقی باقی)

جناب احمد ندیم قاسمی بی۔اے

آزاد ہند کے سپاہی

پیس کر دھر دے چٹانیں چیر کر رکھ دے پہاڑ
تجھ کو کیوں روکے ہوئے ہے آتشیں گولوں کی باڑ
ضیغمِ ہندوستاں، "ہندوستاں" کہہ کر دہاڑ

توپ کے گولوں کو چٹکی میں دبا کر خاک کر
ان فصیلوں اور دیواروں کے سینے چاک کر
اپنی تلواروں کو دشمن کے لہو سے پاک کر

بڑھتا جا، بھارت کی آزادی کے نغمے گاتا جا،
وادیوں کو روندتا جا، چوٹیوں کو ڈھاتا جا،
دندناتا جا، نشانِ حریت لہراتا جا،

اُٹھ افق کے اُس طرف بھارت کا پرچم گاڑ دے
جو تجھے روکیں انہیں بچھو سمجھ کر جھاڑ دے
تو اگر چاہے تو دو عالم کے پردے پھاڑ دے

دور اک گاؤں میں ہے تیرا کسی کو انتظار،
اُن شفق زاروں میں تیری راہ تکتی ہے بہار،
تیرے دل میں بھی لرزتے ہیں محبت کے شرار،

ہاں ـــ مگر میدان سے منہ موڑ کر جانا نہیں
موت سے ڈر کر فریبِ زندگی کھانا نہیں
کیا ابھی مفہوم آزادی کا پہچانا نہیں؟

جناب انور کمال

جوان بوڑھیا

رادھاکشن اپنے گاؤں بھر میں دھن دولت کے اعتبار سے سب سے بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے۔ گاؤں میں جتنے بھی پکے مکان تھے، انہیں کی ملکیت اور جو کچھ کاروبار تھا، انہیں کے بہم پہنچائے ہوئے سرمائے سے چلتا تھا۔ روپے پیسے کا لین دین انکا ذاتی دھندا تھا، ایک ایک کے دس دس لیتے اور اس طرح غریب کسانوں کا لہو پی پی کر روز بروز موٹے ہوتے جاتے تھے۔ انکی استری کو سورگباش ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ بس اُس کی نشانی صرف اشوک تھا جو صورت و سیرت میں باپ سے بالکل مختلف تھا۔ روپے کی زیادتی رادھاکشن کی ہوس کو کم نہ کرسکی۔ جیسے جیسے دھن بڑھتا گیا دھن کمانے کا لالچ بھی زیادہ ہوتا گیا۔ سیٹھ نے روپیہ پیسہ تو بہت جمع کر لیا مگر بیٹے کو گنوار کا گنوار ہی رہنے دیا۔ کبھی اُس کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہ کی۔ اشوک میں جو کچھ خوبیاں تھیں، خداداد اور اُسکی اپنی نیک فطرت کی بدولت تھیں۔

بملا گاؤں کے آڑھتی کشوری لال کی بیٹی سے اشوک کو بچپن ہی سے محبت تھی، بچپن کے زمانے میں وہ گاؤں کے سرسبز کھیتوں میں کھیلتے، پاس کی ندی میں نہاتے، اور ایک دوسرے پر چھینٹیں اڑا اڑا کر ہنسا کرتے تھے۔ اس طرح حسن بھی موجود ہوتا اور عشق بھی، مگر حسن معصوم ہوتا اور عشق کم سن۔ بملا کے پتا لالہ کشوری لال اشوک کو بیٹوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ ایک دن نہ جانے رادھاکشن کو کیا خیال آیا۔ اشوک کو بلا کر کہا: "بیٹا اب تم خیر سے جوان ہوا جس طرح میں نے دولت کمائی ہے۔ اس طرح تمہیں بھی دولت کمانی چاہئے اب میں تمہیں شہر میں کپڑے کی دوکان کھول دینا چاہتا ہوں۔"

اشوک کا سر باپ کے سامنے جھک گیا۔ شہر کا لڑکا ہوتا تو باپ کو تجارت کا کوئی گُر سمجھاتا، بیوپار کے اونچ نیچ سے مطلع کرتا، مگر دیہات کا ایک اجڈ اور گنوار لڑکا باپ کے آگے بولتا کیا۔ جانے باپ کا کہنا اُس کے لئے حکم، اور باپ کا حکم اُس کیلئے قانون بن جاتا ہے۔ اشوک جس وقت اُٹھنے لگا تو رادھاکشن نے یہ بھی کہدیا "بیٹا جلد تیار ہو جاؤ، اگلے مہینے کی کسی تاریخ کو میں تمہیں شہر بھیجدونگا۔" اشوک کو اپنا عزیز گاؤں چھوڑ دینے کا رنج تھا۔ مگر وہ چپ تھا، اسمیں اتنی ہمت نہ تھی کہ پتا کے سامنے بول سکے۔ کچھ دن گذرنے کے بعد رادھاکشن نے اپنے بیٹے کو بلایا اور بولے "دیکھو بیٹا اتوار کے روز میں تمہیں شہر لے جاؤں گا، شہر میں دوکان کرایہ پر لے لی گئی ہے، منیم جی کو کپڑا خریدنے کے لئے بمبئی بھیجدیا ہے۔ صرف تمہارے وہاں جانے کی دیر ہے۔" اشوک نے جب یہ خبر سُنی تو دل مسوس کے رہ گیا۔ شام کو اشوک کشوری لال کے گھر گیا۔ باتوں باتوں میں شہر جانے کا ذکر بھی ہوا، کشوری لال بولے "کیا سچ مچ تم شہر جا رہے ہو بیٹا" اشوک نے کہا "جی"۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بملا آگئی۔ اس نے اشوک کے شہر جانے کی خبر سنی تو گم سم سی اور چپ چاپ پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اشوک جب گھر جانے لگا تو اس نے دیکھا کہ بملا رو رہی ہے۔

اتوار کا دن آن پہنچا۔ اشوک شہر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ سیٹھ رادھاکشن ملازموں کو بھی جلدی کام کرنے کی تاکید کرتے اور کبھی اشوک کو تیار ہونے کے لئے کہتے۔ چھکڑا دروازے پر آ پہنچا۔ اشوک اور اُس کے پتا چھکڑے میں آ بیٹھے۔ چھکڑا

آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ سامنے افق میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی سرخی سے سارا آسمان سرخ تھا۔ گاؤں کے لیے لیے لڑکے اشوک کو الوداع کہنے کے لئے سڑک کے دونوں طرف کھڑے تھے درمیان میں چھکڑا گرد اڑاتا ہوا آہستہ آہستہ منزل مقصود کی طرف جا رہا تھا۔ اشوک نے دیکھا کہ اس کے ساتھ بچپن کے کھیلے ہوئے ساتھیوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں۔ گاؤں کے یہ تنومند قدآور اور محنت کش نوجوان کتنا معصوم اور نرم دل رکھتے ہیں۔ اشوک بھی باپ کے ڈر کی وجہ سے اپنے آنسو دل سے آنکھ تک نہ آنے دیتا تھا، وہ گاؤں کے نظاروں کو پیاسی اور حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، اچانک اشوک نے سڑک سے ذرا دور دیکھا۔ ملا کھڑی رو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ مگر اشوک کچھ نہ کہہ سکا۔ چھکڑا تو سے ہوئے آگے نکل گیا۔ دور افق کے قریب کوئی دیہاتی لڑکا پہاڑی کی نے میں بنسری بجاتا ہوا جا رہا تھا۔

اشوک کو شہر میں آئے کچھ دن گزر گئے۔ وہ ہر وقت اداس رہتا شہر کی رونق اُسے خوش کرنے کے لئے کافی نہ تھی۔ کئی دفعہ اس نے گاؤں جانے کا ارادہ بھی کیا۔ مگر باپ کے لفظ اُسے اچھی طرح یاد تھے "نئی نئی دوکان کھولی ہے نیا نیا کاروبار چلایا ہے روپے پیسے خرچ کرنے میں کمی نہیں کی، تمہارا دل اداس بھی ہو پھر بھی دوکان چھوڑ کر مت آنا" اشوک جب یہ خیال کرتا۔ تو گاؤں جانے کا خیال دل سے نکال دیتا۔ سیٹھ رادھا کشن بیٹے کو شہر چھوڑ کر واپس آئے تو دوسری شادی کی فکر کرنے لگے۔ اشوک کو گاؤں سے الگ کرکے شہر میں چھوڑ آنے کا اصل مدعا یہی تھا۔ جوان بیٹے کے روبرو کونسا ایسا بوڑھا باپ ہے جو شادی کر سکے۔ رادھا کشن سیٹھ نے دل میں یہ تجویز پختہ کر رکھی تھی کہ اشوک کے شہر چھوڑنے پر دوسری شادی ضرور کر لیں گے۔ اور جب اشوک گاؤں واپس آئے گا تو یہ بات پرانی ہو چکی ہوگی۔ شادی کا ارادہ کرنا تو سیٹھ رادھا کشن کے اختیار میں تھا، مگر رشتہ حاصل کرنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

سیٹھ جی نے منشی کو بلایا ہے تاکہ اس سے کوئی صلاح مشورہ کرلیں جہاں آقا ہی کی نیت خراب ہو وہاں غلام کی نیت میں فرق کیوں نہ آئے منشی جی سیٹھ جی سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر تھے۔ رادھا کشن اگر انہیں کرایہ دار سے کرایہ سختی سے لینے کا حکم دیتے تو منشی جی سامان قرق کرانے تک بھی کہہ دیتے۔ منشی جی آئے اور سیٹھ جی سے ذرا ہٹ کر مؤدبانہ بیٹھ گئے۔ سیٹھ جی نے اپنی اچکن کے بٹن کھولے اور رُک رُک کر بولے "منشی جی! آج میں آپ سے اُسی شادی کے متعلق بات چیت کرنا چاہتا ہوں" منشی جی نے سیٹھ صاحب کو شرمندہ کرنے اور بات کو لمبا کرنے کی غرض سے جواب دیا۔

"ہاں ہاں اشوک بابو کی شادی ہی کے متعلق نا سیٹھ صاحب"۔

"نہیں نہیں منشی جی میں اپنی شادی کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں"

"سمجھا حضور" سیٹھ صاحب بولے "کوئی رشتہ بھی ہے منشی جی یا یونہی ٹال مٹول کر رہے ہو"

منشی جی نے ذرا اپنی اہمیت کو بڑھاتے ہوئے کہا "رشتہ پیدا کیا جا سکتا ہے حضور"

سیٹھ جی نے پھر آہستہ سے کہا "مجھ کو اس عمر میں بر کون دیگا منشی جی"

"لوگ آج کل دولت کو دیکھتے ہیں سرکار۔ عمر و مر کوئی نہیں دیکھتا"

"مگر منشی مجھے کوئی رشتہ بھی بتاؤ گے یا یونہی باتیں بناتے جاؤ گے" سیٹھ صاحب نے ذرا کرخت مگر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"حضور اگر رشتہ نہ ہوتا تو اتنی باتیں بنانے کی کیا ضرورت تھی"

سیٹھ دل ہی دل میں خوش ہو کر بولے "کونسا منشی جی؟"

منشی نے رازدارانہ انداز میں آگے جھکتے ہوئے کہا "کشوری لال آڑھتی کی جوان بیٹی کا اور کس کا سرکار"

سیٹھ جی نے بات کو پختہ کرنے کی غرض سے کہا "کیا وہ راضی ہو جائے گا"

منشی جی نے بڑے وددوالوں کی طرح جواب دیا "وہ آپ کا قرضدار ہے اور پھر ایک بنیا۔ وہ تیار ہو جائیگا، اور اگر زمانے تو دوچار ہزار روپیہ دے ڈالنے لگا حضور"۔

دن گذر گئے۔ اور کشوری لال کی جوان بیٹی باجے گاجے کے ساتھ بوڑھے سیٹھ رادھاکشن کے گھر آگئی سیٹھ صاحب خوش تھے۔ کہ انہیں ایسا اچھا بر مل گیا ہے، انہیں اس بات کا بالکل رنج نہ تھا، کہ ایک دوسرے دل پر جسے ان سے زیادہ خوش ہونا چاہئے تھا۔ چھریاں چل رہی ہیں' ایک دن سیٹھ جی منشی کے ساتھ بیٹھے ہوتے حساب کتاب کی چھان بین کر رہے تھے کہ ایک گاڑی دروازے پر آکر رُکی۔ اُس میں سے اشوک اترا۔ سیٹھ جی بیٹے کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ اُس نے اپنے گھر آنے کی اطلاع تک نہ دی تھی اشوک نے جھک کر پتا کو نمسکار کیا۔ سیٹھ جی کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے "جیتے رہو، مگر تم میری اجازت لئے بغیر کیسے واپس آگئے۔ کیا تمہیں دوکان اور میرے روپے کا کوئی خیال نہیں" اشوک نے آہستہ سے کہا "اپنی ماتا سے اشیرباد لینا میرا دھرم تھا۔ اور اُس کو ادا کرنے کے لئے میں آیا ہوں۔ آج ہی واپس چلا جاؤں گا"۔ بوڑھا باپ جوان بیٹے کے منہ سے یہ جواب سنکر چپ ہو گیا۔ اشوک نے کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا زنانے میں داخل ہو گیا بملا دوسری طرف منہ کئے گھر کے کسی کام دھندے میں مصروف تھی اشوک اور آگے بڑھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مگر جس فرض کو ادا کرنے کے لئے آیا تھا۔ اُسے وہ فوراً ادا کر دینا چاہتا تھا' بملا کے قریب پہنچ کر اس کے قدموں میں جھک گیا اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بڑی مشکل کے ساتھ یہ الفاظ نکلے "پرنام ہو ماتا جی" بملا کے کان میں ایک ایسی آواز پڑی جسے وہ پہچانتی تھی، مگر جسے اب سننا نہ چاہتی تھی' اُس نے منہ موڑ کر دیکھا، اور ایک ایسی آواز میں جو زیادہ تر ایک چیخ سے مشابہ تھی کہا "ماتا" اشوک قدموں پر جھک گیا اور کہا "مجھے اشیرباد دو ماتا" بملا کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے' اس کے دل کی دنیا میں ہلچل مچ گئی' اُس کے منہ سے فقط اتنا ہی نکلا "میں اشیرباد دیتی ہوں بیٹا" اس کے بعد ایک چیخ سنائی دی۔ ایک دھماکہ ہوا بملا زمین پر گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ اشوک اُسے زمین سے اُٹھانے کے لئے بڑھا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ بملا کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اس کے چہرے پر جھریاں ہیں' وہ ہر اعتبار سے بوڑھی ہو چکی تھی بملا ایک ماں تھی۔ ایک بوڑھی ماں جو ابھی ابھی اپنے جوان بیٹے کو اشیرباد دے چکی تھی۔

جناب سرور قریشی

رنگِ تغزّل

ایک تم ہی تو نہیں ہو نوحہ خواں میرے لئے
رو چکی میری بھی چشمِ خونفشاں میرے لئے

جستجوئے عشق میں کیا لامکاں میرے لئے
ختم ہیں اک گام پر دونوں جہاں میرے لئے

مہرباں ہوں یا رہیں نامہرباں میرے لئے
آپ ہیں ہر حال میں آرامِ جاں میرے لئے

وائے قسمت بجلیوں کی نذر آخر ہو گیا
آشیاں کیواسطے ہیں آشیاں میرے لئے

مسکرا کر وہ اُدھر دامن اٹھائے چل دیئے
ہو گئی بیکار اِدھر بزمِ جہاں میرے لئے

ہر کلی ساغر بکف، ہر برگِ گل شیشہ بدست
رند ہوں میں، عام ہیں مینوشیاں میرے لئے

میکدے کا میکدہ ہے ایک قطرے میں نہاں
وسعتِ ساغر میں ہی گویا جہاں میرے لئے

سوزِ پرورِ میری فرقت میں نوائے ہمنوا
صرفِ نالہ ہے زبانِ ہمزباں میرے لئے

میری آمد پر صراحی جھک گئی تعظیم کو
اُٹھ گئیں بدمستیاں سرشاریاں میرے لئے

ہر خمِ گیسو پریشاں، ہر رسیلی آنکھ تر
اللہ اللہ کل جہاں ہے نوحہ خواں میرے لئے

جب انہیں دیکھا نہ تھا آسان تھیں دشواریاں
اب مگر دشوار ہیں آسانیاں میرے لئے

اُف مرے ذوقِ جبیں سائی کا معراجِ کمال
سجدہ گاہِ شوق ہیں دونوں جہاں میرے لئے

تھا میں دنیائے محبت پر کبھی چھایا ہوا
اب محبت بن گئی بارِ گراں میرے لئے

خندہ زن ہیں مجھ پہ اے سرورؔ تمام اہلِ جہاں
اور مری تقدیر ہے گریہ کناں میرے لئے

جناب جمیل احمد کندھاپوری بی اے

نجات

چچا کی علالت کے سلسلہ میں مجھے ایک ایسے واقعہ سے دوچار ہونا پڑا جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا

چند سال گذرے اگست کا مہینہ تھا، برسات کی روح پرور رنگینی اپنے پورے شباب پر تھی۔ شجر و حجر نے اپنے پرانے جوڑے اتار کر نئے نئے سبز کپڑے پہن لئے تھے، ہر طرف، ہر گوشہ، ہر سمت نغمہ تھا، موسیقی تھی، اور قہقہے کی لطیف جھنکار!

عین اسوقت کہ میں ہوسٹل میں اپنے احباب کے ساتھ لذت و سرور میں محو تھا۔ تار کے اس مضمون نے میری تمام خوشیوں کا خاتمہ ہی کر دیا۔ مضمون یہ تھا۔

"چچا سخت بیمار ہیں۔ فوراً گھر چلے آؤ۔"

اس کا پڑھنا تھا کہ قہقہوں کی رنگین عمارت آن واحد میں منہدم ہوگئی، جیسے کسی شدید زلزلے نے اُسے بری طرح مسمار کر دیا ہو——— اور اس کی جگہ آنسوؤں نے لے لی جو گھبراہٹ اور پریشانی میں میری آنکھوں سے بہ نکلے۔

شام کی گاڑی سے گھر روانہ ہوا، راستہ میں خوفناک خیالات خود بخود میرے ذہن کے گرد منڈلانے لگے، میں نے اُن کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود! جان لیوا، روح فرسا خیالات میرا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔

ڈبے میں کچھ گرمی سی تھی، میں کھڑکی سے گردن باہر نکال کر غیر ارادی طور پر شفق کو دیکھنے لگا، آسمان سیاہ اور ابر آلود نظر آرہا تھا، ابر کے موٹے موٹے ٹکڑے بیڈھنگے انداز میں ادھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے تھے، جیسے خوفناک دیو رات کی تاریکی میں اپنا راستہ بھول گئے ہوں۔

کچھ دیر بعد بارش ہونے لگی اور میں کھڑکی بند کر کے تازہ اخبار پڑھنے لگا۔ کوئی دو گھنٹے بعد اسٹیشن پہنچا۔ وہاں مجھے اترنا تھا۔ پلیٹ فارم سے باہر نکل کر دیکھا تو کوئی سواری موجود نہ تھی، رات کے گیارہ بجے تھے اور اس گاڑی سے اس وقت صرف گنتی کے چند مسافر اترے تھے۔

بارش تو ختم ہو چکی تھی، لیکن ہلکی ہلکی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی آسمان اس وقت پہلے سے بھی زیادہ سیاہ اور بھیانک نظر آرہا تھا ہوا زور شور سے چل رہی تھی۔

لیکن ان حالات کے باوجود بھی میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ پیدل ہی گھر کو روانہ ہو جاؤں، راستہ تو اچھی طرح دیکھا ہوا تھا، لیکن اس اندھیری رات کو ایک قدم چلنے میں بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ جس سڑک پر میں چل رہا تھا وہ پیچ و تاب کھاتی ہوئی دور تک سنسان چلی گئی تھی، کہیں کسی متنفس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہر طرف ایک بھیانک اور پر اسرار سکوت چھایا ہوا تھا، جسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی اُلو کی آواز درہم برہم کر دیتی تھی، سرد ہوا بہت فراٹے سے چل رہی تھی، اور معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ہیبتناک دیو بستر مرگ پر آخری سانسیں لے رہا ہے۔

سڑک کے بیچ میں ایک دھرم سالہ ملتا تھا، ابھی میں وہاں تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ پانی کے قطرے ٹپ ٹپ آسمان

سے گرنے لگے، سامنے کی بھیانک فضا ایک خوفناک آندھی کی پیشینگوئی کر رہی تھی، لیکن میرے لئے اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا کہ ہمت و استقلال سے اُس وقت تک راستہ طے کرتا جاؤں، جب تک کہ بارش خطرناک صورت نہ اختیار کر لے۔

سڑک کے دونوں جانب شیشم اور پیپل کے گھنے اور تناور درخت مضبوطی سے قدم جمائے کھڑے تھے اور آندھی کے وحشت انگیز تھپیڑوں سے وہ کچھ اس طرح زور زور سے چیخ رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا، غضب کا فرشتہ ان کو کوڑے مار رہا ہے۔

اب بارش نے بہت زیادہ زور پکڑ لیا اور برف کے ڈھیلے بھی آسمان سے گرنے لگے، میں سڑک سے بھاگ کر قریب کے ایک گھنے پیپل کے درخت کے نیچے چلا گیا اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں سے پانی نچوڑنے لگا۔

اس رات جیسی وحشت انگیز بارش میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، پانچ سات منٹ میں سڑک اور ندی نالے سب پانی سے بھر گئے۔ ہر طرف، ہر سمت، جدھر دیکھئے پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ خوفناک سیلاب اپنے ساتھ ساری آبادی کو بھی بہا کر تخیل کے کسی نامعلوم سمندر میں غرق کر دیگا۔ اُف! اُس رات جب بجلیاں چمکتیں تو معلوم ہوتا کہ بدی کا فرشتہ منہ کھول کر قہقہے لگا رہا ہے!

بہت دیر تک میں خوف و دہشت کے عالم میں کھڑا آسمان کو غصے سے تکتا رہا اور یہ حالت نہ جانے کب تک جاری رہتی اگر اس گریہ و زاری کی آواز میری توجہ اپنی جانب مبذول نہ کر لیتی، پہلے تو میں سمجھا کہ کوئی بُری روح اس درخت کی کسی شاخ پر پناہ گزیں ہے۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد جب پھر وہی آواز میرے کانوں میں آئی تو مجھے قدرے تعجب ہوا، حیرت سے میں نے گردن دوسری طرف موڑی، اور عین اسوقت بجلی کی ایک چمک نے مجھے کیا دکھلایا

—— اُف معبود! اب اس کے اعادہ سے بھی طبیعت خوفزدہ ہو جاتی ہے —— دو فاقہ کش مزدور! ایک سن رسیدہ مرد، اور ایک پریشان حال عورت (جو اس کی بدنصیب بیوی معلوم ہوتی تھی)، اور دو کالے کالے کمسن برہنہ بچے جن کے سینوں کی پسلیاں صاف الگ الگ نظر آ رہی تھیں۔

میں درخت کی دوسری طرف جا کر اُن سے قریب کھڑا ہو گیا۔ عورت جس نے اپنے جسم کا فقط ایک حصہ ایک پھٹے ہوئے پیوند آلود کپڑے میں ڈھانک رکھا تھا۔ اب بھی آہستہ آہستہ رو رہی تھی اور وہ ناسمجھ نادان بچے جو اس سے ناواقف تھے کہ فطرت غریبوں کے لئے کتنی بے رحم اور بے پرواہ ہے، بار بار نحیف آواز میں کہہ رہے تھے —— "روٹی . . . . . ماں . . . . روٹی!" لیکن وہ عورت جو ان کی بدنصیب ماں تھی بچے کے سوالات کا کوئی جواب دیئے بغیر روئے جاتی تھی۔

"کیا اس گریہ و زاری سے خدا کا دل نہیں ہلتا!" —— یہ سوچتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"تم لوگ کون ہو بہن! کیا رونے کا سبب مجھے بتلاؤ گی؟"...

لیکن میرے یہ الفاظ فضا میں چھپ کر رہ گئے اور ان کی صدائے بازگشت سنائی نہ دی۔

بارش اب کم ہوتی جا رہی تھی، اور معلوم ہوتا تھا کہ بدی کا فرشتہ اپنی بے اعتدالیوں سے اب کچھ تھک گیا ہے، جب اُس عورت نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے پھر پوچھا —— "تم کون ہو بہن . . . . کونسا دکھ ہے تمہیں؟" . . . . . اس عورت نے غمگین آنکھوں سے مجھے بغور دیکھا۔ اور جب اُس کو میرے چہرے میں ہمدردی کے آثار نظر آئے تو اُسے تقویت سی ہوئی اور اس نے سسک سسک کر کہنا شروع کیا . . . . "دکھ . . . بابوجی . . . . ہماری زندگی ہی سب سے بڑا دکھ ہے، پر ماتما مار ڈالے تو اس جنجال سے چھٹکارا ہو جائے"

اس کی ان باتوں سے میں بہت متاثر ہوا۔ "لیکن کونسی مصیبت تم پر ٹوٹی ہے.... آخر ہوا کیا؟ ... مجھ سے کہو... ہر آدمی یکساں نہیں ہوتا... شاید میں تمہارے کام آسکوں۔" میں نے اسے ہمدردی سے کہا۔

"ہمارا قصہ سنکر کیا کیجئے گا بابوجی!... ہم غریب لوگ ہیں ہمارے قصے میں سوائے دکھ درد اور آنسوؤں کے کیا ہو سکتا ہے"

..... وہ ابھی اپنا جملہ ختم کرنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کے ایک بچے نے یوں مداخلت کی ... "کچھ کھانے کو دے ماں .... اب بھوکا نہیں رہا جاتا۔"

"سو رہو بیٹا، صبح کو کھانا ضرور ملجائیگا۔ رات کے وقت تو کوئی بھیک بھی نہ دیگا"..... اور پھر اس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ کون ہیں بابوجی؟ ... یہاں کس طرح آئے؟"

"میں ابھی گاڑی سے اترا ہوں، چچا بہت بیمار ہیں، انکو دیکھنے کی غرض سے آیا ہوں، اسٹیشن پر کوئی سواری نہ ملی اس لئے پیدل ہی روانہ ہو گیا، راستہ میں بارش زدہ کی ہونے لگی تو اس درخت کے نیچے ٹھہر گیا۔"

"آپ کے چچا بیمار ہیں!!" ... یہ کہکر اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہا ... "اس سنسار میں سوائے دکھ کے اور آنسوؤں کے اور دھرا ہی کیا ہے بابوجی؟"

اتنا کہکر وہ خاموش ہو گئی اور اپنے شوہر کی پیشانی چھونے لگی ... "اب طبیعت کیسی ہے تمہاری؟" اس نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"درد..... سے..... سر... پھٹا... جاتا... ہے۔" مرد نے نحیف آواز میں آہستہ آہستہ کہا۔

"انہیں ہوا کیا ہے بہن!"... میں نے پوچھا۔

"بخار ہے بابوجی!" ... عورت نے جواب دیا۔

"بخار کا مریض اور اس وحشت انگیز آندھی کی گود میں اس بے سروسامانی سے پناہ گزیں... خدایا! اس پر رحم کرنا"..... دل ہی دل میں یہ سوچتا ہوا میں مریض کی طرف جھکا اور اسکی پیشانی چھو کر دیکھی!

"اس بخار کی حالت میں تم لوگ یہاں کیوں پڑے ہوئے ہو۔ ... یہاں تو تیز ہوا میں مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔"

عورت نے پھر بھی جواب دینے میں پس و پیش کیا، لیکن جب میرا اصرار اس کے انکار پر غالب آگیا تو اس نے کہنا شروع کیا۔

"آخر کوئی گھر تو ہے نہیں بابوجی... پھر جاؤں کدھر؟"

میں سراپا گوش بنا اس کی دردناک کہانی سن رہا تھا، اور وہ بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بالتفصیل واقعہ بیان کر رہی تھی.....

"یہ جسے آپ بخار سے جلتا ہوا سامنے دیکھ رہے ہیں میرا شوہر ہے بابوجی!... ہم لوگ مزدوری پیشہ ہیں... آج کی طرح ہم ہر روز اس درخت کے نیچے بے سروسامانی سے نہیں رہتے تھے، ہم نے بھی اچھے دن دیکھے ہیں بابوجی!..... لیکن زمانہ سدا ایک سا تو رہتا نہیں۔

"بازار میں ایک دولت مند مہاجن رہتا ہے، اس کا بہت بڑا سودی کاروبار ہے، شہر میں اس کے بہت سے مکانات ہیں۔ جنہیں وہ کرایہ پر چلاتا ہے، آپ تو اس جگہ کے رہنے والے ہی ٹھہرے، شاید اس سے واقف بھی ہوں۔ تین چار مہینے ہوئے وہ ندی کے پاس زمین خرید کر مکان بنا رہا تھا، میں اور میرے شوہر نے اس مکان کی تعمیر میں بہت جانفشانی سے کام کیا سب مزدور تو چار بجے ہی کام چھوڑ کر چلے جاتے، لیکن ہم دونوں آفتاب ڈوبنے تک کام کرتے رہتے، مہاجن ہمارے کام سے بہت خوش ہوا اور اپنے ایک معمولی مکان کی ایک تاریک کوٹھڑی، جس میں خود اس کا دربان رہتا تھا، تین روپے ماہوار پر

ہمیں کرایہ پر دے دیا۔ ہم سب اس میں خوش خوش رہنے لگے اس سے قبل جہاں ہم رہتے تھے، وہاں کرایہ چار روپے دینا پڑتا تھا۔ اس ایک روپیہ ماہوار کی بچت سے ہمیں بہت کچھ اطمینان ہوگیا تھا، دن بھر ہم بازار میں اِدھر اُدھر محنت مزدوری کرتے اور شام کو چاول ابال کر کھاتے اور چادر تان کر چین کی نیند سو رہتے۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنے شوہر کی پیشانی پھر چھو کر دیکھی اور نکو سرگوشیوں میں کچھ کہہ کر مجھ سے اس طرح مخاطب ہوئی۔

"لیکن بابو جی! اچھے دن سدا تو رہتے نہیں۔ . . ہماری خوشیوں کے دن بھی بہت جلد بیت گئے۔ میرا شوہر بیمار پڑ گیا اور اس کو ہر وقت بخار رہنے لگا۔ یہ تو کام پر جانے سے رہا، اب اکیلی میں مزدوری کرنے کے لئے جاتی اور جو چند آنے دن بھر کام کرنے پر ملجاتے، ان سے سب لوگوں کا پیٹ بھرتا۔ ایک مہینہ اسی طرح گذر گیا۔ لیکن روز بروز اس کی بیماری بڑھتی گئی اور مرض نے آخر خطرناک صورت اختیار کرلی۔ پہلے تو میں شوہر کو چھوڑ کر کام کرنے کے لیے چلی جاتی تھی، لیکن اب ایسی حالت میں کس طرح باہر جاتی۔ کوئی اور تو تھا نہیں، جو بیمار کی تیمارداری کرتا، لہذا مجھ ہی کو تمام دن یہ فرض ادا کرنا پڑتا تھا۔"

عورت کے دونوں بچے روٹی . . . . . روٹی . . . چلاتے ہوئے اب سو گئے تھے، مریض بدستور لیٹا ہوا تھا۔

"ایک دن شام کا ذکر ہے بابو جی!" اس نے پھر کہنا شروع کیا، "میرے شوہر کا بخار اس وقت بہت تیز تھا، میں سرہانے بیٹھی اسکا سر دبا رہی تھی اور بچے الگ کھیل کود میں مصروف تھے کہ باہر سے کسی نے گرج کر کہا۔ . . "دروازہ کھول!"

میں سہم کر اٹھی اور دروازہ کھولدیا۔

"لاج نہیں آتی تجھے۔ . . . دو مہینے سے مہاجن کا کرایہ نہیں ادا کیا!" . . . میں فوراً ہی پہچان گئی۔ یہ اس ظالم مہاجن کا بے رحم پیادہ تھا۔

"ہم بڑی مصیبت میں ہیں بھائی۔ . . سرکار کو کہہ دینا کہ پتی بیمار ہے۔ . . کام کرنے والا کوئی نہیں۔ . . . چاول دال تو دھا لا کر دن گذارتی ہوں۔ . . کرایہ اس وقت کہاں سے دوں ؟" . . میں نے اس سے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔

"میں تیرے دکھ کا حال سننے نہیں آیا، سرکار نے حکم دیا ہے کہ جس طرح بھی ہو، کرایہ وصول کر کے لے آؤ۔" پیادے نے کڑک کر کہا

"لیکن کرایہ دوں کہاں سے بھائی۔ ایشور جانتا ہے ایک پائی بھی پاس نہیں۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"نہیں ہے تو قرض لے چوری کر! . . . کرایہ تجھے جس طرح بھی ہو دینا پڑیگا" اس ظالم نے ترشروئی سے جوابدیا۔

"غریبوں کو قرض کون دیگا بھائی؟" . . میں نے کہا، لیکن جب اس پر بھی اسکا دل نہ پسیجا تو پھر میں نے بڑی منت سماجت کی۔ کہ سرکار سے کہکر کم سے کم چار دنوں کی مہلت دلادے۔ میں نے سوچا کہ شاید کسی طرح اس درمیان میں پرماتما کوئی سامان بنادے،

"آج منگل ہے۔ . سنیچر کو پھر آؤں گا۔ . . اگر اس وقت نہ دیا تو پھر مکان سے نکالدیئے جاؤ گے!" وہ پیادہ اتنا کہہ کر چلا گیا۔

دو چار دن میں نے بڑی مشکل سے گزارے۔ . . . ہر وقت یہ خیال لگا رہتا کہ سنیچر کو جب مہاجن کا پیادہ آئیگا تو کیا منہ دکھاؤنگی بیمار شوہر دن رات اسی فکر میں اور زیادہ گھلا جاتا تھا۔

پڑوس میں ایک داروغہ جی رہتے تھے۔ انہوں نے کچھ دنوں قبل میرے شوہر سے بغیر مزدوری کے کام کرایا تھا اس وقت مجھے ان کے خیال سے بڑی تقویت ہوئی۔ سوچا کہ کچھ بھی ہو، پڑوسی ہیں شاید اسوقت خیال کر کے چند روپے قرض دیدیں، لیکن میری توقعات نقش بر آب ثابت ہوئیں بابو جی! . . . . داروغہ جی نے میری عرض سنتے ہی کہا۔

"مجھے معاف کرو میرے پاس فاضل پیسے نہیں جو قرض لگاتا پھروں۔"

الغرض سنیچر کو منہ اندھیرے مہاجن صاحب خود ہی اپنے پیادے کے ساتھ تشریف لائے، سچ کہتی ہوں بابو جی! اُس وقت پوری طرح صبح نہ ہوئی تھی اور انسان تو کیا پرندے بھی اپنے گھونسلوں سے باہر نہیں نکلے تھے۔

میں اور میرے بیمار شوہر دونوں ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑے ہو گئے، میں اُن کے پاؤں تک پڑی، لیکن میری منت وسماجت سے اُن کا دل نہ پسیجا، اور اپنی ایک گرجدار آواز سے انہوں نے ہماری تمام التجاؤں، آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔

"رام داس! دیہ اس کے پیادے کا نام تھا، اس کوٹھڑی میں جتنے برتن ہیں، ان سب کو ضبط کر لو اور ان بے ایمانوں کو دھکے دیکر باہر نکالدو۔"

اتنا کہہ کر وہ عورت اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، ابر اب بھی مستعدی سے اپنا تسلط جمائے تھے، لیکن بارش قدرے کم ہو چکی تھی، ہوا بدستور زور زور سے چل رہی تھی۔

"پھر کیا ہوا بہن!" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ہوتا کیا بابو جی! . . . . الغرض ہم سب کل صبح سویرے دھکے دیکر کرایہ کی کوٹھڑی سے نکالدیئے گئے، اور اُس وقت سے اس رحمدل درخت کے نیچے پناہ گزیں ہیں، آج صبح سے بارش نے بے حال کر رکھا ہے . . شوہر کی حالت آپ دیکھ رہے ہیں، بخار سے مرا جاتا ہے، کل سے ایک دانہ بھی ہم میں سے کسی کے پیٹ میں نہیں گیا . . . بچے بھوک سے روتے ہیں . . لیکن میں عورت کیا کر سکتی ہوں . . . غریب کے لئے دنیا جنجال ہے بابو جی!"

یہ آخری جملہ اُس نے بڑی بیزاری سے کہا۔

اُس کی سرگذشت سنکر مجھے بہت غم ہوا اور آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے میری آنکھوں سے بہ نکلے۔

اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے، موسم اتنا خراب تھا کہ ایک قدم چلنے میں بھی خوف محسوس ہوتا تھا، دن کا وقت ہوتا تو میں کسی طرح اُن کو اپنے گھر تک لے جاتا اور جس طرح بھی ہوتی ان کی مدد کرتا۔ لیکن ایسی ہیبتناک شب میں کیا کر سکتا تھا، سوچا کہ ابھی میں گھر چلا جاؤں اور صبح سویرے آکر ان کو گھر لے جاؤں گا۔

"بارش اب کم ہو گئی ہے بہن . . . . مجھے گھر جانے کی اجازت دو . . . کل صبح آکر . . . جیسی کچھ بھی ہوگی تمہاری خدمت کروں گا۔ خدا کرے رات بھر تم لوگ خیریت سے رہو۔"

میں نے اپنا جملہ ختم ہی کیا تھا کہ یکبارگی بجلی بہت زور سے کڑکی اور میری ان دعاؤں کا جو دل کی عمیق گہرائیوں سے نکلی تھیں، تمسخر اڑاتی ہوئی، فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر کے غائب ہو گئی۔

"ہاں بابو جی! آپ جایئے، ایشور نے چاہا تو پھر ملاقات ہوگی۔"

میں وہاں سے چل پڑا، لیکن ابھی چند ہی قدم گیا تھا کہ پیچھے سے عورت نے پکار کر کہا۔

"بابو جی ذرا سنیئے گا!"

میں نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔ "کیا ہے بہن؟"

"ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے بابو جی!" . . اُس نے کہا . . . "میرے شوہر کی چھتری رکھی ہوئی ہے، ساتھ لے لیجئے۔"

اور اتنا کہہ کر اُس نے ایک ٹوٹی پھوٹی چھتری میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

میں اُس وقت عورت کے اس سلوک سے بہت متاثر ہوا . . "اُف غریب اور امیر کے دل میں کتنا زبردست فرق ہے۔" . . . یہ سوچتا ہوا میں گھر کو روانہ ہو گیا۔

کم وبیش ایک گھنٹہ کے بعد گھر پہنچا، چچا واقعی سخت بیمار تھے، رات میں نے آنکھوں آنکھوں میں جاگ کر کاٹی، صرف صبح کے وقت کچھ دیر کے لئے نیند آگئی۔

بارش رات کے آخری حصہ میں شدت کی ہوئی، اس قدر زور شور سے کہ گھر کا آنگن ترکیا، صحن اور کمروں تک پانی آگیا آس پاس کے چند پرانے مکانات گر پڑے لیکن کسی کی جان تلف نہ ہوئی، ابر و رعد کی گڑگڑاہٹ آواز نے لوگوں کے ہوش وحواس گم کر رکھے تھے۔ کبھی کبھی تو بجلی اس زور سے تڑپتی کہ سارا مکان ہل جاتا اور یہ محسوس ہوتا کہ قریب ہی کہیں برق گر کر جذب ہوگئی ہے۔

الغرض کسی طرح صبح ہوئی، نیند سے بیدار ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ابر آسمان سے چھٹ رہے ہیں، مجھے فوراً اپنا وعدہ یاد آگیا اور چھتری لیکر میں سٹیشن کے راستہ پر چل پڑا، جس کے ایک درخت کے نیچے، ان مصیبت زدوں سے میں دوچار ہوا تھا۔

ابھی میں وہاں پہنچا بھی نہ تھا کہ دیکھا سامنے سے لوگ جوق در جوق چلے آرہے ہیں، سب کے چہروں سے حسرت و ملال کے آثار ٹپک رہے ہیں، قریب سے سٹیشن کے دو قلی گذرے وہ آپس میں کہہ رہے تھے۔

"بھیا! یہ ساری آفت ہم غریب پر ہی آدت ہے، جب کچھ ہووت ہے تو غریب پر ہی!"

دوسرے نے کہا۔ "سچ ہے بھیا! پر عیسی ایشور کی اچھا۔"

میں ان کی نامکمل گفتگو کا کوئی مطلب نہ سمجھ سکا۔ گھبراہٹ اور حیرت میں آگے بڑھتا گیا اور جب اس پیپل کے درخت کے نیچے پہنچا تو دیکھا۔ . . اُف میرے معبود! اس کے قلمبند کرنے سے بھی وحشت ہوتی ہے، خدا ایسا نظارہ پھر نہ دکھلائے!

گوشت و پوست کے وہ پریشان حال انسان جنہوں نے رات کے وقت اپنی دکھ بھری کہانی سنائی تھی، اس وقت بجلی کی ایک ضرب سے راکھ کے ڈھیر ہو گئے تھے، اور پیپل کا درخت جس نے انہیں اپنی سبز شاخوں کے نیچے پناہ دی تھی سوکھ کر زرد اور بے رنگ و بو ہوگیا تھا!

"اچھا ہوا! بیچاروں کو دکھ اور مصیبت سے ہمیشہ کیلئے نجات مل گئی!" یہ سوچتا ہوا میں گھر واپس آگیا۔

اس جانکاہ واقعہ کو گذرے ہوئے ایک مدت ختم ہوچکی ہے لیکن اس کی روح فرسا یاد میرے دل کو ہمیشہ اس طرح برماتی ہے، جیسے یہ کل کی بات ہو۔

اُن کی پیوند آلود چھتری کو میں ہمیشہ دیکھتا ہوں، اور اُن پر آنسو بہاتا ہوں ⁂

نقد و نظر

آئی سی-ایس - مُصنفہ پروفیسر علی عباس حسینی ایم - اے کتابت و طباعت اعلےٰ و جاذب دل دنگاہ - صفحات ۲۵۲ - قیمت ڈیڑھ روپیہ - ملنے کا پتہ انڈین پریس الہ آباد -

یہ کتاب پروفیسر علی عباس حسینی ایم - اے کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے - پہلے صفحے پر "انتساب" ہے اور یہ انتساب پڑھکر ہی قاری پر مصنف کی پاکیزہ و بلند ذہنیت آئینہ ہوجاتی ہے - انتساب کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے :-

"مادرِ وطن ہندوستان کی بارگاہ میں اسکے ایک ادنےٰ فرزند کی نذر"

پروفیسر علی عباس حسینی ایم - اے اردو کے ان مایۂ ناز افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے افسانہ نگاری کو بحیثیت فن اتنا بلند کر دیا ہے کہ آج ہم بھی اپنے کامیاب افسانوں کو یورپ کے کامیاب افسانوں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں پروفیسر صاحب مدت سے افسانے لکھ رہے ہیں - اور آپکے اکثر افسانے دیگر زبانوں میں بھی منتقل ہو چکے ہیں - آپ بالخصوص معاشرتی افسانے لکھتے ہیں - اور اس موضوع پر آپ کو خاص مہارت حاصل ہے - دیہاتی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو آپ کا قلم اس کامیابی و دلآویزی سے پیش کرجاتا ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ افسانے کے واقعات تمام جزئیات کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے پیش ہو رہے ہیں - نہ صرف یہ بلکہ افسانہ ختم کرنے کے بعد افسانے کے تاثرات گہرے نقوش بنکر دل و دماغ پر مرتسم ہو جاتے ہیں - اور یہی افسانہ نویس کی سب سے بڑی خوبی ہے صاحب موصوف کے تقریباً تقریباً ہر افسانے میں ایک مقصد ہوتا ہے اور اسی مقصد کے ارد گرد افسانے کے تمام واقعات گھومتے ہیں یہ مقصد غیر شعوری طور پر ہمارے دل میں اترتا جاتا ہے - اور اہمیت حاصل کرتا جاتا ہے - مثلاً اس مجموعے کے پہلے افسانے ہی میں دیہات کی محنتی زندگی کی وقعت و اہمیت کو واضح کیا ہے - "دو شریفوں کا مقابلہ" میں بھی "انتہائی شرافت کی فتح کو بیان کیا ہے - اسی طرح آپکے دوسرے افسانوں میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد" کوئی نہ کوئی غایت ہے - آپ افسانہ نہ تو تفریح طبع کے لئے لکھتے ہیں - اور نہ چاہتے ہیں کہ کوئی اسے محض تفریح طبع کے لئے پڑھے - کردار نگاری افسانے کی جان ہے - اور کردار نگاری" میں بھی آپ کو یدِ طولےٰ حاصل ہے - "افسانہ شیخو چچا" کردار نگاری" کے لحاظ سے خاص طور پر کامیاب ہے -

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مجموعے کے دو تین افسانوں کا ایک ہی مقصد ہے - اور قاری کی طبیعت قدرے منغّص ہو جاتی ہے - مگر جیسا کہ کہا گیا ہے پروفیسر صاحب کے مدِ نظر ایک مقصد کی اہمیت کو واضح کرنا ہوتا ہے - جتنا مقصد زیادہ اہم ہوگا - اتنا اس پر زیادہ زور دیں گے -

مختصر یہ کہ ہم بڑی مسرت سے جناب پروفیسر علی عباس حسینی کے افسانوں کے اس مجموعے کا خیر مقدم کرتے ہیں - اُمید ہے یہ مجموعہ بہت قبولیت حاصل کرے گا -

یا گھر کا ڈاکٹر و حکیم

مصور ایڈیشن

مخزن حکمت

مصنفہ و مؤلفہ

خانصاحب ڈاکٹر و حکیم غلام جیلانی شمس الاطباء

طبع یازدھم

اس موجودہ ایڈیشن میں دیگر اضافات کے علاوہ تقریباً چار صد رنگین ہاکسی (عکسی تصاویر) اور دو صد کے قریب دستی تصاویر کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتاب ہر پہلو سے سابقہ ایڈیشنوں کی نسبت زیادہ مفید اور زمانہ حال کی ضروریات کے عین مطابق بن گئی ہے جسمیں ہر مرض کی ماہیت کیفیت اسباب علامات اقسام تشخیص انجام و عوارض اصول علاج کے بیان کے بعد ڈاکٹری علاج میں حصول حفظ ماتقدم پھر طبی شافی ڈاکٹری اور بہترین نسخہ جات لکھنے کے بعد یورپ و امریکہ کی بہترین اور مفید ترین پیٹنٹ ادویہ بھی تحریر کردی گئی ہیں۔ علاوہ بریں علاج بذریعہ انجکشن (جلدی پچکاری) کا جدید اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح طبی مجربات کے علاوہ مفید ترین مفرد ادویہ کے استعمال کا طریق بھی لکھ دیا ہے اور ساتھ ہی ہر مرض کے آخر میں غذا اور پرہیز کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے ان عظیم الشان اضافات اور بلند ترین خوبیوں کے باوجود قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ قیمت ہر دو حصہ جلد مکمل بے جلد ۸؎ مجلد ۱۰؎ بغیر جلد ۸؎ مجلد ۱۰؎ علاوہ محصول ڈاک۔

مخزن مرکبات معلم دواسازی!

قیمت بلاجلد ۲؎ مجلد تین روپیہ کتاب میں تقریباً ڈیڑھ دو ہزار قدیم و جدید یونانی مرکبات کے صحیح منتخب نسخہ جات درج ہیں اسکے علاوہ ضمیمہ معلم دواسازی اور ضمیمہ علاج الامراض بھی شامل ہیں۔

سیسیوں انگریزی کتابوں کا نچوڑ!

یا کتاب التلقیح

باتصویر مصور

انجکشن بُک

جسمیں انجکشن کے مخصوص فوائد اور طریق عمل ٹیکہ کے مقام کا انتخاب

ضروری ہدایات

انجکشن میں بے احتیاطی سے نقصانات۔ انجکشن کے اقسام اور ان میں مستعملہ ادویات کا مفصل بیان درج ہے۔ اس کے علاوہ جلدی پچکاری (ہیکوٹینیس انجکشن) عضلی پچکاری (انٹرا مسکولر انجکشن) وریدی پچکاری (انٹراوینس انجکشن) نخاعی پچکاری (انٹراتھیکل انجکشن) بے حسی پیدا کرنیوالا ٹیکہ (لوکل انیس تھیٹک انجکشن) ویکسینز اور سیرم کے ٹیکے (ویکسینز اینڈ سیرم انجکشن) وغیرہ کا مفصل تذکرہ اور آسان طریق پر ہر ایک کا بیان درج ہے۔ علاوہ ازیں قوت مناعت امیونٹی اور لیبر ٹیکر وغیرہ اور جسقدر آپریشن اور نائٹ فیشن نیز مشہور انگریزی دواساز کمپنیوں کی ادویات انجکشن جو آجکل مروج ہیں نہایت وضاحت کے ساتھ درج کر دیا ہے۔ ہر دوا کی مقدار خوراک طاقت و تاثیر و طریق استعمال وغیرہ کے متعلق بیان درج ہے۔ انکے علاوہ علاج جراحی میں جو انجکشن مستعمل ہیں انکو بھی تفصیلوار درج کر دیا ہے۔ آخر میں دو ضمیمے یعنی ضمیمہ میٹریا میڈیکا اور ضمیمہ علاج الامراض لگا دیئے ہیں۔ غرض ہمارے ایسی تمام بیان موجود ہیں جو کتاب دیکھنا اور مطالعہ کرنے پر معلوم ہو سکتی ہیں مزید آسانی پیدا کرنے کیلئے بیشمار رنگین تصویریں لگا دی گئی ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو کسی زبان میں آج تک ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جو اس قدر مواد بہم پہنچائے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔ یعنی صرف تین روپے بلاجلد۔ مجلد ۳؎۔ علاوہ محصولڈاک۔

طبی کتب خانہ جناب شمس الاطباء رجسٹرڈ بھاٹی گیٹ لاہور

افسردہ دلوں کی مسرت کا سامان شبنم کی آغوش میں آگ کا طوفان!

چٹکتے ہوئے غنچوں کا رازِ تبسم

آپ کے دل کی شگفتگی سے وابستہ ہے

للٰہذا دن بھر کے کام کاج سے تھک کر اگر آپ کی طبیعت مکدر ہو گئی ہو تو مرزا جی پڑھیے مسلسل سلیس دلنشین اور شوخ عبارت چٹ پٹے فقرے یکبار تو آپ کو ضرور ہنسا دیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو زبان میں اس سے زیادہ سنجیدہ ظرافت اور اچھوتے مذاق کی کوئی کتاب آج تک طبع نہیں ہوئی۔

مرزا جی حصہ اول۔ قیمت مجلد خوبصورت [illegible]

مرزا جی حصہ دوم:- یہ بھی مزاحیہ افسانوں اور مزاحیہ مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے جس کا ایک ایک لفظ سنجیدہ ظرافت اور اچھوتے مذاق میں ڈبو دیتا ہے۔ قیمت مجلد خوبصورت [illegible]

کھلتی ہوئی کلیوں کا نغمۂ تبسم

آپ کے قلب میں پنہاں ہے

للٰہذا اس اظہارِ مسرت کے لئے پنجاب کے ادیب شہیر ایم۔ اسلم کے دلچسپ افسانوں کا مجموعہ۔

تفسیرِ حیات:- پڑھیے جس کا ہر افسانہ ایسا روح افزا ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی جی نہیں اکتاتا۔ یہ کتاب اتنی بہترین نوعیت کی ہے کہ تمام پنجاب کی لائبریریوں کیلئے منظور ہو چکی ہے اور قابل مصنف نے اس پر انعام حاصل کیا ہے۔ قیمت مجلد خوبصورت [illegible]

کارزار:- صاحب یہ بھی اسی قابل مصنف کے دلچسپ افسانوں کا دوسرا حصہ ہے اور پہلے حصہ کی طرح نہایت دلچسپ ہے۔ قیمت مجلد خوبصورت [illegible]

کائناتِ عالم کا رازِ فطرت

دامنِ گل پر شبنم کے قطرے!

ملک ہندوستان کے نامور ادیب، شاعر مشہور اور مقبول افسانہ نویس

ماھر القادری

کے تازہ ترین دلچسپ افسانوں کا حسین و جمیل مجموعہ جس کا ہر افسانہ نفسیات کا صحیفہ اور ادب کا گلدستہ ہے۔ یورپ کی زبانوں میں بھی اس تصنیف کے ترجمہ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ حجم تقریباً ۴۵۰ صفحات سرورق سہ رنگی با تصویر جلد حسین پائیدار کتابت و طباعت لاجواب مصنف کے فوٹو کے ساتھ۔ قیمت صرف دو روپے [illegible]

غزال:- بہترین افسانہ جس کو ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ قیمت [illegible]

گلشنِ ادب کے شگفتہ پھول!

ادیب شہیر ایم۔ اسلم کے شہ پارے

شہر گناہ:- یعنی پُر نہایت عبرتناک اور دردناک افسانوں کا مجموعہ مجلد [illegible]

آشوبِ زمانہ:- مرد و عورت کے چند خطوط کا دلچسپ مجموعہ مجلد [illegible]

مضامینِ ایم اسلم:- قابل مصنف کے دلچسپ مضامین کا بہترین مجموعہ [illegible]

گناہ کی راتیں:- یعنی انسان کے گناہ رنگین ... نہایت دلچسپ ... [illegible]

طلسم سامری:- ... کے تارکنوں کے عبرتناک ... [illegible]

پیامِ مکرم:- دلچسپ افسانوں اور دلنواز مضامین کا مجموعہ [illegible]

عروسِ غربت:- ایک بے کس عورت کی ... [illegible]

سرابِ زندگی:- ایک نوجوان ... [illegible]

انقلاب:- ... گذشتہ جنگ حبش کے عبرتناک ... کا دلچسپ مجموعہ۔ قیمت [illegible]

نغمۂ حیات:- ادب لطیف کا بہترین مجموعہ [illegible]



طلسمِ خیال

اُردو کے جلیل القدر افسانہ نگار جناب کرشن چندر ایم۔ اے کے افسانوں کا مجموعہ

طلسمِ خیال

نگارخانۂ حیات کی وہ حقیقی تصویر ہے جس میں زندگی کے حقیر سے حقیر نقش کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

طلسمِ خیال

میخانۂ حسن وعشق کا وہ لبریز ساغر ہے۔ جسکے قطرے قطرے میں محبت کے اسرار کی دنیا ابھار رہی ہے۔

طلسمِ خیال

طلسم کدۂ کائنات کا وہ مرقع ہے جس میں دنیا کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔

طلسمِ خیال میں

مصنف کے طلسم کار قلم نے حیات انسانی کے دکھوں اور سکھوں کی اس طرح تصویر کھینچی ہے کہ آپ روئیں گے بے اختیار ہو کر، ہنسیں گے متاثر ہو کر اور یہ اثرات ہمیشہ آپ کے دل پر مرتسم رہیں گے۔

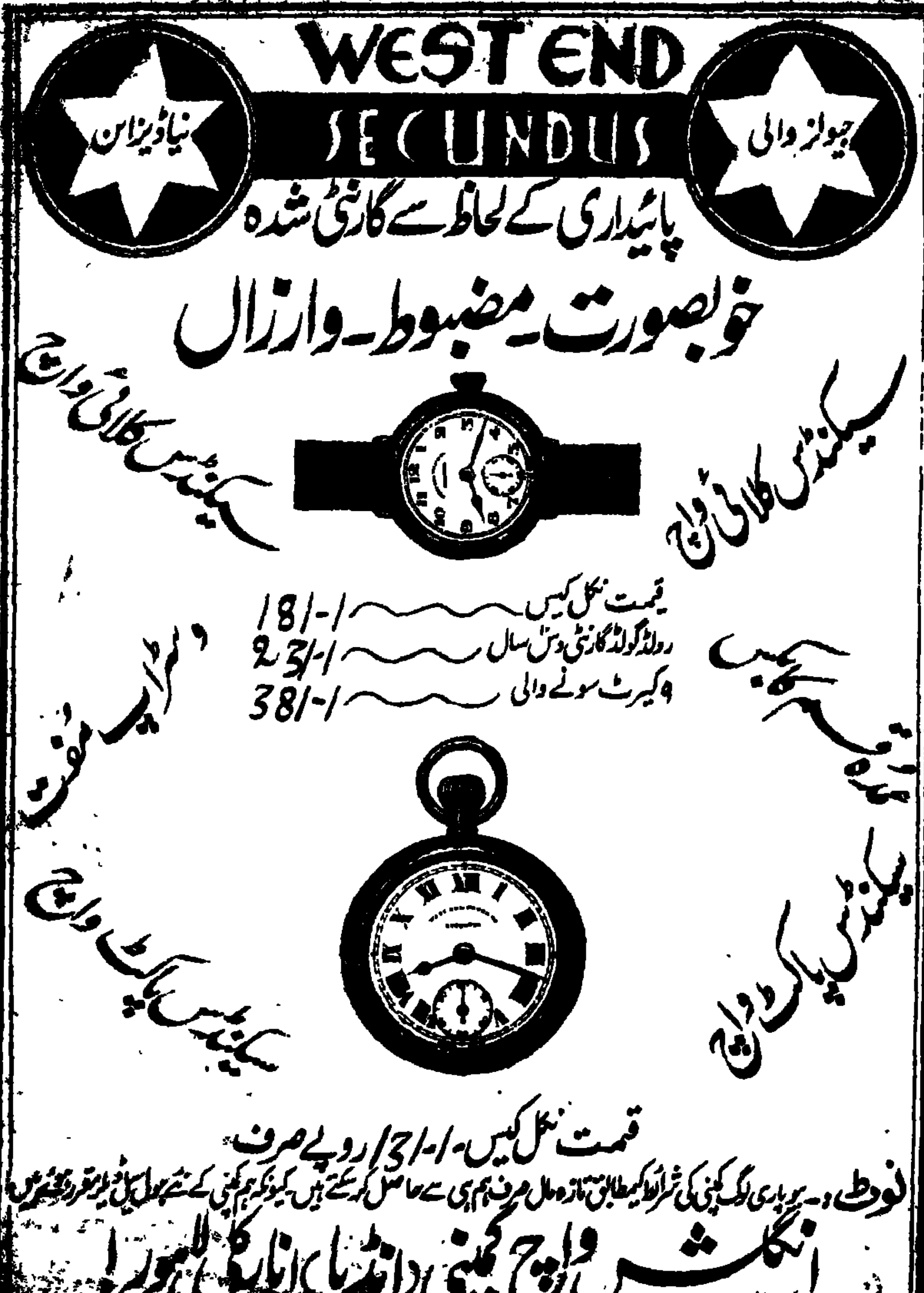
طلسمِ خیال ۔ کا مصنف اردو کے صاحب طرز افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی افسانہ نگاری و طرز انشا کے متعلق ملک کے جلیل القدر رسائل و جرائد کی رائیں شائع ہو چکی ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) مسٹر کرشن چندر صاحب نے حیات انسانی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا طرز انشا انوکھا اور البیلا ہے "ٹریبیون" لاہور

(۲) اس نوجوان ادیب کی نفس اور زور دار زبان ، اسیر حاصل اور رنگین تخیل اور گہرا نفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا ایک زبردست ادیب ثابت ہو گا۔ "ہمایوں" ستمبر ۱۹۳۷ء

(۳) مسٹر کرشن چندر ایم اے کا افسانوی کمال اب اس درجہ مسلم ہے کہ اسکے متعلق مزید لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ آپ ترقی پسند ادب کے علمبردار ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپکے افسانے اصلیت نگاری کے حامل ہوتے ہیں۔ موجودہ سوسائٹی پر آپ اس قدر دلچسپ اور لطیف پیرائے میں طنز کیا جاتے ہیں کہ پڑھنے والوں کا ضمیر ہر برائی کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہاں اسکا لطف لئے بغیر نہیں رہتا۔ آپ کا طرز بیان جدید اور دلکش ہے۔ ادب کی ان کے ساتھ بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ کاغذ نہایت اعلیٰ۔ قیمت ایک روپیہ "شاہکار" ۱۹۳۸ء

ملنے کا پتہ: مکتبہ اردو ۔ ۱۵ سرکلر روڈ لاہور


WEST END
SECUNDUS
نیا ڈیزائن
جیولز والی
پائیداری کے لحاظ سے گارنٹی شدہ
خوبصورت ۔ مضبوط ۔ وارزاں
سیکنڈس کلائی واچ
قیمت نکل کیس 18/-/1
رولڈ گولڈ گارنٹی دس سال 23/-/1
۹ کیرٹ سونے والی 38/-/1
سیکنڈس پاکٹ واچ
قیمت نکل کیس ۔ 12/-/1 روپے صرف
نوٹ ۔ بیوپاری لوگ کمپنی کی شرائط کے مطابق تازہ مال صرف ہم ہی سے حاصل کر سکتے ہیں ۔ کیونکہ ہم کمپنی کے
انگلش واچ کمپنی (انڈیا) انارکلی لاہور !